

حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب

آلیٹ احادیث پر کُل اعراب اور تخریج تحقیق کے ساتھ [۱۲۰] خطبات کا مجموعہ

خطبات حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے
مختلف شعبوں سے تعلق اسلام کی تعلیمات کو یکجا اسلوب میں پیش کیا گیا ہے
جس کا مطالعہ قلب و فکر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مُرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیٹ السلام
پبلشر: کراچی • پاکستان



حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۱۰

آیات احادیث پر کمال اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ [۱۴۰] ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت تازگی بخشتا ہے

مترجم: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا ساجد محمود صاحب
مختص فی احادیث مایہ فاروقیہ کراچی

مولانا راشد محمود صاحب
مختص فی احادیث مایہ فاروقیہ کراچی

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل مایہ دارالعلوم کراچی

تقدیم و نگارنی: مولانا ابن الحسن عباہی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر، کراچی - پاکستان





قرآن و سنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں
- طبع جدید اکتوبر 2011ء
- تعداد 1100
- ناشر بیت السلام



بیت السلام
پبلشرز، کراچی، پاکستان

نزد مقہذس مسجد، اردو بازار، کراچی - فون: 021-32711878

موبائل: 0321-3817119 ای میل: baitussalam_pk@yahoo.com

27		9	مقصودِ عبادات	نبی اُمی علیہ السلام
28		9	تلاوت اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ ہے	تمہید
28		9	دستورِ حیات	موضوع تقریر
29		10	الفاظِ قرآن کمالاتِ خداوندی کے مظہر ہیں	دعویٰ نبوت اور دلیل نبوت
30		11	اللہ تعالیٰ کی رسی اور اس کے تھامنے کا طریق کار	نبوت انسانیت کے لئے ذریعہ علم
31		11	عظمت و محبت کا تقاضا	علوم دنیوی کا ذریعہ بھی نبوت ہے
31		12	قیامت میں اوصاف کے لحاظ سے جماعت بندی	مُعَلِّم الانبیاء
32		13	اہل علم کا اخروی مقام	نبوت اور طبیعت
32		13	تجلیاتِ قرآن کریم کے ظہور کے ترتیب	نبوت اور بچپن کا دور
33		15	قرآن کریم کتابِ انقلاب	خاندانی ذرائع علم کے انقطاع سے امت کا تحفظ
34		17	عورتوں میں انقلاب	قومی ذرائع علم کے انقطاع سے امت کا تحفظ
36		18	قرآن کریم کا برزخ میں انقلاب	حلِ بعثت کے لحاظ سے امت کا تحفظ
37		18	انقلابِ عظیم	اُمیت نبوت کی سب سے بڑی دلیل
38		19	صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انقلاب کا نقشہ	وحی اور عقل کا فرق
38		19	انقلابِ شر	نبی کی عقل کی بلندی
38		20	جنات میں انقلاب	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے
21		21	صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قرآن کریم کے انقلاب	وصف امت کو مفاخر کے مواقع پر ذکر کیا گیا
39		21	کی ایک جھلک	جیسی بعثت ویسا علم
40		22	قرآن انقلابِ عظیم کا سرچشمہ	بعثتِ عیسوی کا پس منظر
40		22	صحیح انقلاب کی تناسل میں الٹی زقند	بعثتِ موسوی کا پس منظر
41		22	کتاب انقلاب کا طرزِ تعلیم	بعثتِ نبی اُمی کا پس منظر
41		24	کتاب انقلاب کا طرزِ تربیت	خاتم النبیین علیہ السلام کے لئے کمالِ جامعیت
41		24	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ تعلیم اور حکمتِ عملی	ضروری ہے
42		25	تبریک	نبی اُمی کے دین کا امتیاز
43		25	دُعا	نبی اُمی کے علم کی شانِ جامعیت
44		27	عظمتِ حفظ	راہنمائے انقلاب
44		27	ظلمتِ کدہ میں روشن چراغ	احوال واقعی
44		27	سرچشمہ حیات	کلامِ آثارِ مشکم کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ہے

خطبات حکیم الاسلام — فہرست

71	 علم باطن ہی مورث طمانیت ہے	45	 سیر طاقوتوں کی شکست کی بنیادی وجہ
72	 صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہل اجتہاد	46	 حافظ قرآن کا باطل سے تحفظ
	 اُمت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری	47	 حافظ قرآن کی حیات دائمی ہے
75	 ہے	47	 حافظ قرآن کے والد کی تاجپوشی
76	 صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی تقلید رائج تھی	48	 قرآن حکیم کی ابدی حکومت
77	 اجتہاد و تقلید کی حدود	49	 قرآن کریم کی ابدی آثار کی وجہ
	 اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اس کی واضح	49	 حافظ قرآن کا حق شفاعت
78	 دلیل	50	 ابدی سر بلندی
79	 ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائج بد	50	 عظمت قرآن کریم
81	 اختلاف ائمہ باعث رحمت ہے	50	 نگاہ محبت
84	 مسائل فقہیہ کی تدوین مذہب نہیں ہو سکتی	50	 برکت سے بڑھ کر برکت
85	 مقبوعین فقہ کے لقب ”اہل السنۃ والجماعۃ“ کا ماخذ	52	 آل اطریاحاف کانفرنس سے خطاب
88	 تقلید شخص اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے	52	 شکریہ و تمہید
	 تقلید شخص کون سی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری	53	 تحریر خطبہ کی غرض و غایت
89	 ہے؟	53	 اللہ کا کام اور اس کا کلام
92	 ائمہ کے اختلاف مزاج سے پیدا شدہ مختلف اصول	53	 تکوین و تشریح کا مبداء و معاد واحد ہے
93	 امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ کی چنداں مسئلہ	54	 تکوین و تشریح کے اصول بھی ایک ہیں
	 عدم تقلید یا تقیصین میں دائر ساز رہنے کے چند واضح	56	 ایجاد اور اجتہاد
100	 مفاسد	56	 اجتہاد کی انواع
103	 سلف میں تقلید معتین عام تھی	57	 مجتہد کا کام حقیقت ری ہے
113	 اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام	58	 شریعت حد درجہ مرتب اور منظم ہے
114	 میری سب سے بڑی عزت و سعادت	59	 تنظیم شریعت کی چنداں مسئلہ
115	 تذکیر قدیم	62	 انکشاف علوم میں نبی اور امتی کا فرق
115	 اجمالی پیغام	63	 نصوص کتاب و سنت کا ظہر و بطن
115	 پیغام اور اس کی نمبر وار دفعات	66	 علماء شریعت کے دو طبقات اہل ظاہر اور اہل باطن
116	 اسباب غلامی	68	 صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں اہل علم کے دو طبقات
117	 علم کی کتابی		 ملکہ اجتہاد وہی ہے کسی نہیں اور بعض اس کے اہل ہیں
118	 حیثیت عربی کی بربادی	69	 اور بعض نہیں

137	اقتصادی تباہی.....	119	طرز نبوت اپنانے کی ضرورت.....
	خارجی تعلقات سے محرومی.....	119	قوت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے
138	برطانیہ کا طرز عمل.....	121	دالوں کا انجام.....
140	مسلمانوں کا نظام تعلیم برباد کرنے کی برطانوی		جہد مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں.....
142	سازش.....	121	مطالبہ آزادی کے ساتھ تبلیغ کی ضرورت.....
	برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ.....	121	فرعونان وقت کو قیادت موسوی ہی شکست دے سکتی
143	ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی حمایت سے محروم		ہے.....
145	رکھنے کے لئے برطانیہ کا گھناؤنا کردار.....	123	اسلام میں آزادی کی غرض و غایت.....
146	آزادی پسند مسلمانوں کو بدنام کرنے کی اسکیم.....	123	مطالبہ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے..
148	بنیادی مسئلہ.....	124	اسلامی آزادی کے دور راستے.....
150	[3] جدوجہد آزادی ایک مذہبی فریضہ.....	125	[17] مطالبہ آزادی میں اعجازی جہت کی ضرورت..
152	[4] حصول آزادی کا پروگرام.....	125	[18] انتخاب امیر اور تشکیل مرکزیت.....
152	برطانیہ کا جمہوری استبداد.....	126	[19] صفات قیادت.....
154	[5] پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت.....	127	صلاح قیادت سے روگردانی کی پاداش.....
155	[6] غاصب قوم سے حکم جہاد.....	127	مخلوط معاشرہ میں جمعیت مسلمہ کے دواصول.....
156	عدم تشدد کے ذریعہ احتجاج.....	128	غیر مسلم سے اشتراک عمل.....
156	[7] عدم تشدد کے پانچ ہتھیار.....	129	ہمہ گیر مقصد کے حصول کا طریق کار.....
	یورپ کی غلامی سے نجات کا استہ.....	129	باہمی ربط و تعاون کی بنیاد اتحاد مقصد اور تقسیم عمل پر
157	اشتراک عمل کی ضرورت.....	130	ہونی چاہئے.....
157	[8] معیار قیادت.....	130	جمعیت العلماء کا شرف و امتیاز.....
158	[9] مذاکرات کی بنیاد.....	131	افہام و تفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت.....
159	[10] حکومت اور قوم سے افہام و تفہیم کی ضرورت.....	131	حصول آزادی کا مختصر اپروگرام.....
161	[11] شعار قیادت.....	132	سیاست شریعہ کی عظمت.....
163	اقتدار کے فرعون سے طرز گفتگو.....	133	تکمیل انسانیت.....
163	[12] بلند بانگ دعوؤں کی ممانعت.....	134	تقریب تکمیل.....
163	[13] مسلم قیادت کا اولین فرض.....	135	ابتداء اور تکمیل پر خوشی.....
164	قیادت علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے.....	135	تکمیل پسندامت.....
164	[14] ترجمان رسالت حامل معرفت ہونا چاہئے.....	136	عالم بشریت کی طفولیت اور اس کا ابتدائی علم.....

ابتدائی عبادت.....	164	حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تاریخ
عالم بشریت کا دوسرا دور اور اس کا علم.....	165	اسلام کی ایک زندہ جاوید شخصیت
عالم بشریت کا تیسرا دور اور اس کا علم.....	165	موضوع تقریر
دوسرا دور اور اس کا علم.....	166	انگریزی اقتدار کا تسلط اور مسلمانوں کی شکست
احکام کی حقیقت کا دور.....	166	ہندوستانی انقلاب کی ضرورت
دور نبوی (علیہ السلام) اجتہاد انسانیت کا دور.....	166	ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی
امت محمدیہ میں آثار نبوت.....	166	مدارس عربیہ کی معنوی بنیاد
شرائعِ اصلیہ اور وضعیہ.....	167	خلافتِ ترکی کی تائید
عالم بشریت کا شباب.....	168	فکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے تین بنیادی عناصر
عالم بشریت کی طفولیت کے لئے اندازِ تعلیم.....	169	حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دورہ یورپ کی تمنا
عالمِ بشریت کے لئے اندازِ تعلیم.....	169	افاداتِ علم و حکمت
عالم بشریت کا بڑھا پاقوت فکر یہ کا ازدیاد.....	170	احوالِ واقعی
بڑھاپے میں علم کی وسعت.....	170	مزاراتِ اولیاء پر حاضری اور علماء دیوبند
بوزہی اُمت پر بارِ عمل کی کمی.....	171	مانعینِ زیارتِ قبور سے جنگ
تکمیلِ دین.....	171	زیارتِ قبور کے لئے سفر
انتہاء زیادہ خوشی کی چیز.....	171	تقظیمِ جائز اور عبادتِ ناجائز
تمنائے انتہاء.....	172	اسماءِ شریکہ سے احتراز
یومِ تکمیل کا انتخاب.....	172	تقظیمِ اولیاءِ کرام
ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز.....	173	جزءِ عبادت بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں
علوم و شخصیات کے مراتب.....	174	قیام و سجدہ کی ممانعت
تہریک.....	174	سجدہ قبر کی ممانعت
حسنِ طلب نہیں بیانِ واقعہ.....	174	دردِ شریف کی عمومیت کی حکمت
حُسنِ نیت کے ثمرات.....	174	آدابِ زیارتِ قبور
اخلافِ صدق کا وعدہ.....	174	وہابی اہلِ نجد کا عقیدہ
معیارِ انتخاب.....	175	زیارتِ روضہ اطہر کی نیت سے سفر
عوام کے لئے حجت.....	176	علماء دیوبند کے خلاف بے جا اشتعال
اتحادِ علماء کی ضرورت.....	176	ایصالِ ثواب کی ممانعت کا الزام
طلبِ صادق.....	177	انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ برزخی

205		191	حق پسندی		علامات حیات
206		192	انداز تحریر		استدلال حیات
207		193	نظم و شعر		نذرو نیاز یا ایصال ثواب
208		194	سیاسی خدمات		مشرکانہ نذرو نیاز
208		194	خراج تحسین		ذبیحی کا مزدگی
208		195	تعمیل حکم		ہدیہ ضیافت یا صدقہ ایصال ثواب
		195			ایصال ثواب کے لئے ایام کی تخصیص
		196			دوام و التزام کا فرق
		197			مشابہت سے احتراز
		197			چہلم، برسی ہند و اندرسم ہے
		197			برصغیر کے مسلمانوں میں رسوم کی پابندی کی وجہ
		198			ہندو مسلم اختلاف کے اثرات
		198			دین اور رواج کا امتیاز
		199			حاصل کلام
		199			ایصال ثواب کا تعلق نیت سے ہے
		200			ایصال ثواب کا صحیح طریقہ
		200			علم غیب کا تنازع
		201			علماء دیوبند کا عقیدہ
		201			علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ
		202			علمائے دیوبند کا دعویٰ
		202			نماز کے بعد مصافحہ
		203			نماز کے بعد دعاء ثانیہ
					حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ شخصیت و
		203			کردار میری سعادت
		204			ذوق علم کا رنگ
		204			تقریر و بیان کا رنگ
		205			طرز تدریس
		205			کمال اخلاق

نبی اُمّی علیہ السلام

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
 إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
 وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا . صَلَّى اللّٰهُ
 تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ ! فَاغْوِذْ بِاللّٰهِ مِنَ
 الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ . ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو
 عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ ①

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ

تمہید..... بزرگانِ محترم! آپ اس مقدس مجلس میں سیرت سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور سیرت کس کی؟ میری
 یا آپ کی نہیں یا مطلقاً انسان کی نہیں..... بلکہ عالم بشریت کے سردار اور آقائے دو جہاں جناب رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم کی ”سیرت پاک“ سننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

حضور علیہ السلام کی سیرت ظاہر ہے کہ آپ نبوت کی حیثیت سے سنا چاہتے ہیں یعنی حضور علیہ السلام میں ایک
 حیثیت بشر اور انسان ہونے کی ہے اور ایک حیثیت پیغمبر اور رسول ہونے کی ہے، آپ محض انسانی سیرت سننے کے لئے
 نہیں آئے بلکہ ”پیغمبرانہ سیرت“ سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ گویا نبوت کی سیرت آپ کا مقصد ہے۔ اور ظاہر ہے کہ
 نبوت کی سیرت اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی کہ کچھ تھوڑا بہت نبوت کا مفہوم آپ کے سامنے آجائے۔ جب آپ نبوت
 کو کسی حد تک سمجھ لیں گے تو پھر نبوت کی سیرت خود بخود سامنے آجائے گی۔ اسی بنا پر میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔

موضوعِ تقریر..... اس میں حق تعالیٰ شانہ، نے پہلے حضور علیہ السلام کی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کے بعد
 ”نبوت کی دلیل“ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ”جزائے نبوت“ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس
 کے بعد ”مقاصد نبوت“ بیان کئے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے کچھ اجزا ہوں گے۔ ایک دعویٰ نبوت، ایک نبوت کی
 دلیل، ایک نبوت کا تجزیہ کہ اس کے اجزا کیا کیا ہیں اور کن کن چیزوں پر نبوت مشتمل ہے۔ نبوت کی حقیقت

کیا ہے؟۔ اور پھر نبوت کے دنیا میں آنے کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟۔ یہی چند اجزا ہیں جو اس وقت تقریر کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوع اس آیت کا بھی ہے۔ تو تقریر درحقیقت اس آیت کی توضیح اور اس کی تشریح ہوگی، آیت بہت سے علوم پر مشتمل ہے اور ہم جیسوں کا کام نہیں کہ ان علوم اور ان معارف کو بیان کر دیں یا بیان کا حق ادا کر دیں۔ لیکن بالا جمال تھوڑا تھوڑا ان تمام موضوعات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

دعویٰ نبوت اور دلیل نبوت..... پہلی بات دعویٰ نبوت ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے خود دعویٰ کیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا﴾ ① اللہ وہ ذات ہے جس نے اُمّیوں میں رسول بھیجا۔ ان پڑھوں میں رسول بھیجا۔“ تو بعثت کا دعویٰ یہی درحقیقت دعویٰ نبوت ہے۔ اللہ جس کو بھیجتا ہے وہ نبی ہوتا ہے رسول ہوتا ہے۔ یہ تو گویا ایک دعویٰ ہوا کہ ہم نے ایک رسول بھیجا، لیکن رسالت کی دلیل کیا ہے؟ جو ذات مقدس آئی اور جس کے لئے اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اپنا رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول ہوں: ﴿قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ ② اے انسانو! خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، کسی قوم کے فرد ہوں آج کے ہوں یا آئندہ قیامت تک کے ہوں۔ میں ان سب کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تو اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔

اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت تسلیم کی جائے؟ وہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ: اُمّیوں میں اُمّی رسول آیا، یعنی ان پڑھوں میں ایسا رسول بھیجا جو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ یہ ان پڑھ ہونا درحقیقت نبوت کی دلیل ہے۔ آپ سوال کریں گے کہ ان پڑھ ہونا تو بظاہر عریب کی بات ہے۔ اگر ہم کسی پڑھے لکھے کو یوں کہہ دیں کہ تم ان پڑھ ہو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تو وہ اپنی توہین محسوس کرے گا ان پڑھ ہونا یا بے پڑھا لکھا ہونا بظاہر تو کوئی کمال کی چیز نہیں ہے، عرف عام میں اسے حقیر سمجھا جاتا ہے، عیب سمجھا جاتا ہے اور یہاں اتنے بڑے منصب کے لئے یہ دلیل بیان کی جا رہی ہے کہ جس منصب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی منصب نہیں ہے۔ آخر اس دعویٰ میں اور دلیل میں ربط کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پڑھ ہیں اور عالم میں سب سے زیادہ بڑے ہیں؟ تو میں کہتا ہوں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پڑھا لکھا ہونا ہی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ عالم بشریت میں اونچے اور سارے انسانوں میں مقدس ترین انسان ہیں۔ اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم سیکھنے کے لئے نہیں آتے سکھانے کے لئے آتے ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی استاد نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اور مخلوق کو دیتے ہیں۔

تو پیغمبر کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔ صرف حق تعالیٰ ان کے استاذ ہوتے ہیں۔ پھر وہ دنیا کو اپنا شاگرد بناتے ہیں اور تلمیذ بناتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے کے لئے آتے ہیں، علم لینے کے لئے نہیں آتے۔

① پارہ ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیہ ۲، ② پارہ ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ ۱۵۸۔

نبوتِ انسانیت کے لئے ذریعہ علم..... اسی واسطے کوئی بھی علم ایسا نہیں ہے جس کی بنیادیں پیغمبروں نے قائم نہ کی ہوں۔ یعنی آخرت کا علم ہو معاد کا علم ہو، مبداء کا علم ہو، معاشیات کا ہو، اقتصادیات کا ہو، عمرانیات کا ہو، غرض کوئی بھی علم ہوسب کی بنیادیں انبیاء علیہم السلام نے قائم کی ہیں۔ پہلے تو میں اپنے ذہن میں ایک دلیل سمجھا کرتا تھا کہ شاید میرا مفہوم ہو اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں سب انسانوں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ اٰخَرَجَكُم مِّنْ بُطُنٍ اُمِّهِمْ لَعَلَّكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ ① ”اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حال میں کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے۔“ تو انسان دنیا میں بے علم آتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی علم لے کر نہیں آتا۔ جاہل پیدا ہوتا ہے۔ ﴿لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ عربیت کے قاعدے کے مطابق یہاں نکرہ نفی کے نیچے آ رہا ہے، جس کے معنی غموم کے ہوتے ہیں کہ ذرہ برابر بھی انسان علم نہیں رکھتا، جب آتا ہے تو ایک مضعہ گوشت ہوتا ہے نہ اس میں شعور ہے نہ عقل نہ علم ہے صرف حس ہے۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں: ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّوْذِ الْاٰلٰی اَزْدٰی الْعُمَرٰی لِكٰی لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ ② پھر ہم تمہیں ایک ایسی عمر کی طرف لوٹاتے ہیں جو ارذل ترین عمر ہے کہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود پھر تم بے پڑھے لکھے ہو جاتے ہو، علم کے باوجود پھر بے علم بن جاتے ہو۔

جب انسان انتہائی بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے تو آج قوت حافظہ رخصت ہوگئی تو پہلا علم ختم ہو گیا۔ حواس میں خلل آ گیا تو جدید علم آنے کی صورت نہ رہی کہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے تو پچھلا سرمایہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور آئندہ کے آنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ تو جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ گویا اعلان کرتے ہیں کہ جب تم آئے تھے تو اس وقت بھی عالم نہیں تھے اور جب جارہے ہو تو جب بھی نہیں۔ تو علم تمہارا ذاتی نہیں، اگر تمہارا ہوتا تو ماں کے پیٹ سے آتا اور قبر کے پیٹ تک ساتھ جاتا۔ علم ہمارا ہے، جتنے زمانے تک ہم چاہتے ہیں تمہارے اندر ڈال دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔ تو کسی انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ تو جب سارے انسان ایسے ہی فرض کر لئے جائیں تو عالم انسانیت میں علم نہ رہا تو سرچشمہ علم کا اللہ کی ذات نکلتی ہے۔

علوم و نبیوی کا ذریعہ بھی نبوت ہے..... اس واسطے کہ انسان جانوروں سے تو علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ کم رتبہ ہیں نباتات، جمادات سے حاصل نہیں کرتا، وہ جانوروں سے بھی کم حیثیت ہیں۔ تو ماتحت اور ارذل سے علم حاصل نہیں کیا جاتا۔ افضل سے حاصل کیا جاتا ہے، تو انسان کے اوپر جو افضل ذات ہے وہ تو اللہ ہی کی ذات ہے تو سوائے اس کے کہ خدا سے انسان میں علم آئے اور کوئی شکل نہیں اور خدا سے علم آنے کی صورت یہی ہے کہ کچھ مخصوص بندے ایسے ہوں جن کو براہ راست اللہ میاں اپنا علم سکھائیں۔ وہی حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ تو ہر علم لوگوں کو پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے آ سکتا ہے۔ تو پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا ہی مفہوم ہو گا مگر بعد میں دیکھا کہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے جلیل القدر عالم ہیں نے ”ملل و نحل“

میں دعویٰ کیا ہے کہ: ”تمام علوم معاش کے ہوں یا معاد کے۔ سب انبیاء لے کر آئے ہیں۔“

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام پر لغت کا علم اتر افرمایا گیا: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ① حضرت ادریس علیہ السلام پر ہندسہ اور ریاضی کا علم اتر افرمایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے صنائع کا علم سکھایا۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ: كَانَ بَعْضُ الْأَنْبِيَاءِ يَخْطُ خَطًّا بعض انبیاء خط کشی سے خطوط سکھاتے تھے۔ یا تو لکھنا مراد ہے کہ لکھنا ان سے چلایا خط کشی کا علم مراد ہے کہ خطوط کھینچ کر آئندہ کے بارے میں باتیں بتلانا اور قواعد سے ان کا استخراج کرنا جس کو رمل اور جفر کا علم کہتے ہیں۔ بہر حال مختلف قسم کے علوم احادیث میں آتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں اور سب کے استاذ حق تعالیٰ شانہ ہیں۔

مُعَلِّمُ الانبیاء..... اس لئے قرآن میں جہاں بھی پیغمبروں کے علم کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہاں انہوں نے معلم اپنے آپ کو ظاہر کیا: حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ② ”اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ناموں کا علم سکھلادیا“۔

حضور علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ، وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ ③ ”اے پیغمبر! اللہ ہی نے تمہیں علم دیا، تم پہلے سے نہیں جانتے تھے؟ فرمایا گیا: ﴿مَا كُنْتُ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ ④ ”اے پیغمبر! تمہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں۔ ایمان کیا چیز ہوتی ہے لیکن ہم نے تمہارے قلب میں نور ڈالا، جس سے تم پر یہ تمام چیزیں روشن ہو گئیں۔ تو ہم ہیں ہدایت کرنے والے۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ تو کہتے ہیں: ﴿رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ﴾ ⑤ ”اے میرے پروردگار! آپ ہی نے مجھے مصر کی سلطنت عطا کی اور آپ نے ہی مجھے خواب کی تعبیر کا علم بخشا“۔ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا﴾ ⑥ ”ہم نے خضر علیہ السلام کو علم فراست سکھلادیا تھا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کہتے ہیں: ﴿عَلَّمَنَا مَنَظِقَ الطَّيْرِ﴾ ⑦ ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم سکھلادیا۔ اور یہ اللہ نے ہم کو سکھلایا۔

تو یہ تمام علوم جو انبیاء علیہم السلام میں آئے۔ ظاہر ہے کہ نہ انہوں نے کسی کالج میں تعلیم پائی، نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری ان کے ہاتھ میں تھی۔ براہ راست اللہ کی تعلیم تھی اور پیغمبر شاگرد تھے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے اور سکھانے کے لئے آتے ہیں۔ سیکھنے کے لئے نہیں آتے۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ③ پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۱۳.

(٢) پارہ: ٢٥، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ ٥٢. (٥) پارہ: ١٢، سورۃ یوسف: الآیۃ: ١٠١.

٥) پارہ: ۱۵، سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۶۔ ۷) پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔

نبوت اور طبیعت انبیاء علیہم السلام کی فطرت پیدا کئی طور پر منور ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جدھر علم اور کمال ہو۔ نقص اور عیب کی طرف پیغمبر کی طبیعت فطرۃً نہیں چلتی۔

سیر کی روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب پانچ سال کی عمر کے ہوئے تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں پڑھنے کے لئے مکتب میں بھیج دیا۔ مکتب میں جا کے شاگردوں کی لائن میں بیٹھ گئے۔ تو استاذ نے کہا کہ: کہو ”الف“۔ فرمایا: الف کے معنی کیا ہیں۔؟ استاذ نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: کیا تو مہملات کی تعلیم دینے بیٹھا ہے۔ استاذ نے کہا کہ: کیا الف کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: معنی نہ ہوتے تو اسے شی کیوں کہتے؟ بے معنی چیز کا وجود نہیں ہوتا، جو چیزیں علم کا سرچشمہ ہیں اگر وہی علم سے تعلق نہ رکھیں تو پھر علم کہاں سے آئے گا؟ انہی حروف سے تو علم پیدا ہوتا ہے۔

استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ بچہ کہاں سے آگیا ہے، اس نے مجھے ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ: کیا تو جانتا ہے کہ الف اور ب کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا، ہاں میں جانتا ہوں۔ پوچھا کیا معنی ہیں، فرمایا ایسے تھوڑا ہی بتلاؤں گا۔ استاذی کی جگہ چھوڑ اور شاگردی کی لائن میں آ، اور میں تیری جگہ بیٹھوں۔ اس کو اٹھایا اور اٹھا کر شاگردوں کی جگہ بٹھایا اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔ پھر الف سے جو توحید کے مضامین اور حقائق بیان کرنے شروع کئے ہیں تو استاذ بھی حیران تھا اور مکتب والے بھی حیران تھے کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔

غرض انبیاء علیہم السلام طبعی طور پر اور فطری طور پر علم کی طرف چلتے ہیں۔ یہ ان کی طبیعت ہے۔ باوجود یہ کہ فلاسفہ یہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے۔ طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں، شعور نہیں ہوتا، مثلاً آپ کو بھوک لگتی ہے، یہ ایک طبعی جذبہ ہے لیکن آپ دلیل سے بھوک نہیں لگاتے۔ طبیعت خود بخود ابھرتی ہے، پیاس لگتی ہے تو دلائل سے نہیں لگتی۔ آپ یوں نہیں کہتے کہ چونکہ یہ وجہ ہے۔ لہذا مجھے پیاس لگنی چاہئے، بلکہ بلا دلیل پیاس لگتی ہے، اس لئے کہ طبعی جذبہ ہے۔ بلکہ اگر پیاس اور بھوک لگی ہوئی ہو اور دلائل سے ثابت کیا جائے کہ ہرگز پیاس نہیں لگ سکتی۔ تب بھی نہیں رکے گی۔ آپ جتنی چاہیں دلیلیں بیان کریں۔ وہ تو طبیعت سے ابھر رہی ہے۔ تو طبیعت جذبات کا سرچشمہ ہے۔ طبیعت سے شعور اور علم نہیں پیدا ہوتا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بھی شعور کی طرف چلتی ہے۔ عقل تو بڑی چیز ہے، ان کی طبائع میں شعور ہوتا ہے۔ طبعی جذبات خود عاقلانہ ہوتے ہیں۔

نبوت اور بچپن کا دور آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے واقعات قرآن کریم میں سیارات کے بارے میں بیان فرمائے گئے ہیں تو ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے کے اندر لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے۔ اب گہوارے میں لیٹا ہوا بچہ، عقل تو بڑی چیز ہے، اس کی تو طبیعت بھی پختہ نہیں ہوتی۔ مگر گہوارے میں لیٹے ہوئے جب دیکھتے ہیں کہ کچھ روشن چیزیں سامنے آئیں۔ تو طبعاً انسان روشنی کی طرف بڑھتا ہے، ظلمت کی طرف نہیں جاتا اسے چاندنا اور روشنی محبوب ہوتی ہے، تار کی محبوب

نہیں ہوتی، اور طبعی طور پر یہ بھی تمام انسان جانتے ہیں کہ روشنی ظلمت سے برتر ہے۔ اس لئے اس کی طرف کشش ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ ① یہ پروردگار معلوم ہوتا ہے جو اتنی چمک دمک کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں رفعت و بلندی اور اونچائی بھی ہے اور روشنی بھی ہے۔ تو جس میں رفعت و عظمت اور نورانیت ہو۔ بس وہ رب ہوگا۔ تو فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ لیکن جب ستارے طلوع ہو کر بالآخر غروب ہونا شروع ہوئے تو فرمایا: ﴿لَا أُحِبُّ الْآفَلِينَ﴾ ② ڈوبنے والی چیز رب اور خدا نہیں ہو سکتی۔ جو چیز وجود پائے اور پھر وہ زائل ہو جائے، یہ شان رب کی نہیں ہے۔ اس کے بعد چاند نکلا فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ یہ رب ہوگا اس لئے کہ یہ تمام ستاروں سے بڑھ گیا ہے۔ اس ایک نے وہ روشنی کی کہ سارے ستارے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ تو فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ ”یہ میرا رب ہوگا۔“ ﴿فَلَمَّا أَفَلَ لَمِنَ لَيْلٍ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَتُكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ﴾ ③ جب وہ اپنی چمک دمک دکھا کر گرم ہو گیا اور نیچا پڑ گیا اور آنکھوں سے چھپ گیا۔ تو فرمایا کہ یہ بھی میرا رب نہیں ہو سکتا۔ بس اب تو اگر میرا رب ہی مجھے ہدایت نہ دے تو معلوم نہیں میں کس کس چیز کو رب سمجھتا ہوں گا۔

اس کے بعد آفتاب نکلا جس نے پوری دنیا کو جگمگا دیا، جس رات کو لاکھوں کروڑوں ستارے مل کر زائل نہیں کر سکتے تھے کتنا ہی چاندنا کیا مگر رات ہی رہی۔ سورج کی ایک کرن نکلی اور رات غائب ہو گئی۔ اور کرن بھی ابھی نہیں نکلی، وہ تو صبح صادق ہوئی جیسی رات بھاگتی شروع ہو جاتی ہے بہر حال جب سورج نکلا تو اس کی چمک دمک دیکھ کر فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ﴾ ”یہ بڑا رب معلوم ہوتا ہے۔“ ﴿فَلَمَّا أَفَلَكَ قَالَ يَتَقَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ط﴾ ④ جب وہ بھی اپنی چمک دکھا کر اور پورا عروج پا کے گرنے لگا اور زوال کے طرف چلا، عصر کے وقت اس کا چہرہ فق ہونے لگا۔ روشنی ماند پڑ گئی اور بالآخر منہ چھپا کے رخصت ہوا تو فرمایا: ”ان تمام چیزوں کو رب ماننا درحقیقت شرک میں مبتلا ہونا ہے۔ میں ان چیزوں سے بری ہوں جن میں تم شرک کرتے ہو اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو میں اس شرک کا ساتھی نہیں۔“

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے میں لیٹے ہوئے بچپن کی حالت ہے اور آسمان کے حقائق میں غور فرما رہے ہیں اور خدا کی بڑائی اور اس کے وجود پر استدلال کر رہے ہیں، اگر مفسرین کا یہ قول مان لیا جائے کہ آپ گہوارے میں ہیں اور مہدی کی حالت میں ہیں تو اس سے یہ مدعا ثابت ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بالطبع علم کی طرف چلتی ہے وہ پالکے میں ہوتے ہیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ مکتب میں پہنچا دیئے جائیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے ہیں تو بعض روایات میں پیدائش کی کیفیت آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس شان سے پیدا ہوئے، نگاہیں آسمان کی طرف تھیں اور شہادت کی انگلی

انھی ہوئی تھی۔ گویا توحید کا اعلان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ گویا طبعی چیز ہے۔ لیکن طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جو حقیقت ہے، گویا انبیاء علیہم السلام کی طبیعت حقائق کی طرف جاتی ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ ① حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بچپن تھا کہ ہم نے حکم دیا۔ یعنی علم اور معروف لدنی اور کمالات ربانی عطا کر دیئے گئے حالانکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بھی بچپن تھا اس لئے بعض علماء نے تو دعویٰ کیا ہے کہ سنت اللہ سے مستثنیٰ کر کے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت بھی دے دی گئی۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام کی طبیعت پیدا انشی طود پر پاک ہوتی ہے۔ وہ نیکی ہی کی طرف چلتی ہے۔ کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ ہمیشہ خیر کی طرف اور علم و شعور کی طرف بالطبع چلتی ہے۔ بہر حال پیغمبر دنیا میں آ کر کسی سے سیکھتے نہیں، کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کرتے نہ کسی مدرسہ میں جا کر پڑھتے ہیں، ان کے معلم براہ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی اور ان پڑھ تھے یعنی کسی مدرسہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں پائی۔ کسی استاذ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سیکھا ہی نہیں۔

خاندانی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ..... پھر ساتھ میں یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمّی اور بے پڑھے لکھے تھے۔ لیکن پڑھنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اولاد کو تعلیم دیا کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ خود بچہ اپنے طور پر تعلیم کی طرف نہیں جاتا:

طفل بملتب نمی رود و لے ورنش

بچہ مکتب کی طرف خود نہیں جاتا اسے زبردستی بھیجا جاتا ہے، بعض اوقات ماں باپ مار پیٹ کے بھیجتے ہیں۔ بہر حال باپ کا فرض ہوتا ہے کہ بچے کو تعلیم دلائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے باپ کو اٹھا لیا گیا کہ ہمارے پیغمبر پر یہ تہمت ہی نہ آئے پائے کہ باپ نے تعلیم دلا دی ہوگی۔ اس سے امیت اور زیادہ مضبوط ہوگئی کہ خود بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتے اور جو پڑھنے لکھنے کا ذریعہ تھا، باپ۔ وہ پہلے ہی اٹھا لئے گئے۔

اب یہ ہو سکتا تھا کہ ماں تعلیم دلائے اور ایسا ہو سکتا ہے، جو دانش مند ماں ہیں، اگر باپ دنیا سے رخصت ہو جائے اور وہ باپ کے قائم مقام ہو کے تعلیم دلاتی ہیں اور بعض دفعہ بچے کی تعلیم و تربیت میں باپ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ علماء اسلام میں ایک بڑے جلیل القدر عالم اور امام ہیں۔ جن کا نام نامی امام ربیعہ ہے، سلف صالحین میں مشہور ہیں۔ ربیعۃ الزائے ان کا لقب ہے۔ یہ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ کو اتفاق سے سفر پیش آ گیا، اس زمانے کا تجارتی سفر تھا۔ آج کے وسائل سفر تو مہیا نہ تھے کہ موٹروں میں بیٹھے اور پہنچ گئے۔ ریلوں میں بیٹھے گئے اور ہزاروں میلوں کے سفر کی مسافت طے کر لی۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے اور ہزاروں میل گھوم لئے پھر تو تھا

ہی نہیں وہی اونٹوں کا سفر تھا۔ بہت زیادہ ہوئے گدھے پر سوار ہو گئے اور تیز چلے گھوڑا مل گیا۔

اس طرح سے سفر کرتے تھے۔ غرض امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو سفر پیش آیا، تجارتی سفر تھا اور سفر بھی لمبا چوڑا۔ دس برس لگ جائیں، بیس برس لگ جائیں تو خود ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد نے ربیعہ کی والدہ سے کہا کہ: مجھے سفر درپیش ہے۔ تجارت کا سفر ہے اور کئی ملکوں میں جانا ہے۔ بہت ممکن ہے مجھے دس بارہ برس لگ جائیں تو بیس ہزار روپیہ اپنی بیوی کو دیا۔ دس پندرہ برس مجھے آنے میں لگ جائیں تو اس سے اپنا خرچ چلاتی رہنا اور اس کا حساب رکھنا۔ چنانچہ یہ دے کر رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے چار پانچ ماہ بعد امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ جب ان کی چار پانچ برس کی عمر ہوئی تو ماں نے انہیں مکتب میں بٹھلادیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے مستقل استاذ مقرر کر کے اور ان کی تنخواہ مقرر کی اور رقم خرچ کرنا شروع کر دی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت جید عالم بنے۔ حافظ بنے، محدث بنے، مفسر بنے اور فقیہ و مفتی بنے حتیٰ کہ بارہ برس کی عمر میں فتویٰ انہیں سپرد کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ (رَآدَهَا اللَّهُ شَرَفًا وَ كَرَامَةً) کی مسجد نبوی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفِ تَحِيَّۃً وَسَلَامٌ) میں ان کا درس شروع ہوا۔ بڑے بڑے حلیل القدر علماء ان کے درس میں آکر بیٹھتے تھے۔ خود یہ لڑکے۔ ابھی ڈاڑھی بھی نہیں نکلی۔ مگر بڑے بڑے علماء ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے لگے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا شہرہ اور چرچا ہوا۔ تقریباً پندرہ برس کے بعد ان کے باپ لوٹے۔

جب گھر پہنچے تو امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ گھر میں تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہو گئے تھے، قد و قامت تھا۔ باپ نے دیکھا کہ ایک اجنبی مرد میرے گھر میں گھسا ہوا ہے۔ باپ کو آیا غصہ۔ اس نے کہا کہ: تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا ہے؟ بیٹا، باپ کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہا: کم بخت! تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا چلا آ رہا ہے؟ باپ بیٹے میں سر پھنسل شروع ہوئی۔ وہ اسے کہتا کہ تو اجنبی مرد میرے گھر میں کیوں آیا ہے؟ اور بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے۔

آوازیں جو بلند ہوئیں تو ماں نے اندر سے سنا۔ جھانک کر دیکھا تو پہچان گئی کہ میرا خاوند آ گیا ہے۔ جلدی سے آکر بیچ پچاؤ کیا اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کو اشارہ کیا کہ تم باہر چلے جاؤ اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے باپ کے غصہ کا یہ عالم کہ بیوی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا کہ یہ کون مرد تھا جو گھر میں گھسا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ: تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں سب کچھ سمجھاؤں گی۔ خیر بمشکل تمام سمجھند گیا مگر وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کون تھا؟ اور اتنے ہی یہ سوال کیا کہ جو روپیہ میں دے گیا تھا۔ اس کا حساب دے۔ اس نے کہا کہ میں روپیہ لے کر بھاگ نہیں جاؤں گی۔ حساب بھی آپ سن لیں اور اس شخص کے بارے میں بھی آپ سن لیں۔ مگر آپ جلدی نہ کریں۔ کچھ دم لیں، بمشکل تمام خاوند کو سمجھند کر کے کھانا دانا کھلایا۔ اور کہا کہ: آپ لباس تبدیل کریں غسل کیا لباس تبدیل کیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت آ گیا۔ کہا مسجد نبوی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفِ تَحِيَّۃً وَسَلَامٌ) میں آپ نماز پڑھا آئیں۔ اس کے بعد

آپ کو سارا حساب سمجھا دوں گی۔

یہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گئے۔ تو نماز کے بعد وہاں ربیعہ الرائے رحمۃ اللہ علیہ کا درس شروع ہوا تو بڑے بڑے اجلہ علماء ان کے سامنے بیٹھے اور اتنا بڑا درس مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی عالم کا نہیں ہوتا تھا جتنا ربیعہ الرائے کا ہوتا تھا۔ تو باپ بیٹھ گیا۔ انہیں کیا خبر کہ یہ میرا بیٹا ہے سنتے رہے، سنتے رہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب درس سے اٹھے تو گھر آئے اور آکر یہ کہا کہ: ”آج میں نے ایک ایسے جلیل القدر عالم کا درس سنا ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا بڑا عالم نہیں دیکھا اور میری روح تازہ ہو گئی۔ میری تمام کدورتیں دھل گئیں میں نے تو ایسا کوئی امام نہیں دیکھا۔ بہت تعریفیں کیں۔“

نبوی نے کہا کہ آپ کے نزدیک ایک اتنا بڑا عالم کتنے روپے میں تیار ہو سکتا ہے؟ کہا کتنے روپے میں؟ اگر خزانے بھی ختم ہو جائیں تو وہ خزانہ ہلکا پڑ جائے گا اور وہ عالم بھاری ہوگا۔ پوری دنیا خرچ کر کے بھی اگر ایسا عالم بنا دیا جائے تو سستا سودا ہے۔ کہا کہ: ”یہی ہے وہ آپ کا بیٹا اور بیس ہزار روپے میں نے اس کے عالم بنانے پر خرچ کئے ہیں۔“ تو نبوی کے ہاتھ چوم لئے۔ اور جب بیٹا آیا تو اس سے معافی مانگی اور بیٹا باپ سے معافی مانگ رہا ہے کہ میری گستاخی معاف کیجئے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ آپ باپ ہیں۔ باپ کہہ رہے ہیں تو عالم کا استاذ ہے تو میرا بھی استاذ ہے، اتنا بڑا عالم ہے۔

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر باپ نہ ہو مگر ماں سلیقہ مند ہو تو وہ بیٹے کو پڑھاتی تھیں۔ ربیعہ الرائے جیسا بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، ماں پڑھاتی۔ لیکن ابھی چند ہی سال کے ہونے پائے تھے۔ کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ وہ سہارا بھی ختم ہو گیا جو علم کا ذریعہ بنتا۔ باپ بھی نہیں رہے، ماں بھی نہیں رہی۔ اب دادا نے اپنی کفالت میں لیا۔ مگر ظاہر ہے کہ دادا پھر ایک واسطہ ہوتا ہے جو لو اپنے باپ کو یا ماں کو لگتی ہے واسطہ کے ساتھ اتنی لو نہیں ہوتی۔ لیکن جتنی بھی لگتی ہے مگر آٹھ ہی برس کی عمر تھی کہ دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ابو طالب کے سپرد کر دیا گیا کہ آپ نگرانی اور تربیت کریں۔ ابو طالب نے عمر بھر نگرانی اور دیکھ بھال کی۔ بہر حال گھرانے میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو تعلیم دے سکتا۔

قومی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ..... اب اگر گھر میں ماں باپ اور دادا بھی نہ ہو کوئی تعلیم دلانے والا نہ رہے لیکن ملک و قوم میں علم کا چرچا ہو، تب بھی آدمی کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ سکتا ہے۔ وہاں ملک بھی جاہلوں کا ملک تھا، دنیا کی قوموں میں ان کا لقب ہی جہلائے عرب تھا۔ یہ بھی کوئی نہیں کہتا تھا کہ: عرب کے دانش مند ہیں۔ عالم نہ کہتے تو دانش مند تو کہتے جہلائے عرب ان کا خطاب تھا اور اس زمانے کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ گویا اوپر سے لے کر نیچے تک قوم پر جاہلیت چھائی ہوئی تھی اگر حضور علیہ السلام کے لئے گھرانے میں کوئی مری نہیں تھا تو ممکن تھا کہ قوم کے اندر کوئی مری بن جاتا۔ کوئی معلم بن جاتا، تو تہمت آ جاتی کہ یہ جتنا علم ہے یہ تو قوم کا سکھلایا ہوا

کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتاب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن ”خیر القرون“ ہوگا۔ ایسی خیر درخیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا غیر مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیریں وابستہ تھیں۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذات اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر اور جب گونا گوں خیریں یکجا اور مجتمع ہو گئی تو خیر الکتاب کا نزول ہوا اور اس کے متعلق فرمایا گیا: ”خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ“ ① تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں۔ جس کتاب کے اندر باہر، ارد گرد، اوپر نیچے اور ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطن خداوندی سے وابستگی..... اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔“ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ ② کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کلام اس سے صادر ہو رہا ہے، سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان و زمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات و برکات مخلوق خداوندی ہیں، مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطن خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے اور کلام خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ ③ اور حدیث شریف میں حبْلِ اللہ کی تفسیر ”الْقُرْآنُ حَبْلُ اللَّهِ“ کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن اللہ کی رسی ہے، جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ ④ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی، تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھینچے آئیں گے اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چپے رہنے والے، باطن حق

① الصحيح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم..... ص ۳۳۸.

② الجامع الكبير للسيوطی حدیث رقم: ۳۳۸۶. کنز العمال، ج: ۱، ص: ۳۲۱.

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

④ الصحيح لمسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب ج: ۱۲، ص: ۱۳۳.

سے وابستہ ہو جائیں گے۔

الفاظ و حروف قرآن کی جنت میں گل و گلزار سے تبدیلی..... بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: ”رَسُلُ وَ اَزْنَتِي“ ① پڑھتا جا اور درجے بڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہو گا وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ یہاں آپ کو جو آیات، الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ و بہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی نکلنے سے گولی چٹختی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا، کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بگلا۔ کاربگر نے صنایع یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا۔ اسی طرح شادی بیاہ میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکر اسسا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صنایع اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی بگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صنایع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صنایع رکھی ہے کہ وہ جب تک عالم آب و گل میں موجود ہیں، خزانہ علم و عرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف و الفاظ، گل و گلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایہ سکون و راحت تھے اور انہیں علم و عرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے، وہی الفاظ اب ان کے لئے جنت نگاہ باغ و بہار اور لعل و جواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پُر بہار اور گہوارہ شادمانی و مسرت بنادیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور و قصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل و جواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ و بہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لا کر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سیٹھے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاة، باب استحباب الترتیل فی القراءة ج: ۴، ص: ۲۶۳۔

عِلْمُ الْاَوَّلَيْنِ وَالْاٰخِرَيْنِ. ① ”اگلوں اور پچھلوں کے علوم بھی مجھے عطا کر دیئے گئے“۔ اتنے بڑے علم کے لئے اتنی بڑی عقل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے ظاہر کرنے کے لئے مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یعنی ایک توحی الہی کے ذریعے پیغمبرانہ کارنامے ہیں لیکن جو خالص عقل سے فیصلے فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور اس سلسلے میں واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے..... چنانچہ اس ذیل میں ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔ جب غزوہ بدر ہوا۔ ادھر سے مسلمان تو تین سو تیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تھے اور ادھر ایک ہزار کا لشکر تھا تو تین سو تیرہ کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا۔ دونوں کے کمپ الگ الگ تھے۔ پہاڑ کے اس دامن میں مشرکین مکہ کا کمپ تھا اور ادھر صحابہ کرامؓ تھے۔ اتفاق سے دشمن کے کمپ کا ایک آدمی صحابہؓ کے کمپ میں نکل آیا مشرکین کا کوئی نوجوان ادھر آ گیا راستہ بھولایا قصد آیا۔ بہر حال ادھر آیا تو صحابہؓ نے اس کو تھام لیا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہوتی ہے کہ دشمن کے کمپ کا کوئی فوجی آدمی آجائے تو فوراً اس کو پکڑ لیا، پکڑ کر اس سے پوچھنا شروع کیا کہ تمہارے کمپ میں کتنے آدمی ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ دشمن کی قوت کا اندازہ کیا جائے۔ تو یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب بھی دو جماعتیں لڑتی ہیں تو ہر ایک چاہتا ہے کہ میں اندازہ کروں کہ دشمن کی طاقت کتنی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ چاہا کہ طاقت کا اندازہ ہو جائے۔ تو پوچھا کہ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں؟ اس نے مرعوب کرنے کے لئے کہا کہ: وَاللّٰہِ لَکَیْضٌ بہت بڑا مجمع ہے، بڑی جمیعت ہے، پھر پوچھا۔ دباؤ ڈال کر پوچھا۔ سختی سے پوچھا۔ مگر اس نے تٹا کے نہیں دیا۔ بس یہ کہتا رہا۔: وَاللّٰہِ لَکَیْضٌ خدا کی قسم بہت بڑا مجمع ہے۔

غرض پوچھنے میں ناکام ہو گئے۔ اس میں جو کچھ آوازیں بلند ہوئیں تو حضور علیہ السلام اپنے خیمہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: یہ شور کیسا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مشرکین میں سے ایک شخص ادھر آ گیا ہے۔ ہم اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تمہاری طاقت کتنی ہے یہ بتا کے نہیں دیتا۔

فرمایا: اسے چھوڑ دو! کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کرتے ہو؟ اس کو چھڑوا دیا۔ اس نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تو دو منٹ کے بعد پوچھا کہ: تمہارے لشکر میں اونٹ کتنے ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔ فرمایا: ایک ہزار آدمی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ایک اونٹ کو سو آدمی کھا سکتے ہیں اور دس اونٹ روزانہ ذبح کرنا تیار رہا ہے کہ یہ اس کی دلیل ہے کہ ایک ہزار آدمی ہیں۔

غرض وہ بات جو سب مل کر حل نہ کر سکتے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں حل کر دی۔ یہ وحی سے نہیں بتلایا، عقل سے بتلایا۔ محض تدبیر اور دانش سے بتلایا۔ یہ ایک تجربہ اور اندازہ سے بتلایا۔ بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مصفیٰ بھی بہت اونچی تھی اور علم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اونچا تھا ہی۔ حدیث میں ہے کہ

① حدیث کی تخریج گزشتہ جگہ ہے۔

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ: میرا پڑوسی مجھے بہت زیادہ ستاتا ہے۔ میں عاجز آ گیا ہوں میں نے متیں کیں خوشامدی کیں، ہاتھ جوڑے، مگر وہ باز نہیں آتا اور ہر طور پر مجھے ستاتا ہے۔ اب میں کیا کروں عاجز ہو گیا ہوں، حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تدبیر میں مبتلا ہوں اور وہ یہ کہ اپنے گھر کا سارا سامان نکال کر سڑک کے بیچ میں رکھ دے اور اس کے اوپر بیٹھ جا اور جو آنے والا پوچھے کہ بھی تم نے گھر کے ہوتے ہوئے سامان کیوں باہر ڈالا؟ اسے کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: گھر چھوڑ دے۔ سڑک کے بیچ میں بیٹھ جا۔

چنانچہ اس نے جا کر سامان نکالا اور سڑک کے بیچ میں رکھ کر خود سامان کے اوپر بیٹھ گیا۔ اب جو آ رہا ہے پوچھتا ہے کہ بھی! گھر تمہارا موجود ہے کیوں سڑک کے بیچ میں بیٹھے ہو۔ اس نے کہا صاحب! پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا، گھر چھوڑ دو، سڑک پر بیٹھ جاؤ، لوگوں نے کہا لعنت ہے اس شخص پر جو اپنے پڑوسی کو ستائے۔ اب جو آ رہا ہے وہ اس پر لعنت کر رہا ہے، صبح وشام ہزاروں لعنتیں اس پر برسیں شام کو اس نے ہاتھ جوڑے، اللہ کے واسطے تو اپنے گھر چل اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا۔ خود جا کے اس کا سامان رکھا اور وعدہ کیا کہ عمر بھر خدمت کروں گا اور اللہ کے واسطے دے کر اس کا سامان رکھا۔ یہ بات وحی سے نہیں ارشاد سے فرمائی تھی بلکہ یہ دانش کا اثر تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کی طرف سے علم لے کر آتے ہیں۔ ویسے ہی کمال دانش لے کر آتے ہیں۔ تو جتنا بڑا علم اتنی ہی بڑی دانش۔ چونکہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم سب سے بڑا تھا تو دانش بھی سب سے بڑی تھی۔ اس لئے حضور علیہ السلام کی دانش مندیوں پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

وصف امت کو مفاخر کے مواقع پر ذکر کیا گیا..... بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور امت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کو مفاخر کے مواقع اور مدح کے مواقع پر ذکر فرمایا ہے: ﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ ① توراۃ و انجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک رسول آئیں گے وہ نبی ہوں گے اور امی ہوں گے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہا جا رہا ہے اور پوری انسانیت کو خطاب ہے کہ جن کا تم توراۃ اور انجیل میں ذکر پاتے ہو۔ وہ نبی امی بے پڑھے لکھے ہیں۔ تو یہ ان پڑھ ہونا اور بے پڑھا ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا علم پیش فرمایا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوچا سمجھا نہیں تھا بلکہ من اللہ تھا۔ حق تعالیٰ کی جانب سے آیا ہوا تھا۔

جیسی بعثت ویسا علم..... اور پھر وہ علم کیا تھا؟ اَوْتِيَتْ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جمع کر دیئے گئے تھے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ

صورت میں مجسم ہوگا تو وہی جنت کہلائے گی۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاری قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہی جنت بالآخر اس کا مسکن و ماویٰ بنے گی۔ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا اور پہچانے گا تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے جو میرے نہاں خانہ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے نا آشنا رہا تھا اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آگئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضو فشاں ہیں اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال و ہر آن خیر مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیر مطلق، آخرت میں بھی خیر مطلق، اس کا پڑھنا بھی خیر مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیر مطلق۔ یہی بات اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد فرمائی گئی ہے: ”خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ“ ”قرآن حکیم کا سیکھنا سکھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے۔“

پیدائشی ولی شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ..... اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں، البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے۔ ہمارے استاذ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاندان ”اویسیہ خاندان“ کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادرزاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا۔ بلا مجاہدے اور ریاضت، من جانب اللہ وہی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا اور نہ بایہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ انکے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ فرماتے تھے ”یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہ وغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔“ تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیم قرآن کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے تھے۔ آپ پر استغراق کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے تھے۔ انکے ایک داماد تھے، جن کا نام ”اللہ بندہ“ تھا، وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے: ”اللہ بندہ“ فرماتے صحیح نام بتاؤ، وہ پھر کہتے: حضرت! میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھی! اللہ بندہ تو ہم بھی ہیں صحیح نام بتاؤ آخر میں وہ کہتے: حضرت! میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے: اچھا بیٹھ جاؤ! بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال و جواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی کو لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ ”دنیا و مافیہا“ سے بے خبر رہتے تھے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے تھے اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ و ریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی کھنسنے تو موجود نہیں تھے، نشانوں سے وقت پہچانا جاتا تھا اور پہروں (ایک پہر دو پہر تین پہر وغیرہ) میں وقت تقسیم ہوتا تھا، ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا بس دھوپ وہاں پہنچی اور چھٹی ہوگئی۔ بچے ہمیشہ کے شرارتی۔ کبھی شرارت کر کے نشان

آگے گاڑ دیتے تاکہ دھوپ وہاں جلدی پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی اور شور مچا: چھٹی کا وقت ہو گیا۔ آپ فرماتے: اچھا بھئی! چھٹی کر لو۔ لوگوں نے آپ کو بتایا: میاں جی! لڑکے شرارت کرتے ہیں اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرا لیتے ہیں۔ فرماتے: بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا ہوگا، جاؤ بچو! چھٹی کرو۔ یہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا پختہ عقیدہ و خیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے ”الْمَرْءُ يَقِينٌ عَلَى نَفْسِهِ“ ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

اوروں کے جھوٹ، حافظ محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی..... ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے کسی کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ یہ میری زمین ہے۔ مدعی دعویٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے، دعا کیجیے! زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا: اچھا بھائی! دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے۔ ادھر حافظ محمد احسن صاحب اطلاع ہوئی کہ مدعی نے زمین پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین فلاں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت! میں بھی مسلمان ہوں، زمین میری ہے۔ فرمایا: اچھا تم اپیل کر دینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا۔ دوسرے نے اپیل کی اور اپیل میں وہ حجت گئے۔ حضرت کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دکھنے لگیں، دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا: میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آ گیا اور وہ مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا، کہہ دیا: میں نابینا ہو گیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، جو آ رہا ہے اس سے کہہ دیتے کہ: فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے، بس میں نابینا ہو گیا ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولانا مزاج پرسی کو پہنچے، احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا: جی! میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے: اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے، اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔ مولانا بہت زبردست و ذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے: حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پانی پڑھ کر دم کیا اور چھینٹا مار کر کہا: حضرت جی! آنکھیں کھولے بینائی واپس آ گئی ہے۔ بینائی

وہ گیارہ بھائی محتاج ہو کر پہنچے انہوں نے ہی سرپرستی کی اور بالاخر حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پہنچے۔ آپ نے جا کر تعظیم و تکریم کی۔ تو ابتداء خواب سے ہوئی تھی تو خواب کا علم ایک مستقل علم کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا جو وحی کے ذریعہ ان پر اترتا تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام کو جتنے علوم عطا کئے گئے وہ سارے کے سارے حضور علیہ السلام کو عطا کئے گئے، تو تمام علوم کا جامع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا دیا گیا، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر میں تشریف لائے اور ظاہر بات ہے کہ جب تمام ماتحت عدالتوں سے فیصلہ چلتا ہے اور اپیل چلتی ہے تو آخری عدالت میں آکر آخری حکم ہوتا ہے پھر اس کے بعد کسی اور جگہ مقدم نہیں جاتا۔ وہاں بالکل انتہائی جاتی ہے۔

خاتم النبیین علیہ السلام کے لئے کمالی جامعیت ضروری ہے..... کسی اسکول یا کالج میں جب اساتذہ جمع ہوں تو کچھ اساتذہ درجہ ابتدائی کے ہوتے ہیں، وہ ابتدائی علوم کچھ سکھاتے ہیں، کچھ لغات بتلا دیتے ہیں۔ اس کے بعد درجہ وسطانی کے استاذ ہوتے ہیں جو اوپر کی باتیں بتلاتے ہیں۔ جو آخری مدرس ہوتا ہے۔ جس کو پرنسپل کہنا چاہیے وہ سب سے اخیر کا مدرس ہے جو سب سے اونچی چیزیں بتلاتا ہے۔ تو قاعدہ کی بات ہے کہ پرنسپل کو ان تمام چیزوں کا علم ہونا چاہیے جو ماتحت مدرس بتلا رہے ہیں۔ لیکن ماتحت مدرس کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ اتنا بڑا علم رکھتا ہو جتنا صدر مدرس رکھتا ہے۔ اسکی جماعتیں چھوٹی ہیں وہ ابتدائی چیزیں سکھاتے۔

تو حضرت آدم علیہ السلام آئے بچے کو جب آپ کچھ سکھاتے ہیں تو پہلی چیز سکھانے کی یہ ہے کہ آپ نام سکھلا دیتے ہیں کہ یہ روٹی ہے، یہ لوٹا ہے، یہ زمین ہے۔ یہ آسمان ہے، تو سب سے پہلا علم ناموں کا ہے۔ اس کے بغیر اشیاء میں تمیز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سب سے پہلے نبی علیہ السلام نے آکر اسماء سکھائے: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ”آدم علیہ السلام کو ناموں کی تعلیم دی گئی“۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام آئے۔ وہ اسماء جان چکے تھے۔ اب انہیں آگے کا علم دینا چاہئے انہوں نے اسماء کی مسمیات اور اشیاء مدلولہ کو سامنے کر کر معرفت خداوندی کرائی جن کے نام پہلے سے سکھے ہوئے تھے۔

﴿الْم تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا﴾ ① ”اے لوگو! کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کیسے آسمان کو تہہ بہ تہہ پیدا کیا اور چاند اور سورج کے انڈے اس میں جلانے“۔ ﴿وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا﴾ زمین سے تمہیں اس طرح سے اگادیا جیسے کہ درخت اگائے جاتے ہیں زمینی اجزاء جمع کر کے تمہیں انسان مجسم بنادیا۔ تو اللہ نے تمہیں زمین سے پرورش کیا اور پروان چڑھایا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام نے آسمان اور زمین کے نام نہیں سکھائے بلکہ نام والی چیزیں سامنے کر رہے ہیں کہ انہیں دیکھ کر اس بنانے والی ذات کا پتہ چلاؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے فقط نام سکھائے تھے۔ حضرت

نوح علیہ السلام نے اسماء والی چیز دکھانا شروع کر دیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا تو انہوں نے فقط زمین و آسمان کی صورتیں نہیں دکھلائیں۔ فرمایا گیا: ﴿وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلَيْكُن مِّنَ الْمُؤَقِّنِينَ﴾ ① آسمان و زمین کا نہیں بلکہ ان کے ”ملکوت“ کا علم دیا۔ ”ملکوت“ حقائق کو کہتے ہیں، یعنی زمینوں کی حقیقتیں نمایاں کیں، آسمانوں کے نفوس نمایاں کئے اور حقائق منکشف کئے۔ تو پہلے پیغمبر نے اسماء سکھائے۔ دوسروں نے صورت دکھلائی۔ تیسرے نے حقیقت کا پتہ دیا کہ صورت کے اندر کیا حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ سیارات کے نفوس کا پتہ دیا۔ زمین کے نفوس اور حقائق کا پتہ دیا۔

اب جبکہ شی کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت بھی معلوم ہو گئی۔ اس کی حقیقت اور ماہیت بھی معلوم ہو گئی۔ اب یہ معلوم ہونے کی ضرورت تھی کہ ان کے احکام کیا ہیں؟ ان کی خاصیتیں کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے احکام کی تفصیل بیان کی جس کو فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو تورات دی۔ ﴿فَنَفِصِلَا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ جس میں ہر چیز کی تفصیل بتلا دی گئیں۔ ہر چیز کا حکم ان کے سامنے کر دیا گیا۔ تو جب ایک شے کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ صورت کا بھی پتہ چل گیا، حقیقت کا بھی پتہ چل گیا، خاصیت اور نعم بھی معلوم ہو گیا۔ اب حکم کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ اس کے علل و اسرار اس کے دلائل اور حقائق شرعیہ کا پتہ چلے۔

نبی امی کے دین کا امتیاز..... تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقائق شرعیہ کا علم دیا گیا۔ یعنی اسماء بھی معلوم، صورتیں بھی معلوم، حقیقتیں بھی معلوم، احکام بھی معلوم، مگر احکام کے حقائق کا پتہ نہیں تھا۔ تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ قرآن کریم کا نام ہے۔ ﴿وَبَيَّنَّا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ ② نبیان دعویٰ مع الدلیل کو کہتے ہیں۔ جو دعویٰ کیا اس میں علت چھپی ہوئی ہے۔ جو حکم پیش کیا اس میں حکمت پوشیدہ ہے، اس سے مجتہدین نے کام لیا اور اس سے علل و اسرار نکال کر اس سے فقہ نکالنا شروع کیا اور احکام کا استنباط کیا۔ تو انبیاء علیہم السلام پر شرائع اصلیہ اتاری گئیں اور اس امت کے ربانی علماء اور آئمہ پر شرائع وضعیہ اتاری گئیں کہ اصلی شریعتوں سے استنباط کر کے وضعی شریعتیں پیدا کریں۔ استنباط و اجتہاد احکام کریں۔

تو اجتہاد فقط حکم میں نہیں ہوتا۔ حکم کی علت میں ہوتا ہے کہ جب یہ علت یہاں ہے اور اس پر حکم دائر ہے تو یہ علت اگر کسی اور جگہ پہنچ گئی تو یہ حکم وہاں بھی پہنچ جائے گا اسی کو قیاس کہتے ہیں کہ کسی علت جامعہ کی وجہ سے حکم مشترک کیا جائے کہ جو حکم یہاں ہے وہی وہاں ہے، اسی وجہ سے ائمہ اجتہاد پیدا ہوئے۔ غرض پچھلی شرائع میں صرف احکام تھے، وہ احکام جزوی طور پر اقوام کو معلوم تھے۔ وہ رسوم کے طور پر ان پر عمل کر لیتی تھیں۔ لیکن اس شریعت میں احکام کیساتھ علل و اسرار بھی دیئے گئے تاکہ ایک حکم پر قیاس کر کے ہزاروں احکام پیدا کئے جاسکیں۔ نبی امی کے علم کی شان جامعیت..... اب ظاہر بات ہے کہ جو احکام کی علتیں بیان کرے گا۔ احکام اسے

① پارہ ۷: سورۃ الانعام: الآیۃ ۷۵۔ ② پارہ ۱۴: سورۃ النحل: الآیۃ ۸۹۔

میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع..... تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ابتداء و انتہا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزر اردی اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مرد مومن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ۔ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے، میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے بلکہ اس کی جدائی پر یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ: ”اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر موت پر رنجیدہ ہوتے تو اس پر روتے اور اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود محبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے، نیکی کی چیز کب ہو سکتی ہے غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے اور اس کا دنیا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفہ مومن فرمایا گیا ہے: **الْمَوْتُ تَحْفَةُ الْمُؤْمِنِ** ① اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے! تحفہ پر تو اظہار مسرت و خوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے: **إِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ يُوصِلُ الْحَبِيبَ إِلَى الْحَبِيبِ** (اوکا قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) ② موت درمیانی پل ہے جو محبت کو حبیب سے ملاتا ہے، جو وصل حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعث کرب و ملال کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو گیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا، اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پارہے تھے وہ منقطع ہو گیا، اس سے محروم ہو گئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے، موت پر رونا نہیں ہے۔

بہر حال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے اور موت بھی خوشی کا مقام۔ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے اور جب اس سے فارغ ہو جائے، اس کا حافظ و عالم ہو جائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر مبنی ہے، کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے

① کنز العمال، حرف المیم، ص: ۱۷۰۔ علامہ عیسیٰ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر

بزیادة: والدرهم والدينار مع المنافع وهما زاد الى النار... دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۲، ص: ۲۹۰۔

② لباب الحديث للامام السيوطي، ج: ۱، ص: ۳۴۔ یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے۔

گا، حافظ و عالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی، توقع کی خوشی ہے اور فراغت و انتہا کی خوشی، کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی وہ پوری ہوگئی، مراد حاصل ہوگئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہوگا، عالم فاضل بنے گا، صنّاع و کارمگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسب توقعات کامیاب گزار کر سلامتی ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور پھچھڑ جانے کے غم سے آدمی انگبار بھی ہوتا ہے اور یہ انگباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامت و لایتمتتائے موت..... بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے، کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ: ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هٰذُوْا اِنْ رَّعٰمْتُمْ اَنْتُمْ اَوْلِيَاۤءُ لِلّٰهِ مِنْ ذٰوِنَ النَّاسِ فَتَسْمِنُوْا الْمَوْتُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی تو موت کی تمنا میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ملتا ہے کہ: ”اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ ② ”اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا ہو اور اس کا اقرار کرتا ہو اس کے لئے موت کو محبوب بنا دے“۔ (امین ثم

امین بِحَاہِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالتَّسْلِیْمُ)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ”لَا یَسْمِنُ اَحَدُکُمْ الْمَوْتَ“ ③ ”تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے“۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: ”اِنَّا نَکْرَهُ الْمَوْتَ“ کہ ہم موت کو نا پسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شہائد و مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے اور جسکے دل میں اللہ کی محبت اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ

① ہارہ ۲۸: سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶. ② المعجم الکبیر للطبرانی، باب الحاء، شریح بن عبید الحضری عن ابی مالک، ج: ۳، ص: ۴۷۸. علامہ بیہقی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفيہ محمد بن اسماعیل بن عیاش

وہو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱۰، ص: ۳۰۹۔

③ الصحيح للبخاری، کتاب المرضی، باب تمنی المریض الموت ج: ۱۷، ص: ۴۲۳، رقم: ۵۲۴۱۔

اس طرح کرو جیسے تم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ صورت نہیں تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ یہ جو دیکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے کہ اپنے معبود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ تمنا ہر شخص کے دل میں ہے۔ نماز کے ذریعے دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی نظر ہوتی ہے چٹائی کے اوپر اور حقیقت میں نظر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے چہرے کے اوپر لیکن آج نمازی کو محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ میں اللہ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں مگر جب قلب میں جتے جتے آخر وقت آئے گا اور عمر اس تصور میں گزر جائے گی تو اچانک وہ جلوہ نگاہ کے سامنے آجائے گا جس کی تمنا میں آدمی عبادت کیا کرتا تھا تو عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے۔ مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عابد و معبود کا آئینہ سامنا ہو جائے۔ تو اس حدیث میں اس کی تدبیر بتلائی گئی کہ دل میں تصور یہ باندھے کہ میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ ہے میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت ہوتی ہے نماز میں اس سے حق تعالیٰ شانہ کے اوصاف و کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝﴾

ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے جہانوں کا جو رحمان و رحیم ہے۔ ﴿مَلِکِ یَوْمَ الدِّیْنِ﴾ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ جس میں سارے اولین و آخرین جمع ہوں گے۔ آج بھی اس کی حکومت ہے مگر اس روز اس کی حکومت نمایاں ہو جائے گی سارے بنی آدم کے اوپر۔ تو حق تعالیٰ شانہ کو دیکھنے کی مشق کرتے رہنے سے جب عمر بھر یہ تصور بنے گا تو ایک نہ ایک دن وہ چیز سامنے آجائے گی جسے دل میں جمارکھتا تھا۔ یہ ایک انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کا وہ تصور دل میں جمالیتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

تلاوت اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ ہے..... اسی طرح سے جب قرآن مجید پڑھتے ہوئے حق تعالیٰ کا دھیان دل میں جمائیں گے، وہ جم جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ جس چیز کو دل میں جمایا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ یہ فطرت کے مطابق ہے۔ دنیا کی چیزیں چالیس دن بعد آجائیں گی سو دن بعد آجائیں گی۔ لیکن چونکہ یہ اعلیٰ ترین جمال ہے۔ اس لئے اس میں پوری عمر چاہیے اگر پوری عمر تصور جمائے تو پھر وہ شے سامنے آجائے گی اور جمال خداوندی نمایاں ہو جائے گا۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ: جس کو یہ شوق ہو کہ میں حق تعالیٰ کی زیارت کروں اس کا طریق یہی ہے کہ قرآن کریم پڑھتے ہوئے ہر حرف پر اس کا دھیان جمائے اور جما کر اس کو دل میں راسخ کر لے تو دنیا میں بھی جلوے نمایاں ہوں گے اور آخرت میں بھی دیدار ہو جائے گا۔ تو آپ نے بہت بڑا اقدام کیا ہے اور بڑی سعادت کا اقدام ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ شروع کیا ہے۔

دستور حیات..... اگر ترجمہ سرسری طور پر سنا جائے تو ثواب تو ملے گا ہی لیکن اس دھیان سے ترجمہ ہو کہ میرے اللہ نے کیا کہا ہے۔ یہ کیا دستور العمل ہے۔ جس پر میں چلوں تو ایک تو ہے محض معنی سمجھ لینا ایک ہے اس معنی کو دستور

العمل بنانا کہ اس پر مجھے چلنا ہے چونکہ قرآن کریم قانون کی کتاب ہے اور قانون محض اس لئے نہیں پڑھایا جاتا کہ آدمی اس کو رٹ لے اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے احکام اور اس کی پالیسیاں معلوم ہوں تاکہ جرائم سے بچے اور صحیح طور پر چلے قانون کے اوپر۔ تو اللہ نے اپنا کلام نازل فرمایا مگر محض تلاوت کے لئے نہیں کہ اس کو رٹ لیا جائے۔ یہ تو ابتدائی درجہ ہے اصل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں کیا کہا جا رہا ہے۔؟ یہ کلام کیوں ہے؟ اس میں خطاب کیا ہے؟ مجھے کس طرح سے زندگی گزارنی ہے یہ میرا دستور العمل ہے اس نیت اور قصد سے اور اس عزم سے جب آپ پڑھیں گے تو کیفیات کچھ اور ہوں گی تو اس لئے۔ میں نے عرض کیا کہ: ایک بہت بڑی سعادت کی بات آپ نے کی ہے کہ ترجمہ شروع کیا ہے۔

الفاظ قرآن کلمات خداوندی کے مظہر ہیں..... قرآن کریم کے بارے میں حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّكْ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّهُ كَلَامُ اللَّهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ① ”برکت حاصل کرو اس کلام خداوندی سے اس لئے کہ یہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔“ کلام جو ہوتا ہے وہ متکلم کے اندر سے نکل کر سامنے آتا ہے وہ اس کے جذبات ہوتے ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ میں کوئی ہنسی کی بات کہوں تو آپ ہنس پڑیں گے۔ یہ لفظوں کا اثر نہیں ہے بلکہ یہ اس جذبے کا اثر ہے جو میرے قلب میں موجود ہے کہ میں آپ کو ہنساؤں۔ لفظوں کو تو آڑ بنایا ہے۔ اگر جی چاہا کہ آپ کو رولایا جائے تو ایسا کلام کیا جائے کہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں تو وہ لفظوں کا محض اثر نہیں وہ ان جذبات کا اثر ہوتا ہے جن کا بولنے والے نے قصد کیا ہے آپ نے لفظوں کو آڑ بنایا۔ اور جذبات اپنے پیوست کر دیئے قلب کے اندر کہ رو پڑا آدمی۔ پھر آپ کے دل میں جذبہ آیا کہ فلاں کو خوش کر دوں اور ہنسا دوں تو کچھ ایسے بول بولے کہ خواہ مخواہ ہنس پڑا اور خوش ہو گیا۔ وہ محض لفظ نہیں ہیں بلکہ وہ اندر کے جذبات ہیں، جنہوں نے الفاظ کا جامہ پہن کر اس کے دل میں اثر ڈالا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کے الفاظ نازل فرمائے ان الفاظ میں وہ کمالات چھپے ہوئے ہیں جو بولنے والے کے اندر تھے، وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں ان الفاظ کے ذریعہ دنیا میں کوئی بھی جذبہ بغیر لفظوں کے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے لفظوں کو بیچ میں لانا لازمی ہے اور ان ہی الفاظ کے اندر اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے اپنے کمالات کو اور ان ہی الفاظ کے ذریعہ ان کمالات کو بندوں تک پہنچایا ہے اور ان کے دل میں اتارا ہے ان کمالات کو اپنے دل میں حاصل کرنے کی نیت سے اگر آپ تلاوت کریں گے اور دھیان اس پر دیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور میرے دل میں کمالات کس طرح اتر رہے ہیں تو پھر اور ہی شان ہوگی۔ اسی کو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّكْ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّهُ كَلَامُ اللَّهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ② ”برکت حاصل کرو اس قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ بولنے والا جو بولتا ہے وہ اندر سے بولتا ہے لفظ آڑ ہوتے ہیں۔

کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ لباس مستقل نعمت ہے۔ گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔ غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے تو ان کا گننا ممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، پھل فروٹ ہے یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلے ہیں تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں، کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔ غرض کھانے پینے، رہنے سہنے اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی (چھوتی) ہیں انکا ہم احساس کرتے ہیں۔ ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

باطنی نعمت..... ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جن کو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی، جیسے علم اور معرفت خداوندی ہے۔ علم دل کے اندر بھر جانا، یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں لگراتی، وہ دل سے دل میں آتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبت خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔ اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان ہی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھوں سے نظر آ سکتا ہے، اس لئے کہ اسلام کے معنی ظاہری عمل کے ہیں۔ نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوٰۃ دی۔ نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے، حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے، لیکن ایمان دل میں چھپا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔ تو ایمان بھی ایک نعمت، محبت خداوندی بھی ایک نعمت، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، یہ عظیم نعمت ہے، ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتا۔

امتحان محبت، نعمت میں نہیں مصیبت میں ہوتا ہے..... اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أُوْثِقَ إِلَيْهِ مِنَ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ“ ① ”تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو۔“

جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی آدمی مؤمن نہیں بنے گا۔ اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے، جب خدا اور رسول کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔ آدمی سو رہا ہے، اسے محبت اس سے ہے کہ میٹھی نیند آ رہی ہے، نہ اٹھوں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آؤ مسجد میں اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خدا سے زیادہ محبت ہے۔ اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹخنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا اور مسجد میں حاضر ہو گیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اپنے خدا کو اختیار کر لیا۔ گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ اللہ کے راستہ میں جانا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ

① الصحيح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من الایمان، ج: ۱ ص: ۲۳۔

نہ جاؤں ان کو چھوڑ کے، خدا اور رسول کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے، اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آگئی۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللَّهُ شَرَفًا وَ كَرَامَةً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر یا دریاں بال بچے مکہ ہی میں تھے، جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں، عزیز و اقرباء مکہ میں تھے لیکن سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی اور نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ یہ محبت میں کامیاب ہو گئے، امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خدا اور رسول کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا اور اللہ و رسول کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو، نہ ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو ورنہ مؤمن نہیں بن سکتا۔ تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آجائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ: مجھے اللہ سے محبت ہے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ اللہ کی محبت سے پڑ جائے اس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: سوچ کر کہو کیا کہتے ہو، عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا: دیکھو بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو سمجھ کے کہو، کیا بات ہے؟ عرض کیا: آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: اگر محبت ہے تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے، تنگیوں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کیلئے۔ یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعویٰ سچا ہوگا کہ واقعی اللہ و رسول سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے: آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! تب کہا جائے گا سچا بندہ یہی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا، یہ مشکل ہے اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ

دلا! اندر جہاں یاراں سہ قسم اند زبانیانہ و نانیانہ و جانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی آدمی جب دوستی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں۔ تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں۔ ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں۔ یعنی جب تک دسترخوان پر چکن کھا ناٹل رہا ہے، ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور ایک دوست وہ ہیں جو جگر کی دوست ہیں کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ، مصیبت میں ہو تو کہیں گے: پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی۔ یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔ تو ایک زبانی جمع خرچ، ایک روٹی کی دوستی اور ایک جگر کی

اب تم میرے چہرے اور جمال کو دیکھتے رہو اور ابدالاباد تک تمہاری بینائی آج کھول دی گئی اور فرمایا جائے گا کہ ”یمنین عرش (عرش کی دائیں جانب) میں آ کر قیام کرو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔“

ان کے سامنے نعمتیں رکھی جائیں گی خدا کا کتنا بڑا احسان ہوگا کہ میدان محشر بپا ہے۔ مخلوق کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور یہ نایبنا لوگ کھلی ہوئی آنکھیں ہیں اور اللہ کے یہاں مہمان ہوں گے اور نعمتیں استعمال کر رہے ہوں گے۔ تو جب ان نایبنا حضرات کی جماعت اس شان سے آئے گی اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرما کر مہمان بنائیں گے ٹھیک اسی وقت میں علماء کی جماعت آگے بڑھے گی اور علماء کہیں گے کہ ہماری ہی تلقین سے اور ہمارے ہی بتلانے سے انہوں نے صبر کیا، ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں اور ان اندھوں کو یمنین عرش میں جگہ دے دی گئی حق تعالیٰ ان نایبنا حضرات سے فرمائیں گے کہ انہیں کہنے دو تم آؤ یمنین عرش میں وہ عرش کی دائیں جانب نعمتوں میں ہوں گے علماء وہیں کھڑے رہیں گے۔

اس کے بعد بلایا جائے گا ان کو جو جہنم کے مرض میں مبتلا تھے کہ دنیا والوں نے ان کو اچھوت بنا دیا تھا۔ محشر کے دن ان کے بدن چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت ایوب علیہ السلام کو اور ان کو بزر جہنم دیا جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور بہت بیماریاں سہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: تم بھی یمنین عرش میں آ جاؤ۔ پھر علماء ابھریں گے کہ ہمارے ہی کہنے سے تو انہوں نے صبر کیا اور دل میں تسکین پیدا ہوئی اور ہمیں ہی کوئی پوچھتا نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، کہنے دو تم ان علماء کو، تم آگے چلو۔ اسی طرح سے معاملہ ہوگا۔

اہل علم کا اخروی مقام..... اور اہل مصیبت جب سب نمٹ جائیں گے۔ پھر حق تعالیٰ علماء کو خطاب فرمائیں گے کہ: تم صرف نعمتیں ہی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم صرف اس لئے پیدا کئے گئے تھے کہ صرف اپنی ذات کا ہی نفع ڈھونڈو؟ بلکہ تم بھیجے گئے تھے دنیا کی ہدایت کے لئے یہاں لوگوں کی شفاعت کرو کھڑے ہو کر جب سب کو بخشوا لو گے تب تم آگے بڑھنا۔ تم اپنے کام کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ دنیا کے کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے کہ دنیا کے انسانوں کو نفع پہنچاؤ۔ اس وقت ان کا رتبہ ظاہر ہوگا۔ وہ شفاعتیں کریں گے اور لاکھوں آدمی ان کی شفاعت کی بدولت بخشے جائیں گے۔ رب العالمین فرمائیں گے کہ: اب تم نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ دنیا میں ہدایت کی، یہاں شفاعت کی۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں کوئی عہدہ مل جائے، کوئی نعمت مل جائے۔ یہ تمہارا کام نہیں تھا۔ تمہارا کام یہ تھا کہ دنیا کو سب کچھ ملے اور تم الگ کھڑے رہو اس کے بعد تمہیں اجر ملے تو بہر حال یہ جو یمنین عرش میں جائیں گے یہی ہیں وہ جسے میں نے عرض کیا تھا کہ: اللہ تعالیٰ کے پہلو میں جگہ مل جائے گی کہ دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھا تھا، قبر میں اس کے جلوے دیکھے، میدان محشر میں اس کی تجلی دیکھی اور آخر میں جا کر مل جائیں گے یمنین عرش میں حق تعالیٰ کے پہلو میں بیٹھ جائیں گے۔

تجلیات قرآن کریم کے ظہور کے ترتیب..... یہ قرآن کا اثر ہوگا کہ آپ پڑھیں گے، پڑھ کر اس کی چیزیں

جمائیں گے، دل میں اللہ تعالیٰ کے کمالات آئیں گے، عظمت بیٹھنے لگی، ایمان مضبوط ہوگا۔ اس کے انوار و برکات قلب کے اندر آئیں گے اور پھر وہ انوار محسوس طریق پر نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر قبر میں نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر تجلیات کی صورت میں میدان محشر میں نمایاں ہوں گے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا پہلو ہے کہ بس ہمارے پاس آ جاؤ۔ تو وہ ساری چیزیں پوری ہو جائیں گی جو عبادت سے مطلوب تھیں کہ دیکھ بھی لیں، اپنے معبود کے قریب بھی ہو جائیں۔ اس سے مل بھی لیں۔ اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں۔ یہ صرف قرآن کریم ہی کے ذریعہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ تو آپ نے ترجمہ شروع کرا کر قرآن کریم کا در حقیقت راستہ کھولا ہے مسلمانوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں اور مل بھی لیں اور اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں اور اس سے ملاصق ہو جائیں۔ آپ نے یہ بہت بڑی سعادت کا کام کیا ہے۔

قرآن کریم کتاب انقلاب..... یہی قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے۔ دلوں کو بدل دیتی ہے۔ روجوں کو بدل دیتی ہے۔ جنہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا وہ تو نہیں جانتے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ انہوں نے استعمال نہیں کیا اس کو اور جب تک کسی چیز کو استعمال نہ کیا جائے اس کے فوائد معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کا کوئی اثر ظاہر ہو سکتا ہے جیسے قیمتی سے قیمتی دوا ہو لیکن اس کو استعمال نہ کیا جائے تو وہ کیا اثر کرے گی۔ مثلاً شہد کو کہا گیا ہے کہ: اس میں شفا ہے لیکن کوئی شخص شہد سے گھبرائے اور خیال کرے کہ شہد میرے گھر میں بھی داخل نہ ہو تو کیا فائدہ ظاہر ہوگا۔ ایسے ہی اگر قرآن کریم سے بچتے رہیں کہ قرآن کریم کو سننے بھی نہ اور اس کے پاس پھٹکے بھی نہ تو کیا اس کا نور ظاہر ہوگا، اسی کے لئے نور ظاہر ہوگا جو اس کو آ کر سننے اس کو پڑھے، اس کو دل میں جمائے۔ اسی سے اس کے انوار و برکات ظاہر ہوں گے تو اس لئے دیکھا جائے تو قرآن کریم ایک انقلاب کی کتاب ہے، دلوں کو بدل دیا، روجوں کو بدل دیا، کایا پلٹ دی، زمانہ جاہلیت جو اسلام سے قبل کا زمانہ ہے اس کے اندر دلوں میں روجوں میں ہر برائی جمی ہوئی تھی، شرک میں وہ مبتلا تھے۔ بدعات میں وہ مبتلا تھے، منکرات میں وہ مبتلا تھے۔ چوری، ڈکیتی، زنا کاری ساری حرکتیں ان کے اندر موجود تھیں۔ نہ عقیدہ صحیح نہ عمل صحیح نہ مال درست بس جیسے جانور گزارتے ہیں۔ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا۔ رات دن ڈکیتی رات دن مار دھاڑ، قبیلوں میں جنگ اور کشت و خون، ہر وقت کا یہی مشغلہ تھا، قرآن کریم آیا، جن دلوں نے اس کو قبول کیا اور اس سعادت کو حاصل کیا تو ایک دم کایا پلٹنا شروع ہو گئی۔ پہلے ان کا نام تھا جہلائے مکہ۔ جب اس کو قبول کر لیا اب ان کا نام ہو گیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

تو جہلائے مکہ سے بن گئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا وہ زمانہ جاہلیت تھا اب اس کا نام ہو گیا خیر القرون کہ دنیا کے سارے زمانوں میں بہترین زمانہ ہے یہ وہ لوگ جو جہالت میں مبتلا تھے۔ وہی حضرات علماء کے استاذ بنے، عرفاء کے شیخ بنے۔ پوری دنیا کو نور سے منور کر دیا۔ ایک دم کایا پلٹ ہو گئی۔ جو ایک ایک پیسے کے لئے ڈکیتیاں ڈالتے تھے گردنیں کاٹتے تھے اور مرتے تھے پیسے کے اوپر، آج یہ کیفیت ہے کہ گھر بھرے ہوئے ہیں

خزانوں سے اور ورہ رخ کر کے بھی نہیں دیکھتے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک مرتبہ خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، بیت المال میں لاکھوں روپیہ جمع تھا۔ سونے چاندی کو خطاب کر کے فرمایا۔ یا ذُنُیَا غَیْرَیْ ۱۔ ”اے دنیا! دھوکہ کسی اور کو دینا“۔ ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں اور خزانچی کو اسی وقت حکم دیا کہ غرباء میں دولت تقسیم کی جائے۔ رات بھر دولت تقسیم ہوئی۔ یہ لوگ تھے جو پہلے ایک ایک پائی کے لئے جان دیتے تھے۔ آج خزانے پڑے ہوئے ہیں اور اس کو خطاب کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر رحم کرنے والے نہیں۔ ہم تجھ پر مرنے والے نہیں ہیں۔ یہ کیا پلٹ کہاں سے ہوئی؟ اس قرآن نے ہی تو دلوں کو بدل دیا تھا، روجوں کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے مال کی محبت تھی اب کمال کی محبت ہوئی، پہلے مخلوق کی محبت تھی اب خالق کی محبت شروع ہوئی اور محبت میں مستغرق ہو گئے، غرق ہو گئے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ پتی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں۔ ایک دن گھر میں تشریف لائے تو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ کچھ غمگین اور اداس ہیں۔ پوچھا کہ آج آپ اداس کیوں ہیں فرمایا کہ: خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہو گیا ہے دل کے اوپر بوجھ پڑ رہا ہے کہ اتنی خرافات کہاں میرے سر پر لگ گئی۔ اس کی وجہ سے غمگینی ہے۔ بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ انہوں نے کہا کہ: پھر غم کی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ کے نام پر غرباء کو تقسیم کر دو۔ بس تشریف لے گئے اور خزانچی کو بلا کر حکم دیا کہ غرباء میں روپیہ تقسیم کیا جائے یتیموں اور بیواؤں کی مدد کی جائے۔ تمام رات مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو گھر پہنچے تو بہت ہشاش بشاش۔ بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا کہ: بہت عمدہ تدبیر بتلائی تھی میرا دل ہلکا ہو گیا۔ تو پہلے یہ کیفیت تھی کہ ان کا دل ہلکا ہوتا تھا جب دولت زیادہ ہوتی تھی یا آج ہلکا ہونے لگا جب دولت ختم ہو جائے۔ یہ کیا پلٹ نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ انقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ دل بدل گئے۔

عورتوں میں انقلاب..... دولت کی محبت سب سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے اور ان ہی سے یہ روگ مردوں کو بھی لگتا ہے اگر عورتیں نہ ہوں تو یہ بھی اس روگ میں مبتلا نہ ہوں اور یہ محبت عورتوں میں اس لئے ہوتی ہے کہ پیدا ہوتے ہی زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں۔ آج اس کے کان میں سوراخ کر دیئے تو بالیاں پڑ گئیں۔ ناک پھوڑ دی تو اس میں لوگ گھس گئی۔ ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ بندھ گئیں۔ تو پیدائش سے لے کر وہ مبتلا ہوتی ہیں سونے چاندی میں اس لئے ان کے دل میں محبت بیٹھ جاتی ہے سونے چاندی کی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿أَوْ مَن يَنْشَوٰهُ الْجُلِيَّةُ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرَ مُبِينٍ﴾ ۲ ”کیا یہ عورت

① المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ علی ج: ۹، ص: ۱۳۴، علامہ یحییٰ فرماتے ہیں: فیہ جا۔ المعجفی وهو ضعیف

دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹، ص: ۱۳۱، ۲) پارہ: ۲۵، سورة الزخرف، الآية: ۱۸.

جورات دن زیوروں کی جھنکار میں پرورش پا رہی ہے یہ عقل کامل رکھتی ہے؟“

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر خاوند سے تو تو میں ہو جائے تو خاوند تو اپنے دلائل پیش کرے گا اور یہ وہی مرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جائے گی۔ نہ دلیل نہ حجت، یہ اسی پر جمی رہے گی۔ تو جو کلام کی ایک قوت ہوتی ہے وہ نہیں رہتی۔ کیوں کہ علم نہیں اور علم اس لئے نہیں کہ مال یعنی سونا چاندی اندر گھسا ہوا ہے۔ علم نورانی ہے اور دولت سیاہ چیز ہے اور سیاہی کے ساتھ نور جمع نہیں ہوتا ہے اور سیاہی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں۔ اب تو خیر وہ روپیہ نہیں رہا سونے چاندی کا اب تو کاغذہ گئے ہیں مگر جب سونے چاندی کے سکے تھے تو اگر پچاس روپیہ گن لیں تو انگلیاں سیاہ ہو جاتی تھیں۔ تو سونے چاندی میں کالک بھری ہوئی ہے۔ گنتے گنتے ہاتھ پر سیاہ ہو جاتے تھے۔

جو عورتیں رات دن پیروں میں زیور پہنتی ہیں تو ان کے ٹخنوں پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے سنا اسی کے بارے میں فرمایا کہ ”دست زر آلودایں قدر بد بو میکند۔ قلب زر آلود چہ قدر بد بو خواہد کرد“۔ یعنی جو ہاتھ سونے چاندی کو لگتے ہیں ان میں اس قدر بد بو آ جاتی ہے اگر کوئی انکے جائے سونے چاندی میں تو دل میں کتنی بد بو پیدا ہوگی اور کتنا تعفن پیدا ہوگا۔ تو عورتوں کے بارے میں فرمایا ﴿أَوْ مِّنْ يُنْشِئُوا فِي الْحُلِيِّ﴾ ”جب وہ عورتیں زیورات میں ہی نشوونما پاتی ہیں تو ان کے اندر علم و کلام کی قوت کہاں سے ہو سکتی ہے۔ وہ تو مرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جائیں گی نہ حجت نہ دلیل۔ دوسرا لاکھ دلیل بیان کرے وہ اپنی ہی ہٹ پر رہیں گی۔ چونکہ دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے عورتوں کے دل اتنے بدل دیئے تھے کہ بجائے محبت کے بیزاری پیدا ہو گئی تھی سونے چاندی سے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے حاکم ہو گئے تھے تو انہوں نے دو بورے بھر کر گئیوں اور زیوروں کے اپنی خالہ کے ہاں ہدیہ کے طور پر بھیجے۔ تو اندازہ کیجئے کتنے ہزاروں اور کتنے لاکھوں روپے ہوں گے جبکہ دو بوریاں بھری ہوئی ہوں۔ ایک طرف سونا اور ایک طرف چاندی یہ تمام سامان لے کر خالہ کے گھر پہنچے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ: میں کیا کروں گی اتنی دولت کو، اس کو غریبوں میں تقسیم کر دو۔ وہ دولت غریبوں کو تقسیم ہونی شروع ہو گئی صبح سے تقسیم ہونی شروع ہوئی اور شام تک دو بوریاں خالی ہو گئیں۔ باندی نے عرض کیا کہ ام المؤمنین! آپ پر فاقہ ہے کچھ آپ نے بھی رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا کہ: بیوقوف پہلے سے کیوں نہیں کہا۔ دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی۔ تو حالت یہ کہ ذہن میں یہ بھی نہیں کہ اتنے وقت سے فاقہ میں ہوں اور مجھے کچھ رکھ لینا چاہئے۔ اس قدر گویا کہ غنی ہو گئی تھیں زر سے اور دولت سے کہ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مجھے فاقہ ہے کہ کچھ مجھے بھی رکھنا چاہیے باندی کے یاد دلانے پر یاد آیا۔

تو عورتوں کے دل میں زیادہ محبت ہوتی ہے یہ انقلاب تھا قرآن کا پیدا کیا ہوا کہ عورتوں کے قلوب کو اتنا پاک بنا دیا کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں آتا تھا کہ پیسہ پاس نہیں ہم فاقہ سے ہیں۔ یہ قرآن کا ہی تو انقلاب تھا۔ تو قرآن کریم دنیا میں

بھی انقلاب پیدا کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تو یہ کہ دل کے اندر بجائے کفر و معصیت کے ایمان کی حلاوت پیدا کرتا ہے اور آخرت میں جہنم سے بچا کے جنت میں پہنچاتا ہے۔ فتنوں سے نکال کر ایمان میں پہنچاتا ہے، قرآن یہاں بھی انقلاب لاتا ہے اور آخرت میں بھی انقلاب لائے گا اور برزخ میں قبر کے اندر بھی انقلاب لائے گا۔

قرآن کریم کا برزخ میں انقلاب حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورہ تَبَارَكَ الَّذِي کے بارے میں حکم یہ ہے کہ عشاء کے بعد اس کی تلاوت کر کے سویا کرو۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا۔ هِيَ الرَّافِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ هِيَ الْمَانِعَةُ ① یہ رَافِعَةُ بھی ہے کہ عذاب کو رفع کرتی ہے۔ یہ مَانِعَةُ بھی ہے کہ روک لگاتی ہے مصیبتوں پر، یہ مُنْجِيَةُ بھی ہے جو نجات دلاتی ہے عذاب سے۔ تو قبر کے اندر نجات دلا دینا، عذاب کو دفع کر دینا اور روک دینا یہ خاصیت ہے تَبَارَكَ الَّذِي کی۔ اسی واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سوتے وقت سورہ تَبَارَكَ الَّذِي پڑھ کر سویا کرو۔ اس لئے کہ سونا اور مرنا برابر ہے۔ سونے والا گویا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ موت اہل ہونے کے لئے ہی فرمایا کہ سورہ تَبَارَكَ الَّذِي پڑھو۔ یہ ”برزخ“ میں بھی نجات دلائے گی۔ میدان محشر میں بھی بجائے گی، یہ امر ہے شریعت کا، اگر کوئی حافظ ہے تو حفظ پڑھ لیا کرے اور حافظ نہیں ہے تو دیکھ کر پڑھ لیا کرے۔ پانچ منٹ کی کیا بات ہے۔ عشاء کے وضو ہوتے ہی پڑھ کر سوجائے اس سے برکات حاصل ہوں گی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹایا جائے گا اور عذاب کے فرشتے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اس وقت سورہ تَبَارَكَ الَّذِي کو ایک شکل دے دی جائے گی وہ اس شکل میں آ کر کہے گی کہ: خبردار جو تم آگے بڑھے اس عذاب کو فوراً روک لو تو ملائکہ عذاب کہیں گے کہ ہم کو تو اللہ کا حکم ہے آپ کے کہنے سے کیسے رک جائیں وہ کہے گی کہ میں اللہ کا کلام ہوں۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے کہ آپ اللہ کا کلام ہیں مگر وہاں سے ہمیں کلام والے کا آرڈر ہے تو عذاب سے ہم کیسے رک جائیں تو یہ سورت غضبناک ہو جائے گی۔ اس پر ملائکہ عذاب کہیں گے کہ آپ اللہ سے کہیں۔ ہمیں نہ روکیں۔ ہم آپ کے کہنے سے رک نہیں سکتے۔ ہم تو آرڈر کے پابند ہیں وہ سورت کہے گی کہ: ایک منٹ رک جاؤ۔ اس وقت عروج ہوگا اور پہنچے گی حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ میں اور جا کے کہے گی بہت غصے سے کہ یا تو اے اللہ: مجھے اپنے کلام سے نکال دے کہ میں آپ کے قرآن کی سورت نہ رہوں اور اگر میں سورت ہوں تو اس کے کیا معنی ہیں کہ ملائکہ میری تعمیل نہیں کرتے میں تو آپ کا کلام ہوں میں آرڈر دیتی ہوں کہ وہ روکیں عذاب کو مگر وہ رکے نہیں یا تو مجھے قرآن سے نکال دیجئے اور رکھنا ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ میرا حکم نہ چلے۔ حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔

میں دیکھتا ہوں تو بہت غصہ میں بھری ہوئی ہے، تو کہے گی۔ وَحَقِّ لِي أَنْ أَعْصَبَ. ② ”مجھے حق ہے کہ

① السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورة الملک، ج: ۱۰، ص: ۱۲۶.

② الدر المنثور، سورة الملک، ج: ۱۰، ص: ۶۳.

میں غصہ کروں۔“ میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں میں آپ کا کلام ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ میری تعمیل نہ کی جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: میں نے اس میت کو تیرے سپرد کر دیا جو مناسب سمجھے تو کہہ اب آئے گی آرڈر لے کر کے اور ملائکہ عذاب سے کہے گی خبردار: جو تم آگے بڑھے، یہ آرڈر ہے۔

تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ ملائکہ منہ بسورتے ہوئے رخصت ہو گئے جیسے کوئی شرمندہ شکست کھا کر جاتا ہے کہ ہماری کچھ بات بھی نہ چلی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے واپس ہوں گے اور قبر خالی ہو جائے گی ملائکہ عذاب سے۔ حدیث میں ہے کہ یہ سورت میت کے منہ پر اپنا منہ رکھے گی جیسے کوئی بوسہ لیتا ہے اور کہے گی کیسا مبارک منہ ہے کہ جس سے میری تلاوت کی گئی تھی۔ پھر سینے پر منہ رکھے گی کہ کیسا مبارک سینہ ہے کہ جس میں میں محفوظ تھی۔ پھر قدموں پر منہ رکھے گی کہ کیسے مبارک قدم ہیں کہ جن سے کھڑے ہو کر میری تلاوت کی گئی تھی اور اس وقت میت سے کہے گی کہ تو آرام سے اور اطمینان سے رہ کوئی تیرے اوپر ہار نہیں میں موجود ہوں فکر کرنے کی بات نہیں۔ تو قرآن کریم دنیا میں کایا پلٹ کر کے قلوب کو نورانی بنا دیتا ہے۔ بزرخ میں کایا پلٹ کر کے عذاب کو دفع کرتا ہے اور میدان محشر میں اللہ کے یمن میں پہنچا دیتا ہے۔ تو قرآن کریم میں ایک تبدیلی اور انقلاب کا مادہ ہے کہ دلوں کو بدل دے روحوں کو بدل دے، ناپاک کو پاک بنادے۔ یہ انقلاب کا مادہ قرآن میں موجود ہے۔

انقلاب عظیم..... دنیا میں کتنا بڑا انقلاب پایا ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن کریم کی تلاوت کی ہے تو لوگ بدل گئے جو جاہلین مکہ تھے وہ صحابہ کرام بن گئے۔ زمانہ بدل گیا جاہلیت کے بجائے خیر القرون اس کا نام ہو گیا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مقام پر پہنچے کہ امت کا عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ غُذُوْتُ۔ ”سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم متقی پارسا پاک دامن اور قلوب کے اندر کامل تقویٰ لئے ہوئے ہیں۔“ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ: امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں یا عمر بن العزیز افضل ہیں؟ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ہیں اور عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ہاں حضرات صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ مگر عادل اتنے بڑے تھے کہ لوگ ان کو عمر ثانی کہتے ہیں۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور لوٹ آیا تھا۔ ان کے زمانہ خلافت میں عدل و انصاف انتہائی درجہ پر تھا۔ اس عدل و انصاف کے باوجود تین سو نفلیں بھی ثابت ہیں جو روزانہ پڑھتے تھے۔ اور علمی مشغلہ الگ رہا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بہت ہی اونچا مقام ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے دور خلافت میں کچھ خطا اجتہادی اور خطائے فکری بھی ہوئی ہیں اس بناء پر لوگوں نے حضرت حسن بصری سے دریافت کیا کہ ”حضرت عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ؟ حضرت حسن بصری نے جواب دیا کہ: اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑے کی ناک میں کچھ پانی آ جائے اور اس پانی پر کچھ گرد بیٹھ جائے وہ گرد ہزار درجہ افضل ہے عمر بن عبدالعزیز سے۔ اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں اور معاویہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ صحابی اور اور کوئی شخص کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انقلاب کا نقشہ..... صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ قرآن اخذ کیا، دل بدل گئے، روح بدل گئی، جذبات بدل گئے، پھر جہاں یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب پھا کر دیا، قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کر لیا، قیصر کا ملک فتح ہو گیا، رومی ماتحت بن گئے کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا۔ ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پہنچے ملک بدل دیا، تہذیب بدل دی، مذہب بدل دیا زبان بدل دی، ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔

آج آپ ممالک عربیہ کہتے ہیں مصر کو، شام و عراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور زبان بولی جاتی تھی، مصر قطیوں کا ملک تھا اس میں قطی زبان بولی جاتی تھی۔ شام عیسائیوں کا ملک تھا اس کے اندر رومی زبان بولی جاتی تھی، فلسطین بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا، زبان بھی بدل دی۔ مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی ہو گئی۔ تمدن تک بدل دیا، تہذیب تک بدل دی۔ تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں کہاں سے آئی۔؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی کو لے کر کھڑے ہوئے۔ اسی کو دستور العمل بنایا۔ تو عالم کی کاپی ملٹ دی۔

انقلاب شر..... آج جتنا قرآن سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اتنا ہی فساد برپا ہو رہا ہے اور شر کا انقلاب آتا جا رہا ہے کہ لوگ خیر سے شر کی طرف آرہے ہیں۔ علم سے جہالت کی طرف آرہے ہیں۔ تہذیب سے بد تہذیبی کی طرف۔ تو انقلاب خیر اور انقلاب حسن کو قرآن پیدا کرتا ہے اور انقلاب شر ترک قرآن پیدا کرتا ہے۔ قرآن کو ترک کر دو گے تو دوسرا انقلاب آتا جائے گا، تہذیب سے بد تہذیبی ہوتی چلی جائے گی۔ شائستگی بدل جائے گی ناشائستگی سے۔ علم ختم ہو جائے گا جہالت سے۔ اخلاق حسنہ جاتے رہیں گے، بد اخلاقیات پیدا ہوتی جائیں گی اس لیے علم اخلاق اور کمالات یہ قرآن ہی سکھاتا ہے۔ جب آدمی اس جڑ سے وابستہ نہ رہے تو کمالات کی شانیں سامنے کہاں سے آجائیں گی۔ بہر حال قرآن برکت بھی ہے، ہدایت بھی ہے، نور بھی ہے اور وہ انقلاب بھی ہے کہ جب آتا ہے تو کاپی ملٹ دیتا ہے۔

جنات میں انقلاب..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنات اور شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک پہنچ جاتے اور ملائکہ کی گفتگو سن لیتے۔ اس میں کچھ جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں میں اس کی تبلیغ کرتے۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہ سلسلہ ان کا منقطع کر دیا گیا اب کوئی آسمان پر اگر جاتا ہے تو اسے آگ کے بم مارے جاتے ہیں جس سے وہ بھسم ہو جاتا ہے، فرشتے ان کو آسمان کے قریب پھنکنے بھی نہیں دیتے۔ یہ جنات

اس جستجو اور ٹوہ میں تھے کہ کون سی ایسی وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم کو روک دیا گیا ہے۔ یہ تو سمجھتے تھے کہ کوئی حادثہ ضرور پیش آیا، مگر کون سا حادثہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی جستجو تلاش میں نکلے اور ان جنات کا وفد مکہ مکرمہ پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرما رہے تھے قرآن کریم کی۔ انہوں نے قرآن کریم کو سنا اور سمجھ گئے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نازل ہونے کی وجہ سے ہمارے راستے بند ہوئے ہیں تاکہ ہم اس میں خلط ملط نہ کر سکیں۔

تو انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا: ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۖ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۚ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا﴾ ① ”ہم آج ایسا کلام سن کر آئے ہیں کہ جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے راہنمائی کرتا ہے کمالات کی طرف۔ ہم تو اس کلام پر ایمان لے آئے اور ہم شرک نہیں کریں گے۔“ ہمیں تو توحید کامل نصیب ہوگئی اس کلام کو سن کر یہی ہے وہ کلام جس کی وجہ سے ہمارے راستے روکے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں مشرکین بھی تھے۔ مشرکین آئے انہوں نے قرآن سن کر توبہ کی کہ: ﴿وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا﴾ ”اب ہم شرک نہیں کریں گے“ یہ کمال جو آج ہمیں معلوم ہوا کہ توحید اتنی کامل ہے جس کو قرآن لے کر آیا ہے۔ ﴿وَأَنَّهُ تَعَلَّى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا﴾ ② ”اور ہم توبہ کرتے ہیں اس سے جو ہم نے عقیدہ ہمارا کھا تھا کہ اللہ کے یہاں کوئی بیوی ہے اللہ کے کوئی اولاد ہے۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر عیسائی بھی تھے جو عقیدہ انبیت کے قائل تھے، اس سے توبہ کی جنات نے۔ تو قرآن کے وہ الفاظ کان پڑے تھے کہ ایک انقلاب پیدا کر دیا کفر سے ایمان کی طرف آگئے شرک سے توحید کی طرف آگئے، ناشائستگی سے شائستگی کی طرف آگئے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قرآن کریم کے انقلاب کی ایک جھلک..... یہی قرآن کریم ہے جو لوگوں کے دلوں کو بدلتا ہے، اگر اس کو پکڑے ہوئے ہیں تو خیر کی طرف پھرتے رہیں گے اگر اسے ترک کر دیا تو شر کی طرف بڑھیں گے، فتنوں کی طرف بڑھیں گے، ایک سے دوسرے کو چین نہیں ملے گا، تو قرآن نے پیدا کیا، ایثار ہمدردی، محبت، خدمت گزاری، جذبہ اطاعت، اپنے نفع پر اپنے بھائی کے نفع کو ترجیح دینا۔ یہ جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ خود غرضی مٹا کر لا غرضی پیدا کر دی اور اس درجہ کہ موت گوارہ مگر اپنے بھائی کا نقصان گوارہ نہیں۔

غزوہ بدر کے اندر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم زخمی ہو کر گرے، لشکر میں کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجاہدین کی ضروریات پوری کرتے ہیں مثلاً مرہم پٹی وغیرہ۔ انہوں نے آکر مرہم پٹی کی، ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کو پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو فرمایا، پانی، اس وقت ایک آدمی کٹورہ بھر کر پانی کا لایا منہ کے قریب لے گئے کہ قریب سے ایک اور آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں لے گئے ان کے منہ سے لگایا ایک تیسری آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں پہنچے تو چوتھی آواز آئی۔ وہ نہیں پینے پائے کہ پانچویں آواز آئی۔ وہاں پہنچے تو چھٹی آواز آئی۔ غرض سات آوازیں آئیں،

ساتویں تک پہنچے تو وہ شہید ہو چکے تھے۔ چھٹے کے پاس لوٹ کر آئے تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ پھر لوٹے کہ پانچویں کو پلا دوں وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ اسی طرح لوٹ کر واپس آتے رہے اور دیکھتے رہے کہ شہید ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں کے ساتویں پیا سے شہید ہوئے مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ میں پانی پیوں اور میرا بھائی برابر میں پیسا لیٹا رہے۔ موت گوارہ کی مگر دوسرے کا پیسا رہنا گوارہ نہ کیا۔ وہی لوگ جو ایک ایک پائی کے لئے دوسروں کے گلے کاٹتے تھے آج ان میں اس درجہ ایثار پیدا ہو گیا کہ موت گوارہ کی مگر دوسرے کی پیاس گوارہ نہیں۔

قرآن انقلاب عظیم کا سرچشمہ..... یہی وہ عظیم انقلاب ہے جو قرآن کریم نے پیدا کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اندر۔ ان ہی مشیت خاک کو کیمیا بنا دیا، سونا چاندی بنا دیا اور ایسا بنا دیا کہ دنیا کی کاپلٹ دی انہوں نے۔ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ”تَبْرُكٌ بِالْقُرْآنِ“ برکت حاصل کر قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے، یہ پیدا کی ہوئی چیز نہیں کلام خداوندی اس کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس سے صادر ہو رہا ہے، اس نے سورج پیدا کیا، اس نے چاند پیدا کیا زمین پیدا کی اور کلام خود بخود اندر سے نکل کر آیا ہے۔ اس لئے کلام مخلوق نہیں ہے۔ مخلوق میں تو روح بن کر کلام بھرا ہوا ہے جسکی وجہ سے اشیا اپنی اصلیت پر قائم اور صحیح معلوم ہوتی ہیں اس لئے فرمایا کہ کلام اللہ سے برکت حاصل کرو۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پیدا کئے ہوئے ہم اور آپ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنے اندر کی چیز نکال کر دی ہے تاکہ ان کے اندر اس کلام کی برکت سے تہذیب پیدا ہو، شائستگی پیدا ہو۔ تو اس اعتبار سے دو عالم ہوئے ایک عالم خلق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ایک عالم ارواح ہے کہ اپنے حکم سے اپنے کلام سے اس کے اندر روح ڈالی ہے، تو قرآن کریم درحقیقت روح الہی ہے، روح خداوندی ہے جس سے اقوام زندہ ہوئیں۔ جس نے اسے لیا وہی زندہ ہوا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس روح کو لیا اس لئے وہ ایسے زندہ ہوئے کہ لاکھوں کروڑوں مردوں کو زندہ کر دیا، انہوں نے، ہم نے آج اس روح کو نکال دیا ہے ایسے پڑے ہوئے ہیں بے جان، جس کا جی چاہے مارے جس کا جی چاہے کاٹ دے، جس کا جی چاہے کچھ کر لے، چونکہ ہمارے اندر جان ہی باقی نہیں ہے اور نہ ہی روح باقی ہے۔

قرآن بلند ہے اور اس پر کوئی چیز بلند نہیں ہو سکتی جیسا کہ: ① اِسْلَامٌ يٰعَلُوْا لَا يُغَلٰی سے کوئی پست نہیں کر سکتا، اس کی روح جس میں آجائے گی، وہ بھی بلند ہو جائے گا۔ جس میں سے نکل جائے گی وہ پست ہو جائے گا۔

صحیح انقلاب کی تمنا میں اُلٹی زقند..... تو آج ضرورت اس کی ہے کہ قرآن کریم کو سنبھالا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کچھ دولت ہو ہمارے پاس، کچھ بلنگیں ہوں، کچھ جائیدادیں ہوں۔ جب ہی ہم پنپ سکتے ہیں حالانکہ

پنپنے کی یہ صورت نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں چھن بھی سکتی ہیں، انقلابات میں گھر تک چھن جاتے ہیں جائیدادیں تک چھن جاتی ہیں، دکانیں تک بک جاتی ہیں، بازار تک جلا دیئے جاتے ہیں، اگر ان سے شوکت وابستہ ہو تو وہ سب ختم ہو جائیں گی۔ اگر اندر روح بھری ہوتی ہے تو لاکھ بازار جلیں تو وہ جلنے رہیں، پھر سینکڑوں قائم ہو جائیں گے۔ مگر مومن کو ذرہ برابر فکر نہ ہوگی۔ نہ جلنے کی نہ آنے کی، اس واسطے جہاں اور تدابیر کرتے ہیں وہ ثانوی درجہ کی ہیں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان تو بنے اور بننے کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن کی روح کو اپنے اندر جذب کر لے۔

کتاب انقلاب کا طرزِ تعلیم بہر حال یہ سلسلہ جو آپ حضرات نے قائم فرمایا ہے مبارک سلسلہ ہے مگر اس کو رسی نہ بنایا جائے بلکہ پڑھایا جائے اور پڑھانے کے ساتھ سنا بھی جائے یعنی پڑھانے والا اور ترجمہ کرنے والا کبھی کبھی امتحان بھی لیتا رہے کہ کل ہم نے کیا بتایا تھا۔ فلاں آیت کا کیا مطلب ہے۔ اس پر آپ نے کچھ عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس لئے محض پڑھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ تربیت بھی ضروری ہے علم کے ساتھ ساتھ۔ پھر اس کو دستور زندگی بنانا بھی ضروری ہے، علم اس وقت تک نفع نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کو دستور زندگی نہ بنایا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے۔

آپ نے قرآن کا ترجمہ پڑھایا احکام سمجھائے اخلاق بتلائے۔ پھر چند دن کے بعد جانچ بھی کرتے رہیں پوچھ گچھ بھی کرتے رہیں کہ بھئی کتنا عمل ہوا کتنا نہیں ہوا تو اس کی ترکیب بتلائیں جیسے کہ احادیث میں دعائیں وارد ہوئی ہیں اور قرآن کریم میں بھی بہت سی دعائیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام لکھا دی جائیں اور پھر سنی بھی جائیں ان سے معاشرت کی اصلاح ہوتی ہے اخلاق درست ہوتے ہیں ماحول بنتا ہے اس لئے محض ترجمہ پڑھا دینا ہی ذمہ داری نہیں ہے۔

کتاب انقلاب کا طرزِ تربیت میں تو یہ کہتا ہوں کہ ترجمہ پڑھانے والا عمل بھی دیکھتا رہے اور تربیت بھی کرتا رہے، یہ نہ دیکھے کہ بس ان کو علم ہو گیا ہے۔ یہ تو اور مصیبت بن جائے گی، حکمت کے ساتھ ان کی تربیت کرتا رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض تعلیم ہی نہیں دی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہ صرف قرآن کے معنی بتلا دیئے ہوں یا سمجھا دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی بھی مشق کرائی ہے اور عمل کی نگرانی بھی فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ تعلیم اور حکمت عملی حدیث میں ہے کہ ایک قبیلہ حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم ایمان لانا چاہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بسم اللہ اہل قبیلہ نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ نماز نہیں پڑھیں گے فجر اور عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے باقی تین وقتوں کی پڑھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور وہ اسلام قبول کر کے چلے گئے۔ انہوں نے نہ صبح کی نماز پڑھی اور نہ عشاء کی۔ ظہر، عصر، مغرب کی پڑھتے رہے۔

لوگوں کو تعجب ہوا کہ جیسے تین وقت کی نماز فرض ہے ویسے ہی دو وقت کی بھی فرض ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط کیسے مان لی۔ اس پر سب کو حیرت تھی۔ مگر ایک مہینے کے بعد ان لوگوں کے دلوں میں خود یہ خیال

پیدا ہوا کہ بھائی فرض تو ساری نمازیں ہیں، ہم تین نمازیں ادا کر رہے ہیں، دو ادا نہیں کر رہے ہیں اس پر گناہ گار ہو رہے ہیں، تو فائدہ کیا ہوا اسلام لانے سے؟ یہ سوچ کر پڑھنی شروع کی اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد پانچوں نمازوں کے پابند ہو گئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے انوارِ باطن سے پہچان لیا تھا کہ یہ اس شرط پر ہیں گے نہیں اور پڑھنی شروع کر دیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط مان لی تھی۔ تو یہ حکمت تربیت کی تھی تعلیم میں تو سب برابر ہیں۔ تعلیم میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی جیسے ظہر، عصر، مغرب فرض ہیں، ویسے ہی عشاء اور فجر بھی فرض ہیں مگر اس سے آگے عمل کی بات ہے اور عمل میں تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اور تربیت میں حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، تعلیم تو ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے طب کی کتاب پڑھا دی ہو اور علاج ہوتا ہے مطب میں، تعلیم میں تو طبیب سب کے سامنے ایک ہی مسئلہ بیان کرے گا لیکن کرنے بیٹھے گا تو ہر ایک کا نسخہ الگ الگ لکھے گا۔ چونکہ ہر ایک کا مزاج الگ ہے، بیماری الگ ہے، تو تعلیم کے درجہ میں تو سب برابر ہوتے ہیں لیکن عمل کرانے کے درجے میں ہر ایک کا مزاج الگ ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کی رعایت کرنی پڑے گی اور اسی مناسبت سے نسخہ تجویز کرنا پڑے گا۔ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مربی بھی ہیں۔ اس لئے ان کا مزاج پہچان کر مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شرط کو قبول کر لیا اور انوارِ باطن سے پہچان بھی لیا تھا کہ بعد میں اس کو یہ قبول کر لیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی رد نہ فرمائی اور ہوا یہی اور بالآخر وہ ساری نمازیں پڑھنے لگے۔ یہ کچھ حکمت تھی تربیت کی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ: ترجمہ کرانے والے تعلیم کے درجہ میں تو سب کو ایک ہی طرح سمجھائیں گے مگر اس میں تربیت کی شان بھی ہونی چاہئے اور وہ ہونی چاہئے جدا گانہ۔ ہر ایک کے مزاج کی مناسبت سے ہفتہ میں دو ہفتہ میں جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہئے کہ عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ نہیں کر رہے تو کیا رکاوٹ ہے اس کو دور کیا جائے۔ اس طرح سے تربیت ہو کر اچھے خاصے مسلم بن جائیں گے۔

اس وجہ سے محض علم کافی نہیں جب تک کہ استعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے اور عمل کرا کے اس کی مشق نہ کرائی جائے اس وقت ثابت ہوگا کہ قرآن کریم نے نفع پہنچایا اور کس طرح سے اس نے کایا پلٹ دی ہے۔

تبریک بہر حال یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کر دی ہیں کہ آپ حضرات قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمہ کلام اللہ کا آغاز کیا ہے یہ نہایت مبارک اقدام ہے حدیث میں فرمایا گیا ہے: **خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ** ① ”پڑھنے والا بھی خیر ہے پڑھانے والا بھی خیر ہے“ ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ ② قرآن کریم کے ندائیں طرف سے باطل آ سکتا ہے نہ بائیں سے نہ سامنے سے نہ پیچھے سے

① الصحيح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم من تعلم، ج: ۱۵، ص: ۳۳۹.

② پارہ ۲۲: سورة حم السجدة: الآية: ۲۲.

یہ چیز باطل سے بری ہے حق محض ہے اس لئے جس میں سرایت کر جائے گا اس کے پاس باطل نہ آ سکے گا وہ بھی حق کے اوپر جے گا، تو آپ نے خیر کا کارخانہ کھولا ہے، پڑھانے والا بھی خیر ہوگا۔ سننے والے بھی خیر ہوں گے پھر اگر اس کے ساتھ عمل بھی مستقیم ہو جائے تو اس کے اثرات اندر راتر جائیں گے اور پھر اس کے فوائد ظاہر ہوں گے۔ یہ چند باتیں ذہن میں آئیں جو میں نے عرض کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے اس کے فوائد و برکات دنیا و آخرت میں ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ”آمین“

دُعا

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا صَالِحًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَشِفَاءً مِنْ كُلِّ دَاءٍ وَارْزُقْنَا يَا رَبِّ حُسْنَ الْخَاتِمَةِ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَاسْرِافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ رَبَّنَا وَابْنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ. اَللّٰهُمَّ وَتَوَقَّفْنَا مُسْلِمِيْنَ وَالْحَقُّنَا بِالصَّلٰحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْرِيْنَ، وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى اٰلِهِ وَصَحْبِهِ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

عظمتِ حفظ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّ لَهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَّاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ! فَاغُوْذِبِ اللّٰهُ مِنْ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ. ﴿۱﴾ اَلَمْ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ ۝ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

ظلمتِ کدہ میں روشن چراغ..... بزرگانِ محترم! آج ہم سب کے لئے بے انتہا خوشی اور مسرت کا دن ہے
کیونکہ آج ہماری قوم کے چند بچے حافظ ہوئے اور ان کو پگڑی باندھی گئی اور سند عطا کی گئی اور ان کے سینے میں حق
تعالیٰ نے اپنا کلام مبارک اتار دیا۔ حق تعالیٰ کا کلام کسی بندے کے سینے میں آجانا یہ خود ایک عظیم سعادت ہے حق
تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات اور اس کی صفاتِ کمال نورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمتِ مخفی اس ظلمتِ کدہ میں یہ چراغِ روشن ہو
جانا اور نورِ مطلق کی کرنیں اس میں گھومنا اور انشراحِ قلب، یہ خود ایک عظیم کرامت ہے انسان کے لئے اور قرآن
کریم ایک عظیم ترین برکت اور سعادت ہے۔

سرچشمہ حیات..... اگر غور کیا جائے تو یہ ایک حیات اور ایک زندگی ہے، اس نے دنیا کو بھی زندہ کیا، اقوام کو بھی
زندہ کیا اور عربوں کو بھی زندہ کیا اور ان میں زندگی کی روح ڈالی، خود قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے
حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ﴿۱﴾ ”اے پیغمبر! آپ کی طرف ہم
نے وحی کی اور وحی کے ذریعہ اپنی روح آپ کے اندر ڈالی، مراد ہے قرآن کریم۔ آگے فرمایا گیا: ﴿مَا كُنْتُ
تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُورًا نَّهْدِيْ بِهِ مَنۡ نَّشَآءُ مِّنْ عِبَادِنَا﴾ ”آپ اس سے
پہلے یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آپ واقف نہیں تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اس
وحی اور اس روح کو نور بنا کر آپ کے اندر ڈالا۔ جس سے تمام علوم آپ پر منکشف ہوئے۔

① بارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲. ② بارہ: ۲۵، سورۃ الشوری، الآیۃ: ۲۵.

تو قرآن کریم کے بارے میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ روح خداوندی ہے اور نوعیت اس کی علم اور کمال ہے۔ تو دوسرے لفظوں میں علم کو روح بتلایا گیا ہے۔

ہم اور آپ اپنے عرف میں جانتے ہیں کہ روح باطنی چیز ہے اور وہی زندگی ہے بدن کی، بدن کی کوئی زندگی نہیں اصل میں زندگی روح کی ہے اس کی وجہ سے بدن بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس دن روح نکل جاتی ہے، اسی دن یہ بدن بھی لاش ہو کر گندگی میں شمار ہوتا ہے۔ تو حقیقت یہ زندگی روح کی ہے اور بدن کی زندگی اس روح کے روپ میں اللہ کے کمال کی ہے۔ تو قرآن کریم میں جس کو روح کہا گیا ہے وہ روح خداوندی ہے اور حقیقت میں ایک معدن حیات اور سرچشمہ زندگی ہے۔

یہ روح خداوندی جب عربوں میں پہنچی تو وہ قوم زندہ ہوئی جو پشت ہا پشت سے مردہ چلی آرہی تھی، دنیا جس کو حقیر و ذلیل جانتی تھی۔ کوئی ان کو اونٹ کی میٹگنیوں میں کھیلنے والا سمجھتا تھا۔ کوئی ان کو بھلائے عرب کا خطاب دیتا تھا۔ کوئی جاہلین مکہ کہتا تھا اور مختلف تحقیر آمیز خطابات سے ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ روح ان کے اندر بھر گئی تو وہ عالموں سے بڑھ کر عالم اور عارفوں سے بڑھ کر عارف باللہ بن گئے اور جن کا نام بھلائے عرب تھا ان کا نام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو گیا۔

پہلے ان کو کفر سے یاد کیا جاتا تھا، اب ان کو ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُمْ﴾ ① کے اعزاز کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس روح خداوندی سے پہلے جس زمانہ کا نام تھا ”زمانہ جاہلیت“ اب اس کا نام ”خیر القرون“ ہے۔ تو زمان میں بھی زندگی آئی، مکان میں بھی زندگی آئی اور اعیان میں بھی اور افراد بھی ایسے زندہ ہوئے کہ دنیا کو زندہ کیا۔

سپر طاقتوں کی شکست کی بنیادی وجہ..... اور دنیا کی مردنی کو دفع کر کے پوری دنیا میں زندگی پھیلا دی اور مردہ قوم جو پہلے کروٹ نہیں لے سکتی تھی اب قوت پا کر بڑھی تو اتنی بڑھی کہ قیصر و کسریٰ کا کبر و غرور خاک میں ملا دیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ان مقدس ہستیوں کو اپنی جواں مردی ثابت کرنی نہیں تھی بلکہ ان خرافات کو مٹانا تھا جو دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔ قیصریت و کسریت کا حاصل خدائی کرنا تھا۔ وہاں جو آتا تھا اسے اپنے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض نے زبان سے دعویٰ کیا کہ ہم معبود اور خدا ہیں اور بعض نے عملاً رعایا سے وہ کام کرائے جو خدا ہی کے لئے مخصوص تھے تاکہ سمجھا جائے کہ وہ خدا ہیں چنانچہ رعایا کا ہر فرد آکر سجدہ کرتا تھا اور فریاد کرتا کہ: میری ساری حاجتیں آپ سے متعلق ہیں۔ تو جو خدا کی شان میں کہا جاتا ہے، وہ قیصر و کسریٰ کی شان میں کہا جاتا تھا۔ رعایا سب کی سب غلام سمجھی جاتی تھی۔ اس غلامی کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے چند امراء اور بادشاہ کو عیش کرائے اور خود بیلوں کی طرح اپنے کھیتوں میں لگی رہے اور ان کی محنتوں سے چند

افراد فائدہ اٹھائیں، مساوات بھی نہ عدل و علم تھا۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جنگیں ملک گیری کے لئے نہیں تھیں، وہ تخت شاہی کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ اس اقتدار کو خاک میں ملانا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سر بلندی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں میں عدل و مساوات کی راہ میں حائل تھا۔ اور اس وقت دنیا میں قیصر روم اور کسریٰ کی دو بڑی بڑی حکومتیں تھیں جو اللہ کے دین کی سر بلندی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اس وقت دنیا میں وہی دو ہی حکومتیں تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک یہ اقتدار ختم نہیں کیا جائے گا۔ یہ اوصاف کمال، عالم میں نہیں پھیل سکتے۔ انسانوں میں خدائی اور بندگی کی تفریق رہے گی۔ یہ مساوات اور عدل اسلام لے کر آیا ہے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی قیصریت و کسرویّت ہے اس لئے ان حضرات نے ملک سے قیصریت و کسرویّت کو مٹایا، بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کا تختہ جاکے اُلٹا۔ جب جاکے مساوات پیدا ہوئی۔ اسلام پھیلا دین پھیلا اور وہی لوگ جو انسانوں کے عہد بنے ہوئے تھے وہ عباد اللہ بنے، وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنے، سب میں مساوات آئی، ان میں زندگی آئی۔ تو قرآن کریم نے اپنے کو روح کہا ہے اور حق تعالیٰ نے روح بتلایا ہے اور روح ہی معدنِ حیات ہے۔ اس سے گویا واضح ہو گیا کہ قرآن کریم زندگی ہے اور جس قوم میں یہ سزا یت کر جائے گا وہ زندہ ہو جائے گی اور جس سے نکل جائے گا وہ مر دہ ہو جائے گی۔

حافظ قرآن کا باطل سے تحفظ..... اور پھر آپ غور کریں تو واقعی جس سینے میں قرآن ہوگا۔ باطل اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اس واسطے کہ قرآن کی شانِ مثبت طریق پر یہ فرمائی گئی ہے کہ: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ ① ”وہ جو ایمان لے آئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ چیز پر قرآن پر فرمایا: ﴿وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾۔ ”وہ اللہ کی طرف سے حق ہی بنا کر اتارا گیا ہے۔“

تو مثبت طریق پر تو قرآن کو حق کہا ہے۔ اصل میں حق یہی ہے۔ دوسرے منفی پہلو میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ ② ”یہ وہ کلام ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں باطل نہیں پھٹک سکتا۔“ یہ حق ہی حق ہے۔ اندر سے بھی حق اوپر سے بھی۔ نہ باطل اس کے اندر ہے نہ اس کے آس پاس آسکتا ہے۔ پھر قرآن کریم باطل سے منزہ اور مبرا اور ذاتی طور پر حق اور سرتا پا حق۔ اب یہ حق اور غیر باطل جب کسی کے سینے میں گھسے گا تو اس کے سینے میں بظان کہاں سے آجائے گا۔

اور دوسرے جب یہ حق ہے تو اس میں باطل نہیں آسکتا۔ تو جن بچوں نے آج قرآن کو اپنے سینے میں لے لیا ہے۔ حقیقت میں لفظوں کے اعتبار سے تو وہ منزہ ہو چکے ہیں باطل سے، کل کو معافی اس کے پڑھ لیں گے تو معافی کے لحاظ سے بھی باطل سے منزہ ہو جائیں گے۔ تو ایک وصف تو یہ تھا کہ قربِ خداوندی ملا۔ دوسرا وصف یہ کہ

مشابہت ملی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تیسرا وصف یہ ملا کہ جسم حق بنے گا۔ باطل اس کے آس پاس نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کے اندر قرآن روح بن کر سرایت کر گیا ہے اور وہ حق ہی حق ہے۔ بطلان اس کے آس پاس نہیں باطل دُور سے ہی بھاگے گا۔

حافظ قرآن کی حیات دائمی ہے..... اگر اس پہلو کو دیکھیں کہ وہ حیات ہے اور آپ نے حیات کو اپنے اندر ڈال لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندہ ہیں مُردہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مُردنی بدن پر طاری ہوگی اور بدن پہلے ہی سے باطل ہے۔ اسے موت آجائے تو کون سے بڑی بات ہے۔ اصل میں زندہ روح ہے۔ اس کا زندگی کا سامنا تو وہ دوامی زندگی ہے۔ تو حافظ اور قاری مرنے والا نہیں۔ روح اس کی جاری و ساری ہے۔ نہ حافظ مرتا ہے نہ قاری مرتا ہے نہ عالم مرتا ہے بلکہ اس کا بدن مرتا ہے۔ اس کی روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اس روح کا فیضان اس عالم میں پہنچتا رہتا ہے۔ اس لئے موت حقیقت میں اس کے پاس بھٹکتی ہی نہیں اور موت کا یہ حاصل ہے کہ بدن کھانے پینے کے قابل نہ رہا بلکہ روح کھانے پینے کے قابل ہے۔ اسے وہاں بھی غذا مل رہی ہے۔ یہاں بھی مل رہی ہے۔ یہاں بھی اس کی غذا علم و معرفت تھی اور برزخ میں بھی اس کی غذا علم و معرفت ہے اور جنت میں بھی اس کی غذا اعلیٰ سے اعلیٰ علم و معرفت ہوگی، تو ہر جگہ اسے زندگی ہے۔ بدن کو یہاں غذا ملتی تھی مگر بہت سی دفعہ بیمار ہو کر یہاں بھی محروم ہو جاتا ہے۔ برزخ میں پہنچا وہاں بھی محروم ہوگا۔ حشر میں پہنچے گا تو وہ وہاں بھی محروم رہے گا۔ جب تک وہ روح کے ساتھ نہ ملے کوئی اس کی قدر و قیمت نہیں۔

تو بدن کی نہ یہاں زندگی نہ برزخ میں زندگی اور نہ وہاں زندگی اور روح یہاں بھی زندہ، برزخ میں بھی زندہ اور عالم آخرت میں بھی زندہ اور روح کی غذا یہی قرآن کریم ہے جس سے حیات ابدی ملتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حافظ قرآن مرتا نہیں وہ زندہ ہی رہے گا۔ اس کے لئے موت نہیں، ایک خسی موت ہے کہ بدن ناکارہ ہو جائے۔ روح اسے چھوڑ کر چلی جائے مگر روح جو لے کر گئی ہے وہ قائم ہے اس کے ساتھ وہ اس سے نپٹنے والی چیز نہیں وہ قرآن ہے جو روح ہے بلکہ روح خداوندی ہے۔ تو حافظ کی شان یہ ہے کہ باطل اس کے پاس نہیں آئے گا، جس حد تک وہ قرآن کو لے چکا ہے اور حیات اس کی دائمی بن گئی ہے اور وہ مشابہ بن گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور خطابات اسے مل گئے کس کے ایسے نصیب ہیں۔ اسی واسطے اس کا اثر یہ ہوگا۔

حافظ قرآن کے والد کی تاجپوشی..... حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: قیامت کے دن حافظ کے باپ کی تاجپوشی کی جائے گی یعنی میدان حشر میں جہاں اولین و آخرین جمع ہوں گے تاج پہنایا جائے گا جس کی نورانیت سے پورا حشر منور ہوگا۔ اعلان ہوگا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن کریم یاد کرایا تھا۔ یہ آج اس کی عزت افزائی ہو رہی ہے، جو تاج پوشی کی گئی ہے۔

دنیا میں اگر کسی کی تاجپوشی کی جائے تو یہ عظیم ترین اعزاز ہے اس سے بڑھ کر کوئی فخر و اعزاز کی چیز نہیں۔ لیکن

کسی بادشاہ کی اگر تاج پوشی ہو تو اس ملک کے جو اعیان ہیں وہ جمع ہوتے ہیں اور بادشاہ کو تاج پہنا کر اعلان کرتے ہیں کہ آج سے یہ ہمارا بادشاہ ہے ملک والوں کو فخر ہوتا ہے۔ اس میں ہر اقلیم کے لوگ جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے ملک والے لوگ جمع ہو کر تاج پہنائیں گے۔ اور ایک یہ کہ اگر مان لیا جائے کہ کسی کی تاج پوشی میں ساری دنیا کے ملکوں کے نمائندے جمع ہو گئے اور سب نے کھڑے ہو کر تاج پہنایا مگر اس زمانہ کے جو لوگ گزر چکے ہیں وہ تو نہیں آویں گے یا آئندہ آنے والے ہیں وہ تو شریک نہیں ہوں گے پھر تاج پوشی ناقص رہی۔

مگر میدان محشر میں آدم کی ساری اولاد جمع ہوگی۔ اول سے آخر تک۔ اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہوگا۔ صدر حق تعالیٰ شانہ ہوں گے۔ ملائکہ علیہم السلام معاون ہوں گے، جلسہ کے تمام آفاق پر زمینوں پر ان کی فوجیں کھڑی ہوئی ہوں گی۔ بیچ میں بنی آدم ہوں گے۔ اس میں مسلم غیر مسلم سبھی ہوں گے۔ ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا ہوگا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے حفظ کرایا اس کی تاج پوشی کی جائے گی۔ تو اولین و آخرین جمع تاج پہنانے والے خدا تعالیٰ تو اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کون سا موقع ہوگا۔ حافظ کو اپنی ذات سے جو تھوڑا تھا ہی۔ اس کے ماں باپ تک یہ اثر پہنچا کہ ان کو بادشاہ بنادیا کیا ان کی تاج پوشی کی گئی اور اولین و آخرین میں شور یہ ہوگا، بھائی انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔ تو بہر حال خود کلام کو دیکھو تو وہ حق محض ہے جس میں باطل پاس نہیں آ سکتا جس محل میں آیا بچے کے وہ اتنا بلند ہوا کہ اسے مشابہت حاصل ہوئی حضور سے صلی اللہ علیہ وسلم اسے القاب ملے حق تعالیٰ شانہ کے حیات ملی اسے دائمی۔ اس کے اثرات متعدی ہوئے تو ماں باپ تک اثرات پہنچے۔ اور ماں باپ کی تاج پوشی کی گئی۔ اولین و آخرین میں شہرت ہوئی۔ تو گویا قرآن کے آثار دنیا سے لے کر برزخ تک اور برزخ سے لے کر آخرت تک سب سے اعلیٰ ہیں۔

قرآن حکیم کی ابدی حکومت اور پھر یہی نہیں کہ یہیں ختم ہو جائیں بلکہ آگے جنت تک بھی یہ اثر چلتا رہے گا۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ: حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّلْ وَارْتَقِ تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا جنت کے درجات کما تا جا۔ اس کی جزایہ ہے کیونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: جتنی آیات ہیں قرآن کی اتنے ہی درجات ہیں جنت کے۔ ہر درجہ میں تفصیلات تو لاکھوں ہیں۔ لیکن نوعی طور پر درجات کی وہی تعداد ہے جو قرآن کی آیتوں کی تعداد ہے۔ اب جیسے قرآن کی کوئی آیت ہے چار حرفوں کی۔ اس کے اندر غور کرو تو ہزاروں قسم کے درجات نکلیں گے۔ تفصیل کھولو تو احکام الگ نکل رہے ہیں۔ لطائف الگ نکل رہے ہیں۔ علل الگ نکل رہی ہیں۔ اسرار الگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں اس کے کمالات کی تفصیلات کی آیت ایک ہی ہے۔ تو قرآن کی ایک آیت مستقل موضوع ہے علم و کمالات کا۔ لیکن مجمل دیکھا جائے تو انواع علوم کی اتنی ہیں جتنی آیات ہیں۔ اور درجات جنت کے اتنے ہی ہیں جتنی آیتیں ہیں۔ تو فرمایا جائے گا اس حافظ قرآن سے کہ تلاوت کرتا جا۔ جہاں تک تیری طاقت ہے۔ درجات کما تا جا اور پھر ہر درجہ کی تفصیل الگ ہے۔ جیسے آیت کے اندر تفصیلات ہیں۔

لاکھوں علوم بھرے پڑے ہیں۔ تو جو درجہ جنت کا کمائے گا اس کی نعمتوں کی تفصیلات اتنی ہیں کہ کوئی حد و نہایت نہیں ہے ابد الابد گزر جائے گا۔ مگر وہ سیر و سیاحت میں ہی رہے گا اور نعمتیں کما تارہے گا۔ تو قرآن کی حکومت دنیا میں ہی نہیں برزخ میں ہی نہیں حشر میں ہی نہیں بلکہ جنت میں ابد الابد تک رہے گی۔ اس واسطے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ میرا اور آپ کا کلام نہیں۔

قرآن کریم کے ابدی آثار کی وجہ..... ہمارا کلام جب فضا میں آتا ہے تو وہ گم نہیں ہوتا وہ مٹا نہیں، اس کو فضا گھیر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام جب چلتا ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ ساری فضا کو گھیر لیتا ہے ساری فضا اس کا محل بن جاتی ہے۔ تو فرق یہ ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ نے فضا کو گھیرا اور ہمارے کلام کو فضا نے گھیر لیا ہے جسے ریڈیو نے ضبط کر کے دنیا تک پہنچا دیا۔ اگر فضا میں محفوظ نہ ہوتا تو ریڈیو کس کو پیش کرتا، اسی پر ریڈیو کی ایجاد مبنی ہے کہ جو لفظ ہم بولتے ہیں فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا ہے ﴿مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ ① کوئی لفظ کوئی ہاں ہوں تم اپنے منہ سے نہیں نکالتے مگر ناکٹنے والا اسے ناکٹ لیتا ہے، محفوظ کر لیتا ہے ہر ہر لفظ محفوظ ہے، ہر ہر ادا محفوظ ہے اور آواز محفوظ ہے اور قیامت کے دن وہ سامنے کر دی جائے گی، وہ عمل بھی وہ ہیئت بھی وہ قول بھی اس قول کی آواز بھی وہ زمانہ بھی ہر چیز محفوظ ہے۔ تو بہر حال ہماری آواز جب نکل جاتی ہے منہ سے تو گم نہیں ہوتی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کلام نکلے وہ گم ہو جائے۔ ہمارے اور آپ کے کلام کو تو فضا گھیر کر محفوظ کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام نکل کر ساری کائنات کو گھیر لیتا ہے تو وہ کیسے گم ہو سکتا ہے وہ تو گم ہونے والی چیز نہیں، جس میں وہ کلام خدا جذب ہوگا۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ گم ہونے والی چیز نہیں ہے آخرت تک اس کے آثار و برکات چلتے ہی رہیں گے۔

حافظ قرآن کا حق شفاعت..... حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو حق دیا جائے گا کہ اپنے عزیزوں میں سے دس کی شفاعت کر خواہ وہ ماں باپ ہوں، بھائی بند ہو۔ تجھے حق ہے دس آدمیوں کی شفاعت کا جس کی چاہے شفاعت کر اور اگر کسی نے گھر میں سے پانچ بچوں کو حفظ کرا دیا ہے تو پچاس آدمیوں کی شفاعت کا حق ہو گا ان کو اگر گھر میں پچاس آدمی نہیں تو باقی شفاعت اوروں کے کام آئے گی۔ گھر والے تو بخشے ہی جائیں گے۔ باقی شفاعت اوروں میں پہنچ جائے گی۔

کسی کو شفاعت کا حق دیا جانا بڑی عزت و عظمت کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ بخشا بخشوایا ہے۔ جب ہی تو اس کو دوسروں کو بخشوانے کا حق دیا جا رہا ہے کہ تو شفاعت کر دس آدمیوں کی ہم قبول کریں گے۔ اسی طرح سے علماء کو حق دیا جائے گا۔ شہداء کو حق دیا جائے گا کسی کو سات کسی کو دس آدمیوں کی شفاعت کا۔ اب اگر سارے ہی گھر والے حافظ ہیں تو ان کی شفاعت کہاں تک پہنچے گی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

ابدی سر بلندی..... بہر حال جن ماں باپ نے اپنے بچوں کو حفظ کرایا ہے۔ وہ یہاں بھی محروم نہیں وہاں بھی محروم نہیں۔ یہاں بھی ان کے لئے برکات ہیں وہاں بھی ان کے برکات ہیں۔ بچہ ابھی چھ سات برس کا ہوتا ہے مگر جب پیش کرتے ہیں پہلے ماں باپ کا نام آتا ہے کہ فلاں صاحب کا بیٹا ہے جس نے قرآن حفظ کیا تو پبلک جان گئی کہ بچہ یہ ہے باپ یہ ہے۔ اس باپ کا احسان ہے جو اس بچہ کو قرآن حفظ کرایا۔ تو دنیا میں بھی سر نام ہوا اور آخرت میں تو تشہیر ہوگی ہی۔ اولین میں آخرین میں تو بچہ بھی اور ماں باپ بھی سارے کے سارے ہی سر نام ہوں گے۔

عظمت قرآن کریم..... بہر حال قرآن کریم کی عظمت کے سینکڑوں پہلو ہیں جو احادیث میں فرمائے گئے وقت اتنا نہیں ہے کہ اور سارے پہلوؤں کا ذکر کیا جائے اور سارے پہلو ذکر میں آ بھی نہیں سکتے۔ یہ دو چار پہلو ذکر کر دیئے گئے ہیں کہ یہ قرآن کے پہلو ہیں جن سے قرآن کریم کی عظمت واضح ہوتی ہے اور ان بچوں کو پگڑی باندھ کر چند چیزیں ذہن میں آئیں کہ بڑی اور بڑی خوش نصیبی ہے ان بچوں کی، کہ حق تعالیٰ نے ان کو یہ فضیلت عطاء فرمائی۔ اور یہ بھی کم فضیلت ہے کہ ایک نالائق یہاں آ کر بیٹھا کرسی کے اوپر کہ بچوں کی پگڑی باندھے اور آپ نے پاس نامے میں یہ کس کی تعریفیں کر دی؟ حالانکہ یہ مبالغہ ہے اور میں کہتا ہوں کہ: مبالغہ تو جھوٹ کی قسم ہے اور آپ لوگ بری ہیں خدا نخواستہ جھوٹ بولیں۔ آپ نے تو اپنے نزدیک سچی باتیں کہی ہیں۔

نگاہ محبت..... مگر یہ کہتا ہوں کہ: آپ نے ایک نالائق بھائی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور محبت کی نگاہ سے کوئی چیز بری نہیں لگتی ہے۔ اس کا عیب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سب محبت کرنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبت اور اخلاص سے جب انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو عیب دار کے عیب بھی چھپ گئے اور ساری چیزیں انہیں خوبیاں ہی خوبیاں نظر پڑیں تو خوبیاں سراہنی شروع کر دیں حالانکہ وہ خوبیاں کہاں اور ہم جیسے کہاں؟ اور سادگی سے میں یہ کہتا ہوں کہ: یہ تو آپ نے اپنی تعریف کی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنے حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک ناکارہ بھائی کو بہت بڑھایا آپ میں وسعت تھی جب ہی تو آپ نے بڑھادیا۔ تو وسعت قلبی کا ثبوت آپ دیں تو شکریہ میں کیوں ادا کروں؟ یہ تو آپ نے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔

برکت سے بڑھ کر برکت..... اور میں کہتا ہوں کہ نہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو اور نہ ہم تمہارا شکریہ ادا کریں۔ بس ہم سب مل کر اپنے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہم پر اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں ایک جگہ جمع کیا۔ ہمارے بچوں کو حافظ بنایا۔ ہمیں توفیق دی کہ ان کو پگڑی باندھیں، ہمیں توفیق دی کہ ان کو سند دیں اور اس قرآن کریم کی تعلیم کو ہم آگے چلائیں۔ یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے جو ہمیں توفیق عطاء فرمائی۔ تو بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں کہ ہمیں جمع کر دیا کہ مسلمانوں کا اجتماع یہ خود ایک مستقل نعمت ہے اور برکت ہے اور اجتماع ہو قرآن کے لئے یہ برکت سے بھی بڑھ کر برکت ہے۔ اور قرآن سے بھی افادے کے لئے وہ آگے

بڑھیں تو یہ برکت در برکت در برکت ہے۔

تو اتنی برکات اور اتنی نعمتیں ہمیں عطا فرمائیں تو اس لئے اصل میں مستحق تو شکر کے وہ ہیں۔ وَلَهُ الشُّكْرُ الْحَسَنُ وَلَهُ الْكِبَرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ عزت والا وہ شکر کا مستحق وہ حمد و ثنا اس کے لئے۔ تو ہم سب مل کر اس کی حمد و ثناء کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ مدرسہ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع فرمائے اور اس کے معلم اور ہمارے قاری صاحب کی عمر دراز فرمائے اور ان کے ایثار اور اخلاص میں اور زیادہ برکتیں عطا فرمائے اور ہمارے اس قصبے اور علاقے کے لوگوں کو اور زیادہ توجہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيْمُ۔

آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِمَعْرِفَةِ سُبُلِ الْاِجْتِهَادِ وَتَقْلِيدِهِ وَارْشَدَنَا اِلَى طَرِيقِ اتِّبَاعِ الْاِثْمَةِ وَتَأْيِيدِهِ ، فَسَوَّرَ قُلُوبَنَا بِشُمُوعِ اَعْلَامِ السُّنَنِ وَجَنَّبَنَا بِهَا عَنْ فِتَنِ الضَّلَالَةِ وَالْعَوَايَةِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ . وَاخْتَارَ لَنَا بِحُسْنِ تَوْفِيقِهِ سُنَّةَ الْاِتِّبَاعِ وَيَسَّرَ لَنَا التَّجَنُّبَ عَنْ وَرْطَةِ الْبِدْعِ وَالْاِخْتِرَاعِ وَالصَّلَاةِ وَالسَّلَامِ عَلَى مَنْ حَبَّبَ اِلَيْنَا اِقْبَادَ الْمُتَّبِعِينَ بَعْدَ اِتِّبَاعِهِ وَرَضَى لَنَا الْاِهْتِدَاءَ بِهَدْيِ الرَّاسِخِينَ بَعْدَ الْوُقُوفِ عَلَيْهِ وَاِطْلَاعِهِ . فَتَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ ، لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ شَهِادَةً تَنْجِيَاغَنِ الْفُسُوقِ بَعْدَ الْاِيْمَانِ . وَتَكُونُ عِدَّةً لِّلتَّقْلِيدِ بِطُرُقِ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعِرْفَانِ . اَمَّا بَعْدُ !

شکریہ و تمہید..... محترم حضرات! میں اس تصور سے بھی نجل اور شرمسار ہوں کہ صدارت کے نام سے مجھ جیسے نااہل کو ایک ایسی جگہ پر لا بٹھایا گیا ہے جو کسی اہل ترین فرد کے لئے سزاوار ہو سکتی تھی اور اسی لئے مجھے اس منصب کے قبول کرنے میں حد درجہ تامل اور تردد تھا جس کا میں نے اعتماد کے لہجہ میں اظہار بھی کر دیا تھا لیکن وہ درخور پذیرائی نہیں ہوا۔ آخر کار اس جماعتی ارشاد سے روگردانی کو بے ادبی خیال کرتے ہوئے میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور ہو گیا اور آج اپنی بے بضاعتی کے ساتھ آپ کے حضرات سامنے ہوں۔ مجھے ان بے نفس بزرگوں کے اخلاص اور ایثار کی برکت سے جو اپنی صدارت کی دولت کو بے دریغ لٹا کر ہم جیسے نااہلوں کو مسند صدارت پر بٹھا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ قادر و توانا جو رسوم حسنہ میں حقیقت حسنہ ڈالتا ہے اور جو اچھی صورتوں کے سانچے میں اچھی سیرتیں القاء فرماتا ہے۔ اس رمی اعزاز کو حقیقت کا پیش خیمہ بنا دے اور اس مبارک ہیئت کو جو بزرگان کانفرنس کی عزت افزائی سے بصورت موجودہ نظر آ رہی ہے عین حقیقت کر دے۔ وَمَا ذَلِكْ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ

بنابریں میرا عقلی اور شرعی فریضہ ہے کہ میں ان تمام بزرگوں کا مخلصانہ شکریہ ادا کروں جنہوں نے مجھے بایں بے بضاعتی قبول فرمایا ہے۔ فَجَزَاهُمْ اللّٰهُ عَنِّيْ خَيْرَ الْجَزَاءِ وَ اَحْسَنَ الْاِيْهِمْ اَحْسَنَ الصَّلَاةِ . آمین

حضرت! اس مختصر تحریر سے میری غرض خفیہ یا فقہ حنفی کی دعوت و تبلیغ یا دعاویت و اشاعت نہیں یا اس کے منکرین یا غیر حنفی مسالک پر کوئی رد و انکار نہیں ہے کیونکہ یہ فقہی مسالک کچھ شرائع مستقلہ نہیں ہیں کہ ان کی دعوت و

تبلیغ کا سلسلہ چھیڑ کر ایک سے دوسرے مسلک پر رد و طعن یا ایک سے دوسرے کا ابطال کیا جائے یہ اجتہادی مسالک محض عملی راستے ہیں جو چلنے کے لئے صاف کئے گئے ہیں نہ کہ جنگ کے میدان ہیں جو لڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور نہ موجودہ نازک زمانہ جب کہ مسلمانوں میں ہزاروں مابہ النزاع موجود ہیں اس کے لئے موزوں ہی ہو سکتا ہے کہ ایک اور نزاع کو ہوا دی جائے۔

تحریر خطبہ کی غرض و غایت..... اس مختصر نوشتہ سے غرض اصولی طور پر اجتہاد و تقلید کے بارہ میں نقل صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی معتبر اور مستند یعنی شرعی اجتہاد کی تقلید کوئی بدعت سیئہ نہیں ہے کہ اسے قابل ملامت اور اس کے مرتکب کو مستوجب نکیر تصور کیا جائے بلکہ وہ ایک ایسا مسلوک راستہ ہے جو سلف سے لے کر آج کے خلف تک اجماعی طور پر دینی راہ گزر بنا رہا ہے اور امت نے اس کے سوا اپنے دین کے تحفظ کی کوئی اور صورت نہیں سمجھی۔ یہ غرض نہیں کہ تقلیدی مسلک سے انکار رکھنے والے کیسے ہیں اور کس حکم کے مستحق ہیں؟ میں اس سلسلہ میں ابتداء چند تمہیدی جملے اور بعد میں اصل مقصد کی چند باتیں عرض کروں گا جس کے خطا و صواب کا فیصلہ حضرات علماء کے ہاتھ میں ہے۔ فَإِنْ يَكُ ضَآوَابًا فَمِنْ اللّٰهِ وَإِنْ يَكُ خَطَآءً فَمِنْ نَفْسِي وَالْمَرْجُوُ الْمُسَامَحَةُ وَالْإِصْلَاحُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيقُ۔

اللہ کا کام اور اس کا کلام..... حضرات! اس عالم کی زندگی اور آبادی درونِ صرف دو چیزوں سے ہے بلکہ عالم میں آبادی صرف دو چیزیں ہیں ایک اللہ کا کام اور ایک اس کا کلام خدا کے کاموں سے کائنات عالم میں حسی نظام بنا ہے جسے عالم خلق کہتے ہیں اور اس کے کلاموں سے اقوام عالم کا یہ شرعی نظام استوار ہوا ہے جسے عالم امر کہتے ہیں۔ ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَالْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ ① پس عالم خلق ہو یا عالم امر دونوں میں اسی کی ذات و صفات اور کمالات علم و عمل کی جلوہ گری ہے اور تکوین و تشریع کے ان گونا گوں مظاہر میں اسی باطن مطلق کے محاسن اقوال و افعال ظہور کر رہے ہیں۔

ہرچہ دیدم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

تکوین و تشریع کا مبداء و معاد واحد ہے..... یہی وجہ ہے کہ تکوینی نظام بھی اسی سے چل کر اسی پر ختم ہوتا ہے اور تشریحی انتظام بھی اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی تکوین و تشریع اور امر کا مبداء اور معاد وہی اور صرف وہی ہے۔ عالم خلق کے بارے میں اپنے مبداء ہونے کو اپنے کلام پاک میں اس طرح ارشاد فرمایا ﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ﴾ ② ”وہی ہے جو آغاز فرماتا ہے خلقت کا“۔ پھر اسی آیت سے ملحق اپنے معاد خلق ہونے کی یوں تصریح فرمائی کہ ﴿ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ ”پھر وہی ہے جو خلقت کو (اپنی طرف) لوٹا لیتا ہے اور وہ اس پر بالکل سہل ہے“۔

① سورة الاعراف، الآية: ۵۳. ② پارہ: ۲۱، سورة الروم، الآية: ۲۷۔

جس سے واضح ہے کہ کائنات کی ابتداء و انتہا صرف اسی سے ہے کوئی غیر اس میں دخل نہیں اس طرح عالم امر کے بارہ میں اپنا مبداء ہونا یوں ظاہر فرمایا ﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۚ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ﴾ ① ”اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں اور انہی کی مانند زمینوں کو بنایا، اترتا رہتا ہے امران کے درمیان“ اور دوسری آیت میں اپنے مرجع الامور اور معاد امر ہونے کی یوں تعبیر فرمائی کہ ﴿وَالِلّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ ② ”اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹ جاویں گے“۔

جس سے نمایاں ہے کہ اوامر اور شرائع کا نازل کرنا اور آخر کار اپنی طرف اٹھالینا صرف اسی کا کام ہے اس میں کوئی مخلوق یا کوئی بشر شریک نہیں۔ پس نہ تخلیق و تکوین میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک ہے اور نہ تشریع و تعمیر میں کوئی اس کا سہیم و ندیم ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ ③

تکوین و تشریع کے اصول بھی ایک ہیں یہاں سے خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے کہ تکوین اور تشریع کو بروئے کار لانے والے ایک ہی اصول فطرت ہو سکتے ہیں جو ﴿فَاطَرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ④ کی فطرت سے ناشی ہیں کہ وہی ان دونوں کا مبداء اور انتہا ہے انہی اصول کو جب تخلیق میں استعمال کیا گیا تو عالم مخلوقات مکمل ہو کر سامنے آ گیا اور انہی کو جب تشریع میں بکار لایا گیا تو عالم مشروعات تیار ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

چنانچہ حق تعالیٰ کی صفت ثانی و تدریج یا صفت ربوبیت کا اصول جس کے معنی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کسی شے کو اس کی حد کمال تک پہنچانے کے ہیں جب تکوین کے ساتھ ہم کنار ہوا تو بتدریج مخلوقات کا نظام مکمل ہو کر اس ہیئت کذائی پر آ گیا جو آج زمین و آسمان شجر و حجر، حیوان و انسان اور پوری منظم کائنات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور وہی تدریج کا اصول جب تشریع سے ہم آغوش ہوا تو بتدریج ہی شرائع کا نظام بھی کامل و تام بن کر اس ہیئت کذائی پر سامنے آ گیا۔ جو اسلام کی صورت میں ہمارے آگے ہے۔ مخلوقات کا نظام کی اس تدریجی ساخت اور تعمیلی مدت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی کہ ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾ ⑤ ”بلاشبہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں، پھر چھا گیا عرش پر کہ امر کی تدبیر فرمائے“۔ اس کی تفصیلات دوسری آیات اور احادیث میں موجود ہیں کہ کتنے دن اور کون سے دن میں کیا چیز بنی اور اس نے اپنی تکمیل میں کتنی مدت لی۔ آیت سے بالا بحال یہ واضح ہے کہ یہ مجموعہ کائنات چھ (۶) دن میں تیار ہوا، اس کے ساتھ جب یہ آیت بھی ملائی جائے کہ ﴿وَإِنْ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ ⑥ ”اور ایک دن آپ کے پروردگار کا مثل ہزار برس کی مدت کے ہے جو تم شمار کرتے ہو“۔

① پارہ: ۲۸، سورة الطلاق، الآية: ۱۲۔ ② پارہ: ۲، سورة قال عمران، الآية: ۱۰۹۔ ③ پارہ: ۷، سورة انعام، الآية: ۵۷۔

④ پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآية: ۱۔ ⑤ پارہ: ۱۱، سورة يونس، الآية: ۳۔ ⑥ پارہ: ۷، سورة الحج، الآية: ۴۷۔

تو نتیجہ نکلتا ہے کہ کائنات خلق کی تکمیل رفتہ رفتہ چھ ہزار برس میں ہوئی۔ ادھر شرعیاتی نظام کی تدریجی ترقی و تکمیل کی طرف بھی قرآن نے اشارہ فرماتے ہوئے تعلیمات الہیہ کا اولین مورد اور خلافت ربانی کا پہلا مرکز حضرت آدم علیہ السلام کو بتلایا ان کی علمی خلافت کے بارہ میں جو عالم امر کی ابتداء ہے۔ قرآن عزیز کا ارشاد ہے ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ﴾ ① اور خلافت نبوۃ کے بارہ میں جو عالم امر کی آخری کڑی ہے۔ حدیث ابوذر غفاریؓ میں جسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے آدم علیہ السلام کو اول الانبیاء اور نبی مکلف فرمایا گیا جن پر آسانی صحف نازل ہوئے ② غرض قصر نبوت کی تعمیر آدمؑ سے شروع ہوئی جو نبوت اور علم نبوت کے پہلے مرکز تھے جن سے عالم امر کا آغاز ہوا۔ پھر اس قصر نبوت کی آخری خشت جس سے یہ قصر مکمل ہوا۔ حدیث ابی ہریرہؓ میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ: خَتَمَ بِي الْبُيُوتِ وَخَتَمَ بِي الرُّسُلِ (وَلَفِي رِوَايَةٍ) فَأَنَا السُّبُّنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ ③ ”مجھ سے قصر نبوت مکمل کر دیا گیا اور رسول ختم کر دیئے گئے (اور ایک روایت میں ہے) پس میں وہ خشت ہوں جس سے یہ قصر مکمل ہوا اور میں خاتم النبیین ہوں۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس علم نبوت اور ختم نبوت کے آخری مرکز تھے جن پر عالم امر کا اختتام کر کے اس کی تکمیل کر دی گئی۔ چنانچہ قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری اور وداعی حج کے دن دین کی اس تدریجی تکمیل کے آخری نتیجہ کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا کہ ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ ④ ”آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں تم سے دین کے بارے میں اسلام سے راضی ہو گیا۔“

اگر مورخین کا یہ قول اختیار کیا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے چھ ہزار سال بعد دودھ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہوتا ہے اور آپ ساتویں الف کے آغاز میں مولود اور مبعوث ہوئے ہیں (جس پر بعض آثار صحابہؓ اور احادیث بھی شاہد ہیں جن کو ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے) تو واضح ہوگا کہ تکوینیات کی طرح تشریعیات کی تکمیل بھی چھ ہزار سال میں ہوئی ہے اور جس طرح تکوین و تشریع میں تدریج و تانی کا اصول مشترک تھا اسی طرح اس کی مدت بھی مشترک اور یکساں ثابت رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے چھ دن یا دنیا کے چھ ہزار سال کی مدت میں مخلوقات اور مشروعات کا نظام مکمل ہو کر اس درجہ پر پہنچا دیا گیا کہ اب اس میں نہ کمی کی گنجائش رہی نہ زیادتی کی نہ ترمیم کی نہ تنسیخ کی کہ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ یعنی جس طرح کائنات عالم کے کلی مواد آب و خاک و باد و آتش پھر مواد کے کلی موالید جمادات، نباتات، حیوانات،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱، ② مسند احمد، حدیث ابی ذر الغفاریؓ، ج: ۳۳، ص: ۳۲.

③ الصحيح للبخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین ﷺ، ج: ۱۱، ص: ۳۶۶، والصحيح لمسلم، کتاب الفضائل، باب

ذكر كونه ﷺ خاتم النبیین، ج: ۱۱، ص: ۴۰۲، ④ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳.

پھر ان کے علویات اور سفلیات۔ پھر مواد علوی و سفلی کی جامع انواع و اجناس، انسان، شیر، بکری، شجر حجر اور محروبر، جن، ملک سیارات و ثوابت، ارض و سماء وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کی بیشی قبول نہیں کر سکتے۔ اسی طرح دین کے اصول و کلیات اساسی قواعد و ضوابط اور تمام منصوص عقائد و احکام کی اس مجموعی ہیئت کدائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کی بیشی اور ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں کہ ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسِنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ ①

ایجاد اور اجتہاد..... مگر ہاں جس طرح تکوین کے ان مرتب مواد اور علوی و سفلی ذخائر سے بواسطہ فکر و تدبیر نئے عجائبات کا اکتشاف کیا جاسکتا ہے اور ان کی چھپی ہوئی طاقتوں کا سراغ لگا کر تمدن کے نئے نئے کارنامے دنیا کو دکھائے جاسکتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کہ۔ لَا تَنْقُضُ عُرْوَتَهُ ②

اسی طرح تشریع کے منظم احکام و مسائل اور قواعد و کلیات کے مخفی علوم و اسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف و ظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جاسکتے ہیں کہ قرآن کی شان بھی لَا تَنْقُضُ عُرْوَتَهُ ③ سے عیسائیہ وارد ہوئی ہے۔ اس تکوینی اکتشاف کا نام ایجاد ہے اور تشریحی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔ نہ ایجاد کی کوئی حد ہے اور نہ اجتہاد کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانہ کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃ موجدین کی طبائع ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو طبائع کی یہ دوز بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی اجتہاد کا رنگ بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور وقت کے مقتضیات کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہدین کے قلوب فطرۃ چلتے ہی اس استخراج کی طرف ہیں جس کی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے۔ پس تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو گزر چکا ہے کہ زمانہ اس کی ضرورت سے فارغ ہو چکا ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع باقی رہ جاتا ہے۔ اجتہاد کی انواع..... مثلاً اگر عین دین میں اجتہاد کر کے استخراج علل و کلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ قدرۃ ادھر ہی چلیں گے اور اگر ان کلیات میں سے اجتہاد کے ذریعہ استخراج مسائل اور تدوین قانون کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ ادھر ہی متوجہ ہوں گے۔ اور پھر اگر ان متخرج مسائل کو واقعات پر منطبق کر کے ترجیح و انتخاب فتاویٰ کی ضرورت پڑے گی تو اجتہادات ادھر ہی بڑھیں گے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جو درجہ بھی اجتہاد کے ذریعہ پردہ ظہور پر آ جائے گا اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے قدرۃ بعد کے مجتہد دماغ اس کی طرف چل ہی نہ سکیں گے کہ ان کے لئے ان حاصل شدہ اجتہادات میں اجتہاد کرنے کی طرف کوئی کشش ہی نہ ہوگی کہ تحصیل حاصل سے فطرت ہمیشہ گریز کرتی رہی ہے کیونکہ حاصل شدہ شے سے صرف انتفاع کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے نہ کہ اسے حاصل کرنے کی۔

① پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ ۶۲۔

② السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن، ج ۱۰ ص ۱۳۷۔

مجتہد کا کام حقیقت رسی ہے..... اس سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے ہوں گے کہ موجد اور مجتہد کا کام محض سطحی امور کا دیکھ لینا نہیں بلکہ ان کی گہرائیوں میں گھس کر ان کی بنیادوں کا پتہ لگانا ہے۔ موجد کائنات کی اشیاء کی صورت سے گزر کر ان کی مخفی خاصیات کا پتہ چلائے گا تا کہ اس کی باطنی کلیت اور اندرونی وسعت سے اپنا علم وسیع کر کے کوئی ایجادی قدم اٹھا سکے اور مجتہد مسائل شرعیہ اور نصوص کے ظواہر سے گزر کر ان کے باطن میں گھسے گا تا کہ علل کلیہ اور اسرار جامعہ کا سراغ لگا کر ان جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے۔ خلاصہ یہ کہ جزئیات سے کلیات تک پہنچنا اور کلیات سے پھر نئے جزئیات نکالنا ان دونوں طبقات کا کرم ہو گا نہ کہ سامنے آئی ہوئی جزئیات کا یاد کر لینا کہ یہ درحقیقت حفظ ہو گا علم نہ ہو گا یا علم ادنیٰ ہو گا علم اعلیٰ نہ ہو گا۔

مثلاً تکوین کے سلسلہ میں دنیا کی بے شمار جزئیات و افراد زید، عمر، بکر، ثمر، حجر اور بحر و بر کا دیکھ لینا یا سن کر معلوم کر لینا کوئی قابل ذکر علم نہیں کہ یہ ہر عامی سے عامی انسان کو میسر آ سکتا ہے بلکہ یہ علم ہی نہیں حس ہے۔ خواہ آنکھ سے محسوس کرے یا کان سے ہاں یہ جان لینا کہ زید کن کلیات کے ماتحت زید ہے۔ اس کی حقیقت کی تشکیل کن کن کلیات سے ہو رہی ہے اور اس کی ماہیت میں کون کون سے کلیات حصہ دار ہیں۔ پھر زید جزئی کا اس کی ماہیاتی کلیات سے کیا رابطہ ہے حقیقت علم ہے جو جس کے مقام سے بالاتر ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ زید اور زید کی طرح عالم کی جزئیات منتشر اور بے جوڑ نہیں بلکہ ہر جزئیات میں بیسیوں کلیات سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ سب جزئیات اور افراد سمٹ کر کسی نہ کسی نوع کے تحت میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر ساری انواع سمٹ کر کسی نہ کسی جنس کے نیچے ہیں۔۔۔ پھر اجناس جمع ہو کر کسی جنس عالی اور جنس الالاجناس کے تحت میں آ جاتی ہیں اور کائنات کی اس فطری ترتیب و تنظیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عالم کی تمام جزئی کثرتیں سمٹ کر کلیات کی طرف اور کلی وحدتیں پھیل کر جزئیات کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ زید جزئی بظاہر تو ایک جزوی شخص ہے لیکن بہ نگاہ غائر وہ ایک مستقل جہاں ہے جس میں ترتیب وار یہ سینکڑوں کلیات اور عومات سمائی ہوئی ہیں اور اس کی زیدیت کی تشکیل و تکمیل کر رہی ہیں۔

اس جزئی زید کے اوپر انسان کلی ہے۔ جس میں زید کی طرح لاکھوں افراد انسانی لپٹے ہوئے پڑے ہیں۔ پھر انسان کلی کی حقیقت میں یا اس کے اوپر حیوان ہے جس میں حیوان کی طرح لاکھوں نمودار نباتاتی انواع کھپی ہوئی ہیں۔ پھر نامی کی اصل جسم ہے جس میں نامی کے ساتھ لاکھوں غیر نامی اور بے نمودارات شریک ہو گئے ہیں۔ پھر اس جسم مطلق سے اوپر جوہر ہے جس میں اجسام کے ساتھ ان گنت غیر جسمانی مجردات بھی آ جاتے ہیں۔ پھر جوہر سے اوپر وجود ہے جو کلی الکلیات اور جنس الالاجناس ہے جس کے نیچے جوہر کے ساتھ لاکھوں اعراض بھی آ جاتے ہیں پس ساری کائنات کے یہ مختلف الماہیات اور شاخ در شاخ اجزاء ان درمیانی کلیات سے گزرتے ہوئے وجود میں جمع ہو جاتے ہیں جو ان سب کی اصل اصول ہے اور اس طرح ایک زید کے بنانے میں کس قدر کلیات نے اپنا کام

کیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وجود نے جو ہر کا لباس پہنا، جو ہر نے جسم کی قابو رکھی، جسم نے نمو کی ردا پہنی۔ نامی نے حیوانیت میں قدم رکھا۔ حیوان نے انسانیت میں ظہور کیا اور انسان نے ان سارے تشخصات کے ساتھ زید کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ پس زید مجموعہ اصول و کلیات نکلا جس کی جزیت میں کتنی ہی کلیات سمائی ہوئی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ سے خود متشکل ہو کر نمایاں ہو رہی ہیں۔

پس ایک عامی تو صرف زید کو دیکھ لے گا، لیکن ایک مفکر زید کے دیکھ لینے ہی پر قناعت نہیں کرے گا۔ اس کی گہری نظر ان مخفی کلیات و اسرار تک پہنچ کر رہے گی جن سے زید کا قوام بنا اور وہ بایں بیت کدائی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوا۔ اس لئے عامی کو جس میں صرف پیشانی کی آنکھ تھی مبصر کہیں گے لیکن اس باطن بین دانا کو جس کی مخفی آنکھ نے زید کے ان تمام مخفیات کو بھی دیکھ لیا مبصر ہی نہیں مبصر بھی کہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ زید کے جشہ کا دیکھ لینا علم نہیں بلکہ زید کی کلی حقیقت کو پالینا اور پھر ان جزئی زید کا اس کلیات سے ارتباط معلوم کر لینا علم ہے جو ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

شریعت حد درجہ مرتب اور منظم ہے..... بالکل یہی صورت شریعات کی بھی ہے کہ تشریع کے یہ لاکھوں مسائل اور شریعت کی یہ بیت کدائی محض سطحی اور نمائشی نہیں بلکہ پوری شریعت اپنے ظاہری مسائل اور باطنی دلائل نیز اپنے تمام فروع اور اصول کے لحاظ سے اس درجہ مرتب اور منظم ہے کہ وہ مثل ایک سیدھی زنجیر کے ہے جس میں یہ سارے اصول و فروع اور جزئیات و کلیات درجہ بدرجہ ترتیب وار پردے ہوئے ہیں۔

شریعت کا کوئی جزئیہ نہیں جو کسی نہ کسی کلیہ کے ماتحت نہ ہو۔ ہر ہر فرع کسی نہ کسی اصل کے ماتحت ہے۔ پھر ہر ہر اصول کسی نہ کسی اصل اصول سے مربوط ہے اور سارے اصول و کلیات سمٹ کر کسی ایک اصل اخیل سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس سے پوری شریعت ایک محیر العقول نظام کے ماتحت اور ایک ایسے شجر واحد کی صورت دکھائی دیتی ہے جس کی تمام شاخیں اور شاخ در شاخ ٹہنیاں مع اپنے ثمرات کے ایک اصل واحد سے ناشی ہو رہی ہیں اور ہر آن اپنے مستفیدین کو اپنے پھلوں سے بہرہ مند کر رہی ہیں۔ ﴿مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا﴾ ① ”مثال کلمہ طیبہ کی اس پاک درخت کی مانند ہے جس کی جڑ تو تہہ میں گھسی ہوئی ہو اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ پھل دے رہا ہو ہر آن اپنے پروردگار کی جانب سے۔“

پس آیات و احادیث میں جس قدر بھی جزئی احکام مذکور ہوتے ہیں جو زید عمر، بکر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ان کی تشکیل وہ اصول و کلیات و علل و اسرار کرتے ہیں جو ان جزئیات میں مستور ہوتے ہیں کہ ہر جزئی میں ایک علم کلی ہوتا ہے اور ہر علم کلی میں کوئی حکمت مصلحت کلیہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر ہر مصلحت کا تعلق کسی نہ کسی شان کمال

سے ہوتا ہے۔ پھر ہر شان کمال کسی نہ کسی صفت الہی سے مربوط ہوتی ہے جس سے نفس انسانی کی صفات نقص اس جزئیہ شریعت کی تکمیل کے ذریعہ کمال کا اثر قبول کرتی ہیں اور پھر یہ صفات کمال ذات بابرکات سے مربوط ہیں کہ کمالات کا منبع ہی وجود ہے جیسے شروع کا منبع عدم ہے۔

حرف خوش راست اندر معنی معنی در معنی در معنی

اسی طرح ساری شریعت بالاخر ان درمیانی اصول و کلیات اور شؤون و صفات سے گزرتی ہوئی اپنے وجود سے جا کر جڑ جاتی ہے۔ یعنی شریعت کے تمام اوامر و نواہی جو بمنزلہ افراد کے ہیں اپنی اپنی علل کے نیچے ہیں جو بمنزلہ انواع کے ہیں۔ پھر یہ تمام انواع سمٹ کر دو جنسوں کے نیچے آ جاتی ہیں۔ معروف اور منکر پس سارے مامورات کا سرچشمہ معروف ہے اور سارے منہیات کا سرمنشاء منکر ہے۔ اسی کو قرآن عزیز نے یوں واضح کیا ہے کہ ﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُونًا عِنْدَهُمْ فِي الْتَوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ① ”وہ جو پیروی کرتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نبی امی ہے پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات و انجیل میں، جو انہیں معروف کا امر کرتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔

پس اصل میں مامور بہ معروف اور منہی عنہ، منکر ہے اب جس چیز میں معروفیت ہوگی وہ مامور بہ بن جائے گا اور جس میں منکریت ہوگی وہ منہی عنہ، ہو جائے گا۔ اس لئے بالذات مامور یعنی معروف و منکر ہے کہ وہی حسن بالذات اور قبح بالذات ہوتے ہیں اور بالعرض وہ چیزیں مامور یعنی منہی ہیں جن میں وصف معروفیت اور وصف منکریت موجود ہو کہ ان کا حسن ذاتی نہیں ہوتا لغیرہ ہوتا ہے۔ پس یہ معروف و منکر کی دونوں اجناس اللہ کی صفت عدل کے نیچے آئی ہوئی ہیں۔ عدل الہی کا تقاضا ہے کہ معروفات برسر کار آئیں اور منکرات زیر ترک رہیں: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ”اللہ تعالیٰ امر فرماتا ہے عدل اور احسان کا اور روکتا ہے فحشاء و منکر سے۔“

پس دین کے حق میں یہ صفت بمنزلہ جنس عالی کے ہے اور ظاہر ہے کہ عدل حصہ ہے اس کے وجود کا یعنی وجودی کمال ہے اس لئے گویا سارے اوامر اور نواہی وجود الہی سے مربوط ہو گئے اور اس طرح پوری شریعت ذات بابرکات سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے ذیل کی امثلہ پر غور کیجئے۔

تنظیم شریعت کی چند امثلہ..... ① ﴿وَلَا تَقْرُبُوا الزِّنَىٰ﴾ (زنا کے پاس بھی مت پہنکو) اور ساتھ ہی اس کی علت نقل فرمائی کہ ﴿إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً﴾ ② (کیونکہ زنا فحش ہے) پس بظاہر تو ﴿لَا تَقْرُبُوا﴾ کا حکم زنا پر لگ رہا ہے مگر حقیقہ فحش پر لگا ہوا ہے کہ فحش ہی کی وجہ سے زنا حرام ہوا ہے۔ اگر اس میں فحش کی شان نہ ہوتی تو وہ ہرگز حرام نہ ہوتا۔ چنانچہ دوسری جگہ کتاب مبین میں اس کی تصریح بھی ہے کہ ﴿وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ

وَالْمُنْكَرِ ① ”اور اللہ روکتا ہے فحش سے اور منکر سے“ پس حکم کی شکل یوں ہو گئی کہ ﴿الزَّانِي فَحْشٌ وَالْفَحْشُ حَرَامٌ فَالزَّانِي حَرَامٌ﴾ ”زنا فحش ہے اور فحش حرام ہے لہذا زنا حرام ہے“

پس اصل میں فحش کی جس حرام نگلی اس کی وجہ سے زنی کا جزئیہ حرام بن گیا۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ فحش کی علت کلیہ جن جن افعال میں پائی جاتی رہے گی اور وہ حرام ہوتے جائیں گے لیکن اس کا پتہ چلانا کہ فلاں جزئیہ میں فحش کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ہر ایک کا کام نہیں یہاں سے مجتہد کے کام کا دائرہ شروع ہوتا ہے کہ فحش کی شان کسی فعل میں ثابت کر کے اس پر حرمت کا حکم لگا دے یہ ایسے ہی مجتہد دماغوں کا کام ہے جنہیں تشریع سے فطرۃً اور ذوقاً مناسبت ہو اور اللہ نے وہ ملکہ ان میں قدرۃً ودیعت فرمایا ہو۔

پھر فحش کے حرام ہونے کی بھی ایک علت ہے جس کی وجہ سے فحش میں حرمت آئی اور وہ اللہ کی صفت حیاء ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ حَيٌُّ سَبِيحٌ ② صفت حیاء کا فطری تقاضہ ہے کہ اس کے بندوں میں فحش نمایاں نہ ہو۔ پس حکم جزئی یعنی حرمت زنی حرمت فحش سے ناشی ہے اور حرمت فحش اللہ کی صفت حیاء سے نکلی ہے۔ اس لئے زنی کے ساتھ اور بھی تمام فواحش کی حرمت کی علت کلی خدا کی ایک صفت کمال نکلی جو اس کے وجود لاحقہ و داکا ایک حصہ ہے۔ پس جس شخص میں حیاء درجہ حال کو پہنچ چکی ہو اور وہ ظاہر یا باطناً فیما بینہ و بین اللہ اور فیما بینہ و بین الخلق حیاء کامل کے لئے مضطر ہو چکا ہے۔ ادھر قلب میں ذوق اجتہاد رکھتا ہو اور دماغ میں کمال عقل تو بلاشبہ وہی اس حیاء اور اس کے تقاضی سے حرمت فحش اور اس کے تقاضی سے حرمت زنی اور پھر حرمت زنی کے تقاضی سے عموماً وداعی زنی کو جو ہر زمانہ میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتے ہیں، پہچان کر حرمت کا حکم لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس اجتہاد سے تشریع کا یہ دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا اور ایک حکم زنی سے کس قدر احکام پیدا ہو جائیں گے جو مجتہد کی دیانت و امانت اور فقہ و اجتہاد کا ثمرہ ہوں گے۔ پس ایسے احکام میں جہاں یہ علل کلیہ ظاہر نص میں موجود ہوں۔ مجتہد کا کام قیاس ہے کہ علت کے اشتراک سے اس جزئیہ پر دوسرے جزئیات کو قیاس کر کے ان پر حرمت کا حکم لگا دے اور احکام کا دائرہ وسیع تر کر دے۔

③ اور کبھی نص میں صرف حکم ہی مذکور ہوتا ہے اور اس کی علت حکم میں مستور مخفی بھی ہوتی ہے لیکن جن چیزوں پر یہ منصوص حکم لگایا جاتا ہے ان میں خلقی طور پر کچھ اوصاف ہوتے ہیں جو حکم میں موثر ہوتے ہیں۔ گویا علت حکم ان اوصاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے جس کو مجتہد کی گہری نظر ان اوصاف میں سے نکھار کر نکال لیتی ہے اور علت حکم کھل جانے پر یہ حکم جزئی بمنزلہ کلیہ کے ہو کر دوسری جزئیات میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک مجتہد کے نور اجتہاد سے یہ جزئی حکم ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیتا ہے جس سے شریعت کی تفصیلات اور ترتیبات نمایاں ہوتی ہیں۔

① پارہ: ۱۲، سورۃ النحل، الآیہ: ۹۰، ② السنن لابی داؤد، کتاب الحمام، باب النهی عن النعری ج: ۱۱

ص: ۲۶، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۹، ص: ۱۲، رقم: ۳۰۱۲۔

مثلاً احادیث دیسوا میں اشیاء ستہ ۱۔ گندم، ۲۔ جو، ۳۔ مچھو بارہ، ۴۔ نمک، ۵۔ سونا، ۶۔ چاندی، میں سود لینا حرام فرمایا گیا۔ لیکن حرمت کی لیم اور علت کسی حدیث میں مذکورہ نہیں اس لئے مجتہدین متوجہ ہوئے کہ حکم کی حکمت یا وجہ حرمت نیز اشیاء مذکورہ کی وجہ تخصیص کیا ہے؟ یعنی شارع نے آخر حرمت ربا کے لئے انہی اشیاء کو کیوں خاص فرمایا؟ تو سوائے اصحاب غلو اہر کے جو قیاس کے منکر ہیں۔ ہر ایک نے ان اشیاء کے اوصاف میں قوت اجتہادی سے غور کر کے کچھ ایسے جامع اوصاف نکالے جو علت حکم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ وصف جامع قدر مع الحسن ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: وہ طعمیت اور شمیت ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ اقیات و اذخار ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے وہی فرمایا: جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

بہر حال ہر ایک نے ایک علت حکم برآمد کی جس پر حرمت ربا کا حکم دائر ہے، اب جہاں جہاں جس کی نکالی ہوئی علت پائی گئی وہاں وہاں اس نے سود کی حرمت کا حکم لگایا۔ ایسے مواقع پر مجتہد کا کام پہلے استنباط علت ہے اور پھر قیاس حکم۔

۳ کبھی نص میں حکم کے برعکس نہ منصوص ہوتی ہے نہ محکوم نہ اس میں کوئی وصف ہی ایسا ہوتا، جس سے علت حکم کا استنباط کیا جاسکے۔ ایسی صورت میں مجتہد محض اپنے ذوق اجتہاد سے آگے بڑھتا ہے اور عام قواعد شرعیہ اور وضع تشریع کی مدد سے جن کے استحضار سے اسے تفرغ سے مناسبت اور اس کی اجتہادی قوت کی تشکیل ہوتی ہے۔ علت کا استخراج کرتا ہے اور حکم جزئی کو اس سے مربوط سمجھ کر پھر اس علت سے مختلف ابواب کو احکام قیاس کی مدد سے ظاہر کر دیتا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَتُوا النَّيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ ① ”گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو“۔ اجتہادی ذوق سے اس کا کلیہ جس سے یہ حکم ناشی ہے یہ ہے: اَفْعَلُوا الْأُمُورَ عَلَىٰ مَنَوالِهَا يَصْعَوُ الْأَشْيَاءُ فِي مَجَالِهَا ”کاموں کو ڈھنگ سے کرو، بے ڈھنگے پن سے مت کرو یا ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھو“۔

ظاہر ہے کہ دوازہ ہوتے ہوئے گھروں میں دیواریں پھلانگ کر گھسنا حد درجہ بے ڈھنگا پن، بد سلیقگی، ناشائستگی اور بے محل کام کرنا ہے۔ پس اصل میں ممانعت ہوئی ناشائستگی اور بے ڈھنگے پن کی۔ چونکہ یہ بے ڈھنگا پن دیواریں توڑ کر یا پھلانگ کر داخل خانہ ہونے میں پایا جاتا تھا۔ لہذا یہ فعل ممنوع ہوا کہ اس کی علت ممنوع تھی اور علت اس لئے ممنوع ہوئی کہ اللہ کی صفت جمال اور صفت عدل کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جمال کے معنی حقیقی موزنیت اور کامل توازن کے ہیں اور عدل کے معنی ”وَضَعَ الشَّيْءَ فِي مَحَلِّهِ“ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ بے ڈھنگا پن اور بد سلیقگی اس کے خلاف ہے، اس لئے ناپسندیدہ حق ہوئی کہ ”إِنَّ اللَّيْلَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ“ ② پس جس کے دماغی قوی میں توازن حقیقی حد کمال پر پہنچا ہوا ہو۔ گویا وہ اللہ کی اس صفت

① پارہ ۲، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۱۸۹۔

② الصحيح لمسلم: کتاب الايمان، باب تحریم الکبر و بیانہ، ج: ۱، ص: ۲۴۔

جمال سے مستعیر اور اس کے اس خلق سے متخلق ہے، ادھر قلب میں وہ وہی ملکہ اجتہاد بھی رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس کلیہ کے انکشاف کے بعد صرف اسی جزئی حکم پر قناعت نہیں کرے گا، جو آیت میں مذکور ہے بلکہ ہر باب کے ہر اس فعل کو ممنوع قرار دے گا جس میں یہ بے ڈھنگے پن کی علت پائی جائے گی۔ البتہ یہ معلوم کرنا کہ آیا اس میں یہ علت غیر موزونیت ہے بھی یا نہیں؟ نہ ہر ایک کا کام ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اس میں معتبر ہے۔

بہر حال علت کے انکشاف پر حکم جزئی کی توسیع موقوف ہے پس اگر یہ علت کلی ہوگی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مجتہد پر ایک کلیہ منکشف ہوگا جس سے بہت سی غیر معلوم جزئیات معلوم ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ مجتہد کے لئے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ ہوگی کہ اس نے کلیات کیوں بنا لئے کیونکہ وہ کلیات بنانا نہیں بلکہ بتاتا ہے۔ بنے ہوئے تو وہ خود ہی موجود ہیں کیونکہ علم میں جتنا خفا بڑھتا جائے گا اتنی ہی کلیت آتی جائے گی، پس مجتہد کا کمال یہ ہوگا کہ وہ ان خفیات کو نکال لے نہ یہ کہ کلیات کا پیش کرنا اس کے حق میں کوئی عیب اور نقص سمجھا جائے۔

انکشاف علوم میں نبی اور امتی کا فرق ہاں! اس موقع پر یہ فرق سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام پر تو بذریعہ وحی اوّل علل و کلیات منکشف ہوتے ہیں اور پھر ان سے متعلقہ احکام کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی ان کے مصنفی اذہان میں مقاصد و کلیات پہلے آتے ہیں اور ذرائع بعد میں کیونکہ ان کا تعلق ابتداء ہی جاذبہ حق کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ ذات سے صفات کی طرف اور صفات سے افعال و احکام کی طرف آتے ہیں۔ لیکن مجتہدین اور امت کے محدثین کے روشن ضمیروں میں اول بذریعہ درس و تدریس اور روایات کے احکام جزئیہ جمع ہوتے ہیں اور پھر علم و عمل کی مزاولتہ۔ تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب کی برکت اور ہمہ وقت کے ذکر و فکر اور استمرار تفکر و تدبر سے علل و کلیات کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ان کے لئے استنباط و قیاس اور اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے کیونکہ امتی کا تعلق ابتداء ذات حق سے نہیں ہوتا بلکہ نبی وقت اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے اتباع سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے احکام سامنے آتے ہیں ان پر پھر عمل کی برکت سے علوم و اسرار کا انکشاف ہوتا ہے ٹھوٹے حدیث: **مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَفَّ اللَّهُ عَلَيْهِ مَا لَمْ يَعْلَمْ** ① ”جس نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ اسے ایک ایسے علم کا وارث بناتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہ تھا۔“

اور اس پر علم وہی سے بواسطہ اسرار و کلیات صفات حق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تب کہیں ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ امت میں دین بحیثیت مجموعی پہلے تو مجتہدین اور راہنہاں فی العلم کے اذہان میں مرتب ہوتا ہے اور پھر وہ پوری ترتیب و تنظیم سے اس کی تشکیل کر کے امت کے سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے دنیا کو دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور شریعت کا وہ سیر واضح ہوتا ہے جس کے جگہ جگہ قرآن و حدیث میں دعاوی موجود ہیں۔

① الحدیث اخرجه ابو نعیم فی ”الحلیۃ“ وضعفه، الجزء العاشر، احمد بن ابی الحواری ج: ۴ ص: ۲۵۰

بہر حال کسی جزئیہ کے واسطے سے اس کے کلیہ کا سراغ لگانا اور پھر اس کلیہ کے نیچے دوسری جزئیات لانا اور اس مرتب سلسلہ کی درمیانی ترتیب اور رابطہ کا پہچان لینا فقیہ کا کام ہے۔ گویا فقیہ کبھی شاہد سے غائب کی طرف جاتا ہے جبکہ واضح جزئیہ سے اس کی مستور علت نکالتا ہے اور کبھی غائب سے شاہد کی طرف آتا ہے جبکہ کلیات سے جزئیات کی طرف لوٹتا ہے اور یہ ایاب و ذہاب عوام اور علماء کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، اس لئے فقیہ مجتہد ان کی نگاہوں میں شریعت ذاتی رائے سے متصرف دکھائی دیتا ہے، کوئی نا سمجھ اسے ازراہ طعن قیاس کہتا ہے اور کوئی صاحب الرائے وغیرہ حالانکہ اس کی یہ رائے اور قیاس عقلی محض نہیں ہوتا اور نہ محض قوت فکر یہ کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اسے تصرف ذاتی کہا جائے بلکہ اس ذوقی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جو شریعت ہی کے علم و عمل کی مزا و امت سے بطور جذبہ صادق اس کے قلب میں من اللہ تعالیٰ القاء کی جاتی ہے۔

پس وہ تصرف خود شریعت ہی کا عین شریعت میں ہوتا ہے نہ کہ اس کا۔ مگر ہاں اس کا ظہور اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسے تمام شرائع ساوہ یہ کا ظہور محض من اللہ ہے۔ مگر ہوتا ہے نبی ہی کے لسان و قلب پر اور نہ یہ طعن کی چیز ہے نہ حیرت و تعجب کی۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت میں محدث بھی ہوئے ہیں جن کی خبر دی گئی، انبیاء علیہم السلام کو لسان شریعت میں مکمل فرمایا گیا ہے اور غیر انبیاء کو جو ان کشف الہی اور علم تشریفی تک الہام کے ذریعہ پہنچائے جائیں اصطلاح شریعت میں منحدث کہا گیا ہے۔ بہر حال ان محدثین کے ذریعہ حکم شریعت اور اللہ کے درمیان تمام کلیاتی سلاسل منکشف ہوتے ہیں جس سے پوری شریعت کا رابطہ کلیات اور کلی الکلیات سے واضح ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کائنات خلق کی طرح عالم امر کا یہ پھیلاؤ بھی بے جوڑ نہیں بلکہ شریعت کا ہر جزئیہ اپنے نوعی اصول و علل پھر بالائی جنس معروف و منکر پھر فوقانی جنس کی صفت الہی اور پھر جنس الاجناس عدل اور اس میں بھی بالائی علم محیط اور اس سے اوپر لامحدود وجود باوجود سے ہوتا ہوا ذات بابرکات سے مربوط ہو جاتا ہے گویا جیسے تکوین کی جزئیات زید، عمرو، بکر وغیرہ کا آخری مرجع جسم و جوہر سے گزرتا ہوا وجود حق نکلتا تھا، ایسے ہی تشریع کے تمام مسائل کا سرمنشاء بھی ان درمیانی انواع سے ہوتا ہوا وہی نکل آتا ہے اور تکوین و تشریع کا مبداء و معاذات حق ٹھہر جاتی ہے جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ابتدا میں ہم نے نقل کیا ہے نیز واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح پوری کائنات آئینہ جمال حق ہے جس میں اس کا فعلی ظہور ہے اسی طرح پوری شریعت آئینہ کمال حق ہے جس میں اس کا قولی اور علمی ظہور ہے۔

درخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد درخن بیند مرا

نصوص کتاب و سنت کا ظہور و بطن..... پس امر و نہی کے اس طویل سلسلہ میں سے امر و نہی یا حکم منصوص کا جان لینا کمال علم نہیں بلکہ اس سلسلہ میں سے اس جزئیہ کی فوقانی علل و کلیات اور پھر ان کی فوقانی شؤون و صفات سے اس کا ربط اور کیفیت ارتباط کا پتہ چلا لینا اور اس حکم کی نسبت اور کیفیت نسبت کا انکشاف کر لینا اس کی معرفت و منکریت کا درجہ معلوم کر کے صفت و نوعیت و وجوب، فرضیت، سنیت اور استحباب وغیرہ کی تعیین کرنا کمال علم ہے جو

صرف راسخین فی العلم اور دائرہ علم کے اولوالامراہ اصحاب کے حصہ میں آیا ہے۔

نصوص کے اسی سلسلہ حکم و حکمت یا معانی جلیلہ اور مدلولات خفیہ کو جس طرح عرض کردہ آیت شجرہ نے کلمہ شریعت کو شجرہ سے تشبیہ دے کر پیش کیا تھا کہ جیسے شجرہ میں فروغ و اصول ہوتے ہیں فروغ نمایاں اور اصول مستور و مبطن اور فروغ میں اصول ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ گویا فروغ درحقیقت مظاہر اصول ہوتے ہیں جن کی صورت میں اصول کے قوی ظہور کرتے ہیں۔ اسی طرح ذیل کی احادیث ظہر و بطن سے تعبیر کر رہی ہیں۔ قرآنی نصوص کے بارہ میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنزَلَ الْقُرْآنَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ لِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا ظَهَرٌ وَبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَدِيثٍ مُطْلَعٌ ①**۔ ”ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد کے لئے طریقہ اطلاع جداگانہ ہے۔ (یعنی مدلول ظاہر کے لئے علوم عربیہ اور مدلول خفیہ کے لئے قوت فہمیہ)۔“

حدیث بالا میں ظہر آیت اور بطن آیت دونوں کے لئے ایک ایک مطلع کی خبر دی گئی ہے مطلع جہر و کے اور جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں جیسے جہر و کوں اور جھانکنے کی جگہوں سے وہ تمام چیزیں نظر آ جاتی ہیں جو ان کے مقابل ہوتی ہیں اور ان کے وسیلہ سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی آیات کے ظواہر یعنی مدلولات لفظی معلوم ہونے کے لئے جہر و کہ عربیت ہے کہ کلام عرب کی اصناف اور اسالیب کلام پر عبور۔ محاورات اور محاسن کلام سے واقفیت ہو، قواعد فصاحت و بلاغت زیر نظر ہوں، صغ اداء اور ان کے تعریفات پر اطلاع ہو تو ان کی مدد سے آیت قرآنی کا صحیح مفہوم سامنے آ سکتا ہے بشرطیکہ ذوق سلیم بھی سازگار ہو۔

لیکن بواطن آیت یعنی مدلولات خفیہ اور احکام سریہ جو بطون دربطون کے پردوں میں مخفی ہیں، ان کے لئے مطلع اور جہر و کہ بھی علل و احکام ہیں جن پر مجتہد اپنے نور فہم اور ذوق اجتہاد سے قوف حاصل کرتا ہے ان علل کے جہر و کوں کے ذریعہ تمام وہ احکام خفیہ منکشف ہو جاتے ہیں جو ان علل کے بالمقابل ہوئے یعنی ان علل کے معلومات ہوتے ہیں خواہ یہ علل قریبہ ہوں یا علل بعیدہ یعنی بطن آیت قریبی ہوں جیسے علت حکم یا بعید ہوں جیسے کلیات عامہ یا البعد ہوں جیسے صفات حق جو علل اصلی ہیں کیونکہ ثبوت حقوق اللہ یا حقوق العباد کی اصل مقتضی یہ صفات الہیہ ہی ہیں، جیسے خدا کی صفت ربوبیت و عظمت عبادت اور تعظیم کی خواستگار ہے، خدا کا بصیر ہونا بندہ سے حیاء اہد ترک فحشاء کا مقتضی ہے اور خدا کا جمیل ہونا بندہ سے عشق و محبت کا مقتضی ہے اور خدا کا مالک و ملک ہونا بندہ سے انفاق مال و اور صدقات کا مطالب ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض جو شخص بھی ان علل بعیدہ و قریبہ پر مطلع ہوگا وہی عالم

① مسند ابی یعلیٰ، مسند عبد اللہ بن مسعود ج: ۱۱ ص: ۱۶۱، مشکاة، کتاب العلم، الفصل الاول، ج: ۱،

اور حکیم کے لقب کا مستحق ہوگا اور اسی کو ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ ① کا حقیقی مصداق کہا جائے گا، بہر حال اس حدیث بالا میں علم کے اس مخفی مرتبہ و بطن آیت سے اور اس آیت میں حکمت سے اور آیت شجرہ میں اقتضاء اصل (جڑ) سے تعبیر کیا گیا ہے پھر جس طرح علم کا یہ عمیق مرتبہ آیات قرآنی میں پایا جاتا ہے، اسی طرح کلام نبوت میں بھی موجود ہے اور حدیث کا بھی ایک ظہر ہے اور ایک بطن کہ وہ بھی فصیح البشر کا کلام ہے چنانچہ حدیث کے بارے میں خود صاحب حدیث ارشاد فرماتے ہیں: عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَصَرَ اللَّهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاَهَا وَآذَاهَا فَرُبَّ حَامِلٍ فِقْهِهِ غَيْرُ فِقْهِهِ وَزُبَّ حَامِلٍ فِقْهِهِ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ ② ”ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تروتازہ فرمادیں اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات سنے اور اس کو یاد کرے اور یاد رکھے اور دوسرے کو پہنچا دے کیونکہ بعض پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعض ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں۔“ اس حدیث میں بعض شاگردوں کا استاذ سے افضل ہونا بیان فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ صرف ظاہری معنی کے اعتبار سے شاگرد کے استاذ سے افضل واقفہ ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لئے افضلیت کا معیار وہی بطن حدیث یعنی مدلولات خفیہ اور اسرار و علل نکل آتے ہیں جن کو فقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس علم شریعت کے دو درجات ظاہر و باطن اس حدیث سے بھی واضح ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابہؓ کی افضلیت تمام امت پر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: كَانُوا أَفْضَلَ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَبْرَأُهَا قُلُوبُنَا وَأَعْمَقُهَا عِلْمُنَا وَأَقْلَبُهَا تَكَلُّفًا۔ ”صحابہ رضی اللہ عنہم! جمیع تمام امت سے افضل تھے، سب سے زیادہ ان کے قلوب پاک تھے، سب سے زیادہ ان کا علم عمیق تھا اور سب سے کم ان کا تکلف تھا۔“

اس سے واضح ہے کہ علم کا ایک درجہ عمقیت اور گہرائی بھی ہے جو علماء کے لئے معیار فضیلت ہے، چنانچہ اسی معیار سے صحابہ رضی اللہ عنہم! جمیع کو افضل فرمایا گیا اور یہ درجہ ہی بطن نص کا ہے جسے مدلولات خفیہ اور اسرار و علل سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی علم کی بدولت علماء و قیقہ شناس اور علمتہ و ربنتے ہیں اور اسی سے ان میں فضیلت کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کو قرآن حکیم نے لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا ایک حکم ہے اور ایک اس کی اندرونی حکمت ہے۔ ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ ③ ”اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی۔“

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خیر کثیر کو جو یہاں حکمت کا ثمرہ ظاہر کی گئی ہے فقہ کا ثمرہ کہا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفْقَهُهُ فِي الدِّينِ ④ ”جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ

① پارہ ۳: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹۔ ② السنن لابن ماجہ، المقدمۃ، باب من بلغ علما ج: ۱ ص: ۲۷۳۔ حدیث صحیح

ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجہ ج: ۱ ص: ۳۰۲ رقم: ۲۳۰۰۔

③ پارہ ۳: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹۔ ④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱ ص: ۱۱۹۔

کرتا ہے اسے دین کا فقہ عطاء فرماتا ہے۔“ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکمت اور فقیہ ایک ہی چیز ہے کہ شمرہ دونوں کا ایک ہے، پس ایک فقیہ حکیم دین ہوتا ہے اور ایک حکیم اسلام فقیہ دین۔ بہر حال اس آیت کریمہ سے بھی علم کا یہ مستور اور خفی درجہ ثابت ہو گیا جو حکماء اسلام، فقہاء دین اور مجتہدین شرع متین کے ساتھ خاص ہے۔

علماء شریعت کے دو طبقات اہل ظاہر اور اہل باطن..... ظاہر ہے کہ جب علم النص کے دو مراتب نکلے ایک ظاہر اور ایک باطن یا ایک مدلول ظاہری اور ایک مدلول خفی تو لامحالہ علماء نصوص کے بھی دو طبقات ہونے قدرتی تھے۔ ایک عالم جزئیات اور ایک عالم کلیات یا ایک عالم ظاہر اور ایک عالم لطن یا ایک عالم حکم اور ایک عالم حکمت۔ یعنی ایک وہ کہ جس کی نگاہیں نص کے مدلول ظاہر تک رہ جائیں اور ایک وہ کہ جس کی عمیق نگاہیں اس ظاہری جزئیہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ چلا لیں جس کے وسیع سلسلہ میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے منسلک ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی نظر علم کلی تک پہنچ گئی تو اس کا علم اسی ایک منصوص جزئیہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ اس علت جامعہ کے سبب ہزار ہا وہ جزئیات بھی اس پر کھل جانی ممکن ہوں گی جو اس منصوص جزئیہ کی طرح اس امر کلی کے عموم میں لپٹی ہوئی پڑی تھیں، اس لئے یہ عالم جزئیات اگرچہ ہزار جزئیات کا حامل ہو پھر بھی انصافاً عالم نہیں حافظ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا، عالم اسے مجازاً ہی کہیں گے، ہاں جو شخص کلیات و جزئیات پر حاوی ہو، پھر ان کی باہمی نسبت اور کیفیت نسبت کا مدرک اور مکتشف اور پھر اس نسبت سے سیکڑوں نامعلوم جزئیات کا استخراج ہوگا وہی حقیقی معنی میں عالم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

پس حافظ آیات و نصوص محض راوی اور محدث ہوتا ہے اور مدرک مخفیات و سراثر مجتہد اور فقیہ ہوتا ہے۔ ان دونوں طبقات کو ذیل کی حدیثوں میں یوں واضح فرمایا گیا ہے۔

عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِي وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيرِ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ وَأَنْبَتَ الْكَلَّا وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ. وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَفَقَعَ اللَّهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا. وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةٌ أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قَيْعَانٌ لَا تَمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلًّا، فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فُقِدَ فِي دِينِ اللَّهِ وَنَفَعِهِ بِمَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ، فَعِلِمٌ وَعِلْمٌ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ، وَلَمْ يَقْبَلْ هَدَى اللَّهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ ①. ترجمہ ”حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری مثال اور میرے لائے ہوئے علم و ہدایت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موسلا دھار بارش زمین پر برسی تو زمین کا ایک حصہ تو نہایت عمدہ تھا جس نے پانی کو جذب کیا اور طرح طرح کے پھول پتے اور خشک و تراگایا اور ایک حصہ سخت تھا جس نے پانی تو جمع کر لیا (مگر گھاس

① الصحيح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم ج: ۱ ص: ۱۴۱.

وغیرہ اگانہیں سکا) تو اللہ نے اس زمین سے لوگوں کو پانی ہی کا نفع پہنچایا کہ انہوں نے پانی پیا بھی اور سیراب بھی ہوئے اور ان سے کھیتوں میں آبپاشی بھی کی اور ایک حصہ اور تھا جو بالکل چھیل میڈان تھا۔ نہ پانی کو روکتا ہی تھا اور نہ گھاس پھوس اگاتا ہی تھا۔ بس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور انہیں اس علم نے نفع دیا جسے لے کر میں مبعوث ہوا ہوں اور مثال ہے ان کی جو سرے ہی سے اس انقار کے درجہ کو نہ پہنچ سکے اور انہوں نے خدا کی وہ ہدایت ہی قبول نہیں کی جسے لے کر میں آیا تھا۔“

اس حدیث میں علم کو بارش سے اور قلوب بنی آدم کو زمین سے تشبیہ دیتے ہوئے لوگوں کی دو اقسام بیان فرمائی گئی ہیں، ایک دین سے منفع اور ایک غیر منفع۔ پھر منفع کی دو اقسام ارشاد فرمائی گئیں، منبت اور غیر منبت یعنی ایک وہ کہ جنہوں نے علم وحی حاصل کر کے اسے اپنے قلوب میں بھرا، جمع کیا اور اس سے استنباط و اجتہاد کے ذریعہ طرح طرح کے علوم و معارف اور علل و حکم نکالے اور نکات و اسرار بیان کئے پھر ان باطنی علوم کے ذریعے سیکڑوں نامعلوم مسائل امت کے سامنے لا رکھے جس سے دین منفع اور مدون ہو کر ایک قانون کی صورت میں آگیا اور دوسرے وہ کہ جنہوں نے علم وحی حاصل کر کے اپنے سینوں میں جمع کیا اور پوری امانت داری سے بلا کم و کاست دوسروں تک پہنچا دیا تاکہ ان میں جو بالغ نظر ہو وہ اس سے پھل پھول نکال سکے۔ پہلا طبقہ فقہاء مجتہدین اور علماء راہنہیں کا ہوا اور دوسرا محدثین اور حفاظ کا ہوا۔ محدث اور حافظ کا کام حفظ و امانت اور بلا کم و کاست روایت ہے اور فقیہ مجتہد کا کام فہم اور تفقہ اور محققانہ روایت ہے کہ تخم علم کی آبیاری کر کے دریا کو بصورت باغ و بہار دکھلا دے۔ اسی حدیث میں فَكَانَتْ طَبَقَةً کے کلمہ سے مجتہد اور فقیہ محقق کی تفصیل بھی غیر مجتہد حافظ پر ظاہر فرمادی گئی جس کی وجہ بجز اس علم باطن کے اور کچھ نہیں۔

ان روایات سے علما کے دو طبقات بھی واضح ہوئے۔ مجتہد اور غیر مجتہد اور ساتھ ہی فقیہ مجتہد کی غیر فقیہ و مجتہد پر یارادی محض پر صاحب درایت و تفقہ کی تفصیل بھی نمایاں ہوگئی جس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ فقیہ کلام الہی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جامعیت اور مجزانہ بلاغت کو کھولتا ہے جو کتاب کے متعلق ﴿وَبَيَّنَّا لَكُلِّ شَيْءٍ﴾ ① سے اور حدیث کے متعلق اعطيت جوامع الکلم ② سے واضح فرمائی گئی ہے گویا ایک فقیہ کے ذریعہ کلام وحی کی وجہ اعجاز نمایاں اور فراہم ہوتی ہیں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور مقام ختم نبوت کی حقیقت اور رفعت شان کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

پس علم اولیٰ حفظ و روایت ہے تو علم حقیقی فقہ و روایت اور اس لئے طبقات علماء کے سلسلہ میں حافظ حدیث یا اہل حدیث یا محدث مبتدی ہے جو وحی کا مواد جمع کر کے ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور فقیہ و مجتہد فتنی ہے جو اس ذخیرہ کی

① پارہ ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۹۔

② الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوۃ، باب (بلا ترجمہ) ج: ۳ ص: ۱۰۴۔

تہہ کی چیزیں نکال کر جسے فقہ کہتے ہیں ہمہ گیر جزئیات سے امت کی تربیت کرتا ہے اور اس مواد سے مختلف صورت کے دینی سامان بنا کر دین کو سجاتا اور امت کے حق میں اسے قابل استعمال بناتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں اہل علم کے دو طبقات یہ دونوں طبقات حضرات صحابہؓ میں بھی موجود تھے۔ کوئی حافظ حدیث تھا، جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، اور کوئی فقیہ و مجتہد تھا جیسے عباد اللہؓ اربعہ اور حضرات شیخینؓ وغیرہ پھر فقہاء صحابہؓ میں بھی فرق مراتب تھا بعض کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم، چنانچہ صحاح کی مشہور روایت ہے:

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ قَوْلِهِ تَعَالَى ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطُوفَ بِهِمَا﴾ قُلْتُ قَوْلَ اللَّهِ مَا عَلَى أَحَدٍ جُنَاحُ أَنْ لَا يَطُوفَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ فَقَالَتْ بِنَسَسَ مَا قُلْتُ يَا ابْنُ أُخْتِي إِنَّ هَذِهِ لَوُكَايَتُ عَلَى مَا أَوْلَيْتَهَا كَانَتْ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَا يَطُوفَ بِهِمَا وَفِي الْحَدِيثِ قَالَ الزُّهْرِيُّ فَأَخْبَرْتُ أَبَا بَكْرٍ بَنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ فَقَالَ إِنَّ هَذَا الْعِلْمُ مَا كُنْتُ سَمِعْتُهُ. ① ترجمہ ”حضرت عروۃ ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا: إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ الْبَحُّ اور میں نے کہا کہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص صفا و مروہ کا طواف نہ کرے تو اس کو گناہ نہ ہوگا (جیسا کہ ظاہر ترجمہ سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ گناہ نہیں ہے جو طواف کرے تو اس سے متبادر یہی ہے کہ طواف مباح ہے اگر نہ کرے تو بھی جائز ہے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے بھانجے! تو نے بڑی غلط بات کہی اگر یہ آیت اس معنی کو مفید ہوتی جو تم سمجھ ہو تو عبارت یوں ہوتی لا جناح علیہ ان لا یطوف بہما یعنی طواف نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں نے ابو بکر بن عبد الرحمنؓ کو اس کی خبر دی تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ علم میں نہ سنا تھا۔“

اس سے واضح ہے کہ نصوص کے سمجھنے میں فہم متفاوت ہوتے ہیں کوئی ظہر نص تک رہ جاتا ہے۔ کوئی ظن نص تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں جو دقیقہ تھا باوجود یہ کہ وہ زیادہ خفی نہ تھا مگر حضرت عروہؓ اسے نہ سمجھ سکے اور حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں۔ بات چونکہ لطیف تھی اس لئے ابو بکر بن عبد الرحمنؓ نے سن کر اس پر مسرت ظاہر کی اور اسے علم کہا۔ اسی تفاوت فہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ: رُبَّ حَامِلٍ فِقْهِهِ غَيْرُ فِقْهِهِ وَرُبَّ حَامِلٍ فِقْهِهِ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْفَقِيهِمْ ہوتے اور بعض ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے بھی زیادہ فہیم ہوتے ہیں۔“

مگر ساتھ ہی یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہیے کہ اس تفاوت افہام کے سلسلہ میں زیادہ فہم کا ہر درجہ معتبر نہیں یعنی ہر فہیم مجتہد یا فقیہ نہیں کہلایا جائے بلکہ اس بارہ میں فہم کا صرف وہی درجہ معتبر ہوگا جو متعدد بہ ہوا و محض موہبت ربانی

ہو جو بطور علم لدنی قلب مجتہد میں التواء کیا گیا ہو یعنی جس طرح کائنات خلق کے سلسلے میں نہ ہر چھوٹے بڑے فہم کا آدمی موجد ہو سکتا ہے۔ نہ ہر دور میں موجدین کی بھرمار ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ کی حکمت جب کبھی تمدن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دیکھنا پسند کرتی ہے تو قرون و ذہور میں چند مخصوص دماغ منتخب کر کے ان سے ایجاد کا کام لیتی ہے اور وہ تمدن کے ان گوشوں کو آراستہ کر دیتے ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت تھی۔

اسی طرح کائناتِ امر کے سلسلہ میں نہ ہر فہیم و ذہین مجتہد ہو سکتا ہے نہ ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے ہیں بلکہ حکمت ربانی جب کبھی دین کے کسی مخفی گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص خاص ذہینت کے افراد پیدا کر کے ان کے قلوب میں ذوقِ اجتہاد ڈالتی ہے اور وہ اپنے اس خاص وہی ذوق سے تدین کے ان پہلوؤں کو واضح اور صاف کر کے اور گویا بال کی کھال نکال کر امت کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جن کے اظہار کی ضرورت تھی۔ فہم خاص یا ذوقِ اتقاد کے اسی وہی درجہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِيِّ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُودَاءٍ فِي بَيْضَاءٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ لَا وَالَّذِي فَطَرَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسْمَةَ مَا عَلِمْنَا إِلَّا فَهْمًا يُعْطِيهِ اللَّهُ رَجُلًا فِي الْقُرْآنِ ① ”ابی جحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کچھ ایسے مضامین لکھے ہوئے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں؟ انہوں نے ”یا نہیں۔ قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شکاف دیا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کوئی علم ایسا نہیں، لیکن فہم خاص ضرور ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطاء فرمادیں۔“

ملکہ اجتہاد وہی ہے کسی نہیں اور بعض اس کے اہل ہیں اور بعض نہیں..... اس سے جہاں کتاب اللہ میں دقیق معانی کا ثبوت ہوتا ہے جنہیں غیر معمولی ہی فہم کا آدمی سمجھ سکتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فہم کوئی اکتسابی چیز یا فن نہیں ہے جسے محنت سے حاصل کر لیا جائے بلکہ ایک عطاء الہی ہے جو خاص خاص افراد امت کو عطاء ہوتا ہے۔ بعینہ اس طرح جیسے رسالت و نبوت کوئی فن نہیں کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے نبی بن جائے۔ چنانچہ قرآن نے رسالت کے بارہ میں تو یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ ② ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھتا ہے۔“ اور اس قسم کے صاحب فہم یا صاحب علم اسرار و حقائق کے بارہ میں حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا﴾ ③ ”اور ہم نے انہیں (خضر علیہ السلام کو) اپنے پاس سے مخصوص علم دیا۔“

غرض دونوں امور کو یعنی علم نبوت اور علم حقیقت کو اپنی طرف منسوب فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ علم کا یہ مرتبہ اکتسابی نہیں بلکہ محض عطاء الہی اور موهبت ربانی ہے جس کے لئے من جانب اللہ ہی افراد کا انتخاب فرمایا جاتا ہے،

① الصحيح للبخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب فکاک الاسیر، ج: ۱۰، ص: ۲۵۸.

② پارہ ۵: سورة النساء، الآية: ۶۷. ③ پارہ ۸: سورة الانعام، الآية: ۱۲۳.

چنانچہ ارشادِ علویٰ میں یُعْطِيهِ اللّٰهُ اور رَجُلًا سے اسی طرح اشارہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرنِ اوّل میں جب اجتہاد و قیاس اور استنباط کا دروازہ کھلا اور حضراتِ صحابہؓ نے نصوص نہ ہونے کی صورت میں اپنی رائے و قیاس پر عمل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں ہر ایک کی رائے کی تصویب و توثیق نہیں فرمائی۔ بعض کے اجتہاد کو قبول فرمایا اور بعض کے اجتہاد کو رد فرمادیا۔

گویا انہیں اجتہاد کا اہل اور مجتہد نہیں سمجھا کہ وہ اس فہم خاص کا وہ وہی درجہ نہیں رکھتے تھے جس کی رو سے شریعات میں صحیح حقیقت کو سمجھ کر استدلال کر سکیں، چنانچہ ابوداؤد میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خیر القرون میں ایک زخم زدہ شخص کو احتلام ہو گیا ساتھیوں نے اسے غسل کر دیا وہ غسل کرتے ہی مر گیا۔ علم ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی رائے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ فرمایا کہ: خدا انہیں قتل کرے اسے قتل کر ڈالا اور اس کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ تیمم کر لیتا اور زخم پر پٹی باندھ کر مسح کر لیتا اور باقی بدن دھو لیتا۔ ① ان لوگوں نے بظاہر غسل جنابت کی آیت ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَأَطْفِرُوا﴾ کو تو معذور اور غیر معذور کے حق میں عام سمجھا اور آیت تیمم مریض ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى﴾ ② کو حدیثِ اصغر کے ساتھ مخصوص سمجھ کر یہ فتویٰ دے دیا کہ اس جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں اور اس لئے اسے غسل کرنے پر مجبور کیا۔

یامثلًا حضرت عدیٰ بن حاتم کے واقعہ میں جسے بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ خَيْطٌ أَبْيَضٌ خَيْطٌ أَسْوَدُ سے سفید و سیاہ ڈورے سمجھ کر تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور جب تک ان کی سفیدی و سیاہی ممتاز نہ ہو جاتی سحر کا کھانا کھاتے رہتے حالانکہ ان ڈوروں سے مراد رات اور دن تھے، پس باوجود اہل زبان ہونے کے چونکہ قوتِ اجتہاد یہ تھی اس لئے نفس مراد قرآنی تک کے سمجھنے میں غلطی کی، چہ جائیکہ کہ حقائق تک پہنچتے۔

توان کی رائے اور قیاس دین میں کس طرح بند ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برنگِ مزاح انَّ وَسَادَتَكَ لَعَرِيضٌ ③ ”تمہارا تکیہ بڑائی لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے امیض اور اسود یعنی رات اور دن آگئے“ کے جملہ سے ان کے فہم پر رد فرمادیا۔ نیز پہلے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث گزر چکی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض حاملِ فقہ خود غیر فقیہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غیر فقیہ کی رائے بھی دین میں معتبر نہیں ہو سکتی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض کی رائے و قیاس کو رد فرمادینا اس کی واضح دلیل ہے کہ نہ ہر ایک مجتہد ہوتا ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اور قیاس پایہ اعتبار کو پہنچ سکتی ہے جب تک کہ وہی طور پر فہم و ذوق کا وہ خاص درجہ نہ پیدا ہو جائے جو شارع کی نظر میں متعین ہے۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یہ تقسیم ہو سکتی تھی تو آج کس طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کا فہم معتبر اور حدِ اجتہاد تک پہنچا ہوا تسلیم کیا جائے۔ آج بھی یہ تقسیم لازمی ہوگی پس اسی ذوقِ نور اور علمِ نہایت و

① السنن لابن داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی المجروح یتمیم ج: ۱ ص: ۴۱۱۔ ② پارہ: ۶، سورۃ: العائدہ،

الآیۃ: ۶۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان ان الدخول فی الصوم ج: ۲ ص: ۷۶۶۔

سراور تصرف کو شرعی الفاظ میں کہیں بطن سے جیسے حدیث ”لِكُلِّ آيَةٍ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ ① میں ہے کہیں فہم سے جیسے حدیث ”إِلَّا فَهْمًا يُعْطِيهِ اللَّهُ ② میں ہے۔ کہیں رویت ورائے سے جیسے حدیث ”رَأَيْتُ فِي ذَلِكَ الَّذِي رَأَى عُمَرُ ③ میں ہے۔ کہیں تفقہ سے جیسے حدیث ”مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ ④ میں ہے۔ کہیں حکمت سے جیسے آیت ”وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ ⑤ میں ہے۔ کہیں فرقان سے جیسے آیت ”اتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا ⑥ میں ہے۔ کہیں شرح صدر سے جیسے حدیث ”فَشَرَحَ اللَّهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ صَدْرَ عُمَرَ ⑦ میں ہے اور کہیں انبات سے جیسے حدیث ”قَبِلْتُ الْمَاءَ وَأَنْبَتَ الْكَلَّا ⑧ میں ہے۔

اور جامع عنوان کے ساتھ کہیں اجتہاد سے جیسے حدیث ”الْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَيُصِيبُ میں تعبیر کیا گیا ہے جس پر عام عرف و شریعت میں یہی اجتہاد و استنباط کا عنوان غالب اور معروف ہو گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد ایک ملکہ اور فہم خاص کی ایک قوت اور علم کا ایک مخصوص وہی درجہ ہے جس کی وساطت سے اس کے اہل نصوص کے دقیق اور خفی معانی اور احکام کے اسرار و علل کو سمجھ کر ان پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے متقنی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ علم باطن ہی مورث طمانینت ہے..... چنانچہ ظاہر ہے کہ علم کا یہ مرتبہ جس کا تعلق براہ راست شرح صدر اور علم الہی سے ہے جس حد تک مورث طمانینت اور مسائل میں موجب الطمینان ہو سکتا ہے وہ اکتسابی درجہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن کے بارہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جو مسئلہ فقیہ اور مجتہد ہیں استدلالی علم سے وہ طمانینت نہ ہوئی جو اس حالی علم سے میر آئی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ دقیقہ کافی وضاحت کے ساتھ حل ہوتا ہے۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ أُرْسِلَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ مَقْتُلَ أَهْلِ الْيَمَامَةِ فَإِذَا عُمَرُ جَالِسٌ عِنْدَهُ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ إِنَّ عُمَرَ جَاءَ نَبِيٍّ فَقَالَ إِنَّ الْقَتْلَ قَدْ اسْتَحْرَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرْآنِ الْقُرْآنِ وَإِنِّي أَخْشَى أَنْ يُسْتَحْرَ الْقَتْلُ بِالْقُرْآنِ فِي كُلِّ الْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبَ مِنَ الْقُرْآنِ كَثِيرٌ وَإِنِّي أَرَى أَنْ تَأْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْآنِ فَقُلْتُ وَكَيْفَ أَفْعَلُ مَا لَمْ يَفْعَلَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ وَاللَّهِ هُوَ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ يُرَاجِعُنِي فِي ذَلِكَ حَتَّى شَرَحَ اللَّهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ لَهُ صَدْرَ عُمَرَ وَرَأَيْتُ فِي ذَلِكَ الَّذِي رَأَى ④ ترجمہ ”حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بن ثابت کی روایت ہے کہ

① مسند ابی یعلیٰ، مسند عبد اللہ بن مسعود ج: ۱۱ ص: ۱۶۱، مشکاة، کتاب العلم، الفصل الاول، ج: ۱ ص:

۳۸۳ رقم: ۲۱۳۳، ② الصحيح للبخاری، کتاب الجہاد والسير، باب فکاک الاسیر، ج: ۱۰ ص: ۲۵۸.

③ الصحيح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ج: ۱۵ ص: ۳۸۵، ④ الصحيح للبخاری،

کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱ ص: ۱۱۹، ⑤ پارہ: ۳، سورة: البقرة، الآية: ۲۶۹.

⑥ پارہ: ۹، سورة: الانفال، الآية: ۲۹، ⑦ الصحيح للبخاری، کتاب الاحکام، باب يستحب للکاتب ان يكون امینا

عاقلاً، ج: ۲۲ ص: ۱۲۷، ⑧ الصحيح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم، ج: ۱ ص: ۱۴۰.

⑨ الصحيح للبخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قوله لقد جاءکم رسول من انفسکم... ج: ۱۲ ص: ۲۵۲.

زمانہ جنگ یمامہ میں حضرت ابو بکرؓ نے میرے بلانے کے لئے آدمی بھیجا وہاں جا کر دیکھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے قصہ بیان فرمایا کہ: حضرت عمرؓ نے میرے پاس آ کر یہ صلاح دی کہ واقعہ یمامہ میں بہت سے قراء قرآن کام آگئے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح سب جگہ یہ لوگ کام آتے رہے تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا امر فرمادیں۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کس طرح کروں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا، واللہ یہ کام خیر محض ہے اور برابر اسی کو بار بار کہتے رہے حتیٰ کہ جس باب میں ان کو شرح صدر اور اطمینان تھا مجھ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی بات مجھے محسوس ہوئی جو انہیں ہوئی تھی۔“

اس سے ظاہر ہے کہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اولاً جمع قرآن کے بدعت ہونے کا خیال تھا احادیث ذم بدعت ان کے سامنے تھیں اس لئے انہیں جمع قرآن میں تردد تھا۔ مگر جب استدلال سے گزر کر ان کے قلب میں باطنی علم منکشف ہوا کہ جمع قرآن کا یہ جزئیہ تحفظ دین کے عام کلیہ کے ماتحت ہے اور ذم بدعت کے ماتحت نہیں آسکتا۔ تو شرح صدر کے ساتھ اس فعل کو کر گزرے اور آج تک دنیائے اسلام ان کے اس احسان عظیم سے مستفید ہو رہی ہے جس سے واضح ہوا کہ مجتہد کے لئے علم کا یہ خفی درجہ بعض اوقات جلی درجہ سے بھی زیادہ موجب طمانینت ہوتا ہے اور وہی اطمینانی کیفیات اس کے متبع افراد میں سرایت کر جاتی ہیں جبکہ وہ اس کی اتباع کریں۔

بہر حال اتنا واضح ہو گیا کہ امت کے لئے ایک درجہ علم خفی کا بھی پیغمبر نے وارثت میں چھوڑا ہے جو کلیات سے استخراج مسائل اور جزئیات سے استنباط دلائل کا ہے اور اس کے افراد مخصوص ہیں، نیز وہ ایسے مواقع کے لئے ہے جہاں یا نص ہی موجود نہ ہو یا ہو مگر معانی مختلفہ کو محتمل ہو یا متعین محتمل ہو مگر یہ محتمل دقیق اور غامض ہو یا محتمل بھی واضح ہو مگر اس کی علت مستور ہو۔ جس کا اکتشاف ہر فہم نہ کر سکتا ہو تو ایسے مواقع میں بجز اجتہاد و استنباط کے چارہ کار نہیں اور ضرورت تھی کہ امت کو اس فہم خاص کا رتبہ بھی عنایت ہو جو درحقیقت تشریع ہی کا ایک دقیق حصہ ہے اور جو علماء کے لئے عَلَمَاءُ اُمْتِیْ كَانِبِیَّآءِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ کے معزز اور بابرکت خطاب کے ماتحت ثابت کرتا ہے کہ علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کے سے کام کریں گے۔

اگر تبلیغ دین اور تربیت خلق کریں گے تو ایک ایک عالم خطوں کو رنگ دے گا اور ہزاروں کو دائر اسلام میں داخل کر دے گا ان میں دینی رنگ پیدا کر دے گا تعلیم مسائل پر آئیں گے تو انبیاء جو امور وحی سے کہتے تھے یہ بالہام وحی، وحی سے استنباط کر کے کہیں گے یعنی احکام تکلیفیہ کی طرح احکام وضعیہ امت کے سامنے لا رکھیں گے اور یہ صورت بغیر اجتہاد و قیاس کے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے امت میں یہ علم غامض القاء کیا گیا اور قرن اول سے شروع ہو گیا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہل اجتہاد..... چنانچہ جب ان لوگوں کا اجتہاد سامنے آیا جو اس کے اہل تھے اور تشریع کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اجتہاد و استنباط کی تحسین فرمائی۔ چنانچہ

نہیں سامنے نہ ہونے کی صورت میں عموماً اور کلیات سے استدلال کرتے ہوئے جو رائے پر عمل کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی اس کی مثال یہ ہے کہ: عَنْ طَارِقٍ أَنَّ رَجُلًا أَجْنَبَ فَلَمْ يُصَلِّ فَاتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ لَهُ ذَلِكَ فَقَالَ أَصَبْتَ. فَأَجْنَبَ آخَرُ فَتَيْمَّمْ وَصَلَّى فَاتَاهُ فَقَالَ نَعُوْمًا قَالَ لِآخَرَ يَعْنِي أَصَبْتَ. ”حضرت طارق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو نہانے کی حاجت ہوئی اس نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور اس قصہ کا ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے ٹھیک کیا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو اسی طرح نہانے کی حاجت ہوئی اس نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ویسی ہی بات فرمائی۔ جو ایک شخص سے فرما چکے تھے یعنی تو نے بھی ٹھیک کیا۔“

اس حدیث سے اجتہاد و قیاس کا جواز صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر ان کو نص کی اطلاع ہوتی تو پھر بعد عمل کے سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد پر عمل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب و تحسین فرمائی اور ظاہر ہے کہ شارع علیہ السلام کی تقریر یعنی کسی چیز کو سن کر رد نہ فرمانا بلکہ صراحتہً اس کی تصویب فرمادینا اس کی مشروعیت کی واضح دلیل ہے اس لئے نص صریح نہ ہونے کی صورت میں جواز اجتہاد و قیاس میں کوئی شبہ نہ رہا۔

اسی طرح بروایت ابو داؤد و حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوہ ذات السلاسل کے موقع پر سردیوں کی ایک رات میں جان کے خوف سے، بحالت جنابت، بجائے غسل کے تیمم سے نماز پڑھادی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر عرض کیا کہ: میں نے اللہ کے اس قول پر عمل کیا: وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ. ”اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو۔“ حضور نے مسکرا کر سکوت اختیار فرمایا۔ ① جس سے واضح ہے کہ نص صریح نہ ہونے کی صورت میں رائے پر عمل کرنا عموماً و کلیات سے استدلال کرنا یعنی اجتہاد سے کام لینا خلاف حدیث نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکیر فرماتے کہ تم لوگ دین میں رائے اور قیاس کو کیوں دخل دیتے ہو۔ یا نص تو موجود ہو مگر محتمل الوجود ہو تو اجتہاد سے کسی ایک وجہ کا تین کر کے اس پر عمل کرنا بھی خلاف نص یا خلاف حدیث نہیں۔ چنانچہ حدیث ذیل اس پر شاہد ہے۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْأَحْزَابِ لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ فَأَذْرَكَ بَعْضُهُمُ الْعَصْرَ فِي الطَّرِيقِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا نُصَلِّي حَتَّى نَأْتِيَهَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ نُصَلِّي لَمْ يَرِدْ ذَلِكَ فَذَكَرَ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُضْعِفْ وَاحِدًا. ② ”حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب کے موقع پر صحابہ

① الصحيح للبخاری، کتاب التیمم، باب اذا خاف الجنب علی نفسه المرض، ج: ۲، ص: ۷۲.

② الصحيح للبخاری، کتاب الجمعة، باب صلوة الطالب والمطلوب راکباً، ج: ۳، ص: ۳۹۹.

سے فرمایا کہ: عصر کی نماز بنی قرظہ میں پہنچنے سے ادھر کوئی نہ پڑھے بعض صحابہ کو راہ میں عصر کا وقت آ گیا تو باہم رائے مختلف ہوئی۔ بعض نے کہا کہ: ہم نماز پڑھیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب تاخیر صلوٰۃ نہیں تھا بلکہ مقصود تاخیر تھی کہ عصر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کرو، پھر یہ قصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر بھی ملامت نہیں فرمائی۔“

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بعض نے اپنی قوت اجتہاد سے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی غرض کو سمجھ کر جو کہ نص کی ایک محتمل وجہ تھی نماز پڑھ لی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر ملامت نہیں فرمائی کہ تم نے حدیث کے ظاہر الفاظ کے خلاف کیوں عمل کیا؟ یعنی ان کو عمل بالحدیث کا تارک قرار نہیں دیا یا نص صریح بھی موجود ہو اور اس کا مکمل بھی متعین ہو مگر مجتہد اس حکم کو کسی علت سے معلول سمجھ کر علت باطنیہ پر عمل کرے اور ظاہر نص کو ترک کر دے تو یہ بھی خلاف حدیث نہیں۔

چنانچہ حدیث انسؓ اس پر شاہد عدل ہے۔ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا كَانَ يُتَمِّمُ بِأَمِّ وَلَدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِعَلِّي إِذَا هَبْتُ فَاصْرَبْتُ عَنْقَهُ فَأَتَاهُ فَإِذَا هُوَ فِي رُكْعَتَيْ يَبْرُؤُ فَقَالَ أَخْرُجْ فَنَازِلَهُ يَدُهُ فَأَخْرَجَهُ فَإِذَا هُوَ مَجْبُوبٌ لَيْسَ لَهُ ذِكْرٌ فَكَفَّتْ عَنْهُ وَأَخْبَرَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَسَنَ فِعْلَهُ (زَاد فِي رَوَايَةٍ) وَقَالَ يَرَى الشَّاهِدُ مَا لَا يَرَى الْغَائِبُ ① ”حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لونڈی ام ولد کے ساتھ متمم تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ: جاؤ اس کی گردن مار دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس آئے تو اس کو دیکھا کہ وہ کنویں میں اترا ہوا بدن ٹھنڈا کر رہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا یا ہر نکل۔ اس نے اپنا ہاتھ دے دیا۔ آپؓ نے اس کو نکالا تو وہ مقطوع الذکر نظر پڑا تھا۔ آپؓ اس کی سزا سے رک گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے اس فعل کو مستحسن فرمایا (اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حاضر ایسی بات دیکھتا ہے جو غائب نہیں دیکھتا۔“

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اور صاف حکم یہ تھا کہ حضور علیؓ نے اپنے ذوق اجتہاد سے اسے ایک علت سے معلول سمجھا اور جب علت کا وجود نہ پایا تو حکم سزا بھی جاری نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل ظاہراً اطلاق حدیث بخلاف تھا۔ اس سے واضح ہے کہ حدیث کی لم اور علت حکم سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اور الفاظ حدیث کے ظاہر کو ترک کر دینا، خلاف حدیث نہیں بلکہ وہ عمل بالحدیث ہے مگر لفظ حدیث پر ہے جو خود حدیث سے ثابت شدہ چیز ہے، اس کی نظیر یہ بھی ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو بشارت دی کہ جو بھی صدق دل سے کلمہ طیبہ پڑھ لے گا وہ نارِ جہنم پر حرام ہو جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں لوگوں کو اس کی بشارت عام نہ دے دوں؟ فرمایا نہیں، لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں

گے۔ (اور عمل چھوڑ دیں گے۔)

اس ممانعت تبشیر میں کسی زمانہ کی قید نہ تھی مگر حضرت معاذؓ نے اپنے نور اجتہاد سے دوسرے دلائل کلیہ پر نظر کر کے اس ممانعت کو اس زمانہ کے ساتھ مقید سمجھا جس میں اس پر پھر وہ نہ کر بیٹھنے کا احتمال باقی رہے اور وفات کے وقت جب کہ وہ زمانہ ان کے زعم میں باقی نہیں رہا تھا، اس بشارت کا اعلان عام کر دیا۔

یا مثلاً (بروایت مسلم) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: ایک لونڈی کو جس نے بدکاری کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درے مارنے کے لئے مجھے حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زچہ تھی۔ اس لئے درے نہ لگائے کہ کہیں مرنے جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی تحسین فرمائی۔ اس سے واضح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نصوص کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کو مذموم نہ جانتے تھے ورنہ ظواہر احکام کو مقصود جان کر ان باطنی علل اور علوم کلیہ سے بحث ہی نہ فرماتے۔ چہ جائیکہ ان بواطن پر عمل کرتے۔ یہ نظائر اس پر شاہ عدل ہیں کہ اگر مجتہد اپنی قوت اجتہاد سے کسی حدیث کے مدلول ظاہری کے خلاف یعنی اس سے بالاتر کوئی دقیق معنی سمجھ جائے جس تک عوام علماء کی رسائی نہ ہو تو اس پر عمل جائز ہے۔

اُمت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہے..... بہر حال جب یہ واضح ہو گیا ہے کہ دین میں نص نہ ہونے یا متعین الوجہ نہ ہونے یا غیر معلول نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد و قیاس جائز ہے اور اس حکم کے لئے افراد من اللہ منتخب اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ہر ایک اس کا اہل نہیں اور وہ بتصدیق پیغمبر حجت شرعیہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیر اہل اجتہاد یعنی غیر مجتہد کے لئے بجز اس کے چارہ کاری کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت اور پیروی کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اتباع کرے خود ان مخفی دلائل اور علل نہیں تک پہنچ سکتا۔ تو دانا یا ناسرار و علل کے سامنے جھک جائے، کیونکہ مراتب علم کے دو ہی ہیں یا خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی وہ دو مراتب علم کی واسطہ کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ قیامت کے دن کفار اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل والوں کی سنی۔ ﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ ① ”اور کہیں: اگر اراے کا شہم سنتے یا عقل سے سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے۔“

بس یہی درجہ سمع و طاعت جو علم والے کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقق کے سامنے ایک غیر محقق عمل میں لاتا ہے، تقلید کہلاتا ہے، جو فی نفسہ بھی اور بضرورت اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام اور غیر اہل اجتہاد کے حق میں اب بھی اہل اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو اجتہاد کا حجت شرعیہ ہونا لغو ہو جائے اور اس آیت کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہے کہ: ﴿فَسْتَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ ② ”اگر تم لاعلم ہو تو علم والوں سے سوال کرو۔“ اور اس حدیث کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے کہ: أَلَمْ يَكُنْ شِفَاءَ الْعَمَى السُّوَالُ ③ ”کیا عاجز کی شفاء سوال نہیں ہے؟“

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۹، ② پارہ: ۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷۔

③ السنن لابن داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی المجروح یتیم ج: ۱ ص: ۴۱۲۔

پس اگر اجتہاد بنفس حدیث شرعی چیز ہے اور غیر مجتہد بنفس حدیث دنیا میں موجود ہیں کہ قرن اول تک میں موجود تھے۔ ادھر غیر مجتہد کا علاج و شفاء بنفس حدیث سوال و تقیل ہے تو غیر مجتہد کے لئے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارہ کاری باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تقلید کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مستقلاً موجود ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَفْتِيَ بَغْيٍ عِلْمٍ كَانَ اِثْمُهُ عَلَيَّ مَنْ أَفْتَاهُ ① ”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دے دے تو وہ اس کا گناہ فتویٰ دینے والے کو ہوگا۔“ ظاہر ہے کہ اگر تقلید نہ جائز ہوتی اور کسی کے فتویٰ پر بدون معرفت دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل ہے تقلید کا تو گناہ گار ہونے میں مفتی ہی کی کیا تخصیص تھی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے اور بلا تحقیق عمل کرنے کا گناہ ہوتا۔ پس جبکہ شارع علیہ السلام نے سائل کو باوجود تحقیق دلیل نہ کرنے کے عاصی نہیں ٹھہرایا تو جواز تقلید بلاشبہ ثابت ہو گیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی تقلید رائج تھی..... چنانچہ حضرات صحابہؓ جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد، مجتہد کے فتویٰ پر بلا تحقیق دلیل محض اس حسن ظن کی بناء پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے اور بلا دلیل فتویٰ نہیں دے رہا ہے۔ عَنْ سَالِمٍ سَمِعَ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَنْ رَجُلٍ يَكُونُ لَهُ الدِّينُ عَلَى رَجُلٍ إِلَى أَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ لِيُعْجَلَ الدِّينُ فَكُفِّرَ ذَلِكَ وَنَهَى عَنْهُ ② ”حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ دین میعاد واجب ہے اور صاحب حق اس میں سے کسی قدر اس شرط سے معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا۔ چونکہ اس مسئلہ جزئیہ میں کوئی حدیث مرفوعہ صریح منقول نہیں۔ اس لئے یہ حضرت ابن عمر کا قیاس ہے اور چونکہ سائل نے دلیل نہیں پوچھی اس لئے اس کا قبول کرنا تقلید ہے نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا دلیل بیان نہ کرنا خود تقلید کو جائز رکھتا ہے، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے قیاس و تقلید دونوں کا جواز ثابت ہو گیا۔

اسی طرح بروایت مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دے دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کر دے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرما کر منع فرمادیا اور فرمایا کہ: بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ چونکہ اس بارہ میں بھی کوئی صریح حدیث مرفوعہ مروی نہیں لہذا حضرت عمرؓ کا یہ جواب قیاس سے تھا اور چونکہ جواب کا ماخذ نہ آپؐ نے بیان فرمایا نہ سائل نے پوچھا بدون دریافت دلیل قبول کر لیا تو یہی تقلید تھی۔

پس جواز قیاس و تقلید حضرت عمرؓ کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اسی طرح بروایت مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو

ایوب انصاری رضی اللہ عنہ حج کے لئے نکلے۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہو گئیں اور حج کا وقت نکل جانے پر پہنچے۔ حضرت عمرؓ سے سارا قصہ بیان کر کے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ: افعالی عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسر شدہ قربانی دے دو۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہؓ سے استفادہ کر کے اس کی تقلید کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابویوب انصاریؓ نے حضرت عمرؓ سے صرف حکم سن لیا اور دلیل کی تحقیق نہیں کی جو تقلید کا حاصل ہے۔ یہ بھی صورت تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے جیسا کہ کتب احادیث سے مزاولت رکھنے والے جانتے ہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ قرآن خیر میں اجتہاد و تقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد و اشخاص الگ الگ تھے۔ یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس و ناکس کے لئے اجتہاد جائز نہیں تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس و ناکس کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں۔

اجتہاد و تقلید کی حدود..... نیز اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ شریعت نے امت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی جس سے واضح ہے کہ شریعت نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتی ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد اور یہی اس کی جامعیت اور عدل و اعتدال کا تقاضا بھی ہے ورنہ اجتہاد بلا تقلید افراط تھا اور تقلید بلا اجتہاد تفریط تھی۔ عدل کا مقتضی یہی تھا کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں پھر ساتھ ہی اس اجتہاد و تقلید کا شریعت ایک نظم بھی چاہتی ہے کہ مقلدین کی اکثریت مجتہدین کی مطیع رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت اسلام چونکہ کمال اعتدال اور جامعیت کی شان رکھتی ہے اور اسی لئے یہ امت بھی اعدل الامم اور جامع اقوام ہے جس کا لقب ہی قرآنی زبان میں امت وسط ہے۔ اس لئے منشاء شریعت یہ ہے کہ امت میں ہر ایک کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور یہ اجتماعیت نظام لئے ہوئے ہو۔ خواہ وہ نظام سیاسی ہو۔ خواہ دینی اس انداز کا ہو کہ نہ اس میں تشمت اور پراگندگی ہو جو بد نظمی ہے اور نہ جمود و استبداد ہو جو اجتماعیت اور جمہوریت کے منافی ہے۔ اس لئے اس نے امت کے سیاسی اور دینی دونوں نظامات میں یہی معتدل صورت قائم کی ہے۔ مثلاً امت کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تاکہ قوم میں فوضویت اور لامرکزیت نہ آنے پائے جو پراگندگی اور بد نظمی کی روح ہے۔ اس سے تو حکومت میں شخصیت قائم ہوئی۔

ادھر اس امارت کے لئے شوریٰ لازم قرار دیا تاکہ امیر میں استبداد بھی نہ پیدا ہو سکے اور قوم کے اجتماعی فکر کے قوی معطل اور بے کار نہ ہوں۔ اس صورت سے قوم میں جمہوریت باقی رہے۔ پس اسلامی امارت میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لامرکزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بے کار بنا دے اور عوام بھی اس پر حکومت کرنے لگیں۔

پس امیر کی شخصیت اور آمریت سے تو قوم کی طوائف الملوکی اور پراگندگی دفع کی اور قوم کی شوریٰ تشکیل

سے امیر کے استبداد کی روک تھام کر دی۔ اس طرح شخصیت اور جمہوریت دونوں کو ایک معتدل درجہ کے ساتھ امت کے سیاسی نظام میں شامل کر دیا گیا یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کر لئے گئے جو کمال اعتدال ہے۔ ٹھیک اسی طرح امت کے دینی نظام میں شریعت نے نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام افکار کو اس درجہ آزاد چھوڑا کہ امت کا ہر شخص مجتہد ہو اور کتاب و سنت میں ہر کس و نا کس کے آراء و قیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس امت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس کے قوی فکر و اجتہاد سرے ہی سے معطل ہو جائیں بلکہ ایک طرف تو جس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضاء زمانہ آتی اور ختم ہوتی رہیں گی تاکہ امت کے قوی فکر و تدبیر مست نہ ہونے پائیں۔

اور ایک طرف تقلید کو قائم رکھا تاکہ عامی اور ناواقف اپنی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے دین ہی کو آراء و قیاسات کا مجموعہ نہ بنادے اور اس طرح دین میں تشنیت و پراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں پس امت کے علمی تشنیت کو تقلیدی سمج و طاعت سے رفع کر دیا اور تقلیدی جمود کو شان اجتہاد و تحقیق سے دفع کیا اس طرح اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے بچا کر امت کو درمیان کے معتدل نقطہ پر قائم فرما دیا جس میں نافع پہلو سب قائم ہیں۔ چنانچہ امت اگر مقلد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اسوہ سلف کی مقلد بھی۔ غرض اس اعتدالی درجہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شان تحقیق نمایاں ہے۔ اس لئے نہ تو تقلید کو ایک مستقل شریعت بنا کر اس سے جس اجتہاد کی تردید کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید پر رد و انکار کوئی خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔

اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اس کی واضح دلیل باقی یہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اجتہاد کی وہ نوع جو استنباط عقل اور اجتہاد فی الدین سے تعلق رکھتی ہے آج اس لئے نہیں پائی جاتی کہ اس کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ائمہ نے اسے اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ آئندہ اس سے نفع اٹھانے کی صورت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں مزید تلاش و تحقیق کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی اصول ہے کہ جو مقصد دنیا میں مکمل ہو جاتا ہے اس کی متعلقہ قوت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ دین کی بنیادیں دو ہی ستونوں پر قائم تھیں۔ روایت اور درایت، روایت کا تعلق حافظہ سے ہے اور درایت کا تعلق فہم سے۔ اوّل اسلام میں جب کہ اسلام کا روایتی حصہ مکمل ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے محدثین کو جو مخصوص حافظہ عطاء فرمایا کہ آج اسے بجز کرامت اور خرق عادت کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، ایک ایک محدث کو لاکھوں کی تعداد میں احادیث یاد ہوتی تھیں اور نہ صرف متون و حدیث بلکہ مع اسانید و رجال اور نہ صرف رجال کے اسماء بلکہ ان کی سوانح اور صفات بھی ازبر ہوتی تھیں جیسا کہ کتب طبقات سے واضح ہے۔

جب دین سینوں کے ذریعہ سے سفینوں میں منضبط ہو گیا اور محض حفظ پر مدار نہ رہا تو قوت حافظہ قدرتی عوامل

کے ماتحت کھٹی شروع ہوئی اور آج اس حد پر آگئی کہ اگر ہم روزانہ کی معاشرتی زندگی میں نوٹ بک اور ڈائری جیسوں میں نہ رکھیں تو کاروبار صفر ہو جائے۔ پس جس حد تک اس محیر العقول قوت حافظہ کا کام پورا ہو گیا جو اس امت کو بطور اعجاز کے دی گئی تھی تو قوت کی وہ نوع بھی قدرتی طور پر ختم ہو گئی۔ گو جس حافظہ آج بھی موجود ہے جس کی باقی ماندہ نوعیت مناسب وقت کام کر رہی ہے۔

دور روایت کے بعد اسی طرح جب کہ اسلام کا دور اپنی حصہ مکمل ہونا شروع ہوا اور روایات سے دین کو استنباط کر کے متنب اور مفصل کرنے کی نوبت آئی تو حق تعالیٰ نے اس امت میں وہ ارباب درایت و فقہ اور ائمہ اجتہاد پیدا کئے کہ ان کے مصطفیٰ اذہان کا سرعت انتقال و نفوذ ان کے حیرت انگیز استنباطات اور ان کے فقہ نفس کے عجائبات بھی خرق عادت ہی کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مسائل ہی مستنبط کئے بلکہ وجوہ استنباط بھی علی وجہ البصیرت ظاہر کیں۔ کیفیت استنباط پر بھی روشنی ڈالی۔ پوری شریعت کی جزئیات کا ان کی کلیات سے ارتباط بھی معلوم کیا اور اس ربط کے واسطے سے ہزاروں نئے مسائل کلیات سے اور ہزار ہا علل کلیہ جزئیات سے استخراج کیں جس سے پوری شریعت شاخ در شاخ ہو کر ایک ہی شجرہ اور متصل واحد شئے دکھائی دینے لگی اور یہ سب کچھ اس شان سے ہوا کہ ارباب فہم آج ان حضرات کی رسائی فہم پر انگشت بدنداں ہیں اور اسے ان کا کوئی اکسابی کارنامہ نہیں بلکہ محض وہی عمل کہنے پر مجبور ہیں جس کے لئے خدا نے انہیں منتخب کر لیا تھا۔

جب دین کا یہ فقہ اپنی مکمل صورت میں آ گیا۔ اہمات مسائل حقیقی تنقیح کے بعد باب وار مرتب ہو گئے اور ائمہ فقہ کے سینوں سے نکل کر سفینوں میں مدون بھی ہو گئے تو ان ہی قدرتی عوامل کے ماتحت وہ خاص قوت فہم بھی کم ہونی شروع ہو گئی کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور رفتہ رفتہ زمانہ آج اس درجہ پر پہنچ گیا کہ جدید استنباط تو بجائے خود ہے مستنبط شدہ مسائل کے خفی رشتہ کو جو متعلقہ کلیات سے قائم ہے بلکہ جزئیات و کلیات کے سلسلہ کے تسلسل اور صورت انسلاک کو بھی پوری طرح سمجھنے کا فہم عامہ خلائق میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے اجتہاد کی وہ نوع بھی باقی نہیں جس کا تعلق استخراج علل و استنباط مسائل سے تھا کہ یہ ضرورت زمانہ نے پوری کر کے ختم کر دی اور اس بناء پر وہ قوت بھی منسحل ہو گئی۔

ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائج بد..... اس فقدان قوت کے بعد بھی اگر مدعیان زمانہ کو اجتہاد کی اس نوع میں آزادی مل جائے جس کے لئے لوگ تڑپتے ہیں تو قطع نظر استنباط مسائل کی ضرورت و عدم ضرورت کے فساد مذاقی غلبہ ہوا و ہوس اور جذبہ خود مختاری کے ماتحت ہر ایک فاضل ہر ایک گریجویٹ ہر ایک وکیل ہر ایک بیرسٹر ہر ایک ایڈیٹر جو چند پیسوں میں لوگوں کا کچھ وقت خرید سکتا ہے بلکہ ہر ایک خواندہ ناخواندہ مجتہد عصر ہوگا اور اجتہادات کے ایسے ایسے انوکھے نمونے دنیا کے سامنے آئیں گے کہ اسلام کی اصل شکل پہچانی بھی مشکل ہو جائے گی۔

چنانچہ حسب مضمون ”الاقتصاد“ ایک فیض کہے گا کہ: جس طرح سابق مجتہدین نے نصوص کو کسی علت

سے معلول سمجھا اور بسا اوقات ظاہر نص کو چھوڑ کر باطنی علت پر عمل کیا اور کر لیا مجھے بھی اس کا حق ہے لہذا میرے نزدیک مثلاً وضو کا حکم معلل ہے جس کی علت یہ تھی کہ عرب کے اکثر لوگ اونٹ بکریاں چراتے تھے۔ ان کے ہاتھ پیراں جانوروں کے بول و براز کی چھینٹوں سے آلودہ ہو جاتے تھے وہی ہاتھ منہ پر بھی لگ جاتا تھا اس لئے ان کو وضو کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے اعضاء وضو وہی رکھے گئے جن کی آلودگی عادتاً اکثر و بیشتر تھی۔ لیکن ہم ضروریات تمدن کے ماتحت روزانہ غسل کرتے ہیں محفوظ مکانوں میں کرسی نشین رہتے ہیں اور وہ آلودگی کی علت ہم میں نہیں پائی جاتی۔ لہذا وضو ہم پر واجب نہیں۔ ایک کہے گا کہ: مثلاً نکاح میں شہود اور اعلان نکاح فی نفسہ ضروری نہیں بلکہ اس علت سے تھا کہ زوجین میں اختلاف و نزاع کے وقت تحقیق حال میں سہولت ہو۔

پس جہاں اس کا احتمال نہ ہو وہاں بلا شہود نکاح جائز ہے وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ آج کہا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی علل و اسرار دین کے ہوں گے اور ان ہی علل پر احکام مبنی ہوں گے تو ان مجتہدین عصر کی بدولت غریب اسلام کو تو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہ ملے گی کیونکہ اس کا انجام احکام کی تحریف، اجماع کی مخالفت و تخریب نصوص کی تبدیلی اور اصلی اسلام کا انہدام ہے۔ یہ آج کے اجتہادات کے عریاں نمونے ہیں جنہیں ہر شخص ادنیٰ تاہل سے پہچان سکتا ہے اور بعض نمونے علمی رنگ کے ہوں گے جن کے اہمال کو خواص پہچان سکیں گے مگر اس قسم کے اجتہادی مفاسد پیش آنے کی وجہ وہی ہے کہ تکوینی طور پر وہ استخراج علل کی قوت تو بوجہ انقضاء ضرورت کے ختم ہو چکی ہے اور یہ علم کہ کون سا حکم معلل ہے علت کے ساتھ اور کون سا تعبدی ہے جس قوت فہم پر مبنی تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس کا ادعاء اور اوپر سے استعمال ایسے ہی نتائج پیدا کرے گا جو مثلاً عرض کئے گئے۔ ہاں اس خاص نوع کو چھوڑ کر جس نوع کے پردہ میں آج بھی جنس اجتہاد باقی ہے وہ عام تحقیق و تلاش کتاب و سنت میں تدبیر ان کے لطائف و حقائق کا استخراج ہر زمانے کے تکوینی حوادث سے تشریحی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا۔ معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک و شبہات کی تردیدات نصوص سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات و تحقیق کے لئے کتاب و سنت سے مویذات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ ہے۔ اجتہاد کی یہ نوع کل بھی تھی ورا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ قرآن کی شان لا تنقضی عجائبہ ① فرمائی گئی ہے جس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں۔

پس جس طرح کتب روایت میں آج کبھی جدید چھان بین اور روایات پر نئی جرح اور تعدیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ حسب ضرورت صرف ائمہ فن سے ان کی عرق ریزیوں کا شرہ پیش کر دینا کافی حجت ہے ورنہ تحصیل حاصل ہوگی۔ اس طرح کتب روایت میں بھی آج پھر سے اس اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی جو کیا جا چکا ہے۔ بلکہ حسب ضرورت ائمہ درایت سے ان کی کاوشوں کے ثمرات کا نقل کر دینا اور اس پر عمل کر لینا کافی ہے۔ وہاں ہم روایت میں تقلید ائمہ پر مجبور ہیں۔ یہاں درایت میں مجبور ہیں۔ گویا نہ نئی حدیث کی ضرورت ہے نہ نئے فقہ

کی۔ محدثین نے کوئی روایت نہیں چھوڑی جس کا صحت و سقم کھول کر نہ رکھ دیا ہو۔ فقہاء نے کوئی درایتی احتمال اور بعید سے بعید صورت عمل ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کو نکھار کر بدلائل سامنے نہ رکھ دیا ہو اور کسی جو یاے عمل کے لئے تشکیکی کوئی ادنیٰ صورت بھی باقی رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئے سے نئے مسائل پیش آئے اور آرہے ہیں مگر متقیین کو فتاویٰ کے لئے اب تک کوئی جدید فقہ مرتب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی فقہ سے جو ایک لاء اور قانون کی صورت میں مدون ہے اور ان ہی اصول سے جن کے ماتحت یہ فقہی ترتیبات عمل میں آئیں زمانہ کی ساری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں خواہ اس کے منصوص حصہ سے اور خواہ اس کے اجتہادی حصہ سے۔ یہ خود اس کی ایک مستقل دلیل ہے کہ اجتہادی دور اپنا کام پورا کر کے منقضی ہو چکا ہے جو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اجتہاد فی الدین کا دور ختم ہو چکا تو ہو جائے مگر اس کی تقلید کا دور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تقلید ہر اجتہاد کی دوامی رہے گی خواہ وہ موجود ہو یا منقضی شدہ کیونکہ تقلید عین اجتہاد میں نہیں کی جاتی بلکہ اس سے پیدا شدہ مسائل میں کی جاتی ہے اور وہ مسائل آج بھی موجود ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے تقلید پر کوئی دور بھی اختتام و انقضاء کا نہیں آ سکتا۔ خلاصہ یہ کہ جس اجتہاد و تقلید میں سے کسی کو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی وقت بھی دنیا سے منقطع ہوئے ہیں اس لئے آج بھی وہ دونوں اپنی اسی نوعیت کے ساتھ جس کی تفصیل ابھی عرض کی گئی دنیا میں موجود ہیں کہ دین کی جامعیت تو ان دونوں کے وجود کو منقضی ہے جبکہ یہ دونوں شرعی چیزیں ہیں اور دین کا اکمال و اتمام ان دونوں کے درجہ اعتدال کو منقضی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ درمیانی نقطہ پر لا کر دونوں کو قائم رکھا جائے جس کی صورت ابھی عرض کی گئی۔

اختلاف ائمہ باعثِ رحمت ہے..... یہاں سے بحث کا ایک اور نقطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب اجتہاد شرعی چیز ہے جس میں رائے اور فہم کا دخل ہوتا ہے اور آراء و جفاوت افہام متعذر اور مختلف ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی اجتہادی مسئلہ میں آراء کئی ہو جائیں اور اجتہادات مختلف رنگوں کے ظاہر ہوں تو کیا اس اختلاف رائے کا دروازہ کھلنا امت کی تفریق بلکہ تخریب اور تہذیب کا باعث نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صورت اختلاف نہ فی نفسہ مضر ہے نہ دین کے لئے مضر ہے نہ امت کے لئے مضر ہے۔ بلکہ علمِ علماء اور پوری امت کے خواص و عوام کے لئے موجب ترقی اور باعثِ سود بہود ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ترقی بغیر تصادم و تزام کے نہیں ہوتی بلکہ ترقی نام ہی دو متخالف چیزوں کے ٹکرانے کا ہے۔ اس لئے علم کی وسعت بھی بغیر تزام آراء اور تصادم افکار کے نمایاں نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے۔ ”الْقَلْبُ مِيتٌ وَ حَيَاتُهُ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مِيتٌ وَ حَيَاتُهُ بِالْمَحَبَّةِ وَالْمُنَظَرَةُ“ ”دل آدمی کا مردہ ہے اس کی زندگی علم سے ہے اور علم انسان کا مردہ ہے اس کی زندگی محبت و مناظرہ سے ہے“

ظاہر ہے کہ بحث و مناظرہ علم کو علم سے ٹکرانے کا ہی نام ہے جس سے علم کے مختلف مخفی گوشے کھل جاتے ہیں۔ مکوین الہی نے اسی لئے اسلام کے مقابلہ میں کفر کی طاقتیں کھڑی کیں تاکہ کفر باطل کے جتنے پہلوؤں سے اسلام

سے نکلے، اسلام کے اتنے ہی حقانی پہلو نمایاں ہو جائیں اور انجام کار حق کا غلبہ سب دیکھ لیں۔ علم کے مقابلہ پر شبہات کا انکسار اسی لئے صف آراء کیا گیا کہ جہل اپنے جس جس حصہ سے علم سے نکلے گا وہ علم کے اتنے ہی مخفی گوشے دنیا کے سامنے ہوتے رہیں۔ پھر علم کو علم سے جتنی بھی ٹکری دی جائے معلومات کے اتنے ہی بوقلموں نقشے کھلتے رہیں۔ شریعت نے مشورہ کا اصول اسی لئے رکھا کہ آراء کے تصادم سے مسئلہ کے موافق اور مخالف پہلو کھل جائیں اور بات چھن چھن کر مٹھ ہو جائے۔ غرض اگر اصول کے مقابلہ پر اضمحان نہ ہوں اور متخالف اشیاء کے سامنے ان کے متخالفات نہ ہوں تو نہ ان کے مخفی حقائق اور قوی واشکاف ہو سکتے ہیں اور نہ بے حقیقت اضمحان کی قلعی کھل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے دین میں ایک حصہ محل فکر و بحث رکھ کر اجتہاد و تحقیق اور تراجم آراء کے لئے چھوڑ دیا تاکہ اسلام کا وہ باطنی علم جو وسیع ترین کلیات اور مخفی علل اور اسرار پر مشتمل ہے ”لَا تَقْفُ عِنْدَ حَيْدٍ“ کی حد تک کھلتا چلا جائے اور امت کے مخصوص دماغوں کی جولانیاں اور قلوب صافیہ کی رسائیاں سارے عالم کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔

ساتھ ہی اسلامی علوم کی جامعیت اور اسی کے ساتھ کتاب و سنت کی ہمہ گیری بھی کھل جائے۔ اس کی مختصر مختصر نصوص میں کتنے کتنے علوم بھرے پڑے ہیں کہ ہر مصفی قلب و دماغ کے لئے اس میں ہر وقت اور وقت کے مناسب علم کا جدید سے جدید سامان تیار ہے جس سے ”أَعْطِيتَ جَوَامِعَ الْكَلِمِ“ ① اور ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ② کا پورا پورا نظہور ہو جائے۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کتاب و سنت کے بلیغ جملات اور ذی وجوہ فقرات جس قدر بھی شرعی احتمالات اپنے اندر رکھتے ہیں جو قواعد عربیہ اور اصول لسان کے اعتبار سے ان میں سے حقیقہ پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تمام محتملات بعض احتمالات میں نہ رہیں۔ بلکہ ہر ایک محتمل قابل عمل اور ایک مستقل اسوہ بن جائے اور احتمال کی طرف جانے والا چل نکلے اور اسے اپنا مسلک ٹھہرائے تاکہ کلام الہی اور کلام رسالت پناہی کا کوئی گوشہ بھی مہمل نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی امام کے اختیار کر لینے کے سبب وہ امت کے زیر عمل آجائے۔ پس آج اختلاف آئمہ کی بدولت احادیث کا ہر محمل اجتہادی مسائل کی صورت میں امت میں معمول ہے اور کلام پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی گوشہ نہیں ہے جو ایک مستقل مذہب اور مسلک بنا ہوا نہ ہو۔ اسی لئے اس اختلاف کو رحمت و وسعہ فرمایا گیا کہ اس کی بدولت کلام نبوت کا اعمال ہوتا ہے اہمال نہیں رہتا ”وَالْأَعْمَالُ أَوْلَىٰ مِنَ الْإِهْمَالِ“ نیز امت کے لئے اور سہولت بھی بہم پہنچتی ہے کہ ہر مذاق کا طبقہ ہر مذاق کا امام اپنے مناسب مذاق علی پہلو کو لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے اس صورت میں اسلام ایک ایسے دریا کی مانند ہوگا جس کا ایک ہی گھاٹ نہ ہو بلکہ متعدد ہوں کہ جو راہ گیر جس جانب سے بھی گزرے سیراب ہو سکے اور اسے کسی ایک ہی گھاٹ کی طرف گھوم کر آنے کی مجبوری لاحق نہ ہو کہ ہر گھاٹ پر پانی بھی وہی ہے مزہ بھی وہی ہے۔ البتہ سمت اور رخ بدلا ہوا ہے ایک عظیم

① الصحيح لمسلم، کتاب المساجد ومواقع الصلوٰۃ، باب (بلا ترجمہ) ج: ۳ ص: ۱۰۹.

② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیہ: ۸۹.

الشان درخت کے مشابہ ہوگا جس کی ہزاروں شاخیں ہوں اور ہر سمت میں ہوں تاکہ جدھر سے بھی کوئی آئے پھل کھا سکے۔ یہ نہیں کہ شاخ ایک ہی ہے اور ہر جانب سے آنے والے کو ناگزیر طریقے پر ایک ہی سمت خاص میں پہنچ کر پھل سے انتفاع کا موقع ملتا ہے یا ایک ایسے عظیم ایوان کی طرح ہے جس میں ہزاروں دروازے ہیں کہ ہر جہت سے آنے والے ہر سمت سے مکان میں داخل ہو سکتے ہیں اور اس کے سامان سے راحت اٹھا سکتے ہیں جو مجبور نہیں ہیں کہ گھوم پھر کر ایک ہی دروازے سے داخل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت اختلاف ائمہ ہی کی بدولت امت کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلاف ائمہ اصول کا نہیں بلکہ اتحاد اصول کے ساتھ سمتوں اور جہات و کیفیات کا اختلاف ہے تاکہ علم کی اس وسعت سے اسلام کی ہمہ گیری اور امت کے لئے عمل کی تیسیر ہو جائے۔ نیز ہر مذاق کے انسان کو الوان فہم کے مذاق کے مطابق مربی اور سامان تربیت بھی میسر آ جائے۔

بس اس حکمت بالغہ کے ماتحت حق تعالیٰ نے آئمہ اجتہاد میں تعدد بھی پیدا فرمایا اور ان میں متعدد حضرات کے مذاق اجتہاد میں الوان کا بھی اختلاف ڈال دیا۔ اصول استنباط بھی مختلف ہو گئے اور ان کے ماتحت مستنبط شدہ مسائل کی لیات اور پھر ان لیات کے ماتحت حکمیات بھی مختلف ہو گئیں اور یہ سارے اختلافات سمٹ کر اس اختلاف ذوق سے پیدا ہوئے جو ائمہ کو قدرت الہی نے نگوینی طور پر بخشا تھا۔ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی رونما ہوا کہ ان ائمہ کی مختلف ہشون سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف اور متنوع ہشون نبوت و اشکاف ہوئیں۔ گویا وہ ساری ہشون جو ایک ذات بابرکات نبوی میں مجتمع تھیں اور ان سب کا کوئی ایک امتی انفرادی طور پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ پوری امت کے راسخین فی العلم پر منقسم ہو کر مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئیں اور اس شان سے کہ ہر شان نبوت نے ایک ایک مجتہد کے ذریعہ ایک مستقل مسلک اور تہذیب کی صورت اختیار کر لی جس پر امت کے کروڑوں افراد چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ اور ہشون نبوت کے یہ تمام الوان ایک صدر رنگ گلدستہ کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے، نظر بریں فقہاء امت کا یہ اختلاف امت کے حق میں نہ صرف غیر مضر بلکہ علما و عملاً مفید ثابت ہوا۔ فہم شخصیات کے مکنون جو ہر کھلے کتاب و سنت کی بلاغت و جامعیت کے مستور پہلوؤں کا اعلان ہو گیا۔ امت کے لئے عملی آسانیاں بہم پہنچ گئیں۔ پیغمبر کے متنوع علم کی ہشون واضح ہو گئیں، غرض امت، پیغمبر، دین، مذہب سب کے لئے اجتہادی اختلاف اور فروغی تنوع بھرپور مفید ہی مفید اور رحمت ثابت ہوا، اسی لئے شریعت نے کھلے الفاظ میں اس اختلاف کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے رحمت و اسعہ کہا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ”اِخْتِلَافُ أَصْحَابِي رَحْمَةٌ وَاسِعَةٌ“ ① ”میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا اختلاف بڑی رحمت ہے۔“

پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی گئی بلکہ ہر اس اجر و ثواب کے مواعید دے کر امت کو اس کی رغبت دلائی گئی۔

① علامہ شاہ فرماتے ہیں: اس حدیث کا امام بیہقی نے ”الدرل“ میں ذکر کیا ہے، اس حدیث کی سند میں جویر ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

و جویر ضعیف جداً دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۱۲، حرف الهمزة.

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ ثُمَّ اجْتَهَدَ ثُمَّ أخطأَ فَلَهُ أَجْرٌ. ①

”حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی حکم والا حکم کرے اور اجتہاد میں مصیب ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر خطا ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔“

قرآن کریم نے بھی اپنے نظم میں اس اختلاف کی مشروعیت کی طرف اشارہ فرمایا گویا فروعی اختلافات کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ ② ”اور تم لوگ ان کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا واضح احکام پہنچ جانے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی۔“ ﴿مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ کی قید سے واضح ہے کہ اختلاف مطلقاً مذموم نہیں بلکہ صرف وہی اختلاف مذموم ہے جو دلائل کھل جانے کے بعد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اختلاف یا تو اصول کا اختلاف ہو سکتا کیونکہ اصول خود ہی نفسہ کھلے ہوئے اور واضح ہوتے ہیں اور یا ان فروع کا ہو سکتا ہے جن کے دلائل واضح ہو جائیں۔ پس اصول واضح اور فروع واضحہ الدلائل میں اختلاف آیت بالا سے مذموم اور ممنوع ثابت ہوا کہ وہ اختلاف محض نفسانی ہوتا ہے لیکن ان فروع میں اختلاف جن کے دلائل ہی ابھی تک واضح نہ ہوئے ہوں خواہ اس طرح کہ ان کے بارہ میں کوئی نص ہی نہ آئی ہو یا نص ہے مگر اس سے متعارض ایک دوسری نص بھی ہو جن میں وجہ تطبیق صریح اور واضح نہ ہو۔ تو اس قسم کی فروعیات میں اختلاف ظاہر ہے کہ وضوح مینات سے پہلے پہلے کا ہوگا اس لئے مذموم بھی نہیں ہو سکتا یہی وہ اجتہادی اختلاف ہوگا جو اتحاد اصول کے ساتھ محض فروعی ہوگا اور کججوری ہوگا جسے لسان نبوت پر رحمت واسعہ کہا گیا ہے اور جس کی خطا پر اجر کا وعدہ دیا گیا ہے پس ایسے اختلاف کی مشروعیت حدیث کے تو منطوق اور قرآن کے مفہوم سے ثابت ہوگئی۔

مسائل فقہیہ کی تدوین مذموم نہیں ہو سکتی..... بہر حال جبکہ اجتہاد مشروع بھی ہوا، اجتہادی اختلافات بھی شرعی اور مطلوب شرعی ٹھہرے تو آخر اجتہاد کے ذریعے ایسے اجتہادی اختلافات کا ظہور بھی نہ قابل ملامت ہو سکتا ہے نہ ایسے مسائل کی تدوین ہی قابل طعن ہو سکتی ہے۔ اگر کسی مجتہد کے تلامذہ اپنے عمل کے لئے اس کے اجتہادات کو ایک جگہ جمع کر لیں گویا بالفاظ دیگر ان شریعات کے مسائل کی تدوین کرنے لگیں تو آخر اس میں کون سی شرعی قباحت ہے کہ اس پر انہیں قابل سرزنش شمار کیا جائے۔ بس ایسے ہی اجتہادی مسائل کے ایک جگہ جمع شدہ مجموعہ کا نام فقہ ہے جس کو کسی مجتہد کے متوسلین نے باب وار اوراق میں ذخیرہ کر لیا ہو۔ پھر یہ نام بھی کوئی اختراعی نام نہیں بلکہ حدیث نبوی سے ثابت شدہ اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز فرمودہ نام ہے جیسا کہ

① الصحيح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب اجر الحکم اذا اجتهد، ج: ۲۲، ص: ۳۳۵.

② بارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۵.

حدیث رَبِّ حَامِلٍ فَقِهِ اور حدیث مَثَلُ مَنْ لَفَقَةٍ فِي دِينِ اللَّهِ اور حدیث مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ سے تفصیلی طور پر اس فقہ کی نوعیت عرض کی جا چکی ہے۔

متبعین فقہ کے لقب ”اہل السنّت والجماعۃ“ کا ماخذ..... ہاں پھر چونکہ یہ فقہ مجموعہ سنن تھا جس میں سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو بطور ماخذ کے شامل تھیں اور سنن صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بطور ماخذ کے جمع تھیں اس لئے اس میں سنیت کا بھی نور تھا اور جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا جماعتی نور بھی مجتمع تھا اس لئے عالمین فقہ نے اپنا نام اہل السنّ والجماعۃ رکھ لیا تو کیا برا کیا بلکہ غور کرو تو یہ نام بھی حدیث ہی سے ماخوذ ہے، حضرت عمرؓ بن عاص کی روایت میں ارشاد نبوی ہے۔ وَإِنْ بَنِي إِسْرَاءَ نِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَتَفَرَّقَ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً قَالُوا مَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي. ① ”اور بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت بہتر (۷۳) فرق پر منقسم ہو جائے گی سب فرق ناری ہو گئے بجز ایک کے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں اس پر چلنے والا ناجی ہے۔“

ظاہر ہے کہ اصحاب کے لفظ سے جو جمع لایا گیا ہے اس سے جماعت مفہوم ہو رہی ہے اور نما سے مراد طریقہ اور سنت ہے جو غیر اور صحابہؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس لئے فرقہ ناجیہ کا ترجمہ ہوا ”سنت نبی وجماعت نبی“ ظاہر ہے کہ جب اہل فقہ کی فقہ میں یہی سنت نبی اور جماعت نبی جمع ہے اور انہوں نے اس لفظی اور معنوی مناسبت سے اپنا لقب اہل سنت والجماعت تجویز کر لیا تو اس میں کیا برائی ہے کہ یہ لقب ان کے حق میں مستوجب ملامت شمار کیا جائے بلکہ اس لقب کی ترکیب پر غور کیا جائے تو ایک اور شرعی حقیقت بھی اس لقب سے واشگاف ہوتی ہے جو نبی جماعت کے جسم کے لئے بمنزلہ روح کے ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت اور اہل الجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سنن نبوی کو محض الفاظ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہؓ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں جو عالمین حدیث ہیں جن کی زبانوں پر تو حدیث وقرآن کے الفاظ ہیں اور سینوں میں ان الفاظ کے مخفی حقائق وحقائق ہیں۔ گویا الفاظ کتاب و سنت کے ساتھ صحبت و معیت اساتذہ بھی ضروری ہے۔

اگر صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن و حدیث سنا اور ان کے حقائق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے لیا پھر تابعین نے صحابہؓ کی زبان سے تو قرآن و حدیث لیا اور ان کے قلوب سے اس کی صفائی و اسرار کو حاصل کیا ﴿بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُكُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ﴾ ② وہم بھی اس توارث کے ماتحت الفاظ کتاب و سنت تو کتب سے لیتے ہیں اور ان کے حقائق ان روشن ضمیر اساتذہ کے قلوب سے جو خلفاء عن سلف اس باطنی نور کو اخذ

① المستدرک، ج: ۱، ص: ۲۱۸، رقم: ۲۴۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ۱، ص: ۲۰۲، رقم: ۲۰۳۔

② پارہ: ۲۱، سورة العنکبوت، الآية: ۳۹۔

کرتے چلے آئے ہیں۔ پس اہل السنۃ والجماعت کے لفظ سے طریقہ اور مذہب بھی نکلتا ہے اور طریقہ کے ساتھ اہل طریق کی معیت ملازمہ بھی مفہوم ہوتی ہے جو حقائق کے سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے دینی سلسلہ میں تعلیم و تربیت کے بھی دو اصول ذکر فرمائے ہیں۔ ایک کتاب اور ایک استاد۔ گویا کتاب کے ساتھ ایک عالم کتاب رسول، ضرور لازم رکھا ہے تاکہ وہ کتاب کے جلی و خفی حقائق سمجھائے بھی اور کر کے دکھلائے۔

چنانچہ ارشاد در بانی ہے۔ ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ① ”بلاشبہ ہم نے اپنے رسول بھیجے کھلی کھلی نشانوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان تاکہ لوگ عدل کے ساتھ قائم ہوں“۔ اس لئے اہل السنۃ والجماعت کا عنوان ایسا جامع عنوان نکلا کہ اس میں دینی تربیت کے ان دونوں بنیادی اصول (کتاب اور شخصیت) کی طرف اشارہ ہو گیا جن سے ایک سچی جماعت یا صادق فرقہ کی تشکیل ہوتی ہے کہ اس کے لقب میں طریق اور اہل طریق دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جو اہل السنۃ والجماعت ہے وہ اہل حدیث اور اہل قرآن بھی ہے کہ یہ کتاب کا مرتبہ ہے۔ اہل عترۃ بھی ہے کہ یہ شخصیت کا درجہ ہے لیکن ہر اہل حدیث اور اہل قرآن کا اور اہل عترۃ کا اہل السنۃ والجماعت ہونا ضروری نہیں کہ ان القاب میں کسی میں فقط کتاب کی طرف اشارہ ہے اور کسی میں محض شخصیت کی طرف۔ پس حدیث میں جہاں بھی مسلمانوں کو اہل حدیث فرمایا گیا جیسے حدیث انسؓ بخادی سے نقل کی جاتی ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ”أَهْلُ الْحَدِيثِ“ سے خطاب کیا گیا یا قیامت میں کیا جائے گا یا کسی حدیث میں مسلمانوں کو اہل قرآن کہا گیا ہے جیسے حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے کہ ”إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَيُؤْتِرُ فَأُوْتُوا يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ“ ”اللہ وتر ہے، وتر کو پسند کرتا ہے پس وتر پڑھو اے اہل قرآن“۔ ②

یا کسی حدیث عترت کے اتباع کی دعوت دے کر گویا انہیں اہل عترت کہا گیا یہ سب اسماء جزوی اور نسبی ہیں کہ یا مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا اصحاب و اہل بیت کی طرف ایک دم اشارہ بلکہ صراحتہ موجود ہے۔ دراصل حالیکہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے القاب والی روایات میں اس لقب سے کسی اصطلاحی جماعت کی طرف اشارہ نہیں ورنہ چکڑ الوی اہل قرآن اور شیعان اہل عترت کو اپنی حقانیت پر استدلال لے آنے کا کافی موقع مل جائے گا۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نسبت محض ہے جو ملا بست کی وجہ سے فرمائی گئی ہے جیسے جنت میں مختلف دروازوں باب الصلوٰۃ باب الجہاد باب الریان وغیرہ سے داخل ہونے والوں کو محض ان اعمال یا ان دروازوں کی طرف منسوب ہو جانے کے سبب مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض کو اہل الصلوٰۃ کہا گیا بعض کو اہل الصیام کہا گیا

① پارہ ۲۷، سورۃ الحديد، الآیہ ۲۵۔

② السنن للترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء ان الوتر ليس بحتم ج: ۲ ص: ۲۵۵۔

اور بعض کو اہل الجہاد کہا گیا۔ یا بعض روایات میں انہیں اہل دین کہا گیا ظاہر ہے کہ ان القاب سے فرق اور مذہبی گروہ مراد نہیں ہیں بلکہ محض نسبتوں کا اظہار ہے جس سے مسلمانوں کی امتیازی شان اور تشریف مقصود ہے نہ کہ عقائد و مسائل کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرمانا۔ اسی طرح حدیث میں اہل الحدیث اہل القرآن فرمانے سے اصطلاحی جماعتیں چکڑالوی یا امرتسری مراد نہیں بلکہ نسبتوں کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے بھی نسبت ہے۔ حدیث سے بھی ہے۔ صحابہؓ سے بھی ہے صلوٰۃ سے بھی ہے صیام سے بھی ہے جہاد سے بھی ہے، دین سے بھی ہے مکہ طیبہ سے بھی ہے۔ پس ایک مسلمان اہل حدیث بھی ہے اہل قرآن بھی ہے اہل عزت بھی ہے، اہل صلوٰۃ بھی ہے اہل صیام بھی ہے۔ اہل جہاد بھی ہے، اہل دین بھی ہے، اہل علم بھی ہے اور اہل

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بھی ہے۔ لیکن ”مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي“ کا جملہ جس سے اہل السنۃ والجماعۃ کا لقب مستنبط ہوتا ہے بولا ہی گیا ہے فرق کے تذکرہ کے سلسلہ میں اور اس لقب سے ایک ہی فرقہ کی تشخیص منظور ہے جو عند اللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ پس یہ لقب محض نسبت ہی نہیں بلکہ ایک جماعت کا شرعی سرنامہ اور عنوان ہے، اس لئے میرے خیال میں اہل السنۃ والجماعت نے اس لقب کو اپنے لئے اختیار کر کے اپنے کمال فقہ کا ثبوت دیا ہے کہ مسلک کا لقب بھی منصوص ہی انتخاب کیا یعنی اہل السنۃ والجماعت اور پھر لقب بھی وہ اختیار کیا جو لقب ہی کے طور پر حدیث میں مذکور ہوا ہے نہ کہ محض نسبت کے طور پر ”فَمَا أَحْسَنَ فِقْهُهُمْ وَأَحْسَنَ بِلَدِّائِهِمْ“ جس طرح حدیث کی اس نسبت ”اہل حدیث“ سے ”اہل قرآن“ کی نفی نہیں ہوتی اور اہل قرآن کے لفظ سے اہل حدیث کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل حدیث کے لفظ سے آخر اہل السنۃ والجماعت کے لقب کی یا ان کے مسلک فقہ کی یا اس کے لوازم اجتہاد و تقلید کی نفی کیسے ہو جائے گی اور حدیث کی یہ مراد ہی کب ہے کہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے لقب کو بمقابلہ لقب اہل السنۃ والجماعت استعمال کیا جائے؟ نہیں بلکہ سوچا جائے کہ اگر فرقہ ناجیہ کے لقب (اہل السنۃ والجماعت) سے نسبت محض اہل حدیث یا اہل قرآن کی نفی کی جاتی تو موقع بھی تھا لیکن نسبت محض کے عنوان سے ایک جماعتی لقب کے عنوان کی نفی کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے جبکہ وہ منصوص بھی ہو۔ بہر حال اہل السنۃ والجماعت بحمد اللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ فرقہ ضالہ نہیں۔ اس کا لقب شرعی ہے بدعت نہیں۔ اس کے دستور العمل کا لقب (فقہ) منصوص ہے، اختراعی نہیں۔ اس لئے اگر یہ شرعی جماعت اپنے شرعی مسلک کے مسائل کو بنام فقہ ایک جگہ مرتب اور جمع کر دے تو اس میں ملامت کی کیا بات ہے؟ چناں چہ آئمہ مجتہدین کے فقہیات مرتب ہوئے اور اپنی اپنی جگہ کروڑوں مسلمانوں کے لئے دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور کبھی بھی امت نے ان کو ذریعہ مطاعن و ملامت نہیں بنایا۔ بلکہ ہر طبقہ نے امت کی اس محنت کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے قرآنی معجزہ کی حجت سمجھا کہ اس کے ذریعے سے قرآن کے علوم سر بستہ جو اس کے اعجاز کی روح اور وجہ اعجاز کا اہم جزء تھے، کھل گئے اور کتاب و سنت کے جوامع کلم کی اعجازی بلاغت و جامعیت نمایاں ہو گئی۔

تقلید شخصی اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے..... بہر حال جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ اجتہاد مشروع، اجتہاد پر عمل مشروع، ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کیا جانا شرعی چیز، اس کا نام رکھنا شرعی بات اور ان سارے اجتہادات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید ناگزیر اور ساتھ ہی یہ کہ ہر اجتہادی مسئلہ میں دو آراء کا ہونا ممکن اور دائرہ شرع میں داخل بلکہ مستحسن اور مطلوب ہے۔ تو یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے اختلافی مسائل میں پھر تقلید شخصی بھی ناگزیر طریقہ پر ضروری ہو کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جائزین میں دائر و سائر کبھی رہ ہی نہیں سکتا، نہ اعتقاداً نہ عملاً آخر ایک ساعت میں ناخن و منسوخ، رائج و مرجوح، اولیٰ غیر اولیٰ، حقیقت و مجاز، مشترک، مؤول، واجب اور مکروہ، فرض اور حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے؟ چارونا چار ایک ہی جانب کو اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غیر مجتہد کو اختلافیات میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنا پڑے گی۔ حتیٰ کہ اگر ایک مسئلہ میں ایک امام کی تقلید ہو اور دوسرے میں دوسرے کی تو میں کہوں گا کہ: جس مسئلہ میں بھی کسی کی تقلید ہوئی ایک کی ہوئی اور وہی تقلید شخصی پھر باقی رہی۔ زیادہ سے زیادہ امام کئی ہو گئے۔ مگر ہر مسئلہ میں امام ایک ہی رہا اور تقلید بھی واحد ہی کی رہی۔ یہ تو نہ ہوا کہ کسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعدد ہو گئیں امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واقع ہوئی وہ رہی شخصی ہی۔ یا اگر ایک شخص ایک مسئلہ میں صبح کو ایک امام کا مقلد ہے اور اسی مسئلہ میں شام کو دوسرے کا، جبکہ وہ دونوں مختلف الرائے بھی ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اب بھی وہ تقلید شخصی ہی رہی کیونکہ جس صبح کو اس نے ایک امام کی تقلید کی تو اس صبح کو وہ یقیناً دوسرے امام کے نظریہ سے ہٹا ہوا اور اس کے عمل سے الگ تھلگ۔ شام کو جب اس نے دوسرا امام اختیار کیا، تو یقیناً صبح کا مذہب اور صبح کا امام بھی بدل دیا۔ اس لئے صبح کو تقلید شخصی ہی کی اور شام کو بھی تقلید شخصی ہی رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوا عقلاً کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کون سی مذموم ہے اور کون سی مستحسن؟ مگر مختلف فیہ مسائل میں کوئی نوعیت ہی لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لئے اور تحقیق شخصی کے سوئی مجتہد کے لئے کوئی چارہ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ عقلاً آدمی بیک وقت نقیضین میں دائر و سائر کبھی نہیں رہ سکتا۔ نیز دین میں شرعاً تناقض غیر ممکن ہے۔ جو بھی کسی ایک جانب کو اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریہ سے علما اس کی ایک جانب کو بڑھا ہے یا وہ مقلد ہو جو اعتقاداً و عملاً مسئلہ کی ایک جانب کو اختیار کر رہا ہے وہ ناگزیر ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے ورنہ وہ اور اس کا دین تناقض کا شکار ہو جائے گا۔ جو عقلاً و شرعاً محال ہے جس کی دین میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہاں اس کے نظائر ملیں گے کہ ایک جانب سے رجوع کر کے دوسری جانب اختیار کر لی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پہلی جانب کو ترک کرنا پڑے گا۔ اور وہ تقلید شخصی یا تحقیق شخصی پھر آ جائے گی۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک کے زیر عمل ہوتے ہوئے دوسری بھی معمول بن جائے۔

تقلید شخصی کون سی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟..... رہا یہ کہ ان ساری شخصی تقلیدات میں مطلوب کون سی تقلید ہے یا عقلاً اور نقلاً قابل قبول بلکہ قابل وقوع کون سی ہے؟ سو اس کے متعلق اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صرف ایک ہی صورت معقول ہو سکتی ہے کہ عمل کے دائرہ میں ایک ہی فقہ کے تمام مسائل پر عمل کیا جانا یا بالفاظ دیگر کل مسائل اجتہاد یہ میں ایک ہی امام کی تقلید کیا جانا ضروری ہے کیونکہ علمی نظر میں یہ غیر ممکن ہے کہ اجتہادیات میں تقسیم کر کے بعض مسائل میں ایک امام کی اور بعض میں دوسرے کی تقلید کی جاسکے۔ بلکہ جس فقہ کو بھی اختیار کیا جائے گا اسے پورے ہی کو اختیار کرنا پڑے گا ورنہ وہی تناقض محال کسی نہ کسی جہت سے سر پر پڑ جائے گا۔ بعض مسائل میں جزیاتی تناقض نمایاں ہوگا۔ بعض میں ان جزیات کے مبادی اور تعلقات کا تناقض رونما ہوگا اور بعض میں ان جزیات کے کلیات اور اصول میں تناقض پیدا ہو جائے گا کیوں کہ:

1..... بعض مسائل اجتہاد یہ تو وہ ہیں کہ خود ان ہی میں کھلا تناقض ہوتا ہے جسے ایک عامی سے عامی آدمی بھی پہچان سکتا ہے۔ مثلاً مس مراء (عورت کا چھو دینا) کہ حنفیہ کے یہاں ناقص وضو نہیں اور شوافع کے یہاں ہے یا خارج من غیر التسمیلین شوافع کے یہاں ناقص وضو نہیں اور حنفیہ کے یہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلا تناقض ہے جو حکم کے لحاظ سے بھی ہے اور بناء حکم یعنی دلائل وغیرہ کے اعتبار سے بھی۔ پس ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ وہ ان مسائل کی ان دو متناقض جہات کو تناقض مانتے ہوئے بیک وقت نہ دونوں پر عمل کر سکتا ہے نہ دو اعمال کے درمیان دائرہ سائرہ سکتا ہے کہ دین میں ایسے تناقض کی کوئی حجت اور کوئی نظیر ہی موجود نہیں الا یہ کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے دو متناقض باتوں میں صراحت امت کو اختیار دے دیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں دو فقہیات یا دو فقہاء میں دائرہ سائرہ ہنا کھلا تناقض قبول کر لینا ہے گویا دو متعارض چیزوں کو بیک وقت حق جان کر قابل عمل ماننا ہے جو عقلاً بھی باطل ہے اور شرعاً بھی محال ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عامی آدمی کھلے طور پر مسئلہ کی ایک ہی جانب اختیار کر کے ایک ہی امام کی تقلید پر مجبور ہوگا۔

2..... دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ کی دو متخالف جانبیں میں سے ایک وقت ایک پر عمل کیا جائے اور دوسرے وقت دوسری پر۔ یا ایک امام اور ایک فقہ کا پابند رہتے ہوئے اسی نوع کے کسی ایک آدھ مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر لی جائے اور جبکہ اس مسئلہ کی وہ جانب ہی چھوڑ دی جائے گی جو اپنے امام کی اختیار کردہ تھی اور صرف وہی جانب لی جائے گی جو دوسرے امام کی مختار ہے تو اس میں وہ مذکور تناقض حکم بھی پیدا نہ ہوا اور ایک امام کی تقلید سے بھی آدمی باہر نہ ہوا کہ ہر حال اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً کل ہی مسائل میں بجز اس ایک آدھ مسئلہ کے اپنے ہی امام کی تقلید موجود ہے تو ایسی محدودے چند جزیات میں دوسرے امام کی تقلید کرنے میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ایک حنفی تمام مسائل فقہیہ میں حنفی رہتے ہوئے مفقود کے مسئلہ میں مالکیہ کے مذہب پر عمل کرنے لگے اور حنفیہ کا مسلک اس بارے میں ترک کر دے تو اس میں وہ تناقض یا جمع بین الضدین کب لازم آیا جس سے بچنے کے لئے دو تقلیدیں

غیر معقول سمجھی گئی تھیں لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو وہ ناقص اب بھی موجود ہے اس خاص جزئیہ میں نہیں تو اس کے مبادی اور متعلقات میں موجود ہے وجہ یہ ہے کہ ہر ایک امام جب کسی مسئلہ میں کوئی اجتہادی رائے قائم کرتا ہے تو اس کے سامنے اس باب کے تمام مسائل کا ایک سلسلہ متحضر ہوتا ہے اور وہ اپنے مخصوص ذوق اور اصول سے ان تمام مسائل باب میں ایک خاص تناسب محسوس کرتے ہوئے اور اپنے ذوق اجتہاد سے اسی تناسب کو قائم رکھ کر اس باب کے تمام مسائل کی کڑیاں جوڑتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے امام کی ذوقی نظر میں بھی مذکورہ تناسب کا مذہبی رنگ قائم ہو بلکہ وہ تناسب و توازن کا کوئی اور رنگ لئے ہوئے ہو جو اس رنگ سے بالکل جدا گانہ ہو اس لئے اگر ایک امام کا مقلد کسی ایک مسئلہ میں بھی دوسرے امام کی تقلید کرے گا تو اس خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے ہمرنگ اور مبادی دوسرے مسائل میں تناقض رونما ہوگا اور اس نئے مقلد کے سران متعلقات مسائل کی تقلید بھی لازم آجائے گی جن میں تقلید کا اس نے ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ مفقود کے مسئلہ میں یہی صورت ہے کہ مالکیہ کے یہاں چار سال میں تفریق اس پر دائر ہے کہ ان کے یہاں اکثر مدت حمل چار سال ہے اس لئے چار سال تک براءۃ رحم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نیز چار سال کے بعد اعسار بھی موجب تفریق ہو جاتا ہے لیکن فقہ حنفی میں اکثر مدت حمل دو سال سے زائد نہیں اور اعسار موجب تفریق نہیں پس مفقود کے اعتبار سے چار سال پر تفریق کا فتویٰ دیا جانا گویا مدت حمل بھی چار سال مان لینا اور اعسار پر تفریق کا ترتیب کر لینا ہے حالانکہ یہ حنفی بحیثیت حنفی ہونے کے اکثر مدت حمل دو سال مانے ہوئے ہے جس سے ابھی تک منکر نہیں اور اعسار کو موجب تفریق ہی نہیں کہتا۔

پس وہ مسئلہ مفقود کے معانی میں حنفی بھی ہے اور مالکی بھی ہے۔ دو سال کا بھی قائل ہے اور چار سال کا بھی، تفریق اعسار کا بھی قائل ہے اور عدم تفریق کا بھی قائل ہے اگر نفس مسئلہ مفقود کے فتویٰ میں وہ گرفتار تناقض نہ ہوا تو اس کے مبادی اور متعلقات میں ہو گیا جس کے رفع ہونے کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ہر مسئلہ میں حنفی رہے یا ہر مسئلہ میں مالکی بن جائے۔

3..... تیسری صورت یہ ہے کہ نہ ایک مسئلہ کی دو جائین میں دائر رہے نہ ایک مسئلہ کے دو اجتہادی پہلوؤں میں دو وقتوں میں دائر رہا جائے بلکہ دو باب کے الگ الگ مسائل میں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو دو امامین کی تقلید کی جائے مثلاً فروع صلوٰۃ میں ایک امام کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور فروع حج میں مثلاً دوسرے کے اجتہاد پر تو اس میں بظاہر تناقض کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور تقلید شخصی کی مصیبت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں گویا قیاتی تعارض نہیں مگر اصولی اور کلیاتی تعارض سے یہاں بھی مفر نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر امام کے اصول استنباط الگ الگ ہیں جو اس کے فطری مزاج اور افتاد طبع سے سرزد ہوئے ہیں۔ اس لئے وہی رنگ اس کے پورے فقہ میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شرائع میں انبیاء علیہم السلام کا رنگ سایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شریعت جبکہ نبی کے دل و دماغ سے ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے تو نبی کا فطری رنگ شریعت

میں جھلکنا نگزین ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان جلالی تھی تو شریعت کے احکام میں بھی تشدد اور شدت غالب ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شان جمالی اور رافت و رحمت کی تھی تو ان کی شریعت میں بھی لین (نرمی) کا غلبہ ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان جامع شہون تھی جن کا غالب رنگ عدل و اعتدال اور رحمت و یسرها تو شریعت محمدی کے ہر مسئلہ میں یہ جامعیت اور مظاہرہ عدل و رحمت بھی نمایاں ہے۔ غرض مذہب کے اصول و فروع میں صاحب مذہب کی فطری ذہنیت کا الگ رنگ اس لئے جھلکنا ضروری ہے کہ یہ تمام الہامی اصول و فروع اسی کی ذہنیت کے راستے سے گزر کر آتے ہیں۔ اس لئے باوجود دین انبیاء کے واحد ہونے کے ہر نبی کی شریعت کا ایک ممتاز رنگ ہے اور اس کے کمالات و کرامات کا ایک خاص لون ہے جو دوسروں میں نہیں۔ اور اس رنگ کے ماتحت اس کے تربیت یافتوں میں بھی وہی رنگ سرایت کرتا ہے جو مقتداء اعظم کا ہوتا ہے چنانچہ مختلف اہم کی شہون اور آثار و خواص بالکل ممتاز اور باہم متخالف بھی ہیں اور اپنے اپنے نبی کی شہون کا مظہر اتم بھی ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے ایک دریا باوجود ایک ہونے کے جس جس خطہ زمین سے گزرتا ہے اس کی خصوصیات اور وہاں کی ہواؤں کے مخصوص اثرات لیتا جاتا ہے اور اس کے سیراب ہونے والوں کے مزاج میں بھی وہی کیفیت سرایت کرتی ہے۔

پس شرائع تکلیفیہ کی طرح یہ شرائع وضعیہ (اجتہادی مسالک) بھی باوجود متحد الاصول ہونے کے جس امام کے دل و دماغ سے گزر کر وجود کا جامہ پہنتی ہیں اس کا ذوقی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں اور اسی کے ذوق سے نکلے ہوئے اصول استنباط سے مستنبط ہوتی ہیں۔ پس اس مجتہد کا پورا فقہ اور فقہ کے سارے ابواب اسی ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو انجام کار ان عملی جزئیات کے واسطے سے اس فقہ کے ہر قبیح میں سرایت کرتا ہے۔ گویا اس فقہ کے تربیت یافتوں کی ذہنیت بھی اسی رنگ کی ہو جاتی ہے جو اصلی مربی اور بانی فقہ کی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا۔ کسی میں شدت ہے اور کسی میں لین۔ کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا۔ کسی میں دیانات کا دوفر ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست و نظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے۔ کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے۔ اور کسی میں باطنیت کا۔ کسی میں تاسی یا اسوۃ السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات کے تتبع و استقراء کا۔ ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجح ظواہر روایت ہوں گے اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح بواطن روایت یعنی درایت ہوگی، جہاں تاسی کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح تعامل سلف ہوگا اور جہاں شرعی جمہوریت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح سلف کی اکثریت ہوگی۔ بہر حال جس امام کی جو بھی ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا خاص رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عمل ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلد بظاہر تو جزئیات فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا

ہے جن سے وہ فقہ بنتا ہے اور اسے راہ عمل پر ہقیقہ وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیات فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔ پس اگر وہ فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کر دے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہوا مگر درحقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں اور ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً تناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہوا اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اگر فی الحال تناقض مضربہ اور وہ جزئیات کو ناقابل عمل بنا سکتا ہے تو وہی تناقض کلیات کو ناقابل نظر کیوں نہیں بنادے گا؟ اور جبکہ عمل نظر کے تابع ہے تو بالواسطہ اس کے عمل میں مفساد پیدا ہوں گے جو بعد چند عطا ہونے لگیں گے۔

ائمہ کے اختلاف مزاج سے پیدا شدہ مختلف اصول..... ائمہ کے اس اختلاف مزاج کو اشلہ سے واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس پر غور کیجئے کہ مثلاً تعارض روایات کے وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ قوت سند ہے وہ روایات متعارضہ میں عموماً قوت سند کے معیار سے ترجیح دیتے ہیں۔ پس جس حدیث کی سند اصول روایت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوگی وہ اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دے کر دوسری ضعیف السند روایات کو جو اس کے خلاف ہیں یا ترک کر دیں گے یا مرجوح قرار دیں گے یا اس کی کوئی توجیہ کریں گے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دارالبحرۃ کا ایسی صورت میں سب سے بڑا اصول تاہی باسوة السلف ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان دو متخالف روایات میں اہل مدینہ کا تعامل کس طرف ہے۔ یہ تعامل جس روایت کے ساتھ ہوگا وہ اختلافی مسائل میں اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دیں گے اور بقیہ روایات کو ترک کر دیں گے ان کی کوئی توجیہ کریں گے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اصولی معیار ایسے اختلافی مواقع پر رجحانات سلف کا تتبع ہے کہ کثرت سے فتاویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین رحمۃ اللہ علیہ کس طرف ہیں۔ جدھر بھی یہ صورت ہوگی وہ اسی روایت کو مذہب کی اصل قرار دے کر بقیہ روایات کا اسی سے فیصلہ کر دیتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ اصول ایک خاص جامعیت کے ساتھ تطبیق و توفیق بین الروایات ہے۔ یعنی وہ ایک باب کی تمام متعارض روایات کو جو قابل احتجاج ہوں بیک دم سامنے لا کر ان کے مجموعہ سے شارع علیہ السلام کی غرض و غایت کا پتہ چلاتے ہیں اور نور اجتہاد سے یہ دیکھتے ہیں کہ آخر اس مسئلہ سے شارع علیہ السلام کا منشاء کیا ہے۔ یہ منشاء جس روایت میں زیادہ واضح ہوتا ہے اس کو مذہب کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ سنداً کچھ ضعیف ہی ہوا اور بقیہ روایات کو اس طرح اس کی غرض و غایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ساری روایات اپنے اپنے محل پر چسپاں نظر آنے لگتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ تمام روایات میں مسئلہ ایک ہی

ہے مگر کسی روایت میں اس کا حکم ہے کسی میں اس کی حکمت ہے اور کسی میں اس کی کیفیت ہے اور کسی میں اس کی کمیت ہے، کسی میں اس کی اصلیت ہے اور کلیت ہے اور کسی میں اس کے احوال و عوارض ہیں۔ غرض شائع کے سلسلہ سے ترتیب وار جوڑ کر انہیں جمع کر دینا امام رحمۃ اللہ علیہ کا اصل اصول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کلام پیغمبر کا ہر گوشہ تاجدا مکان زیر اعمال آجائے زیر اہمال نہ رہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ کی چند امثلہ..... مثلاً صوم سفر کے سلسلہ میں مختلف احادیث وارد ہوئیں کسی حدیث میں نمایاں ہے کہ سفر میں صوم افضل ہے افطار سے۔ چنانچہ حمزہؓ ابن عمروؓ سلمیٰ کی روایت ہے کہ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ هِيَ رُخْصَةٌ مِنَ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَنْ أَخَذَ بِهَا فَحَسَنَ وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصُومَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ ① ”افطار کرنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے گا تو یہ خوبی کی بات ہوگی اور جو روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔“

اس حدیث میں افطار کو رخصت فرما کر اس کو حسن فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ عزیمت روزہ ہی رکھنا ہے مگر جائز افطار بھی ہے۔ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے صوم سے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ کسی غزوہ میں بزمانہ رمضان ہم سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جہوم دیکھا کہ ایک شخص پر سایہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ ایک روزہ دار کی حالت گرمی سے بہت بگڑ رہی ہے۔ فرمایا لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ ② ”سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں۔“

دوسری حدیث میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ کچھ لوگ روزہ دار تھے، کچھ بے روزہ، منزل پر پہنچ کر روزہ دار تو بے دم ہو کر گر پڑے اور بے روزہ لوگوں نے، کام کئے، خیمے گاڑے، جانوروں کو پانی پلایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ذَهَبَ الْمُفْطِرُونَ بِالْأَجْرِ ③ ”بے روزہ لوگ اجر سمیٹ لے گئے۔“

اور بعض روایات میں صوم اور افطار میں تخییر معلوم ہوتی ہے کہ خواہ روزہ رکھ لو خواہ افطار کر لو، دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ ان ہی حضرت حمزہؓ ابن عمروؓ سلمیٰ کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ إِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَإِنْ شِئْتَ فَافْطِرْ ④ ”بحالت سفر جی چاہے روزہ رکھ لو اور جی چاہے افطار کر لو۔“

① الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب التخيير في الصوم ج: ٥، ص: ٣٥١.

② الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لمن ظلل عليه ج: ٤، ص: ٢٩.

③ الصحيح للبخاري، كتاب الجهاد والسير، باب فضل الخدمة في الغزو، ج: ١٠، ص: ١٥.

④ الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب الصوم في السفر والافطار، ج: ٤، ص: ٣٣.

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وازامی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث انسؓ کو اختیار کر کے کہا کہ: سفر میں افطار افضل ہے تو انہوں نے افضل صوم اور تخیر کی نفی کر دی۔ بعض فضیلت صوم کے قائل ہوئے تو انہوں نے فضیلت افطار اور فضیلت صوم دونوں کی نفی کر دی اور معیار انتخاب روایات ان حضرات کے یہاں وہی حدیث کی سند کی قوت وضعف یا تعامل کی مطابقت وغیرہ ہے۔ لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تطبیق و توفیق روایات کے ماتحت تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما کر سب کو قابل عمل بنا دیا اور کسی ایک جہت کی نفی نہیں کی۔ انہوں نے نور اجتہاد اور ذوق تشریع سے دیکھا کہ ان مختلف روایات سے شارع علیہ السلام کی غرض مختلف احوال میں مختلف احکام دینا ہے نہ کہ ایک حکم سے دوسرے کی نفی کرنی ہے۔ پس حدیث تخیر کو تو مساوات فی الجواز پر محمول فرمایا کہ اس سے شارع کی غرض صوم و افطار دونوں کو بلا کر کراہیت جائز بتلانا ہے کہ نفس جواز صوم و جواز افطار میں کوئی تفاوت نہیں اور فضیلت صوم کی روایت کو اصل پر محمول فرمایا کہ بالذات صوم ہی افضل ہے کیونکہ رمضان زمانہ ہی صوم کا ہے اس میں افطار کسی طرح اصل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اصلی فضیلت صوم ہی کو حاصل رہے گی جس کو اس روایت سے ظاہر فرمانا مقصود ہے اور فضیلت افطار کی روایت کو عوارض پر محمول فرمایا کہ جب حالت پریشان کن ہو جائے اور روزہ رکھنے میں تعب حد اعتدال سے گزرنے کا خطرہ ہو تو پھر عارضی فضیلت افطار ہی میں ہے۔ پس تخیر ہوئی جواز میں۔ فضیلت صوم ہوئی اصلیت صوم اور وقت میں اور فضیلت افطار ہوئی احوال صائم میں اور ظاہر ہے کہ جب مسافر پر یہی تین احوال آسکتے تھے تو شارع نے تینوں حالات کا حکم بیان فرما دیا پس ان تین حالات کی تفسیر نے ساری روایات کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کے تعارض کو اٹھا دیا۔ تخیر بھی باقی رہی۔ فضیلت صوم بھی قائم رہی اور فضیلت افطار بھی ثابت رہی کسی ایک حکم سے دوسرے حکم کی نفی نہ ہوئی۔

پس امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس علم دقیق سے ساری احادیث کو جمع کر کے قابل عمل بنا دیا نہ ان میں اور نہ کسی حدیث میں دور از کار تاویل و توجیہ کی ضرورت پیش آئی۔ یا مثلاً شک کے بارہ میں تین قسم کی احادیث وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ جب شک ہو جائے کہ کتنی رکعات پڑھی ہیں تو نماز کا اعادہ کرنا چاہیے ”إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَأْنِفْ“ جب کسی کو نماز کی رکعات میں شک پڑ جائے تو نماز لوٹا لے۔

دوسری یہ کہ بصورت شک نماز ہی میں تحریکی کرنی چاہیے یعنی اٹکل لگا کر غور کرنا چاہیے کہ کتنی رکعات ہوئیں۔ جدر غلبہ ظن ہو، اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے۔ ”إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَواتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيَتِمَّ عَلَيْهِ“ جب کسی کو تم میں سے نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے تو اٹکل لگانی چاہیے۔ اور اسی پر (جو اٹکل میں غلبہ ظن سے دل میں آجائے) نماز پوری کر لینی چاہیے۔

تیسری روایت میں ہے کہ جب شک ہو جائے اور اٹکل سے غلبہ ظن بھی کسی جانب سے حاصل نہ ہو کہ تین رکعت ہوئی ہیں یا چار تو جانب اقل کو اختیار کر کے اس پر نماز کی بناء کرو۔ تین اور چار میں اقل عدد تین کا ہونا

بہر صورت یقینی ہوگا۔ اس لئے یقینی جہت لے لو۔ چنانچہ عطاء بن یسار کی حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ”اِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَواتِهِ فَلَمْ يَذَرِكُمْ صَلَّيْ؟ ثَلَاثًا أَوْ أَرْبَعًا فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ وَلْيُتِمِّنْ عَلَى مَا اسْتَيْقَنَ۔“ ”جب تم میں سے کسی کو نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار، تو شک کو چھوڑ کر جو جانب یقینی ہے (یعنی اقل) اسی پر بنا کر نی چاہیے۔“

ان تینوں احکام میں سے ایک ایک کو ایک ایک مجتہد نے اختیار کر لیا ہے بعض نے شک کی صورت میں اعادہ صلوٰۃ کا حکم اختیار کر لیا ہے تو انہیں قدرتی طور پر تحری (عمل بغلبہ ظن) اور بناء علی الاقل کی نفی کر دینی پڑی ہے۔ جمہور نے تحری اور غلبہ ظن کا اعتبار کیا ہے تو انہیں استیناف اور بناء اقل کا حکم ترک کر دینا پڑا ہے لیکن جب کہ یہ تینوں صورت حدیث میں آچکی ہیں تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جمع بین الروایات کے اصول کے تحت تینوں احکام کو بیک دم اختیار کر کے تینوں قسم کی روایات کو جمع فرمادیا۔ اگر عمر میں پہلی بار شک پڑا تو اس کے لئے اعادہ صلوٰۃ کا حکم ہے کیونکہ بار بار کے شک اور اعادہ سے جب شک کا وقوع عادۃ ضروری ہے نماز و بال جان ہو جائے گی جو تیسرے دین کے خلاف ہے اور حرج شرعاً مدفوع ہے اگر ایک سے زائد بار شک پڑنے لگے تو تحری کا حکم ہے کہ غلبہ ظن پر عمل کیا جائے اور اگر غلبہ ظن کسی جانب نہ ہو بلکہ دونوں جانب میں شک مساوی رہے تو جانب اقل کو اختیار کیا جائے جو یقینی ہے۔ اس صورت میں اعادہ صلوٰۃ تحری اور بناء اقل تینوں حکم جمع ہو گئے اور روایات میں کسی کا رد اور کسی کا قبول لازم نہ آیا جس کی فقہی روح یہ ہے کہ شک ہو جانے پر اعادہ صلوٰۃ تحری اور اختیار اقل در حقیقت حصول یقین اور دفع شک کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی شک میں جو ایک مرض نا آشنا کی طرح نماز میں طاری ہوا حصول یقین اعادہ صلوٰۃ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ پچھلی مشکوک نماز ترک کر دی جائے۔ کیونکہ جس کے لئے شک کا مرض ہی نیا ہے وہ ابتداء ہی اس کے علاج پر غور کر سکتا ہے۔ ہاں بار بار کے شک میں جبکہ عادۃ اس کی حقیقت کھل گئی اور وہ عادت بھی بن گئی نماز میں رہتے ہوئے بھی اس کا علاج ممکن ہو گیا اور وہ تحری اور انکل سے غلبہ ظن معلوم کر لینا ہے جدھر بھی غلبہ ہو گیا خواہ تین رکعت کی طرف یا چار کی طرف۔ پس امام صاحب کے طریق کے مطابق حدیث کے یہ تینوں احکام ایک دوسرے کی نفی اور تردید کے لئے نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے مختلف احکام بن جاتے ہیں جن میں نہ تعارض ہے نہ تدافع اور تینوں احادیث اپنی اپنی جگہ چسپاں ہو کر قائل عمل ہو جاتی ہیں۔ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق اجتہادیات میں یہ ہے کہ تاجد امکان ہر حدیث زیر اعمال آئے۔ زیر اہمال نہ رہے۔ اس لئے وہ عامۃ متعارض روایات میں سند کی قوت و ضعف کے معیار سے ترجیح و انتخاب کی صورت اختیار نہیں فرماتے کہ اس میں کسی نہ کسی جہت سے ترک حدیث یا ترک عمل بالحدیث لازم آجانا یقینی ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ترک ہو۔ جس کی صورت انہوں نے یہی اختیار فرمائی کہ ایک باب کی تمام احادیث سے وہ پہلے شارع کی غرض و عایت کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر اسی بنیادی غرض

پر تمام احادیث کو دائر فرمادیتے ہیں۔ متعارض روایات میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تطبیق اور جمع بین الروایات اور دوسرے حضرات ائمہ کی ترجیح و تعلیل روایات کی اشد بکثرت ہیں جن سے فقہ حنفی بھری پڑی ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ دو مثالیں جو اس وقت سامنے آ گئیں عرض کی گئیں۔

اس طولانی بحث سے غرض یہ ظاہر کرنا ہے کہ اصول اجتہاد ائمہ کے فطری مزاج کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں جامعیت ہے تو اصول بھی جامعیت کے وضع ہوں گے۔ طبیعت میں ظاہریت ہے تو اصول میں بھی ظاہریت کا رنگ رہے گا اور طبیعت میں تاسی بالاسوہ کا مزاج ہے تو اصول میں بھی وہی رنگ نمایاں ہوگا اور ان ہی اصول پر مجتہد کا پورا فقرہ مرتب ہوتا ہے جس سے قبیحین فقہ اور مقلدین کی ذہنی اور عملی تربیت ہوتی ہے۔ پس اصول میں مخالف ہوگا تو مقلد کی ذہنیت پر عملی جزئیات کا اثر بھی متضاد ہی پڑے گا۔ گوا ابتدا سے اسے کوئی جزئیاتی مخالف اور تضاد محسوس نہ ہو کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ مرئوس میں سامان تربیت اثر انداز نہ ہو یا مثلاً متعارض روایات میں امام صاحب کا ایک خاص اصول یہ بھی ہے کہ وہ کسی باب کی ایسی حدیث کو جو کلیہ اور ضابطہ عامۃ کا رنگ لئے ہوئے ہو اصل قرار دے کر اس باب کے جزئی افعال کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں اور اس کلیہ کے خلاف پڑتے ہوں اس کلیہ کے تابع کرتے ہیں کلیہ کو افعال جزئیہ کے سبب توڑنا پسند نہیں کرتے کہ وہ معلوم السبب اور معلوم العلت ہے اور افعال جزئیہ واقعہ حال ہوتے ہیں جن میں کوئی عموم نہیں ہوتا کلیہ کو اصلیت پر باقی رکھ کر ان جزئی واقعات کی کوئی ایسی توجیہ فرمادیتے ہیں کہ وہ اس کلیہ کے مخالف نہ رہیں بخلاف دوسرے آئمہ کے کہ وہ ان جزئیات کی محض سندی قوت دیکھ کر ان سے کلیہ کی تخصیص کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً آداب خلاء کے سلسلہ میں حضرت ابویوب انصاریؓ کی حدیث میں ایک کلیہ ارشاد فرمایا گیا اِذَا اَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَذْبِرُوْهَا وَلٰكِنْ شَرِّفُوْا اَوْ غَرِّبُوْا۔^① ”جب تم استنجاء کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ رخ ہو کر بیٹھو اور نہ قبلہ پشت ہو کر لیکن شرقاً غرباً بیٹھو (تاکہ قبلہ بغل میں رہے)۔“

یہ ایک حکم عام ہے جس میں استقبال و استدبار کو کسی مکان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا کیونکہ یہ حکم عظمت بیت اللہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے تاکہ افعال حسیہ کے وقت قبلہ کا استقبال و استدبار نہ ہو کہ وہ صورت تو ہیں بیت اللہ ہے اور تعظیم بیت اللہ فی نفسہ حسن اور ہر زمان و مکان میں مطلوب ہے۔ چنانچہ حکم کی یہ علت ایک دوسری حدیث میں صراحتاً مذکور بھی ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اِذَا اَتَيْتُمْ الْبَرَازَ فَلْيُكْرِمْ قِبْلَةَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَلَا يَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ^② ”جب تم میں سے کوئی استنجاء کے لئے جائے تو چاہے کہ قبلہ الہی کا اکرام کرے اس کا استقبال نہ کرے یعنی قبلہ رخ ہو کر نہ بیٹھے“

① الصحيح للبخاری، کتاب الفلکوة، باب قبلۃ اهل المدينة و اهل الشام و المشرق ج: ۲ ص: ۱۵۳۔

② السنن الکبریٰ للبیہقی، کتابہم المہن، باب ماورد فی الاستنجاء بالتراب، ج: ۱، رقم: ۱۱۱۔

پس جبکہ اکرام بیت اللہ کی علت سے بحالت بول و برازا استقبال و استدبار قبلہ ممنوع تھا اور یہ علت فی نفسہ مطلوب ہونے کے سبب کسی قید سے متعین نہ تھی تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مذہب کی اساس اس کلیہ کو قرار دے کر مطلقاً استقبال و استدبار کی حرمت کا فتویٰ دے دیا خواہ مکان ہو خواہ جنگل ہو بحالت قضاء حاجت استقبال قبلہ اور استدبار دونوں غیر جائز ہیں جس کیلئے اس حدیث کو بطور ایک کلی ضابطہ اور دستور العمل کے پیش فرمایا۔ مگر اس کلیہ کے خلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ افعال ثابت ہوئے۔ چنانچہ حسب روایت بخاری رحمۃ اللہ علیہ و مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف پشت کئے ہوئے اور شام کی طرف رخ کئے ہوئے پیشاب کرتے خود دیکھا۔ امام صاحب نے اپنے ذوق خاص سے جن کا ذہن کلی الضابط اور تعلیمات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ اس جزئیہ سے متاثر ہوئے بغیر ضابطہ کلیہ کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور اس جزئی واقعہ کی ایسی توجیہات فرمادیں کہ وہ اس کلیہ کے خلاف نہ رہے کیونکہ کلیہ کا حکم جس علت پر دائر ہے یعنی تعظیم بیت اللہ وہ مکان اور صحراء ہر جگہ موجود ہے تو اس کو کسی ایسے جزئی واقعہ سے کیوں توڑا جائے جس کی نہ علت کا پتہ ہے نہ سبب کا۔ لیکن دوسرے ائمہ نے جن کا ذہن تخصیصات کی طرف زیادہ چلتا ہے اس کلیہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کلیہ کا ہم پایہ جزئیات کو بناتے ہوئے یا اس جزئی واقعہ سے کلیہ سابقہ کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا کہ استقبال و استدبار مکان میں جائز اور اور صحراء میں غیر جائز۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ استدبار ہر جگہ جائز اور استقبال ہر جگہ غیر جائز۔

بہر حال یہ اختلاف اسی اصول استنباط کے اختلاف کے تابع ہے کہ اور حضرات نے صرف حکم حدیث پر نظر فرمائی اور امام صاحب نے حکمت حدیث پر، اوروں نے ظہر حدیث لیا اور امام نے بطن حدیث کو آگے رکھا اور شارع علیہ السلام کا یہ فناء پا کر کہ اصل مقصود حرمت بیت ہے اسے ہی بنیاد قرار دے دیا اب جو روایت اس کے خلاف آئی اس کی وجہ سے بنیاد کو منہدم نہیں ہونے دیا بلکہ اسے ہی بنیاد سے جوڑ دیا۔ پس ایک مقلد جو اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرے گا وہ درحقیقت ان اصول کی تقلید کرے گا جو ان مسائل میں سمائے ہوئے ہیں اور جبکہ ان میں تخالف ہے تو ان کی جزئیات میں بھی ہے یا مثلاً کہیں کہیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک باب کے اصل موضوع کی روح پر مطلع ہوتے ہیں جو خصوص کتاب و سنت سے ان پر منکشف ہوتی ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر اس باب کی تمام روایات کے انتخاب کا معیار اسی روح کو قرار دیتے ہیں اور خلاف روایات کی ایسی توجیہ فرمادیتے ہیں کہ اس روح پر کوئی اثر نہ پڑے لیکن دوسرے ائمہ مثلاً اس باب کی روح دوسری سمجھتے ہیں تو احکام میں اختلاف اس روح کے تفاوت سے پڑ جاتا ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کے بارے میں جب فعلی اور ترکی احادیث آتی ہیں تو امام صاحب اکثر و بیشتر ترکی احادیث کو اختیار کرتے ہیں اور فعلی احادیث کو ان کے تابع کرتے ہیں جیسے قراۃ فاتحہ خلف الامام اور ترک قراۃ فاتحہ کی

روایات میں ترک قراۃ کو، رفع یدین اور ترک رفع یدین میں ترک رفع کو، جہر آمین اور ترک جہر میں ترک جہر کو جہر بسم اللہ اور ترک جہر میں ترک جہر کو، نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کے لئے جمع بین الاشارة والتسبیح کی بجائے ترک جمع کو اختیار فرمایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام کے نزدیک نماز میں فعل پر ترک کو یا حرکت پر سکون کو ترجیح ہے۔ شاید اس بناء پر کہ امام کے نزدیک نمازی کی بناء سکون پر ہے حرکت پر نہیں اور یہ لطیفہ امام پر آیات و روایات اور نماز کے انداز تشریع سے منکشف ہوا۔ مثلاً نماز کی اصلیت کے بارہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ ① ”نماز بھائی ہے مگر خشوع والوں پر“

اور خشوع کی حقیقت سکون ہے جو اولاً قلب میں آتا ہے اور پھر قالب پر، پھر اسی کے ساتھ امام نے نماز کی رفتار تشریع پر نظر فرمائی ہو کہ اس میں بھی حرکت سے سکون کی طرف آئے مثلاً پہلے نماز میں نقل و حرکت جائز تھی بعد میں نص حدیث سے منسوخ ہوئی اور سکون آ گیا، پہلے سلام کلام جائز تھا بعد میں نص حدیث اس سے روک کر سکوت کا حکم دیا گیا، پہلے التفات (ادھر ادھر دیکھنا) جائز تھا بعد میں منسوخ ہو کر اس بارہ میں سکوت پیدا کر دیا گیا، اولاً نشہ کی حرکات کے ساتھ نمازیں جائز تھیں بعد میں انہیں منسوخ کر کے نماز میں سکون پیدا کر دیا گیا۔

بہر حال رفتار تشریع حرکت سے سکون کی طرف آنا تھا تو امام کے اس قلب صافی نے جو ایک اساسی رنگ تشریع سے مصبغ (رنگ ہوا) اور افتاد شریعت کا محرم راز تھا یہ اخذ کیا کہ نماز میں اصل چیز سکون ہے۔ لہذا جتنا سکون ترقی کرتا جائے گا نماز کی حقیقت سے انقاع زیادہ ہوتا جائے گا۔ شارع کی اس غرض کو پیش نظر رکھ کر امام کے نزدیک جب امام کے فعلی اور ترکی امور میں اختلاف و تراجم واقع ہوا تو انہوں نے اسی رفتار اور لون اجتہاد کے ماتحت جانب سکون کو ترجیح دی اور تمام وہ روایات اختیار کر لیں جو اس رنگ پر مشتمل تھیں کہ ان کے نزدیک یہی روایات غرض شارع سے زیادہ موافق تھیں۔ خواہ سند اوہ کسی درجہ کی ہوں، مگر قابل احتجاج ہوں۔ لیکن اس کے برخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فعلی اور ترکی روایات میں سے عموماً فعلی روایات کو ترجیح دی ہے۔ قراۃ فاتحہ کو اختیار کیا، رفع یدین کو ترجیح دی، جہر آمین کو منتخب فرمایا، جہر بسم اللہ کو اولیٰ کہا وغیرہ وغیرہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی ہیئت کذائی پر غور کر کے اسے فعل سمجھا ہے اور جب وہ از قسم فعل ہے تو اس میں افعال جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کا حسن بڑھتا جائے گا۔

حج میں اس کے برعکس قصہ ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ حج کی عبادت ہی حرکت ہے گھر سے نکلنا، بیت اللہ کے گرد گھومنا، صفا مروہ میں دوڑنا، عرفات کا سفر اختیار کرنا، منیٰ میں رمی جمار کرنا وغیرہ۔ غرض پوری عبادت ایک مستقل سفر اور متعدد انواع حرکات کا مجموعہ ہے۔ پس جتنے بھی افعال اور حرکات زائد ہوں گے، حج میں حسن پیدا ہوگا۔ اس لئے اس عبادت میں ان روایات کو ترجیح دی ہے جو کسی حرکت اور فعل پر مشتمل ہیں

بخلاف امام شافعی رحمہ اللہ، کہ انہوں نے حج میں اس کے برعکس جانب سکون اور تقلیل حرکت کی جہت کو اختیار فرمایا ہے شاید اس لئے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حج مظاہرہ محبت ہے اور محبت کا ثمر ربودگی اور ترک ہے۔ ترک وطن، ترک لباس، ترک زینت، ترک خوشبو، ترک راحت، ترک لذت وغیرہ اس لئے اس عبادت میں جتنے تروک بڑھتے جائیں گے۔ اس کی حقیقت تام ہوتی جائے گی مثلاً قارن کے حق میں امام صاحب کے یہاں دو طواف اور سعی ہے اور شوافع کے یہاں ایک طواف اور سعی ہے وہ تکثیر فعل کی طرف گئے اور یہ تقلیل فعل کی طرف۔ اس قسم کی صداہا مسئلہ کتب فقہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ بہر حال حال حجت احوال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غائر نظر ہمیشہ اصول اور تہ کی طرف دوڑتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کی لم اور اس کی اندرونی بنیاد تک پہنچ کر غرض شارع کا پتہ چلاتے ہیں۔ اسی باطنی غرض اور حکمت کے معیار سے روایات کے احکام کے درجات قائم کرتے ہیں اور ان میں تطبیق و توفیق دیتے چلے جاتے ہیں اسی لئے ان کے فقہ میں کلیات، تعمیمات اور ہمہ گیری بہت زیادہ ہے، دوسرے حضرات حکم دیکھتے ہیں اور اسی کو اصل قرار دے کر روایات پر نظر کرتے ہیں تو احکام میں تعداد اور تکثیر زیادہ ہوتی ہے مگر انضباط تسلسل اور ترتیب اس طرح کی نہیں آتی کہ ہر ہر جز یہ کسی نہ کسی اصل سے جڑا ہوا نظر آئے اور ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے مربوط دکھائی دے۔

ظاہر ہے کہ تسلسل اور ترتیب میں انضباط ہوتا ہے اور دوسری صورت میں تکثیر احکام، اسی لئے فقہ حنفی میں ترتیب و تسلسل اور جامعیت و اجتماعیت کا رنگ غالب ہے اور دوسری فقہیات میں تکثیر احکام اور تکثیر جزئیات کا رنگ غالب ہے اور کلیاتی دائرہ محدود ہے، ظاہر ہے کہ جب یہ مخصوص رنگ کے اصول اپنے اپنے فقہ کے تمام ابواب اور ساری ہی اجتہادی فروغ میں رچے ہوئے ہوں گے گویا ایک فقہ کے سارے مسائل کی تشکیل یہ ایک ہی رنگ کے اصول کریں گے تو اس پوری فقہ کا ایک مزاج قائم ہو جائے گا جو اپنے امام کے ذہنی مزاج کے مطابق ہوگا۔ پھر وہی ذہنی مزاج ان کا بھی بنے گا۔ جو اس فقہ کی تقلید کریں گے، کیونکہ مربوط کی ذہنیت ربی ہی کی ذہنیت سے بنتی ہے۔ اس صورت میں دو فقہوں کی جزئیات خواہ کتنی ہی غیر متباہین ہوں اور بظاہر سطح تقاض سے کتنی ہی بعید ہوں، مگر یہ ذوقی الوان اور اصول استنباط کا تقاض ان میں رچ کر انہیں اصولی طور پر متضاد بنادے گا اور یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تقلید حقیقہ جزئیات کے پردہ میں ان اصول کی ہوتی ہے جو ان جزئیات کو پردہ ظہور پر لاتے ہیں اور وہ متعارض ہیں تو وہی تضاد پھر باقی رہا، جزئیاتی نہ سہی کلیاتی سہی اور جبکہ یہ اصول و کلیات ہی اصل میں محل تقلید ہیں تو خاص کی نظر میں یہ تضاد اس سے اشد ہوگا جو جزئیاتی تھا کہ جزئیات تقلید کے بارہ میں اصل ہی نہ تھیں۔ یہ اصول ہی اصل تھے اور اصل کا فساد فرع کے فساد سے عقلاً و شرعاً مہلک تر ہوتا ہے۔

پس ایسے اصولی اختلاف کے ہوتے ہوئے دو فقہین کی بیک دم تقلید کیا جانا اور بالفاظ دیگر ایک فقہ کی تربیت کے ہوتے ہوئے دوسرے فقہ کی تربیت کا رنگ اس پر چڑھایا جانا علاوہ تربیت کی دو عملی اور تضاد حالی کے ہر ربی

امام کی تربیت کو ناقص اور نکمہ بنالینا ہے۔

مثلاً اگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان ہی اصول استخراج پر نماز کے ذریعہ سکون اور حج کے ذریعہ حرکت کا ذوق حامل فقہ میں راسخ کرنا چاہتے ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے برعکس اور اس ہر جائی مقلد نے نماز حنفی اصول پر پڑھ کر حج شوافع کے طریق پر کر لیا تو ذوق حرکت اسے کسی طرف سے بھی نڈل سکے گا کیونکہ اس کی نماز تو ساکن رہی حنفی اصول پر اور حج ساکن رہا شافعی اصول پر۔ حالانکہ جو امام اپنے ذوق اجتہاد سے اس میں نماز کا سکون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اسی ذوق سے اس میں حج کی حرکت بھی راسخ کرنا چاہتا تھا کہ اس مجموعہ ہی سے اس کے نزدیک مقلد کی ذہنیت میں صحیح توازن پیدا ہو سکتا تھا اور اسی میں اس کی روحانی فلاح تھی لیکن جبکہ اس مقلد نے آدمی تربیت ایک سے کرائی اور آدمی ایک سے اور وہ بھی دونوں جانبین کے سکون عبادت ہی کی جہت لے لی تو اول تو کسی امام کے رنگ پر بھی اس کی تربیت مکمل نہ ہوئی اور حنفی ناقص بھی ہوئی وہ بھی دورخی مقام کی طرح ایک ہی جانب پر مشتمل رہی گویا یہ مقلد ناقص بھی رہا اور ایک جہت سمجھنے سے بھی خالی رہا اور اوپر سے کلیاتی تضاد حال کا شکار بھی ہو گیا، جو اس کے فساد مزاج کا پورا پورا سامان ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مریض، یونانی طبیب کا علاج کراتے ہوئے بعض ڈاکٹری ادویہ بھی استعمال کرنے لگے ظاہر ہے کہ ادویہ میں کوئی تعارض نہیں لیکن ادویہ کے مخفی سلسلہ میں جس کو روش علاج اور طریق تدبیر کہنا چاہئے اصولی تعارض ضرور موجود ہے جو مریض کے مزاج کو فاسد کر دینے کے لئے کافی ہے کیونکہ ڈاکٹر اپنے اصول اور روش علاج کے ماتحت مثلاً مریض کو دودھ کی تاکید کرے گا اور طبیب اپنی روش فن کے لحاظ سے اس سے روکے گا، ڈاکٹر مثلاً پھلوں کا استعمال ضروری قرار دے گا طبیب اس سے مانع آئے گا ڈاکٹر ایک غذا تجویز کرے گا، طبیب اس کے خلاف دوسری، غرض ایک جزوی دوا کے استعمال میں تو بظاہر کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا تھا مگر یہ دوا جس مجموعی روش اور جس ڈاکٹری اصول کے نیچے آئی ہوئی ہے وہ یقیناً اس روش و اصول کے معارض ہے جو طب یونانی کی ادویہ کی پشت پر ہیں اس ایک جزوی دوا کے راستہ سے یہ اصولی تعارض مریض پر متضاد آثار ڈالے گا اور مریض اس حالت میں زیادہ دن اپنی خیر نہیں مناسکے گا، مگر اس مخفی مضرت کو عوام نہیں صرف اطباء ہی پہچان سکتے ہیں جن کے قول پر اعتماد کرنے کے سوا مضرت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

عدم تقلید یا تقیضین میں دائر سائر رہنے کے چند واضح مفاسد..... ساتھ ہی اس پر غور کیجئے کہ اس ہر جائی پن اور تقیضین میں دائر رہنے کی عادت کا طبعی اثر ایک دوسری نوعیت مفاسد کی یہ ہوگی یہ شخص کئی کئی ائمہ اور مفتیین کی طرف رجوع کرتے رہنے کی حالت میں اپنے نفس کے لئے سہولیات تلاش کرنے کا عادی ہو جائے گا جدھر سہولت دیکھی ادھر ہی سے فتویٰ لے لیا اور ادھر کا مقلد بن گیا، اس صورت میں گویا یہ تقلید غیر معین غلبہ ہوا وہوس کے ماتحت اس کی مطلب برآری کا ایک آلہ اور حیلہ ہوگی اور ان کئی ائمہ کے پردہ میں درحقیقت مقلد اپنے نفس کا ہوگا، جس کے سامنے طاعت حق نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اپنی راحت و سہولت و نفسانی شہوت ہوگی مثلاً ایک شخص نے وضو کیا اور پھر خون

نکلوایا جس پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضو ٹوٹ گیا تو اس نے کہا کہ: میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کے بعد عورت کو شہوت سے ہاتھ لگایا جس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے تو اس نے کہا کہ: میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور بلا تجدید وضو نماز پڑھ لی چونکہ اس شخص کا وضو بالا جماع ٹوٹ چکا ہے گو سب مختلف ہوئے اس لئے اس کی نماز سب کے نزدیک باطل ہوئی مگر یہ اپنے نزدیک پھر بھی اپنے کو متوضیٰ اور مصلیٰ سمجھ رہا ہے جس سے علاوہ خرق اجماع کے مفسدہ کے اس شخص کی ساری تحقیق اور تقلید کا حاصل حفظ نفس اور مطلب برآری کے سوا کچھ نہ نکلا گیا اس کا دین اس کے ہوا کے تابع ہو گیا نہ کہ ہوا نفس دین کے تابع ہوئی حالانکہ صریح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: عَنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدٌ كُمْ حَتَّى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جَنَّهُ بِهِ. ① ”عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔“ پھر فروع میں اس قسم کی آزادی کا خوگر ہو جانے سے اصول میں ایسی آزادی کا آجانا غیر مستبعد نہیں رہتا بلکہ عادۃً ایسا ہوتا ہے حالانکہ نص حدیث شہادت میں پڑنے والا بالآخر حرام میں پڑ کر رہتا ہے۔

بہر حال ایسا مقلد عام جو بلا تعین مختلف ائمہ کی تقلید کا خوگر ہے وہ یقیناً نقیضین میں دائر سا زور ہے گا خواہ وہ تناقض جزئیاتی ہو یا کلیاتی۔ ساتھ ہی ان متخالف اجتہادات کے آثار سے اس کا روحانی مزاج بھی فاسد ہوئے بغیر نہ رہے گا یا ہوا نفس اس کے دین پر غالب آجائے گی یا وہ رضاعت کا طالب نہ رہے گا یا اجماع امت کا رقبہ گلے سے نکال پھینکے گا اور نتیجہ فروعات کی آزادی اصول تک پہنچ جائے گی اور اصول کو بھی حفظ نفس اور مطلب برآری ہی کا ذریعہ بنا کر بالا خر سرے سے دین کو کھو بیٹھے گا یہی وجہ ہے کہ روحانی تربیت اور نفسانی معالجہ کے سلسلے میں جس کے اطباء حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں ایک نبی کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے دوسری شریعت اور نبی کو حق جاننے کے باوجود اس پر عمل کرنے کی خاص طور سے ممانعت فرمائی گئی ہے ادب تو اتنا کہ ایک نبی اور اس کی شریعت کے انکار پر پورا دین ضبط لیکن احتیاط اس پر یہ کہ اس سچے نبی کے ایک جزئیہ پر بھی بلا اجازت نبی زمان عمل غیر جائز اور ممنوع جس کا راز یہی ہے کہ ہر شریعت کی تربیت کا رنگ جدا جدا ہے۔ نفس میں ان کے متضاد آثار پیوست ہونے سے اس نفس کی ہلاکت ہے نہ کہ تقویت، چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہود کی بعض باتیں ہمیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں اگر اجازت ہو تو لکھ لیا کریں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَمْتَهُوَ كُونْ اَنْتُمْ كَمَا تَهْوَوْنَ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى قَدْ جَنَّتْكُمْ بِهَا

① مشکاۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام، ج: ۱، ص: ۳۶، رقم: ۱۶۷۷۔ علامہ ترمذی فرماتے ہیں: رواہ فی شرح السنۃ

وقال النووی فی اربعینہ: هذا حدیث صحیح روایہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح

بَيِّضَاءَ نَفِيَّةً وَلَوْ كَانَ مُوسَى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي. ① ”کیا تم اپنے احکام دین کے بارہ میں ابھی تک حیرت میں پڑے ہوئے ہو کہ دوسروں کی باتیں لکھنا چاہتے ہو؟ بلاشبہ میں تمہارے پاس ایک صاف اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ بھی آج زندہ ہوتے تو انہیں میرے اتباع کے سوا چارہ کار نہ تھا تو پھر تمہیں ان کا اور ان کی شریعت کا اتباع کب جائز ہے؟“

اس اصول پر مریبان باطن، حضرات صوفیا کرام قدس اللہ اسرارہم نے اپنے طریق تربیت کی بنیاد بھی توحید مطلب پر رکھی جس کا حاصل یہی ہے کہ ایک شیخ سے وابستہ ہو کر دوسرے کی طرف عملی رجوع کرنا باعث تباہی نفس ہے۔ ادب و تعظیم بالاستثناء سب کا ضروری ہے لیکن اتباع صرف ایک کی کہ ہر مربی باطن کا رنگ ذات ہی الگ ہے۔ اس سے پیدا شدہ اصولی تربیت کا رنگ بھی جدا جدا ہے اور اسی رنگ کے مطابق پروردوں کے نفوس پر احوال و کیفیات بھی اسی رنگ کے طاری ہونے ضروری ہیں۔ پس اگر توحید مطلب باقی نہ رہے بلکہ طالب و سالک اپنے تلون کے تحت مختلف مشائخ میں دائر سائر پھرتا رہے تو اس میں یکسوئی، ایک رنگی اور دل جمعی کی دولت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو تمام کمالات باطن کی اساس ہے اور اس لئے اسے تمام عمر کبھی بٹاشت و تمکین میسر اس آ سکتی جس کے لئے ساری ریاضات کی جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ طریق نبوت ہو یا طریق ولایت دونوں میں توحید مطلب کے بغیر تربیت کا کام نہیں چل سکتا، پھر اسی طریق کی روشنی میں اطباء جسمانی کو بھی توحید مطلب بنام توحید مطلب اختیار کرنی پڑی کہ اس کے بغیر مریض کی صحت ہی متوقع نہیں ہو سکتی۔

پس جو انتظام انبیاء علیہم السلام نے اپنی شان تربیت کو موثر بنانے کے لئے کیا، اولیاء نے اپنی شان معالجہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔ اطباء نے اپنے طریق علاج کو نتیجہ خیز کرنے کے لئے کیا جس کا نام توحید مطلب یا توحید مطلب ہے وہی انتظام بعینہ فقہاء ملت نے اپنی شرعی راہنمائی اور دینی تربیت کو پر اثر اور مشہور بنانے کے لئے فرمایا اور اپنی فقہی توحید مطلب کا نام تقلید شخصی یا تقلید معین رکھ کر یہ شرعی مطلب کھول دیا تا کہ ایک ہی فقہ کو اپنا دستور زندگی ٹھہرا کر اور کئی کئی فقہیات اور فقہاء کے مخالف آثار تربیت کا شکار نہ بن کر اپنے دین پر یکسوئی اور طمانینت سے عمل پیرا رہے کہ اس کے بغیر تشویش و پراگندگی اور مذکورہ مفسد کے بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہیں یہی وجہ ہے کہ قرون اخیر گزر جانے کے بعد دانایان امت نے نظم ملت قائم رکھنے اور اسے تثبت و پراگندگی سے بچانے کے لئے نئے اجتہاد و تقلید کا یہ ایک خاص نظام قائم کیا کہ نہ امت کو اجتہاد میں آزاد چھوڑا کہ ہر شخص مجتہد بن کر کتاب و سنت کو اپنی آراء و قیاسات کا کھلونا بنا لے اور نہ تقلید میں آزاد چھوڑا کہ جس کی چاہے اور جتنوں کی چاہے تقلیدات میں چکر کھا کر اپنے نفوس کو تباہ کر لے بلکہ اجتہاد کا دائرہ بھی محدود رکھا جیسا کہ وہ کنوینا بھی محدود تھا اور تقلید کا دائرہ بھی تنگ کیا جیسا کہ وہ عقلاً تنگ ہی تھا کہ غیر معین نہ ہو اور معین ہو کر بھی ایسے فرد کی ہو جو علم و عمل، ورع و تقویٰ،

شعور تشریع علم لدنی، اور اک خواص و احکام، اکتشاف اسرار و علل و جدان ظواہر و بواطن احساس و جزئیات و کلیات، شریعت میں یگانہ ہو، حاذق ہو اور اوپر سے اس کی یہ علمی و عملی قوت اسباب سے بالاتر ہو کر ایک مہربان الہی ہو جس کے ماتحت وہ اس آیت کا سچا مصداق ہو کہ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیْمَةً يٰهْتَدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بَاٰثِرِيْنَ يُوقِنُوْنَ﴾ ① ”اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے امر کی ہدایت کرتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر اختیار کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں“۔ یہاں صبر کے لفظ سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام طاعات کا مبداء صبر ہے، یعنی وہ صبر علی الطاعات۔ اور صبر بین الشہوات میں راسخ القدم ہو جو مطلق عمل سے آگے کا مرتبہ ہے اور جس کو حدیث جبریل علیہ السلام میں احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ادھر ایقان سے قوت علمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ علوم کی اساس یقین صادق ہی ہے، یعنی وہ پوری شریعت اور اس کے جزوی اور کلی مقاصد کے بارہ میں کمال یقین کے ساتھ درجہ معرفت پر آیا ہوا ہو جو ایمان سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو قرآن نے اطمینان سے تعبیر کیا ہے۔

سلف میں تقلید معین عام تھی..... چنانچہ سلف سے لے کر خلف تک اخلاقی مسائل میں ایسے ہی جامع افراد کی تقلید معین بطور دستور العمل کے شائع ذائع رہی اور قرن صحابہ ہی سے اس کا وجود شروع ہو گیا تھا مثلاً حدیث حضرت حذیفہؓ میں جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ سِیَّ لَا اَذْرِیْ مَا قَدَّرُ بِقَائِمِیْ فِیْکُمْ فَاَقْتَدُوْا بِاِلَٰذِنِیْ مِنْ بَعْدِیْ وَ اَشَارَ اِلَیْ اَبِیْ بَكْرٍ وَ عُمَرُو ② ”مجھے نہیں معلوم کہ میں تم لوگوں میں کب تک زندہ رہوں گا؟ سو تم لوگ ان دونوں کی اقتدا کیا کرنا اور اشارہ سے ابو بکر و عمرؓ کو بتلایا“۔ ظاہر ہے کہ من بَعْدِی سے ان دونوں حضرات کی حالت خلافت مراد ہے کیونکہ بلا خلافت تو ہر دو حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی موجود تھے، مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلیفہ ہونے کی حالت میں ان کی اتباع کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ خلیفہ ایک ہی ہوں گے نہ کہ دونوں اکٹھے۔

اس لئے حاصل یہ ہوا کہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں ان کی اور خلافت فاروقی میں ان کی اتباع کرنا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ خاص تک ایک معین شخص کے اتباع کا دین میں حکم فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان سے دلیل بھی ہر مسئلہ کی تحقیق کیا کرنا اور نہ یہ عادت مستمرہ تھی۔ یہی تقلید شخصی ہے کہ عملی مسئلہ پیش آنے پر کسی ایک عالم سے رجوع کر کے اس کے فتویٰ پر عمل کیا جائے لیکن دلائل کے پوچھنے کا کوئی التزام نہ تھا چنانچہ لوگوں کے سوال کرنے پر ان کے جو فتاویٰ روایات میں مذکور ہیں ان میں دلیل کا سوال ہے نہ دلیل کا اظہار۔ یہی تقلید شخصی تھی کہ ایک پر پورا ملک جمع ہو گیا اور بلا استفسار دلیل اس کے فتاویٰ پر عمل کرنے لگا، بخاری کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعرؓ سے مسئلہ پوچھا۔ پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا۔ تو انہوں نے

① پارہ ۲۱: سورة السجدة، الآية: ۲۳.

② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر و عمرؓ کلہما ج: ۱۲ ص: ۱۲۲.

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف بتایا جب حضرت ابو موسیٰ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ جب تک یہ حبر تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ مت پوچھا کرو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تمام مسائل میں ایک طرف لگا دینا اور لوگوں کا اس پر عمل درآمد کرنا جس میں مطالبہ دلیل کا کوئی سوال نہیں، پس یہی تقلید شخصی ہے۔

اہل مدینہ عموماً حضرت زید بن ثابتؓ کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ مکرمہ کی روایت بخاری میں ہے کہ لوگوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ: ہم حضرت زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف آپ کے قول پر عمل نہیں کریں گے، جس سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کے امام و مفتی حضرت زید بن ثابتؓ تھے اور لوگ ان کے فرمودہ کے مطابق عمل کرتے تھے خواہ وہ نص سے حکم دیں یا عدم نص کی صورت میں قیاس سے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کے سبعة احرف کو حرف واحد پر مقتصر فرمادینا اور تمام محروسہ ہائے اسلامی میں صحابہؓ و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا اسی کو عملاً قبول کر لینا اتباع و تقلید معین نہیں تھا تو اور کیا تھا؟۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح حکم حدیث تو موجود نہ تھا۔ ایک علت پر جس کو حضرت ذی النورین کے تفسیر نے ادراک کیا یہ حکم دائر تھا جبکہ ان کے نزدیک اس علت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ حکم سبعة احرف بھی ختم ہو گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس قیاسی حکم کو سب نے قبول کر لیا اور کسی نے بھی مطالبہ دلیل نہ کیا۔ اسی طرح اور قیاسی احکام میں بھی قرن صحابہؓ میں تقلید شخصی کی گئی ہے جیسا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلہ اس شرط پر فرض دینے کو ناپسند کیا کہ وہ دوسرے شہر میں ادا کیا جائے اور فرمایا کہ کرایہ بار برداری آخر ادا کرنے والا کس سے لے گا؟ اس فتویٰ پر لوگوں نے عمل کیا۔ اور یہ قیاس سے فتویٰ دیا تھا۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔ پس تقلید بھی ہوئی اور ہوئی قیاسی حکم میں۔

بہر حال تقلید شخصی کا عمل قرن سلف میں رائج تھا آج چونکہ اس کے بغیر لوگ طرح طرح کے علمی و عملی مفاسد کا شکار ہیں جن کی تشریح ابھی عرض کی گئی کہ اجتہاد کی آزادی سے فتنہ شبہات پھیلتا ہے اور تقلید کی آزادی سے فتنہ شہوات بڑھتا ہے۔ اس لئے قدرۃ اس میں وجوب کی شان پیدا ہو گئی کہ وہ واجب کا مقدمہ بن گئی اور اس کے بغیر اتباع ہواء سے محفوظ رہنا عاۃً محال ہو گیا، اس لئے تقلید شخصی بھی ضروری اور واجب ہو گئی ہے۔ مگر واجب بالغیر۔ قرون اولیٰ میں یہ غیر یعنی فتنہ شبہات و شہوات شائع نہ تھا۔ اس لئے یہ تقلید معین جواز کے درجہ میں تھی۔ آج شائع ہے اس لئے واجب کے درجہ میں ہے، الحاصل مطلق تقلید تقلید معین کتاب و سنت کی روشنی میں ایک ثابت شدہ اور معمول بہ مسئلہ واضح ہوئی۔ مطلق تقلید تو نص قرآنی ﴿فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ ① ”علم والوں سے سوال کرو اگر تم علم نہیں رکھتے“

اور تقلید معین بوجہ مفاسد مذکورہ اصول کتاب و سنت، احادیث باب، تعامل سلف، اجماع امت اور نبض

شناسان امت مرحومہ کے تجربات وغیرہ سے واجب ثابت ہوئی اور غیر مجتہد کے حق میں ضروری نکلی۔ مگر صرف مسائل اختلافیہ میں کہ انہیں مسائل میں کوئی نقیضین کا اجتماع یا نقیضین میں دائر سائر رہنے کی صورت پیدا ہوتی تھی جو دین کے نقطہ نظر سے محال ہے کہ دین میں تناقص محال ہے۔ اسی لئے عامۃً تمام اکابر امت اور ہر قرن کے علماء فحول جو اجتہادی شان تک رکھتے تھے تقلید معین کے دائر سے باہر نہیں ہوئے، بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکثر و بیشتر ارباب سنن و جوامع مقلد ہی ہوئے ہیں، ہندوستان کے عام محققین اور خصوصاً ولی اللہی خاندان اور سلسلہ کے تمام وہ اکابر جن کی تحقیقات اور لطائف و معارف ائمہ اجتہاد کا دور یاد دلاتی ہیں، خود اپنے لئے اور اپنے حلقہ اثر کے لئے تقلید معین ہی کو ضروری سمجھتے رہے اور کبھی اس کے حلقہ سے باہر نہیں ہوئے۔

دین کے بارہ میں یہی وہ اسوہ ہے جو بطور توارث علماء دیوبند تک پہنچا اور اسی راہ پر اسن پر دارالعلوم دیوبند نے راہ روی اختیار کی۔ حضرت ججۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم قدس سرہ، بانی دوسر پرست اول دارالعلوم، حضرت مولانا محمد رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سر پرست ثانی دارالعلوم۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ صدر مدرس اول و سر پرست ثالث دارالعلوم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ صدر مدرس ثانی و سر پرست رابع دارالعلوم، حضرت علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سر پرست خاص دارالعلوم، حضرت علامہ محمد انور شاہ قدس سرہ صدر رابع دارالعلوم وغیرہ وغیرہ جن کی تقاریر اور تحریرات دریائے اجتہاد کی نہریں معلوم ہوتی ہیں بایں تحقیق نظر و فکر تقلید معین کے دائرہ سے نہ کبھی خود باہر ہوئے نہ اپنے حلقہ ہائے اثر کو باہر ہونے دیا۔ پھر ان حضرات کے ہزار ہا تلامذہ اور شاگردان رشید۔ پھر دارالعلوم کے ہزار ہا فروغی مدارس جو ہندو بیرون ہند میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، ان کے محقق علماء اور ان کے حلقہ ہائے اثر اسی پرانے مسلک پر جمے رہے اور لوگوں کو جماتے رہے۔

بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم (قاسم العلوم والخیرات) نے اپنے مخصوص رنگ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ کی تقلید بھی کی اور ساتھ ہی محققانہ انداز سے تمام فقہ اور کلام کا اور اصولی فلسفہ بھی اسی انداز سے کھل کر دکھلایا کہ تقلید ایک مستقل تحقیق نظر آنے لگی اور جس کی بدولت دارالعلوم کے یہ ہزار ہا فضلاء اور شاگردان شاگرد و مقلد بھی رہے اور محقق فی تقلید بھی ہوئے، اسی طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان حضرات نے اسی مسئلہ تقلید کے ذریعے سے لوگوں کے دین کی حفاظت کی۔ ورنہ ایک طرف سے ملک کا جاہل طبقہ جس کی ملک میں اکثریت تھی فکر و خیال پر اس درجہ قید و بند عائد کر چکا تھا، کہ اپنی آبائی رسوم کو اسلام اور انہی کی کورانہ تقلید کو پیروی اسلام سمجھ کر ہر کس و ناکس کی تقلید میں گرفتار تھا جس سے ان میں طرح طرح کی بدعات و محدثات رچ گئی تھیں۔

اور دوسری طرف سن ۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم اور اس سے پیدا شدہ آزاد خیالی کے سبب فکر و خیال کی وہ آزادی پھیل چکی تھی کہ ہر شخص مجتہد مطلق ہونے کا مدعی اور اسے اپنا جائز حق سمجھ رہا تھا۔ جزئی عقول دماغوں پر اس درجہ مسلط ہو چکی تھیں کہ مذہبی نقل و روایت کے رد و قبول کا معیار ہی یہ عقول رہ گئی تھیں۔ غرض ایک طبقہ تقلید جامد کا شکار

تھا اور ایک طبقہ اجتہاد مطلق کے خیال میں غرق تھا۔ ایک نے طبقہ تقلید بلکہ ربقہ تقلید ہی کو گلے سے اتار پھینکا تھا۔ ایک نے تقلیدی افراط میں گرفتار ہو کر ہر صاحب سجادہ و دلق بلکہ ہر ہرمعی کی تقلید مطلق کرنے کا نام دین رکھ چھوڑا تھا۔ پس جامد مقلد یا بہت سوں کے سامنے جھکنے والے بہت سوں کے افعال کی اقتدا کرتے کرتے بدعات و محدثات کا شکار ہوئے اور فتنہ شہوات میں جا گرے اور آزاد خیال کسی ایک کے بھی سامنے نہ جھکنے کی خواہش پیدا کر کے اپنی عقل کے بندے بن گئے تھے، جوان کی عقل میں آیا مان گئے جو نہ آیا انکار کر بیٹھے اور اس طرح یہ لوگ فتنہ شہوات میں جا پھنسے تھے۔

اگر یہی لیل و نہار رہتے تو ہندوستان کی پوری دنیا شہوات و شہوات میں پھنس کر کلیۃً اپنا دین کھو چکی ہوتی۔ خدا رحمتیں نازل کرے ان اساطین امت اور مجددین دین پر کہ انہوں نے اجتہاد و تقلید کا وہی معتدل اور درمیانی نکتہ پکڑ کر جو حقیقہ کتاب و سنت کی روح تھا اس امت کو سنبھالا اور ہند اور بیرون ہند میں حقیقت اور حقیقت کی جڑیں مضبوط کر دیں، دائر تقلید معین کو بھی نہ چھوڑا اور شان تحقیق کو بھی ہاتھ سے نہ جائے دیا اور پھر ایک طرف کتاب و سنت کے علم و سبب کا روشن مینارہ دلیل راہ بنایا اور دوسری طرف ریاضت و عبادت کر کے معرفت نفس اور معرفت رب کی منازل طے کیں جس سے ان کا علم منقول سے معقول بنا اور پھر معقول سے محسوس ہو کر مشاہدہ میں آ گیا یعنی جو علم اوپر والوں سے سنا تھا پہلے اسے استدلال سے سمجھا اور پھر اس کے استعمال سے اسے اپنا حال بنالیا جس سے پوری شریعت اپنے ظہر و بطن کے ساتھ ان پر منکشف بھی ہوئی اور ان کا حال ہو کر ان کی طبیعت بھی بن گئی۔ لیکن غور کیجئے کہ اس انکشاف تام اور کمالات ظاہر و باطن کے ہوتے ہوئے بھی جبکہ ان جیسے مانے ہوئے محققین اور عارفین نے بھی تقلید کا دامن دینی تحفظ کی خاطر کبھی نہ چھوڑا تو ایک ایسے دور میں جبکہ ہم لوگوں کا علم تو مضاعف ہو کر رسمی سارہ گیا ہے اور اسلام کمزور ہو کر اسی سا ہو گیا ہے، تقویٰ و طہارت اور عمل کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ فہم عالی گویا کہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ کام کا وجود نہیں ہے اور دعاوی بے شمار ہیں۔

حیرت ہے کہ آج کے بہت سے بزرگوار اس سیدھے سادھے محافظ دین طریق عمل یعنی تقلید معین سے جو سلف کے وقت سے اسی تحفظ دین کی خاطر معمول بہ ہے کس سہولت سے روگردانی فرما رہے ہیں؟۔ مناسب تو یہ تھا کہ خود بھی اس طریق عمل کو اختیار فرماتے کہ اس میں کوئی برائی نہ تھی لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم اس رہ کے اختیار کرنے والوں پر ملامت نہ فرماتے کہ اختیار کرنے والوں نے بہر حال کسی بدعت یا شرعی مذموم کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ایک حجت کے ساتھ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں جیسا کہ سلف نے بھی اور بعد میں پوری امت نے بھی امن اسی میں دیکھا تھا۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس مسلک اور اس کے سالکین کو ہر طعن کا مخاطب بنایا گیا اور کسی قسم کے حملوں سے احتراز بھی نہیں کیا گیا۔

کہیں کہا گیا کہ مقلد جھگڑالو ہوتے ہیں اور لڑتے ہیں، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین نے غیر مسلک والوں پر

تعدیات کیس جس کے لئے تاریخی شواہد لائے جاتے ہیں تاکہ منافرت کا تخم کافی مضبوطی کے ساتھ دلوں میں جم جائے اور برگ لے آئے، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین یا احناف نے حکومت کے زور سے اپنے مسلک کو پھیلایا ہے گویا فقہ حنفی یا دوسرے فقہیات عیاذاً باللہ خرافات کا مجموعہ تھے جن میں نہ کوئی معقولیت تھی نہ کشش، اس لئے جبری اشاعتوں کی بدولت زور زبردستی سے دنیا میں پھیلانے گئے؟

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات ہیں جو مذاہب اربعہ اور ان کے ماننے والوں کی نسبت شائع کئے جاتے ہیں۔ مجھے ان خیالات کا اس تحریر میں جواب دینا نہیں ہے کیونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس تحریر کا موضوع کوئی رد و قدح یا مناظرہ نہیں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس قسم کے خیالات و افکار کم سے کم محقق علماء اور مربیان امت کے شایان شان نہیں۔ اگر کسی فرد یا جماعت میں شخصی یا جماعتی کمزوریاں ہوں تو اس میں مسلک یا مذہب کا کیا دخل ہے کہ وہ اس کی طرف منسوب کر دی جائیں؟ اگر آج مسلمان اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر آپس میں سر پھٹول روا رکھتے ہیں تو اس میں اسلام کا کیا دخل ہے اور کس طرح جائز ہوگا کہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کو اسلام کا شرہ کہا جائے۔

بہر حال مقلد یا غیر مقلد کسی وقت بھی باہم غیر مناسب انداز سے باہم آویزش کرنے لگیں تو اس میں تقلید اور عدم تقلید کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ یہ محض ان کے جذبات ہیں جو اپنے ہی رنگ میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جذبات کا نہ کسی شرعی مسئلہ سے تعلق ہے نہ کسی شرعی مسلک سے اجتہاد و تقلید جیسے شرعی مسائل اپنی جگہ ہیں اور یہ کمزوریاں اپنی جگہ، ان کمزوریوں پر اعتراض اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو مگر ان شرعی مسائل یا ان کے ماننے والوں پر کسی حالت میں بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ہر وقت حاصل ہے لیکن اسی حد تک کہ مجتہد متنبہ ہو جائے نہ اس حد تک کہ یہ امر بالمعروف ہی ایک مستقل نزاع بن کر محاذ قائم کر دے اور باہمی منافرات کی تخم ریزی اور آبیاری کرنے لگے۔

اس لئے میری دردمندانہ گزارش ہے کہ مسائل کو مسائل کے درجہ میں رکھ کر تمام حضرات خواہ وہ تقلید سے تعلق رکھتے ہوں یا ترک تقلید سے تعلق رکھتے ہوں۔ نفس دین کے تحفظ میں اجتماعی جدوجہد صرف کرنے کی فکر فرمائیں اور فردی مسائل کے اختلافات میں جو آج سے مختلف فیہ نہیں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی کے وقت سے مختلف فیہ چلے آ رہے ہیں۔ ایک اختلافی جہت کے ماننے والوں کی طرف سے یہ حجت کافی خیال فرمائیں کہ فلاں طبقہ، فلاں فقیہ کے فتاویٰ پر عمل کر رہا ہے۔ مخترع اور مبتدع نہیں ہے یہ حجت ہر زمانے میں ایسے مسائل میں قاطع نزاع سمجھی گئی ہے نہ کہ مورد نزاع، اس لیے خدا را آج بھی اس حجت کو قاطع نطاع ہی بنائیے نہ کہ موجب نزاع۔ ضرورت ہے کہ سب حضرات باہمی اشتراک عمل سے پوری قوم کی تعمیر کی فکر فرمائیں اور یہ سب مل کر ایسے لائحہ عمل پر غور کریں جو مسلمانوں کو ایک سطح پر لائے اور معاندین اسلام کی مخفی ریشہ دوانیوں کا کسی حد تک سد باب کر سکے۔

حضرات! اپنے باہمی اتحاد میں کم سے کم حضرات صحابہؓ کے اس اُسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنالینا چاہئے کہ قرآن کریم کی بعض شاذ آیات جن کو صحابہؓ کے اجماع نے قرآن کریم کا جزو تسلیم نہیں کیا۔ بعض حضرات صحابہؓ کے پاس موجود تھیں جو انہیں خلاف اجماع قرآن کا جزو جانتے تھے لیکن کسی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ارباب اجماع نے مخالفین کے خلاف یا مخالفین اجماع نے ارباب اجماع کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔

پس حضرات مقلدین جبکہ ترک تقلید کو خلاف اجماع سمجھتے ہیں تو وہ تاریکین تقلید کے بارہ میں ان حضرات صحابہؓ کا اُسوۂ اختیار فرمائیں۔ جنہوں نے اپنے اجماع کے باوجود مخالفین اجماع کے خلاف نہ کوئی محاذ قائم کیا اور نہ کسی جنگ کا آغاز کیا۔ بلکہ تفہیم کا حق ادا کر دینے کے بعد ان کی تحقیق پر انہیں معذور سمجھ کر ہمیشہ چھوڑے رکھا۔ ادھر حضرت مکرہ بن تقلید اگر تقلید کو باوجود اجماع امت کے قابل قبول نہیں سمجھتے تو وہ ان حضرات صحابہؓ کا راستہ اختیار فرمائیں جنہوں نے شاذ آیات کے بارہ میں اپنی تحقیق نہیں چھوڑی تو اجماع کنندوں کے مقابلہ میں بھی نہیں آئے اور انہیں ان کے عمل کے لئے آزاد چھوڑا۔ تقلید کے فریقین بلکہ تمام فرق اسلامیہ جب تک حضرات صحابہؓ کی اس پر حوصلہ رواداری کا اسوۂ اختیار نہیں فرمائیں گے۔ امت کے اجتماعی مسائل کا حل کبھی نہیں ہو سکتا۔

آج امت مسلمہ کو تعلیم عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ جہالت کے جراثیم نے اس کے قومی جسم کو شل ایک بے جان لاشہ کے کر دیا ہے۔ اسی طرح آج تبلیغ عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ مسائل سے عدم واقفیت نے انہیں اندھیرے میں ڈال رکھا ہے۔ اسی طرح امت کو اصلاح اخلاق کی قوی ترین ضرورت ہے کہ بد اخلاقیات ناسور ہو کر اس قوم کو لگ گئی ہیں۔ اسی طرح صفائی معاملات کی آج حد درجہ ضرورت ہے کہ بد معاملگی نے قوم کی رہی سہی سا کھ بھی ختم کر دی ہے۔ اسی طرح سیاسی حقوق کے تحفظ کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس کے فقدان نے قوم کی شوکت و قوت کو قطعاً زائل کر دیا ہے۔

لیکن سارے اجتماعی معاملات آپ حضرات جب ہی پایہ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں جبکہ ان فردی اختلافات کو نزاعات نہ بنائیں اور روات کے بادیانت اختلافات کو اس کی حدود میں قائم رکھ کر اسلام کی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی فکر کریں اور امت کی اس اجتماعی ساکھ کو پھر از سر نو قائم کرنے کی کوشش کریں جو بہت حد تک پامال ہو چکی ہے اور ان نزاعات کے ذریعہ ہی روز بروز وال ہو رہی ہے۔ میں اس کی امید رکھوں گا کہ ”آل انڈیا احناف کانفرنس“ ان عمومی اور اجتماعی مہمات کو اپنے بنیادی مقاصد میں شامل کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے دائرہ عمل میں لے لے گی۔

مجھے آل انڈیا احناف کانفرنس کے دعوتی پوسٹر کو دیکھ کر جس میں غیر مسلک کے علماء کو بفرانح دلی و فرانح حوصلگی دعوت دی گئی ہے۔ یقین کامل ہے کہ اس کانفرنس کے مخلصانہ جذبات عمل انفرادیت سے بالاتر اجتماعی روح اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور اس کے مخلص کارکن اتحادیین المسلمین کے زیادہ سے زیادہ خواہش مند ہیں۔ اس لئے اس کانفرنس سے یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ عرض کردہ مقاصد اس کے اساسی مقاصد قرار پا سکیں گے اور اس کے ہاتھوں

پھلیں پھولیں گے۔

آخر میں تمام ذمہ داران کانفرنس کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی فراخ دلی سے مجھ ناچیز کو اپنے کج مع خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمایا اور میری انتہائی بے بضاعتی کے باوجود مجھے قبول فرما کر میری انتہائی عزت افزائی فرمائی۔ حق تعالیٰ شانہ، ذمہ داران کانفرنس، کارکنان جلسہ اور تمام حاضرین اجلاس کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق دے اور ہم سب کو حسن خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

پس منظر

اجلاس جمعیت العلماء صوبہ بمبئی

منعقدہ ۶، ۷، ۸ صفر المظفر ۱۳۶۴ھ بمطابق ۱۳، ۱۴، ۱۵ مئی ۱۹۴۳ء

از فخر المآثر حضرت الحاج مولانا قاری حافظ محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ
(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

جمعیت العلماء صوبہ بمبئی نے گزشتہ سال ۱۳۶۳ھ میں اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا تھا۔ مدوح نے اس اجلاس میں ارتجالاً زبانی جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اس نے اہل بمبئی کے مذہبی اور سیاسی احساس و شعور کو بیدار کرنے میں خیرت انگیز کام کیا۔ قبول و تائید کی ایک روتھی جو چالیس پچاس ہزار سامعین کے قلوب میں گھر کرتی چلی گئی تھی۔

مشرقی و مغربی تعلیم و نظریات دونوں کے حامل و ولدانہ اس خطبہ سے یکساں متاثر تھے۔ سیاسی و غیر سیاسی، سرکاری و غیر سرکاری، مذہبی اور غیر مذہبی مسلم اور غیر مسلم کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس پر حقائق و معارف کے اس آب حیات کا کوئی چھینٹا بڑ گیا ہو اور وہ خواب گراں سے ہوشیار نہ ہو گیا ہو۔ بمبئی کے کانوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسا سیاسی پروگرام سنا جو قرآن و سنت اور صرف قرآن و سنت سے مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس میں انسان کے لئے دنیا کے موجودہ حالات میں فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے سہل الحصول اور یقینی طریقے بھی موجود تھے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی۔

بمبئی! جہاں کے باحوصلہ اور نیک دل مسلمانوں کو ایک خود غرض جماعت نے اپنی نفس پرستی اور جلب منفعت کے لئے بتلائے فریب کر رکھا تھا اور مخلصانہ مذہبی جذبات کو غلط راستوں پر ڈال کر سچا دین پیش کرنے والوں اور کلمہ حق کہنے والوں سے اس درجہ متفر اور متوحش کر دیا تھا کہ وہ ان کے قریب جانے یا ان کی کوئی بات سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے، انہوں نے جب جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے اس بیدار کن صدائے حق کو سنا تو وہ چونک اٹھے، انہوں نے محسوس کیا کہ ارباب غرض نے سالہا سال سے ان کے مذہبی جذبات کو جن راہوں پر ڈال کر علماء دیوبند کے خلاف جو اشتعال اور نفرت پیدا کر دی ہے وہ سراسر باطل ہے۔ حق یہی ہے کہ دین و دنیا کی خیر و فلاح اور تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح اسوہ اگر کسی کے پاس ہے تو انہیں علماء حق کے پاس ہے۔

اس احساس کا پیدا ہونا تھا کہ بمبئی جیسے عظیم الشان شہر کے گوشہ گوشہ سے طالبان حق گردن گروہ حضرت ممدوح کی خدمت میں یہ التجا لے کر حاضر ہونے لگے کہ ہمارے علاقے کے مسلمانوں کے کان بھی اس صدائے حق سے آشنا کئے جائیں جس سے وہ اب تک مختلف حیلوں، اور گمراہ کن تدبیروں سے محروم رکھے گئے ہیں، اہل بمبئی کی اس طلب صادق اور التجائے شدید نے حضرت مہتمم صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پروگرام میں مخلصین و طالبین بمبئی کے لئے جتنا وقت نکال سکیں نکالیں۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے جتنا ممکن ہو سکا بمبئی میں قیام فرمایا اور وہاں کے تقریباً ہر حصہ کے تشنگان حقیقت و معرفت کو اپنے ارشادات عالیہ اور مواعظ حسنہ کے شیریں اور صاف و شفاف آپ رواں سے سیراب کرنے کی کوشش کی۔ پیاسوں کی پیاس کا یہ عالم تھا کہ جام پر جام پیتے جاتے تھے اور ”هَلْ مِنْ مُزِيدٍ“ پکار رہے تھے۔ چونکہ مولانا نے ممدوح کی ذات گرامی پر دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان مرکزی ادارہ کی اہم ذمہ داریوں کا بار گراں بھی ہے اس لئے تقریباً تین ہفتہ سے زیادہ بمبئی میں قیام نہ فرما سکے اور بمشکل دیوبند واپس تشریف لائے۔ اس سال جمعیت کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ذمہ داران جمعیت نے پھر حضرت ممدوح سے صدارت اجلاس قبول کرنے کی باصرار درخواست کی اور اہل بمبئی کے والہانہ شوق کا شد و مد کے ساتھ اظہار کیا چنانچہ مخلصین بمبئی کی دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ممدوح نے بمبئی تشریف لے جا کر فرائض صدارت انجام دیئے، اس سال مسلمانان بمبئی کا ذوق و شوق المضاعف تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حاضرین جلسہ کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہوتی تھی۔ اجلاس جمعیت کے ختم ہونے پر اہل شہر کی جانب سے علاقہ وار جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان میں حضرت ممدوح نے انسان کی نجات اور اس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں فلاح و خیر کا وہ پروگرام پیش فرمایا جو قرآن و سنت کا مرتب کردہ ہے۔ ان خطبات و مواعظ نے مسلمانان بمبئی کے ایمانوں میں جلا پیدا کر دی۔ ارباب باطل نے تلبیس و تلبیس اور افتراء و بہتان پر جماعت دیوبند کے خلاف سالہا سال میں عناد و عداوت کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر رہ گئی اور بمبئی کے سنجیدہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میں دیوبند کی محبت و عقیدت کا گہرا نقش قائم ہو گیا۔ ذَلِكْ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ .

۵ صفر ۱۳۶۲ھ کو جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے سالانہ اجلاس میں حضرت ممدوح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا دیوبند سے بمبئی تشریف لے جاتے ہوئے راستہ میں قلم برداشتہ تحریر فرمایا تھا، اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ مسودہ پر نظر ثانی کی جاسکتی۔ دراصل یہ خطبہ صدارت کے مضامین کا ایک اجمالی خاکہ تھا جو رواروی میں بطور یادداشت مرتب کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ سامعین کو طبعاً تحریر کے سننے میں الجھن اور ضیق ہوتی ہے۔ نیز تحریر کے ذریعہ مسائل کی تفہیم میں مختلف التخیال اور تفاوت التخیال حاضرین کی کما حقہ رعایت نہیں رکھی جاسکتی۔ اس لئے ممدوح نے اس مرتب کردہ تحریری خاکہ پر زبانی خطبہ ارشاد فرمایا کہ اس خطبہ میں بہت سے مضامین تحریر کردہ خطبہ سے زائد بیان ہوئے اور مجمع پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ ممدوح کا خیال تھا کہ خطبہ پر نظر ثانی

کے وقت تقریر کے زائد نکات و مضامین کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ لیکن حضرت ممدوح نے جیسے ہی تقریر ختم فرمائی۔ مدیر ان جرائد نے اصرار کیا کہ مسودہ جس حالت میں بھی ہے انہیں دے دیا جائے کہ انہوں نے تقریر کے جو نوٹ لئے ہیں یہ مسودہ یقیناً ان سے زیادہ مفصل ہوگا اس لئے مسودہ دے دیا گیا اور اسے بمبئی کے اردو، انگریزی، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ اخبارات نے نمایاں طور پر اور بعض نے پورا اور بعض نے اس کے خاص خاص حصے شائع کئے بلکہ بعض اخبارات نے پبلک کے شدید مطالبہ کی بناء پر اس مکمل مسودہ کو ایک سے زائد مرتبہ شائع کیا۔

بمبئی سے واپسی پر اثناء سفر ممدوح نے اس مسودہ پر نظر ثانی کر کے اس میں ان مضامین کا اضافہ بھی فرما دیا جو تقریر میں خاص طور پر آگئے تھے۔ اب حذف و از دیار، اور ترمیم و تنبیخ کے بعد یہ مسودہ اپنی مکمل صورت میں مرتب ہو گیا ہے۔ چونکہ اس خطبہ کی حیثیت عام رسمی خطبات صدارت سے مختلف ہے اور اس میں زمانہ حال کی ضروریات میں مسلمانوں کی بہترین مذہبی و سیاسی راہنمائی کی گئی ہے۔ اس لئے مدیر رسالہ دارالعلوم کی درخواست پر حضرت ممدوح نے ترمیم شدہ مسودہ دفتر رسالہ کو مرحمت فرما دیا جس کو بالاقساط رسالہ میں شائع کیا گیا۔

دارالعلوم کے جن نمبروں میں یہ خطبہ صدارت شائع کیا گیا ہے اور اطراف و اکناف ہند سے ان کی فرمائش اس کثرت سے آئیں کہ وہ نمبر بہت جلد ختم ہو گئے اور فرمائشات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس لئے شائقین کے اصرار پر بہ منظوری حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ خطبہ صدارت کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ناظم کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

”الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسَبِّحُهُ وَنُسْتَغْفِرُهُ وَتَوَكَّلُ بِهِ وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
 إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
 وَرَسُولُهُ ، أَرْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرَا وَنَذِيرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُبِيرًا . صَلَّى اللَّهُ
 تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا آمَنَّا بِعَدْلِهِ أَفَاعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ
 الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ، بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ٥

﴿إِذْ هَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ قَالَ رَبِّ اسْرُخْ لِي صَدْرِي ۖ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۖ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ۖ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۖ وَاجْعَلْ لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۖ هَرُونَ أَخِي ۖ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۖ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۖ كَتَىٰ نَسَبَحَكَ كَثِيرًا ۖ وَنَذَرَكَ كَثِيرًا ۖ إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيرًا ۖ قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يٰمُوسَىٰ﴾ (إِلَىٰ أَنْ قَالَ تَعَالَىٰ) ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۖ إِذْ هَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِأَيْتِي وَلَا تَنِيَّافِي ذِكْرِي ۖ إِذْ هَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ فَقَوْلَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لِّعَلَّهُ يَنْذَرُ ۖ أَوَ يَخْشَىٰ ۖ قَالَ لَا رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا وَأَنْ يُطْغَىٰ ۖ قَالَ لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا أَسْمِعُ ۖ وَأَرَىٰ ۖ فَإِنِّيهِ فَقَوْلَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ وَلَا تَعْدُ بِهِمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّنْ رَبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ۖ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾ ① صَدَقَ اللَّهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ .

ترجمہ: ”اے موسیٰ! تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے عرض کیا اے میرے رب! میرا حوصلہ فراخ کیجئے اور میرا کام آسان فرما دیجئے اور میری زبان پر سے بلسنگی ہٹا دیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوت مستحکم کر دیجئے اور ان کو میرے کام میں شریک کر دیجئے تاکہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں بلاشبہ آپ ہم کو خوب دیکھ رہے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ: تمہاری درخواست

منظور کی گئی اے موسیٰ (پھر آگے حق تعالیٰ نے فرمایا) اور میں نے (اے موسیٰ) تم کو اپنے لئے منتخب کیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل چلا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے پروردگار: ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔ ارشاد ہوا کہ: تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا ہوں اور سب دیکھتا ہوں۔ سو تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور ایسے شخص کے لئے سلامتی ہے جو راہ پر چلے۔ ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلائے اور روگردانی کرے۔

میری سب سے بڑی عزت و سعادت بزرگان محترم! آپ حضرت نے ایک سال بعد پھر مثل سابق میری عزت افزائی فرما کر مجھے اسی جگہ لا بٹھایا ہے جس جگہ گزشتہ سال مجھے بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس حوصلہ افزائی پر آپ سب بزرگوں کا شکریہ ادا کروں۔ فہجزاکم اللہ عنی بخیر! لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری سب سے بڑی عزت افزائی یہ ہے کہ خواہ میری ذات کو حقیر ترین سمجھا جائے جیسا کہ واقعہ میں وہ ہے لیکن اس پیام کو گوش ہوش سے سن کر دل کی گہرائیوں میں جگہ دی جائے جو میرا کرسی پر بیٹھ کر دینا چاہتا ہوں تو یہی میری سب سے بڑی عزت و سعادت ہوگی۔ گو ذات کسی نگاہ سے بھی دیکھی جائے۔ سلاطین کا پیغام عام پبلک کے کانوں عموماً بھٹکی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے لیکن اس کے قبول کرنے میں بھٹکی کی ذاتی حقارت کبھی مانع نہیں آتی۔

مجھے آپ ختمی مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کا ایک ادنیٰ بھٹکی تصور کریں۔ بلکہ وہاں کے بھٹکی کا مرتبہ بھی یہاں کے سلاطین سے بڑھ کر ہے۔ میں کیا چیز ہوں، تاہم ایک معمولی بھٹکی کی بے حیثیتی اگر پیغام حکومت ماننے سے مانع نہیں ہو سکتی تو میری کم حیثیتی بھی پیغام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سننے اور ماننے سے مانع نہ ہونی چاہئے۔ میں اپنے لئے اس وقت وہی مثال دے سکتا ہوں جو ایک تبلیغ خاص کے موقع پر مولانا سلیع شہید کی ہوئی کہ وہ طوائفوں کو تبلیغ حق کرنے پہنچ گئے تو ان کے خدام و متوسلین نے یہ کہہ کر روکا کہ حضرت: ایسے بدنام گروہ کے سامنے تبلیغ کے لئے جانا علم کی عزت کو گھٹاتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا تھا کہ: ”خدا کی قسم! اگر سلیع کو گدھے پر سوار کر کے اس کا منہ کالا کیا جائے اور جوتیوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے اور اس کے پیچھے بچے ہر لودیتے ہوئے اسے شہر سے باہر نکال رہے ہوں اور سلیع قال اللہ وقال الرسول کہتا ہوا جا رہا ہو تو یہی اس کی انتہائی عزت و مہر بندی ہے جس کے بعد اسے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔“

تو میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ: آپ اگر کسی درجہ میں بھی میری کوئی توقیر نہ فرماتے اور اپنے اخلاق

کریمانہ کا کسی درجہ میں بھی ثبوت نہ دیتے مگر اس پیغام کی عظمت کرتے جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں تو بلاشبہ یہی میری ایک انتہائی عزت افزائی ہوتی کہ اس کے بعد مجھے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔

تذکیر قدیم..... حضرات! مجھے جمعیت العلماء صوبہ بہمنی کے اس پلیٹ فارم سے کوئی نیا اور انوکھا پیغام دینا نہیں ہے جواب تک نہ دیا گیا ہو کیونکہ اول تو پیغام قرآنی ہے اور قرآن چودہ صدی کی پرانی کتاب ہے تو اس کا پیغام نیا کب ہو سکتا ہے؟ پھر قدامت کی یہ محدود مدت بھی قرآن کے کلام لفظی ہونے کے لحاظ سے ہے۔ جس کی عمر چودہ سو برس ہے۔ ورنہ کلام نفیسی کے درجہ میں تو کلام اللہ اور اس کا پیغام ازلی اور قدیم مطلق ہے کہ صفت الہیہ ہے جس کی قدامت کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ سر تا پا قدیم اور ازلی محض ہے اس لئے میرے پیغام میں کوئی ادنیٰ جدت نہ ہوگی۔ اور پھر اس پرانے پیغام کو بھی دینے والے بارہادے چکے ہیں کہ اس چودہ صدی میں قرآن اور اس کے ضمن میں یہ پیغام ہر عالم و عامی کی زبان پر ہزار بار آیا ہوا ہے۔ اس لئے بلحاظ تبلیغ بھی یہ پیغام نیا نہیں۔ ہاں صرف عنوان بیان اور طریق استدلال کے لحاظ سے شاید نیا ہو اور اس لحاظ سے بھی نیا نہ ہو تو نہ سہی۔ مقصود اصلی تو تذکیر ہے اور تذکیر ہمیشہ پرانی ہی بات کی ہوتی ہے۔

اجمالی پیغام..... یہ پیغام قرآن حکیم کی مرقومہ بالا آیتوں سے چند نمبروں میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں آیات مذکورہ کے الفاظ اور سیاق و سباق سے استنباط کر کے نمبر وار مرتب کر دیا گیا ہے تفصیلات سے پہلے پیغام کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ ہم غلامی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہمیں مکمل آزادی کی نعمت حاصل کرنی چاہئے۔ اس لئے میری اس ساری عرضداشت کا حاصل غلامی اور آزادی کی شرعی بحث شرعی حیثیت سے غلامی اور آزادی کا مفہوم دونوں کے اثرات حصول آزادی کی ضرورت اور طریقہ حصول وغیرہ کی تفصیل چند نمبروں میں عرض کرنا ہے۔

1 پیغام اور اس کی نمبر وار دفعات برطانیہ کی سرکشی..... آیات مندرجہ عنوان کا ترجمہ آپ نے سمجھ لیا اب سلسلہ وار ان آیات کے مدلولات پر غور کیجئے۔ بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ ﴿اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ﴾ ”اے موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے۔“

اس حد سے نکل جانے کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنانا رکھا تھا۔ پس قرآن کا اس غلام سازی کو اور فرعون کے استعبادی جذبہ کو طغیان سے تعبیر کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ کسی قوم کا کسی قوم کو اپنا غلام بنانا خالق کائنات سے بغاوت اور سرکشی ہے جو مورد قہر و عتاب ہے کیونکہ طغیان مورد غضب ہی ہو سکتا ہے نہ کہ مورد رحمت و شفقت، اس سے یورپ کی ان اقوام کی پوزیشن سامنے آ جاتی ہے جن کے شب و روز کا ذکر فکر اور مشغلہ ہی دنیا کی اقوام کے گلے میں یورپ کی غلامی کے پھندے ڈالتے رہنے کی اسکیمیں سوچتے رہنا اور انہیں عمل میں لاتے رہنا ہے۔ جس میں برطانیہ کو بالخصوص بیٹھوی حاصل ہے اسی کو قرآن نے فساد انگیزی سے تعبیر فرمایا ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضِعُّ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَذِخُّ أُنْبَاءَ هُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾ ① ”فرعون سرزمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا واقعی وہ بڑا مفسد تھا۔“

[2] اسباب غلامی اسی سے دوسرا مسئلہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ عند اللہ خود غلامی بھی قابل نفرت چیز ہے کیونکہ جب اس کے برپا کرنے والے کو طاغی اور سرکش کہا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی برپا کردہ چیز (غلامی) کسی درجہ میں بھی مستحسن اور پسندیدہ ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی غلامی قوموں کے لئے ہر ممکن بے عزتی کی جڑ اور ہر محتمل بے وقعتی کی بنیاد ہے کیونکہ دنیا میں ایک قوم کے لئے اسباب عزت چار ہوتے ہیں۔

1..... ایک اس کا اپنا سیاسی علم جس سے اس کی معنویت قائم ہوتی ہے۔

2..... دوسرے اس کی اقتصادی اور مالی حیثیت جس سے اس کی مادیت بنتی ہے۔

3..... تیسرے اس کی عرفی حیثیت جس سے اس کا وقار قائم ہوتا ہے۔

4..... چوتھے اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی نوعیت جس سے اس کے حلقہ اثر میں وسعت اور بنیادوں میں مضبوطی آتی ہے۔

ایک مسلط قوم جب کسی ملک یا قوم کو اپنا غلام بنا لیتی ہے تو غلام قوم کی عزت کے یہ چاروں سوت بند کر دیتی ہے جس سے اس قوم کی معنویت، مادیت، وقعت اور نیک شہرت سب ختم ہو جاتی ہے اور پھر نتیجہ کے طور پر اس محکوم قوم میں پستی اخلاق و کردار کے ایسے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ مخلوق ہی کی نہیں خالق کی نگاہوں سے بھی گر جاتی ہے۔ تا آنکہ غیرت خداوندی جوش میں آئے۔ اس کا حال زبوں اور بد سے بدتر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اپنے قومی علم کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ جس سے نہ اسے اپنی قومی روایات یا درہتی ہیں نہ قومی مذاق ملحوظ رہتا ہے اور نہ قومی مزاج ہی باقی رہتا ہے اور اگر اسے علم کی تلاش بھی ہوتی ہے تو فاتح قوم کا علم سیکھ لینا ہی اسکے نزدیک سب سے بڑا فخر بن جاتا ہے جس کے لئے وہ مجبور کر دی جاتی ہے۔ اور اب اگر اس جدید علم کی بناء پر اس کی کوئی رسمی عزت ہوتی ہے تو وہ درحقیقت خود اس کی قومی عزت نہیں بلکہ حکمران قوم ہی کی عزت کا ایک ظل ہوتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس کی مالی حیثیت کچل دینے کے لئے ایسے قوانین بنا دیئے جاتے ہیں کہ روز بروز محکوم قوم افلاس کے گڑھے میں گرتی رہے اور اس کی سیر چشمی استغناء اور غیرت و حمیت کا خون اس گڑھے کے کناروں پر بہتا رہے تا آنکہ اس افلاس و بے مائیگی کی بے چارگیوں میں اس کا ایمان ستے داموں خرید لیا جائے اور انجام کار خود داری و استغناء کا اس میں تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ جب تک کہ وہ خود مشکلات کا مقابلہ کر کے اسے باقی

رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ حیثیت عربی اور ساکھ مٹانے کے لئے اسکے قوائے عمل کم مرتبہ امور اور ذلیل پیشوں میں مصروف کر دیئے جاتے ہیں۔ ملک کی اونچی سوسائٹی اور بلند عہدوں میں نہ خود اس کی جگہ رہتی ہے نہ اس کا اپنا علمی و اخلاقی سرمایہ ہی کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اور آخر کار اس غلامی کی پیدا کردہ جہالتوں اور بد اخلاقیوں نیز حکمران قوم کی مخفی خواہش و مساعی کی بدولت محکوم قوم کے باہمی روابط بھی خراب ہو جاتے ہیں اور بیرونی تعلقات بھی مضحل پڑ جاتے ہیں اسے اپنوں سے منقطع کر کے ایسا بے دست و پا کر دیا جاتا ہے کہ کوئی اس کا ہمنوا باقی نہیں رہتا اور اس کی ساری زندگی حکمران قوم کے رحم و کرم پر دائر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے داخلی اور خارجی وسائل منقطع ہو جائیں جس کی بقاء و ترقی کے مادی معنوی اسباب مفقود ہونے لگیں اس کے مریض جسم و روح کے گھل گھل کر قریب بہ مرگ ہو جانے میں تا مل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ چونکہ غلامی یہ چار مہلک اسباب اپنے ساتھ لاتی ہے جس سے قوموں کے تختے اٹتے ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے غلامی کو بدترین عذاب فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کی اس غلامی کا جو فرعون اور قبطیوں کی آقا ئی سے پیدا ہوئی۔ قرآن نے ذیل کے الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے۔ ﴿وَإِذْ نَسَجْنَاهُمْ مِنْ أَلْفِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ﴾ ① ”وہ وقت یاد کرو (اے بنی اسرائیل) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو کہ تمہیں بدترین عذاب (غلامی) کا مزہ چکھاتے تھے۔“

علم کی تباہی..... چنانچہ فرعونی قوم نے فاتح بن کر بنی اسرائیل کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا جو ہر آقا قوم اپنی غلام قوم کے ساتھ اختیار کرتی ہے۔ یعنی غلامی کے عناصر رابعہ پورے ہو کر رہے۔ سب سے اول بنی اسرائیل کا آبا ئی علم ختم ہوا۔

فرعون کو کیا ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کی روایتی تعلیم کو رواج دیتا۔ اس کی اشاعت کے لئے مدارس جاری کرتا یا ابراہیمی اور اسرائیلی طریق زندگی کے مطابق تربیت گاہیں قائم کرتا ورنہ اس کی خدائی کو کب فروغ حاصل ہوتا؟ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہونا تھا کہ ان کے اسلاف اولین جب تک زندہ رہے پیغمبروں کی پند و نصائح بھی انکے ذہنوں میں زندہ رہیں۔ جوں جوں وہ رخصت ہوتے گئے اسی حد تک وہ روایتیں بھی ختم ہوتی رہیں تا آنکہ بنی اسرائیل کے افق پر جہالت کی گھنگھور گھٹا چھا گئی جسے فرعون نے بڑھا چڑھا کر انتہاء تک پہنچا دیا تاکہ وہ اپنی خاندانی روایات کو سرے سے بھول جائیں اور ان میں قومی خود اختیاری کا احساس پیدا نہ ہو۔

یہی تو وجہ ہے کہ غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک قانون زندگی کے علم و عمل کی درخواست کی اور تورات لا کر دی گئی جس سے واضح ہے کہ ان کے پاس کوئی قانون اور اس کا علم باقی نہ تھا ورنہ اس درخواست کی ضرورت نہ ہوتی۔ چنانچہ یہی برس ہا برس کی جہالت اور مصری بت پرستوں کی صحبت جو زمانہ

غلامی کی یادگار تھیں۔ باوجود محبت موسوی کے پھر بھی جاہلانہ حرکات پر انہیں گاہ بگاہ آمادہ کر دیتی تھی۔ اریحاء پر گزر رہا اور گائے کی صورت کے پیتل کے بت بچتے ہوئے دیکھے تو جھٹ فرمائش کر دی کہ ﴿يٰۤاَيُّهَا مُوسٰى اجْعَلْ لِّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمُ الْاِلٰهَةُ﴾ ① ”اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی خدا بنادیتے جیسے (ان اریحاء والوں) کے خدا ہیں۔“ جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی جہالت کا پردہ یہ کہہ کر فاش کیا کہ ﴿اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ ”تم ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کہتے ہیں۔“

اس پر بھی جہالت کا یہ عالم تھا کہ جب سامری نے سونے چاندی کا پھڑا بنایا تو قوم کا ایک بڑا حصہ اسی کی پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا۔ نہ انہیں موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں یاد رہیں نہ ان کے توحیدی و پند و نصائح کا کوئی دھیان رہا۔ ایمان باللہ کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے کہ ہم تو اس وقت تک ایمان نہیں لاسکتے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ کلام الہی کی خبر دی گئی تو بولے کہ: ہم کلام خداوندی کو کیسے مانیں جب تک کلام خود نہ سن لیں۔ تورات لا کر دی گئی تو عبادت کے لئے آمادہ نہ ہوئے حتیٰ کہ پہاڑ سروں پر لا کھڑا کیا گیا کہ ما نو ورنہ پچل دیئے جاؤ گے۔ تب کہیں عمل پر آمادہ ہوئے۔

غرض برس برس ہا برس کی جہالت کا یہ اثر تھا جو زمانہ غلامی کی یادگار تھی کہ ان کا تصور جب کبھی جاتا تو اللہ کی بجائے غیر اللہ ہی کی طرف جاتا تھا۔ معنویت کی بجائے صورت و حیات کی طرف اور لطیف و خیر خدا کی جگہ محسوس و مصور خدا ہی کی طرف طباع چلتی تھیں جو لاعلمی کا قدرتی نتیجہ ہے۔

حیثیت عرفی کی بربادی..... ادھر جب کہا پنا علم نہ رہا اور ہوتا تو اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی جب کہ حکومت اس علم کی نہ تھی تو مالی حیثیت کیسے درست رہ سکتی تھی۔ مفلس و نادار ہوئے۔ احساس خودداری نہ رہا۔ اولاً تو مجبور ہو کر اور بعد میں خود طبیعت کی جدید افتاد سے ذلیل خدمات سے پیٹ پالنا شروع کیا۔ یعنی چہر اسی، خانساں، بیر، مزدور وغیرہ بن کر گزران کی اور اونچی سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی حتیٰ کہ وہ اسی کو بہت کچھ جاننے لگے۔

فرعون کی سیاست نے صورت حال یہ کر دی کہ قبطیوں کے لئے تمام اونچے عہدے تھے بڑی بڑی تنخواہیں تھیں۔ زمینداریاں تھیں اور سطیوں کے لئے یہ ذلیل خدمات تھیں۔ وہ مثل اچھوت کے تھے جیسا کہ آیت گزشتہ میں ﴿يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ﴾ کا یہی مفہوم سامنے آچکا ہے۔ ہاں سطیوں میں سے اگر کوئی ترقی پا سکتا تھا تو نہ اپنے خاندانی علم و روایات کے لحاظ سے بلکہ وہی فرعون کی حکومت کے قانون کے علم سے۔ چنانچہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا اور ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بنی اعمام میں سے تھا۔ فرعون کا پیش کار بنا۔ اس کا علم کوئی پیغمبری علم نہ تھا۔ ورنہ اس علم سے اسے یہ عہدہ فرعون کی حکومت میں کیسے مل سکتا تھا بلکہ وہ علم وہی غیر ساوی علم تھا جو فرعون کا مال کا نتیجہ تھا۔ قرآن نے اسی علم کی طرف قارون کے قول میں اشارہ فرمایا جب کہ اس نے کہا تھا ﴿اِنَّمَا

اَوْثِيْتُهُ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِي ﴿١﴾ ”یہ مال و دولت مجھے میرے علم و ہنر کی بدولت دیا گیا ہے جو خود میرا اپنا ہے۔“
جو ظاہر ہے کہ فرعون کے عہد کے رائج شدہ رسمی علم کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا تھا ورنہ یہ عزت افزائی ممکن نہ تھی بلاشبہ اس کے لئے مال اور خزانے کے دروازے کھل گئے اور اس نے بے شمار مال سمیٹا جس کی قرآن نے شہادت دی ہے اس سے واضح ہے کہ مطلق طاقت چونکہ اپنا تمدن اپنا کلچر اور اپنا علمی سرمایہ پھیلاتی ہے، اس لئے مفتوح اقوام کے علوم کی حوصلہ افزائی کے دروازے بند کر کے اعزاز و تکریم سب اپنے ہی رائج کردہ علم کے لئے مختص کر دیتی ہے تاکہ اس کا کلمہ گھر گھر میں داخل ہو جائے اور محکوم قوم کی حیثیت عرفی، حیثیت اقتصادی سب اس نئے علم کے تابع ہو جائے اور محکوم قوم اس علم سے عزت بھی پائے تو اپنی نہیں بلکہ فاتح کی عزت کا سایہ حاصل کرے۔

اقتصادی تباہی..... اور اسی غلامی کی بدولت بنی اسرائیل کی عام اقتصادی حالت بھی تباہ ہوئی۔ چنانچہ بنی اسرائیل جب مصر سے بھاگ کر نکلے تو اپنے قطبی محلہ داروں سے ہی ان کا زرد زور لے کر باہر جانے کی ان میں ہمت ہوئی جو بنام قرض و عاریہ لیا گیا ورنہ اگر خود اپنا مال و متاع کافی ہوتا تو انہیں اسے ہی منگوانے سے فرصت نہ ملتی، اگر ان کی اپنی اقتصادی حالت اعلیٰ ہوتی تو کیا وہ اسی طرح مفلس و قلاش ہوتے جس کا انہوں نے مصر سے ہجرت کرتے ہوئے ثبوت دیا۔

خارجی تعلقات سے محرومی..... پھر بیرونی تعلقات بھی بنی اسرائیل کے منقطع تھے حتیٰ کہ خود ان کا اصل وطن اور ابراہیم علیہ السلام کا دفن (شام اور بیت المقدس) تک ان کے لئے اجنبی ہو گیا تھا اگر وہ خود اپنے وطن جاسکتے اور وہاں کا رابطہ قائم رہتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيَّ اِسْرٰٓئِيْلَ﴾ کے فرمان پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی پس نہ وہ جاسکتے تھے نہ عزت سے رہ سکتے تھے اور اسی لئے بعد نجات فتح بیت المقدس کے لئے انہیں مستطاب ارض مقدس پہنچنے پر آمادہ کیا گیا اور کہا گیا ﴿يَنْقُومُ اَدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ﴿١﴾ ”اے قوم! ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہارے حصہ میں لگایا ہے۔“

بہر حال فرعون کی حکومت نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کی علمی حیثیت اور تعلیمی منصب کو برباد کیا جس سے ان میں قومی روایات باقی نہ رہیں۔ ان کی منصبی حیثیت باطل کی جس سے اس میں احساس خودداری باقی نہ رہا۔ ان کی اقتصادی حالت برباد کی جس سے ان میں استغناء نہ رہا جو اخلاق فاضلہ کی اساس ہے۔ ان کے تعلقات ساری دنیا سے منقطع کئے رکھے حتیٰ کہ ان کے وطن اصلی سے بھی انہیں منقطع کر دیا جس سے ان میں غربت اور بے کسی قائم ہو گئی۔

برطانیہ کا طرز عمل..... اگر حقیقت یہ چار چیزیں غلامی کے عناصر اربعہ ہیں اور ضرور ہیں کہ قرآن حکیم نے ان کی طرف اشارے کئے ہیں تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ: کیا ہندوستان کے مسلمان غلام نہیں ہیں؟ اور کیا ان پر ایک اجنبی شہنشاہی مسلط نہیں؟ ضرور ہے اور جب ایسا ہے تو کیا فی الحقیقت مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی باشندوں کے ہاتھ

پیروں میں غلامی کے انہی ارکان اربعہ کی چار میخیں ٹھکی ہوئی نہیں ہیں؟ ضرور ہیں اور بلاشبہ خصوصیت سے مسلمانوں کو ان چار مقاصد کے لحاظ سے اس وجہ سے زیادہ کچلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھی۔ پس سب سے پہلے مسلمانوں کی روایتی تعلیم برباد کرنے کی کوشش کی گئی کہا گیا کہ: جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذہبی جنون کم نہیں ہو سکتا، جب تک اسلامی روایات ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں یہ احساس خودداری سے ریگانہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ابتدائے عہد حکومت میں تو متسلط حکومت نے مسلمانوں ہی کے طرز تعلیم کو جاری رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جدید طریق تعلیم رائج کر کے قدیم تعلیم اور طرز تعلیم کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم برباد کرنے کی برطانوی سازش..... اس سلسلہ میں خود انگریزوں کی شہادت زیادہ دو قیع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور چارگانہ شعبہ ہائے زندگی میں انہیں کس درجہ تک کچلا ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں کتاب ”ہمارے ہندوستانی مسلمان لکھ کر اس سلسلہ کے بہت سے حقائق سرکاری کاغذات سے واشگاف کر دیئے ہیں۔ موصوف مسلمانوں کی تعلیمی سلسلہ کی بابت ایک جگہ لکھتا ہے۔

”ہم اپنے دور حکومت کے پچھلے ۵۷ سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقہ تعلیم (مسلمانوں کے طرز تعلیم) سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے ماتحت پیدا ہو گئی۔ ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیر باد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری (سیاسی) زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ ①

پھر اسی ہنٹر کی کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا دار و مدار معافیات اور اوقاف پر تھا جو اسی مقصد تعلیم کے لئے مسلمان امراء اور حکام وقف کر جاتے تھے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ”صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افرمال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت تخمیناً صوبہ کی آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ (جوان معافیات کے سلسلہ میں تھا) حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی ۱۷۷۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پاسکی۔ بیالیس برس بعد ۱۸۱۵ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرات نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۳۸ء میں ۸ لاکھ پونڈ کے خرچ و مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پایا اور صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ گویا تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہو گیا۔

یہ آمدنی جب مسلمانوں کے قدیم صیغہ تعلیمات کے ہاتھ سے نکل گئی اور تعلیم قدیم کا اشاف اس سے محروم ہو گیا تو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ”سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی

نظام جس کا دار و مدار انہی معافیت پر تھا تہ وبالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ ①

آگے چل کر لکھتے ہیں ”لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کے چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائیداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔ ② اندازہ کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب ایک صوبہ میں تعلیمات پر ۴۵ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا تو دوسرے صوبوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا اور جب ۴۵ لاکھ کی رقم ایک صوبہ سے اڑائی گئی تو دوسرے صوبوں سے آمدنی کیا کچھ ہوتی ہوگی اور اس سے جدید تعلیم کی ترویج میں کس درجہ مدد ملی ہوگی۔

پھر جدید تعلیم اور جدید طریقہ تعلیم رائج کیا گیا اس میں مسلمانوں کے رجحانات کی رعایت کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ انگریز اپنے رجحانات رائج کرتے یا مسلمانوں کے رجحانات کی پرواہ کرتے جن کے مٹانے ہی کے لئے قدیم تعلیم مٹائی گئی تھی۔ اس لئے مذہبی تعلیم کا کوئی جزو اس تعلیم میں نہیں رکھا گیا، ہنر ایک جگہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کی غیر معمولی قلت کی وجوہات گناتے ہوئے لکھتا ہے۔ ”تیسرے ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔“ ③

آگے چل کر اس سے زیادہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ”ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے: کیا اسکے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کر رہے ہیں جو ان کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لئے از حد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔

بہر حال مسلمانوں کی قدیم تعلیم مٹا کر اور جدید تعلیم کو اسلامی رجحانات سے کلیۃً خالی رکھ کر مسلمانوں کو جس تعلیم میں لگایا گیا اس کا مقصد لارڈ میکالے کے مشہور الفاظ میں اس کے سواء کیا تھا کہ ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگریز ہوں۔“ چنانچہ یہ ثمرہ نمایاں ہو گیا آج اس تعلیم کے بعد کون سا ہندوستانی ہے جو مشرقیت یا الیشیائیت کا دلدادہ ہو۔ تہذیب انگریزی، تمدن انگریزی، لباس انگریزی، خیالات انگریزی، عقائد انگریزی اور مذہب تک انگریزی ہے۔

برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ..... بہر حال مسلمان علم سے تو یوں گئے اب مالی حیثیت ہو سکتی تھی جس سے دنیا میں انہیں فارغ بالی ہو سکتی تو اس کو ختم کر ڈالنے کی انتہائی سعی یہ کی گئی کہ صوبہ بنگال کے متعلق ہنر کہتا ہے۔ ”آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل

یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں۔“

آگے چل کر لکھتا ہے ”گزشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے (وسائلِ دولت منقطع کر دیئے جانے کے سبب) یا تو صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے (وسائلِ دولت سے) سر بلند کیا ہے۔“ اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر ۱۳۷۷ء کے دوامی بندوبست کے بارے میں جو اس وقت مسلمانوں کو کچلنے کے لئے حکومت کی ایک خاص پالیسی کے تحت کیا گیا لکھتا ہے۔ ”بائیں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پر فریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو۔“

اس پر فریب پالیسی کا اثر کیا ہوا؟ خود کہتا ہے ”اس بندوبست نے ہندو کلکثروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔ آگے آخری نتیجہ لکھتا ہے جو اس سارے تغیر و تبدل کا انتہائی مقصد تھا۔ ”مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔“

اس دور میں مسلمانوں کی آمدنی کے دو ہی بڑے ذرائع تھے محکمہ فوج اور محکمہ دیوانی دونوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کئے گئے تاکہ وہ مالی حیثیت سے انتہائی طور پر پست ہو جائیں۔ ہنٹر لکھتا ہے۔ ”ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے از حد ضروری تھا۔“

آگے ملازمتوں اور عہدوں کا ایک نقشہ دیا ہے جس میں مسلمانوں کو دوسری اقوام ہند کے مقابلہ میں صفر کے برابر کر دیا گیا۔ جب ان پر خود ان کے علم کے دروازے ہی بند کر دیئے گئے اور دولت بھی ان کی پر فریب طریقوں اور کھلے اندازوں سے چھین لی گئی تو ظاہر ہے کہ ان کا وقار منصب اور حیثیت عری کیا باقی رہ سکتی تھی۔

چنانچہ ہنٹر لکھتا ہے کہ ”دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ کفلی اور چراسی، دو اتوں میں سیاسی ڈالنے یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔“

ہاں جو ان کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر دل و دماغ انہیں دینے پر پختہ ہو گیا اور اس نے حکومت کی ڈگریاں حاصل کر لیں وہ بلاشبہ ان کا منظور نظر ہوا۔ اس نے مالی حیثیت سے ترقی کی اور غلامی کے باوجود کچھ مناصب پائے، جیسا کہ قارون بھی فرعون کے دربار میں بار پائے گئے تھے۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے ہنٹر نے یہ احوال صوبہ بنگال کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ہندوستان کے بقیہ خطوں کو ان پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ چونکہ اولاً صوبہ بنگال ہی کی سرداری انگریزوں کے قبضہ میں آئی، اس لئے انہوں نے سب سے اول صوبہ بنگال ہی کو تباہ و

پامال کیا اور غداری سے تباہ کیا۔ جس کا ہنر کو کھلا اقرار ہے۔ جب ان کی روش ایک صوبہ میں یہ رہی اور ایک مقرر شدہ پالیسی کے ماتحت یہ صورتیں عمل میں آئیں جو حکومت کی پالیسی تھی تو کیسے ممکن تھا کہ یہ پالیسی دوسری صوبوں میں بدل جاتی۔ لہذا جہاں بھی یہ حکومت پہنچتی وہ ایسا ہی کرتی چنانچہ اس کا جواب ہنر ہی اپنے الفاظ میں دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ ”میں یہ بھی بتا دوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کہ کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر میں اگر دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہے کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف کیا جائے۔“

اس سے واضح ہے کہ یہ حال صرف صوبہ بنگال ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا ہے۔ بنگال صرف نقش اولین کا محل رہا ہے۔ نقش ثانی اس سے بھی زیادہ مکمل ہو کر دوسرے صوبوں میں پڑا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی حمایت سے محروم رکھنے کے لئے برطانیہ کا گھناؤنا کردار..... بہر حال ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علم ”دین و دیانت منصب اور دولت کے لحاظ سے اس طرح بربادی گئی۔ مگر خارجہ پالیسی اس سے بھی زیادہ برباد کن رہی ہے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے بیرونی تعلقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا اور افغانستان سے لے کر ترکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا احتمال تھا کہ وہ باہر سے ان کے لئے کوئی وزن دار آواز اٹھاتے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے غم مہیا کئے گئے جن میں وہ مبتلا رہیں۔

چنانچہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج داخل ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام میں بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران و افغانستان کا مسئلہ، کہیں ایران و ترکی کا مسئلہ، کہیں ترکی و عربستان کا مسئلہ، کہیں شام و فلسطین کا مسئلہ، کہیں خلافت اسلامیہ کا مسئلہ۔ چنانچہ آس پاس کی آویزش سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف ترکی کے حصے بخرے ہوتے رہتے تھے۔ دوسری طرف خلافت اسلامیہ کے مٹانے کا مسئلہ چھڑا رہتا تھا۔ کہیں افغانستان پر دانت رہتا تھا۔ کہیں ایران جو بالاخر ہضم ہو کر براخلافت مٹ کر رہی۔ ایسے ایسے مسلمان کھڑے کئے گئے جو ان مسائل کو خود اٹھاتے اور آخر میں فیصلہ برطانیہ کے ہاتھ میں آ جاتا۔ برطانوی شہنشاہی سے دوستی کے رنگ میں وہ احکام صادر ہوتے جس سے نہ مدعی باقی رہتا نہ مدعا علیہ بلکہ دونوں کی میراث بچ کے ہاتھ میں آ جاتی۔

آزادی پسند مسلمانوں کو بدنام کرنے کی اسکیم..... ادھر ہندوستان میں جن دردمندوں نے دین اور ملک کی آزادی کے لئے آواز اٹھائی اور کھڑے ہوئے تو ان کے تعلقات عام مسلمانوں سے منقطع کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ سو وہ ہنر کے کتاب دیکھنے سے واضح ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ درجہ کی تدبیر یہ تھی کہ ان

آزادی پسند جماعتوں کو حسب بیان ہنراگریزوں کی طرف سے باغی اور آخر میں وہابی کا لقب دے کر بدنام کرنے کی مہم جاری کی گئی جس کی تفصیلات اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ یہ اسکیم عملاً آج تک جاری ہے۔ اب کیا کوئی اس کے خلاف بھی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہند کی پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی حکومت، ثروت، شوکت، حشمت اور دولت اور دیانت و دین اندرون و بیرون تعلقات میں جو گھن لگا اور وہ بالاخر ان تمام چیزوں کو کھا گیا وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کے نظام حکومت کے سوا کوئی اور چیز تھا؟

پس فرعون نے جو معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کہ انہیں ان کے علم سے بے بہرہ کیا پھر ان کی دولت کے چشمے خشک کئے پھر ان کی حیثیت عرفی زائل کر کے انہیں قلی، چپراسی، اور معمولی خدمت گاروں کے درجہ پر پہنچایا اور پھر ان کے تعلقات باہمی و بیرونی منقطع کئے وہی معاملہ برطانوی شہنشاہی نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جس کی تفصیلات میں ڈبلیو ڈبلیو ہنری کی کتاب سے خود انگریزوں کے مسلمات پیش کر چکا ہوں۔ غلامی کے ان اثرات کے بعد کون کہہ سکتا ہے؟ کہ غلامی پر کسی غلام قوم کا قناعت کئے رہنا موت کے مترادف نہیں ہے؟ اس لئے قرآن نے اسے بدترین عذاب اور اسے برپا کرنے والوں کو بدترین طاغی اور سرکش کا لقب دیا ہے۔ جیسا کہ آیت بالا کے ابتدائی کلمات ہی سے واضح ہو گیا۔

بنیادی مسئلہ..... ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لئے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے نہ اقتصادیات کا نہ اپنے اور اپنائے وطن کے تعلقات کا نہ منضی اور عرفی حیثیت کا بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سراہندوستان کے مسلمانوں کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا سراپوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں اور پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قانونی اور بین الاقوامی قوانین کی جکڑ بند یوں اور ساتھ ہی اندرونی ریشہ دوانیوں کی چھانسیاں لٹکی ہوئی ہیں جو دنیائے اسلام کو پنپنے نہیں دیتیں جس میں بلاشبہ ایک ہی ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ برطانوی شہنشاہی اور استبداد و استعجاب ہے جس کی گرفت کھول دینے کی ضرورت ہے۔

اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے نہ اولاً تو رات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ توجہ فرمائی جس سے مالی حالت درست ہوتی نہ امور کی طرف زیادہ التفات فرمایا جن سے حیثیت و عزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ ﴿أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ﴾ ① ”بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ بھیج“۔ تاکہ یہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی تعمیر با اختیار خود کرنے پر قادر ہو جائیں۔

پس آج بھی ہندوستانیوں کے لئے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند سے متعلق ہے تاکہ مسلمانان عالم اپنے دین و مذہب، اپنی سیاست اور اپنی اقتصادی و معاشرتی حالت کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر سکیں۔ پس مسلمانوں کے لئے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے انہیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

[3] جدوجہد آزادی ایک مذہبی فریضہ..... ادھر جب کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جا کر کہو ﴿اَنْ اَرْسِلَ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے انہیں نجات دے۔ تو آیت سے صراحت یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لئے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے مستظلاً ایک اولوالعزم پیغمبر علیہ السلام کی معیت عمل میں آئی، کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لئے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھہرتی؟ اگر اس وقت کی مصر کی اجنبی حکومت سے بنی اسرائیل کی آزادی تقریباً ضروری تھی تو آج ہندوستان کی اجنبی حکومت سے بھی مسلمانوں کی آزادی مذہباً ضروری ہے۔ بہر حال اس آیت ﴿اَفْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ﴾ سے غلامی کا اپنی ذات اور آثار کے لحاظ سے امر قبیح ہونا بھی واضح ہوا اور ساتھ ہی اس کے دفعیہ کی جدوجہد کا شروع اور وظیفہ شرعی ہونا بھی نمایاں ہو گیا۔

[4] حصول آزادی کا پروگرام..... اس کے بعد حصول آزادی کے پروگرام کا سلسلہ رہ جاتا ہے تو قرآن نے انہی آیات میں اصولاً اس پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ چنانچہ اس خطاب خداوندی ﴿اَفْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ﴾ سے جو بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ازلہ غلامی کی تدبیر کے وقت اولاً غلام قوم کو اس مرض کے سرچشمہ کی طرف نظر دوڑانی چاہئے کہ یہ غلامی کے جراثیم چلتے کہاں سے ہیں؟ آیت نے واضح کیا کہ بنی اسرائیل کی غلامی کا سرچشمہ فرعون کا طغیان تھا۔ جس کے رکن تھے استبداد اور استعباد استبداد کے ماتحت اس نے اپنی شخصی حاکمیت مطلقہ کا جال پھیلا رکھا تھا جس کا انتہائی ثمرہ اس کا دعوائے الوہیت تھا جس میں حاکمیت مطلقہ کے تمام حقوق اس نے اپنے لئے ثابت کئے اور کہا ﴿اَنَا رَبُّکُمْ اَلَا عَلٰی﴾ ① ”میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں“۔ پھر اپنے سوا ہر ایک غیر سے اس منصب کی نفی کرتے ہوئے کہا ﴿مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ﴾ ② ”میں اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں سمجھتا ہوں“۔

پھر جس ذات بابرکات کا یہ واقعی تہا حق تھا یعنی حق جل مجدہ، اس سے نہ صرف مقابلہ ہی کی ٹھانی بلکہ معاذ اللہ اس کی الوہیت کو بزعیم خود مٹانے پر تل گیا اور اپنے وزیر ہامان سے کہا ﴿فَاَوْقَدْ لٰی یَّهَامُنْ عَلٰی الطَّیْنِ

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۲۳۔ ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸۔

③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۲۔

فَاَجْعَلْ لِّىْ صَرَخًا لِّعَلِّىْ اُطْلِعُ اِلٰى اِلٰهِ مُؤَسِّسِ وَاِنِّىْ لَاطْنُہُ مِنَ الْكَذٰبِیْنَ ﴿۳۰﴾ ”تو اے ہامان! تم ہمارے لئے مٹی کو آگ میں پکواؤ (یعنی پختہ ایٹمیس بناؤ) پھر میرے واسطے ایک عمارت بناؤ تاکہ میں موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔“

اور استعباد کے ماتحت بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا جذبہ تھا جو فرعون میں کام کر رہا تھا۔ قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقولہ کے ضمن میں اس کی بھی حکایت فرمائی اور کہا ﴿وَلَسْتَكَ نِعْمَةً تَمُنُّهَا عَلٰى اَنْ عَبَدْتُ بَنٰی اِسْرَآءِیْلَ﴾ ﴿۳۱﴾ ”اور (مجھے پرورش کرنے کا احسان جلتا نا“)

سو وہی یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ (اس کے بدلہ میں) تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا (حالانکہ وہ نعمت نہیں وہ بھی تیرے ظلم ہی کا نتیجہ تھا نہ تو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرتا نہ میری ماں مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہاتی نہ وہ تیرے محل میں پہنچتا اور نہ تو مجھے پرورش کرتا۔ پس میری پرورش کا منشاء قتل اولاد بنی اسرائیل تھا جو تیرا انتہائی ظلم تھا۔

برطانیہ کا جمہوری استبداد..... ان آیات سے واضح ہے کہ استعباد (بنی اسرائیل کی غلام سازی کا) منشاء فرعون کا استبداد یعنی اس کی شہنشاہی تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ﴿اِنَّہٗ طَغٰی﴾ سے متنبہ فرمایا گیا۔

اسی طرح آج غلام ہندوستان کو محسوس کرنا چاہئے کہ اس کی غلامی کا منشاء برطانوی شہنشاہی اور اس کا استبداد ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں استبداد شخصی تھا یہاں قومی ہے۔ وہاں انفرادیت تھی یہاں اس پر جمہوریت کا پردہ پڑا ہوا ہے، مگر استبداد و استعباد کا جذبہ وہی ہے جو فرعون میں کارفرما تھا۔ فرعون نے اگر ملک مصر کی سلطنت پر مغرور ہو کر خدا کی دعویٰ اور خدا کے برتر سے مقابلہ کی ٹھانی تو آج کی یورپین مغرور بدست قومیں بھی اسی سریر آرائی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر خدائے حقیقی کے مقابلہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ جوشوئیک کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انہوں نے بالفاظ خود اپنی سلطنت میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دینے جانے کا اعلان کیا۔ جرموں کے ہاتھ میں خدا کی بخشش ہوئی حکومت آئی تو انہوں نے وطنی تعصب کے جذبہ سے کہا کہ: اگر خدا جرمین ہوتا تو جرمین قوم اسے مان سکتی تھی۔ برطانیہ کے ہاتھ میں وسیع ملک آیا تو اس کے بعض ذمہ داروں نے اپنی سلطنت کے طول عرض کو دیکھ کر کہا تھا کہ: اگر آسمان بھی ہمارے ملک پر گرنا چاہے گا تو ہم اپنی سنگینوں کی نوک پر اسے رکھ لیں گے۔

غرض یہ استبدادی دعوے وہی ہیں جو فرعون نے کئے تھے۔ اہر جو استعبادی جذبہ اس کا تھا وہی آج کی بدست اقوام کا بھی ہے جس کے ماتحت آج دنیا کی اقوام کو غلام بنائے رکھنے اور بنائے جانے کے منصوبے گاٹھے جاتے رہتے ہیں اور اس معاملہ میں آپس میں سودا بھی ہوتا رہتا ہے جو کہیں کھلے قبضہ کی صورت میں کہیں انتخاب کی صورت میں اور کہیں مداخلت اور دراصلی اثرات کی صورت میں نمایاں ہے اور: ﴿یَسْتَظْفِعُ طَآئِفَةٌ مِّنْہُمْ﴾

② کا وہی ظہور ہو رہا ہے جو فرعون کے وقت میں ہوا تھا۔ غرض سرچشمہ غلامی یہاں سے متعین ہو جاتا ہے۔

⑤ پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت..... بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اور مبعوث من اللہ ہونا اور انہیں ﴿اذْهَبْ اِلَىٰ فِرْعَوْنَ﴾ کا حکم دیا جانا اس کی صاف دلیل ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے لیے پیغمبری سے مدد لیا جانا ضروری ہے، یعنی پیغمبر کی قیادت میں حصول آزادی کا راستہ طے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر علیہ السلام اختراعی راستے نہیں بناتا بلکہ وحی الہی سے پیش کرتا ہے جس سے خدا کا بتلایا ہوا پروگرام سامنے آتا ہے۔ اس نکتہ کے ماتحت حصول آزادی کے تمام سیاسی نظریات و فکریات جو اختراع محض سے منصہ ظہور پر آتے ہیں اور آرہے ہیں۔ ختم ہو جاتے ہیں اور منشاء خداوندی یہ نکلتا ہے کہ اس سلسلہ کی لیڈر شپ کسی فلسفی یا طبیعی یا معاشی عالم کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے نبی و رسانی اور حقانی فرد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو وحی الہی کی مدد سے پروگرام بنانا جانتا ہو تاکہ وہ قوم کو نجات دلانے کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح بھی کر سکے جس کے فساد ہی سے یہ غلامی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں ورنہ بلا اصلاح نفوس نجات کے بعد اس مرض کے عود کر آنے کا خطرہ پھر قریب ہی رہتا ہے۔

پس جو شخص بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے حصول آزادی کی تدبیر کی پہلی کڑی صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبوت وقت یعنی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی قیادت میں گامزن ہو۔ جس کا واضح ترین پروگرام یہ قرآن اور اس کی مدونہ شریعت ہے جس کا ایک بازو اس کی اولین تفسیر یہ حدیث رسول اور دوسرا بازو اس کی فقہی تشریحات ہیں۔ لہذا مسلمان کسی ایسی قیادت کو تسلیم نہیں کر سکتے جو کتاب و سنت سے الگ کوئی نیا راستہ بتاتی ہو۔ ہاں کتاب و سنت کے معیار پر پرکھ کر بلاشبہ اس کے رد و قبول کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ:-

⑥ غاصب قوم سے حکم جہاد..... اب حصول آزادی کے لئے نبوت کا لایا ہوا پروگرام ظاہر ہے کہ اصولاً دو ہی نوعوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ تشدد اور عدم تشدد۔ سو اس کے مواقع اور عمل میں تفصیل ہے اگر فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اس کے وطن سے نکال باہر کیا ہو اور اس کے ملک ہی نہیں املاک پر بھی قبضہ کر لیا ہو جس سے وہ بے یار و مددگار ہو کر وطن سے بے وطن ہو کر در بدر بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس صورت میں استخلاص وطن کی صورت بقیادت پیغمبری تشدد ہے کہ قتال و جہاد کے ذریعہ اس ظالم اور غاصب قوم سے نبرد آزما ہو جائے اور اپنا وطن واپس لیا جائے۔

چنانچہ ارض مقدس (بیت المقدس) کے استخلاص کے لئے (جس پر علاقہ نہ قابض ہو کر بنی اسرائیل کو بے وطن بنادیا تھا) جہاد کا حکم ملا مگر بنی اسرائیل نے اس کی تعمیل نہ کی اور چالیس برس تک میدان تیر میں سرگردانی اور حیرانی کی زندگی بسر کرنے کی سزا بھگتی جیسا کہ قرآن پاک نے چھٹے پارہ میں اس کی پوری تفصیلات بیان فرمادی ہیں یا جیسے حضرت سموئیل کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے وطن پر جب جالوت نے قابض ہو کر انہیں ان کے دیار سے نکال باہر کیا تو بحکم پیغمبر طالوت کی قیادت میں انہیں استخلاص وطن کے لئے قتال و جہاد کا حکم ملا ﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰی

الْمَلَا مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى، إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَالَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا ۖ ﴿١﴾ ”(اے مخاطب) تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جوموسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا؟ جب ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ: ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ ان پیغمبر نے فرمایا کہ: کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں۔ حالانکہ اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں۔“

یا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن خیر میں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالا گیا اور آپ وطن سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تو مدینہ سے قوت فراہم کر کے استخلاص وطن کے لئے قتال کا حکم ملاتا کہ مکہ کو کفار سے آزاد کرایا جائے۔ ﴿اِذْ لِلَّذِينَ يُقَتْلُونَ بِاَنفُسِهِمْ ظُلْمًا وَّ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَن يَقُوْلُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ﴾ (۲) ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔“ بہر حال بے وطنی کی صورت میں استخلاص وطن کی صورت بعد فراہمی قوت تشدد ہے جو پیغمبر علیہ السلام یا مورین پیغمبر علیہ السلام کی قیادت میں کیا جائے۔

عدم تشدد کے ذریعہ احتجاج..... لیکن اگر فاتح قوم نے محض سلطنت و حکومت چھینی ہے محکوم قوم کو ان کے گھروں سے نہیں نکالا وہ بدستور اپنے وطن میں آباد ہیں مگر غلام بن کر نہ انہیں با اختیار خود باہر جانے دیا جاتا ہے اور نہ داخلی آزادی سے انہیں زندگی بسر کرنے دی جاتی ہے تو اس کا حل بغیاد و پیغمبر عدم تشدد ہے یعنی پرامن رہ کر حصول آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

فرعون کی شہنشاہی میں بنی اسرائیل کی یہی نوعیت تھی کہ نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت سے حکومت مصران کی تھی۔ مصران کا تھا جس پر فرعون نے قبضہ پایا اور بنی اسرائیل کو غلام بنالیا۔ انہیں مصر سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام یہ خواہش کیوں کرتے کہ ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَآءَ﴾ (۳) ”(اے فرعون بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے)“ اور مصر میں امن و راحت سے رہنے کی بھی اجازت نہ تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کیوں فرماتے کہ وَلَا تُعَذِّبُهُمْ (اور بنی اسرائیل کو ستامت)۔ پس ایسے ہی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۳۶. ② پارہ: ۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۹، ۴۰.

③ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۷۰.

برطانوی شہنشاہی میں بھی مسلمانوں کے لئے نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن، تو استقلال وطن کے لئے بھی موسوی طریقہ عدم تشدد اختیار کرنا پڑے گا اور حکومت سے احتجاج کیا جائے گا کہ انہیں آزاد کر دو۔

[7] عدم تشدد کے پانچ ہتھیار..... مگر جس طرح تشدد کے اسلحہ تیر و تفنگ اور توپ و بندوق ہیں ایسے ہی عدم تشدد کے بھی کچھ اسلحہ ہیں۔ جو اس جنگ آزادی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل ذکرہ سے طلب فرمائے اور ﴿اٰخُذْ بِالسِّلَاحِ﴾ فرمایا کہ اے اللہ! میں نے تجھ سے چند اسلحہ درکار ہیں۔ جو اس جابر بادشاہ کے مقابلہ کے لئے ناگزیر ہیں جن کو ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ سے شروع فرمایا۔ یہاں صرف ان معنوی اور اخلاقی اسلحہ کی تفصیل پر نظر ڈالئے جو آیت عنوان میں موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب فرمائے ہیں۔ یہ عدم تشدد کے پانچ ہتھیار ہیں جو مانگے گئے۔

پہلی چیز شرح صدر ہے کیونکہ جب تک کسی مقصد کے لئے سینہ نہ کھل جائے اور وہ مقصد دل کے اندرونی داعیہ اور جذبہ سے نہ ابھرے حوصلہ بلند نہ ہو آدی زور قوت اور وزن دار آواز سے اسے پیش نہیں کر سکتا۔ دوسری چیز تسخیر امر ہے کیونکہ اگر باوجود انشراح صدر کے ادھر سے اعانت و توفیق اور جہاں اسباب و وسائل نہ ہوں تو محض جذبہ اندرون کام نہیں دے سکتا۔

تیسری چیز حل عقدہ لسان ہے کہ اگر بلیغ انداز میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کلام میں فصاحت اور شیرینی نہ ہو تو مخاطب پر مقصد کا اثر نہیں پڑ سکتا اور اس اجتماعی مقصد میں نہ اپنوں کی جمعیت بن سکتی ہے نہ دشمن کی سوسائٹی ٹوٹ سکتی ہے بلکہ وہ تصدیق کی بجائے اور تکذیب پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

چوتھی چیز اعانت کار اور اشتراک عمل ہے کہ اگر کام میں اشتراک عمل نہ ہو اور کوئی بھروسہ کا معین و یا دوسرا ساتھ نہ ہو تو انفرادیت کے ساتھ یہ اجتماعی کام نہیں چل سکتا۔ نیز طبع بشری تنہائی کے ساتھ جب کہ وہ بے معین و مددگار ہو قرار بھی نہیں پکڑ سکتی۔ ساتھ ہی قلبی و باطنی مقاصد میں انفرادی و استقلال بھی میسر نہیں آ سکتا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عمرین میں سے ایک عمر کے اسلام کی دعا فرمائی تھی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حق میں مقبول ہوئی کہ انہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وزارت کا قلمدان مکمل ہونے والا تھا۔

اور پانچویں چیز جو ان سب کی روح اور معنوی قوت ہے وہ ذکر اللہ اور ذات بابرکات حق کی تسبیح و تقدیس ہے کیونکہ اگر توجہ الی اللہ نہ ہو تو نہ شرح صدر ہو، نہ تسخیر امر نہ حل عقدہ ہونا اشتراک عمل کی توفیق و تائید۔

یورپ کی غلامی سے نجات کا راستہ..... (الف) اس سے صاف ظاہر ہے کہ استقلال وطن کی مساعی کا آغاز ذکر اللہ، دعا، یاد حق اور توجہ الی اللہ سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ کے اجتماعات کی تقریریں مکالمے وغیرہ سب میں ذکر حق کی روح دوڑی ہوئی ہونی چاہئے اور ساری جدوجہد کا رجوع اور رخ بالا خروذات حق کی طرف ہونا چاہئے تاکہ اس اخلاص کی بدولت یہ کام نتیجہ خیز بھی ہو اور ظاہر و باطن کی صلاح و فلاح کی راہیں خدا کی طرف سے کھلتی رہیں۔

خلاصہ یہ کہ استخلاص وطن کی مہم دینی رنگ اور اسلامی ڈھنگ سے شروع کی جائے نہ کہ یورپ کی نقالی اور نمائشی مظاہروں سے، کام ٹھوس ہونا چاہئے نہ کہ رسمی۔ ورنہ جس غلامی سے گلو خلاصی کے لئے حرکت کی جائے گی وہی غلامی اور گلوگیر ہو جائے گی۔ گویا یورپ سے بچنے کے لئے یورپیہیت کا پھندا گلے میں آپڑے گا جو بچنا نہیں کہلائے گا بلکہ اور پھنسا کہلائے گا اور شرہ یہ ہوگا کہ ظاہر کی غلامی کے ساتھ باطن کی غلامی بھی سر پر پڑ جائے گی۔

اشتراک عمل کی ضرورت..... ان مرادوں میں کچھ چیزیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے طلب کیں جیسے شرح صدر تیسیر امر، حل عقدہ لسان۔ لیکن جو چیز سب سے اہم طلب کی وہ ﴿اَشْرِكْهُ لِيْ اَمْرِيْ﴾ ① ہے یعنی میرے اس کام میں میرے بھائی کو شریک کر دیا جائے جس سے واضح ہے کہ کسی آزادی کے سلسلہ میں اشتراک عمل اولین منزل ہے اور وہ بھی اپنوں کے ساتھ۔ اس سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ آج مسلمانوں کو باہمی اشتراک عمل کی اشد ضرورت ہے۔ غیروں سے پہلے انہیں اپنوں کو اپنانا چاہئے۔ جمعیت العلماء سے زیادہ کون اس کا حق دار ہے کہ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف وداد و محبت کا ہاتھ بڑھائے اور درمیانی رکاوٹوں کو آئینی اور رسمی انداز سے نہیں بلکہ واقعاتی انداز سے دور کر کے ٹوٹے ہوؤں کو ملانے کے لئے خود اقدام کرے۔ معاذیر نہ پیش کرے۔ بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اجتماعیت کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دے اور خود جھک کر دوسروں کو اپنے سامنے جھکا دے۔ خواہ وہ لگی ہوں یا احراری۔ حق تعالیٰ نے یہ تمام باطنی اسلحہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمادئے اور ارشاد ہوا۔ ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِيتَ سُوْلًا كَ يَمْوُئِيْ﴾ ② ”فرمایا بلاشبہ تمہاری مراد تمہیں دی گئی اے موسیٰ۔“

اور اس کے بعد تلی آمیز کلمات فرما کر پھر اس ابتدائی حکم کو اس طرح دہرایا گیا ﴿وَاضْطَنَعْنَاكَ لِنَفْسِيْ ۝ اَذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاَيُّيْ وَلَا تَبْتَغِيْ فِيْ ذِكْرِيْ ۝ اِذْهَبَا اِلَيْ فِرْعَوْنَ اِنَّهُ ظَلَمٰ ۝﴾ ③ ”اور میں نے تم کو (اے موسیٰ) اپنے لئے منتخب کر لیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کے جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت چل نکلا ہے۔“

⑧ معیار قیادت..... اس سے واضح ہوا کہ اس اجتماعی کام کے شرکاء اور وہ بھی منصب داران قیادت ذاکرین کی جماعت ہو، غافلین کی نہ ہو جنہیں نہ اللہ کی معرفت ہو نہ اس کی محبت ہو اور نہ اس کے طریق اور راہ سے واقفیت ہو کہ وہ مسلمانوں کے کام اسلامی حیثیت سے کبھی نہیں بنا سکتے۔ مگر ساتھ ہی اسے فراموش بھی نہ کرنا چاہئے کہ قوم میں جو لوگ کسی نہ کسی ہیئت سے بڑائی پیدا کر چکے ہیں اور مخلص بھی ہوں ان کی ادنیٰ تو بہن یا بے وقسی بھی گوارا نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اجتماعی کام میں افراد ہی کا نہیں اجتماعات کا وابستہ رکھا جانا بھی ناگزیر چیز ہے۔ ورنہ اجتماعیت عامہ پیدا نہیں ہو سکتی جو قومی حریت کے لئے اولین زینہ ہے۔ ہاں ان کی تقویٰ اور غلط روش کی اصلاح، شفقت و

محبت اور خلوص کے ساتھ ضروری ہے تاکہ وہ بھی بلا کسی جھجک کے امر حق کی طرف جھک آئیں اور لاعلمی کے سبب ان میں جو بعد سوء اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا وہ مبدل بہ قرب ہو جائے۔ غرض اس طرح سے دو پیغمبروں کو قائم بنا کر فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا۔

⑨ مذاکرات کی بنیاد..... یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حکمران کے پاس جانے والے (جو آزادی مانگنے کے لئے جا رہے ہوں) بحیثیت فرستادہ خدا جائیں نہ کہ ذاتی تقاضے سے روانہ ہوں جیسے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام از خود نہیں گئے، بھیجے ہوئے گئے۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت الہی پر عائد ہو جائے گی۔ قوم پر کوئی برائی اور آنچ نہیں آئے گی۔ غرض ان تمام کیفیات کے ساتھ ارشاد ہوا کہ فرعون کے پاس پہنچو۔ اسی موقع کے لئے دوسری جگہ قرآن میں یوں ارشاد ہے۔ ﴿وَاذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ ذَكَرْتُمُ يُسُفُونَ ۚ﴾ ① ”اور جب آپ کے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ تم ان ظالم لوگوں یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ کیا یہ لوگ نہیں ڈرتے۔“

⑩ حکومت اور قوم سے افہام و تفہیم کی ضرورت..... اس سے واضح ہوا کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں نہ صرف حکمران ہی کے پاس جانے کی ضرورت ہے بلکہ حکمران قوم کے پاس بھی جانے اور ان سے مل کر گفت و شنید کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ حکومت اپنے غرور میں مدعا پر کان نہیں دھرتی مگر حکومت کی قوم سمجھ جاتی ہے اور کبھی برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ بہر حال حکومت اور قوم دونوں سے اس بارے میں گفت و شنید ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان دونوں احکام سے دو خطرے لاحق ہوئے جن کو انہوں نے صفائی سے عرض کر دیا۔ حکومت سے تو زیادتی اور تعدی کا کہ فرعون کوئی جاہل و نادان نہ کر بیٹھے کیونکہ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی تو عرض کیا ﴿فَلَا رَبَّنَا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْفِئُ﴾ ② ”دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کر بیٹھے یا یہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔“

اور قوم سے خطرہ ہوا تعصب اور ہٹ دھرمی کا کہ بات نہ مانے اور مجھے چھوڑ دے کیونکہ وہ مستغنی تھی تو عرض کیا: ﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ﴾ ③ ”کہا اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں حق تعالیٰ نے جواب میں تسلی دیتے ہوئے فرمایا ﴿قَالَ لَا تَخَافْ إِنَّنِي مَعَكُمْ أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ ④ ”اور ارشاد ہوا تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ﴿كَلَّا فَاذْهَبْ بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَعِينُونَ﴾ ⑤ ”کیا مجال ہے سو تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ تم تمہارے ساتھ ہیں۔“ اس سے واضح ہوا کہ اگر فرستادہ خدا ہونے کی حیثیت سے احکام اور حکمران قوم سے ملا جائے گا تو مصرت کی

① ہارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیہ: ۱۰، ۱۱، ۱۲، ہارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیہ: ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳

ذمہ داری اللہ پر ہوگی۔ یعنی کام خدا کے نام اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام پر شروع کیا جائے تو پھر اس کے اثرات و نتائج دوسرے ہوں گے۔ اگر ہم اپنے اختراعی پروگراموں اور خود اپنی ذوات کے بل بوتہ پر کام شروع کریں تو اس کے نتائج اور ہیں۔ ان میں وہ قوت نہیں آسکتی جو پہلی صورت میں ممکن ہے۔

11 شعاع قیادت اس لئے آیت بالا میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو نہ صرف یہی حکم دیا گیا کہ بحیثیت فرستادہ خدا ہونے کے دربار فرعون میں جاؤ۔ اپنی طرف سے مت جاؤ اور نہ صرف یہی کہ ہمارا ہی پیغام پہنچاؤ اپنی طرف سے کچھ نہ کہو یعنی اختراعی پروگرام مت اختیار کرو بلکہ یہ بھی ارشاد ہے کہ انداز پیغام رسانی بھی ہمارا ہی متعین کردہ اختیار کرو بطور خود طریق ابلاغ بھی متعین نہ کرو اور وہ یہ کہ ﴿قُولُوا لَهُ قَوْلًا لِّئِنَّا﴾ ① ”پھر اس (فرعون) سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

یعنی مکالمہ میں بھی تشدد کا پیرایہ نہ آنے پائے۔ جبکہ یہ جنگ عدم تشدد کی جنگ ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو اس جنگ آزادی کے قائد اعظم تھے طبعاً تیز مزاج تھے اور ان کی شان جلالی واقع ہوئی تھی۔ افتاد طبع میں حدت اور شدت تھی۔

چنانچہ اس تشدد پسندی کے چند واقعات بھی ان سے ظاہر ہو چکے تھے، قطعی کوجوش میں تھڑمارا تو اس کی گردن الگ جا پڑی اور مر گیا، بچپن میں فرعون کا دعوائے الوہیت سن کر ایک دو چپت اسے بھی رسید کئے اس کی داڑھی پکڑ لی وغیرہ تو اندیشہ تھا کہ فرعون کے بے باکانہ اور گستاخانہ جوابات سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی طبعی رفتار پر کہیں اکھاڑ پچھاڑ کر کے نہ چلے آئیں اور نصیحت و شفقت یا اتمام حجت کا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے، اس لئے یہ تاکید دونوں حضرات کو شیریں زبانی اور نرم گوئی کا حکم دیا گیا تاکہ یا دشمن اس خوش اخلاقی سے مسخر ہو جائے اور یا پھر برملا اس کی تعدی واضح ہو کر کھلے بندوں اس پر جھٹ تمام ہو جائے۔

کون نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ جوش و خروش عیاذاً باللہ نفسانی نہ تھا کہ نبوت کی بارگاہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ بغض فی اللہ تھا جو شرعاً مطلوب ہے لیکن موقع کی نزاکت اور اجتماعیات کی تکمیل کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ اس جذبہ کو اگر چہ وہ دینی تھا مستور کر کے دوسرے دینی جذبہ رافت فی اللہ اور صبر و تحمل کو بروئے کار لایا آجائے کیونکہ مقصود اصلی صرف اتنا ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کر کے اپنا ذمہ بری کر لیں اور فرعون کو کہہ سن کر فارغ ہو جائیں بس فرض تبلیغ ادا ہو جائے، آگے فرعون اور فرعون جنت میں جائیں یا جہنم میں، نہیں بلکہ مقصود اصلاح اور تکمیل کا تھی اور فرعون کے پاس اس جذبہ کے ساتھ جانا تھا کہ وہ کسی طرح راہ راست پر آجائے نہ یہ کہ ہم پیغام پہنچا کر بری الذمہ ہو جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ قصد اصلاح و تربیت کے ساتھ مخاطب کے احوال کی رعایت کی جاتی ہے نہ کہ اپنے احوال

کی۔ اس صورت حال سے یہ مسئلہ نمایاں ہوتا ہے کہ آج بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے قائدین اور زعماء کا خواہ وہ کسی اجتماعی ادارہ کے ذمہ دار ہوں یا خود اپنے کام کے، شعار رافت و رحمت ہونا چاہیے، قول لین اور نرم گوئی ان کی شان غالب ہوتا کہ اپنے ٹوٹنے نہ پائیں اور غیر بیگانے نہ رہیں، غفلت قلب اور شدت ہمیشہ قطع کا باعث ہوتی ہے اور رافت ولینت ہمیشہ وصل و ملاپ کا سبب بنتی ہے بشرطیکہ اس میں مدد و نصرت اور استرضاء غیر اللہ نہ ہو۔ پس زعماء مسلمین زیادہ اہم ہیں کہ ﴿رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ ① کے مصداق بنیں اور ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ ہو کر حکمت اور رافت اور نصیحت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اقتدار کے فرعون سے طرز گفتگو..... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں حکومت متسلطہ کے مظالم اور آئینی انداز کی چیرہ دستیائیں مسلمانوں کی شوکت کو تباہ کرنے کی وسیع کاریاں، بیلا و اسلامیت کو چن چن کا پامال کرنا اور اسلامی شوکت کو مٹا کر نصرانی عظمت و انتداب کو قائم کرنا۔ مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کرنا۔ ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدوں کو پس پشت ڈال کر ان کی صریح خلاف ورزی کرنا، ہندوستانی اقوام سے جھوٹے وعدے کر کے انہیں احمق بنانا اور اپنا الوسیدھا کرتے رہنا، انہیں لڑا لڑا کر حکومت کی بنیادیں استوار کرنا وغیرہ وہ امور ہیں کہ حمیت اسلامی کے ماتحت ان پر مسلمانوں اور ان کے زعماء کو جس قدر بھی جوش ہو کم ہے اور جس قدر بھی وہ غیظ و غضب کا اظہار کریں انہیں حق ہے۔ فان لصاحب الحق مقالا لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مقصود اصلی جوش کا مظاہرہ کر لینا نہیں بلکہ اپنی آزادی اور مقابل قوم کو حق سے متاثر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب میں تاثر اور سیلان اظہار غضب سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ رقت ولین سے، موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ہم بغض فی اللہ کے حامل نہیں ہو سکتے لیکن انہیں بھی عدم تشدد کی جنگ کی صورت میں قول لین کا حکم دیا گیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون بغض فی اللہ سے متخلق ہو سکتا ہے اور وہ بھی بمقابلہ مشرکین مکہ جنہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا میں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی تھی کہ آخر کار وطن اور گھریار تک سے محروم کر دیا لیکن مکہ کی زندگی میں جو عدم تشدد کی زندگی ہے، خود حضور کو بار بار حکم ملتا رہا کہ صبر سے کام لو، تحمل سے کام لو، کسی جذبہ کا اظہار نہ کرو۔ شفقت و خیر خواہی خلق اللہ کو ہاتھ سے رہاں مالیاں کھا کے بے مزہ مت ہو۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَرْشِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ﴾ ① ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾ ② ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ ③ اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ۔ ﴿سو آپ صبر کیجئے جیسے اُولو العزم انبیاء نے صبر سے کام لیا اور جلدی نہ کیجئے۔ سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے۔ غرض آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجئے اور ان مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے یہ لوگ جو ہستے ہیں۔

① پارہ ۲۶، سورۃ الفتح، الآیہ: ۲۹۔ ② پارہ ۲۶، سورۃ الاحقاف، الآیہ: ۳۵۔ ③ پارہ ۱۴، سورۃ الحجر، الآیہ: ۹۴۔

④ شعب الایمان للبیہقی، فصل فی اسمائہ صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۳ ص: ۴۱ (قال البيهقي رحمه الله: هذا مرسل)

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہی رحمت اللعالمین ہوا۔ آپ کا لقب ہی رَحْمَةُ مَهْدَاةٍ ﴿۱۰﴾ ہوا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور خیر خواہی خلق اللہ کا یہ عالم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس غیر معمولی شفقت سے روک کر اس کی تعدیل فرمائی پڑی کہ: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ اَنْ لَا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ ﴿۱۱﴾ ”شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے۔“

بہر حال یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس عدم تشدد کی جنگ میں دشمنوں اور فرعون مفت دشمنوں کے سامنے قول لین کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار غیظ و غضب کی اور خود انہیں بھی ہدایت کرنے کی ضرورت ہے نہ تھا اپنی گلو خلاصی کی، اس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خطرہ ظاہر کیا کہ فرعون ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یعنی باوجود اس نرمی اور لہجیت کے بھی اس سے مان جانے کی توقع نہیں۔ بلکہ تہر اور ڈھٹائی کا ہی خطرہ ہے گویا ایسے سرکش کے لئے پھر نرمی کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی ارشاد ہوا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں کہ تم پر اس کی کوئی زیادتی اثر انداز نہ ہوگی۔ ہم دیکھتے سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔ تم تو ناصحانہ اور مشفقانہ انداز ہی سے بات کرو۔ مصلحت اور حکمت یہی ہے۔

﴿۱۲﴾ بلند بانگ دعوؤں کی ممانعت..... اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنگ آزادی کے سلسلہ کے قائدین متواضع اور بے تکلف ہونے چاہئیں جو اپنے دل کی ہر کھٹک کا بے تکلف اظہار کر سکیں حتیٰ کہ اپنی کمزوری صاف صاف کہہ سکیں اور کوئی رسمی وقار انہیں اظہار حال سے مانع نہ ہو نہ کہ فخر و شہی خورے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بایں قوت نبوت اپنے خوف کا اور دشمن کی طرف سے متوقع زیادتیوں کا جو خطرہ دل میں گزرا اس کا برملا اور بے تکلف اظہار فرمادیا کہ مجھے فرعون سے زیادتی کا خطرہ ہے اور اس کی قوم سے تکذیب اور ہٹ دھرمی کا۔

اس لئے آج ہمارے لئے بھی جبکہ ایک جابر حکومت کے سامنے مطالبے لے کر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اذعاء اور یہ فخریہ لب و لہجہ یا شہی کے کلمات کا اظہار کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا، ہمارے لئے یہ دعوے کبھی زیب نہیں دیں گے کہ نہ ہم حکومت سے ڈرتے ہیں نہ ہم پھانسی سے خوف کھاتے ہیں نہ ہمیں جیل کا ڈر ہے، ہم یہ کر ڈالیں گے اور وہ کچھ کر گزریں گے۔ خدا کرے ہمارے قلوب غیر اللہ سے ایسے ہی ٹڈا اور بے باک ہوں لیکن اعادہ تو پھر بھی ممنوع ہے جب تک کہ ادعا کی کوئی شرعی ضرورت ہی پیش نہ آجائے۔ ہمیں عموماً ہر حالت میں اور بالخصوص قوی دشمن کے سامنے پڑ کر اللہ کے لئے اعلان تواضع اور اعتراف ناتوانی میں ہرگز کوئی ادبی باک نہ کرنا چاہئے اور پروردگار کے سامنے بلاریب و شک اپنی صحیح حالت کا نقشہ رکھ کر ادھر سے امداد کی استدعاء کرنی چاہئے، کیونکہ تصنع کی بہادری کا رآمد ہے نہ تصنع کا مظاہرہ ہمارا راستہ حقیقت واقعہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آیت بالا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ سے واضح ہے تاکہ ساری ذمہ داری حکومت حق پر ہے اور ہم محض خدا کے ایک کارندے اور کار گزار کی حیثیت سے حکومت متقابل کے سامنے پیش ہوں۔

﴿۱۳﴾ مسلم قیادت کا اولین فرض..... ان ابتدائی معاملات کے طے ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا: ﴿لَا تَبْتَغُوا الْفَقُولَ إِنَّا رَسُولُ رَبِّكَ﴾ ﴿۱﴾ ”سو تم دونوں (فرعون) کے پاس جاؤں اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔“

اس سے واضح ہوا کہ قائدوں کی جماعت دربار حکومت اور حکمران قوم کے ایوانوں میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی پوزیشن صاف صاف واضح کر دے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا کہ جاتے ہی پہلے فرعون کو یہ بتا دو تم کون ہو؟ یعنی صاف صاف کہہ دو کہ ہم رسول ہیں اور فرستادہ خدا ہو کر آئے ہیں یعنی ہم خود نہیں آئے بیچھے ہوئے آئے ہیں ہم مذہبی پیغام لے کر آئے ہیں۔ اپنی کوئی رائے یا اپنی جماعت کی کوئی پاس کردہ تجویز پیش کرنے نہیں آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان قائدوں کا جو اوصاف مذکورہ سے متصف ہوں اولین فرض یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت اور حکمران قوم سے ملنے وقت صفائی سے اپنی پوزیشن واضح کر دیں کہ ہم مسلمان ہیں یعنی ہم بحیثیت ہندوستانی کے وطنی جذبہ سے نہیں آئے بلکہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی جذبات سے آئے ہیں ہم اول و آخر مسلمان ہیں نہ کہ اول مسلمان اور پھر ہندوستانی۔ ہم مذہبی اشارات پر آئے ہیں نہ کہ آراء و اختراعات پر۔ ہم ذاتی افکار و قیاسات سے کوئی پاس کردہ رزیولوشن لے کر نہیں آئے بلکہ اس مذہب کی دفعات لے کر آئے ہیں جو خدائے حاکم اور ملک الملک کا بھیجا ہوا ہے اور جس کو آزاد رکھنے کے تم بھی اپنی زبان سے مدعی ہو۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا مفاد تو یہ ہوگا کہ ہماری پوزیشن و ذنی اور موثر ہو جائے گی کیونکہ ترجمانی حق کی پوزیشن کا جو اثر مخاطبوں پر پڑ سکتا ہے وہ خود ہماری اپنی بنائی ہوئی رسی پوزیشن کا خواہ وہ انفرادی یا اجتماعی ہو نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ اسلامی پوزیشن بے ساختہ اور قدرتی ہے اور غیر اسلامی پوزیشن بہر حال بنائی ہوئی ہے اور بہ تکلف اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور وہ بھی انہی غیروں کی نقالی سے جن کے سامنے ہم احتجاج کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ مخاطب اس سے کسی عظمت و میلان کا اثر نہیں لے سکتے۔ بلکہ تفحیک کا جو ہمارے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر اور سخت خطرناک ہے کہ اس میں ہوا خیزی ہے، کا اثر لے لیں گے۔

قیادت علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے..... نیز اسلامی اور خالص دینی پوزیشن لے کر جانے اور اسے صاف لفظوں میں پہلے ہی واضح کر دینے کا دوسرا مفاد یہ بھی ہوگا کہ قیادت عامہ مخلوط نہ رہے گی بلکہ نکھر جائے گی اور قدرتی طور پر اس نوع کی قیادت اور دعوت لے کر وہی اٹھ سکیں گے جو حقیقتہً اس پوزیشن کے اعلان کی قوت اور اہلیت رکھتے ہوں گے، ہر کس و ناکس کو اس کی جرات نہ ہوگی کہ وہ پیغام بردار الہی بن کر اپنے یا اغیار کے پلیٹ فارم پر پیش ہو اور اس قیادت کی اہلیت صرف انہی افراد میں پائی جاسکے گی جو دینی اور روحانی رنگ میں اس پیغام کے

اثبات والیضاح اور اس کی طرف سے دفاع کی قدرت اور عملی ہمت رکھتے ہوں گے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ایک طالب علم یا علماء کا نام لیا ہوں کی حیثیت سے کسی جماعتی تعصب سے کام لے رہا ہوں اور خواہ مخواہ علماء کی قیادت اور مطاعیت کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ الزام اس وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ میں امت کو علماء کی ذوات کا پابند ہو جانے کی دعوت دوں۔ حالانکہ میری غرض علماء کی ذوات کی اطاعت پر مجبور کرنا نہیں اور نہ مجھے اس کا حق ہے بلکہ میں علماء حق کی زبان پر جاری شدہ قانون الہی کی اطاعت پر مجبور ہو جانے کی دعوت دے رہا ہوں، اس صورت میں قیادت قانون الہی کی آٹھکتی ہے نہ کہ علماء کی۔ مگر چونکہ قانون علماء کی ہی زبان سے مسوع ہوتا ہے اور کتاب الہی کی صحیح ترجمانی وہی کر سکتے ہیں اس لئے ضمانت ان کی اطاعت و قیادت بھی نکل آتی ہیں مگر بالذات نہیں بلکہ بالغیر۔

ساتھ ہی تعصب کا الزام دینے والے اس پر بھی غور کریں کہ علماء کا کوئی مخصوص خاندان یا قبیلہ نہیں کہ دوسرے قبائل کو ان کی طرف جھکنے پر مجبور کیا جائے، علم الہی کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر مسلمان ہر وقت عالم دین بن سکتا ہے پس اگر کسی غیر عالم کو کسی عالم کی اطاعت سے عار آئے تو اس کا علاج یہ نہیں کہ قانون الہی کو رد کرنے لگے بلکہ یہ ہے کہ خود عالم بن کر قائدوں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور قانون حق کی اطاعت کر کے دوسروں سے اطاعت کرائے مگر بہر صورت مسلمان رہتے ہوئے قوانین الہی کی اطاعت کرنا ناگزیر ہے۔ خواہ عالم ہو یا غیر عالم۔ پس جہاں میں غیر علماء کو پابندی قانون الہی کی دعوت دے رہا ہوں وہیں وہ دعوت علماء کے لئے بھی ہے، اس لئے تعصب کا الزام بے معنی ہوگا۔

[14] ترجمان رسالت حامل معرفت ہونا چاہئے..... یہاں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ ہارون علیہما السلام بفحوائے: اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ”ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔“

فرعون کے سامنے بحیثیت رسول کے پیش ہوئے نہ کہ بحیثیت اسرائیلی ہونے کے اور رسول مرئی مخاطبین اور ناصح اقوام ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنی قوم کی گلو خلاصی چاہتا ہے، اسی طرح مخاطب اقوام کی بہبود و فلاح کی فکر بھی ہمدردانہ کرتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام جس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑانے کے لئے فرعون کے پاس گئے اسی طرح خود فرعون اور فرعونوں کی اصلاح و بہبود بھی ان کے پیش نظر تھی کیونکہ رسول کے معنی ہی مرئی خلایق اور ناصح مشفق کے ہیں تو اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ مسلمانوں کے جو قائد بحیثیت ترجمان رسالت حکومت کے سامنے پہنچیں وہ صرف اپنی قوم کی گلو خلاصی پیش نظر نہ رکھیں بلکہ حکمران اقوام کی اصلاح و بہبود بھی ان کے سامنے رہے اور وہ جس طرح پیغام الہی کے واسطے سے وہاں پہنچیں اسی طرح اس پیغام الہی سے خود اس قوم کو بھی آشنا اور متاثر بنانے کی فکر کریں وہ صفائی سے مگر حکمت یہ کہیں کہ ہم جس اسلام کو اور اس کے واسطے سے مسلم قوم کو آزاد کرانے آئے ہیں، اسی اسلام کا تحفہ خود تمہارے لئے بھی لے کر آئے ہیں۔ مغلوب کا محارب کی صورت سے

سامنے آنا اور اثر رکھتا ہے اور اپنی خیر جوئی کے ساتھ مقابل کی اصلاح کا پرواز اختیار کرنا اور اثر رکھتا ہے۔
 آج کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حکمران قوم تک محکوم قوم کے پیغامات اور مطالبے یا پہنچتے ہی نہیں یا پہنچتے ہیں تو کورے سیاسی رنگ میں پہنچتے ہیں اور وہ سیاسی رنگ بھی خود حکمران قوم کا ہوتا ہے جس سے حکمرانوں پر ان مطالبات کی اصل دینی حیثیت واضح ہی نہیں ہوتی اور کسی درجہ میں ہوتی بھی ہے تو صرف اذعاء کے رنگ میں نہ کہ کیفیت اور حال کے درجہ میں یا کم از کم استدلال کے درجہ میں جو انہیں اس حیثیت میں متاثر کر سکے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالبات پہنچانے والے جو مسلمانوں کی نمائندگی کا فخر اپنے قلوب میں محسوس کرتے ہیں، نہ خود دین سے واقف ہوتے ہیں نہ دین کا کوئی رنگ اور حال و کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے مسلم قوم کے اصلی مزاج اور افتاد طبع کے مطابق وہ پیغام پہنچانے پر قادر ہی نہیں ہوتے بلکہ جیسے اور مختلف اقوام کی سیاسی پارٹیوں کے مطالبات رسمی طور پر حکومت کے کانوں تک پہنچتے رہتے ہیں اس طرح مسلمانوں کے مطالبات بھی قومی اور سیاسی رنگ میں انگریزیت کے ساتھ انگریز کے سامنے آ جاتے ہیں جن میں کوئی حقیقی اسلامی روح نہیں ہوتی جو دوسروں کو متاثر کرے۔

پس جو لوگ حکومت کے کانوں تک قوم کا پیغام لے کر جاتے ہیں وہ دین سے نا آشنا اور انگریز سے اس کی زبان میں بات چیت کرنے کے عادی اور ادھر جو لوگ دین سے واقف اور اس کا رنگ ڈھنگ لئے ہوئے ہیں وہ انگریز کی زبان اور اس کی ذہنت سے ناواقف پھر اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے بعید اور الگ تھلگ جن میں باہم کوئی سنگم نہیں بلکہ ہے تو بے اعتمادی یا ہمی ہے اور اسے بھی بڑھاتے رہنے کی کوششیں اپنوں اور اغیار کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں نہ کہ کم کرنے کی۔ ادھر ایسے جامع افراد مفقود ہیں جو دونوں زخوں کی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا صحیح پیغام اپنے اصلی رنگ میں مدعیان حکومت کے سامنے نہیں پہنچتا۔

طرزِ نبوت اپنانے کی ضرورت ہاں ان سب کا نعم البدل یہ ہے کہ علماء میں سے صرف وہ افراد جو عالم باللہ اور عالم بامر اللہ یعنی عارف ہوں روحانیت سے بھرپور ہوں، باخدا ہوں۔ اس پیغام کو لے کر انھیں اور اپنے مخلصانہ اور بے غرضانہ رنگ میں بطور انبیاء اس پیغام کو اپنوں اور متسلط اقوام کے دلوں میں اتارنے کا عزم باندھ لیں اور عامہ علماء ان کے نقش قدم پر چلیں تو پھر وہ جس زبان میں بھی کہیں گے تاثیر نمایاں ہوگی۔ دل معترف ہوں گے۔ خواہ زبانیں اعتراف کریں یا نہ کریں۔

پاری گوگرچہ تازی خوشتر است عشق را خود صد زبان دیگر است
 بوئے او دلبر چو پراں می شود این زبان ہا جملہ حیران می شود
 پس اگر صحابہ کی طرح عرفاء اس میدان میں آ جائیں اور استدلال کے بجائے حال سے کام لیں رسیات کی بجائے حقائق استعمال میں آنے لگیں اور سبکی لوگ ان کی پیروی کریں۔ تو زبانوں اور ذہنیات کی بخشش ہی درمیان

سے اٹھ جائیں گی، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس صورت میں تحریکات کا قالب اور ڈھانچہ کچھ بدل جائے گا اور روح بھی اس میں اسی کی مناسب پیدا ہو جائے گی اور پھر انداز حضرات صحابہؓ کی مساعی کا ہو جائے گا جس میں جذب و کشش باہمی بھی پیدا ہوگی اور دشمنوں پر ہیبت بھی پڑے گی۔

بہر حال جب تک اسلامی تحریک میں تبلیغی رنگ اور ناصحانہ درجہ نہ ہو اور دین کو آگے بڑھا کر رسیانہ انداز مغلوب نہ کیا جائے، اسلامی رنگ کا نتیجہ نہیں نکل سکتا مگر صد حسرت کہ یا اب ایسے افراد عنقاء ہیں یا سامنے نہیں ہیں یا ان کی پریشانی ہے۔

قوت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام..... ۱۶۔ پھر اس پیغام اور مطالبہ کا ابلاغ کیا ایک آدھ دفعہ کافی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس تبلیغ میں برسہا برس گزارے اور مختلف اندازوں سے مدعا سمجھایا اور واضح کیا۔ اسے ثابت کر کے خدا کی طرف سے اتمام حجت کیا اس مقرر اور مسلسل مطالبہ و تبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ حق مختلف جہتوں سے واضح ہو گیا۔ منکر فرعون اور فرعونوں پر خدا کی حجت تمام ہوتی گئی اور بالآخر پھر بھی اس کے انکار و ٹوٹ پر خدا کی طرف سے تنبیہات اور عذابوں کا سلسلہ شروع ہوا، قحط سالیاں اور مال و دولت وغیرہ کی تباہیوں نے فرعون پر یہ واضح بھی کر دیا کہ یہ ساری بلائیں ان شرعی اور خدائی مطالبات نہ ماننے ہی سے نازل ہو رہی ہیں۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے وقتاً فوقتاً اعتراف قصور کر کے فرعون دعا اور معافی کا طالب بھی ہوا مگر ساتھ ہی چرچل کی پالیسی پر جمار ہا اور سارے ہی مطالبے ٹھکرا دیئے جس سے موسیٰ اور موسویوں کے صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ پڑا اور ان کی مظلومیت سورج سے زیادہ نمایاں ہو گئی۔ آخر کار قبطیوں اور سبطیوں دونوں کے اعمال کے مطابق نتائج دونوں کے سامنے آگئے ضعیف قوم غلامی سے رہا ہو کر برسرِ اقتدار آئی اور قوی قوم غلامی نفس میں گرفتار ہو کر دنیا و آخرت کے مصائب کا شکار ہوئی۔ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کے واقعات کا جو جامع نقشہ کھینچا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے اور ترجمہ غور سے دیکھئے جو درحقیقت حاصل طلب اور مختصری تفسیر ہے۔ ارشادِ باری ہے: ﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصِ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ فَإِذَا جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ ۚ وَإِنْ تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ ۚ أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ① اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالیاں میں اور پھلوں کی کم پیداواری میں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔ سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، یاد رکھو ان کی نحوست اللہ کے علم میں ہے لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ کسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ ہم پر جادو چلاؤ، جب بھی ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں۔“

﴿فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالْغَمَامَ تَفْصِيلًا ۖ فَاسْتَكَبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ﴾ ① ”تو پھر ہم نے (کثرت بارش کا) طوفان بھیجا (اس سے گھبرا کے موسیٰ سے فرعونیوں نے عہد و پیمان کیا مگر طوفان کھلنے پر پھر اسی انکار پر اڑے رہے تو ہم نے ان پر) نڈیاں مسلط کیں (جو کہیتوں کو چاٹ گئیں پھر عہد و پیمان کئے مگر یہ بلا دور ہونے پر پھر بدستور اسی سرکشی پر جمے رہے تو ہم نے لائے ہوئے غلہ میں) گھن کا کیڑا پیدا کر دیا (پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور یہ بلا دور ہو کر جب مطمئن ہوئے کہ اب غلہ پیس کر کھائیں گے تو ہم نے ان پر) مینڈک مسلط کئے (جو ہجوم کر کے کھانے اور برتنوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہونے لگا اور گھروں میں رہنا بھی مشکل ہو گیا، پھر پینا یوں مشکل ہو گیا کہ) ان کا پانی خون ہو جاتا یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے سو وہ تکبر کرتے رہتے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جبرائیل پیش۔“

﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يُمُوسَىٰ اذْعُ لَنَا رَبِّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۖ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ﴾ ② ”اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ: ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے اگر آپ اس عذاب کو ہم سے اٹھا دیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) آپ کے ساتھ کر دیں گے۔ ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُمْ بِالْغُورَةِ إِذَا هُمْ يَنْكُحُونَ﴾ ③ ”پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک وقتِ خاص تک (کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا) اٹھا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔“

﴿فَلَمَّا تَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَعَارِبَهَا الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَثَّلَتْ لِرَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِيلَ ۖ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَذَمَرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ ④ ”پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری نشانیں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس زمین کے پورے پچھم کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر (یعنی مصائب سے نہ گھبرانے اور احکامِ نبوت پر جمے رہنے) کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پر داختہ کارخانوں اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو دریا میں بہم کر دیا۔“

فرعون اور بنی اسرائیل کے معاملات کا یہ قرآنی نقشہ سامنے رکھئے اور پھر برطانیہ اور ہندوستان کے کمزور

① پارہ ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۳۳۔ ② پارہ ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۳۴۔

③ پارہ ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۳۵۔ ④ پارہ ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۳۷۔

غلاموں کے باہمی معاملات پر غور کیجئے۔ جس درجہ میں انہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے میں مطالبات اور احتجاج سے کام لیا گو کہ وہ عشرِ عشر بھی ابھی تک زیرِ عمل نہیں آیا اور نہ کچھ پورے صحیح اسلوب پر پیش کیا گیا تاہم جس حد تک بھی کیا اور اس میں قید و بند کے مصائب کو جھیل کر صبر و استقلال سے کام لیا گیا۔ اسی حد تک ظالم قوم پر جت قائم ہو کر خدا کی طرف سے تنبیہات اور ظالم قوم کی طرف سے تھوڑا بہت مُردہ کر دیکھنے اور کبھی کبھی جھک جانے کا ظہور ہوتا رہا، گو ساتھ میں انکار و تجو د بھی بدستور قائم رہا۔

گذشتہ جنگ عظیم اور موجودہ جنگ اعظم تنبیہات کا ایک سلسلہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ موجودہ جنگ کے ذریعہ فرعون کی دور کی طرح حکمران قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور صنعت گاہوں کو وقف و فوجا تباہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی اونچی اونچی سربفلک عمارتیں زمین بوس بھی کی گئی ہیں۔

ان کے لاکھوں بڑوں اور چھوٹوں کو دریا برد بھی کیا گیا، اس سلسلہ میں جب کبھی شکست کا رخ سامنے آتا ہے تو یہ قوم فوراً مڑ کر غلام ہندوستان کی طرف دیکھنے بھی لگتی ہے اور دفع الوقتی کے طور پر کچھ پارلیمنٹری پارٹیاں آزادی ہند کا مسئلہ بھی چھیڑ دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جانے لگتی ہے۔ کبھی کرپس صاحب نمائی آزادی کا کھلونا لے کر ہندوستان کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کبھی سیاسی اسیروں کی رہائی کا مسئلہ بھی زیرِ غور آ جاتا ہے۔ کبھی ہندوستان کو طفلِ تسلی دینے کے لئے انہیں اختتامِ جنگ پر کسی حد تک نام کی آزادی کے وعدے دے دیئے جاتے ہیں، لیکن جوں ہی شکست کا پہلو کمزور ہو کر فتح مندی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر وہ سارے عہد و پیمان سارے رجوع ایسے کا فور ہو جاتے ہیں کہ گویا کسی زبان و قلم پر کبھی آئے ہی نہ تھے، وہی ایک چرچلی رٹ اور ہٹ سامنے رہ جاتی ہے، یعنی جب عذاب سامنے آتا ہے تو فرعونین کی طرح مظلوموں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ: **وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ** ”ہم عنقریب آزادی دینے والے ہیں۔“

اور جب وہ ایک تھوڑی سی مدت کے لئے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور یہ قوم اطمینان کا سانس لیتی ہے تو ﴿إِذَا هُمْ يَنْكُحُونَ﴾ ① پھر وہی عہد شکنی اور الغاءِ مواعید۔ لیکن اس لَئِثٌ وَلَعَلَّ اور ان حقیقت پوشیوں سے خدا کا آخری انتقام ٹلنے والا نہیں ہے۔ ضرور بالضرور یہ ہو کر رہے گا کہ جو لوگ کمزور شمار کئے جا رہے ہیں انہی کو اس زمین کے پورب اور پچھتم کا مالک بنایا جائے گا مکمل آزادی ظاہر ہو کر رہے گی اور جو قوت پر گھمنڈ کر کے کسی مطالبہ پر غور نہیں کرتے ان کے ساختہ پرداختہ کارخانے کلیۃً درہم برہم ہوں گے۔ ان کی اونچی اونچی بلڈنگیں سرنگوں ہو کر رہیں گی اور خدا کا نیک وعدہ کمزور اقوام کے حق میں پورا ہو کر رہے گا۔ ﴿وَنَمُتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی﴾ بشرطیکہ ان اقوام نے اسوۂ موسوی اور اسوۂ محمدی علیہما الصلوٰۃ والسلام سے روگردانی نہ کی۔

جہدِ مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں..... اور وہ یہی کہ خدا کے بھروسہ پر اور اس کے بتائے ہوئے رنگ

ڈھنگ پر تبلیغ اور اظہار مطالبات میں ایک آدھ دفعہ پر قناعت نہ کی جائے بلکہ موسوی انداز پر تسلسل کے ساتھ یہ مسابئی زور اور ہمت باطنی کے ساتھ جاری رکھی جائیں۔ غرض تبلیغ پیغام میں اگر تسلسل اور دوام پیدا ہو جائے اور مطالبات کا زور بندھا رہے ادھر اپنی قوم کی تعمیر بھی ممکنہ حد تک ہوتی رہے تو قدرتی طور پر اتمام حجت اور فیصلہ کن نتائج کی ایسی صورتیں سامنے آجائیں گی جن کا کافی الحال بظاہر اسباب تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

﴿وَمَنْ يُتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ ① میں یہ نہیں کہتا کہ علماء حقانی کے بتائے ہوئے قرآنی پروگرام پر چلنے سے پہلے ہی دن میں کامیابی سامنے جائے گی یا ساری مشکلات اگلے ہی دن ختم ہو جائیں گی یا مشق و تعب سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس پر صبر و استقلال کے ساتھ جم جانے سے غیبی امداد ساتھ ہوگی اور نتائج یقینی اور قطعی ہوں گے۔ اسوۂ موسوی میں اس حقیقت کو بھی دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ ② ”موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ: خدا کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنادیں اپنے بندوں میں سے اور اخیر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔“

اس پر قوم موسیٰ علیہ السلام نے ذرا گھبرا کر بے صبری سے کہا جیسے آج بھی کمزور دل کے انسان لگتے ہیں: ﴿قَالُوا أَوْزَيْنَا مِنْ قَبْلُ أَنْ تَأْتِنَا مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا﴾ ③ ”قوم کے لوگ کہنے لگے کہ: ہم تو ہمیشہ مصیبت میں ہی رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (یعنی آپ کی پیروی سے آخر نتیجہ کیا نکلا؟ غلامی بھی بدستور باقی ہے اور فرعون کی چیرہ دستیائیں بھی)۔“

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَذُوكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴾ ④ ”موسیٰ نے فرمایا: بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کریں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادیں گے۔ پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے یعنی ایسے کاموں میں جلد بازی نہیں چاہئے کام کئے جاؤ اور غیبی لطائف کے منتظر ہو۔“

پس آج بھی بنی اسرائیل کی طرح پیروی نبوت کے سلسلہ میں ابلاغ عام اور مسلسل مطالبات اور ضروری جدوجہد کی طویل مدت سے نہ گھبرانا مناسب ہے نہ تبلیغ کے تسلسل میں سستی رکھنا مفید وعدہ الہی پر بھروسہ اور اس کے جوارح کی حیثیت سے جنگ آزادی میں حصہ لینا اور لیتے رہنا اور اپنی انداز میں آگے بڑھنا اپنی قوم کی گلو خلاصی کے ساتھ مقابل قوم کو خدا کا سچا پیغام موثر پیرایوں میں پہنچاتے رہنا ہی اصل مشن ہے، جس پر وعدہ الہی کے

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیہ: ۳۰۲۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۳۸۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۲۹۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیہ: ۱۲۹۔

مطابق کامیابی یقینی ہے۔

دینی پیشواؤں کی قیادت میں آکر اگلے ہی دن کہنے لگنا کہ: ﴿أَوْذَيْنَا مِنْ قَبْلُ أَنْ نَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْنَا﴾ ﴿۵﴾ ”آپ کی رہنمائی سے قبل بھی یہی مصائب تھے۔ اور آپ کی رہنمائی کے بعد بھی ان میں کچھ فرق نہ پڑا۔“ منشاء نبوت کے بھی خلاف ہے اور فطری اُسوۂ حسنہ (صبر و استقلال) کے بھی خلاف ہے پس خدا پر بھروسہ کر کے اور رسمیات سے گزر کر حقائق کا دامن سنبھالتے ہوئے احتجاجی تبلیغی اُسوۂ اور تسلسل تبلیغ کی ضرورت ہے تاکہ اُمتِ اسلامیہ کا پیغام ہر کان میں گونج اٹھے اور گونج رہے۔

مطالبہ آزادی کے ساتھ تبلیغ کی ضرورت..... آج ہم تبلیغی سلسلوں میں اگر سوچتے بھی ہیں تو صرف اسی حد تک کہ اپنی قوم کو تبلیغ مسائل کر کے اس کی اصلاح کی فکر کریں اور بلاشبہ یہ بھی اہم فرائض میں سے ہے یا کوئی اونچا قدم اٹھاتے ہیں تو یہ کہ یورپ و امریکہ میں ہمارے مبلغ پہنچنے چاہئیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بھی مضائقہ نہیں لیکن کیا ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ سارے یورپ و امریکہ کا خلاصہ جو ہندوستان اور اس کی اقوام کو جو تک بن کر چوس رہا ہے اور دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے۔ ہماری بد بختی سے ہندوستان ہی کے تختہ پر جمع ہے کیا وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کے کان حقیقی انسانیت کے پیغام سے آشنا کئے جائیں تاکہ وہ خود بھی اس انسان نما حیوانیت کی دلدل سے باہر آئے اور اسی کے واسطے سے پھر پورا یورپ و امریکہ بھی متاثر ہو؟ کیا آج ہمیں ضرورت نہیں کہ جس اسلام کو ہم دنیا کا جامع ترین قانون سمجھتے ہیں، اور جسے ہم محض دینا ہی نہیں بلکہ سیاسی دین بھی جانتے ہیں ہم اسی شد و مد سے اس کو آج کی سیاست کے بنائے ہوئے اڈوں تک بھی پہنچائیں اور ڈپلومیٹک دماغوں میں بھی اسے اتارنے کی کوشش کریں جنہوں نے دنیا کو فطری سیاست سے ہٹا کر عیاری اور فریب بازیوں کی مصنوعی اور مہلک سیاست کے کچھڑ میں پھانس دیا ہے؟

ضرورت ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جہاں اپنی قوم کو سیاسی ابھارا دیں اور سیاسی جمود و تعطل کو دور کرنے کی فکر کریں وہیں ایک مستقل مشن اور مقصد کی حیثیت سے ان کا دائرہ عمل یہ بھی ہو کہ قوم کے قابل افراد کی حکومت پر بیٹھنے والوں کے کانوں کو نہ صرف مطالبہ آزادی ہی سے بلکہ اس خدائی قانون سے بھی آشنا کرتے رہیں۔ یعنی تبلیغ دین بھی کریں۔ اور نہ صرف دس بیس دن بلکہ مطالبہ آزادی اور احتجاج کے تسلسل کے ساتھ یہ پیغام رسانی بھی اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان مطالبوں کے نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہو جائیں۔

مثلاً اگر دس پانچ برس مسلسل طریق پر اسلام کے قانونی اور سیاسی پہلو اس کے ساتھ دینی و روحانی پیغام اخلاقی رنگ میں ان کے ذہنوں میں ڈالے جاتے رہیں اور اس تسلسل تبلیغ کے طبعی اثر سے دیا مند ارادہ طور پر یہ سمجھ جائیں کہ امن عالم کا راز اسی قانون الہی کے اجراء میں مخفی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود حکمران قوم کے بہت سے

فہم افراد دل سے ہمارے ہموان جانیں؟

اور پھر وہ کام جو حکومت سے باہر رہ کر ہم انجام دے رہے تھے خود حکومت کے دفاتروں سے انجام پانے لگے اور جو امور قومی پلیٹ فارم سے ہم بمشکل حکومت کے دل میں اتار سکتے تھے وہ حکومت ہی کے اپنے امور بن جائیں۔ ہاں اگر اپنی ان تھک ساعی کے باوجود پھر بھی ایسا نہ ہو یعنی فرعون کی حکومت کی طرح موجودہ حکومت کا انحراف و استکبار ہی بڑھتا رہے تو پھر یہ ہو کہ اس تسلسل پیغام رسانی سے من اللہ اتمام حجت ہو کر ایسی غیبی صورتیں نمودار ہوں کہ یہ قوم یا جبک جائے یا اس کا کروفریک لخت خاک میں مل جائے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے اور اس وعدہ الہی کا ظہور ہو جائے کہ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ① ”سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم ہوئے تھے اور ایمان والوں کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا۔“

لیکن یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ترجمان ملت خود دینی اور اخلاقی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے کردار اور رفتار و گفتار نیز وضع و قطع وغیرہ سے بندگی کے آثار نمایاں ہوں۔ چہرہ دل پر قلبی صداقت چمک رہی ہو اور زبان پر کلمات حق و حکمت جاری ہوں۔ وہ اپنے ظاہر سے فرشی ہوں اور باطن سے عرش ہوں اور پھر ان کا دیا ہوا پیام سیاسی اتار چڑھاؤ ڈپلومیسی اور قول کے خلاف قلب کے مخفی اغراض لئے ہوئے ہونے کے بجائے واضح صداقت و حقانیت اور دیانت و للہیت کا نشان لئے ہوئے ہو جس میں واقعی طور پر اپنی اور ساری اقوام عالم کی حقی خیر خواہی ملحوظ خاطر ہو جیسا کہ اسوۂ موسوی سے ابھی واضح ہو چکا ہے کہ فرعون اور فرعونوں کے پاس حصول آزادی کے لئے بھی جارہے ہیں اور ساتھ ہی کمال روحانیت و تقدس کے ساتھ پیغام الہی خود فرعون کو بھی پہنچا رہے ہیں اور اسے ربوبیت الہی سے آشنایا رہے ہیں اس کے دلائل ذکر فرما رہے ہیں کہ ﴿وَلَمَّا الْاٰلِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی﴾ ② رسالت کی حقیقت سمجھا رہے ہیں، پھر فرعون سے شفقت فرما رہے ہیں اور دلی خیر خواہی سے فرما رہے ہیں جس میں کسی رسمیت اور ضابطہ پری کا ادنیٰ شائبہ نہیں۔

فرعونان وقت کو قیادت موسوی ہی شکست دے سکتی ہے..... پھر عنوان بیان میں کوئی ادنیٰ جاہرا نہ یا حکمانہ انداز نہیں کہ ﴿هَلْ لَّكَ اِلٰی اَنْ تَزٰیجَیْ وَ اَهْلٰیْکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی﴾ ③ ”کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تو درست ہو جائے اور میں تجھے کو تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو ڈرنے لگے؟“ ظاہر ہے کہ اس صاف و صریح اور مقدس طریق خطاب کا جو اسوۂ موسوی اسوۂ محمدی اور اسوۂ جمیع انبیاء و انبیا بن نبوت ہے جو قدرتی اثر عام صلاحیت مند قلوب پر پڑ سکتا ہے وہ ہمارے سیاسی اتار چڑھاؤ کا کبھی نہیں پڑ سکتا ہے کہ ان رسی طریقوں میں دشمن ہم سے زیادہ ماہر اور زیادہ سے زیادہ چالاک واقع ہوا ہے چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۷، ② پارہ: ۱۶، سورۃ طہ، الآیۃ: ۵۰.

③ پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۱۸، ۱۹.

ہے ﴿إِنَّكُمْ لَنْ تَسْعَوْهُمْ بِأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ تَسْعَوْهُمْ بِأَخْلَاقِكُمْ﴾۔ ”تم اقوام دنیا پر اپنے مالوں (یعنی مادی وسائل) سے غالب نہیں آ سکتے البتہ اپنے خالق (یعنی معنویت) سے غالب آ سکتے ہو۔ پس ایک شخص کی رائے یا ایک جماعت کی پاس کردہ تجویز پھر انفرادی و اجتماعی ڈپلومیسی زیر بحث لائی جاسکتی ہے، لیکن خدائی پیغام میں جو صاف و صریح ہو آسانی اور معقولیت سے کوئی بحث نہیں کی جاسکتی، آراء و قیاسات کے اختراعات کردہ پروگراموں کے سلسلہ میں ایسے سرکاری افراد کھڑے کئے جاسکتے ہیں جو ان تجاویز میں بحثیں اٹھانے، انہیں رلانے کے لیے اپنی دماغی قابلیتیں جو اسی دن کے لئے ان میں پیدا کی جاتی ہیں صرف کریں یا ان کے خلاف مطالبات لے آئیں تاکہ حکومت کو گریز کے لئے سہارا مل جائے لیکن مذہب کے صاف و صریح پیغام کا جب کہ وہ ہمہ گیر اصلاحی رنگ اور روحانیت لئے ہوئے ہو، ان رسمی افراد سے معارضہ کرایا جانا آسانی سے ممکن نہیں۔

ہاں اس صورت میں یہ ضرور ممکن ہے کہ استبدادی شان سے سرے سے پیغام ہی رد کر دیا جائے اور فرعون کی طرح موسیٰ صفت افراد کو یہ کہہ کر سامنے سے ہٹا دیا جائے کہ: ﴿وَإِنِّي لَا ظَنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ﴾ ① ”میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یا فرعون کی طرح یہ کہہ کر آزادی خواہوں کو دھمکا دیا جائے کہ: ﴿لَا جَعَلْنَاكَ مِنَ الْمُسْجُونِينَ﴾ ② ”ہم تمہیں جیل بھیج دیں گے۔ یا یوں کہہ دیا جائے کہ: ﴿وَلَا صَلَّيْنَاكُمْ فِي جُدُوعِ النَّخْلِ﴾ ③ ”تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر پھانسی لگوا دیں گے۔“ یا یہ دھمکی دی جائے کہ ﴿سَنَقْتُلُ أَبْنَاءَ هُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَأَنَا فَوْقَهُمْ فَاهْرُونُ﴾ ④ ”ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے کیونکہ ہم کو ہر طرح کا غلبہ حاصل ہے۔“

یہ سب کہا جاسکتا ہے اور کہا گیا اور کیا گیا لیکن حقیقی حجت کو حجت سے رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس صورت سے پیغام کی جڑیں اور مضبوط ہوتی ہیں اور مخاطب قوم کی جڑیں غیر محسوس طریق پر کھوکھلی ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ فرعون نے اگر مذکورہ دھمکیاں دیں تو اس سے خدائی پیغام یا پیغام لے جانے والے کا سر کب نچا ہوا؟ بلکہ یہ ساری شکست و مغلوبیت آخر کار اس فرعون کے حصہ میں آئی جو قہر و غلبہ کا دعوے دار تھا۔

پس اگر آج بھی امت اسلامیہ کا پیغام اسی کے قائد موسیٰ صفت بن کر فرعونان وقت کے پاس لے جائیں اور لے جاتے رہیں تو یہ ممکن ہے کہ انہیں جیل، پھانسی، قتل وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں لیکن اس سے خدائی پیغام اور پیغام بروں کا سر نہیں نچا ہو سکتا اور نہ پیغام میں کوئی معقول حجت نکالی جاسکتی ہے بلکہ یہ امت کی جیت اور ان کے دشمنوں کی کھلی ہار ہوگی جس سے نبی ستارح کا برملا ظہور ہوگا اور یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ﴿لَوْ قَعَّ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ فَلَعَلُّوا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَاغِرِينَ﴾ ⑤ ”پس حق ظاہر ہو گیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا

① پارہ: ۲۰، سورة القصص، الآية: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورة الشعراء، الآية: ۲۹۔

③ پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآية: ۱۲۷۔ ④ پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآية: ۱۱۸، ۱۱۹۔

سب اکارت گیا پس وہ لوگ ہار گئے اور غوب ذلیل ہوئے۔“

خلاصہ یہ کہ عدم تشدد کی جنگ کے سلسلہ میں سب سے بڑا ہتھیار مطالبہ آزادی کے ساتھ مخاطب قوم کو پیغام حق مسلسل طریق پر پہنچاتے رہنا اور مقابل کی ہیکلیوں سے اور ہم چشموں کے استہزاء و تسخر سے بے نیاز ہو کر نبوی رنگ میں ہدایت دیتے رہنا ہے جس کے نتائج قطعی موعودہ حق ہیں اور ساتھ ہی نصرت غیبی یقینی ہے۔

اسلام میں آزادی کی غرض و غایت بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو رسول الہی بتلا کر تعارف کرانے اور اپنی پوزیشن واضح کر دینے کے بعد فرعون کو اولین پیغام یہ پہنچایا کہ ﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَآءَ يَلُّوْا وَلَا تَعْلَبْهُمْ﴾ ① ”(اے فرعون) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ کر دے۔ انہیں آزاد کر دے اور انہیں ستامت۔“

①..... اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام میں محکوم قوم کو حکمران قوم کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کرنا اور غلامی کے بدترین عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا فرض ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کے لئے ہی اللہ نے ایک اولوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے فرعون کے مبرے دربار میں پہنچ کر یہ مطالبہ صریح الفاظ میں پیش کیا جیسا اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

②..... اس موقع پر ایک نکتہ اور سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ کہ اس قومی انتظام میں پہنچنے والی اسرائیل کے آزاد کرانے کی غرض کوئی وطنی یا قومیت کی آزادی نہ تھی بلکہ مذہب کی آزادی تھی قوم کو بھی آزاد کرانا تھا تو مذہب ہی کی آزادی کے لئے الفاظ دیگر اس آزادی سے کوئی دنیوی ترغیب یا لہذا نڈ دنیا کی تحصیل و تحجیل یا کسی قسم کا رسمی جاہ و منصب مقصود نہ تھا کیونکہ اول تو حصول آزادی کے لئے پیغمبر کا انتخاب کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیغمبر سر تا پا دین ہوتا ہے اس کے افعال بھی دین اور ان کی غرض و غایت بھی دین۔ اس لئے پیغمبر کا آزادی مانگنا دنیوی اغراض کی خاطر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اس کو عنوان آیت سے یوں سمجھئے کہ ﴿اِنَّا رَسُوْلًا رَّبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَآءَ يَلُّوْا﴾۔ اس آیت میں ارسال بنی اسرائیل کو دعوائے رسالت پر بذریعہ فاقے متفرع فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ میں پیغمبر ہوں اس لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا ہوں اس سے واضح ہوا کہ مطالبہ آزادی کا فضاء پیغمبری ہے اور ظاہر ہے کہ دنیوی آزادی یعنی آزاد ہو کر متاع دنیا سے آزادانہ اتفاق خطوط دنیا کی ہوسنا کیلئے تعیش اور ترغیب وغیرہ کی آزادی پیغمبری کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس لئے پیغمبر ایسی آزادی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔

اس سے یہ مسئلہ صاف نکل آتا ہے کہ اسلام میں حصول آزادی کی غرض و غایت نہ روٹی ہے نہ مال و متاع۔ اگر آج ہم اپنے انٹیجوں سے روٹی اور معاشی رفقاہیت کی خسیس اغراض لے کر انھیں اور انہی فانی اور چند روزہ بہاروں کی کمزور بنیادوں پر اپنی مساعی کی عمارتیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ دن دور نہیں ہے کہ ہمیں اس بے جبر تعمیر سے تادم ہوا پڑے گا اور ہم عیاذ الہی اللہ اس کے مصداق ٹھہریں گے کہ ﴿اَلَّذِيْنَ جَبَلْ سَفِيْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ

① ہارہ: ۹: سورۃ طہ، الآیۃ: ۴، ② ہارہ: ۶۶: سورۃ طہ، الآیۃ: ۴، ③ ہارہ: ۱۶: سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۰۳

الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿٥﴾ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے استخلاص قوم کی مساعی کا آغاز تبلیغ دین سے شروع کیا۔ ربوبیت و رسالت کو بیچ میں لا کر آزادی کا مطالبہ کیا گویا غم و غصہ اس کا نہ تھا کہ ہماری دنیا آزاد نہیں بلکہ اس کا تھا کہ دین آزاد نہیں، ربوبیت و رسالت کے شعائر بلند نہیں ہیں۔ ربوبیت و رسالت کے منکر دنیا پر غالب آگئے۔ انہوں نے لادینیت کا فساد دنیا میں برپا کر دیا کہ جس سے دنیا مادیت کی خسیں اغراض میں پڑ کر سرکشی اور بغاوت حق میں مبتلا ہو گئی۔ ادھر ان دونوں دینی بنیادوں کے ماننے والے مغلوب ہو گئے، جس سے دیانت و امانت بے کس ہو گئی اور وہ دیانت کے احکام کو دنیا میں پھیلانے سے عاجز رہ گئے اور دین کے اجراء میں دست و پا بستہ ہو گئے ہیں۔ پس یہ شکایت نہ تھی کہ ہماری دنیوی راحت و آرام یا روٹی اور رہائش میں غرق پڑ گیا ہے۔

ہمیں کوٹھی اور بنگلے میسر نہیں رہے۔ ہمارے گھروں پر موٹر کاریں کھڑی ہوئی دکھائی نہیں دیتیں یا ہم اقلیت میں ہیں اور اکثریت ہمیں فنا کر دے گی۔ یا ہماری توہین ہو رہی ہے اور عزت و جاہ دوسروں کے حصہ میں آگئی ہے بلکہ شکایت فی الحقیقت صرف دیانت کے مغلوب ہو جانے اور آزاد نہ رہنے کی تھی اور جس حد تک اکثریت کی طلب یا عزت و جاہ کی طلب یا غلبہ و اقتدار کی طلب تھی وہ بھی صرف غلبہ دین کی خاطر تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تو مشاغل دنیا کے انہماک کی وجہ سے عذاب خداوندی سے ڈراتے اور پھر خود ہی اپنے مطالبہ آزادی کی غرض و غایت وہی شغل دنیا قرار دیتے عیاذ اللہ۔

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ آزادی کا حاصل یہ ہوا کہ افرعون! چونکہ تو خدا پرست نہیں اس لئے تیری ماتحتی میں بنی اسرائیل بھی خدا پرست نہیں رہ سکتے نہ ان کا شرعی علم باقی رہ سکتا ہے نہ ان کی روایات مذہب قائم رہ سکتی ہیں نہ ان کے عملی شعائر بلند ہو سکتے ہیں نہ ان کے مادی وسائل باقی رہ سکتے ہیں جو تقویت دین میں استعمال ہوں۔ اس لئے بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں خدا پرستی کی راہ پر پختہ کر سکوں اور تو بھی اپنے رب اور اس کے فرستادہ رسول کو پہچان اور مان۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبہ آزادی میں شکایت دنیا یا مصائب دنیا یا اقلیت و اکثریت کی بحثیں یا روٹی اور بوٹی کے مقاصد کا دخل نہ آنا چاہئے اگر یہ باتیں آئیں بھی تو غلبہ دین کے وسائل کی حیثیت سے نہ کہ مقاصد کے درجہ میں۔

مطالبہ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے..... پس مسلمانان ہندوستان کو صاف و صریح الفاظ میں مطالبہ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر کرنا چاہئے ان کے نزدیک مصائب دین اہم ہونے چاہیے نہ کہ مصائب دنیا کہ وہ دینی مصائب زائل ہونے پر خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اغیار کے تسلط و اقتدار کو اگر ہولناک باور کرایا ہے تو وہ دینی مصائب کی وجہ سے نہ کہ دنیوی مصائب کی بناء پر۔ چنانچہ ذیل کی دعاء نبوی میں گواقلیت و اکثریت، اکرام و توہین اور غلبہ و مغلوبیت کا ذکر ہے مگر مقصود اولین مصائب دین کے

ازالہ کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان سارے دنیوی مصائب کو بھی اگر تکلیف دہ سمجھا ہے تو دین کی خاطر نہ کہ دنیا کی خاطر۔ ارشاد نبوی ہے ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ مَصِيبَنَا فِي دِينِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا تَبْلُغْ عَلَيْنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُحِطِّمْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يُزِيلُ حَمْنًا﴾ ① ”اے پروردگار! ہمارے دین میں مصیبت نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا اہم مقصود نہ بنا اور نہ اسے ہمارا مبلغ علم بنا (کہ اس کے مادی انکشافات و اختراعات اور دنیوی زندگی کے جوڑ توڑ ہی کو سب سے بڑا علم سمجھنے لگیں) اور نہ ہماری رغبتوں کی آخری حد دنیا کو کر اور ہم پر کسی ایسے کو مسلط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کھائے۔“ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَقْضُنَا وَاکْبِرْ مَنَا وَلَا تُهِنَّا وَابْزِلْنَا وَلَا تُؤْزِرْ عَلَيْنَا۔ ② ”اے اللہ ہماری تعداد زیادہ کر کم نہ کر ہمیں اکرام نصیب فرما تو ہیں سے بچا، ہمیں غالب کر مغلوب نہ کر۔“

ذیل کی حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: روٹی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور فقر و فاقہ کوئی بنیادی مصیبت نہیں اصلی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کے دروازے کھل کر دین ضائع ہو جائے ارشاد نبوی ہے: وَاللّٰهُ مَا أَخْشَىٰ عَلَيْكُمْ الْفَقْرَ وَلَكِنْ مِمَّا أَخْشَىٰ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي زَهْرَةُ الدُّنْيَا تَفْتَحُ عَلَيْكُمْ فَنَهْلِكُكُمْ كَمَا أَهْلَكْنَاهُمْ ③ ”خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر و فاقہ کا کوئی ڈر نہیں لیکن جو چیز مجھے اپنے بعد خائف بنا رہی ہے وہ ہے دنیا کی سرسبزیاں جو تم پر کھلیں گی اور تمہیں اس طرح ہلاک کریں گی جس طرح پچھلی اقوام کو انہوں نے ہلاک کیا (اور جیسے آج کی قوموں کو برباد کر رہی ہے)۔“

اس حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پر ظاہر فرمایا جبکہ ایلاء کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ تک خانہ نشین رہے ہیں اور حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر دیکھا کہ بیت نبوت میں کل سامان ایک چمڑے کا مشکیزہ ہے جس میں کچھ شہد ہے اور ایک چٹائی ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور اس کی تیلیاں بدن مبارک پر اکھڑ آئی ہیں تو آزرده ہو کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یہ قیصر و کسری دشمنان حق تو نرم نرم گدیلوں پر آرام کریں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چار پائی بھی میسر نہ ہو۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر کشائش فرمائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو خطاب فرماتے ہوئے تنبیہ کے طور پر فرمایا اَفَنِيْ شَكَّ اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَايَا؟ هَؤُلَاءِ الَّذِينَ عَجَلْتَ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ (اَوْ كَمَا قَالَ) ④ ”اے خطاب کے بیٹے! کیا تو ابھی تک شک میں پڑا ہوا ہے (یہ قیصر و کسری) تو وہ لوگ ہیں جن کی نعمتیں دنیا ہی میں دے کر ختم کر دی گئی ہیں اور آخرت میں ان

① السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة المؤمنون ج: ۱۰ ص: ۴۵۲۔

② السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة المؤمنون، ج: ۱۰، ص: ۴۵۲۔

③ السنن لابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ المال، ج: ۱۱، ص: ۴۹۹۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن ابن

ماجہ ج: ۸ ص: ۴۹۵ و رقم: ۳۹۹۵۔ ④ الصحيح لمسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء، ج: ۷، ص: ۷۴۴۔

کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے (کیا یہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر رشک کیا جائے)۔“

اہل اللہ چونکہ وارثان نبوت ہوتے ہیں اس لئے ان پر بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کی یہ شان غالب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو جب مکہ کے حرم محترم میں برطانیہ کے کارندوں نے اسیر کیا اور گرفتاری کا پروانہ دیا گیا تو فرمایا کہ الحمد للہ۔

بہ مصیبت گرفتار آدم نہ بہ مصیبت ”خدا کا شکر ہے کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوا نہ کہ معصیت میں۔“ جس سے واضح ہے کہ معصیت دینی مصیبت ہے اس لئے اس میں جہلانہ ہونے پر شکر الہی ادا فرمایا۔ اس سے نمایاں ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دنیا کی مصیبت کوئی چیز نہیں نہ وہ کوئی قابل شکایت امر ہے کہ تغیرات دنیا ہیں اور مغائب اللہ بنی آدم کے ہی مصالح کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی ان سے کفارہ سیات مقصود ہوتا ہے اور کبھی ترقی درجات۔

اہم مصیبت دینی مصیبت ہے اور دینی مصیبتوں کا انتہائی اور جامع درجہ یہ ہے کہ دین آزاد نہ رہے اور دین دار غلامی میں مبتلا ہو کر شعائر دین کو آزادانہ برپا نہ کر سکیں۔ پس آج بھی جبکہ ہندوستان میں دین آزاد نہیں۔ اس کے شعائر کو مسلمان خاطر خواہ قائم نہیں کر سکتے نہ اپنے اختیار سے شعائر دین کو بلند کر سکتے ہیں۔ تو آیت ہلاکی رو سے حسب اسوہ موسوی ان کا اسلامی فرض ہے کہ مکمل آزادی کی جدوجہد کریں دین کے نام پر کریں۔ دینی رنگ میں کریں، دینی افراد کو ذریعہ کریں، عام افراد میں دین اور دین کی اہمیت کے جذبات پیدا کریں کہ مطالبہ آزادی کی غرض و غایت ہی اسلام میں دین کی آزادی ہے۔ جس پر دنیا کی آزادی بطور خاصیت کے خود بخود مترتب ہوتی ہے۔ اسلامی آزادی کے دور راستے..... چنانچہ اسلام میں حصول آزادی کے دو ہی راستے ہیں۔ جہاد اور ہجرت پھر ان دونوں کے دو دوفرز ہیں۔ جہاد باللسان یعنی اسلحہ سے جنگ کرنا اور جہاد باللسان یعنی کلمہ حق ظالم بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دینا۔ ایسے ہی ہجرت کے بھی دو ہی فرد ہیں۔ ایک ہجرت مکانی یعنی دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے ہجرت ارکانی یعنی معاصی چھوڑنا اور موطن طبیعت سے منتقل ہو کر موطن شریعت میں جانا ظاہر ہے کہ ان دونوں امور جہاد اور ہجرت میں سے کسی ایک کی غرض و غایت بھی روٹی یا لہذا نڈ دینا یا رفاہیت و تنعم یا حلقہ عاجلہ نہیں بلکہ صرف دین کی آزادی و برتری کا قیام ہے۔ جہاد کی غرض تو واضح ہی ہے کہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے جیسا کہ کتاب و سنت کی سینکڑوں تصریحات اس بارے میں موجود ہیں۔ ہجرت بھی اس لئے نہیں کرائی گئی کہ لوگوں پر وسائل معاش تنگ ہو گئے تھے اور ان کی روٹیوں میں گھانا آنے لگا تھا تو انہیں دارالکفر ترک کر دینے کا حکم ملا ہو بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے دین پر مصیبت آنے لگی تھی۔

چنانچہ اوائل اسلام میں دو ہی ہجرتیں ہوئی ہیں۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ مگر دونوں کی غرض مشترک تحفظ دین تھی نہ کہ تحفظ معاش۔

چنانچہ ہجرت مدینہ میں چونکہ یہ غرض زیادہ علوم و تربیت کے ساتھ نمایاں ہوئی اس لئے ہجرت مدینہ، ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہجرت حبشہ میں تو مہاجرین کو صرف اپنا دین محفوظ کرنا تھا اور اس کی صورت فرار عن لفظن کی تھی یعنی دین میں فتنہ خلل ہوتا تھا تو جائے فتنہ کو چھوڑ دیا گیا تاکہ دین محفوظ رہ جائے اور ہجرت مدینہ میں نصرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین کی شوکت کا مقصد سامنے تھا یعنی محض اپنا دین بچالے جانا مقصود نہ تھا بلکہ شوکت کے ساتھ دوسروں تک دین کی منادی اور تبلیغ کر دینا بھی مقصود تھا بلحاظ مقصد دونوں ہجرتیں محمود و مستحسن تھیں کہ محض اپنا دین محفوظ رکھ لینے کی خاطر دار الکفر کو چھوڑنا بھی عین دین ہے اور دین کو سر بلند کرنا بھی دین ہے۔ لیکن پہلی صورت میں ایک حد تک اپنے ضعف اور کمزوری کا اعلان بھی ہے جس کو براہ راست اعلاء کلمۃ اللہ نہیں کہہ سکتے اور دوسری صورت میں نصرت نبی کی خاطر گھریا چھوڑنا ہے۔ جو بلا واسطہ اعلاء دین ہے۔ اس لئے یقیناً ہجرت مدینہ ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کا لفظ بول کر تادیر کے ساتھ علی الاطلاق ہجرت مدینہ ہی سمجھی جاتی ہے کہ وہی ہجرت کافر دکانل ہے۔ غرض کوئی سی بھی ہجرت لے لی جائے کسی ایک کا مقصد بھی تنگی معاش سے بچنا یا مصائب دنیا سے نکل آ کر گھر چھوڑنا نہ تھا اور کسی حد تک یہ چیزیں اگر پیش نظر بھی ہوئیں تو صرف دین کی غرض سے ہوئیں اس لئے ہجرتین کا مقصد بھی آخر کار وہی اعلاء کلمۃ اللہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرماتے ہوئے اس کا کوئی افسوس ظاہر نہیں فرمایا کہ میرا آبائی وطن اور جدی گھر مجھ سے چھوٹ رہا ہے، عزیز واقرباء چھوٹ رہے ہیں، مانوس سرزمین چھوٹ رہی ہے بلکہ بیت اللہ کو حسرت سے دیکھ کر یہ فرمایا کہ ”اگر میری قوم مجھے وطن سے نہ نکال دیتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔“

جس سے واضح ہے کہ ہجرت کے سلسلہ میں نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن پیش نظر تھا نہ قبیلہ و خاندان بلکہ اللہ اور بیت اللہ مکہ کا شہر یا ملک جازا اور قوم بھی اگر کسی درجہ میں نگاہوں کے سامنے تھی تو وہ اللہ اور ذکر اللہ یعنی دین اور اعلاء دین کے لئے تھی نہ کہ براہ راست اور بالذات۔

خلاصہ یہ کہ جہاد اور ہجرت حسی ہوں یا معنوی اور ان کا کوئی سافر د ہو صرف اس بناء پر عمل میں آتے ہیں کہ لادین قومیں جمعہ و جماعات، تبلیغ و موعظت، اقامت حدود اور سد ثغور وغیرہ میں حارج ہوئیں اور دین کے سر بلند ہونے میں آڑے آئیں نہ اس لئے کہ وسائل معاش کی تنگی روٹی اور کپڑے کی گرانی، عیش و لذت، راحت کی کمی اور اس کی تحصیل و تکمیل میں فرق آ گیا تھا اور اس سے بچنا مقصود تھا۔ اگر اس سے بچنا مقصود ہوتا تو اسلام میں فقر وفاقہ اور خشونت عیش کے فضائل ہی کیوں بیان کئے جاتے۔ اس لئے آج جو جہاد اکبر یعنی اعلاء کلمہ حق عند سلطان جازا کا مقصد لے کر مسلمان کھڑے ہوں اور کھڑے ہیں تو اس میں بھی ایک لمحہ کے لئے ان کے قلوب میں شکایت معاش یا شکایت ترف و نعم پیش نظر نہ رہے۔ صرف تحفظ دین اور اعلاء کلمہ حق طوطا رہنا چاہئے اور وہی ساری جدوجہد

کی غرض و غایت ہو جسے غیر مشتبہ الفاظ میں بھی واضح کر دیا جائے۔ پھر ایسے ہی تدابیر کے سلسلہ میں اقلیت و اکثریت یا اہانت و تکبریم کا سوال پیدا نہ ہونا چاہئے یعنی ان رسمیات سے مطلوب نہ ہونا چاہئے بلکہ ان پر غالب آنا چاہئے جس انداز سے بھی ممکن ہو جیسا کہ آیت بالا کے اشارہ اور نصوص و حدیث سے واضح کر دیا گیا ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی دربار میں جو کچھ نیابت الہی میں ارشاد فرمایا وہ حجت و دلیل سے فرمایا: اور اپنی رسالت پر خدا کی آیات پیش کیں یعنی معجزے دکھلائے۔ عصاء موسوی دکھلائی جو لاشعی سے سانپ اور سانپ سے لاشعی بن جاتی تھی۔ ید بیضا دکھلایا جو گریبان میں ڈالنے سے سورج کی طرح روشن ہو جاتا تھا اور پھر اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا جس کی جواب دہی سے فرعون عاجز ہوا اور اس کے سوا اسے کچھ بھی جواب نہ بن پڑا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادوگری کا الزام لگائے۔ چنانچہ یہی کیا اور ملک کے جادوگر جمع کر کے مقابلہ کرایا۔

اور انہوں نے بھی اس لاشی کے سانپ کی شکل کے ہزار ہا سانپ جادو کے زور سے بنائے مگر چوں کہ ان میں حقیقت کچھ نہ تھی اس لئے جادو گر سب کے سب عاجز ہو گئے اور انہیں تسلیم و رضا کے سوا چارہ نہ رہا۔

﴿۱۶﴾ مطالبہ آزادی میں اعجازی جہت کی ضرورت..... اس سے صاف ظاہر اور واضح ہوا کہ آج بھی جبکہ استخلاص قوم کے لئے متسلط اقوام کے حلقوں میں قائدین اسلام جائیں، تو ہر دعوے کے ساتھ جہت بھی پیش کریں اور وہ بھی معجزہ ہی تاکہ مخاطب قومیں اس کے ماننے پر عقلاً مجبور ہو جائیں اور جواب نہ لاسکیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون کے سامنے معجزہ موسوی پیش کیا گیا تھا جو لاشی کا تھا اور فرعون ان وقت کے سامنے معجزہ محمدی پیش کرنا چاہئے جو کہ قرآن کریم ہے اور تمام دلائل و براہین کا مجموعہ۔ ﴿وَبَيْنَا لِكُلِّ شَيْءٍ وَرَحْمَةً﴾ کیونکہ فرعون کا رنگ حاکمانہ تھا تو وہ لاشی ہی سے قائل ہو سکتا تھا اور فرعون ان وقت کا رنگ حکیمانہ ہے تو علم و حکمت سے ہی قائل ہو سکتے ہیں۔

فرعون نے اپنے ملکی جادوگروں کو تقرب درباری، کرسی اور انعام و اکرام کے وعدوں کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈال کر عصا موسوی کے سانپ کے، ہم شبیہ لائیں اور رسیوں کے سانپ بنوائے مگر وہ محض ”تخیلاتی تھے۔ ﴿فَإِذَا جَاءَهُمْ وَعَصِیْهُمْ یُخِیْلُ إِلَیْهِمْ مِنْ سِجْنِهِمْ أَنَّهُمَا تَسْعٰی﴾ ① ”بس یکا یک ان جادوگروں کی رسیاں اور لائیں (جو سانپوں کی صورت میں ان کی نظر بندی سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے چلتی دوڑتی ہوں“۔ اس لئے یہ سب کید و مکر ختم ہو گیا اور سارے سانپوں کو موسوی اڑدھا نکل گیا۔ معجزہ کے سامنے سب جادوگروں نے سپرین ڈال دیں۔

بعینہ آج بھی یہی صورت ہوگی کہ جب فرعونان وقت کے سامنے معجزہ محمدی (قرآن) کے دلائل و براہین پیش کئے جائیں گے یا پیش کئے گئے ہیں تو انہوں نے اسی ملک کے جاہل مولویوں مگر جادو بیان لکچراروں کو کھڑا کر دیا کہ وہ مضامین قرآن ہی کے ہم شبیہ مضامین اور اسی کے استنباطات کے مشابہ وجوہ مستنبط پیش کر کے تلمیس

① باره: ۱۶، سورة طه، الآية: ۶۶.

ابلیس کریں جس پر ان کے لئے انعام و اکرام اور ہر قسم کی سرکاری رعایتوں کے وعدے ہوتے ہیں۔ مخفی نالیوں سے اس روپیہ کا یہ گندہ پانی ان کے گھروں میں بہتا ہوا پہنچتا رہے۔ ان ائمہ معطلین سے فرتے جنتے ہیں وہ کتاب و سنت ہی کے نام پر اہل حق کے مقابلہ پر آتے ہیں اور عصاء قرآنی کے مشابہ ہزار ہا عصی (لائعیاں) تخیلاتی بنا بنا کر میدان میں پھینکتے ہیں۔ ہزاروں ٹریکٹ رسالے اور تفسیریں، قرآنی تفسیروں اور فقہیات کے مشابہ سامنے آتی ہیں۔ حتیٰ کہ نبی قرآن کی طرح انبیاء بھی کھڑے کر دیئے جاتے ہیں جو اہل حق کو کذاب و مبطل کہہ کر اپنی گورنمنٹ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بعثت ہی اس حکومت کی حمایت کے لئے ہوئی ہے۔ ہم اگر اس کے فضائل بیان کریں تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔

کوئی کہتا ہے کہ: قرآن میں مومن قانت، متقی وغیرہ کے الفاظ کا مصداق ہی موجودہ گورنمنٹ کے افراد و اجزاء ہیں۔ ان جادو گروں اور ان کی میدان میں ڈالی ہوئی ان لائشیوں اور سانپوں سے جو اہل حق کے خیال میں کبھی کبھی چلی دوڑتی دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ مسلمانوں میں خیالات کا تشعب اور تفرق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دل جمعی خاک میں مل کر قوت منتشر ہو جاتی ہے اور حکمرانوں کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ اور جم گئے۔ لیکن جب یہ شعبان قرآنی اپنی پوری شان کے ساتھ کسی موسیٰ صفت عالم کے ہاتھ پر نمایاں ہوتا ہے تو بلاخران سارے سانپوں کو نکل لیتا ہے اور ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ کا ظہور ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جادو بیان لیکچرار گورنمنٹ سے کٹ کر حق کے سامنے سر بھی جھکا دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم اب تک غلطی اور تلبیس میں پھنسے ہوئے تھے ﴿هَٰؤُلَاءِ سَوَّيْنَا لِكَافِرِينَ مَآثِرَ مُؤْمِنِينَ﴾ جس سے اس قسم کی تلبیسات کا آئے دن پردہ چاک ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ آزادی خواہ طبقہ جو مطالبہ اور جو نصیحت بھی فرعون کی درباروں میں پیش کرے، حجت و برہان یعنی احادیث اور آیات قرآن سے پیش کرے، دینی رنگ میں پیش کرے، سلف کے انداز میں پیش کرے۔ اس تمسک و استدلال کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ہر ہر جملہ کی دلیل کتاب و سنت ہوتا کہ اس کا منجانب سرکار الہی ہونا ظاہر ہو جائے اور اس کی بات مذہبی سمجھی جائے جس کا کسی سے بھی جواب نہ بن پڑے اور جواب دیا تو جواب کی جادوگری کا پردہ اسی آیت الہی سے چاک ہو جائے۔

پس ہمارے لئے اس میں کوئی فخر نہ ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی تقریر و تحریر کو عین اس سیاسی اور معاشی انداز میں پیش کیا جس انداز سے عصری سیاست کے وکلاء اپنے مقالے پیش کرتے ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان میں قرآن و حدیث کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا نہ حصصاً نہ استنباطاً اور محسوس ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ مقالہ کسی طالب علم اور منہک کتاب و سنت کا ہے کیونکہ اس کا آغاز و انجام قومیت محض، معاش، خالص ملکی مفاد اور صرف ریکی تعاون سے ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے اول و آخر اور ظاہر و باطن کی ہر ایک جنبش صرف کتاب و سنت اور اس کے صحیح استنباط سے ہو اور یہی رنگ ہماری طرف خواص و عوام میں منسوب ہو جائے

کیونکہ ان کے ہر خطاب و ابلاغ ہر پیام اصلاح و تہذیب اور ہر ایک مطالبہ و احتجاج کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ: ﴿قَدْ جِئْنَاكَ بِبَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ مِنْ أَتْبَعِ الْهَدَى﴾ ”ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور سلامتی ایسے شخص کے لئے ہے جو راہ پر چلے۔“

یعنی نہ خود آئے نہ کوئی اختراعی حجت لے کر آئے بلکہ دونوں چیزیں من اللہ ہیں اور اسی لئے صحیح و سالم وہی رہے گا جو اس رسالت الہی کی پیروی کرے گا ورنہ ہمارے ہی ہاتھ پر اس کی تباہی من اللہ نمایاں ہوگی کیونکہ ﴿إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى﴾ ① ”ہمارے پاس خدا کی طرف سے یہ حکم پہنچا ہے کہ (قہر خداوندی) کا عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلاوے اور روگردانی کرے۔“

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ساری پیغام رسانی میں جو مناجات اللہ اور بامر اللہ تھی، اولین مقصد فرعون سے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ ﴿أَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَءِیْلَ﴾ (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج۔ اور اپنے بچہ ظلم سے انہیں رہا کر کے انہیں آزادی دے) ظاہر ہے کہ اس ارسال بنی اسرائیل اور انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیج دینے کا یہ مطلب نہ تھا کہ انہیں مصر سے شام بھیج دے یا ہم ملک مصر چھوڑنے کے لئے بنی اسرائیل کو تجھ سے لینے آئے ہیں بلکہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنا پابند اور غلام رکھنے کی بجائے میرے ساتھ ہونے دے تاکہ وہ میرے ساتھ ہو کر جس طرح چاہیں آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔

⑫ انتخاب امیر اور تشکیل مرکزیت اس سے واضح ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کے اوپر سے فرعون کی امامت ہٹا کر رسول خدا کی امامت و امارات قائم فرمانا چاہتے تھے کیونکہ فرعون کی امارت سے ان میں غیر اللہ کی پرستش کے مہلک جراثیم سرایت کر جاتے اور موسوی امامت سے ان میں صرف خدائے واحد کی اطاعت و عبادت کے پاک جذبات گھر کرتے۔ تو کیا اس سے یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا کہ حصول آزادی کے سلسلہ میں مسلمان اپنا ایک امام اور امیر منتخب کریں جو ایک طرف تو حسب استطاعت اطاعت شریعت کے ساتھ ان کی دینی تربیت کرے ان کی اسلامی تنظیم کرے ان کے معاملات و محاکمات کو شرعی دائرہ میں رکھے اور ایک طرف دشمنان دین سے جائز مطالبات بھی کرے اور نہ صرف اپنے مامورین بلکہ ان نا جائز آمرین کو بھی راہ حق دکھلائے۔ رب اعلیٰ اور اس کی رسالت حقہ سے انہیں بھی آشنا بنائے۔ اگر مسلمان فوضویت اور لامرکزیت کی زندگی بسر کرتے رہے تو نہ ان کا دینی تہمت زائل ہو سکے گا نہ دنیوی تفرق۔ یہ غرض نہیں کہ مسلمان اس مغلوبیت کے عالم میں خلیفہ المسلمین اور امیر المؤمنین بنائیں کہ اس کے لئے طاقت اور قہر غلبہ شرط ہے بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک مرجع الامر تسلیم کر لیں جو ان میں دینی تہمت اور افتراق نہ ہونے دے اور حتی الامکان ان کو اخلاقی قوت سے معاملات شرعیہ پر جمائے رکھے تاکہ وہ جب بھی غلبہ پائیں تو انہیں اس انقلاب کے تشویش ناک دور میں از

سرنو کسی نظام اور مرکزیت کی تشکیل کرنی نہ پڑے بلکہ پہلے ہی سے ان کا ایک قائم شدہ نظام کا ڈھانچہ بنایا موجود ہو اور وہ اسی میں حسب غلبہ طاقت، طاقت کی روح پھونک دیں۔ چنانچہ آزادی کے سلسلہ میں چونکہ خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کو مصر چھوڑنا پڑا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زیر قیادت ان کے نظام کی تشکیل ایسی قائم شدہ موجود تھی کہ ایک اشارہ موسوی پر چھ سات لاکھ بنی اسرائیل نے راتوں رات مصر چھوڑ دیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ بحر قلزم کے کنارے پر تھے۔

پھر فرعون اور فرعونوں کی غربتابی کی بعد جب کہ بنی اسرائیل کی طاقت کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ انہیں کوئی نیا نظام بنانا نہ پڑا تھا۔ امام حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جن سے قوم میں مرکزیت قائم تھی اور مقتدی سارے بنی اسرائیل تھے جس سے سب وطاعت کا نظام قائم تھا، ڈھانچہ موجود تھا۔ روح آتے ہی وہ زندہ ہو گیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں موجود ہے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں اشد ترین ضرورت ہے کہ حسب طاقت مسلمان بھی اپنے لئے کسی ایک شخصیت کو پہلے ہی سے امیر تسلیم کئے رہیں اور اس کے ذریعہ اپنی شرعی تنظیم کئے رہیں۔ آج وہ اخلاقی ہے کل کو وہ رسی ہو جائے گا جس میں قہر و غلبہ پیدا ہو جائے۔

⑩ صفات قیادت..... مگر ہاں اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ امیر موسیٰ صفت ہونا چاہئے یعنی دور تبی کے بعد امیر و امام نائب نبی اور وارث نبی ہونا چاہئے جس میں اوصاف نبوت کا پورا پورا غل ہو اور ظاہر ہے کہ نبی کے بے شمار اوصاف کمال کا خلاصہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔

ایک علم لدنی جس پر نبوت کا مدار ہے یعنی وہ علم اکتسابی اور کتابی نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے بلا توسط اسباب القاء خدا ہوتا ہے جس کا چشمہ نبی کے قلب سے پھوٹتا ہے جو محسوساتی علوم کے اوہام و ظنون اور شبہات سے پاک ہوتا ہے اور قطعیت و یقین کی شہدک لئے ہوئے ہوتا ہے جس سے سینے معمور ہو جاتے ہیں اور سکون و طمانیت قبول کرتے ہیں۔

دوسرے معصومیت کہ نبی کی ہر نقل و حرکت حلقہ سے پاک ہوتی ہے ہر چیز اللہ کے لئے کی جاتی ہے جس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ گمراہی کا شائبہ ہوتا ہے نہ ضلالت کا۔ غرض علم خدائی ہو جو اسی کے مخفی راستوں سے آیا ہو اور عمل عبدیت خالصہ کا ہو جس میں ضلالت نہ ہو تو یہی کمالات نبوت کا سر منشاء ہے جس سے آگے تمام کمالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پس حقیقی ورثانہیاء حص حدیث العلماء و زفۃ الانبیاء۔ ⑪ "علماء وارثان نبی ہیں۔"

علماء ہیں تو ان سے اس قیادت و امارات کے سلسلے میں وہی علماء مراد ہو سکتے ہیں جن میں یہ دونوں باتیں حسب درجہ و استعداد پائی جاتی ہوں جن کا علم لدنی ہو، جن میں علم کے ساتھ معرفت بھی ہو، جن کا قلب مورد علم خفی ہو، وہ اسرار تشریع کے مفکر اور مبصر ہوں اور علوم ظاہری کے ساتھ انہیں علوم باطنی سے بھی کافی مناسبت ہو، وحی کی

بجائے القائے ربانی اور الہام باطنی ان کا مربی ہو اور ساتھ ہی نبض شناس امت بھی ہو۔ حوادث و وقائع اور غطین کی ذہنیتوں پر انہیں عبور حاصل ہو اور جو مصداق ہوں حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کے۔

بنی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید استاد

گویا مطلقاً عالم ہو نایا کتابوں کے درس و تدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ باین معنی ان میں وراثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بنی اور ترددات سے بالاتر ہو۔

ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو۔ تقویٰ و طہارت اور احتیاط و حزم کی وجہ سے ان کا رویہ نذاتی گمراہی کا ہونہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا وہ صَلُّوْا وَاَصْلُوْا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں۔ پھر جبکہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کر لیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ”لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِيْ عَلٰی الضَّلَالَةِ“ ① ”میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی (یعنی ساری امت کامل کر کسی گمراہی پر اجماع کر لینا ناممکن ہے بلکہ ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی وہی جماعت منصور ہوگی)۔“

جس سے واضح ہے کہ اہل حق اور ان میں بھی علمائے حق کہ جن کی بدولت لوگ اہل حق بننے ہیں اور ان میں بھی پھر جماعت علماء جبکہ خود ایک اجتماعی شان بھی پیدا کر لے یعنی جمعیت بنا لے وہ انشاء اللہ سب کے سب مل کر امت کو گمراہی کی لائن پر نہیں ڈال سکتے۔

پس اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقی معنی میں نبی کا صحیح قائم مقام پوری امت اجابت اور اس امت میں بھی اس کی بقاء کی اصلی روح علماء ربانی کی جماعت ہوتی ہے اور اسی کو امت کا امام یا امیر کہنا چاہئے لیکن مرکزیت قائم کرنے کے لئے اگر یہی جماعت اپنے میں سے کسی ممتاز شخصیت کو امیر بنا لے اور خود اپنے اسی محفوظ بلکہ ایک حد تک معصوم اجتماعی علم فہم سے اس کی مشیر و معین ہو جائے تو صحیح معنی میں یہی امیر بواسطہ جماعت نائب اور وارث رسول بنی کہلوئے گا، جو ماتحت جماعت، اجتماعی نصرت، و تمہیبات کے سبب کمالات جماعت کا مجموعہ اور اس جامعیت کمالات کے سبب نبی کے ان دونوں اوصاف کمال باطن اور عصمت کا وارث ہوگا۔ اسے حق ہوگا کہ امت کی قیادت اور شرعی تربیت کرے اور ان کا امیر کہلائے۔ پس امت کے لئے اہل علاج یہی ہے کہ مبصر اور مفکر اور تقویٰ و طہارت کے پیکر علماء ربانی کی قیادت میں رہے اور ان کے زیر سایہ یہ اپنی شرعی زندگی بسر کرے۔

صالح قیادت سے روگردانی کی پاداش..... یہ جماعت اگرچہ نبوت کی ہی معصومیت نہیں رکھے گی چہ جائیکہ ان میں کوئی ایک شخصیت، البتہ اس کی شان محفوظیت کا یہ ثمرہ قدرتی ہوگا کہ وہ جو امر بھی طے کرے حفظ نفس اور ذاتی مفادات کے لئے نہ کرے بلکہ لوجہ اللہ اور مفاد مسلمین کے لئے کرے پھر بھی اگر اس کے فیصلوں میں کوئی

گوشتہ خطاء فکری کا نکل آئے تو مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی یہ زیانہ ہوگا کہ وہ اس خطاء کے سبب اس کے سارے صوابات سے محرومی اختیار کر لیں اور اصل جماعت ہی کو غیر معتبر ٹھہرا کر سرے سے اس کی قیادت ہی سے باہر آ جائیں بلکہ مزید برآں وقار کو زائل کرنے کے منصوبے باندھنے لگیں اور اگر چند نااہلوں میں اس بے توقیری کی مقبولیت ہو جائے تو اس پر فخر کرنے لگیں۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِکَ۔

اگر وہ ایسا کر کے جماعت علماء یا ان کے منتخب کردہ صدر و امیر کی قیادت سے باہر ہوں گے تو اس کی پاداش میں ان کے لئے ناگزیر ہوگا کہ وہ جماعت جہلاء یا فساق و فجار کی امارت کے تحت میں آ جائیں اور اپنا رہا سہا دین بھی کھو بیٹھیں۔ پس یہ کیا کم حیرت کی بات ہوگی کہ جو لوگ کسی ایک آدھ جزئیہ کی مڑ مڑی خطا تک کو معاف نہیں کر سکتے تھے اب انہیں اپنی خوشی سے کلیاتی خطاؤں اور عمومی فسق و فجور کی حکومت و قیادت کو بطور و رغبت قبول کر لینا پڑے گا اور اب وہ اسی کے زیر سایہ ساری زندگی غیر شرعی طور پر بسر کرنے لگے۔

میرے خیال میں علماء صالحین کے برعکس خطیہ کی ایک کھلی سزا ہے کہ ایک ایک جزئیہ میں تقویٰ و طہارت کے طالب کلی طور پر فسق و فجور کی امامت کے نیچے آ جائیں اور پھر انہیں خطا و صواب کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ اصول و انش کی رو سے ایسی جزئیاتی خطا بہتر ہے کہ جس کو ترک کرنے سے کلیاتی معاصی میں ابتلاء ہوتا ہو۔

پس ضروری ہے کہ امت اسلامیہ زیر قیادت صلحائے امت و جماعت (جس کا رسمی نام جمعیت العلماء رکھ لیا جانا کوئی مذموم بات نہیں ہے) شرعی زندگی گزارے منہیات شرع سے ہجرت کر کے مامورات شرعیہ کی حدود میں رہے۔ جہالت رفع کرے فقہی الدین پیدا کرے۔ اپنے سیاسی مستقبل اور حقیقی امارت کو جو علماء حقانی کا جامع ہو جس میں دینی رنگ کا غلبہ قوی اور وسیع سے وسیع تر کرے، جزئیات مسائل پر لڑنا جھگڑنا ترک کر کے بنیادی مقاصد میں خلل نہ ڈالے۔ عمل میں رواداری قائم کرے تو پھر حقیقی امارت و امامت قائم ہو جائے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔

مخلوط معاشرہ میں جمعیت مسلمہ کے دو اصول..... اس جامع علم و تقویٰ جماعت کے اصولاً دو کام سب سے بڑے اور سب سے اہم ہو جانے چاہئیں ایک یہ کہ کسی جماعت میں مدغم ہوئے بغیر جب مسلمانوں کے حقوق کا سوال آئے خواہ کسی بھی پلیٹ فارم سے اٹھے تو وہ ان کی غیر مشروط حمایت کرے اور نصرت کے لئے اپنی پوری قوت عمل سے کھڑی ہو جائے اور جب آزادی ملک کا سوال اٹھے خواہ کسی غیر مسلم پلیٹ فارم ہی سے اٹھے تو اس کی غیر مشروط حمایت کرے اور اپنی پوری قوت ادراک و عمل سے اس کو آگے بڑھائے کہ اس ملک کے تمام مادی و نفسانی امراض کی اصلی جڑ صرف غلامی ہے اور اس کی حقیقی بہبود و فلاح صرف آزادی ہے۔

اس طرز عمل سے اس جنگ آزادی کے سلسلہ میں تو باہم ربط و اتحاد قائم رہ سکتا ہے جو حصول آزادی کے لئے رکن اولین ہے اور غیر مسلم جماعتوں سے تصادم و نزاع قائم نہیں ہو سکتا جو حصول آزادی کے لئے شرط اولین ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ رکن کی خاطر شرط سے قطع نظر کی جاسکتی ہے اور نہ شرط میں لگ کر رکن چھوڑا جاسکتا ہے۔ رسمی لفظوں

میں اس حقیقت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جمعیت العلماء کا تمام آزادی پسند مسلم جماعتوں کو اپنے سے وابستہ رکھنا بھی ضروری ہے اور نوائے آزادی میں غیر مسلم آزادی خواہ جماعتوں کا ہموار ہونا بھی از بس ضروری ہے۔

غیر مسلم سے اشتراک عمل..... غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل شرعاً ممنوع یا حرام نہیں ہے جبکہ حدودِ شریعہ میں ہو، آج ملکی معاملات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندو مسلم اشتراک عمل نہ ہو پھر ملکی آزادی جیسے عظیم مقصد میں ہندو مسلم اشتراک عمل ممنوع و حرام کیوں بن جاتا ہے۔ جب کہ ایک طرف تو ملک تمام جزوی امور میں عملاً اسی اشتراک عمل کی تائید میں ہے اور دوسری طرف حکومت نے بھی اس کا کھلا اعلان کر دیا ہے کہ وہ آزادی ہند کے بارے میں کسی مشترکہ اور متفقہ مطالبہ پر ہی غور کر سکتی ہے۔

تو کیا ان حالات میں شرعاً یا سیاستاً یہ چیز ناجائز یا ممنوع ٹھہر سکتی ہے کہ تمام اقوام ہند باہمی اعتماد و رواداری کے ساتھ بیک آواز اس موجودہ شہنشاہی اور نظامِ حکومت سے کھلی بیزاری اور نفرت کا اعلان کرتے ہوئے ملک کی آزادی کا مطالبہ کریں اور اس سلسلہ میں اندرونِ حدود اشتراک عمل کریں اگر غیر مسلم سے اشتراک عمل ممنوع ہے تو گورنمنٹ کے ماتحت ہر سیاسی ادارہ میں ممنوع رہنا چاہئے کیونکہ اصول ہر جگہ اصول ہے۔ ہاں حدود و حدود کی ہر جگہ ضرورت ہے کہ غیر محدود عمل ہمیشہ مضرتوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

پس اس بارے میں بھی باہمی معاہدہ سے حدودِ عمل کی اصولی دفعات ایسی ضرور مشخص کر لی جائیں کہ ان دو قوموں میں نزاعات و اعتراضات کا سد باب ہو جائے جو آئے دن باہمی بے اعتمادی اور آپس کی سرپھٹول کا باعث ہوتا رہتا ہے اور خصوصیت سے جمعیت العلماء خدشات و اعتراضات کا مورد بنی رہتی ہے۔ پھر یہ معاہدہ بھی دفاع اور جنگ کی حد تک ہونا چاہئے۔ تعمیری معاہدوں کے لئے آزادی کا زمانہ موزوں ہوتا ہے نہ کہ غلامی کا۔

ہمہ گیر مقصد کے حصول کا طریق کار..... بہر حال جمعیت العلماء کو اپنے ہمہ گیر مقصد اور بلند پایہ منصب کے لحاظ سے ملک کی ہر قومی جماعت سے درجہ بدرجہ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔ مسلم جماعتوں سے یگانگت و اتحاد کا اور آزادی پسند غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل کا۔ مگر ساتھ ہی خود اپنے پروگرام اور اپنے پلیٹ فارم کا استقلال محفوظ رکھنا بھی اس کا عقلی و شرعی فریضہ ہے ایک منٹ کے لئے نہ اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ جمعیت العلماء اپنی خصوصیات فنا کر کے اپنا استقلال کھودے اور کسی دوسری مسلم یا غیر مسلم جماعت میں مدغم یا اس کے پس پردہ ہونے کا دھبہ اپنے دامنِ تقدس پر لگائے اور نہ کسی حالت میں اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے محدود جماعتی استقلال میں محو ہو کر ہر دوسری جماعت سے مستغنی ہو جائے اور اپنے یا دوسروں کے تعلق منقطع کر دینے پر آسانی سے صبر کر کے بیٹھ جائے کیونکہ پہلی صورت میں اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کی منہی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے ایک ہمہ گیر راہنما اور قائد ہونے کے صرف ایک چھوٹی سی پارٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ پس اسے اپنا مستقل اور غیر تابع وجود قائم رکھ کر دوسروں کی طرف ملاحظ اور اشتراک کا ہاتھ بہر صورت

بڑھاتے رہنے ہی کی ضرورت ہے۔ پھر خصوصیت سے مسلم اداروں سے تو اسے وداد و تعلق کی خاطر دوڑ و دوپ کرنے کے ساتھ اخلاقی لجاجت و سماجت سے بھی کام لینا پڑے اور شدید سے شدید تقدیروں پر بھی جو اس کی ذات پر کی جائیں مسامحت سے کام لینا پڑے تب بھی اسے ہرگز گریز نہ کرنا چاہئے کہ یہ خود اس کی اخلاقی عظمت اور عمومی راہنمائی کا ایک جزء لاینفک ہے کہ ﴿وَحَمَّاءُ بَيْنَهُمْ﴾ کا صحیح نقشہ علماء کی جماعت بھی نہ کھینچے گی تو پھر اس کا سلیقہ اور کس میں تلاش کیا جائے گا؟ اگر انبیاء علیہم السلام اپنی عالمگیر اخلاقی شفقت سے کفار تک کو اپنا کر انہیں مسلم و قانت کر سکتے ہیں تو کیا نابالغ انبیاء اسی شفقت و رحمت کے ظل سے انہوں کو بھی اپنا نہیں بنا سکتے؟

باہمی ربط و تعاون کی بنیاد اتحاد مقصد اور تقسیم عمل پر ہونی چاہئے..... مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض اوقات جبکہ لوگوں کے قلوب پر غرض مند یوں یا غلط فہمیوں کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ اپنے ہی مربیوں اور مصلحوں کے خلاف عناد تک کا مظاہرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تو علماء کو تعاون اور تعلق سے مایوسی تک کی نوبت بھی آ جاتی ہے لیکن پھر بھی فرائض نصیحت و موعظت اور روابط شفقت و رحمت قطع کرنے کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوتی الا یہ کہ شفقت و موعظت کے تمام مراحل سے گزر کر قلوب دیائے اس یا اس پر شاہد ہو جائیں اور یکسوئی کے سوا چارہ کار باقی نہ رہے تو سکوت میں مضائقہ نہیں لیکن انقطاع تعلق یا طغیان نیز کثرت چیدیاں پھر بھی شان علم اور وراثت نبوت کے متافی رہیں گی صِدِّیقِیْنِ وَ عَلَیْمِیْنِ (کیا سچائی کی علمبرداری بھی اور طعن و تشنیع بھی؟ یہ دو چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟) بہر حال جیسے جمیعت العلماء کا قیام اور اس کی منصبی حیثیت کے وقار کا وجود امت کے لئے ضروری ہے ایسے ہی دوسری جماعتوں سے حسب حیثیت و مرتبت اس کا تعلق اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ ادھر اپنے شرعی نظریوں کی تبلیغ اور امت کو رحمت و یدر کے ساتھ ان پر لانا بھی از بس ضروری ہے۔ اس سے میرا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ جمیعت العلماء کی قیادت کے یہ معنی ہیں کہ دوسری مسلم جماعتیں تو ڈر دی جائیں اور یہ ممکن بھی کب ہے جبکہ آزادی جیسے بنیادی مقصد کے لئے اور بھی بہت سے مبادی اور مقاصد طبعی طور پر ضروری ہیں جن سب کو نہ تھا جمیعت العلماء انجام دے سکتی ہے اور نہ بہت سے وظائف کی انجام دہی اس کی منصبی حیثیت پر چسپاں ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ان مختلف مقاصد کے لئے اتحاد مقصد کے اور تقسیم عمل کے اصول پر دوسری جماعتیں بھی موجود نہ ہوں اور ان کا اور جمیعت کا باہمی ربط و تعاون نہ ہو اصل مقصد کی تکمیل دشواری ہی نہیں ناممکن ہے۔

جمیعت العلماء کا شرف و امتیاز..... ہاں مگر یہ بھی میں ضرور کہوں گا اور شرعی راہنمائی کی روشنی میں کہوں گا کہ: یہ تمام دوسری مسلم جماعتیں جمیعت العلماء کے سامنے مستفتی ہوں گی نہ کہ مفتی۔ نہ بلحاظ ذوات علماء بلکہ اس لحاظ سے کہ امت کے ہر مرض کی دوا بالآخر کتاب و سنت ہے اور اس کی حامل حقیقت یہی علماء کی جماعت ہے جبکہ وہ اپنے علمی وقار، فکر صحیح اور اخلاق کی بلندیوں کو محفوظ رکھ کر خالص کتاب و سنت کی روشنی امت کے سامنے پیش کرتی رہے۔ ایسی صورت میں افراد امت ہوں یا جماعات امت انہیں مع و طاعت کے سوا چارہ کار نہیں کہ ارشاد ربانی

ہے ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾ ① ”اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔“

پس تمام مسلم جماعتوں کا فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے مسئلہ میں جمیعت العلماء کی شرعی راہنمائی بالضرور حاصل کریں جس میں ذرا بھی اصول یا فروع اسلام سے ٹکرا جانے کا کوئی احتمال ہو بلکہ ان کے لئے بہر حال یہی ضروری اور مصلحت ہے کہ وہ صرف جمیعت العلماء ہی کی طرف رجوع کریں تاکہ مسلم مجالس سے ربط باہمی قائم ہونے کے ساتھ ان کے کام بھی جمیعت کے علم میں آتے رہیں اور خود جمیعت کی بھی کوئی چھوٹی بڑی تجویز ان مجالس کی تجاویز سے متصادم نہ ہو سکے۔ پھر اگر جمیعت العلماء کی کسی تجویز سے کسی مسلم جماعت کو کوئی ادنیٰ سا بھی اختلاف پیدا ہو تو وہ جب تک کہ اس میں جمیعت سے آخری حد تک رجوع کر کے مسئلہ صاف نہ کر لے کتابت و خطابت سے کوئی ادنیٰ پہلو تہی نہ کرے یعنی ابتداء ہی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہ کر لے اور انتہا کی انقطاع یا بے گانگی یا بے مروتی کا معاملہ نہ کرے اور ادھر جمیعت بھی فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے خلاف تنقید سننے اور مقبول و منقول تنقید کو مان کر اس کی تلافی کے لئے تیار رہے کہ ”كَلِمَةُ الْجَحْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهِيَ أَحَقُّ بِهَا“ ② ”کلمہ حکمت مومن کی گم کردہ پونجی ہے جہاں مل جائے وہ اس کا مستحق ہے۔“

افہام و تفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت..... خلاصہ یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے امام قوم بن کر جب کہ بنی اسرائیل کی تربیت و تعمیر کی اور ان کا وکیل شرعی بن کر فرعون سے ان کی آزادی کے بارے میں گفت و شنید اور مطالبہ و احتجاج کیا اور تمام بنی اسرائیل نے جن میں اسباط کی متعدد جماعتیں تھیں، سمع و طاعت سے کام لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مشترک و مختصر جمیعت پر اعتماد کیا جس کی بدولت بالاخر وہ آزاد ہوئے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں بھی مسلمان افراد اور جماعات نابھان نبی کی اجتماعی قیادت میں اور اگر وہ اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کر لیں تو اس کی امارت میں اس کی تعمیر و تربیت پر اعتماد کریں اور شک اندازوں یا خود غرضوں کی تفرقہ پرداز یوں سے جزئیات میں پڑ کر اصل مقصد کو ہاتھ سے نہ کھوئیں تاکہ جماعت یا امیر جماعت ان کی آزادی کے لئے بانسٹا خاطر پوری جدوجہد کریں اور آزادی کو ان کے قریب لے آئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمیعت العلماء نے ان وظائف کو اپنے مقدور بھر ادا کیا ہے اور ادا کرتی رہے گی۔ مگر یہ کارخانہ بشری ہے اس لئے فرو گذاشت یا اجتہادی خطا ممکن ہے۔ سو جن حضرات پر بھی ایسی کوئی خطا واضح ہو وہ

① ہارود: ۲۴، سورۃ الحزاب، الآیۃ: ۳۶۔ ② الحدیث اخرجه الامام الترمذی فی سننه وضعفه، کتاب العلم باب

ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ ج: ۹ ص: ۳۰۱۔

اعتراض و مطامع اور اخباری پروپیگنڈوں کا راستہ چھوڑ کر دل سے جمیعت کی طرف رجوع کریں اور جذبات کے بجائے دلائل و اصول سے افہام و تفہیم کر لیں اور ابتداء سے فریقین میں نیت مناظرہ کے بجائے تحقیق مسئلہ کا عزم ہو تو بات نہیں بڑھ سکتی۔ ﴿وَإِنْ يُرِيدُوا إِصْلَاحًا يُلَاقُوا اللَّهَ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا﴾ ①

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج ہندوستان کا سب سے گہرا اور بنیادی مرض غلامی ہے جس کی جڑوں کو ایک پردہ سی حکومت رات دن مضبوط کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے جس نے شعائر اسلام یہی کو نہیں شعائر انسانیت کو بھی مٹا دیا ہے۔ اس غلامی سے ہماری تعلیم، روایات، مذہب، اقتصادیات، تہذیب و تمدن، قومی وقار، آبرو اور اندرونی و بیرونی تعلقات سب برباد ہو چکے ہیں۔ قرآن نے اس غلامی کو بدترین عذاب قرار دیا تھا اور اس لئے ہمارا اولین فریضہ ہے کہ اس مہلک مرض سے بجلت ممکنہ نجات حاصل کر کے آزادی کے مقام رفیع تک پہنچیں جیسا کہ اس کی فرضیت و ضرورت ابتدائی نمبروں میں عرض کی گئی تھی۔

حصول آزادی کا مختصر آپروگرام حصول آزادی کے پروگرام کا حاصل یہ ہے کہ:-

- ① سب سے اول غلامی کے نشاء کو سمجھنا چاہئے کہ وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کی استبدادی پالیسی ہے۔
- ② حصول آزادی میں نبوت وقت سے مدد لینی چاہئے تاکہ پروگرام اختراعی نہ رہے بلکہ الہامی ہو جائے اور قیادت وحی الہی کی قائم ہو۔
- ③ پہلے اپنوں سے اتحاد اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ پھر غیروں سے بقدر حاجت اشتراک عمل مگر حدود و قیود و شریعت میں رہ کر اور اس کا بصورت معاہدہ ہندو مسلم اعلان کر کے۔
- ④ موجودہ صورت حال میں جنگ آزادی عدم تشدد سے لڑی جاسکتی ہے جس کے اسلحہ اخلاقی ہیں۔ ذکر اللہ، دعا، رجوع الی اللہ، استمداد باہمی و اتحاد اور احتجاجی و مطالباتی جدوجہد، نیز مسلمانوں کی تنظیم۔
- ⑤ باہمی اشتراک عمل میں شرکاء عمل کا عاقل و باخدا ہونا ضروری ہے، غافل اور چالاک ہونا مضر ہے۔
- ⑥ اس اخلاقی جنگ میں بحیثیت حزب اللہ اور فرستادہ خدا کام کرنا چاہئے نہ کہ حفظ نفس سے۔
- ⑦ متسلط قوم سے خطاب میں نرمی برتنی چاہئے نہ کہ تشدد اور اظہار غیظ۔
- ⑧ خطاب کنندہ قائدوں کا متواضع اور بے تکلف ہونا ضروری ہے جن کی نظر اپنی کمزوریوں اور عیوب پر بھی ہو اور متکبر یا رسمی و فوری ہونا مضر ہے۔
- ⑨ قائدین کی جماعت کو مغفل قوم کے درباروں میں پہنچ کر اپنی اسلامی پوزیشن اور اپنی تحریک کی دینی پوزیشن علی الاعلان واضح کر دینی چاہئے۔
- ⑩ آزادی کی طلب مذہب کے لئے کرنی چاہئے نہ کہ ترفہ و شہم دنیوی کے لئے۔

11..... آزادی خواہ ذمہ داروں کا عاقل و فہیم ہونا، دین سے متاثر ہونا اور دین دار ہونا ضروری ہے ورنہ مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔ جو مقصود بالذات ہے بلکہ صرف قومی آزادی ملے گی جو مقصود اصلی نہیں ہے۔

12..... اپنوں کی اصلاح و تعمیر ان کی اخلاقی تربیت اور جزیات عمل کی تہذیب مسلم جماعتوں کی تقویم از بس ضروری ہے کہ نارتھ یافتہ فوج بالا خربتائی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

13..... متسلط قوم کو بھی تبلیغ دین ضروری اور تا حصول آزادی مسلسل ضروری ہے کہ اس سے نصرت غیبی اور ذمہ داری حق تعالیٰ ہو جاتی ہے اور مطالبات کی جڑ مضبوط ہو جاتی ہے۔

14..... مصائب دنیا کی شکایت زبان پر نہ آنی چاہئے بلکہ عنوان مطالبات موانع دین کی شکایت ہونی چاہئے کیونکہ اسلام میں آزادی کی ضرورت صرف دین کے لئے ہے دنیا تابع محض ہے۔

15..... ہر مطالبہ اور احتجاج کی محنت قرآنی معجزہ یعنی کتاب و سنت کے براہین سے پیش کی جائے۔

16..... شرعی امارت اور دینی قیادت کا قیام ضروری ہے تاکہ قوم میں مرکزیت آجائے۔ ایک مرجع الامر مشخص ہو کر پوری قوم کو بجائے تشمت و پراگندگی کے قلیل شرائع میں یکسوئی نصیب ہو جائے اور قلوب میں تشریف کی جگہ سکون و طمانیت پیدا ہو سکے۔

17..... قائد علماء مفکر و مبصر، دانایان مسائل و دلائل، عارفان حوادث و وقائع مستند و جید اور ساتھ ہی صلحاء و اتقیاہ ہونے چاہیں نہ کہ محض خطیب اور زعم۔

18..... علماء مفکرین کی حیثیت اجتماعی کا وجود ضروری ہے جس کا رسمی نام جمعیت العلماء ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس کے اہل حل و عقد مستند علماء ہوں۔ رسمی یا متکلف علماء نہ ہوں جن کے سامنے آنے سے غیر شرعی چیزیں باور ہونے لگیں اور تلبیس حق بالباطل کا بازار گرم ہو جائے۔

19..... اس وقت جمعیت العلماء کا بڑا کام حقوق مسلمین کی غیر مشروط حفاظت اور آزادی ملک کی غیر مشروط حمایت کرنا ہے۔

20..... ہر آزادی خواہ کی حمایت و ہم نوائی کی جائے مگر اپنا پروگرام مستقل رکھا جائے۔ معاہدہ کے ساتھ غیر مسلم اقوام سے اشتراک عمل بحالات موجودہ ضروری ہے۔ اس اشتراک سے وہ بھی اسلام سے قریب لائی جاسکتی ہیں۔ اپنے استقلال تام کی صورت میں سب ہمارے ساتھ ہوں گے اور ہم صرف خدا کے ساتھ، یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم سب کے ساتھ ہوں اور ہمارے ساتھ کوئی نہ ہو۔

21..... حصول آزادی کی جدوجہد کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام اشد ضروری ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو تحصیل آزادی کے لئے بھیجے ہوئے فرمایا ﴿وَلَا تَبْتَغُوا فِي ذِكْرِي﴾ ﴿١﴾ ”میرے ذکر میں

سستی مت کرنا۔ اور ذکر اللہ کا فرد کامل نماز ہے اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي۔ ﴿۲﴾ ”میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو اور اقامتِ صلوٰۃ کا جزء اعظم جماعت ہے۔ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوفِ مِنْ اِقَامَةِ الصَّلَاةِ۔ ﴿۱﴾ ”جماعت کی صفوں کو سیدھا رکھنا اقامتِ صلوٰۃ میں سے ہے۔“ اور ظاہر ہے کہ تسویہ صفوف بلا جماعت کے ناممکن ہے۔ اس لئے حصول آزادی کی جدوجہد کے وقت تعلق مع اللہ اور اکل فرد نماز باجماعت ناگزیر ہے تاکہ نصرتِ غیبی شامل حال رہے۔

22..... تبلیغی مساعی کی منظم طریق پر ضرورت ہے۔ تبلیغ دین سیاسی پلیٹ فارموں سے ہونی چاہیے اور حکومت و رعایا کے کانوں میں مساوی طور پر اسلام کی آواز پہنچنی چاہئے جس سے دیانات کے ساتھ اسلامی قوانین و سیاسیات کو بھی اصولی طور پر کرسی نشینوں کے کانوں تک پہنچایا جائے تاکہ ان کے مقصد سے دشمنوں میں بھی ہمدردی پیدا ہونے کا راستہ پڑ جائے اور حصول مقصد دور نہ رہے۔ بہر حال یہ بانئیں نکات ہیں جو تلاوت کردہ آیات سے مستنبط ہوتے ہیں جن میں غلامی کی قباح و شاعت ازالہ غلامی کی فرضیت طریق احتجاج و مطالبات اور اس کی نوعیت، آزادی کی برکات، حصول آزادی کی سعی، سعی میں خلوص و ملتہیت۔

حصول آزادی کا پروگرام، دشمنان آزادی کا انجام اور غلام وضعیف قوم کی کامیابی وغیرہ کے مہمات ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ میں نے اپنی ضعیف بساط کے مطابق یہ مضامین آیات بالا سے استنباط کر کے عرض کئے ہیں جن میں اصولی طور پر مسائل حاضرہ کی بحث بھی موقع بموقع آگئی ہے مگر سیاسی زبان کی بجائے دینی اور قرآنی زبان میں آئی ہے اور یہ زبان سیاسی اور غیر سیاسی افراد کے لئے یکساں مقبول اور جاذب توجہ ہے۔ اہل تفکر اور اذکیاء علماء اس سے بہت زیادہ حقائق ان آیات سے نکال سکتے ہیں کہ آخر کلام الہی ہے جس کی گہرائیوں کی کوئی حدود نہایت نہیں ہو سکتی۔ سیاست شرعیہ کی عظمت..... میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب و سنت سے پیش کئے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ڈچر اور اس سے اخذ کر کے نہ لیا جائے یہ پرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے۔ جس نے دنیا کا امن و سکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے۔ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہیے جس سے اس پر مکر عصری سیاست کی ظلمت دور ہو سکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اٹھ جائے، کیونکہ آج اس کی مخالفت کرنے والے بھی بوجہ اس کی شوکت کے وقیع اسی کو سمجھتے ہیں اور اسی میں خود اپنی شوکت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے مزے لے کر اس کا ذکر اور اس کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ صرف کتاب و سنت کے منصوص پروگراموں سے ہی یہ عظمت زائل ہو کر حقیقی عظمتِ خدائی پروگراموں کی قائم ہو سکتی ہے۔

تعمیری سلسلہ کا پروگرام میں کافی تفصیل کے ساتھ اپنے خطبہ صدارت جمعیت العلماء صوبہ سندھ میں پیش کر

چکا ہوں۔ اگر اس کی تمام دفعات ان ۲۲ نمبروں کے ساتھ شامل کر لی جائیں تو دفاعی اور تعمیری پروگرام کی تمام مہم اور بنیادی دفعات سامنے آ جائیں گی جو نصوص کتاب و سنت سے ماخوذ ہوں گی۔

بزرگان محترم! میں نے بہت سا وقت آپ کا لیا جس کی میں معذرت کرتا ہوں اور اس تمغہ صدارت پر جو آپ حضرات کی ذرہ نوازی نے مجھے عطا فرمایا ہے، مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فَجَزَاكُمُ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرَ الْجَزَاءِ ہندوستان آزاد، اسلام زندہ باد، جمعیت العلماء آباد۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اٰلِهِ وَ اَصْحَابِهِ اَجْمَعِينَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ.

تکمیل انسانیت

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
 إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ
 وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَلَاةٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
 تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
 الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ. ۝ اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ
 نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۝ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ

تقریب تکمیل بزرگان محترم! یہ تقریب ہمارے عزیز محمد ازہر صاحب کے ختم قرآن شریف کے لئے
 ہو رہی ہے۔ اسی مجلس میں انہوں نے قرآن کریم ختم کیا اور اس میں دعاء کی گئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہمارے یہ عزیز
 قرآن شریف شروع کرنے کی ابتداء کر رہے تھے اور اس کے حفظ کا قصد تھا۔ یقیناً وہ بھی خوشی کا دن تھا جس میں
 انہوں نے قرآن کریم حفظ کرنے کا آغاز کیا۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں حافظ بنایا اور انشاء اللہ
 ”حافظ جید بھی ہوں گے اور ان کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قاری مجود بھی ہوں گے۔ تو ایک ابتداء تھی اور
 ایک انتہا اور یہ دونوں چیزیں خوشی کی ہوتی ہیں۔

ابتداء اور تکمیل پر خوشی ابتداء کی خوشی توقع کی بناء پر ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے کو مکتب میں بٹھاتے ہیں اور
 خوشی کرتے ہیں مگر یہ خوشی توقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ پڑھے گا، چند دن بعد حفظ کریگا اور اس میں کمال
 پیدا کرے گا۔ غرض ابتداء میں امید کی بناء پر خوشی ہوتی ہے اور انتہاء میں تکمیل کی بناء پر خوشی ہوتی ہے کہ جو توقعات
 باندھی گئی تھیں وہ اللہ نے پوری فرمادی۔ اس لئے انتہائی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ تو ہر ابتداء بھی خوشی کی چیز ہے، اور
 پھر انتہاء بھی خوشی کی چیز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ابتداء میں خوشی توقع پر ہوتی ہے اور انتہاء میں تکمیل پر ہوتی ہے۔ اور
 ظاہر بات ہے کہ تکمیل بہ نسبت توقع کے زیادہ خوشی کی چیز ہے اور توقع اور امید تو مبہم ہوتی ہے، پوری ہو یا نہ ہو،
 لیکن تکمیل کے معنی یہ ہیں کہ وہ ساری توقعات پوری ہو گئیں۔ تو وہ امید محض ہوتی ہے، یہ واقعہ ہوتا ہے، تو واقعہ پر

جو خوش ہوگی وہ یقیناً اس سے بڑھ کر ہوگی جو محض توقع پر ہوتی ہے۔

تکمیل پسند امت ویسے بھی مسلمان کچھ تکمیل پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ دین ہی اس کا کامل ہے۔

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ ① دین کی

ابتداء تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور تکمیل و انتہائی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ہوئی۔

عالم بشریت کی طفولیت اور اس کا ابتدائی علم ابتداء کے وقت بالکل ابتدائی چیزیں تھیں، جو بچوں کے

لئے ہوتی ہیں، بچے کا سب سے بڑا علم یہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ چیزوں کے نام سکھلا دئے جائیں۔ یہ روٹی ہے، یہ لونا

ہے، یہ زمین ہے، یہ آسمان ہے۔ تو اگر بچے کو نام یاد ہو جائیں تو یہ اس کا سب سے بڑا علم ہوتا ہے اور علم کا پہلا درجہ بھی

”علم الاسماء ہی کا ہے کہ اشیاء کے نام معلوم ہوں۔ اگر کسی چیز کا نام ہی معلوم نہ ہو تو وہ مجہول مطلق ہوتی ہے اس کی

طلب ہی نہیں ہو سکتی۔ غرض علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔ اس کے بعد پھر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ یہ

معلوم ہو کہ اس اسم کا کسٹی کون ہے۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جب مسمی کی صورت دیکھ لی تو طبعاً جی چاہتا ہے کہ

اب۔ یہ معلوم ہو کہ اس مسمی کی خصوصیات کیا ہیں۔ تو آدمی ان خصوصیات کا علم حاصل کرتا ہے۔ جب وہ بھی حاصل

ہو گیا تو پھر آگے یہ درجہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ تو پہلے اسم ہے اس کے بعد معانی مدلولہ ہیں۔ اس کے

بعد اس کے خواص اور آثار ہیں۔ اس کے بعد اس کے حقائق ہیں۔ اس طرح درجہ بدرجہ علم ترقی کرتا ہے۔ تو آدم

علیہ السلام کے زمانے میں عالم بشریت کی طفولیت تھی۔ انسانیت کے لڑکپن کا زمانہ تھا اور بچوں کا سب سے بڑا علم

ناموں کا یاد کرنا ہے۔ اس لئے آدم علیہ السلام پر جو جی اتاری گئی اس میں زیادہ تر اسماء ہی تھے۔ ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ

الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ② آدم علیہ السلام کو نام یاد کرادیئے گئے۔ ناموں کے کچھ اسمیات بتادیئے گئے مسمی پہچانوادیا

گیا۔ تو علم کی ابتداء اسماء سے ہوئی حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے اتارے۔ جیسے اس امت مرحومہ

پر قرآن کریم کے تیس سپارے اتارے گئے۔ تو تیس صحیفے اترے۔ ان میں زیادہ تر رہائشی امور کی تعلیم تھی۔ کھیتی یوں

کرنی چاہئے۔ باغ یوں لگانا چاہئے، کپڑے بنانا چاہئے۔ لکڑی کا کام یوں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد

فرمایا گیا کہ ”آدم علیہ السلام کا حق تعالیٰ نے ایک ہزار صنعتیں سکھلائیں۔ وہ ان کی اولاد میں پھیلیں۔ ہر طبقے نے اپنی

مناسبت سے ایک صنعت اختیار کر لی۔ کسی نے لکڑی کا کام، کسی نے لوہے کا کام کسی نے تعمیر کا کام، کسی نے کھیتی

باڑی کا، بنی آدم میں مختلف صنعتیں پھیل گئیں۔۔۔ مگر سب کی سب وحی کے ذریعہ سے آئی ہیں۔

ابتدائی عبادت بہر حال آدم علیہ السلام پر تیس صحیفوں میں جو وحی کی گئی، اس میں زیادہ تر رہائشی امور تھے،

حلال و حرام کے احکام فقہیہ بہت اقل قلیل تھے، اس لئے کہ بچوں کا ابتدائی علم ناموں ہی کا سکھانا ہے، حلال و حرام

زیادہ نہیں بتلاتے۔ وہ تو معصومیت اور فطرت پر ہوتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد فطرت پر تھی،

① پارہ ۶: سورة المائدة، الآية ۶. ② پارہ ۱: سورة البقرة، الآية ۳۱.

نیک اور صالح تھی۔ جو نام یاد کر دیئے گئے انکو پڑھ لینا یہی سب سے بڑی عبادت تھی۔

جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام کو کچھ اسماء کی تلقین کی کہ یہ پڑھا کرو۔ تو اس دور کی سب سے بڑی عبادت یہ تھی کہ اسماء خداوندی کو پڑھا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔ غرض ابتداء علم یہی تھا کہ ناموں کا علم ہو جائے اور اسماء معلوم ہو جائیں۔ ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ ① اس پر شاہد ہے۔ عالم بشریت کا دوسرا دور اور اس کا علم..... اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا۔ تو طبعی طور پر جذبہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس اسم کا مسمیٰ کیا ہے۔ یہ نام کس چیز پر صادق آتا ہے۔ اس کا مسمیٰ کون ہے اس کی طلب ہوتی ہے۔ تو آدم علیہ السلام نے تو ناموں کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کرائی اور نوح علیہ السلام نے مسیات کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کی طرف پہنچایا۔ چنانچہ فرمایا گیا۔ ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمَوٰتٍ طِبَاقًا ۚ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا ۚ وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ۚ وَاللّٰهُ اَنْتَبِخُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاۡتًا ۚ ثُمَّ يُعِيْنُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اَخْرَاجًا ۚ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۚ لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاۡجًا﴾ ② ”زمین کو اللہ تعالیٰ نے پھیلایا۔ تمہیں اس طرح سے پیدا کیا جس طرح نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔“

تو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اسماء سکھائے گئے تھے، یہاں مسیات سامنے رکھے گئے کہ ان کے ذریعے معرفت خداوندی حاصل کرو۔ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا تصور بندھتا ہے۔ اگر مصنوع بہت عمدہ ہو تو تعریف کی جاتی ہے کہ صانع بڑا کامل ہے۔ جس نے ایسی بڑی صنعت دکھائی۔ تو آسمان اور زمین وہ چیزیں ہیں کہ بحر اللہ کے کوئی نہیں بنا سکتا۔ اس واسطے ان کی طرف متوجہ کیا گیا کہ انکے ذریعے سے صانع کو پہچانو کہ وہ، کیسا حکیم و خبیر ہے اور کیسا قادر مطلق اور قدیر علی الاطلاق ہے کہ جس نے آسمان کا خیمہ تان دیا اور زمین کا فرش بچھا دیا۔

آپ چھوٹا سا بھی ایک شامیانہ کھڑا کرتے ہیں تو بانس کے بیسیوں ستون لگاتے ہیں تاکہ وہ ٹھکے۔ مگر آسمان کا یہ اتنا بڑا خیمہ جسکی مسافت پانچ سو برس کی ہے۔ نہ اس کے نیچے کوئی بانس ہے نہ ٹیک ہے اور ہوا کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ تو وہ کتنا بڑا قادر ہے جس نے یہ خیمہ تان دیا۔ ﴿يَغْيِرُ عَمَدٌ تَرَوْنَهَا﴾ ③ نہ کوئی ستون ہے نہ کوئی لکڑی۔ بہر حال نوح علیہ السلام نے اسماء کے بعد مسیات کی طرف متوجہ کیا اور مسیات کے ذریعے سے حق تعالیٰ کو پہچانا دیا۔ معرفت خداوندی کرائی۔ اب گویا عالم بشریت کو نام بھی معلوم ہیں اور مسیات بھی معلوم ہو گئے۔

عالم بشریت کا تیسرا دور اور اس کا علم..... پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اس درجے کے بعد اب طبعی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان مسیات کے خواص کیا ہیں؟ انکے آثار کیا ہیں؟ یہ کیوں بنائے گئے؟ ان کی

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱، ② پارہ: ۲۹، سورۃ نوح، الآیۃ: ۱۵، ۲۰۔

③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۰۔

غرض وغایت کیا ہے؟

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نفسیات کی طرف متوجہ کیا۔ نفوسِ فلکیہ، نفوسِ ارضیہ۔ اور ان کے ذریعے سے معرفتِ خداوندی کرائی۔ اس لئے کہ اسم اور سعی تو معلوم ہو چکے تھے۔ اب تو خواص و آثار سامنے تھے۔ تو خواص و آثار کی طرف متوجہ کر کے انہیں معرفتِ خداوندی کی طرف بڑھایا۔

دور موسوی اور اس کا علم..... طبعی طور پر جذبہ یہ ہوتا ہے کہ نام یہ ہے، سعی یہ ہے، خواص یہ ہیں ان کے استعمال کا طریقہ کیا ہو؟ کس طریقے سے استعمال کریں۔ ان کے احکام کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آ گیا اور تورات نازل ہوئی اور اس شان سے کہ ﴿تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾۔ ہر چیز کے احکام کی تفصیل بتلائی گئی کہ اسے یوں استعمال کرو، یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ غرض احکام کی تفصیل آ گئی۔

احکام کی حقیقت کا دور..... اب یہ کہ نام بھی معلوم ہو گیا، خاصیتیں بھی معلوم ہو گئیں اور احکام کا بھی پتہ چل گیا تو طبعی طور پر ذہن اس کی طرف جاتا ہے کہ احکام کی علت کیا ہے جس پر مبنی ہیں؟ کیونکہ حکم کا تعلق بہر حال کسی حقیقت اور علت سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب علت سامنے آتی ہے تو فقط ایک ہی چیز کا حکم معلوم نہیں ہوتا، جہاں جہاں وہ علت پائی جائے گی احکام معلوم ہوتے رہیں گے۔ تو ایک علت سے سینکڑوں ابواب کے احکام سامنے آ جاتے ہیں۔

دور نبوی (علیہ السلام) اجتہادِ انسانیت کا دور..... پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آ گیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفصیل ارشاد فرمائیں کہ ہر حکم کے نیچے حکمت، ہر حکمت کے نیچے علت ہر علت کے نیچے ایک حقیقت، اور ہر حقیقت کے نیچے ایک صفتِ خداوندی جس سے اس علت اور حقیقت کا رابطہ ہے۔ تو علمی طور پر گویا بنی آدم اس قابل بن گئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔ صورت دکھانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ مسیات پہچانے جائیں۔ وہ تو پہچان چکے تھے۔ اس طرح نام بتلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ وہ معلوم ہو چکے تھے۔ زیادہ احکام بتلانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو چکے تھے۔ علل احکام بتلانے کی ضرورت تھی تا کہ یہ امت مجتہد بنے اس امت کے اندر یہ قوت پیدا ہو کہ اس ایک علت سے ہزاروں چیزوں کے احکام نکالے اور یہ اس لئے کہ ختمِ نبوت کا دور ہے کوئی نبی آنے والا نہیں۔ کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں۔ تو اس امت کے علماء کو یہ قوت دی گئی کہ قیامت تک کے حوادث کا فیصلہ اسی قرآن کریم سے کریں۔ انہی اصول و کلیات اور انہی علل سے اور انہیں حقائق سے فیصلہ کریں۔ چودہ سو برس گزر گئے ہیں اور امت فیصلہ کرتی آرہی ہے، ہر صدی میں نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں نئے حوادث سامنے آتے ہیں، لیکن کبھی امت میں عجز پیدا نہیں ہوتا، اسی قرآن مجید، اسی حدیث، اسی فقہ سے احکام نکلتے چلے آتے ہیں، انہی علل سے احکام کا استخراج کیا جاتا ہے، تو یہ مجتہدین کی امت ہے۔

امت محمدیہ میں آثارِ نبوت..... اور جیسا کہ بعض روایات میں فرمایا گیا: **غُلَمَاءُ لِعُمَيِّ كُنَانِيَاءُ بَنِي إِسْرَآءَ**

۱۔ گواس روایت کی سند میں کچھ کلام کیا گیا ہے، مگر باوجود اس کے علماء اس سے استدلال و استشہاد کرتے ہیں کہ سند اگو یہ روایت کچھ ضعیف ہو مگر اس مضمون کی دوسری روایتیں بھی ہیں۔ اگرچہ عنوان بدلا ہوا ہو۔ اس لئے مضمون کی حیثیت متواتر ہے، گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہو، ایک حدیث سند کے لحاظ سے اگر ضعیف بھی ہو مگر اس معادل دوسری چیزیں مل جائیں تو درجہ حسن پر پہنچ ہی جاتی ہے، بہر حال سند کچھ ضعیف بھی سہی مگر معنی ضعیف نہیں ہے تو امت کے علماء نبی تو نہیں ہیں۔ مگر کام وہ کیا جو نبیوں کا ہوتا ہے۔ جہاں ایک بھی عالم بیٹھ گیا، ہزاروں کو ایمان اور معرفت سے رنگ دیا۔

ایک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے، ان کے علمی آثار کوفہ سے خراسان اور ایران کی طرف پہنچے اور ایران سے افغانستان کی طرف اور افغانستان سے ہندوستان کی طرف۔ تو ہندوستان، افغانستان کی اکثریت حنفی ہے، حتیٰ کہ شام کی اکثریت بھی حنفی ہے، آپ کی فقہ وہاں پہنچی اور اس فقہ نے ان ممالک کی اکثریت کو اپنے ذوق میں رنگ دیا اور لاکھوں کروڑوں حنفی بنے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک امام حق اور امام مجتہد ہیں، آپ کی پیدائش مصر میں ہوئی اور حجاز میں زیادہ تر قیام ہوا ہے، تو حجاز کی اکثریت شوافع ہے، مصر کی اکثریت شافعی ہے۔ پھر وفات بھی مصر میں ہی ہوئی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام درامحجۃ ہیں۔ تو عرب کے جو مغربی قطعات ہیں، وہ اکثر و بیشتر مالکی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نجد اور یمن میں قیام ہوا ہے، تو وہاں اکثریت حنبلیوں کی ہے۔ غرض ایک عالم ربانی بھی جہاں پہنچ گیا، لاکھوں کے اندر ایمان کا نور پیدا کر دیا۔ لاکھوں کو ایمان میں رنگ دیا تو: عَلِمَاءُ اُتْبِیْئِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ۔ ایک نبی کی ذات بابرکات آتی ہے تو امتیں بن جاتی ہیں، لاکھوں، کروڑوں کو ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اس دور میں چونکہ نبوت نہیں رہی تھی، تو علماء کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام بنا دیا گیا، یہ وہ کام کریں جو انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ وہ انہی کی طرز پر تبلیغ کریں۔ وہی تربیت ہو۔ وہی تعلیم ہو۔ وہی تزکیہ نفوس ہو۔ اس طرح سے ان علماء اور مشائخ ربانی نے کام کیا اور صحیح معنی میں اپنے پیغمبر علیہ السلام کا قائم مقام بن کر دکھلایا۔

شرائع اہل صلیہ اور وضعیہ..... علم کے ساتھ قرن اول میں ظاہر بات ہے کہ ساری جزئیات تو نہیں آئی تھیں۔ ہزاروں حوادث بعد میں پیدا ہوئے مگر علل و کلیات کی صورت میں احکام موجود ہیں اور وہ منصوص ہی کے حکم میں ہیں۔ تو یہ امت کو یا مجتہدین کی امت ہے۔ جس کو علماء نے دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا کہ: ”ایک شرائع اہل صلیہ ہیں وہ وہ ہیں جو قرآن و حدیث میں حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل ہوئیں۔ اور ایک شرائع وضعیہ ہیں کہ ان شرائع اہل صلیہ سے احکام نکال نکال کر فقہ مرتب کر دیا گیا۔ کتابیں مدون ہو گئیں، ہزاروں کتابیں لکھی گئیں وہ کتاب وسنت ہی سے نکلے ہوئے احکام ہیں۔ معاذ اللہ کوئی مجتہدین کا ذاتی اختراع تھوڑا ہی ہے۔“

انہوں نے اصول سے احکام کا استنباط کیا۔ تو وہ بھی درحقیقت کتاب و سنت ہی کے احکام ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مجتہد کا ذہن پہنچتا ہے۔ ہمارا اور آپ کا نہیں پہنچتا، ہم سوائے اس کے کہ ان کا اتباع کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کی تقلید کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

تو اصل میں ان حضرات نے کتاب و سنت سے علوم اخذ کئے اور دین کو باغ و بہار بنایا، ابواب مرتب ہوئے، فصول مرتب ہوئیں اور ان فنون پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ فقہ مرتب ہوا تو ہزار ہا کتابیں فقہ میں آ گئیں، اصول فقہ مرتب ہوئے تو وہ ایک مستقل فن ہو گیا۔ اس طرح سے علم در علم اور شاخ در شاخ ہوتے ہوئے عالم کے اندر علم پھیلا تو جو شان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے کہ وہ اللہ سے علم حاصل کر کے مخلوق کو دیتے ہیں۔ وہی شان مجتہدین کی ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام سے علم حاصل کر کے امتوں کو بانٹ رہے ہیں۔

عالم بشریت کا شباب میں نے اس پر عرض کیا کہ: علم کا ابتدائی درجہ ”علم الاسماء تھا۔ یہ عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب مراہقت کا زمانہ آیا جو حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا تو ”مسمیات“ کا دور آ گیا۔ اور پھر بیچ میں شباب آ گیا تو حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام مبعوث ہوئے۔ اس وقت عمر بھی زیادہ قد و قامت بھی زیادہ، قوم عادی پر جب عذاب آیا اور وہ ہواسے پھپھڑ پھپھڑ کر گرے ہیں تو فرمایا گیا ﴿كَانَهُمْ

أَعْجَازٌ نَحْلٌ خَاوِيَةٌ﴾ ①

اتنے لے لے لے لے جیسے کھجوروں کے تنے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار۔ ڈیڑھ ہزار برس کی عمر ہے۔ ہم اور آپ ایک ایک مکان بناتے ہیں۔ تو سو سو برس میں ہماری کئی نسلیں اس میں گذرتی ہیں اور وہاں تین سو برس۔ چار سو برس گذرے مکان گر گیا، پھر مکان بنایا، پھر چار سو برس کی عمر ہوئی پھر مکان بنایا، تو ایک ہی آدمی چار چار دفعہ مکان بناتا تھا۔ کیونکہ عمر ہی ڈیڑھ ہزار برس کی ہوتی تھی۔ تو مکانات بھی نئے نئے بنتے تھے۔ بہر حال عمریں بھی زیادہ تھیں۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ: حضرت آدم علیہ السلام کا زمانہ تو عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ ہے اور عاد و ثمود کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے۔

جوانوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ بچے لڑا رہے ہیں۔ اکھاڑے کر رہے ہیں، کشتیاں کر رہے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ: مجھ سے طاقت میں کون زیادہ ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ: میں تجھ سے طاقت میں زیادہ ہوں۔ یہی ان قوموں کی حالت تھی: ﴿مَنْ أَشَدُّ مِرَافِقَةً﴾ ”ہم سے زیادہ کون قوی ہے؟“ اور ان کے کام دیکھو تو جنات جیسے فرمایا گیا: ﴿وَتَنَحْنُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ يُّوْتًا﴾ ② ”پہاڑوں کو تراش تراش کر بلڈنگیں بناتے تھے“۔ دنیا کی بلڈنگیں نیچے سے اوپر کو چلتی ہیں۔ وہ اوپر سے بناتے ہوئے نیچے لاتے، پہاڑوں کو کھود کھود کے اور تراش تراش کے بلڈنگیں تیار کیں، بہر حال یہ جوانی کا زمانہ ہے کام وہ کئے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

عالم بشریت کی طفولیت کے لئے اندازِ تعلیم اور ظاہر بات ہے بچوں کے سامنے، اگر وہ بدشوقی اختیار کریں، تو کچھ بیمار کرتے ہیں، کچھ ترغیب دیتے ہیں کہ مٹھائی کھلائیں گے، پیسے دیں گے تو بچہ تعلیم میں لگ جاتا ہے، تو کھیل کود کے اسباب سامنے زیادہ رکھتے ہیں تاکہ بچہ متوجہ ہو جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے جو صحیفے تھے تو اس میں صنائع و حرفت کی تعلیم تھی کہ دنیا کی چیزیں یوں بناؤ۔ تو دنیا کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿إِنَّمَا الْحَيَوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ﴾ ①

یہ دنیا تو کھیل کود ہی ہے۔ تو کھلونے زیادہ سے زیادہ دیئے گئے تاکہ ان کا دل راغب ہو اور اس راستہ سے علم کا راستہ دکھلادیا گیا۔ یہ گویا حکمتِ تربیت ہے کہ اسی مزاج سے اللہ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ: تم پہلے جو ان بنو۔ تب اللہ تک پہنچو گے بلکہ طفولیت ہی میں اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھلادیا گیا۔ تو مربی کا مل وہی ہے کہ انسان جس حالت میں ہے۔ اسی حالت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنا دے۔

مولانا محسن کا کووی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم اور شاعر بھی بہت بڑے گذرے ہیں اور نعت میں ان کے اشعار واقعی بڑے عالمانہ اور اونچے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ہر سال پتنگ بازی کا ایک موسم آتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور بڑے بڑے امراء کتے اُڑا رہے ہیں اور کتوں کے میچ ہو رہے ہیں کہ دوسرے کے مانجے کو کاٹا تو انہوں نے کہا کہ: وہ جیت گیا۔ تو ہار جیت ہوتی تھی۔ میچ ہوتے تھے۔ ہوا میں پتنگ اُڑاتے تھے۔ تو مولانا محسن کہتے ہیں کہ: ہمارا بچپن تھا تو ہمیں پتنگ اُڑانے کا شوق تھا مگر یہ پتنگ بازی علماء کے گھرانوں کی شان کے مناسب نہیں تھی۔ اس لئے والد ماجد نے روکا بھی مگر اس میں سے اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا راستہ نکال دیا۔ چنانچہ فرمایا: ”تم چاہتے ہو کہ تم جیت جاؤ اور تم دوسرے کے مانجے کو کاٹ دو؟ انہوں نے کہا جی! یہ چاہتے ہیں۔ فرمایا اس کی تدبیر میں تم کو بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رات کو اخیر شب میں اٹھ کر پہلے تو چار رکعت پڑھو اور اس کے بعد قلّ ھو اللہ پڑھ کر مانجا سوتے رہو اور اللہ کا نام لیتے رہو۔ پھر جوڑو گے تو تم ہی جیت جاؤ گے۔

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ: اب ہم اخیر شب میں اٹھتے وضو کرتے، نماز پڑھتے، قلّ ھو اللہ پڑھ کر مانجا سوتے۔ اب جو میچ ہوتا۔ اکثر کامیاب ہو جاتے۔ فرمانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان ہونے کے بعد پتنگ بازی تو چھوٹ گئی۔ مگر تہجد باقی رہ گیا۔ اور معرفت باقی رہ گئی۔ غرض یہ ایک تدبیر تھی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ: جب تم بڑھو گے تو تم خدا کو پہچانو گے۔ نہیں بلکہ لڑکپن ہی کی نفسیات اور کیفیات سے تم اللہ کو پہچانو۔ تو اس راستے پر ڈال دیا۔

اسی طرح سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں اسماء کے ذریعے اللہ تک پہنچایا گیا اور نوح علیہ السلام کے زمانے میں مسمیات کے ذریعے پہنچایا۔ قوم عاد اور قوم ثمود جو ان قومیں تھیں۔ ان کو ان کی قوت کے راستے سے پہنچایا۔ عالم بشریت کے شباب کے لئے اندازِ تعلیم یہ قاعدے کی بات ہے کہ بچہ اگر بدشوقی دکھلائے تو ایک

آدھ ٹھہر مار دیا۔ کچھ ترغیب دیدی۔ لیکن اگر جوان آدمی سستی دکھلائے تو استاد صبر نہیں کر سکتا، سخت سزا دیتا ہے کہ جب جوانی میں کام نہیں کیا تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے؟ جوانی اور مانجا ڈھیلا؟

تو اس عمر میں پیار وغیرہ زیادہ نہیں کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے کہ پھر تمہارے کام کرنے کی کوئی عمر آئے گی؟ تو قوم عادا اور غموند نے جب سرکشی دکھلائی تو یہ نہیں کہ انہیں کھیل کھلونے دیئے گئے ہوں۔ بلکہ آندھی مسلط کی گئی اور ہوا سے تباہ کیا گیا۔ قوم شمو کو چنگھاڑ سے تباہ کیا گیا کہ جوان ہو کر جب عمل نہیں کرو گے تو کیا عمل کرنے کے لئے بڑھاپے کا زمانہ آئے گا؟ اس واسطے جوانوں پر ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ زیادہ نہیں ہوتی۔ انہیں ترغیبات زیادہ دیتے ہیں اس لئے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

عالم بشریت کا بڑھاپا قوت فکر یہ کہ از یاد..... درجہ بدرجہ یہاں تک کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آیا۔ تو عالم بشریت کے بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ گویا نبی آدم ضعیف ہو چکے ہیں۔ نہ وہ قد و قامت رہے نہ ہی وہ عمریں رہیں نہ وہ طاقتیں رہیں جو بچھلوں میں تھیں۔ مگر بوڑھے آدمی کا دماغ تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ عقل بڑی ہوتی ہے اگرچہ کام کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جوانوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ اس لئے کہ وہ زمانے کے گرم اور سرد سے گزر چکے ہیں اور تجربات ان کے سامنے ہیں۔ تو جوانوں کا کام یہ ہے کہ وہ علم میں لگیں لیکن جب رکاوٹ پیش آئے تو بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ وہ کام کی بات بتائیں گے۔

بڑھاپے میں علم کی وسعت..... وہ کہتے ہیں کہ کہیں بارات گئی اور بارات میں سودو سو آدمی تھے۔ جس گھر میں گئی وہ بہت کھانا پیتا مگر نہ تھا تو انہوں نے یہ شرط لگائی کہ: بارات جو آئے تو اس میں کوئی بوڑھا ساتھ نہ ہو۔ سارے جوان ہوں۔

دو لمبے والوں کے ہاں مشورہ ہوا کہ بوڑھا ساتھ نہ ہو اور کوئی مشکل آن پڑی تو مشورہ کون دے گا؟ تو بوڑھے کو ڈھول میں بند کر کے لے گئے تاکہ ان کی بات کا بھی خلاف نہ اور بوڑھا بھی پہنچ جائے۔

بارات جب پہنچی تو صاحب خانہ نے کہا کہ: لڑکی تو دی جائے گی مگر۔ شرط یہ ہے کہ ہر آدمی کے سامنے ایک بکرا اقل کر رکھا جائے گا اور وہ اس کو پورا کھانا پڑے گا۔ اگر نہ کھاسکیں تو ہم بیٹی نہیں بیاہیں گے۔

اب یہ بے چارہ پریشان ہوئے کہ اتنا معذہ کس کا ہے کہ پورا بکرا اپنے اندر اتار لے۔ تو انہوں نے کہا کہ بھئی! سوچ کر جواب دیں گے، تو ڈھول والے کے پاس پہنچے اور بڑے میاں کو ڈھول میں سے نکالا اور کہا کہ شرط لگائی ہے کہ ایک آدمی ایک بکرا کھائے۔ ہم میں تو اس کی طاقت ہے نہیں۔ اگر شرط رد کرتے ہیں تو پھر نکاح نہیں ہوگا۔ مانتے ہیں تو ہم میں طاقت نہیں۔

بڑے میاں نے کہا کہ: نہیں تم مان لو اور ان سے کہو کہ ایک ایک کر کے تل کر دیتے جائیں۔ اب جو نبی ایک بکرا آتا تو وہ ساری بارات میں بوٹی بوٹی آتی اور بکرا ختم ہو جاتا۔ اس طرح کر کے بڑے میاں کے مشورہ سے ان

کی شرط بھی پوری ہوئی اور بارات دلہن لے کر واپس ہوئی۔

بوڑھی امت پر بار عمل کی کمی..... یہ امت بوڑھی ہو گئی ہے۔ اس واسطے علی طاقت تو اگرچہ گھٹ گئی مگر دماغی اور قلبی طاقت بڑھ گئی، تجربات وسیع ہو گئے دنیا کی امتوں کے احوال قرآن وحدیث کے ذریعے سے اس کے سامنے ہیں۔ تو یہ امت عالم بھی ہے اور مجتہد بھی اور تجربہ کار بھی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا یہی کام ہوتا ہے کہ عملی بات تو ان پر ڈالی نہیں جاتی۔ ان کے ذمہ معمولی کام لگایا جاتا ہے مگر ان کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے کہ بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔ چنانچہ اگر شادی بیاہ ہو تو دیگ کے اوپر بڑے میاں کو بٹھا دیتے ہیں۔ آپ مگرانی فرماتے ہیں۔ جوان آدمی کھانا لے جا رہے ہیں۔ رکھ رہے ہیں، مگر بڑے میاں بیٹھے ہوئے ہیں اور شام کو کہتے ہیں کہ: ”صاحب! بڑے میاں کی حکمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ صبح سے شام تک مگرانی فرمائی۔ حالانکہ بڑے میاں نے کیا کیا بیٹھے ہی تو رہے۔ کوئی حرکت تو نہیں کی۔“

مگر بڑی تحسین کرتے ہیں کہ بڑے میاں کی ہمت ایسی، تو بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے۔ عمل کا بار کم کر دیا گیا۔ وہ بچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے، نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال، وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی کہ ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور دس کے بعد سات سو تک۔ اور: ﴿وَاللّٰهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يُّشَاءُ﴾ ”اور اللہ جتنا چاہے اجر بڑھا دے“۔ غرض اجر اور بڑھا دیا تحسین بڑھا دی مگر عمل کا بار گھٹا دیا ہے، اس لئے کہ امت بوڑھی ہو چکی تھی۔ تو عمل کا بار بہت کم اور اجر بہت ہی زیادہ۔ تکمیل دین..... بہر حال مطلب یہ کہ درجہ بدرجہ عالم بشریت نے ترقی کی تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ابتداء ہوئی اور یہ انتہا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئی۔ اس وقت توقعات تھیں کہ امتیں بڑھیں گی اور اس دور میں آکر وہ توقعات عملی شکلوں میں آگئیں کہ امت کامل ہو گئی۔ ﴿هَٰذَا الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ ① دین کامل کر دیا گیا۔ بلحاظ عقائد کے بھی، بلحاظ اخلاق کے بھی، بلحاظ اعمال کے بھی اور بلحاظ احوال وسنن کے بھی۔ تو ہر حیثیت سے اس امت کی تکمیل کی گئی۔ یوں دین کامل ہوا۔

انتہاء زیادہ خوشی کی چیز..... تو میں شروع میں عرض کر رہا تھا کہ: یہ امت تکمیل پسند ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر تکمیل پسندی کا جذبہ ہے، اس لئے اس کو ابتداء سے زیادہ انتہا پر خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت تکمیل کا ہوتا ہے۔ گواہ اور انتہادوں ہی خوشی کی چیزیں ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت مٹھائی بانٹتے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب انتقال ہو تو انتہائی خوشی کریں کہ بھائی! آج تکمیل ہو گئی! گویا کتنا خوشی کا وقت ہے۔ مگر آپ کہیں گے اس وقت تو کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ سارے بیٹھ کر روتے ہیں۔ لیکن چونکہ تکمیل کو پہنچ گیا تو خوش ہونا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ: موت پر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ انتقال پر کوئی خوش نہیں ہوتا بلکہ موت اگر اچھی ہوتی تو سب کہا کرتے ہیں کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت کوئی رونے کی ایسی چیز ہوتی تو یہ دعائیں کیوں کرتے کہ ایسی موت ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔ اللہ کے راستے میں کوئی شہید ہوا۔ کہتے ہیں بڑے رقبے کی چیز ہے۔ اللہ ہمیں بھی ایسی موت نصیب کرے۔ معلوم ہوا موت غم کی چیز نہیں۔ موت تو خوشی کی چیز ہے۔ غم اپنے عزیز کی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا عزیز جدا ہو گیا۔ اس کے فیض سے محروم ہو گئے۔ اس کے انتقال کا صدمہ نہیں ہوتا، انتقال سے تو وہ اللہ تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی صدمہ کی چیز ہے، ایک آدمی خدا سے جا ملا، یہ کون سی رونے کی بات ہے، یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ عمر جس کام کے لئے رکھی گئی تھی آج وہ کام پورا ہو گیا کہ وہ اللہ تک پہنچ گیا۔

اس بات کو حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: **الْمَوْتُ نَحْفَةُ الْمُؤْمِنِ** ① سب سے بڑا تحفہ مومن کے لئے موت ہے۔ اور کیوں ہے؟ اس لئے ہے کہ: **إِنَّ الْمَوْتَ جَسَرٌ يَصِلُ الْحَبِيبَ إِلَى الْحَبِيبِ** ② موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے، تو محبوب سے کبھی عاشق کامل جانا، یہ غم کی چیز تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے۔ آپ روتے ہیں اس لئے کہ ایک عزیز جدا ہو گیا۔ تو جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ چونکہ ایک وقت میں دو چیزیں ہیں تو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ موت پہ رورہے ہیں۔ موت پر کوئی نہیں روتا وہ تو تحفہ ہے۔

تمنائے انتہاء..... یہی وجہ ہے کہ موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے۔ جتنے اولیاء ہیں وہ موت کی تمنا رکھتے ہیں۔ فساق و فجار موت سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی امیدیں سامنے نہیں آرہیں۔ اولیاء کرام اور ربانی لوگ وہ تمنا میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

خرم آں روز کزیں منزل ویراں برویم تادور میکده شاداں و غزل خواں برویم
کون سی مبارک گھڑی ہوگی جو اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑیں گے اور اس شہر مطلوب میں ہم پہنچیں گے جس کا اللہ نے وعدہ دیا ہے۔

تو موت کی تمنا علامت ولایت ہے اس لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: **اَللّٰهُمَّ حَبِيبَ الْمَوْتِ اِلَيَّ مَنْ يُّعَلِّمُنِي رَسُوْلُكَ** ③ ”اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول و نبی ہونے کا قائل ہو“۔ جس حدیث میں موت کی تمنا سے ممانعت کی گئی ہے۔ وہ اس لئے کہ دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے، اللہ کی ملاقات کے شوق میں جو تمنا مطلوب ہے، اس کا حکم دیا گیا ہے: یوم تکمیل کا انتخاب..... اس امت کے مزاج میں چونکہ تکمیل پسندی ہے۔ تو سید الاایام کے انتخاب میں ام کے

① تخریج گزربچی ہے۔ ② تخریج گزربچی ہے۔ ③ المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۳، ص: ۴۸، علامہ بیہقی فرماتے ہیں:

رواہ الطبرانی وفيہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وهو ضعیف وکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰، ص: ۳۰۹.

امتحان کے وقت اس امت نے اپنی عبادت کے لئے یوم تکمیل خلاق یعنی جمعہ کو پسند کیا۔ یہود نے ہفتہ کو اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار کو، مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں جو منتخب دن تھا وہ یوم جمعہ تھا جو یوم تکمیل ہے اور وہ اس امت مسلمہ نے پسند کیا: حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عصر اور مغرب کے درمیان ہوئی۔ اس سے پہلے نظام بتا دیا گیا تھا، گھر یا سجاد یا گیا تھا۔ ضرورت مہیا کر دی گئیں تھیں، کھانا، دانا پانی غذا وغیرہ سب چیزیں زمین میں پھیلا دی گئی تھیں۔ اخیر میں مہمان کو لایا گیا۔ اور اسی پر تخلیق کی تکمیل ہو گئی۔ غرض اس امت نے یوم تکمیل کو پسند کیا۔ اس لئے کہ تکمیل پسند تھی تو دن بھی وہ اختیار کیا جس میں کمال تھا۔

ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز..... بہر حال بات دور جاتی ہے، تو ابتدا بھی خوشی کی چیز اور انتہاء بھی خوشی کی چیز۔ تو بحمد اللہ ہمارے عزیز محمد ازہر نے قرآن کریم ختم کیا تو یہ یوم تکمیل ہے، جس وقت یہ شروع کر رہے تھے تو اساتذہ کرام نے ماں باپ نے امیدیں باندھی تھیں کہ انشاء اللہ حافظ ہوگا۔ توقع ہے کہ وہ حافظ ہو جائے۔ آج وہ توقع پوری ہو گئی۔ یہ انتہائی خوشی کا دن ہے۔

بہر حال آج یہ تقریب ہے اور تقریب خوشی کی ہے اور خوشی بھی تکمیل کی ہے آغاز اور ابتداء کی نہیں بلکہ حد کمال پر پہنچ جانے کی ہے۔ تو ان کے لئے دعا ہے کہ حق تعالیٰ نہیں حافظ جید بنائے اور قاری مجود بنائے۔ عالم با عمل بنائے، صاحب اخلاق وصی و تقی بنائے اور وہ ساری امیدیں پوری ہوں جو ماں باپ اور اساتذہ کرام نے باندھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان چیزوں کو بھی اسی طرح سے مکمل فرمادے جس طرح سے قرآن شریف کے حفظ کو آج انہوں نے مکمل کر دیا۔

آج اس کے الفاظ ان کے سینے میں جمع ہو گئے، کل کو انشاء اللہ اس کے معانی جمع ہوں گے، معانی کے بعد اس کے حقائق جمع ہوں گے، حقائق کے بعد ان کی علل آئیں گی، علل کے بعد پھر اسرار و مصالح اور حکم بھی منکشف ہوں گی۔ تو اس طرح علم بڑھے گا۔ غرض ایک درجہ میں یہ آغاز ہے یعنی معانی سمجھنے کے لئے اور ایک درجہ میں یہ تکمیل ہے یعنی الفاظ کے حفظ کی۔

علوم و شخصیات کے مراتب..... تو الفاظ سینے میں آ گئے اور قرآن کریم دو ہی چیزوں کے مجموعے کا نام ہے نہ محض الفاظ کا نام قرآن ہے اور نہ محض معانی کا نام۔ بلکہ الفاظ مع المعانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ اس میں الفاظ یاد کئے جاتے ہیں اور معانی سمجھے جاتے ہیں، تو ایک میں قوت حافظہ کام کرتی ہے، ایک میں قوت عاقلہ کام کرتی ہے، تو قوت حافظہ کا کام یہ ہے کہ الفاظ بعینہ اپنے اندر محفوظ کر لے اور قوت عاقلہ کا کام یہ ہے کہ ان الفاظ کے اندر سے معانی نکالے اور معانی کے بھی اندر سے معانی نکالے۔ اس لئے کہ قرآن تو ایک سمندر ہے۔ معانی در معانی اس کے اندر کچے ہوئے ہیں۔

حرف خوش را چند در معنی معنی در معنی در معنی

ابتدا میں ایک لفظ ہے جو قشر کی مانند ہے اور مغز اس کے معنی ہیں۔ پھر معنی بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معنی ہیں، پھر وہ بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معانی ہیں۔ غرض جیسے علوم کے مراتب ہیں ایسے ہی حق تعالیٰ نے شخصیات کے بھی مراتب قائم کئے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ الفاظ کے فقط مدلول کو سمجھ لیتا ہے وہ بھی اونچے درجے کا آدمی ہے، ایک یہ کہ مدلول سے آگے بڑھ کر وہ حقائق تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سے اونچا عالم ہے، اور ایک وہ ہے کہ حقائق کے بعد علل و اسرار کو بھی سمجھتا ہے وہ اور بھی اونچے درجے کا عالم ہے تو جیسے آیات قرآنیہ میں مراتب ہیں ایسے ہی شخصیات میں بھی مراتب ہیں، ایک لفظوں کا عالم، ایک معانی کا عالم، ایک علل و اسرار کا عالم، پھر سینکڑوں قرآن کریم کے علوم ہیں جن کا آدمی عالم بنتا ہے۔

• غرض یہ ایک خوشی کا دن ہے۔ کہ ہمارے ایک عزیز کے قرآن کریم کے حفظ کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے بعد حفظ معنی کا درجہ شروع ہوگا۔ اب ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معانی کا عالم بھی بنائے۔ پھر یہ دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر نفسِ مز کی بھی پیدا کرے تاکہ حقائق اور علوم و معارف ان پر کھلیں۔

تبریک..... بہر حال اس خوشی کے موقع پر میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی خدمت میں ان کے والدین اور ان کے اساتذہ کرام کی خدمت میں ”مبارک باد“ پیش کرتا ہوں۔

حسن طلب نہیں بیان واقعہ..... مگر بھی! ہمارے ہاں تو یہ دستور ہے کہ جب مبارک باد ہوتی ہے تو منہ میٹھا ضرور کراتے ہیں۔ فقط چائے پہ ٹر خاد یا یہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے منہ میٹھا ہونا چاہئے۔ بلکہ پہلے ہونا چاہئے تھا۔ میٹھے منہ سے جو دعا نکلتی ہے اس میں چپک زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ منہ میٹھا کرایا جائے تاکہ دعا جا کے اچھی طرح چپکے۔ اور یہ حسن طلب نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کہنے سے ایسا کریں۔ بلکہ یہ دستور ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے وہ اس کا درجہ ہے۔ بہر حال ہمارا کام تو یہ ہے کہ جب حاضری ہوئی تو مبارک پیش کریں اور خوشی کا اظہار کریں۔ حق تعالیٰ شانہ۔ ان جیسے اور بھی حفاظ اس مدرسے سے پیدا کرے۔

حُسنِ نیت کے ثمرات..... ہمارے بھائی مولانا (محمد یوسف) بنوری مرحوم، جس خلوص سے انہوں نے یہ ادارہ قائم کیا اور جس ضبط و نظم اور منظم طریق پر اسے چلایا اور بہترین قواعد و اصول بنائے یہ حقیقت میں ان کی نیت کے ثمرات ہیں جو سامنے آرہے ہیں۔ بلند نگیں کھڑی ہوئی ہیں۔ نظم بنا ہوا ہے علماء و طلباء جمع ہیں، درس و تدریس بھی ہے۔ ایک مخلص پیدا ہو تو ہزاروں اس سے بن جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں نبی ایک ہی ذات آتی ہے۔ مگر لاکھوں لوگ ایمان سے رنگے جاتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ اس امت میں شخصیات پیدا فرماتے ہیں۔ ان شخصیتوں کے ذریعے سے آگے شخصیتیں بنتی ہیں۔ بہر حال یہ مولانا مرحوم کی نیت کے ثمرات ہیں۔

اخلافِ صدق کا وعدہ..... جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، اسی طرح سے شخصیات کے بھی پیدا کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ حدیث میں اس کا وعدہ موجود ہے۔ بِحَمْلِ هَذَا الْعِلْمِ مِنْ كُلِّ

خَلَفَ عَدُوْلُهُ ① سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ سلف کا علم حاصل کرتے رہیں گے۔ غرض شخصیات کے پیدا ہونے کا وعدہ دیا گیا۔ یہ ناممکن ہے کہ نہ ہوں۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحبِ ازمانہ خراب آگیا۔ اب خلف صحیح پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ: علی الاطلاق یہ غلط ہے۔ بے شک خلف دیئے نہیں جیسے سلف ہیں، تو نوعیت قائم رہے گی۔ کبھی مٹنے والی نہیں۔ علماء کے بعد علماء حفاظ کے بعد حفاظ پیدا ہوتے رہیں گے۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: خَيْرُ الْقُرُونِ قُرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ② بہترین دور میرا دور ہے، جو صحابہ کا دور ہے۔ پھر تابعین ہیں۔ پھر تابع تابعین ہیں تو جو مقام صحابہ کا ہے وہ تابعین کا نہیں۔ جو تابعین کا ہے وہ تابع تابعین کا نہیں۔ یہ شخصیات میں درجات اور فرق مراتب کا قصہ ہے۔ لیکن نوعیت قیامت تک یکساں رہے گی۔ جس کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا: ”میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلا قطرہ زیادہ نافع ثابت ہوا کہ بعد کا قطرہ۔ بارش ہے۔ اول و آخر قطرات پڑ رہے ہیں، زمین سیراب ہو رہی ہے۔ غرض امت میں خیر باقی رہے گی۔ فرق مراتب ہوتا رہے گا۔ اس سے خیر کا انقطاع نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت اور شخصیات کے ذریعے سے معیار قائم کرایا۔ ان کے ذریعے حق کی راہیں نظر آئیں گی۔ اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ: اگر اہل حق میں اختلاف ہو جائے۔ تو اختلاف اس کا عذر نہیں کہ حق کو چھوڑ دیا جائے۔ جدوجہد ختم کر دی جائے۔ اگر آپ خدا نخواستہ بیمار ہو جائیں اور اطباء کی رائے میں اختلاف ہو جائے تو کبھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تو انتقال کرتے ہیں اور قبر میں جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اطباء میں اختلاف ہے۔ آپ منتخب کرتے ہیں۔ خواہ اس لحاظ سے کہ یہ طبیب فلاں طبیہ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے یا اس معیار سے کہ لوگ اس کے یہاں زیادہ شفا یاب ہوتے ہیں یا اس لحاظ سے کہ ان کے خاندان میں جدی طور پر طب چلی آرہی ہے اس کو طب سے زیادہ مناسب ہے، کوئی نہ کوئی معیار لے کر آپ انتخاب کریں گے یہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے کہ اطباء میں اختلاف ہے لہذا انتقال فرما جانا چاہئے۔ لہذا قبر کو آباد کرنا چاہئے۔ غرض جسمانی صحت اور اطباء کے بارے میں ان کے اختلاف سے آپ گھبراتے نہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ تو علماء میں اگر اختلاف ہو تو آپ کیوں انتخاب نہیں کریں گے؟ وہاں کیوں یہ فیصلہ کریں گے کہ چونکہ علماء اختلاف کر رہے ہیں لہذا دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔ وہاں بھی انتخاب کرنا چاہئے۔

معیار انتخاب..... اب انتخاب کا معیار الگ ہے۔ اصل چیز آپ کی طلب صادق ہے جس عالم کی دیانت پر آپ کو اعتماد وطمینان ہو۔ دین اس کے سپرد کریں اور اس سے پوچھ پوچھ کر اس پر عمل کریں۔ آپ کو حکم کس نے بنایا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو آپ ثالث بنیں کہ جب ان کا اختلاف ختم ہو تو میرا دین سنھلے گا۔ تو نہ اختلاف رفع ہوگا نہ

① السنن الکبریٰ للبیہقی، ج: ۱۰، ص: ۲۰۹۔

② الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۱، ص: ۳۸۱۔

آپ کا دین سنبھلے گا۔ ان لڑنے والوں میں اور اختلاف کرنے والوں میں جس فرد یا جس جماعت اور طبقہ پر آپ کا دل مطمئن ہو۔ اس کی طرف آپ رجوع کریں اور اس سے آپ آنکھ بند کر لیں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔

عوام کے لئے حجت میں تو ایک مختصر بات کرتا ہوں کہ عالم کے لئے تو کتاب و سنت حجت ہے ان میں وہ مسائل تلاش کریں۔ عوام کے لئے حجت خود وہ عالم ہے۔ عوام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن و حدیث کو سمجھیں۔ انہیں تعلیم نہیں اسے کیا سمجھیں گے؟ عوام کا کام یہ ہے کہ عالم ربانی جو فتویٰ دیں اس پر عمل کریں۔ اور مان لیجئے کہ کسی نے غلط فتویٰ دیا۔ آپ کی ذمہ داری نہیں، آپ کے لئے نجات ہے، اس عالم کی گردن پنے گی کہ اس نے کیوں غلط فتویٰ دیا؟ ﴿مَنْ أَفْسَىٰ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَاثِمُهُ عَلَىٰ مَنْ أَفْتَىٰ وَقَالَ كَانَ إِثْمُهُ عَلَىٰ مَنْ أَفْتَاهُ﴾ ① حدیث میں ہے کہ جس نے غلط فتویٰ دیا تو مفتی کو پکڑا جائے گا عمل کرنے والے کو نہیں پکڑا جائے گا، اس نے دیانت داری سے عمل کیا، تو آپ اپنی جدوجہد صرف کریں، ان اختلاف کرنے والوں میں کون سا طبقہ ہے، کون سا فرد ہے جو واقعی متدین ہے، اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ آپ دین کے بارے میں اس سے مدد لیں۔ علماء میں اختلاف ہے وہ ان پر چھوڑ دیں آپ کوئی حکم نہیں ہیں کہ بیٹھ کر فیصلہ دیں وہ اپنا فیصلہ خود کریں گے آپ میں اس کی سکت اور استطاعت نہیں ہے۔ ان میں فیصلہ کا حکم وہ بنے گا جو ان دونوں عالموں سے بڑھ کر عالم ہو۔ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ صحیح کہتا ہے یہ غلط، آپ الف سے ب نہیں جانتے اور علماء کے اندر فیصلہ کرنے کے لئے چلے۔

تو آپ کیا فیصلہ دیں گے؟ آپ کا کام اطمینان کے بعد انتخاب ہے اس سے سن کر اپنا دین چلائیں، فتویٰ اور مسئلہ پوچھنے کے ذریعے اپنا دین سنبھالیں۔ جب دین اور علم آ گیا اب آپ ذمہ دار ہیں جس راستے پر آپ چلیں گے۔ دیانت سے چلیں گے۔ اس لئے بڑی خرابی یہ ہے کہ اختلافات کو دیکھ کر لوگ اس فکر میں ہیں کہ دین کو چھوڑ دیا جائے کہ صاحب! ہم کہاں جائیں؟ سوال یہ ہے کہ جب بیمار ہوتے ہو تو اطباء میں اختلاف ہو جائے تو کہاں جایا کرتے ہو؟ کیا قبر میں جایا کرتے ہو؟ ان میں سے کسی کو حکم اور منتخب کرتے ہیں، یہاں کیوں نہیں انتخاب کر لیتے؟ دین کے بارے میں خود مفتی بننے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔

اتحادِ علماء کی ضرورت اس واسطے علماء کے حق میں تو یہی عرض کیا جائے گا کہ وہ آپس میں اتحاد کریں۔ کوئی بھی قدر مشترک لے لیں۔ مگر اتفاق کریں۔ اپنی ذاتی خصوصیات اپنے گھر میں رکھیں۔ خود عمل کریں اور جو آپ کے زیر اثر ہے، اس سے عمل کرائیں، لیکن جو قدر مشترک ہے۔ اس میں متفق ہو کر سامنے آؤ۔ دشمنانِ اسلام بہت ہیں، اعداء اللہ بہت ہیں جو رات دن دین پر حملہ آور ہیں اور استیصال کی فکر میں ہیں۔ آپ ان کے مقابلے میں کیوں نہیں آتے۔ تمام تر جدوجہد آپس کی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔ غرض آپس میں کسی بھی قدر مشترک پر اتفاق کر کے سامنے آؤ۔ مثلاً اللہ واحد، رسول صلی اللہ علیہ وسلم واحد کتاب اللہ واحد۔ اب اگر کسی میں مفہوم کا

اختلاف ہے تو ہوتا رہے۔ آپ اپنی دینی زندگی کی فکر کریں۔

طلبِ صادق..... بہر حال علماء میں اتفاق کرانے یا علماء میں اتفاق ہو جانے کے انتظار میں آپ اپنی دینی زندگی کے بارے میں بے فکر نہ ہوں۔ طلبِ صادق سے آپ کو با اعتماد علماء مل جائیں گے۔ آج بھی ایسا نہیں کہ دنیا میں علماء ربانی آپ کو نہ ملیں۔ اگرچہ وہ تھوڑے ہیں مگر ضرور موجود ہیں۔ ان کا دامن پکڑ پکڑ کر پوچھ پوچھ کر اتباع کرتے چلے جائیں۔ آپ کی اپنی زندگی سنورتی چلی جائے گی۔ غرض علماء کے اختلاف کو دین سے بیزاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ انتخاب کا طریق اپنایا جائے۔ یہ چند باتیں میں نے آپ حضرات کی خدمت میں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل مرحمت فرمائے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنا نصیب فرمائے۔ (آمین)

وَاجْعُرْ دُغْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

(کتبہ، اتحادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تاریخ اسلام کی ایک زندہ جاوید شخصیت

آخر عمر میں آپ نے بطور خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا و عقبیٰ دونوں کے اکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ،)

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنے یہاں علماء اور مصلحین امت کے تعارف کے لئے ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی تقریر جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق براڈ کاسٹ ہوئی، نذر قارئین ہے۔
موضوع تقریر..... میری اس تقریر کا موضوع ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی ایک زندہ جاوید شخصیت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند ہے۔

حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سن ۱۲۳۸ھ، بمطابق سن ۱۸۲۲ء میں اور وفات سن ۱۲۹۷ھ بمطابق ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ اس ۴۹ سال کی قلیل مدت میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی اور قومی خدمت کے سلسلے میں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ صدیوں کی وسعت کے تھے، جنہیں ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انگریزی اقتدار کا تسلط اور مسلمانوں کی شکست..... سن ۱۸۵۷ء میں آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ہندوستان سے غیر ملکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی لیکن جنگ میں شکست ہو گئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا، اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساس کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مشنریوں نے عیسائی اقتدار کے زیر سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا عطیہ اور امانت ہے، اس لئے اس میں مسیحی مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصب العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور اتہامات کی بوچھاڑ بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے الحاد و ہریت کی زد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں کہ

آئندہ سلیس خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہوں خود اپنے اخلاقی نظام اور تہذیب و کچر سے بیگانہ محض ہو کر رہ جائیں گی۔ مذہبی انقلاب کی ضرورت..... حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے نور معرفت سے وقت کی رفتار اور اس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور باشارات غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں الجھنے کے ایک عالمی نقطہ نظر پر ڈال دیئے اور قوم میں ایک مذہبی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی تاکہ یہ احساس کمتری دور ہو۔ اس کے لئے آپ نے تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار فرمایا جو بے ضرر اور رسمی سیاست سے دور تھا۔

چنانچہ سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ایمانی فراست سے چھینے ہوئے اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریت فکر کے بقاء و ارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد سن ۱۸۸۳ء جبر برطانیہ سن ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر با آسانی حاصل کر لیا۔ اس الہامی نقطہ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریت فکر اور استقلال وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتب فکر اور عظیم تحریک ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانے پر مدارس قائم فرمانا شروع کئے اور بنفس نفیس خود جا کر مراد آباد، گلا دھڑی، امر وہہ، مظفر نگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جا بجا اپنے متوسلین کو زبانی اور خطوط کے ذریعے قیام مدارس کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ بہت سے مدارس ہندوستان میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں قائم ہو گئے۔

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی..... اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے حریت فکر کے امین فضلاء نے پورے ملک میں حتیٰ کہ انہی فضلاء نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرز فکر پر تعلیم گاہیں قائم کیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پا رہا ہے۔ عالمی پیمانے پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے، جس کیلئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صاحب دل علماء اور صداقت شعار رفقہ کار حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب مولانا فضل الرحمن صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ یہی دارالعلوم دیوبند آج ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقوامی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتب فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت و عظمت کی حامل ہے۔

مدارس عربیہ کی معنوی بنیاد..... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسے اصولوں پر قائم فرمایا جن کے تحت روز ازل سے یہ درس گاہ ایک عوامی ادارہ کی پوزیشن میں نمایاں ہوئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ والا نے اس سلسلہ میں آٹھ اصول اپنے دست مبارک سے لکھے جو دارالعلوم کے تاریخی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں اور آج تک ہر دور میں بانی دارالعلوم کے ان الہامی اور اساسی رہنما اصولوں کی پوری پوری حفاظت و رعایت کی جاتی رہی ہے۔ یہ اصول درحقیقت دارالعلوم دیوبند کی معنوی بنیاد ہیں، جن پر اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر کھڑی ہوئی۔

اور نہ صرف دارالعلوم ہی بلکہ ان تمام مدارس عربیہ کی بھی اساس ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے رنگ پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متوسلین نے قائم فرمائے۔ چنانچہ ان اصولی ہشت گانہ پر حضرت آندس نے سرخی بھی یہی قائم فرمائی کہ: ”وہ اصول جن پر مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں۔“

یہی ہمہ گیر اصول قیام مدارس کی اس اجتماعی تحریک کی بنیاد بنے جس سے سن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نشاۃ ثانیہ ملی۔ ان اصول کے مطابق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو صرف عوامی چندہ پر قائم فرمایا تاکہ اس میں ابتدا ہی سے ہمہ گیری کا عنصر نمایاں رہے اور یہ دارالعلوم ہندوستان کے غریب عوام کا ادارہ ثابت ہو۔ ساتھ ہی اصول میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اس مدرسہ کے لئے جائیدادوں اور کارخانہ تجارت سے کسی مستقل آمدنی کا کوئی بندوبست نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے پر امداد فیہی منقطع ہو جائے گی۔ رجوع الی اللہ کا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جن کو ان کے مخلص رفیق کار حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب عثمانی نے اپنی طویل نظم کے بعض اشعار میں بایں الفاظ ظاہر فرمایا کہ:

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قدیل معلق اور توکل کا چراغ یوں سمجھ لینا کہ بے نور و ضیاء ہو جائے گا

ان اصولوں میں خصوصیت سے اسے اہمیت دی گئی ہے کہ تعلیم مکمل طریق پر آزاد رہے جو کہ اجتماعیت کی روح ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اصولا معاملات دارالعلوم کو مشورہ کے اصول پر قائم فرما کر اس کو عہد استبداد میں جمہوریت کا نقیب بنادیا گیا اور خاص طور پر ذمہ دار ادارہ (مہتمم) کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ علاوہ مقررہ اہل شوریٰ کے ایسے واردین، صادرین سے بھی مشورہ کرے جو مدارس کے خیر خواہ اور ان سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ یہ اصول حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے ہمہ گیر اور اجتماعی فکر کے ناقابل انکار شواہد ہیں اور انہیں سے دارالعلوم دیوبند کی نوعیت، واہمیت بھی واضح گاف ہو جاتی ہے۔

خلافتِ ترکی کی تائید..... انگریزوں کے قومی استبداد کو توڑنے کے لئے جس کا رخ خصوصیت سے مسلمانوں کی طرف تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ہمہ گیر سیاسی راہنمائی سے اس دور کی خلافتِ اسلامیہ یعنی خلافتِ ترکی کی تائید کی طرف مسلمانوں کو خاص طور پر جھکایا۔ سلطانِ ترکی کی مدح میں قصیدے لکھے اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین ہونے کے مسلمانوں کو ان کی طرف مائل کرتے رہے اور اس دور میں جنگِ روم دروس ہوئی تو خود بہ نفس نفیس دورے کر کے ترکوں کے لئے ہزاروں روپیہ روانہ فرمایا اور خود اپنے گھر کا تقریباً بڑا سامان بطور چندہ ترکی خلافت کی مدد کے لئے روانہ فرمایا تاکہ خلافت سے وابستہ رہ کر ملی اجتماعیت برقرار اور شیرازہ بند رہے۔

اس جذبہ سے ملک کی دوسری قوموں کو بھی ہمدردی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ جب مسلمانان ہند نے احیاءِ خلافت کی تحریک شروع کی تو بلا تفریق مذہب و ملت ملک کی تمام مذہبی اکائیاں متفق و متحد ہو کر اس میں براہِ برابری

شریک رہیں۔ اس اجتماعیت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حج کی ترغیب دیتے تھے کہ بذات خود حج ایک اجتماعی اور بین الاقوامی عبادت ہے تاکہ مشرق و مغرب کے مسلمان یکجا جمع ہو کر باہم وابستہ ہوں اور ان کی بین الاقوامی اجتماعیت کا رشتہ مضبوط ہو اور ساتھ ہی ترکی خلافت سے بھی انہیں وابستگی رہے۔

فکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے تین بنیادی عناصر..... یہ تفصیل فکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے ان تین بنیادی عناصر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے کہ ملت کی بقاء و ارتقاء تعلیم کی ہمہ گیری، ذوق اجتماعیت کے عموم اور مرکزیت سے باعظمت وابستگی ہی میں مضمر ہے۔ آخر کار یہی روح ان کے تربیت یافتوں میں بھی راسخ ہوئی اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ قاسمی فکر کے امین بنے اور ان کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حلف الرشید حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ اس کے علمی امین بنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ریشمی خطوط کی تحریک اٹھائی اور پانچ برس مالٹا میں انگریز کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ ان کے بعد ان کے ہزار ہا شاگردوں میں بھی یہی رنگ جو ہر نفس ہوتا رہا۔

جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری وغیرہ تھے (رحمہم اللہ جمعین) جنہوں نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرایا اور انجام کار ان بزرگوں کا وہ وحدت عالم اسلام کا خواب اب تعبیر کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دورۂ یورپ کی تمنا..... آخر عمر میں آپ نے بطور خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ میں پہنچ کر بتاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو۔ بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا و عقبی دونوں کے اکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔

مباحثہ شاہجاں پور کا واقعہ وہ تاریخی موڑ ہے کہ اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہندو مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی انگریزی سیاست کار خ انگریزوں کی طرف موڑ دیا جس کا اعتراف اس دور کے ہندو علماء نے یہ کہہ کر کیا کہ: ”یہ مولوی ہے جس نے ہندوستان کی لاج رکھ لی“۔ یہ روشن حقائق اس عظیم حقیقت کو طشت از باہم کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک عالمی اور تاریخ ساز شخصیت تھی اور ان کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ کا یہ قول کہ: ”کئی صدیوں کے بعد اللہ نے مولانا محمد قاسم جیسی شخصیت پیدا فرمائی ہے ان کی عظمت و اہمیت کے باب میں بلا خوف تردید حرف آخر فرما دیا جاسکتا ہے۔“

افادات علم و حکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حَامِدًا لِلَّهِ الْعَظِيمِ وَمُصَلِّيًا عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ اَمَّا بَعْدُ
اَحوال واقعی..... اس مجلس کا موضوع مذاکرہ تھا۔ کوئی تقریر اور وعظ نہیں ہے۔ جیسا کہ بمبئی میں بھی یہی صورت
ہوتی ہے کہ عشاء کے بعد کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں، اس میں جس نے کوئی سوال یا شبہ پیش کیا تو جواب علم میں ہوا
وہ عرض کر دیا گیا۔ وہی موضوع اس مجلس کا بھی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ مختلف لوگ مختلف باتوں کے سوالات
کریں، بعض حضرات نے کچھ سوالات مجھے لکھ کر دیئے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ اور یہ سوالات
اکثر غلط فہمیوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی جائیں۔

مزارات اولیاء پر حاضری اور علماء دیوبند..... پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ علماء دیوبند، اولیاء اللہ اور بزرگان
دین کی قبروں اور مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور قبروں پر فاتحہ و دعا کو منع کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کذب محض
اور بالکل جھوٹ ہے اور افتراء باندھا جاتا ہے۔ علماء دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ اولیاء اللہ اہل اللہ کی قبروں پر جانا
انتہائی برکت کا ذریعہ ہے، فیض کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور علماء دیوبند کے ہاں خود بیعت و ارشاد کا سلسلہ
ہے، ہم لوگ ویسے تو چشتی کہلاتے ہیں، لیکن چاروں خاندانوں میں ہمارے بزرگ ریاضتیں بھی کرواتے ہیں اور
اجازت بھی دیتے ہیں یعنی چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ ہمارے دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز
الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندی تھے اور ہر سال حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عرس کے موقع پر
حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ دارالعلوم کے مفتی اعظم تھے۔

تو ایک سلسلہ میں ہمارے ہاں نقشبندیہ کا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع
الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں میں سے ہیں اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث
دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور ان کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ نقشبندیہ
ہیں اور عامہ دیوبند کے بزرگ جیسے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم
نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ سب چشتی ہیں۔ ہمارا سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت صابر

کلیری رحمۃ اللہ علیہ، ان بزرگوں سے ہوتا ہوا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، یہ حضرات تقریباً سلسلہ کے جس قدر اولیاء اور بزرگ ہیں ان کے مزارات پر حاضر ہوتے تھے اور استغاثہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند اکثر و بیشتر سال میں کلیہ شریف حاضر ہوتے اور اس انداز سے کہ میرے خیال میں آج بھی کوئی بزرگوں کا معتقد شاید اس انداز سے نہ جاتا ہو۔ رڑکی سے چھ میل کے فاصلے پر حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ کا مزار ہے اور نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نہر کے کنارے پڑی پر پہنچ کر جوتے اتار لیتے تھے۔ چھ میل ننگے پیر طے کرتے تھے اور وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز کے بعد روضہ میں داخل ہوتے۔ پوری رات مزار پر گزارتے تھے۔ اس میں ریاضتیں، مجاہدہ اور استغاثہ و حصول فیض کرنا اور صبح کی نماز کے لئے وہاں سے نکلتے تھے۔۔۔ بہر حال یہ کہنا انتہائی غلط بیانی اور افتراء پر دازی ہے کہ علماء دیوبند اولیاء اللہ کو نہیں مانتے اگر نہ مانتے تو ان کے سلسلے میں کیوں داخل ہوتے؟ بیعت و ارشاد کا سلسلہ کیوں قائم کرتے؟ اگر مزارات کی حاضری پر جانے کو وہ ناجائز سمجھتے تو خود ننگے پیر ادا با مزارات کے لئے کیوں پیدل جاتے؟

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، جس قدر بھی ہندوستان میں سلسلے کے اکابر ہیں سفر کر کے ان مزارات پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ محبت اللہ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار الہ آباد میں ہے۔ تو وہاں گئے۔ اس طرح کلیہ شریف گئے اور اجیر شریف الگ گئے۔ اسی طرح خود میں نے بھی ان تمام مزارات کی حاضری بھی دی اور جب موقع ہوتا ہے حاضر ہوتا ہوں۔

چنانچہ ایک بار اجیر شریف میں حاضر ہوا اور کسی کو اطلاع نہیں دی اور یہ خیال تھا کہ ایصال ثواب کر کے بس دو گھنٹوں کے بعد واپس ہو جاؤں گا جمعہ کا دن تھا جب میں وہاں پہنچا تو مزار پر حاضر ہوا۔ دو، اڑھائی گھنٹے وہاں قیام کیا، اس کے بعد باہر نکلا تو تقریباً جمعہ کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ تو میں نے ارادہ کیا کہ نماز جمعہ پڑھ کر اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ گاڑی رات کو آٹھ بجے جاتی تھی۔ اس بناء پر ارادہ تھا، چونکہ یہاں کسی سے خاص کوئی تعارف بھی نہیں۔۔۔ لیکن جب میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو بعض لوگوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ شاید کسی نے پہچان لیا ہو۔ نماز جمعہ کے بعد ایک جماعت نے آ کر مجھے گھیر لیا اور اس میں دیوان صاحب آگے آگے تھے۔ جو وہاں کے سجادہ نشین ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ”ابنوں سے یہ اجنبیت کیوں؟ کہ نہ کوئی اطلاع ہے نہ خبر ہے اور چپکے چپکے آنا اور آ کر چلے جانا۔ آخر ہم لوگوں سے یہ اجنبیت کیوں برتی گئی؟“۔

میں نے عرض کیا کہ: میں نیاز مندانه اور خادمہ حاضر ہوا تھا اور خادم اعلان کر کے نہیں آیا کرتے، نیاز مند اطلاعیں دے کر نہیں آتے، حاضر ہونا ان کا فرض ہے۔ تو میں اطلاع دے کر کیسے آپ حضرات کو تکلیف دیتا۔ نیاز مندانه حاضر ہوا ہوں ہزاروں یہاں خدام آتے ہیں۔ ایک خادم اور آ گیا۔ اس میں اطلاع کی ضرورت نہیں تھی،

بہر حال انہوں نے اصرار کر کے ٹھہر دیا۔

مجھے رات کو واپس ہونا تھا۔ ریزرویشن بھی ہوا ہوا تھا۔ اس لئے سب کو منسوخ کر دیا۔ میں نے کہا: مجھے دہلی لازمی پہنچنا ہے۔ وہاں جلسہ کا پروگرام ہے۔ تو انہوں نے فون اٹھا کر مولانا حفظ الرحمن صاحب (سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ) سے بات کی کہ آپ چاہے جلسہ کریں نہ کریں مگر اسے نہیں آنے دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے روک لیا۔ پھر خانقاہ میں وہیں تقریر کا اعلان کیا۔ چنانچہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل پر کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر بھی کی۔ اگر علماء دیوبند بزرگوں کے مزارات پر جانے سے روکتے، تو مجھے کیوں جانے کی توفیق ہوتی اور ہمارے بزرگوں کو کیوں توفیق ہوتی؟

ماتعین زیارت قبور سے جنگ..... ہم لوگوں کی ان لوگوں سے جنگ تھی اور ہے جو واقعہ میں مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور محض تعصباً جنگ نہیں تھی بلکہ دلائل سے جنگ ہے اور حدیث کی رو سے جنگ ہے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اَوَّلُ مَطْلَقًا فرمایا۔ كُنْتَ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ. فزور و ہافان فیہا عبرة. ① ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں زیارت قبور سے روکتا تھا لیکن اب میں اجازت دیتا ہوں۔ قبروں پر جایا کرو۔ کیونکہ وہاں جانے سے آخرت یاد آتی ہے اور آدمی کے سامنے خود اس کی موت آ جاتی ہے جس سے طاعت اور عبادت کی طرف جھکتا ہے۔“

غرض فرمایا کہ پہلے روکتا تھا اب اجازت دیتا ہوں۔ گویا ممانعت منسوخ ہو گئی اور اجازت ثابت ہو گئی۔ غرض اول تو اس حدیث کی رو سے حق ہے اور ہر مسلمان کو ضرورت ہے کہ قبور پر جائے اور آخرت کی یاد تازہ کرے۔ زیارت قبور کے لئے سفر..... دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ قبر کو مستقل مقصد سفر بنا کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت کہتی ہے کہ ناجائز ہے۔ ہمارے بزرگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ مستقلاً اگر زیارت قبور ہی کے لئے سفر کیا جائے تو جائز ہے۔ بحث اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ، مَسْجِدِ الْأَقْصَى، وَ مَسْجِدِي هَذَا. ② ”سفر جائز نہیں ہے مگر تین مساجد کی طرف۔ ایک مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف، ایک مسجد اقصیٰ یعنی شام میں بیت المقدس اور ایک میری مسجد۔ یعنی مسجد نبوی۔“ (عَلَى صَاحِبِهَا أَلْفَ أَلْفِ نَفْسٍ وَ سَلَامٍ)

اس سے بعض لوگوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ علماء دیوبند یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبروں کو مقصد بنا کر سفر نہ کرو۔ اس لئے کہ اس میں مسجد کی قید ہے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سفر جائز نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو ان مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔

① السنن لابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی زیارة القبور ج: ۵ ص: ۴۵.

② السنن للترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی ائى المساجد الفضل، ج: ۲ ص: ۴۸.

ان تینوں کو کیوں جائز رکھا گیا؟ اس لئے کہ ان تین مساجد کی جو خصوصیت ہے وہ عالم میں کسی مسجد کی نہیں۔ بیت اللہ شریف کی تو یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز اس میں پڑھی جائے تو دس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ بقیۃ اللہ کی سب مسجدیں برابر ہیں اور محترم ہیں۔ خصوصیت سے کسی مسجد کو مقصد بنا کر جانا، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس میں کوئی خاص ثواب ہے۔ حالانکہ کوئی خاص ثواب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلایا تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کوئی معاملہ کریں کہ گویا ہم زیادہ ثواب سمجھتے ہیں جہاں بھی جائیں گے نماز برابر ہوگی اور اجر ملے گا۔

تو جو لوگ قبروں کا سفر ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: اس حدیث میں استثناء منقطع ہے۔ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر جائز نہیں، مگر ان تین مسجدوں کی طرف۔ گویا مسجدوں کی طرف سفر کرنے سے روکا گیا ہے لیکن ان تین مسجدوں کی اجازت ہے۔ بقیۃ کی نہیں اس واسطے کہ مسجد کا مفہوم عام لے لیں۔ چاہے اس میں قبر ہو چاہے کچھ ہو۔ تو کسی قبر کی طرف بھی جانا جائز نہیں۔ صرف ان تین مسجدوں کی طرف جانا جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں استثناء میں اصل متصل ہے۔ سفر کر کے مساجد کی طرف جانے سے روکا گیا۔ صرف تین مسجدوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اس روایت میں قبروں کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے قبروں کا مسئلہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس حدیث سے قبروں کے سفر کی ممانعت یا قبروں کی طرف سفر کی اجازت کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ حدیث صرف مساجد کے بارے میں ہے۔

رہا قبروں کا مسئلہ تو اول تو حضور علیہ السلام نے خود فرمایا کہ پہلے تو میں تمہیں روکتا تھا۔ اب اجازت دیتا ہوں۔ اس اجازت میں یہ قید نہیں لگائی کہ اگر شہر میں ہوں تو کر لو اگر باہر ہوں تو مت جاؤ (یعنی کجاوہ کس کر شہر سے باہر مت جاؤ) تو عمومی طور علماء دیوبند اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ قبروں کو مقصد بنا کر اگر سفر کیا جائے تو جاسکتے ہیں۔ گویا یہ حضرات دوسروں سے اس بارے میں لڑتے ہیں کہ دوسرے کہتے ہیں کہ قبروں کی طرف سفر جائز نہیں اور علماء دیوبند کہتے ہیں کہ جائز ہے، برکات کا موجب ہے اور ان سے استغاضہ ہوتا ہے۔ ایک عام استغاضہ ہے، وہ ہر مسلمان کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہاں پہنچ کر آخرت کی یاد تازہ ہوگی۔ ایک خاص استغاضہ ہے جو اہل حال کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ صاحب قبر سے برکات کا اخذ کرنا اور لینا، تو جو لوگ صاحب مراقبہ ہیں یا صاحب کشف ہیں روحانیت سے اخذ کرنا جانتے ہیں۔ اس طریقہ سے واقف ہیں۔ وہ فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

غرض ان حالات میں یہ کہنا کہ: علماء دیوبند قبروں پر جانے سے روکتے ہیں بالکل ایک سفید جھوٹ ہے کوئی اس کی اصلیت نہیں۔ شریعت جب ممانعت نہیں کرتی تو علماء دیوبند کیا چیز ہیں کہ ممانعت کریں۔ وہ تو شریعت کے تابع اور غلام ہیں۔ جو شریعت حکم دے گی کریں گے، جس سے روک دے گی، روکیں گے۔ بہر حال اجازت بھی

دیتے ہیں اور ان کا عمل بھی ساتھ ساتھ ہے۔ یہ سب حضرات گئے ہیں جاتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں، محض عوام کو اشتعال دلانے کے لئے اس قسم کی افتراء پردازیاں کی جاتی ہیں۔ جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی جھوٹ بول دیا جاتا ہے۔ تو کوئی اس کی اصلیت نہیں۔

تعمیم جائز اور عبادت ناجائز..... ہاں! ایک ہے قبروں پر جا کر بے ادبی سے پیش آنا، اس کو ہم بھی روکتے ہیں اور ساری دنیا روکے گی، قبریں اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ ان سے ہم بندگی سیکھیں اور وہی کام کریں جو ان اصحاب قبور نے کیا تھا۔ حضرت خولجہ معین الدین اجیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تھے، انہوں نے خدا کے ٹوٹے ہوئے بندوں کو اللہ سے جوڑا اور کہا کہ صرف اللہ کے آگے جھکو!

ہم اس لئے نہیں جاتے کہ خولجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو سجدہ کریں۔ ہم اس کو شرک جانتے ہیں۔ ہم اس لئے جاتے ہیں کہ برکات حاصل کریں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب اپنے لئے سجدہ جائز نہیں سمجھا تو اولیاء اللہ اس کو کس طرح سے جائز سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ بعض صحابہؓ حاضر ہوئے اور آتے ہی حضور علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا حرکت کی؟ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے قیصر اور کسریٰ کے درباروں کو دیکھا یہ سلاطین اپنی مسندوں پر ہوتے ہیں اور لوگ آکر ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ سجدے کرائیں تو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کا زیادہ مستحق ہے کہ ہم اس کو سجدہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”کبھی ایسا مت کرنا، اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ لیکن دنیا میں کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں بجز اللہ کے۔ عبادت صرف ایک ذات کی کی جائے گی اور تو قیرو تعظیم سب اللہ والوں کی حسب درجہ و مرتبہ کی جائے گی۔ تو حضرات انبیاء علیہم السلام جیسی قدسی ذوات ان کے لئے بھی جب سجدہ جائز نہیں ہے تو اولیاء اللہ کے لئے کس طرح جائز ہوگا؟ اور عوام تو بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔ تو قبروں پر جا کر قبروں کو سجدے کرنا اس کو علماء دیوبند شرک جانتے ہیں۔۔۔ حاضر ہو کر برکات حاصل کرنا، ان اللہ کے بندوں کے نام لے کر اللہ سے دعائیں مانگنا، اس سب کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ عبدیت کے خلاف نہیں بلکہ یہ ”عین عبدیت“ ہے۔

اگر یہ اہل اللہ اور بزرگ دنیا میں موجود ہوتے اور ان کی بارگاہ میں ہم لوگ حاضر ہوتے جب بھی سجدہ نہ کرتے۔ اس لئے کہ اگر ہم سجدہ کرتے تو وہ حضرات خود ہمیں اپنی مجلس سے نکال دیتے کہ ”میں تمہیں اللہ کے لیے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں یا اپنے لئے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صلحاء کے بارے میں قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ آلَةٌ﴾

الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿١﴾ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ”کسی بشر کے لئے جائز نہیں، جس بشر کو اللہ نے کتاب دی ہو، علم دیا ہو۔ فضل و کمال دیا ہو۔ کیا جائز نہیں ہے؟ یہ کہ لوگوں سے یوں کہے کہ میرے بندے بنو اور میرے سامنے جھکو۔“

بلکہ اللہ کا بندہ جس میں علم اور حکمت ہوگی، کہے گا کہ اللہ والے بنو، اس کے آگے جھکو، اس کو اپنا رب سمجھو، اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو، صرف اس کے آگے جھکو، یعنی عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں، عبد بننا صرف اللہ کے سامنے جائز ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

اسماء شریکہ سے احتراز..... اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللَّهِ عَبْدُ اللَّهِ وَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ ﴿٢﴾ ”اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں۔“

کیونکہ اس میں خدا کے سامنے عبدیت اور بندگی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بندے کے نام کے سامنے آدی عبد لگا دے۔ مثلاً عبد النبی کہہ دے یا کوئی چیز کہہ دے کہ کسی بندے کا نام لے کر عبد لگا دے وہ جائز نہیں رکھا۔ چاہے اس کے دل میں نہ ہو کہ میں اس کی عبادت کروں، مگر نام رکھنا بھی جائز نہیں۔ ممنوع قرار دیا۔ اس لئے کہ اس نام سے شرک کی بو آئے گی۔ تو قیر اور تعظیم کا ذکر آئے گا تو انبیاء علیہم السلام کی بھی عظمت کی جائے گی، اولیاء اللہ کی بھی عظمت کی جائے گی، صلحاء مومنین کی بھی عظمت کی جائے گی۔

تعظیم اولیاء کرام..... مومن کا اکرام اور تعظیم شریعت نے فرض قرار دی ہے۔ فرمایا المسلم علی المسلم حرام ذمۃ و ماله و عروضة ﴿٣﴾ ”ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے۔ یعنی اس کی جان اور اس کا خون بھی حرام اور اس کی آبرو بھی حرام۔“ نہ خون گرایا جائے نہ آبروریزی کی جائے نہ گالم گلوچ کی جائے۔ گویا ہر مسلمان کو با آبرو سمجھا گیا۔ تو مسلمانوں کا اعلیٰ ترین طبقہ اولیاء کرام ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کی عزت اور حرمت فرض قرار دی گئی ہے۔ اولیاء سے بڑھ کر حضرات انبیاء علیہم السلام کا طبقہ ہے کہ وہ سارے عالم بشریت کا خلاصہ ہیں۔ ان کے حق میں ظاہر بات ہے کہ انتہائی تعظیم فرض قرار دی گئی ہے۔ اگر ذرا تو بین ہوئی تو آدی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

غرض ایک تعظیم و توقیر ہے ایک عبادت ہے۔ اس میں یہ فرق ہے کہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہے تعظیم تو قیر بندوں کے لئے ہے۔ پھر جس درجے کے بندے ہوں گے، اسی درجے کی تعظیم کی جائے گی، لیکن جس تعظیم میں عبادت کی بو آنے لگے وہ تعظیم ممنوع ہو جائے گی۔

جزء عبادت بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں..... فقہاء حنفیہ لکھتے ہیں کہ سلام اتنا جھک کر کرنا کہ رکوع کی سی

① ہارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۹۔ ② السنن لابن داؤد، کتاب الادب، باب فی تغیر الاسماء، ج: ۱۳، ص: ۱۱۳۔ ③ السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ما یستحب من الاسماء، ج: ۱۰، ص: ۳۶۔

صورت ہو جائے یہ ناجائز ہے۔ اسی لئے کہ اس میں عبادت کی بوائے لگی اور اس میں عبدیت اور بندگی کا شبہ پیدا ہو گیا اور عبدیت اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔ تو سلام بھی اتنا جھک کر مت کرو کہ رکوع کی شکل ہو۔ کیونکہ رکوع عبادت کا جز ہے۔ رکوع کسی بندے کے آگے جائز نہیں۔

قیام و سجدہ کی ممانعت..... حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات جس درجہ عظیم و کریم ہے، اسی درجہ تعظیم کی بھی مستحق ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ سَوَّاهُ أَنْ يَحْتَمِلَ لَهُ الرَّجُلُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. ① ”جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ میرے آگے ہاتھ باندھ کے تعظیم سے کھڑے ہوں وہ جہنم میں جا کر اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لے۔“

تو اس کی ممانعت فرمائی کہ لوگ میری بارگاہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ فرمایا، میں بھی بندہ ہوں، تم بھی بندے ہو، اللہ نے مجھ پر وحی کی یہ عظمت دی۔ اس کی تعظیم کرو، سامنے کھڑے ہو کر قیام کرنا، یہ اصطلاحی عبادت کا ایک جز ہے، اس واسطے شریعت اسلام نے مستقلاً قیام کو روکا۔ غرض انبیاء علیہم السلام دنیا میں موجود ہوں سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر سجدہ کیا جائے وہ خود ناخوش ہو جائیں گے۔ رکوع نہیں کیا جائے گا۔ وہ رکوع کرنے والے کو خود اپنی بارگاہ سے نکال دیں گے۔ ہاتھ باندھ کے قیام نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے دھتکار دیں گے۔

اولیاء اللہ سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس لئے اولیاء اگر یہاں موجود ہوں تو ان کی بارگاہ میں ایسی حرکت جائز نہیں ہو سکتی تو وفات کے بعد کس طرح سے جائز ہو سکتی ہے؟

سجدہ قبر کی ممانعت..... اسی واسطے حضور علیہ السلام نے فرمادیا لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي وَتَنَافُؤًا. ② ”دیکھو میری قبر کو بت مت بنالینا کہ اسے سجدہ کرو یا جا کر اس کی پوجا کرو۔“ اس معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ قیام دنیا میں بھی سجدہ سے روک دیا۔ جیسا کہ میں نے حدیث بیان کی اور وفات کے بعد بھی روکا کہ میری قبر کو سجدہ گاہ مت بنانا کہ اسے بت بنالو اور اسے سجدہ کرو۔

درود شریف کی عمومیت کی حکمت..... چنانچہ فرمایا صَلُّوا عَلَيَّ حَيْثُ شِئْتُمْ. ③ ”درود شریف پڑھو، جہاں سے بھی پڑھو گے میرے پاس پہنچ جائے گا۔“ بہر حال ہم یہ دلائل شریعہ سے سمجھتے ہوئے ہیں کہ اولیاء اللہ کی تعظیم جز ایمان ہے۔ ان کی محبت جز ایمان ہے، لیکن عبادت حرام ہے چاہے وہ دنیا میں موجود ہوں یا وہ آخرت میں تشریف لے گئے ہوں، نہ ان کی عبادت کی جائے گی نہ ان کی قبروں کی عبادت کی جائے گی۔ ان کی ذات کی

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی کراہیۃ قیام الرجل للرجل ج: ۹ ص: ۴۱۷.

② مؤطا مالک، کتاب النداء للصلوٰۃ، باب جامع الصلوٰۃ ج: ۲ ص: ۴۱. (مرسل)

③ مسند ابی یعلیٰ، مسند الحسن بن علی بن ابی طالب، ج: ۱۴ ص: ۲.

تقظیم زندگی میں بھی واجب اور وفات کے بعد بھی واجب۔ اس لئے قبروں پر بے ادبی کے ساتھ جانا یہ بھی بے ادبی ہے۔ ادب کے ساتھ حاضر ہونا چاہئے اور اسی طرح سمجھ کر کہ گویا وہ حضرات موجود ہیں۔

آداب زیارت قبور..... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسند ابی حنیفہ میں روایت نقل کی ہے کہ آداب زیارت میں سے ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرو اور میت کی طرف منہ کرو اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تمہاری بات سنے گا۔ تو جب یہ تفصیل موجود ہے تو اولیاء و صلحاء کے مزارات پر بے ادبی اور گستاخی کسی طرح جائز نہیں اور اولیاء تو بڑی چیز ہیں، صلحاء مومنین کی قبروں کے ساتھ گستاخی جائز نہیں۔

چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قبر کو تکیہ لگا کر بیٹھنا یہ ممنوع ہے۔ قبر کو پھلانگ کر جانا یہ ممنوع ہے یا ادھر سے جائے یا ادھر سے جائے۔ قبر کے اوپر سے پھلانگ کر جانا یہ صاحب قبر کی بے حرمتی ہے۔ تو جس شریعت نے مومنین، صالحین اور اولیاء اللہ کی اتنی توقیر کی ہو کہ ان کی زندگی میں بھی تہذیب سے پیش آؤ۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبروں سے توقیر و تقظیم کا معاملہ کرو۔ تو کون ہے جو ان کی قبروں کی بے ادبی جائز رکھے گا؟ کون مسلمان ہے جو کسی درجہ میں بھی اولیاء اللہ کی حیا و میثاق گستاخی جائز قرار دے گا؟ علماء دیوبند نہ صرف جانا بلکہ مستقل مقصود سفر بنا کر جانا جائز قرار دیتے ہیں۔

وہابی اہل نجد کا عقیدہ..... البتہ نجد کے لوگ جو خود کو وہابی کہلاتے ہیں۔ وہ ممانعت کرتے ہیں اور بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ وہ روضہ اقدس کے پاس جانے کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ: مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کر کے جاؤ۔ مزار اقدس کی نیت کر کے نہ جاؤ۔

زیارت روضہ اطہر کی نیت سے سفر..... تو علماء دیوبند ان کا خلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: جانا ضروری ہے جو شخص بھی حج کو جائے وہ قبر شریف کو مقصد بنا کر مدینہ منورہ حاضر ہو۔ مسجد کی حاضری تو جدا گانہ عبادت و طاعت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیت سے سفر کرے۔ احادیث میں ایسے عنوانات موجود ہیں۔ مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي. ① ”جس نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت اس کے حق میں واجب ہوگئی۔“ بعض روایات میں ہے کہ مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَّائِي. ② ”جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔“

علماء دیوبند تو فقط زیارت قبر شریف ہی کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ زیارت قبر کے لئے سفر کر کے بھی جانا جائز قرار دیتے ہیں۔ تو جو جماعت اس درجہ آگے بڑھی ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ روکتی ہے سوائے

① سنن الدارقطنی، کتاب الحج، باب المواقف ج: ۶ ص: ۴۷۳، ② علامہ سیوطی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے

ہیں: ابن عدی، والدارقطنی فی ”العلل“ وابن حبان فی ”الضعفاء“ والخطیب فی ”رواة مالک“ بسند ضعیف جداً عن ابن عمر دیکھئے: الدرر المنتثرہ فی الاحادیث المشترکہ، حرف المیم ج: ۱ ص: ۱۹۔

جھوٹ، اتہام اور افتراء کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

علماء دیوبند کے خلاف بے جا اشتعال..... بس میں نے یہ عرض کیا کہ جماعت علماء دیوبند بے ادبیوں کو ناجائز کہتی ہے اور قبر پر جا کر سجدہ کرنا یہ صاحب قبر کی گستاخی ہے۔ اس لئے کہ جس صاحب قبر نے کبھی قبر کو سجدہ نہ کیا ہو اس کی قبر پر جا کے آپ سجدہ کریں، اس کا کتنا دل دکھے گا، جس نبی اور پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر یہ تعلیم دی ہو کہ غیر اللہ کے آگے کبھی سجدہ مت کرنا۔ اس نبی کی قبر پہ جا کے آپ سجدہ کریں تو اس نبی مکرم کے اوپر کیا گزرے گی؟ ان کو اس بندے سے کتنی نفرت پیدا ہوگی۔ جو شرک میں مبتلا ہوا۔ تو بدعات و منکرات کو رد کا جاتا ہے۔ لوگ اس کو اصل کارود کا قرار دیدیتے ہیں اور یہ محض اشتعال دلانے کے لئے ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ دوسرے لوگ، لوگوں کو ان منکرات و بدعات کے اندر مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ جب بدعات سے روکتے ہیں تو وہ ہمارے خلاف اشتعال دلانے کو کہتے ہیں کہ: یہ تو قبروں پر ہی جانے سے روکتے ہیں۔ یہ تو اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت ہی کو ناجائز کہتے ہیں۔ جسے جائز کہتے ہیں وہ الگ ہے، جسے ناجائز کہتے ہیں وہ الگ ہے۔ گستاخی کرنا ناجائز ہے۔ زیارت کرنا عین طاعت ہے۔ زیارت قبور کرنا عین مقصد دین ہے۔

ایصال ثواب کی ممانعت کا الزام..... سوال: یہ بھی کہتے ہیں کہ قبروں پر فاتحہ اور درود کو منع کرتے ہیں۔ اگر فاتحہ پڑھنے سے منع کریں تو قبروں پہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر قبروں پر تو فاتحہ ہی پڑھنے کے لئے جاتے ہیں کہ وہاں ایصال ثواب کریں اور یہ فاتحہ کا عنوان بھی کچھ نیا عنوان ہے۔ ایصال ثواب کے لئے فاتحہ کا لفظ بعد میں لوگوں نے گھڑ لیا ہے۔ اصل لفظ ایصال ثواب ہے۔ بلکہ ایصال ثواب کے سلسلہ میں جن سورتوں کے تذکرے آتے ہیں ان میں فاتحہ کا ذکر تک بھی نہیں۔ اخلاص، زلزال اور کافرون کا ذکر آتا ہے۔ سورت فاتحہ کا ذکر نہیں۔ نامعلوم فاتحہ کا لفظ کہاں سے استعمال کیا گیا ہے۔ سیدھا جو لفظ شرعی ہے۔ وہ ”ایصال ثواب“ ہے کہ ثواب پہنچاؤ۔ اب اس میں جس کو جو سورت یاد ہو۔ اخلاص (قل ہو اللہ) کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مختصر سورت ہے۔ ایک دفعہ پڑھنے پر۔ ایک تہائی قرآن کا اجر ملتا ہے، اگر تین دفعہ پڑھ لے تو گویا پورے قرآن کا اجر حاصل ہو گیا، گویا پورے قرآن کا ثواب پہنچائے گا۔ اور سورت کافرون کا فرمایا گیا کہ: یہ ربع قرآن یعنی چوتھائی ہے۔ تو قرآن کے چوتھائی کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اگر کسی نے چار دفعہ یہ سورت پڑھ لی تو گویا پورے قرآن کا ثواب ہو گیا اور وہ پہنچا دیا۔

سورت زلزال کے بارے میں فرمایا گیا کہ: اس کا ثواب نصف قرآن کے برابر ہے۔ تو اگر کسی نے دو دفعہ سورت کو پڑھ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پورے قرآن کا ثواب ہو گیا۔ تو ان سورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ تھوڑے سے وقت میں ثواب زیادہ ہو جائے۔ اور جو اس سے زیادہ پڑھے مثلاً سورت یسین ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کے پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ اگر کوئی باہمت آدمی یہ سورت پڑھ لے تو سبحان اللہ نور علی نور ہے۔ دس قرآن کا ثواب پہنچائے۔ اور اس میں اچھی صورت یہ ہے کہ اگر وقت کم ہو تو قبر کی زیارت کو گھر

سے چلے تو اسی وقت سورت طہین پڑھنا شروع کر دے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گی۔ وہاں جا کر ثواب پہنچا دے۔ تو یہ جو چند سورتوں کی تخصیص کی گئی۔ یہ اس لئے کہ وقت کم لگے اور ثواب زیادہ ہو۔ ورنہ جو بھی آیات پڑھ کے ثواب پہنچائے گا۔ ہر حرف پر دس نیکی کا وعدہ ہے۔ اگر الم کا لفظ پڑھ کر ثواب پہنچائے تو تیس نیکیوں کا ثواب ہو گیا۔ تو جتنا چاہے ثواب پہنچائے۔ تو یہ کہنا کہ فاتحہ سے روکتے ہیں۔ یہ بالکل کذب محض، افتراء اور دوسروں پر اتہام ہے۔ اور خدا جانے یہ چیزیں کہاں سے لی گئی ہیں۔ ان حضرات کا نہ یہ عمل ہے نہ یہ عقیدہ ہے۔ تو کسی شخص کے اوپر یا کسی جماعت کے اوپر اس کے عقیدے یا اس کے عمل کے خلاف اس پر تہمت باندھنا، افتراء پر دازی سوائے اس کے کہ عوام کو بھڑانے کے لئے یہ حرکت کی جائے۔ اس کی کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا یہ کہ ان کا اس میں کوئی فائدہ ہوگا۔ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اگر یہ علماء دیوبند جانے لگیں تو ہمارا یہ فائدہ رک جائے گا۔ تو فائدے میں ہم حارج نہیں ہیں۔ تم فائدے اٹھاؤ مگر افتراء پر دازی کی کیا ضرورت ہے؟ غرض یہ چیز بالکل غلط ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی..... دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعوذ باللہ یہ کہتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد مٹی میں مل گئے ہیں۔ یہ بھی بالکل جھوٹ اور افتراء پر دازی ہے۔ یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کے معتقدین کا ہے۔ جن کو ”وہابی“ کہا جاتا ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

علماء دیوبند کہتے ہیں کہ حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے بدنوں کو زمین کے اوپر حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ مٹی ان کو نہیں کھا سکتی۔ تو یہ کہنا کہ مٹی میں مل کے مٹی ہو گئے، بالکل جھوٹ ہے اور علماء دیوبند پر جھوٹ نہیں بلکہ حدیث پر جھوٹ لگانا ہے۔ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ وہی عقیدہ علماء دیوبند کا ہے۔ اور علماء دیوبند صرف یہی نہیں کہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مٹی میں بالکل صحیح و سالم محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا بلکہ علماء دیوبند کا عقیدہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اسی طرح سے جسم کے ساتھ زندہ ہیں جس طرح سے جسم کے ساتھ دنیا میں تھے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ فقط یہ نہیں کہ بدن محفوظ ہے بلکہ بدن میں وہی حیات محفوظ ہے جو حیات دنیا کے اندر محفوظ تھی۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم جی اور زندہ ہیں۔

علامات حیات..... صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **وَنَبِيُّ اللَّهِ يُرْزَقُ**۔ ”اللہ کا نبی زندہ ہے اور اس کو رزق دیا جا رہا ہے“۔ تو کھانے پینے کے لئے رزق عطا کیا جا رہا ہے۔ اب جیسا وہاں کا عالم ہے رزق بھی ویسا ہی ہوگا اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پلاؤ زندہ اور گیہوں کی روٹی ہو۔ جیسے روح پاک اور جسم پاک لطیف ہے۔ تو لطیف ترین غذائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کی گئی ہیں وہ پہنچتی ہیں۔ اسی طرح سے حدیث پاک میں فرمایا گیا **أَلَا نَبِيَّاءُ أَحْيَاءُ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ**۔ ① ”انبیاء علیہم السلام

① مسند ابی یعلیٰ الموصلی، ثابت البنانی عن انس، ج: ۷، ص: ۴۴۔

اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ تو حیات کے لئے دو چیزیں علامت ہوتی ہیں۔ ایک خور و نوش وہ بھی حدیث سے ثابت ہے اور ایک حرکت وہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

بلکہ اعلیٰ ترین حرکت حرکت عباداتی ثابت ہے۔ غرض حیات آج بھی ثابت ہے۔ البتہ یہ ہے کہ آثار و افعال کو روک دیا گیا ہے۔ کہ وہ جو دعوت و تبلیغ کے لئے جاتے تھے وہ روک دیا گیا۔ اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک روشن چراغ ہو یا روشن بتی یا قمعہ ہو آپ اسے ہنڈیا میں بند کر دیں تو اس کی روشنی میں کوئی فرق نہیں آیا مگر جو اس کی کرنیں ہیں وہ عالم سے منقطع ہو گئیں۔ وہ جو چاندنا پھیل رہا تھا وہ ایک ہنڈیا میں چلا گیا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں تشریف لے گئے، حیات اور روشنی اور فیضان کی وہی نوعیت ہے جو اس عالم میں تھی۔ مگر اب عالم قبر میں محدود کر دی گئی اور اس عالم سے منقطع کر دی گئی۔ مگر اس کے باوجود ہم اس کے قائل ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں تشریف نہیں لاتے لیکن روحانی فیض جاری ہے۔ یہ جو ہمارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان سنبھلا ہوا ہے یہ اسی فیض سے تو سنبھلا ہوا ہے۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ادھر توجہ نہ ہو تو ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔ اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اور لوگ مومن ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا پرتو پڑ گیا جو ہم مومن کہلانے لگے۔ ورنہ اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ جو ایمانی فیض ہے وہ برابر جاری ہے۔ غرض یہ کہنا کہ انبیاء علیہم السلام مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔ (العیاذ باللہ)

یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے ہمارا عقیدہ نہیں۔ ہمیں زبردستی اور خواہ مخواہ و حبابی اور نجدی بنادیا۔ یہ فقط اشتعال انگیزی ہے اور یہ محض اس لئے کہ چونکہ ہم بدعات کا رد کرتے ہیں تو اس کے جواب میں نجدیوں اور وحابیوں سے نسب نامہ جوڑ دیا، حالانکہ کہاں نجدی و وحابی اور کہاں دیوبندی؟

غرض یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے کہ مٹی میں مل گئے۔ ہم اس کا رد کرتے ہیں کہ یہ غلط عقیدہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔

استدلال حیات اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت نہیں بنتی۔ نَحْنُ مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نَسُورُثُ. ① ”انبیاء علیہم السلام وہ گروہ ہیں کہ ہم وراثت میں کسی کو وارث نہیں بناتے۔“ اس لئے کہ وراثت مردہ کی بنا کرتی ہے۔ زندہ کی وراثت بننے کے کیا معنی؟ جب آپ اسی طرح سے زندہ ہیں تو جو اس وقت آپ کی ملک تھی آج بھی آپ کی ملک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح جائز نہیں۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں تو کسی زندہ کی بیوی سے کس کی مجال ہے کہ نکاح کرے۔ بیوہ سے نکاح ہوتا

① الصحيح للبخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی نضیر، ج: ۱۲، ص: ۴۲۰.

ہے نہ کہ زندہ خاوند کی بیوی سے۔

غرض جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو آپ کے مال میں وراثت نہیں بٹ سکتی۔ یہ دلائل ہیں جو آپ نے حیات انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں جو ان دلائل کے قائل ہوں، ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہنا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کہتے کہ قبر میں مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔ تو یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ عقیدہ کسی کا ہو اور جوڑ دیا کہیں۔ تو جو لوگ اتنی بے تحقیق بات کہیں کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ کس کا عقیدہ ہے اور کس کی طرف منسوب کر رہے ہیں کیا وہ اسی طرح سے اسٹیج پر مسلمانوں کی تربیت کریں گے؟

ہاں یوں کہو کہ فلاں کا عقیدہ ہے اور فلاں کا نہیں ہے۔ ایک لاشی سے ہانک دینا یہ تو کذب محض اور افتراء محض ہے اس لئے یہ سوال بھی بالکل بے محل ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

نذر و نیاز یا ایصالِ ثواب..... ایک یہ سوال کیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اور دوسرے حضرات جو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز اور ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں۔ یہ بھی وہی بات ہے۔ ایصالِ ثواب کو تو ہم خود کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہنا کہ یہ ایصالِ ثواب کو روکتے ہیں یہ افتراء پر دازی ہے۔ ہم لوگ چشتی ہیں اور چشتیہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جب صبح و شام بیٹھ کر اپنے معمولات کو پڑھو کوئی ذکر و شغل کرو یا نفی اثبات کرو۔ تو ہمارے اکابر اور بزرگوں کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کم سے کم تین مرتبہ ”سورۃ اخلاص“ پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ کے تمام بزرگوں کو ثواب پہنچاؤ اور پھر دعا مانگو کہ یا اللہ! ان کے طفیل سے ہمارے قلب میں بھی نورانیت پیدا فرما دے۔ تو جن کے صبح و شام روزانہ کا معمول یہ ہو کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ثواب پہنچاتے ہوں اور اولیاء سلسلہ کو بھی۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ ایک بے وجہ کی تہمت لگانی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان سے نفرت دلانے کے لئے جہاں جیسا موقع ہو او ایسا ہی اٹھا کے جھوٹ بول دیا۔ بالکل بے اصل چیز ہے۔ غرض ایصالِ ثواب کے قائل ہی نہیں بلکہ ان کے معمولات میں داخل ہے۔ جیسے روزانہ تسبیح و تہلیل معمولات میں ہے۔ خود ہم لوگ بھی اس کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنے معمولات شروع کرنے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیران سلسلہ کو ثواب پہنچائے اب آگے رہ گئی نذر و نیاز؟

تو اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ بھائی! مال دے دو اور ثواب پہنچاؤ تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ تو جائز ہے۔ آپ نے چار فقیروں کو کھانا کھلا دیا اور یہ نیت کی کہ اس کا ثواب فلاں فلاں بزرگ کو پہنچے۔ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ وہ پہنچے گا علماء دیوبند بھی اس کے قائل ہیں اور نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اس کا بھی ان کے ہاں معمول ہے۔ تقریباً سال میں ایک دو مرتبہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بکرا ذبح کر کے کھانا پکایا اور غریبوں میں ایصالِ ثواب کے لئے تقسیم کر دیا۔

جو صاحب حیثیت ہیں وہ بڑا جانور ذبح کر کے بہت سوں کی دعوت کر دیتے ہیں جو بے چارے کم حیثیت ہیں انہوں نے دو چار پیسے صدقہ کر دیئے۔ بہر حال اگر نذر و نیاز کے معنی یہ ہیں کہ مالی عبادت کا ثواب پہنچاؤ تو اس

میں کوئی حرج نہیں۔ ہم اس کو شرعاً جائز سمجھتے ہیں اور ہمارا معمول ہے۔
 مشرکانہ نذر و نیاز..... ایک نذر و نیاز کے معنی جھینٹ چڑھانا ہے کہ کسی بکرے کو لے جا کر قبر پر باندھ دے یا کسی بزرگ اور فقیر کے نام پر چھوڑ دو اس کو ہم شرک جانتے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کی نذر و نیاز صرف اللہ کے نام کی ہو سکتی ہے۔ صرف اللہ کے نام پر جانور چھوڑا جاسکتا ہے۔ جیسے آپ حج پر جائیں تو ”ہدی لے کر جانا یا ہدی کو چھوڑ دینا، یعنی اوٹنی خدا کے نام پر چھوڑ دینا یہ اللہ کے لئے جائز ہے۔ غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔ مشرکین مکہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے جانور اپنے بزرگوں اور بتوں کے نام پر چھوڑا کرتے تھے۔ ایک کو سائبہ، ایک کو وصیلہ اور ایک کو حام کہتے تھے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

مثلاً جس اونٹنی نے دس دفعہ بچے جن دیئے ہوں۔ جب وہ جن چکی اب اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ جس نے پہلا حمل جنا اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، اس کو کچھ نام دیدیتے تھے اور اسکے گلے میں ہار ڈال دیتے تھے اور عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ یہ فلاں بت کے لئے اور یہ فلاں بت کے لئے قرآن کریم نے اس کا رد کیا۔ فرمایا ﴿سَجَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ وَلَكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ﴾ ① ”اللہ نے نہ سائبہ رکھا نہ بحیرہ نہ وصیلہ، نہ حام رکھا کہ بتوں کو نذر و نیاز کرو۔ یہ اللہ پر افتراء ہے کہ جھینٹ چڑھاؤ بتوں کے نام پر اور یہ کہو کہ واللہ اَمَرْنَا بِهَا۔ اللہ نے ہمیں امر کیا ہے۔ فرماتے ہیں یہ افتراء پر دازی ہے۔ ہم نے اس کا امر نہیں کیا۔

غرض نذر و نیاز کے معنی اگر مالی عبادت کے ہیں کہ کھانا پکا کے غریبوں کو کھلاؤ اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔ یہ جائز ہے، اگر کپڑا دینا ہو تو ثواب کی نیت کر دو۔ یہ بھی جائز ہے۔ تلاوت قرآن کریم کر کے ثواب پہنچاؤ، یہ بھی جائز ہے، غرض بدنی عبادت ہو یا مالی عبادت ہو، دونوں کا ثواب پہنچتا ہے۔ اگر مالی عبادت کو آپ نذر و نیاز کہتے ہیں، علماء دیوبند اس کے منکر نہیں اور اگر نذر کے معنی چڑھاوے کے ہیں کسی کے نام پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی ہو یا نبی ہو۔ اس کو قرآن کریم نے روکا ہے اور اس کو علمائے دیوبند بھی روکتے ہیں۔ تو مطلقاً یہ کہہ دینا کہ نذر و نیاز سے روکتے ہیں یہ غلط ہے۔ ایک خاص نذر ہے جس میں شرک ہے اس کو روکتے ہیں۔ مطلقاً مالی عبادت کا ثواب پہنچانا اس کو کسی نے نہیں روکا۔ یہ جائز ہے اور ان حضرات کا بھی یہ عمل جاری ہے۔

ذبیحہ کی نامزدگی..... اسی طرح کسی بزرگ کے نام پر ذبیحہ کرنا یہ بھی ناجائز ہے۔ فقط اللہ کے نام پر ذبح ہوگا۔ جب بھی آپ ذبح کریں گے تو یوں کہیں گے۔ بِسْمِ اللَّهِ وَعَلَىٰ مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ۔ یا جب بھی قربانی کرتے ہیں، اس میں بھی آپ اللہ کا نام لیتے ہیں۔ تو ذبیحہ تو صرف اللہ کے نام پر ہوگا لیکن جس کو ثواب پہنچانا چاہیں آپ نام لے سکتے ہیں کہ ”اے اللہ! میں اس ذبیحہ کو کرتا ہوں تاکہ ثواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دے یا فلاں بزرگ کو پہنچا دے“۔

تو ایک ہے ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کرنا کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کر رہا ہوں۔ یہ جائز ہے اور ایک ہے کسی کے نام پر ذبح کرنا یہ عبادت ہے۔ تو ذبح تو اللہ کے نام پر ہوگا اور ثواب کے لئے کسی ایک یا دو یا بیس کو نامزد کر دیں اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اگر نذر کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو ثواب کے لئے نامزد کر دے کہ مثلاً میں فلاں بزرگ کو ایصال ثواب کے لئے یہ کھانا پکا رہا ہوں۔ اس میں کچھ حرج نہیں۔ ایک کو نامزد کرو، دو کو نامزد کرو، بے شک تمام اولیاء امت کے نام لگاؤ۔ اور یہ کہ فلاں کے نام پر ذبح کرتا ہوں اور ثواب کا کوئی ذکر نہیں۔ جو نام پر ذبیحہ ہوگا وہ صرف اللہ کے نام پر چھوڑا جائے گا وہ کسی بزرگ کے نام پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

بہر حال میں نے عرض کیا کہ: اگر نذر و نیاز کے معنی ایصال ثواب کے ہیں یا نامزد کرنے کے ہیں کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے اس بکرے کو ذبح کر رہا ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ ثواب کا کوئی ذکر نہیں اور فلاں بزرگ کے نام پر میں اس کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ جائز نہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسے مشرکین مکہ بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور قرآن کریم نے اس کا رد کیا ہے۔ ہدیہ ضیافت یا صدقہ ایصال ثواب..... اگر ایصال ثواب کے لئے کچھ پکائیں تو وہ غرباء کا حق ہوگا۔ اغنیاء کا حق نہیں ہے کہ وہ کھائیں اس لئے کہ یہ صدقہ ہے۔ یہ رسم ہے کہ آپ نے رشتہ داروں اور برادری کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا۔ یہ صدقہ کیا ہوا۔ یہ تو نام و نمود کی دعوت ہوگئی۔ صدقہ اس کو کہتے ہیں کہ آپ فقیروں کو کھلائیں تاکہ آپ کو ثواب ہو۔ اور اغنیاء کو اگر کھلائیں تو اس میں ثواب نہیں ہوگا۔

ہاں اس طرح ثواب ہو سکتا ہے کہ آپ ہدیہ کی نیت کریں کہ خوشی کے طور پر دعوت کر رہا ہوں۔ اس میں ایصال ثواب کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ غرض ایک یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں کو دعوت پہ بلانا۔ تو یہ ضیافت اور ان کے لئے ہدیہ ہے جو آپ ان کے لئے گویا پیش کر رہے ہیں۔ اس میں ایصال ثواب کی نیت نہیں ہوتی اور ایک ایصال ثواب کے لئے صدقہ کرنا ہے اس کو ہدیہ نہیں کہتے۔ تو صدقہ کے لئے غریب کا ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ اغنیاء اور مال داروں کو بلا کر کھلا دیں گے تو وہ کھانا بھی کھا جائیں گے اور ثواب بھی سارا کھا جائیں گے۔ وہ کسی اور کو نہیں پہنچے گا۔

ایصال ثواب کے لئے ایام کی تخصیص..... سوال نمبر: ایسے عزیز واقارب اور متوفیاں کے لئے اگر تیسرے یا دسویں اور چالیسویں کوئی کھانا وغیرہ پکا کر اس پر فاتحہ دیں اور برادری وغیرہ کو جمع کر کے کھلائیں۔ اس کو بھی علماء دیوبند منع کرتے ہیں؟

(جواب) تو اتنی بات معلوم ہوگئی کہ ایصال ثواب سے تو نہیں روکتے۔ اس لئے کہ شریعت نے اجازت دی ہے کسی کو روکنے کا کیا حق ہے۔ اب اس میں اپنی طرف سے قیدیں بڑھانا کہ تیسرے دن کرو، چوتھے دن کرو، اگر یہ اتفاق ہے تو بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اتفاق سے آپ کے دل میں آیا کہ میں میت کو ایصال ثواب کروں اور وہ تیسرا دن تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں یا دسواں اور چالیسواں دن اتفاق کے طور پر تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اگر یہ سمجھ کر آپ کریں کہ چالیسویں دن تو پہنچے گا ورنہ نہیں۔ تو یہ غلط ہے کہ یہ عقیدے میں خلل اندازی ہے، عقیدے میں برابر قرار دیا گیا ہے کہ چالیسویں دن پہنچائے، جب پہنچے گا۔ انتالیسویں دن پہنچائے، جب بھی پہنچے گا تو جس چیز کو شریعت عام قرار دے اس کو خاص بنا دینا یہ امت کا حق نہیں۔ یہ صرف رسول کا حق ہے۔ جس چیز کو اللہ کا رسول خاص قرار دے۔ اس کو عام کرنا یہ امت کا حق نہیں۔

مثلاً رمضان شریف کے لئے شریعت نے تیس روزے خاص کر دیئے امت کو حق نہیں کہ وہ شعبان کے بھی روزے رکھا کرے کہ ہم اس کو بھی رمضان سمجھتے ہیں۔ اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح شریعت نے نماز کے پانچ اوقات مقرر کئے ہیں۔ بندہ پابند اور مقید ہے کہ انہی اوقات میں نماز ادا کرے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ: میں آج ظہر کو عشاء کے بعد ادا کروں گا یا عصر کے بعد پڑھ لوں گا اور یہ کہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس میں حرج یہ ہے کہ اللہ نے نمازوں کے اوقات خود مقرر فرمادیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾ ① اللہ نے نماز وقت کی قید کے ساتھ فرض کی ہے تو وقت کی قید اٹھانے والا کوئی دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ کہ خدا تو قید لگائے اور وہ اٹھائے۔ یہ تو اللہ کا مقابلہ ہے تو جہاں شریعت نے قید لگا دی اسے اٹھانے کا حق نہیں اور جہاں قید نہیں لگائی اور بے قید رکھا۔ وہاں قید لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ دونوں چیزیں برابر ہیں تو مقید کو مطلق کرنا اور مطلق کو مقید کرنا یہ صرف شارع علیہ السلام کا کام ہے۔ اللہ و رسول کا کام ہے کسی غیر کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوام و التزام کا فرق..... پھر اس میں دوسرا فرق یہ کہ ایک ہے وقت کا تقید کرنا اپنی سہولت کے لئے۔ مثلاً میرے پاس فلاں مہینہ کے فلاں دن آمدن زیادہ ہوتی ہے۔ اس دن میں اپنے حالات کے لحاظ سے کر سکتا ہوں۔ ورنہ مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا کریں اور دوسرے کو ملامت نہ کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ سب دنوں کو برابر سمجھتا ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جیسے مثلاً آپ حضرات تاجر ہیں اور سیزن کا کوئی مہینہ آگیا۔ اس میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے اور بکری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس مہینے میں غرباء کو کھانا کھلایا کروں گا۔

تو یہ ایک عمل ہے اس عمل پر آپ نے اتفاقی احوال کے لحاظ سے دوام کر لیا آپ کے عقیدے میں یہ نہیں ہے کہ اس دن ثواب پہنچاؤں گا تو پہنچے گا۔ ورنہ نہیں پہنچے گا۔ اس واسطے کہ اگر کوئی شعبان میں کرتا ہے تو اس کو بھی صحیح قرار دے رہے ہیں اور ایک نے اتفاق سے شوال میں کیا۔ آپ نے کہا اس نے بھی ٹھیک کیا۔ اب آپ خود جس مہینے میں دوام کر رہے ہیں تو اس کے خلاف کو بھی جائز سمجھتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔

بہر حال یہ سمجھنا کہ اس مہینے میں ہوگا اور اس کے خلاف کو ناجائز سمجھنا یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بنانا جائز نہیں جب تک اللہ کا رسول عقیدہ نہ تھلائے۔ غرض ایک ہے دوام اور ایک ہے التزام۔ دوام اور التزام میں فرق ہے تو

ایک یہ ہے کہ آدمی کسی مہینے کا پابند بن جائے اور عقیدے میں یہ سمجھے کہ یہ کام اسی مہینے ہو سکتا ہے، یہ مہینہ نکل گیا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یہ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ عقیدہ ہے اور ایک التزام کے بغیر دوام ہے کہ میری مصلحت کے لحاظ سے میں اس مہینے میں کھلا سکتا ہوں اور عمر بھر اس کا پابند ہو گیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ جائز اس میں بھی ہے دوسرے میں بھی جائز ہے۔ یہ ایک ذاتی مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مشابہت سے احتراز..... بس اب اتنی بات دیکھی جائے گی کہ اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے جو اس خاص مہینے میں یا اس وقت کو لازم سمجھتی ہے اور آپ نہیں سمجھتے لیکن اگر آپ عمل کریں گے تو آپ پر تہمت یہ آئے گی کہ ان کا بھی وہی عقیدہ ہے۔ ایسے میں مشابہت کی وجہ سے ترک کر دینا چاہئے۔ لیکن اگر سارے ہی ایسے ہوتے کہ فی نفسہ ہر مہینے میں جائز سمجھتے لیکن اپنی مصلحت کی وجہ سے کسی نے کوئی مہینہ اختیار کر لیا کسی نے کوئی۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ فی نفسہ عقیدہ بنائے بغیر عمل کا اپنے کو پابند کر لینا جائز ہے لیکن بعض مصالح کی وجہ سے ترک کر لیا جائے گا، اگر کوئی قوم دنیا میں اسے لازم سمجھتی ہے اور آپ اسے لازم نہیں سمجھتے مگر عملاً وہی کر رہے ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ ان کا بھی وہی (لازم سمجھنے کا) عقیدہ ہے تو لوگ اس سے حجت پکڑیں گے تو ایسے مواقع پر ممانعت کی جائے گی۔ مگر وہ ممانعت مصلحت ہوگی حرام یا ناجائز ہونے کی وجہ سے اس فعل کی ممانعت نہیں ہوگی۔ بہر حال اس سے آپ سمجھ گئے کہ عزیز و اقربا یا متوفیان کے لئے تیسرے دسویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر فاتحہ دے کر برادری کو بلا کر دعوت کھلانے سے جو علماء دیوبند روکتے ہیں اس کا آپ تجزیہ کر لیں کہ کیوں روکتے ہیں۔ بات کو گول مول نہ رکھئے۔ اب تک میں نے تیسرے، دسویں اور چالیسویں دن کے روکنے کے بارے میں کلام کیا کہ ان کو عقیدہ بنا کر مخصوص کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی مصلحت کی وجہ سے خاص کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

چہلم، برسی ہندوانہ رسم ہے..... مگر یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ کو فرض کیجئے تیسرے دن اور محرم کے مہینے کی سہولت ہے تو کیا ضروری ہے کہ جس کا عزیز مرے وہ محرم ہی کے مہینے میں مرے، اتفاق سے وہ شعبان کے مہینے میں انتقال کر گیا تو وہ کون سا دن ہوگا جس میں آپ کو سہولت ہوگی۔ تجارت کا تو ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تو یہ تیسرا دسواں اور چالیسواں بلکہ چہلم یہ کوئی قید شریعت میں نہیں ہے۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت۔ یہ ایک بے اصل سی چیز ہے۔

بلکہ اگر ثابت ہے تو یہ ہندوؤں سے ثابت ہے۔ ان کے ہاں تیسرا بھی ہے، چوتھا بھی ہے، چالیسواں بھی ہے، برسی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسم وہیں سے لی گئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں رسوم کی پابندی کی وجہ..... اور اس کی بناء درحقیقت یہ ہوئی ہے اور بھی بہت سی رسمیں اسی طرح ہیں۔ غرض اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس کی بناء یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کرام کے صدقے پھیلا ہے تو ان حضرات کے طفیل سے ہندوستان کے جو لوگ مشرک تھے، وہ دائرہ اسلام

میں داخل ہوئے۔ چنانچہ نانوے لاکھ آدمی تنہا حضرت خواجہ حمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں اور آپ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو ہوئے ہیں وہ تعداد اس کے علاوہ ہے۔ اسی طرح اور حضرات صوفیاء ہیں۔ تو کروڑوں کی تعداد میں ان حضرات کی دیانت، امانت، سچائی، خلوص اور بزرگی دیکھ کر خود بخود جوق در جوق لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئے۔ لیکن ان کی تعلیم کا بندوبست پورا نہیں ہو سکا۔ حکومتوں نے توجہ نہیں کی۔ عوام مسلمین نے دھیان نہ کیا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں تو داخل ہو گئے، مگر مسائل کا علم نہیں ہو سکا۔

تو جو رسمیں انہوں نے اسلام کے نام سے کرنی شروع کر دیں۔ مثلاً ان کے دیوالی کی چھڑی نکلتی تھی انہوں نے بھی بعض بزرگوں کے نام پر جھنڈا نکالنا شروع کر دیا۔ ان کے ہاں سنی کے اوپر پرشات چڑھتا تھا انہوں نے جا کر قبروں پر مٹھائی چڑھا دی۔ ان کے ہاں کسی دیوتا کے نام پر کوئی کام ہوتا تھا انہوں نے وہ کام کسی بزرگ کے نام پر کر دیا۔

تو اسلام کا ایڈیشن بنایا جب کہ حقیقت وہی تھی جو پہلے سے آرہی تھی۔ غرض اس کی بنا یہی ہوئی کہ اسلام میں داخل تو جوق در جوق ہوئے مگر ان کی تعلیم نہ ہو سکی۔ تو وہ عورتیں اور مرد جو رسمیں ان کے گھروں میں تھیں ان کے اپنے ذہن سے یا کسی کے کہنے سے انہی کا نقشہ بدل کے وہ سب اسلام بنا دیا۔ اب وہ ساری رسمیں اسی طرح سے چلی آرہی ہیں۔ اب جبکہ کوئی عالم اس کو ناجائز کہتا ہے تو خفا ہوتے ہیں کہ باپ دادا سے تو ہم یہ رسمیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ کیوں ہوتا ہے منع کرنے والا؟

پھر اس کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے حالانکہ وہ ان کی خیر خواہی میں یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین اصلی وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے پیش فرمایا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے۔ یہ رسوم وغیرہ یہ شریکِ مزاج ہے۔ لوگ اس کو نہیں سنتے۔ بلکہ اس رسم پر زور دیتے ہیں۔ ہندو مسلم اختلاف کے اثرات..... تو زیادہ تر یہ رسمیں ابنائے وطن (ہندوؤں) سے آئی ہیں اور پورے ہندوستان میں اس کا مسلمانوں کے دین پر اثر پڑا ہے۔ بعض چیزیں انہوں نے بھی آپ کی قبول کیں اور رفتہ رفتہ ان میں تو حید آئی کہ ایک ان میں مستقل ایسا فرقہ (آریوں کا) پیدا ہو گیا۔ جو شرک اور بت پرستی کو روکتا ہے اور مسلمانوں میں شرک اور بت پرستی اسلام سے پیدا ہو گئی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں اسلام سمجھ کر رہے ہیں اور حقیقت میں وہ شرک ہو جاتا تو یہ چیزیں وہاں سے چلیں۔ ورنہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں کہیں اس کا وجود نہیں کہ کہیں دسواں اور چالیسواں ہے۔ اسی طرح تابعین کے زمانہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ آئمہ مجتہدین میں کہیں اس کا ذکر نہیں اسی طرح فقہ میں نہیں۔ البتہ فقہ میں رد موجود ہے کہ یہ غلط اور یہ غلط۔

دین اور رواج کا امتیاز..... بس ایک رواج چلا آ رہا ہے۔ تو رواج کا نام دین نہیں۔ دین تو رواجوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے تاکہ خدائی رواج قائم ہو۔ خدائی قانون قائم ہو۔ اس واسطے جب بھی کوئی عمل کیا جائے تو دیکھا جائے کہ کتاب اللہ میں ہے یا نہیں؟ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے یا نہیں؟ سنت صحابہؓ میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟

اگر معلوم ہو جائے تو آدمی سر آنکھوں پر کرے اور اگر نہ نکلے تو پھر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ اور اگر نہیں ہے۔ مگر غیروں کے اندر ہے اور عمل کریں تو ان سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کو پوری طرح سے ترک کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ مسلم اقوام کا مزاج بدل دے گا۔ جوان کا موحدانہ مزاج ہے اور اسلام نے توحید کا مزاج بنایا ہے۔

حاصل کلام..... غرض دو باتیں میں نے عرض کیں، ایک یہ ہے کہ کسی مسئلہ کو شریعت نے مطلق چھوڑ دیا ہو اور اپنی طرف سے قید لگانا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کون ہیں کہ خواہ مخواہ اس کو مقید کریں؟

لیکن اگر آپ کوئی دن اپنی مصلحت سے مقید کر رہے ہیں کہ مجھے آج کے دن سہولت ہے اور آپ اس کی تبلیغ نہیں کرتے۔ اپنی سہولت دیکھتے ہیں تو کر لیں لیکن یہ بھی جائز سمجھتے ہوں کہ اگر اس کے کوئی خلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اس میں یہ ہوگا کہ اگر کسی قوم نے اس کو لازم سمجھ رکھا ہے تو احتیاطاً آپ کو رکنا پڑے گا کہ اس وقت یہ فعل آپ کے واسطے موضع تہمت ہو جائے گا۔ اس لئے آپ کو اس سے بچ جانا چاہئے۔

اور اس کے بچنے میں کوئی دشواری نہیں۔ اور بچنے سے آدمی جب رکے کہ اس دن تو ثواب پہنچتا ہے پھر نہیں پہنچے گا۔ جب ثواب اب بھی پہنچتا ہے اور چار دن بعد بھی پہنچتا ہے تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر ایک بلالی جائے اور اپنے سر پر تہمت رکھی جائے۔

دوسری بات یہ کہ فاتحہ کے معنی اگر ایصال ثواب کے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ ہونا چاہئے۔ حدیث میں میت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے جیسے دریا میں ڈوبتا ہوا آدمی کہ تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے وہ آس کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ میرا کوئی عزیز مجھے ثواب پہنچاتا ہے یا نہیں؟ تو آپ کو اس کی آس پوری کرنی چاہئے۔ اس کو ثواب پہنچانا چاہئے۔

ایصال ثواب کا تعلق نیت سے ہے..... ایصال ثواب کا تعلق قلب سے ہے۔ آپ نیت کریں گے تو ثواب پہنچ جائے گا۔ اگر آپ اس ثواب پہنچانے میں چند قیدیں لگائیں کہ کھانا یوں رکھا جائے اور اس پر یوں پڑھا جائے۔ بعض سہاگنیں جمع ہوں جن کے اب تک بچہ نہ ہوا ہو اور وہ ایک ایک یا سات سات چاول کے دانے اٹھائیں۔ یہ محض رسوم ہیں۔ شریعت کے اندر ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ غرض ایصال ثواب کا تعلق قلب کی نیت سے ہے۔ آپ نے نیت کی، کھانا پکا کے بانٹ دیا۔ فقیر سے بھی یوں نہ کہا کہ میں کیوں کھلا رہا ہوں؟

بس قلب کی نیت یہ ہے کہ ثواب پہنچے، بس پہنچ جائے گا۔ یہ جو قید لگائی گئی ہے کہ جب تک مسجد کا ملانہ آئے گا ثواب نہیں پہنچے گا۔ یہ سب کھانے پینے کی باتیں ہیں۔ مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ ثواب پہنچانا ہے اور یہ صدقہ ہے۔ اسی واسطے مستحقین کو کھلائے۔ یہ جو ساری برادری کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا یہ تو وہی رسی بات ہو گئی۔ ثواب سے اس کا کیا تعلق ہوگا وہ تو کھانے کے ساتھ ثواب کو بھی کھا کر چلے جائیں گے۔ میت غریب کے لئے کچھ بھی نہ رہے گا۔ میت کو جب پہنچے گا جب آپ مستحق کو صدقہ دیں۔

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ..... اس واسطے اگر دعوت کرنی ہے، شوق سے کیجئے اور آپ ہر روز دعوت کیا کیجئے۔ آپ کے عزیز ہیں، اقربا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔ جتنی چاہیں آپ دعوتیں کریں۔ دس، بیس سو سو کو جمع کریں۔ مگر ثواب پہنچانے کی عبادت کو کیوں آپ کر کر کر کرتے ہیں کہ اس میں خلط ملط کریں۔ کچھ مستحق کچھ غیر مستحق کچھ امراء کچھ غرباء۔ معلوم ہوتا ہے دل کے اندر کچھ نمود کا جذبہ ہے۔ برادری کی انک ہے کہ نہیں کریں گے تو برادری میں ناک کٹ جائے گی، تو جس میں ناک کٹنے کا خوف ہو وہ عبادت ہوتی ہے؟ ناک کٹنے کا خوف ہو تو وہ مخلوق کی اطاعت ہوگئی۔ نہیں کریں گے تو برادری والے نام رکھیں گے۔ تو نماز، روزہ اور صدقہ نام رکھئے اور ناک کٹنے کے خوف سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے، تو آدمی عبادت بھی کرے اور اس کو کر کے کھودے، تو اس کے کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ صحیح طریق سے کیجئے۔

تو یہ کہنا کہ یہ علماء دیوبند منع کرتے ہیں تو وہ ایصالِ ثواب سے منع نہیں کرتے ان رسوں سے منع کرتے ہیں۔ تو یہ اشتعال دلانا ہے اور یوں نہیں کہتے کہ: علماء دیوبند ایصالِ ثواب کو جائز بلکہ ضروری کہتے ہیں مگر جو رسوم باندھ رکھی ہیں، ان سے روکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ان کے کھانے پینے کا نقصان ہے۔ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ مطلق ثواب سے روکتے ہیں تاکہ عوام میں اشتعال پیدا ہو۔ ایصالِ ثواب جیسی مطلق چیز کو تم مقید کرتے ہو تو اس تنقید کو روکتے ہیں کہ تم کو اس کے مقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جس کو خدا تعالیٰ نے عام کر رکھا ہے اس کو عام رکھنا پڑے گا جس کو وہ خاص کر دے اس کو خاص رکھنا پڑے گا۔ ہم عیاذُ اللہ شائع نہیں ہیں کہ شریعت وضع کریں۔ شریعت وضع کرنے والا اللہ ہے اور اس کو پہنچانے والے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کے بعد کسی کو شریعت کے وضع کرنے کا حق نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یا آئمہ مجتہدین بھی اس شریعت میں سے مسائل نکال سکتے ہیں۔ لیکن مستقل شریعت وضع کر دیں یہ کسی کا حق نہیں۔

علم غیب کا تنازع..... سوال: علماء دیوبند سرکارِ دو عالم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں، دیوانوں اور جانوروں کے مشابہہ کہتے ہیں؟ العیاذ باللہ، العیاذ باللہ اور معاذ اللہ شیطان کے علوم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے زیادہ بتاتے ہیں۔

جواب: یہ بھی بالکل افتراء اور بالکل کذب ہے۔ یہ دعویٰ اصل میں وہی لوگ کرتے ہیں جو علماء دیوبند کو الزام دے رہے ہیں۔ اور یہ قصہ یہاں سے چلا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سارا علم حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ علم غیب کلی اور جزئی جزئی کا وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کو ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میرا اور میرے ساتھ ساری مخلوق کا علم ملا کہ اللہ کے علم کے سامنے ایسا ہے کہ جیسے ایک بے پید سمندر پر ایک چڑیا آئے اور اس میں چوچ لگائے۔ اس کی چوچ کو جو تری لگ جاتی ہے تو اس تری کو سمندر سے کوئی نسبت نہیں۔ ساری مخلوقات کا علم مل کر اللہ کے علم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو چڑیا کی چوچ کی تری کو سمندر

سے ہے۔ تو حضور علیہ السلام تو یہ فرمائیں اور ہم دعویٰ یہ کریں کہ جتنا اللہ تعالیٰ کو علم ہے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ عقلاً بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات بھی لا محدود اور صفات بھی لا محدود صفات کاملہ میں سے علم بھی ہے۔ تو علم بھی اس کا لا محدود، اس کی کوئی حد نہایت نہیں۔ بندہ خود محدود، عمر محدود، ذات محدود، صفات محدود اور قوتیں محدود، تو لا محدود چیز، محدود چیز میں کس طرح سما سکتی ہے؟ تو شرعاً میں نے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک پیش کیا اور عقلاً بھی یہ محال ہے تو عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

علماء دیوبند کا عقیدہ..... علماء دیوبند کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حق تعالیٰ نے علم دیا ہے ساری کائنات میں سے وہ علم کسی کو نہیں دیا۔ نہ اتنا زیادہ کسی کو ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم علم الخلاق ہیں۔ تمام ملائکہ کو بھی وہ علم نہیں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ تو کائنات میں سب سے زیادہ علم والی ذات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ یہ دعویٰ ہے کہ ایک تو علم الخلاق ہونا ہے کہ ساری مخلوق سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم ہیں اور ایک اللہ کے برابر ہونا۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

مخلوق، خالق کی کسی صفت میں اللہ کے برابر ہو جائے۔ یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقل بھی اور ایک یہ کہ مخلوقات میں سے سے زیادہ افضل ہونا۔ تو وہ ذات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ غرض مسئلہ یہاں سے چلا کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب کلی حاصل ہے۔ علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ..... اس کے بارے میں بعض بزرگان دیوبند نے لکھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ”علم کلی حاصل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اگر علم کلی کا یہ مطلب ہے کہ ساری کی ساری جزئیات اور کلیات حاصل ہیں۔ یہ عقلاً بھی اور نقل بھی غلط۔ خود حدیث کے بھی خلاف۔ قرآن کریم کے بھی خلاف۔ اور اگر یوں کہتے ہیں اور آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل میں سے بعض علم حضور علیہ السلام کو حاصل ہے تو وہ بعض کچھ اور بعض کچھ اور سب کو بھی حاصل ہے۔ تھوڑا بہت علم اللہ نے ہر انسان کو دیا ہے۔ تھوڑا بہت علم ہر فرشتے کو دیا۔ تھوڑا بہت علم جنات کو بھی دیا۔ پھر اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کیا رہی؟

تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ اگر تمہارے دعوے کا یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط۔ یہ مطلب علمائے دیوبند کا تھوڑا ہی ہے یہ تو خود بریلوی حضرات کا مطلب ہے جن کو ہم رد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سر پر قہوپ دیا کہ تم یوں کہتے ہو کہ معاذ اللہ جانوروں کے برابر علم ہے۔

اور جنات کے برابر علم ہے ”عیاذ باللہ، عیاذ باللہ، نقل کفر، کفر نہ باشد۔ شیطان کے برابر علم ہے۔ تو یوں کہا گیا ہے کہ: اگر تم علم کے معنی یہ سمجھتے ہو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر جانور کو بھی علم ہے۔ ہر فرشتے کو بھی علم ہے۔ جنات کو بھی یہ علم ہے۔ اس میں فضیلت کیا رہی؟

غرض تمہارے مطلب کی دوشاخیں بیان کر کے اسے رد کیا جا رہا ہے۔ نہ کہ اپنے مطلب کا کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ تھوپ دیا ہمارے سر کہ تم یہ دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ہم سے یوں کہیں کہ صاحب! فلاں آدمی آیا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ فلاں جگہ وہاں پھیل گئی ہے خدا نخواستہ کوئی باقی نہ رہا۔

تو ہم اس کو کہیں گے کہ بھائی! ”سوچ لو کہ کوئی باقی نہیں رہنے کا کیا مطلب ہے“۔ آیا یہ مطلب ہے کہ ایک بھی باقی نہیں۔ یہ تو بظاہر خلاف بات ہے کل کے اخبار میں آچکا کہ بہت سارے زندہ ہیں اور اگر یوں کہو کہ بعض آدمی انتقال کر گئے تو کون سا شہر ایسا ہے جس میں روز بعض لوگ انتقال نہیں کرتے۔ تو یہ جو ہم نے الزام قائم کیا یہ آپ کے دعویٰ پر ہم نے قائم کیا۔ ہم نے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ تو مطلب تو آپ کے دعویٰ کا بیان کیا جا رہا ہے اور آپ ہمارے سر تھوپ رہے ہیں کہ تمہارا یہ مطلب ہے۔ ہمیں اس مطلب سے کیا تعلق؟

علمائے دیوبند کا دعویٰ..... ہم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوقات سے زیادہ علم دیا گیا ہے نہ اتنا علم انبیاء علیہم السلام کو ہے نہ اولیاء کو ہے، نہ فرشتوں کو ہے۔ لیکن اللہ کے علم کے سامنے وہ جز ہے۔ کلی علم تو فقط اللہ کو ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس کا ایک جز اور ایک شمع ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو جو علم دیا گیا ہے وہ بھی ایک جز ہے تو اس فرق کو سمجھ لیجئے کہ ایک ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساری کائنات سے بڑھ کر عالم ہونا اور ایک ہے حضور علیہ السلام کے علم کا اللہ کے علم کے برابر ہونا۔ یہ برابر تب ہوگا جب ذات برابر ہو، صفات برابر ہوں، احوال برابر ہوں۔ جب کہیں برابری نہیں ہے تو صفات میں کیسے برابری ہوگی۔؟ صفات میں سے علم بھی ہے تو علم میں برابری کیسے ہوگی؟

یہ ناممکن اور محال ہے۔ خود قرآن کریم بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہا ہے، حدیث بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہی ہے۔ تو یہ عجیب چیز ہے کہ ان کے دعویٰ کے مطلب کی ایک شق کو بیان کیا جائے۔ اور وہ اس کو ہمارے سر تھوپیں۔ بھائی! تمہارا یہ دعویٰ تھا اور اس کی وضاحتیں تھیں۔ تم دونوں کا انکار کر دو۔ بس ٹھیک ہے۔ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ”اعلم الخلاق ہیں“ باقی تمام مخلوقات کا علم مل لا کر ایسا بھی نہیں ہے جیسے سمندر کے سامنے چڑیا کی چونچ کی تری ہوتی ہے۔ لیکن یہی نسبت حضور علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم کے ساتھ ہے۔

نماز کے بعد مصافحہ..... سوال: نماز کے بعد مصافحہ کو منع کرتے ہیں؟ جواب: نماز کے بعد مصافحہ کو واجب کس نے کیا ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ کسی جائز چیز کو اگر آپ واجب سمجھیں گے تو منع نہیں کیا جائے گا تو اور کیا جائے گا۔ نماز کے بعد مصافحہ کرنا نماز کی سنتوں میں داخل نہیں، سنن وضو میں داخل نہیں، سنن دعا میں داخل نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں فرماتے تھے، صحابہ کرام نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے کوئی لازمی چیز نہیں اتفاقاً کر لیا تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ کبھی عقیدت و محبت میں کر لیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو نہ کرے اس کو آپ ملامت کریں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے واجب جانتے ہیں۔ تو جو چیز واجب نہ ہو آپ اسے واجب جان کر کرنے لگیں تو روکا

نہیں جائے گا تو اور کیا کیا جائے گا؟

تو یہ ساری باتیں وہی تو ہیں کہ جس چیز کو اللہ جائز قرار دیں اسے جائز رکھو۔ جسے واجب قرار دیں اسے واجب رکھو۔ جسے حرام قرار دیں اسے حرام رکھو۔ واجب کو جائز بنادے اور جائز کو واجب بنادے۔ اس کا آپ کو حق نہیں۔ مصافحہ کرنا جائز ہے۔ لیکن نہ کرنا بھی جائز ہے جائز کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب کرو جب بھی مضائقہ نہیں۔ نہ کرو تب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی کرنے پر زور دینے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے واجب جانتا ہے۔ تو اس کو روکا جائے گا اگر نہ کرنے پر زور دینے لگے تو اسے بھی روکا جائے گا۔ کیونکہ اسے ترک پر زور دینے کا حق نہیں، اللہ نے برابر رکھا ہے۔ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں نہ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ روکنا فرض بنا کر کرنے سے ہے اور سنن نماز سمجھ کر کرنے سے روکتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم نے مصافحہ کو رواج سمجھ لیا ہے اور جہاں کسی نے رواج سے روکا وہ کافر۔ تکفیر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ضروریات دین کا جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ تمہارے مصافحہ کو روک دیا وہ کافر، کھانا پکانے کو روک دیا وہ کافر۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کس مصلحت سے روکا ہے۔ کون سی حد بندی کے لئے روکا، اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تکفیر کرنا یہ آپ کے لئے بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد دعاء ثانیہ..... سوال: نماز کے بعد دعاء ثانیہ کو منع کرتے ہیں۔ جواب: دعاء ثانیہ کے لازم ہونے کو منع کرتے ہیں۔ جائز ہونے کو تو منع نہیں کرتے۔ دعاء ثانیہ اگر اتفاق سے کوئی کرے اور ثانی کیا چیز ہے۔ کوئی دس دفعہ کر لے، چار دفعہ کر لے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس کو اس طور پر لازم قرار دے کہ جو نہ کرے تو اسے کہے کہ یہ غلط آدمی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے لازم سمجھتے ہیں۔ تو یہ لازم تو نہیں۔ غرض جواز ہے، لزوم نہیں۔ جواز کو منع نہیں کیا جاتا، لزوم کو منع کیا جاتا ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَآخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ حَزْرۃ: ۸/۵/۱۲ھجری)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ شخصیت و کردار میری سعادت..... حضرت الاستاذ علامہ شبیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح کے سلسلہ میں محترم عاشق عمر صاحب عباسی کا امر ہے کہ میں بھی سوانح نگاروں کی فہرست میں نام درج کرالوں، تعمیل امر سعادت ہے۔ لیکن حضرت علامہ کے مناقب کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ہم جیسے ناقص المعلومات کی چند سطریں اس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کر سکتیں۔ تاہم یہ کیا کم سعادت ہے کہ ان کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام ہی آجائے۔ گو چند نام تمام سطریں ہی لکھ کر ہو جن میں کوئی خاص ترتیب یا مضمون نگار نہ تشکیل نہیں۔ قلم برداشتہ ذکر محاسن کے طور پر جو بات بے ساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا، اسے سپرد کاغذ کر دیا ہے۔ پس یہ سوانح یا سوانح کا عری نہیں۔ محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تسلی اور تحیض مقصود ہے۔ (واللہ التوفیق)

ذوق علم کا رنگ..... حضرت علامہ میرے استاذ تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مولانا اپنی جامعیت علوم کے ساتھ خصوصیت سے علوم عقلیہ سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ: اگر میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ، کی تصانیف نہ دیکھ لیتا تو نہ معلوم اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا۔ لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم نے مجھے سنبھالا علوم عقلیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، حکمت قاسمیہ کے مطالعہ نے معقولات ایمانی کا راستہ دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا میں شکلمانہ رنگ کا غلبہ ہو گیا۔ اسی لئے اسلام کے اصول و کلیات سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر ان کا کلام نہایت بسیط اور محققانہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمد للہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے۔ مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب وسنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قرآن شریف کے تفسیری فوائد، لطیف و شیریں زبان اور شگفتہ طرز ادا کے ساتھ ان کی قلمی کاوشوں کا شاہکار اور صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے۔ اس تفسیر و حدیث کی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے اہم مسائل کو سہل عنوانات کے ساتھ حل فرما گئے ہیں۔ جس سے حضرت مدوح کے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تقریر و بیان کا رنگ..... تقریر و بیان آپ کا خاص حصہ تھا۔ قوت استدلال نہایت مضبوط اور مستحکم تھی، معمولی سی بات کو اس خوبصورتی اور قوت سے ادا کرتے تھے کہ وہ ایک اہم مگر حل شدہ مسئلہ نظر آنے لگتی تھی اور اس کے تمام پہلو متانت کے ساتھ صاف ہو جاتے تھے۔ تحریر کا ایک خاص رنگ تھا جس میں نہ زمانہ حال کی بے قید شوخی تھی نہ قدیم طرز کی کہنگی، حال کی فصاحت اور ماضی کی متانت سے ملا جلا رنگ تھا، جو آپ کی تحریر کا نمایاں پہلو تھا۔ بلاغت کلام، کلام پر برستی تھی جو ہر طبقہ کے جذبات کو اپیل کرتی تھی۔

طرز تد ریس..... درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصاء کے ساتھ ادا کرتے تھے، کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل۔ ایک مسئلہ کو اس کے تمام شقوق و جوانب کے ساتھ کھولنے اور صاف کرنے کی روش تھی۔ اس لئے درس میں کمیت پر نہیں، کیفیت پر نظر رہتی تھی سبق خواہ تھوڑا ہو مگر تمام ہو اسی لئے درس و تد ریس کے سلسلے میں وقت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے، تنقیح مسئلہ اور اس میں تدبر و تفکر پر وقت زیادہ صرف ہوتا تھا مگر اسباق کا یہ تخیل اس لئے گراں نہ ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے درس میں کئی طور پر کئی دنوں کے درس کا مواد فراہم ہو جاتا اور کسر نکل جاتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم کے دوران حضرت والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے خود ہی فرمائش کی کہ اسے معقولات میں پڑھاؤں گا اور مجھے فرمادیا کہ: منطق تجھے میں پڑھاؤں گا چنانچہ خصوصیت صغریٰ کبریٰ شروع کرائی اور مرقات تک پہنچے، گو یہ کتابیں بیچ میں رہ گئیں۔ لیکن جس قدر پڑھایا اتنے ہی سے فن سے کافی مناسبت پیدا ہو گئی کیونکہ ان کی احاطہ کا نقطہ نظر کتاب نہیں ہوتی تھی بلکہ فن ہوتا تھا اور طلبہ کی حسب استعداد فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔

احقر جب کہ متوسط کتابیں ہدایہ، جلالین وغیرہ پڑھتا تھا تو میں نے خود فرمائش کی کہ ترجمہ قرآن شریف پڑھا

دیتے۔ دوسرے طلبہ بھی بکثرت شائق اور متبعی ہیں۔ فرمایا کہ اول اول تو طلبہ شوق میں نام لکھا دیتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کار جماعت صفر کے درجہ میں رہ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کم از کم مجھ پر تو اطمینان فرمائیے۔ نہ میں ناغہ کروں گا نہ بدشوقی دکھلاؤں گا، مگر آپ بھی پابندی فرماویں، وعدہ فرمالیا اور بڑی شفقت سے قرآن شریف کا درس شروع کر دیا۔ ابتداء میں سو، سو اسو طلبہ کا جمگھٹا جمع ہو گیا، مگر آخر کار وہی ہوا کہ طلبہ گھٹنے شروع ہوئے اور آخر میں میں تنہا رہ گیا، قدرتی طور پر مولانا کی تدریسی امنگ بھی کم ہو گئی اور ناغے بکثرت ہونے لگے۔ مگر میں نے یہ وسیطہ اختیار کر لیا کہ اس گھنٹہ میں مولانا جہاں بھی ہوتے وہیں پہنچ جاتا، خواہ مکان پر یا دفتر میں یا کتب خانہ مدرسہ میں اور وہ گھنٹہ میں ان کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے گزار دیتا تھا، کبھی پڑھا دیتے کبھی عذر فرمادیتے مگر میں یہ وقت ان کے پاس پورا ہی کر دیتا۔ آخر کار ایک دن فرمایا کہ بھائی میں ہار گیا اور توجیت گیا، تو نے اپنی بات پوری کر دکھائی۔

کمال اخلاق..... اخلاقی طور پر ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانی تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے خلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش اور اگر ناخوش ہیں تو اعلانیہ اس کا اظہار ان کے چہرہ بشرہ سے ہو جاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے دارالعلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم (جوان کے بڑے بھائی بھی تھے) کچھ رنجش ہو جاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں منانے اور راضی کرنے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ خفا ہو کر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔ ایک دفعہ ناخوش ہو کر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نے طے فرمایا کہ: تو ہی جا کر لا سکتا ہے۔ میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آ جاتی تھی تو اسی لمحہ گرانی رفع ہو کر حقیقۂ بشاشت چہرہ پر نمودار ہو جاتی اور ایسے خوش اور منفرح ہو جاتے کہ گویا کوئی گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور بہ تکلف نہیں بلکہ بلا تصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار ہی یہ ہو۔

حق تعالیٰ نے علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بارہا دیکھا کہ انکے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجہ سے کوئی بات کہی تو ان کبھی نہ کرتے تھے، اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت فرماتے۔

حق پسندی..... قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے خواہ وہ اپنی ہی کوئی کمزوری ہو۔ ایک بار ناخوش ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسب معمول منانے کے لئے گیا تو غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ: بھائی نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے، جو

اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کر لی تو سن لو کہ اس قطع نظر کہنے پر میرے دل میں دو قسم کے جذبے پیدا ہوئے ایک جذبہ للہیت سے اور ایک نفسانیت سے۔ نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو میں انہیں اپنی زندگی باور کراؤں؟ اور اس کا یہ اور یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھا دیتا۔ دوسرا جذبہ للہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ: حضرات ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا للہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا کہ: الحمد للہ مگر میں نے کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر بھی تو دھیان فرمائیے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگوار یوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہوگا جب کہ کاموں کا دار و مدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگوار یوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آ جاتی ہیں یہی فیصلے کر لیں کہ ہم کو کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمائیے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا؟ اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یک سو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشارت آ گئی اور فرمایا: ہاں یہ تو نے صحیح کہا، بس! میں نے اب یہ دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دارالعلوم پنج کر کام کروں گا، چنانچہ علی الصبح حسب وعدہ تشریف لائے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانی، قلب کی صفائی اور حقیقت پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

انداز تحریر..... بہر حال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھا دی تھی، قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ کام کے سلسلہ میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی، متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کتب بینی اور مطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا خود بھی کبھی کبھی فرماتے تھے کہ: کیا کام کروں میں تو کتابوں کا کیرا بن کر رہ گیا ہوں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ تفسیری فوائد اور شرح مسلم جیسے دواہم اور عظیم الشان کام یادگار زمانہ چھوڑے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی اعلیٰ ترین تصانیف، العقل والنقل، الاسلام، الشہاب الثاقب، صدائے ایمان، اعجاز القرآن، اور دوسرے مفید ترین رسائل و مسائل پر قلم زنی فرمائی اور حق یہ ہے کہ بیان مسائل کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت علامہ الاستاذ الکشمیری نور اللہ مرقدہ انہیں اس لحاظ سے لسان الغیب فرمایا کرتے تھے۔

ذکاوت و ذہانت طبعی تھی، فہم تیز اور طبیعت سادہ تھی۔ علم کی بنیاد فہم ہی ہے جب اسے کتاب و سنت میں

استعمال کیا گیا تو علم کا دو چند ہو جانا قدرتی امر تھا۔ تحریر کی شگفتگی مسلم تھی، ایک ہی مضمون کئی آدمی لکھتے اور اسی کو وہ قلم بند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مالٹا سے واپسی کے بعد ترک موالات کا استفتاء کیا گیا۔ حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتویٰ یہ حضرات مرتب کریں اور غایت احتیاط و تدبیر سے فرمایا کہ انگریزوں کے بارے میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ مجھ پر ان کے بغض و عداوت کا غلبہ ہے ہو سکتا ہے کہ فتویٰ میں جذبات کا رنگ آ جائے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ① ”تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے کام نہ لو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔“

اس لئے اس استفتاء کا جواب آپ تینوں حضرات لکھیں۔ چنانچہ تینوں حضرات نے قلم بند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا کہ: جواب تو ماشاء اللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں۔ لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔ بہر حال ان کی تحریر کی جامعیت شگفتگی اور بلاغت کو خود ان کے اکابر بھی مانتے تھے اور اس کی کافی داد دیتے تھے۔

نظم و شعر..... مولانا نظم اور شعر و شاعری سے بھی عاری نہ تھے، گو اس کا ذوق نہ تھا، چند مواقع ایسے بھی پیش آئے کہ جذبات دلی کی ترجمانی آپ نے نظم میں فرمائی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ”نالہ دل کے نام پر ایک نظم لکھی جو بہت پسند کی گئی اور ایک بار میرے متعلق ایک نظم قلم بند فرمائی جس کا واقعہ یہ ہوا کہ میرا رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری کے یہاں ہو چکا تھا، نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ یہ میری اہلیہ جے پور اپنے تایا کے پاس گئی ہوئی تھی اور شدید علیل ہوئی، حالت نازک دیکھ کر غلطی، یا غلط فہمی سے وہاں سے انتقال کا تار دے دیا جس سے یہاں دیوبند میں صف ماتم بچھ گئی، تیسرے دن تار پہنچا کہ وہ انتقال کا تار غلط تھا۔

اس پر بساط شادی بچھ گئی اور تہنیتی جلے گھروں میں اور مدرسہ میں ہونے شروع ہو گئے۔ تقریباً پندرہ بیس دن تک جلسہ ہائے شیرینی و تہنیت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان مجالس میں مختلف حضرات کی طرف سے مبارک بادی کی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے بھی ایک جلسہ میں نہایت بلیغ نظم لکھی اور سنائی، جس کا واقعاتی شعر یہ تھا:

غلط ایک تار برقی پہنچی تھی جے پور سے، جس نے جلایا خرمن مقصود کو برق تپاں ہو کر
اسی طرح کبھی کبھی کسی خاص محرک کے ماتحت نظم بھی کہہ لیتے تھے، مگر یہ چیز ذوق کے درجہ میں نہ تھی صرف
ضرورت کے درجہ میں تھی اور طبیعت اس سے عاری اور عاجز نہ تھی۔ بہر حال حضرت علامہ کی ہستی تقریر، تحریر، نظم و نثر

اور علم و فضل کی ایک مجسم تصویر تھی، جس کے اٹھ جانے کے بعد یہ مخصوص کمالات بھی گویا اٹھ گئے۔ یوں حق تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے اور وہ شخصیتیں پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے دین اور اس کے نبی کے علم کو سنبھالتے اور تازہ کرتے رہیں گے لیکن جن کے سامنے علم و فضل کی ہستیاں اٹھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور وہ جس قسم کے فضل و کمال سے مانوس اور مالوف ہوتے ہیں اس کے اٹھنے سے یہ پسماندہ بالیقین یتیم رہ جاتے ہیں۔

سیاسی خدمات آخر میں سیاسی راہوں پر ان سے جو مہم کام انجام پائے یہ بھی فی الحقیقت ان کی زندگی کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بات تو الگ ہے کہ ان کی رائے سے بہت سے اکابر کو اختلاف تھا۔ اختلاف رائے اپنی جگہ پر ہے اور اس میں ہر شخص اپنی حجت سے مجبور ہے لیکن عزم و عمل کی جو طاقتیں مولانا ممدوح سے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہوئیں دوسرے انہیں خلاف توقع سمجھتے تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ حصہ ان کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد دین اور علماء دین کو کافی سنبھالا۔ قدرت نے تنہا انہیں وہاں کی مرکزی شخصیت بنا دیا اور ان سے وہ کام لیا جو مرکزی شخصیتوں سے لیا جاتا رہا ہے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو وہاں کے کاموں کی نوعیت اور ہوتی۔ یہاں کے لوگ ان کی رائے سے تو اختلاف رکھتے مگر ان کے جذبات اور صدق و خلوص کی قدر بھی کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اختلاف رائے کے حیلہ سے حضرت ممدوح وہاں نہ پہنچتے تو دین کا جو کام ہوا بظاہر اسباب وہ نہ ہو سکتا۔

خراج تحسین غرض مجموعی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت ایک ممتاز ترین شخصیت تھی جس کے علم و فضل کا سکہ ملک بھرنے مانا ہوا تھا۔ اور بیرونی ممالک میں بھی اس کا شہرہ پہنچا ہوا تھا جس کے سامنے اہل علم و فضل سر جھکانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔

ان کے تفسیری فوائد کا حکومت افغانستان کی طرف سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جانا اور ان فوائد کا انتخاب عمل میں آنا درحقیقت ان کے فضل و کمال کے سامنے جھک جانا تھا، فتح المہم کو علامہ زاہد کوثری مشہور فاضل مصر کا خراج تحسین ادا کرنا ہی ان کے فضل و کمال کا اعتراف تھا۔ بہر حال جہاں جہاں بھی ان کے فضل و کمال کا کوئی اثر پہنچا وہیں اعتراف و تسلیم کا شیوہ بھی اختیار کیا گیا۔ اس طرح حضرت مولانا کی شخصیت صرف ہندوستان ہی کے لئے بایہ ناز نہ تھی بلکہ دنیائے اسلام کے لئے سرمایہ ناز تھی۔

تعمیل حکم اگر اس طرح سے قلم چلاتا ہوا چلا جاؤں جس طرح سے وہ بے ساختہ چل رہا ہے اور اس مجلس میں چند سطور سپرد قلم ہو گئیں تو ممکن ہے کہ قلم چلتا ہی رہے اور بات پر بات یاد آتی چلی جائے مگر سوئے اتفاق سے وقت ختم ہو گیا۔ میں بہار کے سفر کے لئے پابرجا ہوں، ریل کا وقت آ گیا اس لئے قلم کو روک دینا پڑا، اگر قلم چلتا ہی رہتا تب بھی مناقب کی طولانی فہرست پوری نہ ہو سکتی اور اسے رک جانا پڑتا۔ اس لئے اگر رک بھی گیا تو مضائقہ نہیں، تکمیل فہرست نہ جب ہوتی نہ اب، اس لئے یہ سطور بے ساختگی کے ساتھ حافظہ سے باہر آ گئیں اور محترم

عاشق صاحب کے حکم کی تعمیل ہو گئی اور میں بھی اس حیلہ سے مولانا کے سوانح نگاروں کی فہرست میں شامل ہو گیا، جو میرے فخر کے لئے کافی ہے۔

﴿وَبَسَّأَلَا تَوَاحِدُنَا إِن نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ ترجمہ: ”اے رب ہمارے، مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے“۔ (آمین)

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۱۱

ایکٹ احادیث پر کل اعراب اور تخریج تحقیق کے ساتھ [۱۲۰] ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو یکجہانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مترجم: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دارالعلوم حیدرآباد دکن

تخریج و تصحیح

مولانا ساجد محمود صاحب
تحقق فی احادیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا راشد محمود صاحب
تحقق فی احادیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا محمد اصغر صاحب
فائز مل جامعہ دارالعلوم کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر: کراچی • پاکستان





قرآن و سنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- جملہ حقوق..... بحق ناشر محفوظ ہیں
- طبع جدید..... اکتوبر 2011ء
- تعداد..... 1100
- ناشر..... بیت السلام



بیت السلام
پبلشر، کراچی، پاکستان

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی - فون: 021-32711878

موبائل: 0321-3817119 ای میل: baitussalam_pk@yahoo.com

49	9	فلسفہ نماز
49	9	فلسفے کے تین (۳) طبقے
50	9	فلسفہ اور دین
52	16	انسانی بدن کے جمادات
55	16	انسانی بدن کے نباتات
57	17	انسانی بدن کے حیوانات
91	18	انسانی بدن میں زلزلے اور طوفان وغیرہ
	18	علویات و فلکیات
91	20	انسان میں کمالات خالق کے نمونے
	24	تمہید سے مقصود کا استنباط
91	25	عبادت صرف نماز ہی ہے
91	27	نماز میں عبادت کے پہلو
	27	نماز ساری کائنات پر لازم کی گئی ہے
92	31	اسلامی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں جمع ہیں
93	31	نماز جامع پناہ ہے
93	32	نماز جامع اذکار بھی ہے
	32	نماز جامع صلوٰۃ اعضاء ہے
94	32	نماز جامع اوقات بھی ہے
94	33	ہر عینہ نماز کی خوبصورتی
95	34	نماز کے اجزاء میں ترتیب عقلی
95	34	نماز جامع عبادت بھی ہے
95	37	نماز اور عالم النفس
96	37	نماز اور تہذیب اخلاق
96	40	قرن اول میں نماز کی اہمیت
96	40	نماز سے تہذیب نفس کی کیفیت
96	42	نماز اور نفس کے مقامات و احوال
97	44	نماز اور اجتماعیات
98	46	نماز اور اجتماعی معاشرہ

116	99	عناصر بادشاہت	عطاء کا وقت خود متعین کرنا باعث نقصان ہے
117	99	بلندی قدرت	سرمائے کے جمع اور ظہور کا وقت
119	100	مقصد موت و حیات	دعا کے وقت قدرت کا امتحان نہ لے
119	100	موت و حیات کے تدریجی نظام کی حکمت	دعا کے وقت استغناء نہیں بلکہ تضرع چاہیے
120	101	محبوب القلوب بادشاہ	اوقات مقبولہ میں غفلت سے احتراز
120	101	جلال و جمال کی جامع بادشاہت	ماہ رمضان کا امتیازی بدلہ
121	102	لوازم بادشاہت	مظلومیت کے وقت کی بددعا
122	103	لوازم سلطنت	ضرورت خلافت
	103	بادشاہ کی سات شہر پناہیں اور انسان کی وہاں تک	نظام عالم چلانے کے لیے اوصاف شاہی
122	104	رسائی؟	وصف اول
123	105	بادشاہ کا نظام کو اکب	اوصاف شاہی کے قوم میں آثار
	105	عظیم بادشاہ کا عظیم دار السلطنت اور اس کے حفاظتی	رعیت بادشاہ وقت کا ذوق اپنانی ہے
123	106	انتظامات	خیر و برکت والی شاہی
124	106	تخت شاہی کا مقام	برکت کا مفہوم
124	108	سرکاری مہمانوں کے لیے گیٹ ہاؤس	بادشاہت کی پہلی شرط
125	108	آمد مہمانان	بادشاہت کی دوسری شرط
125	109	خصوصی مہمانی	شاہجہان کے ولی عہد مقرر کرنے کا قصہ
125	110	مہمانی کے لیے زمین کی روٹی کا انتخاب	بادشاہت کی تیسری شرط
126	110	زمینی روٹی اور مچھلی کے سالن کی حکمت	سورۃ ملک کے دیگر نام
127	111	دنیوی لذتیں چھڑانے کی حکمت	کمال مملکت
127	111	ابدی قیام کی بشارت	کمال قدرت
127		جنت کی ادنیٰ بادشاہت کا عالم	سورۃ ملک میں وسعت قبر اور مانع عذاب قبر ہونے کی
128	112	سرکاری جیل خانہ اور زیارۃ خداوندی سے محرومی	تاثیر کیوں ہے؟
128	113	مہمان خانہ میں زیارۃ خداوندی کے درجات	اس سورۃ کے بخجیہ نام رکھے جانے کی وجہ
128	113	میدان مزید کی وسعت	برکات در برکات
129	114	سرکاری سواریاں	عالمی بے برکتی کے عوامل
129	114	نشست گاہیں اور مقامات قلبیہ سے ان کا تعین	نظام حکومت میں تزکیہ کے آثار
129	115	میدان مزید میں کرسی حق پر تجلیات کا ظہور	حکومت کی اہلیت

143		130	ایجاد و تصرف		دربار خداوندی میں مشروب تواضع
144		130	زمین اور فضا آسانی کی تسخیر جدید		شکر معرفت میں از دیاد
145		130	یا وحق کے ساتھ انسانی تصرفات منشاء خداوندی ہیں		اہل علم کی احتیاج
145		131	کرامت انسانی		جمال خداوندی کے دیدار کا سوال
.....		131	استعمال اشیاء میں جائزات شرعیہ سے تجاوز ممنوع		کیفیت جمال
147		132	ہے		کیف جمال
147		132	ذکر اللہ کے دو معنی		جنت کی لائٹ کا نظام
148		133	ذکر اللہ کی نہایت سہل صورت		شاہی قلعوں کی مضبوطی اور ان کا منیریل
149		133	سفر تنہائی		دار الحکومت کی افواج
149		134	شکر الہی سے بے خونی کی کوئی صورت نہیں		فوج کی عظمت و تقدس
150		134	قادر مطلق تکبر و نخوت کو جس طرح چاہے تو زدے		مرکز نفاذ احکام
150		135	اسباب موت ہزاروں ہیں		سورج مرکز سے باجائز طلوع ہوتا ہے
152		135	تصدیق و تکذیب کا انجام		حکومت الہی کی پالیسی
153		135	قبولیت ایمان کا وقت		استحکام حکومت کا اصول
153		136	یا خداوندی کا وقت		بے مثال روشنی کا انتظام
.....		137	سات قسم کے آدمی قیامت کے دن عرش الہی کے		دفاعی نظام
154		138	سائے میں ہوں گے		دنیا میں حق کے ساتھ باطل کو بھی باقی رکھا جاتا ہے
154		138	قیامت کے حساب سے پہلے اپنا حساب کر لیں		آخرت میں حق و باطل کا امتیاز کر دیا جائے گا
154		138	نعیم کی تفسیر		سرکاری جیل خانہ کی اندرونی کیفیت
155		138	مراقبہ کے ذریعہ روز کار و حساب		ملائکہ جنہم کا اپوزیشن سے مقابلہ
156		139	آسان محاسبہ		تلاش حق کے (۲) دور استے
156		139	کار آمد عبادت		اعتراف بے وقت
156		140	صوبہ زمین کے احکام کا حاصل		اطاعت کے پاکیزہ ثمرات
157		140	فضا پر خدا کی حکومت		عالم انکشاف
157		141	حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں		ظاہر و باطن پر اس کی حکومت
158		141	انسانی روگ، عقل کا بے جا استعمال		ملک کے تین علاقے اور ان کے ذمہ دار
158		142	خالق طبیعت کو خلاف طبیعت بھی قدرت ہے		اللہ کا خلیفہ اعظم
159		143	خلاف طبیعت پر قدرت کی تاریخی مثال		تسخیر خزان

- 176 امم سابقہ کے اجتماعی عذاب کی جزوی صورت آج شخصی قیامت کے تعین نہ ہونے کے باوجود اگلے بھی ممکن ہے! 160 سامان کرتے ہو تو عالمی قیامت کے تعین نہ ہونے پر
- 177 امم سابقہ کے تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کی بھی اگلے سامان کرنا چاہیے 160 مقصد قیامت
- 178 قدرت خداوندی کا حسی ظہور 161 قیام قیامت کا عقلی ثبوت
- 180 عقل پرست طبقہ سے ایک سوال 163 قیامت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے
- 180 مخلوق مخلوق کے ذریعہ خالق سے کیا مقابلہ کرے گی؟ 163 نادانی کا سوال
- 180 اللہ سے مقابلہ کی سوچ صرف انسان کی ہے 164 کلی قیامت کا علم نہ دینا ہی قرین مصلحت ہے
- 181 منزل مقصود پر پہنچنے والا کون ہو سکتا ہے؟ 165 قیامت شخصی کا علم دے دیا جاتا تو دنیا کی ترقی موقوف
- 182 اپنی ذات میں مشاہدہ کی دعوت 166 ہو جاتی جیسے ہر انسان کی قیامت!
- 183 عقل کے اندھے 166 انکار معقول اپنی ہی تکذیب ہے
- 183 قلبی بینائیاں 167 عقل کی گمراہی
- 183 قوت قلبیہ کے ادراک 167 کفار پر قیامت کے آثار
- 183 ادراکات کا تحفظ 168 قیام قیامت آنا فانا ہوگا
- 184 قلب کے ظاہری و باطنی پانچ پانچ دروازے 169 نفع صوری کیفیت
- 184 حلال و حرام کا مدرک بھی قلب ہے 169 عمل کے لیے جتنا قیامت کا علم ضروری تھا وہ دے دیا
- 184 حقیقت علم 170 گیا 171 حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موت کی کیفیت کے
- 185 سارے بیان کا حاصل 171 بارے میں سوال
- 185 انسان کی کٹ جتنی 171 مؤمن و کافر کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت کی
- 186 اثبات قیامت 172 صورت
- 186 قیامت کے سوال کا منشاء 173 موت کے آسان ہونے کی صورت
- 186 منکرین قیامت 173 اخروی نعمتوں کے حصول میں دنیوی مصائب کو روح
- 187 تعدد قیامت 174 از خود قبول کر لیتی ہے
- 188 جس عالم کے اجزاء قیامت کے قبول کرنے کی کیفیت موت اور قوت ایمانی کا سہارا
- 189 صلاحیت رکھتے ہوں اس کے مجموعہ میں بھی یہ صلاحیت اپنی فکر اول ہے
- 189 ہوگی 175 اعتقاد صحیح اور عمل صحیح ہی کا رآمد ہے
- 190 انکار قیامت، انکار مشاہدہ ہے 175 دنیا کے ساز و سامان کی حیثیت

207	190	سکون کا راستہ ایک ہی ہے
209	190	زیادہ دولت، زیادہ مصائب
211	192	اللہ کے مقابل دعویٰ بڑی نادانی ہے
	193	افادات علم و حکمت
	193	نصاب تعلیم
	193	طرز تعلیم
	196	معلم کا اثر
	194	طلبہ کی اخلاقی حالت
	195	رابطہ کا فقدان
	195	اساتذہ کرام کا معیار
	196	کیا مدارس کا موجودہ نظام بدعت ہے؟
	197	اکابر کے علوم کی گہرائی جس کا اب فقدان ہے
	198	طلبہ کی سیاسیات میں شرکت کے آثار
	199	فکر معاش نے علمی ترقی روک دی
	200	پست فکر بھی علمی ترقی نہیں کر سکتا
		علم کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا، پیدا شدہ بلندیوں کو اونچا
	200	کر دیتا ہے
	202	طبعاً ہی فکری قوت کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں
	202	فضلاء کرام کی اپنی مادر علمی سے وابستگی کی ضرورت
		حکومت کی ادنیٰ توجہ سے اونچی سوسائٹی کے لوگوں
	203	میں دین آ سکتا ہے
	204	اکابر کے خواب کی تعبیر
		صدیق حمیم..... ورفیق قدیم حضرت مولانا مفتی محمد
	206	شفیع صاحب قدس سرہ
	206	معیت و رفاقت
	206	رفاقت تعلیم
	207	رفاقت تدریس
	207	رفاقت سلوک

فلسفہ نماز

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَّاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُبِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ أَفَاعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. ۵

تمہید..... اما بعد! مجھے جس عنوان پر لب کشائی کی ہدایت کی گئی ہے اور جو عنوان میرے مضمون کے متعلق شائع
کیا گیا ہے وہ ہے ”فلسفہ نماز“ سال گذشتہ بھی اسی خیر المدارس کے سالانہ جلسہ پر جو مضمون مجھے دیا گیا تھا اس کا
عنوان تھا ”فلسفہ ارکان اسلام“.....

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کی مجالس سے فلسفہ ہی میرے حصے میں کیوں آیا ہے؟ حالانکہ نہ تو میں فلسفی ہوں
اور نہ میری تعلیم پر فلسفہ کا غلبہ ہے اور نہ جس جماعت کی طرف میرا انتساب ہے وہی کوئی فلسفیوں کی جماعت ہے
اس لیے کسی نہج سے میری طرف یہ تفلسف اور فلسفہ کا انتساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔

فلسفے کے تین (۳) طبقے..... قدیم فلاسفہ کے (۲) دو ہی مشہور طبقے ہیں۔ ۱۔ مشائیہ اور ۲۔ اشراقیہ۔ مشائی
کائنات کی حقیقت پر عقلی سوچ بچار سے بحث کرتے ہیں اور استدلال کے رنگ سے دنیا کی حقیقت کا سراغ لگانے
کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔ نظر و فکر ان کا علمی سرمایہ ہے اور دماغی اختراعات کا ذخیرہ ان کی پونجی۔

فلسفہ اور دین..... ظاہر ہے کہ دین اور اس کی حکمیات کو نہ دماغی اختراع سے تعلق ہے اور نہ نظر و فکر اور سوچ بچار
سے وہ معرض وجود میں آیا ہے۔ وہ تو ایک خدائی پروگرام ہے جس کا تعلق نظری عقیدت اور عملی اکتساب سے ہے،
اس کے حقائق برتنے سے کھلتے ہیں نہ کہ دماغ لڑانے اور عقلی گھوڑ دوڑ سے۔ اس لیے اسے مشائیہ کی عقلی تگ و تاز
سے بھی کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔

ہاں! اگر دین کی جمع و ترتیب عقلی اتار چڑھاؤ کا ثمرہ ہوتی اور وہ کسی رسمی فلسفی کی کاوش و دماغ کا ثمرہ ہوتی تو
اسے عقلی چیتانوں سے حل کیا جاسکتا تھا، جیسے ہندو مذہب کہ اس کی موجودہ ہیئت ترکیبی کا پر داز ہی فلسفیانہ انداز

کا ہے اور فلسفیوں ہی کی کاوشوں کا رہن منت معلوم ہوتا ہے۔ نیز ہندوستان کا فلسفہ مشہور بھی ہے اس لیے ان کے مذہب پر فلسفہ کا دباؤ بعید از قیاس بھی نہیں۔ اس لیے اگر اس جیسے مذہب کو فلسفیانہ نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایک بات بھی ہے لیکن اسلام ایک سادہ اور صاف خدائی مذہب ہے جس کی ابتداء و انتہاء اور اصول و فروع سب کچھ نقلِ صحیح اور عقلِ کلی کا ثمرہ ہیں۔ اس لیے جزوی عقلوں کے تغلف کے اندازوں سے کلیۃً بالاتر ہیں اور اس لیے اس کے احکام کو مشائیانہ فلسفہ کے طرز و انداز سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہو سکتی کہ مجھ سے اس کی کسی عبادت کا فلسفہ بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے، یوں بھی دین کی اساس عشق و محبت حق پر ہے اور عقل اور فلسفہ کی غرور نفس پر۔ متدین دیندار بتلائے حق ہوتا ہے اور فلسفی مبتلائے نفس..... یہاں دماغی الجھنیں ہیں اور وہاں رسائی قلب۔ عشق و محبت سے بڑھنے اور دوڑنے کا جذبہ ابھرتا اور کوری عقل سے مصلحت اندیشیوں میں الجھ کر پیچھے ہٹنے اور رکنے کے دوائی پیدا ہوتے ہیں۔

پس کہاں عشق کی وارفتگی اور کہاں سوچ بچار کی گہمیر؟ اور جب کہ دونوں کی بنیادیں الگ الگ ہیں اور دین و فلسفہ میں اساسی بتاؤں موجود ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں دین میں سے فلسفہ کس طرح پیدا کر سکتا ہوں کہ نماز جیسی خالص دینی عبادت کے فلسفہ کا مجھ سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ نیز عقل و فلسفہ کا دائرہ حیات تک محدود ہے اس لیے عقل کی کارگزاری بھی صرف محسوسات کی ترکیب و تحلیل تک محدود رہے گی۔ پس وہ دین جو خدا کی اس فطرت سے نکل کر بندوں تک آیا ہے، جہاں حیات کے پرنسپل جم سکتے تو یہ تو حیات کا مزدور (فلسفہ) ان لطیف معنویات کا بار اپنے ضعیف کندھوں پر کیا اٹھا سکتا ہے؟ کہ ہم دین کی عبادتوں کو فلسفہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ بہر حال مشائیانہ فلاسفہ کے اصولوں پر یہ عنوان ’فلسفہ نماز‘ کوئی بامعنی عنوان ہی نہیں رہتا کہ میں تقریر میں اس کا حق ادا کر سکوں۔ ہاں دوسرا طبقہ اشراقی فلاسفہ کا ہے جو محض عقلی ڈھکونسلوں پر نہیں چلتے بلکہ کسی حد تک روشن وجدان سے بھی کام لیتے ہیں۔ یعنی یہ طبقہ محض سوچ بچا کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محنت و ریاضت اور مجاہدات سے تزکیہ نفس کر کے اپنے اندر کچھ جلا و صفا پیدا کرتا تھا اور نظر و فکر کے بجائے مراقبہ سے کام لیتا تھا تو ان پر کچھ اسرار منکشف ہو جاتے تھے، گویا وہ اس زمانے کے صوفیاتھے جنہیں فی الجملہ صوفیاء اسلام سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور ان کے فلسفہ کو زیادہ سے زیادہ مکاشفات کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں لیکن کشف محض خود کوئی حجت شرعیہ نہیں کہ اس سے مہمات دین کے بارہ میں کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ اس کے رد و قبول کا معیار دین اور اس کے قواعد ہیں۔ اگر کشف ان کے موافق ہے تو قبول ہے، ورنہ قابل رد..... لیکن قابل قبول ہو جانے کے بعد حجت شرعی پھر بھی نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ مؤیدات کے درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

پس عقل محض تو بجائے خود ہے جو مشائیانہ فلسفہ تھا۔ کشف محض بھی مدار معیارِ شریعت نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ عقل محض نے جس کی تگ و تازان کا نجات اور محسوسات سے آگے ہے ہی نہیں۔ اور جبکہ شرعی احکام کے اسرار کے

انکشاف سے فلاسفہ اشراقیہ بھی عاجز رہے ہیں جن کو فی الجملہ دینی ریاضت سے قرب بھی ہے اور گویا دوسرے لفظوں میں فلسفہ محض شریعت کے آس پاس بھی پھنک نہیں سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز کے عنوان کے ساتھ یہ فلسفہ کا کلمہ کیوں بڑھایا گیا ہے اور کیوں مجھ جیسے طالب علم سے جو فلسفیت سے کوسوں دور ہے، نماز کا فلسفہ بیان کرنے کی خواہش کی گئی ہے.....؟

اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ جب مشائی اور اشراقی فلاسفہ بھی جن کا فلاسفہ نظری ہے، نظریات شرعیہ کے ادراک سے عاجز ہیں تو وہ فلاسفہ جن کا فلسفہ محض عملی جزئیات کے استقرار و تجمیع تک محدود ہے اور وہ نظریات و کلیات میں کوئی شعور اور سلیقہ ہی نہیں رکھتے یعنی فلاسفہ یورپ تو اپنے فلسفہ سے حقائق شرعیہ کو کیا پاسکتے ہیں۔ فلاسفہ حال کا فلسفہ درحقیقت صنعت و حرفت اور سائنس ٹکنالوجی ایجادات تک محدود ہے۔ عناصر اربعہ اور جمادات و نباتات یا معدنیات میں عملی ترکیب و تحلیل اور اس سے نئی صورتیں اور معیشت کے نئے نئے سامان پیدا کرتے رہنا ان کے فلسفہ کی روح ہے۔ کلیات یا الہیات میں قدیم فلاسفہ کے سامنے ان کی حیثیت طفل کتب کی بھی نہیں۔ جیسا کہ ان کی تصانیف سے واضح ہے۔

پس جبکہ نظری فلاسفہ نے بھی اس میدان الہیات میں سپر ڈال دی تو یہ عملی مزدور جنہیں دستکار کہنا تو صحیح مگر فلسفی کہنا فلسفہ کی توہین کرنا ہے، اس میدان میں کیا چل سکیں گے کہ ہم ان کے فلسفہ کی رو سے حکمیت شریعت کو پرکھنے لگیں۔ غرض قداماء ہوں یا متاخرین، نظری فلاسفہ ہوں یا عملی، کسی صورت سے بھی ان کے اختزاعی اصول اسرار شرعیہ کو سمجھنے کے لیے معیار نہیں بن سکتے۔ کہ میں فلسفہ کے عنوان سے نماز کی حقیقت کو سامنے لاسکوں یا فلسفہ نماز کے عنوان کی تصویب کرسکوں۔

ہاں اگر عنوان رکھا جاتا حکمت صلوٰۃ، یا حقیقت صلوٰۃ یا اسرار صلوٰۃ تو یہ ایک شرعی رنگ کا عنوان ہوتا ہے کیوں کہ حکمت یا حقیقت، یا اسرار کا تعلق ان فطوریہ حیات سے نہیں بلکہ باطنیات اور مغیبات سے ہے اور اس حکمت کی تلاش اگر ہم کر سکتے ہیں تو نہ یہ چیز مشائیہ سے مل سکتی ہے نہ اشراقیہ سے اور نہ ہی فرنگیت سے۔ بلکہ حکمائے اسلام اور محققین دین کے یہاں ملے گی۔ جن کے قلوب بجائے اس خاک اور مکر عالم سے وابستہ ہونے کے غیب کے لطیف عالم سے وابستہ ہیں اور ان کی روحوں کا براہ راست حق جل مجدہ کی صفات کمال سے نکلشن ہے وہ علم کے اس پاک و صاف سرچشمہ سے علمی موتی نکال کر لاتے ہیں جس میں نہ شک کی آمیزش ہے نہ تردد اور تذبذب کی بلکہ عین یقین کے پھیلے ہوئے زلال حیات سے ہے۔

بہر حال اشراقیت اور مشائیت یا فرنگیت اور بالفاظ دیگر فلسفیت یا عقلیت دین کے لیے کبھی معیار نہیں بن سکتی کہ اس پر پرکھ کر ہم دین کو قبول کریں یا اسے دینی حظ حاصل کرنے کا راستہ بنائیں۔

حتیٰ کہ میں تو یہ دعویٰ کر چکا ہوں اور وہ اپنی جگہ ایک صحیح دعویٰ ہے، کہ یہ حکمیت یا کشف صحیح بھی دین کے رد

وقبول کا معیار نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ دین کا مبنی وحی ہے اور قطعیت میں وحی کا مقابلہ سچے سے سچا کشف بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ عقل جو رات دن دھوکے کھاتی رہتی ہے اور غلط فتوے دیتی رہتی ہے۔ اس لیے عقل تو عقل سچا کشف بھی حجت شرعیہ نہیں ہے کہ اس کو دین کے رد و قبول یا دینی امور کے حقیقی اسرار و غوامض کی کسوٹی بنایا جاسکے بلکہ خود کشف کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار قواعد شرعیہ ہیں۔ تاہم اگر کسی حد تک دین کے حقائق میں بصیرت اور دل میں طمانیت پیدا کرنی ہو تو اس کا سراغ مشائیت اور اشراقیت یا فرنگیت سے نہیں بلکہ صرف حکمت اسلام سے مل سکتا ہے اور بس..... جس کا نام فلسفہ نہیں بلکہ حکمت یا حقیقت ہے۔

اس لیے نماز کے بارہ میں کسی فلسفیت میں پڑے بغیر اپنی بساط کے موافق اس مضمون کا حق ادا کرنے کے لیے حکمت یونان کے بجائے صرف حکمت ایمان کے چند نقطے اور دقیقے پیش کروں گا۔ جن کو فلسفیانہ غوامض کے بجائے حکیمانہ رموز سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے اس مضمون کا عنوان ”فلسفہ نماز“ کے بجائے اگر حکمت صلوٰۃ رکھا جاتا تو زیادہ قرین صواب ہوتا۔

نماز کی حقیقت اور آپ کے الفاظ میں اس کا فلسفہ واضح کرنے کے لیے پہلے ایک مقدمہ اور مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے جس سے اس کی حقیقت جلد تر آپ کے سامنے آسکے گی اور وہ یہ کہ پہلے ان افراد کی حقیقت پر غور کیجئے جن پر نماز کا فریضہ عائد کیا گیا ہے یعنی خود انسان کی حقیقت کو سامنے لائیے۔ کیوں کہ نماز کی حقیقت کا تعلق خود انسان کی حقیقت سے ہے کہ جیسی حقیقت خدا نے جس مخلوق کی بنائی ہے ویسی ہی عبادت اس پر عائد کی ہے۔ ناقص الحقیقت افراد پر ناقص طاعت، کہ جو ان کے حق میں کامل ہے اور کامل الحقیقت مخلوق پر کامل عبادت جو واقع میں کامل ہے۔

پس غور اس پر کرنا ہے کہ خود انسان اپنی خلقت اور حقیقت سے کامل ہے یا ناقص۔ اگر کامل ہے تو ضروری ہے کہ عبادت بھی اس کی کامل ہو۔

سو ہم نے جہاں تک انسانی حقیقت پر غور کیا اسے ”حقیقت جامعہ“ پایا۔ یعنی انسان تمام کائناتی حقیقتوں کا مجموعہ اور خلاصہ ہے اور عالم میں جس قدر بھی حقائق ہیں ان سب کے نمونے اس میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ گویا ایک انسان خود تنہا ایک مستقل عالم اور پورا جہان ہے۔ اس لحاظ سے اگر پورے جہان کو عالم اکبر یا شخص اکبر کہیں گے تو اسے عالم اصغر یا شخص اصغر کہیں گے۔ کہ انسان خود ایک ایسا عالم ہے جو مجموعہ عوالم ہے۔ چنانچہ غور کیجئے کہ عالم کائنات کی دو (۲) ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد ¹ اور عالم غیب ² عالم شہادت یہ اجسام کا عالم ہے، جو آنکھوں سے مشاہدہ اور محسوس ہوتی ہے اور عالم غیب وہ عالم ہے جو جسمانیات سے پاک ہے۔ اور آنکھوں سے اوجھل صرف دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے یعنی اس پر یقین رکھنا پڑتا ہے جیسے آسمان سے اوپر روحانیت کا عالم، ملائکہ علیہم السلام، ذات و صفات حق اور عالم اسرار غیب۔ نزول وحی، کلام الہی، رسالت و نبوت کا اعطاء علوم و معارف، کمالات حق وغیرہ ہیں۔ ٹھیک اسی طرح سمجھو کہ انسان میں ایک عالم شہادت ہے جو محسوس ہے، وہ بدنی عالم اور جسمانی جہان ہے جس

میں گوشت پوست، ہڈی، چمڑہ، اعضاء بدن اور اجزاء زمین شامل ہیں۔ ایک عالم غیب ہے جو آنکھوں سے محسوس نہیں جیسے روح انسانی کہ اس میں علوم کے سرچشمے ہیں، صفات کمال۔ جو اس ختمہ اور مشاعر اور اک وغیرہ ہیں۔

پھر جیسے اس دنیا کے عالم شہادت میں دو (۲) حصے ہیں۔ سفلیات ۱ جیسے زمین اور ان کے سبزہ زار دریا اور پہاڑ وغیرہ اور علویات ۲ جیسے آسمان، چاند سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں بھی (۲) دو حصے ہیں۔ ایک فوقانی حصہ ہے جس میں دماغ اور قلب ہے کہ یہی اس کے علویات ہیں اور دوسرا تحتانی حصہ ہے جس میں مختلف حسی اعمال و حرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں جیسے ہاتھ پاؤں پیٹ اور پیٹھ وغیرہ۔ پھر جیسے زمین کے سفلیات میں حسی مادوں کی کار فرمائی ہے یعنی عناصر اربعہ آگ پانی، ہوا، مٹی کہ عالم جسمانی کی بنیاد ہی ان مادوں پر قائم ہے اور علویات میں معنوی مادوں کی کارگزاری ہے۔ جیسے علوم و معارف تدبیر و تصرف، رحمت و غضب وغیرہ ٹھیک اسی طرح انسان کے سفلیات یعنی بدن میں بھی ان ہی چاروں کے اثرات، حرارت، برودت، بیوست و رطوبت کا فرما ہیں کہ اس بدن کی بنیاد ہی ان عناصر اربعہ پر ہے اور اس کے علویات یعنی قلب و دماغ میں حواس ختمہ اور قوائے علوم و ادراکات اور بدن کی تدبیر و تصرف کی قوتیں ودیعت شدہ ہیں۔ وہاں قہر بھی ہے اور مہر بھی رحمت بھی ہے اور غضب بھی۔ پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کار فرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی ختمہ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔ چنانچہ جیسے زمین ایک تودہ خاک ہے ایسے انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے کہ یہ بنا ہوا مٹی سے ہے۔ بدن پر سے میل پکیل جھڑتا ہے، وہ مٹی کے سوا اور کیا ہے۔ پھر جیسے زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول و عرض اور عمق سب ہی کچھ ہے کہیں اونچ ہے اور کہیں نیچ۔

ایسے ہی انسان کے بدن میں بھی اونچ نیچ، گہرائی اور اونچائی سب ہی کچھ موجود ہے، پھر جیسے زمین کے نیچے رطوبات اور پانی بھرا ہوا ہے کہ ذرا زمین کھودی تو تری نکلی شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کی زمین بھی ہے کہ اس کے نیچے بھی رطوبات ہیں۔ ذرا بدن کاٹ دو تو خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے، سفید، سیاہ، سرخ، زرد، ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے، مستور حصے جیسے زیر بغل، کچھ ران سیاہ ہے، چہرہ پر سرخی رہتی ہے، ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے اور پوری نوع بشری پر نگاہ ڈال لو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد، عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پس نوع انسانی میں بھی ہر رنگ کے افراد موجود ہیں اور ہر ہر فرد کے بدن پر بھی مختلف رنگوں کا تفاوت ظاہر ہے، پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے جو تفریح گاہ ہوتا ہے اور کوئی گندہ ہے جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں۔ ایسے ہی بدن انسانی کا کوئی حصہ تو ایسا لطیف اور صاف و ستھرا ہے کہ اسے عزت سے چومتے ہیں جیسے چہرہ اور ہاتھ اور کوئی حصہ گندہ ہے جیسے زیر بغل اور اعضائے نجاست یا معدہ کہ کوڑیوں کی جگہ ہے۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات و کیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کو لو تو جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رد و ور رہی ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی ہر جگہ حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اس حرارتِ غریزی و طبعی پر ہی انسانی زندگی قائم ہے۔ پھر جیسے پتھروں اور مٹی یا لوہے کو رگڑنے سے آگ نمایاں ہونے لگتی ہے، ایسے ہی اگر انسانی بدن سے بدن یا ہاتھ سے ہاتھ رگڑنے لگے تو آگ نکلنے لگتی ہے اور بدن کا وہ حصہ خوب گرم ہو جاتا ہے اور جیسے آگ درحقیقت فیض ہے علویات کا، یعنی سورج کا، اگر سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں چنانچہ جہاں سورج کی گرمی پوری نہیں پہنچتی یا دیر تک نہیں پہنچتی۔ وہاں کی چیزیں سیل جاتی ہیں اور نمناک ہو کر جھڑنے لگتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن میں بھی حرارتِ فیض ہے ”علویات“ کا یعنی قلب و دماغ کا، قلب ہی وہ حرارتِ غریزی تیاری کرتا ہے جو عروق میں بہ صورت بخار پھیلتی ہے اور روح ہوائی کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن جھڑنے لگے یا اگر قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کو لو تو جیسے اقلیمِ عالم کے گوشہ گوشہ میں پانی زمین میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی بدنِ انسان میں بھی رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے جو بدن کا نٹے ہی نکلنا شروع ہو جاتا ہے پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں، کوئی بڑا دریا بہے کوئی چھوٹا۔ ایسے ہی انسان کے بدن میں رگیں اور عروق ہیں اور یہ بڑی چھوٹی نہریں بہہ رہی ہیں جن سے اقلیمِ بدن سیراب ہو رہی ہے۔ پھر جیسے زمین میں ماء جاری کے علاوہ ”ماءِ راکد“ یعنی ٹھہرا ہوا پانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے تالاب یا دوغڑے جو بھرے پڑے رہتے ہیں۔ ایسے بدنِ انسانی میں بھی دوغڑے ہیں جیسے معدہ کہ اس میں پانی ٹھہرا رہتا ہے، پھر جیسا کہ زمین میں مختلف چشمے جاری ہیں کسی کا پانی شیریں ہے کسی کا شور اور نمکین ہے کسی کا تلخ اور کڑوا ہے اور کسی کا ترش ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی مختلف المذاق چشمے جاری ہیں۔ منہ سے آبِ شیریں کا چشمہ جاری ہے اگر وہ تلخ ہوتا تو منہ ہر وقت کڑوا رہتا اور زندگی تلخ ہو جاتی، آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے جس کا نمکین پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ آنسو منہ میں چلا جاتا ہے تو نمک کا مزا آنے لگتا ہے۔ پتے سے کڑوا پانی چلتا ہے اگر وہ اپنے مستقر کو چھوڑ کر سارے بدن میں بہہ جائے تو سارا گوشت پوست بھی تلخ ہو جائے معدے سے ترش پانی چلتا ہے۔

چنانچہ ڈکار کے ذریعے اگر کبھی معدہ چھلک پڑتا ہے اور پانی منہ میں آ جاتا ہے تو اس میں کافی ترشی اور کھٹید ہوتی ہے جس سے سارا منہ کھٹا ہو جاتا ہے غرض انسان میں ہر ذائقہ کا پانی اور اس کے چشمے موجود ہیں۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت و برودت کے غلبہ یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں اور کہیں کا جما ہوا، جیسے بحرِ منجمد شمالی اور بحرِ منجمد جنوبی۔

ایسے ہی انسانی بدن میں کچھ تو چشمے جاری ہیں جیسے تھوک، سنک آنسو وغیرہ اور کچھ منجمد ہیں جیسے بلغم کہ کبھی وہ سینہ پر جمتا ہے کبھی دماغ میں۔ پھر دنیا میں کہیں کے چشمے پینے کے قابل ہوتے ہیں اور کہیں گندہ پانی بہتا ہے، جن سے سب نفرت کرتے ہیں جیسے گندے نالے وغیرہ۔ ایسے ہی بدنِ انسانی میں ایک تو منہ سے چشمہ جاری ہے جو ہر وقت پیا جاتا ہے اور ایک پیشاب یا سنک ہے جو گندہ پانی کو یا گندی نالی سے بہتا ہے، وہ رک جائے تو اور زمین بھی

خراب ہو جائے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے بہتے ہیں جیسے ٹھنڈے پہاڑوں پر اور کہیں گرم چشمے بھی بہتے ہیں، جہاں گندھک کا زور ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے زبان سے اور گرم پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے آنسو یا پیشاب کہ وہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

اور جیسا کہ زمین پر بعض جگہ ایسا مرج البحرین ہے کہ ایک ہی دریا میں ایک حصہ شیریں پانی ہے اور اسی سے ملا ہوا۔ دوسرا حصہ شور و تلخ ہے: ﴿هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٍ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ﴾ ① ایسے ہی بدن انسانی میں دماغ کو دیکھو کہ قوت ذائقہ جس سے شیریں چشمہ جاری ہے۔ اور قوت باصرہ جس سے نمکین چشمہ جاری ہے دونوں الگ الگ اور آپس میں بون بعید رکھتی ہیں۔ ایک کا دریا شیریں اور ایک کا نمکین لیکن اس کے باوجود پھر بھی دونوں دماغ کی حس مشترک میں جمع ہیں اور منبغ و مخزن دونوں کا ایک ہی ہے۔ گویا چشمہ ایک ہی ہے مگر ایک حصہ تلخ ہے اور ایک شیریں۔ پھر جیسے عالم میں برسات ہوتی ہے کہ ہر خطہ میں پانی ٹپکتا ہے، زمین ہی سے مانسون (مون سون) چڑھتا ہے۔ اور زمین ہی پر برس پڑتا ہے۔ ویسے ہی بدن انسانی میں بھی برسات ہوتی ہے کہ پسینہ ہر جگہ ٹپکتا ہے بدن سے ابھرتا ہے اور بدن ہی پر برس پڑتا ہے، اور جیسے وہاں برسات کا موسم ہے کہ پانی اس میں خوب برستا ہے۔ دوسرے موسم میں کبھی کبھی برس جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کی برسات کا موسم بھی وہی عالم اکبر کی برسات کا زمانہ ہے کہ خوب پسینہ بہتا ہے اور یوں ہر موسم میں تھوڑا بہت پسینہ آتا ہی رہتا ہے، غرض پانی کے جتنے ذہنگ جتنے رنگ اور جتنی انواع شیریں، تلخ، نمکین، پاک، ناپاک، جاری، راکد، نازل، مخلوط، غیر مخلوط، گرم و سرد زمین پر ہیں اتنی ہی انواع خود انسان میں بھی ہیں۔

ہوا کو لو تو جیسے اس بڑے عالم کے ہر خلا میں ہوا بھری ہوئی ہے ایسے ہی انسان میں بھی جتنے خلا ہیں وہ بھی ہوا سے پر ہیں اور پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں بھی چلتی ہیں۔

چنانچہ سانس کی آمد و رفت اس کی شاہد ہے، پھر جیسے کرۂ ارض پر نسیم اور صبا یا پردا اور پچھوا، ٹھنڈی اور گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ ایسے ہی انسان میں سانس کے راستہ جو ہوا اندر جاتی ہے وہ نسیم ہے اور جو باہر آتی ہے وہ صبا ہے۔ جانے والی سرد ہے اور اندر سے آنے والی گرم ہے۔ پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی ایسے ہی انسان میں ذکار آتی ہے تو ہوا خوشبودار اور خروج ریاہ ہوتا ہے تو بدبودار۔ پھر جیسے زمین میں کبھی تو جس اور گھونٹ ہو جاتا ہے جس سے جی گھبرانے لگتا ہے اور کبھی آندھیاں چلتی ہیں جس سے جہان الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے ایسے ہی انسان میں کبھی جس ہوتا ہے، ریاہ بند ہو جاتی تو آدمی کا قلب پریشان ہونے لگتا ہے۔ اور کبھی سانس اکھڑ جاتا ہے یا دوڑنے کے سبب سانس چڑھ جاتا ہے تو سانس کی ہوا آندھی کی مثل اندر باہر سے شدت تمام چلے گئی ہے، جس سے سارا آدمی ہی الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے اور جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا بالکل کھینچ لی جائے تو یہ سارا عالم ختم

ہو جائے، ایسے ہی اگر انسان میں سے سانس سرے سے نکل جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔

غرض ہوا کی بھی جس قدر انواع و زمین میں وہ سب کی سب انہی نمونوں اور انہی کیفیات کے ساتھ انسانی عالم میں بھی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عناصر اربعہ کی جو کیفیت اس بڑے عالم میں ہے بجز اس چھوٹے عالم میں بھی ہے اور جن جن اندازوں سے اس پورے جہان میں عناصر کی کار فرمائی ہے، اسی انداز سے تنہا انسان میں بھی ہے جس میں سر مو فرق نہیں پڑتا۔

انسانی بدن کے جمادات پھر جیسا کہ ان عناصر اربعہ سے زمین پر موالید ثلاثہ پیدا ہوتے ہیں یعنی جمادات، نباتات، حیوانات، ٹھیک اسی طرح انسان میں بھی یہ تینوں موالید موجود ہیں، جمادات کو دیکھو تو مٹی پتھر اور ریت وغیرہ سب انسان میں ہیں۔ یہ ہڈیوں کا سلسلہ انسان میں پہاڑی سلسلہ ہے، گویا بدن کے پتھر ہیں، کوئی چھوٹا پہاڑ ہے کوئی بڑا اور پوری اقلیم تن میں یہ سلسلہ اسی طرح پھیلا ہوا ہے جس طرح پوری زمین پر کوہستانی سلسلہ چلا گیا ہے۔ پھر بعض اوقات تو انسان میں سے یہ متعارف پتھر اور ریت اپنی اصلی ہیئت کے ساتھ بھی نکلنے لگتے ہیں۔ جیسے گردہ میں سے پتھریاں آنے لگتی ہیں اور مثانہ میں سے ریگ آنے لگتا ہے۔ جنہیں دواؤں یہ آپریشن کے ذریعہ خارج کیا جاتا ہے، پھر جس طرح ان پہاڑوں پر مٹی جمی ہوئی ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں ہڈیوں پر گوشت چڑھا ہوا ہے۔ جو خاک کے ان تودوں کے ان پہاڑیوں پر چھایا ہوا ہے۔ پھر جیسے زمین اور پہاڑوں کے بعض حصے گرم ہوتے ہیں اور بعض سرد۔ ایسے ہی انسانی بدن کے بعض حصے بہت گرم ہوتے ہیں جیسے مستور حصے اور بعض حصے سرد ہوتے ہیں۔ جیسے سطح بدن کے تمام نمایاں حصے۔

پھر جیسے زمینی پہاڑ کے بعض حصے واجب الاحترام ہیں جیسے مقامات مقدسہ کہ ان کی زیارت کی جاتی ہے اور محبت و آداب سے انہیں چوما جاتا ہے اور بعضوں سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی اقلیم میں بھی ایسے ہی دو (۲) حصے ہیں۔ بعض قابل زیارت ہیں جیسے چہرہ مہرہ کہ اس کی زیارت کے لیے سفر کیے جاتے ہیں اور ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے، دست بوسی کی جاتی ہے اور بعض حصے قابل کراہت ہوتے ہیں جن کو دیکھنا بھی شرعاً و عقلاً ننگ و عار سمجھا جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین کے بہت سے حصے مستور ہیں کہ جن کو دیکھنے کی کوشش کرنا عبث سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی بہت سے اعضاء ہیں جنہیں دیکھا جاسکتا ہے جیسے پیٹ اور پیٹھ وغیرہ مگر اس کی کوشش کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔

انسانی بدن کے نباتات پھر جیسے پہاڑیوں اور عام خطہ ہائے زمین میں اگانے کی خاصیت ہے اور اس پر بھی طرح طرح کے نباتات اگتے رہتے ہیں، ایسے ہی اس اقلیم تن کے ہر خطہ میں نباتات کا سلسلہ بھی قائم ہے جیسے بدن پر اون اور اگے ہوئے بال ہیں۔ اور جیسے زمین کے خطوں میں کہیں گھٹا جنگل ہے کہیں چھیدا۔ ایسے ہی بدن پر کہیں گھنے بال ہیں جیسے سر اور منہ پر اور کہیں چھیدے بال ہیں جیسے عام بشرہ بدن پر ہیں۔ اور جیسے زمین میں

بعض ایسے ہیں جو برابر نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں، نہ بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں۔ جیسے پہاڑی خود رو سبزہ اور درخت۔ ایسے ہی بدن انسانی میں سر ڈاڑھی اور مونچھ وغیرہ کے بال وہ ہیں جو بڑھتے رہتے ہیں لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں وہ ہے جو ہمیشہ یکساں حالت پر رہتا ہے۔ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں بعض مقامات مثل جھاڑ جھکاڑ کے ہوتے ہیں جنہیں صاف کے بغیر زمین پر رونق نہیں آتی اور وہ پاک نہیں ہوتی اور بعض حصے ایسے ہیں جنہیں قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ زمین کا حسن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بدن میں بھی بعض رواں ایسا ہے جس کا صاف کرنا ہی زمین تن کی مصلحت ہے جیسے موئے بغل اور موئے زہار کہ یہ بودار جھاڑیاں ہیں۔ اور بعض کا رکھا جانا ہی حسن بدن ہے جیسے موئے سر اور موئے رخ۔ اور جیسے دنیا کے پالے ہوئے باغوں میں جب تک کہ مالی کاٹ تراش نہ کرتا رہے ان کا حسن و کمال باقی نہیں رہ سکتا بلکہ وہ اور زمین ہی کو بد نما کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی باغ بدن میں ایسے نباتات ہیں جن کی اصلاح اور کتر بیونت ہی سے بشرہ قائم ہوتا ہے جیسے موئے ریش اور موئے شوارب (مونچھ) ان کی کاٹ تراش اور اصلاح ہی سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انسانی بدن کے حیوانات پھر جیسے جنگلوں اور پہاڑوں میں مختلف قسم کے حیوانات ہوتے ہیں جو اپنے اپنے نشین میں رہتے ہیں اور جرتے پھرتے ہیں۔ زمین کی رطوبات ان کی غذا ہوتی ہے ایسے ہی انسانی جہان کی اس نباتات میں بھی طرح طرح کے جانور پیدا ہوتے ہیں جیسے سر میں جوئیں، پیٹ میں کیچوے، معدہ میں ریسمانی کیڑے وغیرہ جو بدن ہی کے خون کو چوستے ہیں اور پلتے ہیں۔

اور جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں حشرات الارض رہتے ہیں جن کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن کے اندر لاکھوں حینات ہیں۔ جو خوردبین سے نظر آتے ہیں جن کی ہیئتیں مختلف اور شکلیں رنگ رنگ ہیں جنہیں جراثیم کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید تحقیقات کی رو سے خون کی ہر ہر بوند میں کروڑ ہا جراثیم تیر رہے ہیں جو خوردبین سے تیرتے نظر آتے ہیں۔

پھر جیسے دنیا کا ہر خطہ اور ہر اقلیم ایک نئی شان رکھتی ہے اور وہاں کے جانور مختلف ہوتے ہیں ایسے ہی جدید تحقیقات کی رو سے ہر حصہ بدن کے جراثیم کی شکلیں بھی جدا گانہ ہیں اور خاصیتیں بھی الگ الگ ہیں ان سے امراض بھی نئی نئی قسم کی پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹری اصول پر خون نکال کر ٹیسٹ کیا جاتا ہے تو ہر حصہ بدن کے خون میں سے نئی نئی شکل و شمائل کے جراثیم نظر آتے ہیں۔

بہر حال جیسے زمین کے اوپر رنگ رنگ حیوانات ہیں اور اندر مختلف الہیہ حشرات الارض۔ ایسے ہی انسان میں ظاہر بدن پر بھی حینات پیدا ہوتے ہیں، اور قعر بدن میں بھی موجود ہیں اور جیسے زمین کی مخلوقات یہیں پیدا ہوتی ہیں اور مرکز یہیں دفن ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی یہ جراثیم بھی بدن ہی میں پیدا ہوتے ہیں، اسی میں پلتے ہیں اور مر کر اسی زمین بدن میں دفن ہو جاتے ہیں۔

انسانی بدن میں زلزلے اور طوفان وغیرہ..... عوارض و احوال کو لو تو زمین میں کبھی کبھی زلزلے آتے ہیں جس سے ساری زمین خود بخود حرکت میں آجاتی ہے۔ ایسے ہی بدن میں جھرجھریاں آجاتی ہیں جن سے پورا بدن اچانک اور ایک دم متحرک ہو جاتا ہے۔ وہاں زلزلے کا سبب زمین کے اندر کی حرکات کا بھڑکنے کے لیے زور کرنا یا کسی اندرونی کوہ آتش فشاہ کا پھٹنا کہا جاتا ہے، یہاں بھی اندرونی گرمی یا بھڑکا ہٹ سے دل پریشان ہو جاتا ہے یا کسی غیر متوقع حادثہ سے دل ایک دم گھبرا اٹھتا ہے۔ اور اس گھبراہٹ ہی سے ایک دم پورے بدن میں جھرجھری آجاتی ہے۔

پھر جب زمین پر کبھی طوفان سے غیر معتدل طور پر پانی زیادہ بہنے لگتا ہے، غیر معتدل طور پر کبھی خشکی اور قحط سالی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے غیر معتدل طور پر کبھی آگ برستی ہے کہ ذرہ ذرہ گرما جاتا ہے اور غیر معتدل طور پر کبھی آندھیاں اٹھتی ہیں جن سے گرد و غبار اڑا کر دنیا کی فضا کو مکدر کر دیتا ہے اور سارا عالم اس سے بھرپور نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی کبھی غیر معتدل طور پر پانی کا طوفان آتا ہے تو امراض مائیمہ مثل زکام و ذلہ وغیرہ رونما ہوتے ہیں کہ ناک آنکھ ہر طرف سے پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی غیر معتدل طور پر پوست کا غلبہ ہوتا ہے تو خارش شروع ہو جاتی ہے اور سارے بدن پر سے مٹی اور بھوسی جھڑنے لگتی ہے۔

کبھی غیر معتدل طور پر حرارت کا غلبہ ہوتا ہے تو امراض حارہ مثل بخار و سرسام وغیرہ ہوتے ہیں کہ بدن کی رگ رگ گرما جاتی ہے اور تپتی دکھائی دیتی ہے، کبھی غیر معتدل طور پر ہوائی مادہ بڑھتا ہے تو اورام بدن کو گھیر لیتے ہیں اور ساری اقلیم بدن پھولی ہوئی نظر آتی ہے۔

غرض عناصر کے غیر معتدل غلبہ سے جو غیر معتدل آثار اقلیم عالم میں آتے ہیں وہی اقلیم بدن میں بھی رونما ہوتے ہیں۔ پھر جیسے عالم پر کبھی کبھی ایسا دور بھی گذرتا ہے کہ اس میں عقل و حکمت کی کمی اور شہوات و غفلت کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ جس سے خود انسان انسانوں کے حق میں وبال بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنگ و جدل اور ایذا و رسانیوں کی گرم بازاری ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی بعض دفعہ ایسے بحرانی امراض پیدا ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے ہی بدن کو نوچنے اور اپنے ہی اعضاء کو کاٹنے لگتا ہے۔ کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے اور اسے اچھے برے کی کچھ خبر نہیں رہتی اور جیسے ان حالات اور عام اوقات میں زمین پر بادشاہت کام کرتی ہے، عام رعایا کی طاقت سے نظم ملک باہر ہوتا ہے نیز بادشاہ کے لیے وزراء اور جنود و عساکر ہوتے ہیں جو نظام ملک قائم رکھنے میں اس کے مددگار ہوتے ہیں ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے جس کے حکم پر یہ ساری کائنات چلتی ہے۔ دماغ اور اس کے حواس و زیر و شیر ہیں۔ معدہ خزانچی ہے جس سے مادی رزق ساری اقلیم میں تقسیم ہوتا ہے اور ہاتھ پیر جنود و عساکر ہیں جن کی مدد سے ملک بدن کا نظم درست کیا جاتا ہے اور عام غیر معتدل حالات میں عملی تدبیر کی جاتی ہے۔ غرض انسانی بدن میں مادی عوارض بھی بعینہ ویسے ہی ہیں جیسے کہ مادہ کی اس بڑی کائنات کے ہیں۔

علویات و فلکیات..... اب ارضیات کے بعد فلکیات یا سفلیات کے بعد علویات کو، انسان میں علویات کی

بھی وہی تفصیل ہے جو اس کے باہر کے آسمان پر ہے۔ آسمان پر چاند اور سورج ہیں کہ جن سے عالم میں روشنی ہوتی ہے۔ یہاں اقلیم کے بدن آسمان یعنی سر میں (۲) دو آنکھیں ہیں جو مثل چاند اور سورج کے روشن ہیں کہ ان ہی سے جہان میں چاندنا (روشنی) ہے اور اچھی بری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہاں ستارے ہیں جن سے لوگوں کو رستہ ملتا ہے اور راستوں کی راہنمائی ہوتی ہے۔ یہاں دماغ میں غور و فکر کی پیمائشیں ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں، گویا ہزار نظریات آسمان دماغ کے ستارے ہیں جو ہدایت کی راہ استوار کرتے ہیں۔ اور جیسے ستارے دنیا میں مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں۔ جڑی بوٹیوں اور مزاجوں میں مختلف گرم و سرد اثر ڈالتے ہیں ایسے ہی آسمان دماغ کے یہ فکری ستارے بدن پر اچھے برے اثر ڈالتے ہیں۔

فکر غم ہے تو بدن گھٹنے لگتا ہے۔ فکر مسرت ہے تو بدن تروتازہ ہو جاتا ہے اور عملی قوت بڑھ جاتی ہے حتیٰ کہ مزاج تک بدل جاتے ہیں۔ پھر جس طرح آسمانوں کے اوپر عالم غیب میں جنت ہے جس میں سوائے مسرت و اطمینان کے کسی غم کا نشان نہیں اور غیب ہی میں جہنم بھی ہے کہ وہاں سوائے غم و تردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں اسی طرح انسان کے باطن میں آثار مصائب و غم اور تشویشات مثل جہنم کے ہیں۔ کہ انسانی نفس ہر وقت کوفت اور کلفت کا شکار رہتا ہے اور آثار فرح و سرور اور بشارت و طمانیت مثل جنت کے ہیں کہ ان میں منہمک ہو کر انسانی نفس مگن اور دنیا و مافیہا سے بے فکر ہو جاتا ہے، غرض جیسے جنت مجموعہ لذات ہے ایسے ہی انسان کا باطن بھی مجموعہ لذات ہے اور جیسے جہنم مجموعہ آفات ہے، ایسے ہی باطن انسان بھی مجموعہ آفات ہے۔

پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے جس پر خالق کی تجلیات کا بلا واسطہ دور دورہ ہے۔ اسی طرح یہاں تمام فوقانی اشیاء اور علویات سے بالاتر آدمی کا لطیفہ قلب ہے جو تجلی کا گہر بانی ہے یعنی فلکیات بدن کا عرش۔

اور جیسے آسمان میں فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں کہ ان میں عصیان کا نشان نہیں اور وہی مدبرات امور ہیں ایسے ہی انسانی آسمان یعنی دماغ میں حواس خمسہ ہیں جو اقلیم بدن کی مخفی خدمات ملانکہ کی طرح انجام دیتے ہیں اور مدبرات بدن ہیں اور قلبی احکام کے سامنے ان میں عصیان کا نشان نہیں۔ بلکہ قلب کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مثلاً قلب نے دیکھنے کا اشارہ کیا تو اسے آنکھ کو حکم دینے کی ضرورت نہیں بلکہ آنکھ قلب کا ایما پاتے ہی مصروف دیدار ہو جاتی ہے۔ ذرا بھی عصیان نہیں کرتی کان قلبی اشارہ سے مصروف شنید ہو جاتے ہیں۔ نام کو عصیان نہیں کرتے اسی طرح تمام حواس خمسہ کو سمجھ لیا جائے اور پھر جیسے آسمان کے نیچے اس غیبی عالم میں شیاطین بھی ہیں جو حکم الہی کے سامنے کبھی نہیں جھکتے بلکہ خود گمراہ ہو کر پوری کائنات کو بھی گمراہ کر دینا چاہتے ہیں اور معاصی کو طرح طرح کی مزین صورتوں میں پیش کر کے عالم کے سامنے قابل قبول بناتے رہتے ہیں۔

ایسے ہی اقلیم بدن میں آسمان دماغ کے نیچے انسان کا نفس ظلمانی مثل شیطان کے ہے اور ہوا و ہوس و سوس اس کے آلات کار ہیں کہ نہ وہ اپنی جبلت سے قلب کی صلاح مانتا ہے نہ اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ بلکہ ہمیشہ

فانی لذات میں منہمک ہو کر ساری اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا رہتا ہے۔ معاصی اور اسراف عمل کی صورتیں خوب لذیذ بنا کر آدمی کے سامنے کرتا رہتا ہے اور آدمی عاجل لذات اور فانی صورتوں کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو کر ان میں منہمک ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کی عارضی لذت ضرور مل جاتی ہے مگر انجام کی ندامت و پشیمانی اور بعد کا بھگتان مفت میں سر پڑ جاتا ہے جس کا پھر کوئی تدارک نہیں ہوتا۔ بس انسانی کائنات میں جیسے جنت و نار تھی ویسے ہی ملائکہ و شیاطین کے نمونے بھی نکلے۔ غرض فرش خاک سے لے کر عرش پاک تک مخلوقات کے جتنے رنگ ڈھنگ، ان کے احوال و عوارض کے جتنے اتار چڑھاؤ اور جس قدر بھی احوال و کیفیات ہیں خواہ وہ غصریات کے ہوں یا مجرورات کے، حیوانوں کے ہوں یا نباتات و جمادات کے، سفلیات کے ہوں یا علویات، ارضیات کے ہوں یا فلکیات، حیات کے ہوں یا حقائق کے، سب ہی کے نمونے انسان میں موجود ہیں۔ اور یہ انسان مخلوقات کے تمام نمونوں کا جامع ہو کر گویا مجموعہ مخلوقات یا خلاصہ کائنات ہے۔

انسان میں کمالات خالق کے نمونے..... لیکن اگر اور عمیق نگاہ ڈالو اور فکر کو گہرائی کی طرف لے جاؤ تو اس مشت خاک میں ایک مخلوقات ہی کے نمونے نہیں بلکہ خالق جل و علا کے کمالات کے بھی سارے ہی نمونے ودیعت کیے گئے ہیں اور جس طرح وہ مجموعہ انواع و احوال مخلوقات ہے۔ اسی طرح از سر تا پا مظہر تجلیات الہی بھی نظر آتا ہے۔ گویا اگر انسان کا عالم شہادت یعنی بدن حیات کے تمام نمونوں کا مرکز ہے تو اس کا عالم غیب اور غیب الغیب یعنی لطیفہ روح مغنویات اور روحانیات اور الہیات کا مرکز ہے۔ اور جو رنگ اللہ کی تدبیر و تصرف، علم و خبر، حکمت و صنعت، ایجاد و ابداع اور پھر قد و سیت و تنزہ کا ہے وہی انسانی روح کا بھی ہے، چنانچہ اگر ساری کائنات کے لیے وہ ذات بابرکات مدبر اور حکیم ہے جو اپنی حکمت و قدرت سے عالم کو سنبھالے ہوئے ہے کہ اگر ذرہ رخ ہٹائے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

ایسے ہی روح انسانی اس بدن سے اپنا رخ پھیر لے تو یہ ساری بدنی اقلیم بے جان ہو کر گل سڑ جائے اور جیسے ان تمام مختلف رنگ جہانوں کے لیے وہی ایک مدبر ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا سہیم و شریک نہیں۔ ایسے ہی بدنی عالم کے لیے صرف ایک ہی روح مدبر بدن ہے جس کے ساتھ کوئی دوسری روح سہیم و شریک نہیں۔

اور جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود نگاہوں سے اوجھل اور بصری ادراک کے احاطہ سے بالاتر ہے۔ ایسے ہی روح انسانی بھی باوجود متقین ہونے کے خود یقین کنندوں کی نگاہوں سے اوجھل اور احاطہ بصر سے باہر ہے اور جیسے وہ خالق یکتا عالم کو نئی نئی صورتیں دیتا رہتا ہے مگر خود صورت سے پاک ہے ایسے ہی روح انسانی بدن کو طرح طرح کی حرکاتی ہمیشیں دیتی رہتی ہیں، مگر خود ہر قسم کی ہیئت و صورت سے پاک ہے۔ پھر جیسے خالق اکبر نے باوجود یکہ عالم کو بولمسون رنگینیاں اور رنگ برنگ کے جلوے دے رکھے ہیں مگر خود ہر رنگ سے پاک ہے۔ ایسے ہی روح انسانی بدن کو تو طرح طرح کی رنگینیاں اور تازگیاں دکھلاتی رہتی ہے مگر آج تک اس کا رنگ کسی نے

نہ پایا کہ اس کی لطافتوں میں رنگ و بو کا نشان ہی نہیں۔

پھر جیسے خالق اکبر باوجودیکہ عالم کے ذرہ ذرہ میں جلوہ فرما ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ سایا ہوا ہے مگر کوئی اشارہ کر کے نہیں بتلا سکتا کہ وہ ادھر ہے یا ادھر؟ ایسے ہی روح بھی بدن کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ لیکن اگر بدن کی گہرائیوں میں گھس کر بھی کوئی یہ چاہے کہ اشارہ کر کے بتلا دے کہ روح وہ بیٹھی ہے یا فلاں کونے میں ہے تو نہیں بتلا سکتا اور اس اقرار کے سوا چارہ نہ دیکھے گا کہ وہ ہر کونہ میں اور بدن کے ہر ہر رگ و ریشہ میں ہے۔ تو پھر جیسے وہ ذات، بابرکات باوجودیکہ ہر مخلوق سے تعلق رکھتی ہے لیکن پھر بھی اس کے تعلقات کی نوعیتیں الگ الگ ہیں۔ جو تعلق اسے عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں، جو بیت اللہ سے ہے وہ عام مساجد سے نہیں۔ جو معابد سے ہے وہ عام مواطن سے نہیں۔ اسی لئے قوی التعلق مقامات میں عظمت و قوت کے جو آثار ہیں وہ ضعیف التعلق مقامات کو حاصل نہیں۔ چنانچہ اگر وہ نقطہ تعلق جسے ہم بیت اللہ کہتے ہیں دنیا میں باقی نہ رہے تو عالم ہی باقی نہ رہے گا۔ ایسے ہی روح کا تعلق گوساری ہی اقلیم بدن سے ہے مگر جو اس جہان کے عرش یعنی قلب سے ہے وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ سے ہے وہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے نہیں اور جو اعضائے رئیسہ سے ہے وہ اعضائے مرسئہ سے نہیں۔ اس لیے روح کے جو آثار حیات قلب میں ہیں وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ میں ہیں وہ دوسرے اعضاء میں نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر قلب تک ذرا بھی کوئی برا اثر پہنچ جائے تو زندگی کی کوئی صورت ہی نہیں رہتی۔ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دماغ میں اگر چوٹ پڑ جائے تو حیات باقی نہیں رہ سکتی۔ بخلاف دوسرے اعضاء کے جیسے ہاتھ پیر کہ اگر کاٹ بھی دیئے جائیں تب بھی زندگی ختم ہو جانا ضروری نہیں اور سب سے نازل درجہ کا عضو ایڑی کہ اگر اسے کاٹ بھی دیں تو قطع حیات تو بجائے خود ہے، تکلیف کی کوئی شدت نہیں ہوتی اور اس سے بھی گرے ہوئے اجزاء بال یا ناخن ہیں کہ اگر وہ کاٹ دیئے جائیں تو سرے سے کوئی اذیت و کلفت ہی آدمی کو نہیں پہنچتی۔

پس روح کے تعلق کی قدر ہی اعضاء بدن میں آثار حیات ہیں اور بقدر آثار باری اعضاء کو راحت و کلفت ہوتی ہے۔ پس جو نوعیت تعلق مع اللہ کے درجات و مراتب کی اجزائے عالم کے ساتھ ہے۔ وہی نوعیت روح کے تعلق کی اعضائے بدن کے ساتھ بھی ہے۔ پھر جس طرح عالم میں کتنا ہی شر ہو اور گندگی اچھلے لیکن اس ذات اقدس کی پاک یوں تک برائی کی رسائی نہیں ”وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَّا كَذِبٌ“ ایسے ہی نفسانی غلاظتیں کتنی ہی اچھلیں مگر روح کی پاکی تک کسی کدورت و غلاظت کا اثر نہیں پہنچتا، وہ اسی طرح لطیف غیر مرئی اور حاکم و متصرف رہتی ہے۔

پھر جیسے حق تعالیٰ کی صفت دایت و ارشاد ہے جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی کائنات کو مضرات مادی و روحانی سے بچانے کے لیے اپنے ملائکہ مقربین کو مامور فرماتا ہے وہ قاصد بن کر بنی آدم کے منتخب اور جو ہر افراد حضرات انبیاء علیہم السلام کے پاس علم الہی لے کر اترتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اپنے بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ہمدردی کرتے ہوئے انہیں راہ ہدایت دکھاتے ہیں جس سے سعید انسان سعادت کو پہنچ جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح روح کی صفت بھی

ارشاد و ہدایت ہے اس نے بھی اس کائنات بدن کی اصلاح کے لیے اپنے کچھ قاصد مقرر کئے ہوئے ہیں جو اس کے علمی خزانے ہیں اور وہ مشاعر اور اک اور حواس خمسہ میں یعنی دیکھنے سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں۔

وہ ملائکہ کی طرح دماغ کے عالم غیب میں مخفی اور مستور رہتی ہیں۔ یہ قوتیں اپنے اپنے متعلقہ اعضائے ظاہری پر اترتی ہیں اور انہیں اپنا جلوہ گاہ بناتی ہیں گویا روح یہ طاقتیں حساس اعضاء پر جو تمام اعضاء بدن میں منتجب اور برتر ہیں القاء کرتی ہے۔ مثلاً حواسہ بصر آنکھ پر، حواسہ سمع کان پر، حواسہ شم ناک پر، حواسہ نطق زبان پر اور حواسہ لمس دس عام اعضاء پر، مگر بحفوات اور پھر حواسہ فہم، قلب پر، یہ اعضاء ان مختلف طاقتوں کے ذریعے پوری کائنات بدن کی حفاظت کرتے ہیں اور جلب منفعت و دفع مضرت کی مہمات انجام دیتے ہیں۔ اگر کائنات بدن ان کے علم پر صحیح صحیح چلتی ہے تو محفوظ رہتی ہے ورنہ ہلاکتوں کے گڑھوں میں جا گرتی ہے۔ پس قوائے احساس دماغ کے غیب میں جو اس کائنات بدن کا فوق اور سا ہے بمنزلہ ملائکہ کے ہیں۔ اور ان قوتوں کے مظاہر یعنی وہ اعضاء جن کے ذریعے یہ قوتیں نمایاں ہوتی ہیں بمنزلہ انبیاء کے ہیں۔ پس جیسے ذات باریکات کے کچھ پیغامبر ظاہر ہیں ایسے ہی روح کے بھی کچھ قاصد باطنی اور کچھ ظاہری نکلے۔ اور گویا رسالت و نبوت کا سلسلہ کائنات بدن میں بھی جاری ہوا۔ اور جیسے انبیاء کرام علیہم السلام جنس بنی آدم میں سے ہوتے ہیں ایسے ہی یہ اعضاء حواس بھی جنس بدن میں سے ہیں۔

پھر جیسے حق تعالیٰ کی گونا گوں صفات و کمالات میں سے کسی نہ کسی خاص صفت کے غلبہ کے ساتھ ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے گویا ہر پیغمبر اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی مخصوص صفت کا مظہر اتم ہے۔ ایسے ہی روح بھی اپنی کسی نہ کسی صفت سے ان ظاہری کارکنوں پر تجلی ہے اور ہر عضو، آنکھ، ناک، کان اس کی ایک ایک قوت احساس و ادراک کا مظہر اتم ہے۔ مگر جیسے حق تعالیٰ کی سب سے زیادہ جامع تجلی جس میں اور کمالات بھی مندرج ہیں، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم جمع کر دیئے گئے ہیں اور اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قرار پائے۔

ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ جامع تجلی قلب پر ہے جس سے قلب مجمع العلوم بنا ہوا ہے۔ چنانچہ حواس خمسہ میں جو بھی ادراک و شعور کا فیض ہے وہ قلب ہی کا ہے۔ اگر قلب توجہ نہ کرے تو آنکھ، کان کھلے رہنے کے باوجود نہ کسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ گویا قلب میں وہ تمام احساسات جمع رہتے ہیں جو ان حواس کے ذریعے نمایاں ہوتے ہیں، خود قلب کے اپنے مفہومات اور علوم مخصوصہ الگ ہیں جو آنکھ، ناک، کان کو میسر نہیں۔

چنانچہ علوم معقولہ اور وجدانیہ وہ قلبی علوم ہیں جو آنکھ، ناک، کان کے حصہ میں نہیں آئے۔ صرف قلب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پس جو علوم ان آنکھ، ناک، کان کے ہیں وہ درحقیقت قلب ہی کے علوم ہیں اور جو مخصوص قلب کے ہیں وہ تو قلب کے ہیں ہی، اس لیے قلب خاتم الادراکات قرار پایا۔ اور اس کی فضیلت تمام اعضاء ادراک پر نمایاں ہوئی۔ جبکہ باہم بھی ان اعضاء حواس میں تفاوت مراتب واضح ہے۔ گویا جیسے رسولوں میں باہم فرق

مراتب تھا اور آخری رسول سب سے افضل تھے کہ خاتم الکملات تھے۔ ایسے ہی ان بدنی رسولوں میں بھی باہمی فرق مراتب نمایاں ہوا۔ اور ان میں ایک رسول (قلب) خاتم الادراکات اور خاتم الکملات نکلا جس سے تفاضل رسالت اور ختم رسالت کا سلسلہ بھی اس کائنات میں جاری نظر آیا۔ پھر جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاء بوجہ جامع کمالات علم ہونے کے سارے انبیاء پر حاکم اور ان کے ادیان کے لیے ناسخ ہیں۔ ایسے ہی قلب بھی ان تمام اعضائے ربیہ و مروتہ پر حاکم اور ان کے ذخیروں نافذ اور متصرف ہے، آنکھ دیکھتی ہے اور اپنے مبصر کو قلب کی طرف روانہ کرتی ہے۔ یہ فیصلہ قلب ہی کرتا ہے کہ آنکھ کے دیکھے ہوئے سے کام لینے کا یہ وقت ہے یا نہیں؟

کان سنتا ہے اور مسموعات قلب کے پاس ارسال کر دیتا ہے، آگے قلب ہی اس میں غور کرتا ہے کہ آیا یہ اس وقت کارآمد ہیں یا نہیں؟ اور انہیں باقی رکھا جائے یا نہ رکھا جائے؟ بہر حال اعضائے حواس تو قلب کے علوم پر نقد و تبصرہ نہیں کر سکتے مگر قلب ان پر تنقید رکھتا ہے کہ خاتم الادراکات ہے پس نسخ شرائع و علوم بھی اس کائنات بدن میں مثل کائنات آفاق کے جاری نظر آیا۔ پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت و معرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و معرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے ایسے ہی یہاں بھی ہے کہ ان اعضاء کو اس کا علم قلب کی قوت علم سے مستفاد اور وابستہ ہے۔ اور قلب بالذات مد رک ہے۔ چنانچہ جب آنکھ، کان بند ہو جاتے ہیں تو تنہا قلب سوچتا اور تدبیر کرتا ہے تو ساری کائنات کے نقشے عالم خیال میں خود ہی دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ کسی طرح ان اعضائے حواس کا دست نگر نہیں ہوتا لیکن اگر قلب بند ہو جائے یا کسی انقباض کے سبب توجہ چھوڑ کر ربودگی کے عالم میں چلا جائے تو یہ سارے اعضاء بے کار محض رہ جاتے ہیں۔ نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں جس سے صاف واضح ہے کہ ان اعضاء کا علم تو قلب کا فیض ہے مگر قلب کا علم ان اعضاء کا فیض نہیں، قلب علم میں ان کا محتاج نہیں، مگر یہ سب اپنے اور اک میں قلب کے محتاج ہیں۔ پھر جیسا کہ مختلف انبیاء کے مختلف علوم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتے ہیں اور وہیں سے شروع ہوتے ہیں یعنی اللہ کے کمالات کے لیے نقطہ فیض ذات محمدی ہے کہ خدا کے کمالات اولاً آپ کی ذات بابرکات پر اترتے ہیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم و حکمت سب کو حسب الاستعداد و تفاوت درجات تقسیم ہوا ہے۔

اسی طرح روح کے بھی تمام علوم و کمالات کا نقطہ فیض قلب ہے کہ روح کے کمالات کا فیضان سب سے اول قلب پر ہوتا ہے حتیٰ کہ حیات و زندگی بھی اول اسی پر اترتی ہے، اور پھر اس کے واسطے سے تمام اعضاء کو یہ وجودی کمالات حسب حیثیت تقسیم ہوتے ہیں پس یہ تمام اعضاء قلب سے کسب فیض کرتے ہیں۔ اور قلب براہ راست روح سے کسب فیض کرتا ہے، اس لیے تعین اول کی نظیر بھی کائنات بدن میں نکلی، پھر جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی تعلیمات سے مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر نفع و نقصان سمجھا دیتے ہیں کوئی جبر و راہ کراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں کے ارادہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے ہی بدنی رسل (اعضائے حواس اور قلب) بھی اشیاء

کے حسن قبح کو دکھلا کر نفس میں برائی سے بچنے اور بھلائی کو سمیٹنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، نفس پر جبر نہیں کرتے۔ بلکہ نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس پر عمل کرے۔ سعید نفوس ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر فلاح دارین حاصل کر لیتے ہیں اور شقی نفوس اس سے بے پرواہ ہو کر اپنے کو ابدی ہلاکت میں مبتلا کر لیتے ہیں تو گویا ”لا اکسراہ فی الدین“ کا نقشہ بھی ہمارے اندر نکلا۔ پھر جس طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مطابق نفس انسانی روحانی غذائیں جب باطن میں پہنچاتا ہے تو حق تعالیٰ ان نفوس کے لیے ان غذاؤں کے نیک و بد ثمرات آخرت میں سامنے کر دیں گے اسی طرح بدنی کائنات میں بھی جب نفس اپنے ارادے سے بدن کی زندگی قائم رکھنے کے لیے مادی غذائیں معدہ میں پہنچاتا ہے تو روح اپنی تربیت سے اس کے ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے، اچھی غذاؤں کے اچھے ثمرات، صحت و قوت اور نشاط کی صورت میں زدی غذاؤں کے ردی ثمرات مرض و ضعف اور حزن و ملال کی صورت میں یعنی ذرہ ذرہ خیر و شر سامنے آ جاتا ہے۔ گویا سزا و جزا اور معاد کے نمونے بھی انسان میں موجود ہیں۔ غرض مبداء ہو یا معاد۔ نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا و جزا۔ حق تعالیٰ کے کمالات و صفات ہوں یا افعال۔ ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ.... انسان ایک ایسی حقیقت جامع ہے کہ اکوان و اعیان کی ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع، الہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں اور ہر انسان گویا مستقل جہان ہے جس میں ظلماتی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی نمود و نمونے قائم ہیں۔

آسمان نہاست در ولایت جان کار فرمائے آسمان جہان
دورہ روح پست و بالاہست کوہ ہائے بلند و صحراہست

غرض..... میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

تمہید سے مقصود کا استنباط..... اب غور کرو کہ جب انسان ایک طرف تو مخلوقاتی نمونوں کا جامع ہے اور ایک طرف ربانی نمونوں کا مظہر ہے۔ کل مخلوقات کی بھی ساری شانیں اس میں علی وجہ الائم جمع ہیں اور الہیات کی بھی تمام شئون اس میں موجود ہیں تو ان دونوں نمونوں کی جامعیت کے لحاظ سے دو ہی فریضے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایک مخلوقاتی کام اور ایک الہیاتی کام۔ یعنی ایک وہ کام جس کو الہیات چاہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مخلوق کا بحیثیت مخلوق الہی ہونے کے اس کے سوا کیا کام ہو سکتا ہے کہ اپنے خالق کے سامنے جھکے، گڑ گڑائے اور گریہ و زاری کرے۔ اسی کو اصطلاح مذہب میں عبادت کہتے ہیں، کیوں کہ عبادت کے معنی ہی انتہائے تذلل اور اظہارِ عجز و نیاز و اعلان احتیاج کے ہیں اور نمونہ الہیات ہونے کی حیثیت سے اس کا کام وہ ہوگا جسے شان الہیت چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا کام اپنی مخلوق پر توجہ کرنا، رحم کھانا، اس کی تربیت کرنا اور اس کے نفسانی نقائص دور کر کے اسے پاک بنانا ہے۔ اس لیے جہاں تک بھی ہو مخلوق اس کی اطاعت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ خالق منبع کمالات ہے اور کمالات کا نتیجہ عجز

نہیں بلکہ غنا ہے۔ مالک کمالات میں تاثر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا حق تاثر ہے۔ اس لیے خالق کا کام کسی کی توجہ حاصل کرنا نہیں بلکہ خود توجہ فرمانا ہے۔ کسی سے کمال لینا نہیں بلکہ مانگنے والے کو خود کمالات کا حصہ دینا ہے۔

پس انسان بھی جب کہ نمونہ ہائے الہیہ کا جامع ہے تو اس حیثیت سے اس کا کام بھی یہی ہوگا کہ وہ عالم پر توجہ مبذول کرے، اس پر اپنا نظام قائم کرے اس کے ذرے ذرے کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر ہر چیز کو اس کے محل پر رکھے اور اسی کے مناسب حال اس کی تربیت کرے، اسی کو اصطلاح مذہب میں خلافت کہتے ہیں۔ بس خلاصہ یہ نکلا کہ بحیثیت مخلوقیت کے نمونوں کے انسان کا فریضہ عبادت نکلتا ہے اور بحیثیت الہیت کے نمونوں کے اس کا فریضہ خلافت ہوتا ہے۔ ہاں پھر جبکہ انسان محض ایک مخلوق ہی نہیں بلکہ مخلوقیت کے تمام نمونوں کا جامع تھا گویا اس کی مخلوقیت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی تو اس کی عبادت بھی اتنی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں ساری ہی مخلوق کی عبادتیں مجتمع ہوں اور ایسے ہی جبکہ وہ الہیات کا کوئی معمولی یا ناقص نمونہ نہ تھا بلکہ ربانی کمالات کے تمام ہی نمونوں کا جامع تھا، جیسا کہ خَلَقَ اللّٰهُ اَٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ سے ظاہر ہے اور اس لیے یہ مسبود ملائکہ بھی بنا تو اس کی نیابت و خلافت بھی اتنی ہی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں خلافت کا ہر پہلو بلکہ ہر بنوع جمع ہو۔ خواہ وہ خلافت روحانی ہو یا خلافت مادی۔ اور خواہ وہ خلافت ظاہری ہو یا خلافت باطنی۔

پھر خواہ وہ خلافت انفرادی ہو یا خلافت اجتماعی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو تعجب سے دیکھیں گے کہ ایسا جامع کام جس سے عبادت و خلافت کے دونوں فریضے بیکدم انجام پاسکتے ہوں اور پوری جامعیت کے ساتھ ادا ہو سکتے ہوں وہ صرف نماز ہے کہ نہ اس سے زیادہ کوئی دوسری عبادت ہے اور نہ اس سے زیادہ جامع اسلوب پر کوئی عمل نیابت و خلافت الہی کا حق ادا کرنے والا ہے۔

عبادت صرف نماز ہی ہے..... نماز میں عبادت کا پہلو نمایاں طریق پر سامنے لانے کے لیے پہلے نفس عبادت کی حقیقت کو سمجھئے تاکہ نماز کی تعبدی حیثیت بھی کھل جائے اور بحیثیت عبادت اس کی جامعیت بھی نمایاں ہو جائے۔ شرعاً عبادت کے معنی غایت تدلل۔ یعنی ایسی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے کا کوئی درجہ ہی باقی نہ رہے کیوں کہ یہ عبادت اس ذات بابرکات کے سامنے پیش کی جاتی ہے جو عزت کے ایسے انتہائی مقام پر ہے کہ اس کے آگے عزت کا کوئی درجہ نہیں۔

پس عزیز مطلق کے سامنے محض ذلیل بن جانا کافی نہیں۔ بلکہ ذلیل مطلق بننے کی ضرورت ہے پس اسی ذلت مطلق کا نام عبادت ہے۔ پس عبادت کی حقیقت انتہاء درجہ کی نیاز مندی کے ہوئے، اب اگر آپ عبادت کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اسلام کی عبادت پر ایک نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں نماز کے سوا کوئی عمل عبادت ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو صرف نماز ہی ہے جسے حقیقی طور پر عبادت کہہ سکتے ہیں کیوں کہ عبادت اسلامی جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے چار ہی ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج۔ ان میں سے اگر آپ زکوٰۃ کو دیکھیں تو وہ کسی طرح

بھی اپنی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ زکوٰۃ کے معنی خدا کے لیے مال خرچ کرنے کے ہیں۔ جس کا حاصل مال سے مستغنی ہونے کا اعلان ہے اور ظاہر ہے کہ مستغنی ہونا کوئی ذلت کی بات نہیں کہ غنا تو خدا کی صفت ہے یا پھر اس میں عطا اور داد و دہش پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ داد و دہش اور جو دو کرم بھی کوئی ذلت کی چیز نہیں کہ اسے عبادت کہیں بلکہ حق تعالیٰ کی ایک پاک صفت ہے اور خدا کی صفات سے متصف ہونا ظاہر ہے کہ کمالات خداوندی سے تشبیہ پیدا کرنا ہے کہ جیسے خدا ان تمام وسائل مال وغیرہ سے غنی ہے اور جیسے وہ معطیٰ ہے اپنے پروردوں کے لیے، ایسے ہی ہم بھی غنی اور معطیٰ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسے ذلت یا عبادت کون کہہ سکتا ہے؟ یہ تو اعلیٰ عزت کا مقام ہے، چہ جائیکہ انتہائی ذلت کا ہو، جسے عبادت کا نام دیا جائے۔ اس لیے زکوٰۃ کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں کہیں گے۔ ہاں زکوٰۃ کا عبادت ہونا محض امتثال امر اور حکم ماننے کی وجہ سے ہے کہ اللہ کے فرمودہ کی اطاعت کرتے ہوئے آدمی نے اپنا مال خرچ کر دیا، پس امتثال امر کے معنی نے اسے عبادت بنا دیا ہے۔ ورنہ اپنی ذات کے لحاظ سے اس میں عبادت ہونے کی کوئی بھی شان نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح روزے کو لے لو تو اس کی ذات میں بھی عبادت ہونے کے کوئی معنی نہیں پائے جاتے، کیوں کہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور جماع کرنے سے رک جانے اور نفس کو ان تینوں خواہشات اور حوائج بشریہ سے پاک، منزہ اور مقدس بنالینے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی کسی طرح ذلت کی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ یہ احتیاج نہیں، بلکہ استغناء ہے اور غناء خدا کی صفت ہے کہ وہ کھانے پینے اور تمام حوائج سے مبرا اور منزہ ہے۔ پس اس منزہ اور تقدس پر آ جانا کمالات الہیہ کے ساتھ مناسبت اور مشابہت پیدا کرنا ہے نہ کہ مخلوقیت کے اوصاف میں پھنسنا پھر اسے عبادت کون کہہ دے گا؟ کہ اس پاک اور منزہ میں ذلت کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ ہاں پھر بھی روزہ اگر عبادت ہے تو محض اس لیے کہ اس میں حکم الہی کی اطاعت اور امر ربانی کی بجا آوری پائی جاتی ہے۔ اور یہ ترک حوائج محض اس کے فرمان کی تعمیل کے لیے پایا جاتا ہے کہ اس کے حکم کی بجا آوری میں یہ ترک اختیار کیا گیا ہے جس سے روزہ دار کی نیاز مندی واضح گف ہوتی ہے۔ اس لیے روزہ بھی بذلتہ کوئی عبادت نہ نکلا صرف اضافی طور پر اس پر عبادت کا اطلاق آ گیا کہ اس میں یہ نسبت اور اضافی ذلت پائی جاتی ہے جس کو حکم کی بجا آوری کہا گیا ہے اور جس سے وہ عبادت بن گیا ہے۔

اسی طرح حج کا فریضہ بھی اپنی ذات سے تعبد کی کوئی شان نہیں رکھتا کیوں کہ حج بھی چند ترک کا مجموعہ ہے، ترک وطن، ترک زینت، ترک لذائذ، ترک راحت وغیرہاں کہ آخر میں بصورت قربانی ترک زندگی بھی گویا کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان تمام ترک کا حاصل بھی وہی بے نیازی اور ان حوائج کلباس، وطن، راحت لذت وغیرہ سے استغناء ہے اور اس کے بعد محبت حق کا مظاہرہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ استغناء و محبت نہ ذلت ہے نہ نیازی مندی بلکہ عین عز و کرم ہے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں محبت و غنا شان حق ہیں نہ کہ شان عبد۔ اس لیے افعال حج سے بھی انسان کی احتیاج ظاہر نہیں ہوتی کہ اسے عبادت کہا جائے۔ وہ بھی عبادت ہوگا، تو اسی اطاعت حکم اور امتثال امر کی

وجہ سے غرض ان تمام اساسی عبادتوں میں سے کوئی ایک عبادت بھی اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان میں اضافی اور نسبتی معنی کے لحاظ سے عبادت کا نام آگیا ہے جس سے انہیں عبادت کہہ دیا گیا ہے۔ ہاں وہ فعل جس سے سر تا پایا ز مندی، عبودیت کیشی، بے بسی و بے چارگی اور انتہائی ذلت و خواری کے سوا کوئی اور چیز ہی ظاہر نہ ہو وہ صرف نماز ہے۔

نماز میں عبادت کے پہلو..... کیوں کہ نماز کے اندر (۲) دو ہی بنیادی چیزیں ہیں۔ ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک بیہات جو اعضائے بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء (سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ) سے لے کر فاتحہ و سورۃ تک۔ پھر تسبیحات سے لے کر التحیات و شہد تک اپنی عبودیت، غلامی اور فدویت۔ یا اللہ کی عظمت و برتری اور لاحد و بزرگی کے سوا اور کسی چیز کا بیان ہی نہیں ہوتا اور بیہات کے لحاظ سے دیکھو تو نیاز مندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔ پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز ناک اور پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت مطلقہ کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً و بیہتہ اعتراف کرنا بندگی اور غلامی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

چنانچہ جب کسی کی انتہائی ذلت اور رسوائی ہو جاتی ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کی ناک کٹ گئی۔ یا فلاں کی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ لگ گیا۔

پس جبکہ انسان اپنے ان شریف اور باعزت اعضاء کو حسی طور پر ذلت کے ساتھ خاک میں رگڑنے لگتا ہے اور معنوی طور پر قلب و زبان سے اپنے ذلیل ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو اس سے زیادہ اپنے کو ذلیل بنانے کی اس کے پاس اور کیا صورت ہو سکتی ہے اور جب اسی حقیقت کا نام عبادت ہے اور یہ صرف نماز میں پائی جاتی ہے تو حقیقی طور پر اگر عبادت کہلائے جانے کی مستحق ہے تو وہ صرف نماز ہی.... ہو سکتی ہے کہ اس میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے عزت نفس یا اپنی تنزیہ و تقدیس کہا جاسکے، یا کسی درجہ میں بھی اسے خدائی کمالات کے ساتھ تہبہ اور تخلیق بتلایا جاسکے کہ خدا کی شان کسی کے آگے جھکنا وغیرہ نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں احتیاج سے پیدا ہوتی ہیں اور وہاں غنائے مطلق کے سوا کسی ادنیٰ احتیاج کا نشان نہیں؛۔

غرض نماز ہی ایک چیز نفی ہے کہ اس میں ذاتی طور پر تہبہ بالخالق کا پتہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف تذلل للخالق اور صرف اعلان عبودیت و فدویت ہے اس لیے صحیح معنی میں عبادت کا لقب دیئے جانے کی مستحق بھی صرف یہ نماز ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں پھر جب کہ نماز کا امر خدا کی طرف سے ہے تو امتثال امر کی نسبت بھی نماز میں آئی جس نے حج و زکوٰۃ اور صیام کو بھی عبادت بنا دیا تھا اس لیے نماز جہاں حقیقی عبادت تھی وہاں اضافی عبادت بھی ثابت ہوئی۔ پس حقیقت و صورت اور اضافت و نسبت ہر ایک کے لحاظ سے اگر عبادت کہلائی جاسکتی ہے تو وہ صرف نماز ہے۔

نماز ساری کائنات پر لازم کی گئی ہے..... یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق کو صرف نماز ہی

کا پابند بنایا ہے کہ عبادت ہی وہ تھی ارشاد ربانی ہے: **كُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ** . ① ترجمہ ”ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا۔“

یعنی اسی طرح کہ جس طرح ہر ایک چیز نے خلقی اور پیدائشی طور پر اپنے کھانے پینے کے ڈھنگ اور اپنی طبعی خصوصیات کے رنگ کو پہچان لیا ہے کہ کوئی ذی حس بھی طبعیات میں کسی تعلیم کا محتاج نہیں ہوتا۔“

غرض یہاں یہ نہیں فرمایا **كُلُّ قَدْ عَلِمَ حَجَّهٖ وَزَكَوٰتَهٗ** بلکہ **صَلٰوۃ** فرمایا ہے یعنی ہر ایک نے اپنے حج و صیام و زکوٰۃ کو نہیں بلکہ نماز کو جان لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کلیۃ کے عموم میں جمادات، نباتات، حیوانات، غصریات اور مجردات سب آجاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے اپنی بعض مصنفات میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے تاکہ اس کی نماز اس کی خلقی وضع قطع سے طبعاً ادا ہوتی رہے۔ مثلاً درختوں میں چلنا پھرنا جھکنا نہیں ہے۔ اس لیے درختوں کی نماز صرف قیام ہے یعنی ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کی نماز تشریفی ہے کہ اس میں فہم و خطاب کا مادہ ہے اور درختوں کی نماز تکوینی ہے یعنی بجائے خطاب کرنے کے انہیں بنایا اس طرز پر گیا ہے کہ وہ گویا ہمہ وقت قیام کی حالت میں حکم الہی کے سامنے سرودھ کھڑے ہوئے اپنی نیاز مندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

پھر چوپایوں کی نماز صرف رکوع ہے یعنی ان کی خلقی ہیئت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت گویا اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں جس سے انحراف نہیں کر سکتے۔

پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑے مکوڑوں کی نماز بصورت سجدہ ہے جیسے سانپ بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑوں کی خلقی ہیئت ہی سجدہ نما بنائی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں، گویا یہ جانور ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں ہیں اور خلقی سجدوں سے اس کی یاد اور انتقال حکم میں مصروف ہیں جس سے کسی حال انحراف نہیں کر سکتے۔

پھر جبال اور پہاڑوں کی نماز بحالت تشہد و قعود ہے۔ گویا یہ ہر وقت زمین پر دوزانو جیسے ہوئے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں، ان کی خلقت اور صورت نوعیہ ہی یہی ہے کہ وہ رکوع و سجود اور قیام نہ کریں۔ بلکہ قعود کے ساتھ عبادت میں مصروف رہیں اور جس ہیئت پر انہیں لگا دیا گیا ہے، لگے رہیں۔

پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے رہتے ہیں جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کے یہ انتقالات بھی عبادت ہی گئے جاتے ہیں۔ پس یہ پرندے بھی جب اوپر سے نیچے کی طرف اڑتے ہوئے آتے ہیں یا اگر زمین پر ٹھہرتے ہیں تو گویا

① بارہ: ۱۸، سورۃ النور: الآیۃ: ۳۱۔

رکوع میں ہیں۔ اور نیچے سے اوپر اڑتے ہیں تو گویا رکوع سے قومہ و قیام کی طرف جاتے ہیں اور پر پھیلا کر زمین پر اوندھے پڑ جاتے ہیں تو گویا سجود میں ہیں۔ پس ان کی نماز انتقالات محض ہیں۔ یہ مستقلاً رکوع میں نہ سجود و قعود میں بلکہ اڑتے ہوئے عروج و نزول کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ایک ہیئت سے دوسری ہیئت کی طرف منتقل ہونا ہی ان کی خلقی پیداؤں کی نماز ہے۔ پھر سیاروں اور آسمانوں۔ کو دیکھو تو ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر لوٹ آتے ہیں اور پھر وہی سابقہ حرکت شروع کر دیتے ہیں۔ پھر زمین کی نماز سکون ہے جسے انسان کی نظر دیکھتی ہے اور یہ بالکل مبتدیوں کی سی نماز ہے۔ کیوں کہ نماز کی تمام حرکات کا مبداء سکون ہی ہے پہلے آدمی ساکن ہوتا ہے، پھر حرکت کرتا ہے پس زمین بھی گویا ساکت و صامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہوئی ہے اور یہ وجود و سکون اس کی نگوینی نماز ہے کہ یہ انتہائی تدریل اور خشوع ہے جو پوری نماز میں مطلوب ہے۔ ارشاد ربانی ہے: **وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ** ① ”نماز بھاری ہے مگر سکون قلب رکھنے والوں پر“۔ اور یہی وہ خشوع و سکون ذلت دوسری جگہ قرآن نے زمین کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ارشاد حق ہے: **هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذُلُولًا**۔ الملک ۱۵ ”وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ذلیل بنایا ہے“۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے واضح ہے کہ زمین کی نیاز مندی اور نماز یہی وجود اور سکون ذلت ہے۔ پھر جنت و نار کی نماز۔ سوال ہے کہ (اے اللہ! ہمیں ہمارے مکان سے پر کر دے) چنانچہ حدیث میں ہے کہ جنت و دوزخ دونوں نے اللہ سے یہی سوال کیا ہوا ہے کہ قیامت کے دن ہمیں پر کر دیا جائے اور دونوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمہیں پر کر دیا جائے گا۔ نار کو کفار سے اور اس کی باقی ماندہ جگہ پتھروں اور پہاڑوں سے اور پھر بھی خلا رہ جائے گا اور وہ ﴿هَلْ مِنْ مُزْنِدٍ﴾ ہی کہی چلی جائے گی۔ تو حق تعالیٰ اپنے قدم اور ایزدی سے پر کر دیں گے جس سے وہ قطقط (بس بس) چلانے لگے گی، ادھر جنت جبکہ دنیا کے تمام اطاعت شعار ایمانداروں سے پر نہ ہوگی تو اس کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کر کے اسے بھر دیا جائے گا۔

غرض ان دونوں عالموں کی نماز سوال اور دعا ہے۔ پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف ہے یعنی صف بندی کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یاد الہی میں مصروف رہتے ہیں۔ ہاں اس اصطفاف کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جتنی ہیئتیں ان جمادات و نباتات و حیوانات کی نمازوں میں رکھی گئی ہیں اتنی سب ملائکہ علیہم السلام کی مختلف الاوان نمازوں کو دی گئی ہیں۔ لاکھوں کی جماعت اپنے بد خلقت؟ سے قیام ہی میں ہے اور بس یہی ان کی نماز ہے۔ ان گنت افراد رکوع ہی میں ہیں اور یہی ان کی صلوٰۃ ہے۔ بے شمار فرشتے سجود میں ہیں اور انہیں صرف سجدہ ہی کی نماز دی گئی ہے۔ بے تعداد قعود میں ہیں اور اسی کو ان کی نماز مانا گیا ہے، کتنے ہی عروج و نزول اور آسمان و زمین کے درمیان شب و روز اترنے چڑھنے میں مصروف ہیں اور یہی ان کی نماز ہے لا تعداد جو سکون و خشوع کے ساتھ ساکن ہیں اور صرف یہی ہیئت

ان کی نماز ہے۔ غرض اس صف بندی میں عبادت کی شاخیں مختلف ہیں جو ملائکہ کو دی گئی ہیں۔ پھر یہی سب ہیئتیں جو، ان جمادات و نباتات و حیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں، بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں۔ کسی قوم کی نماز میں محض قیام ہے۔

کسی قوم کی نماز نیم قیام کے ساتھ گھٹنوں کے بل ڈنڈوت کرنا ہے۔ کسی قوم کی نماز محض رکوع ہے، کسی قوم کی نماز میں محض اوندھا لیٹ جانا گویا سجدہ ہی کرنا ہے، کسی قوم کی نماز میں دو زانوں ہو جانا یعنی قعود ہے، پھر جب کہ نماز کی ہر ایک ہیئت کے مناسب ہی اس میں ذکر اور تسبیح رکھا گیا ہے تو ان موالید ثلاثہ اور ملائکہ اور اقوام عالم کی نمازوں کی ان ہیئتوں اور شانوں کے مناسب حال ہی ان میں سے ہر مخلوق کو نماز کی تسبیح اور ذکر بھی اس کی خلقت واستعداد کے مناسب جدا جدا عطا کیا گیا ہے۔ ہر ایک کی اصطلاح الگ اور لغت علیحدہ ہے کہ ایک کی زبان دوسرا نہیں سمجھتا۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح سے ایک وطن کا انسان دوسرے وطن کے آدمیوں کی زبان نہیں سمجھ سکتا جب تک اسے سیکھ نہ لے۔

پس اگر ایک شخص اپنی وطنی زبان میں اللہ کو یاد کر کے اس کی پاکی بیان کرنے لگے تو دوسرے ملک والے یقیناً اس کی یہ بولیاں نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس لیے قرآن حکیم نے فرمایا ہے وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَّا تُفْقَهُوْنَ تَسْبِيحَهُمْ ① (دنیا کی کوئی چیز نہیں جو خدا کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو)۔ اس آیت میں تعیم کے ساتھ ذرہ ذرہ کو تسبیح خواں بتلایا گیا ہے جس میں کسی نوع کی تخصیص نہیں ہے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی بہت سی تفصیلات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے کہ پانی جب تک جاری رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے درخت جب تک سرسبز رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے، کپڑا جب تک صاف ستھرا رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔ کھانا جب تک تازہ رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔ کنکر پتھر سب یاد الہی میں تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی میں چند کنکریاں اٹھائیں تو وہ زور سے تسبیح کرنے لگیں۔ یعنی ان کی تسبیح سنائی دینے لگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کے ہاتھ میں دے دیں تو بدستور تسبیح مسموع ہوتی رہی۔ اسی طرح فاروق اعظمؓ کے ہاتھ میں بھی، پھر اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ میں بھی۔

غرض نماز میں بھی ایک ہیئت ہے اور ایک حقیقت۔ اس کی ہیئت یہ افعال و ارکان ہیں اور اس کی حقیقت ذکر اللہ۔ یہی دونوں چیزیں قرآن نے ہر مکون اور پیدا شدہ چیز کی طرف منسوب کی ہیں کُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ صلوٰۃ اور تسبیح یعنی ہیئت وضع صلوٰۃ اور اس کی روح یعنی تسبیح اور ذکر الہی اور نماز کی ہیئت و حقیقت کو ہر ایک مخلوق پر لازم کر دیا ہے۔ جب کہ ہر ایک مخلوق بحیثیت مخلوق ہونے کے نمازی بنادی گئی ہے تو کیسے ممکن تھا کہ

انسان پر نماز نہ عائد کی جاتی نہیں بلکہ انسان جب کہ جامع نمونہ ہے مخلوق تھائی یعنی مخلوقیت میں حد کمال کو پہنچا ہوا تھا تو ضروری تھا کہ اس کی نماز ساری مخلوقات کی نمازوں کی بھی جامع ہو اور اس میں نماز کے سب نمونے موجود ہوں جو غیر انسان میں منتشر تھے۔

نوع بشر کی نماز چنانچہ نوع بشر میں مذاہب نے وہ ساری ہی ہیئتیں مختلف اقوام کو تقسیم کیں۔ جو ان مخلوقات میں منقسم تھیں، کسی قوم کو قیام کی نماز کسی کو قعود کی کسی کو رکوع کی اور کسی کو سجود کی۔ پھر ایسے ہی اقوام کی ان مختلف نمازوں میں اذکار بھی مختلف رکھے گئے جو ہر ایک قوم کی فطرت کے مناسب حال تھے۔ کسی پر تعویذ کے اذکار کہ وہ ہر مضر چیز سے پناہ مانگتی رہیں اور صرف دفع مضرت کا پہلو سامنے رکھیں۔ کسی پر سوال و دعا کا غلبہ کہ وہ ہر نافع چیز کو سامنے رکھ کر خدا سے نافع جلب کرتی رہیں۔ کسی پر اپنی ذاتی اغراض چھوڑ کر محض خدا کی پاکی بیان کرنے کا غلبہ کہ وہ ہینا و صفت کے بھجن گاتی رہیں۔ کسی پر تضرع کا انتہائی غلبہ کہ نیاز اور زاری کرتی رہیں اور اسی میں مخمور ہیں۔ غرض ہر قوم کو اس کی ذہنیت کے مناسب ہی اذکار تلقین کیے گئے اور ان کے مناسب شان ہیئات اور اوضاع صلوة دی گئیں۔ مگر بہر حال نوع بشر میں یہ سب امور جمع کر دیئے گئے۔ تنہا ایک قوم کوئی ایسی عارف اور شون الہیہ کو پہچاننے والی نہ تھی کہ سارے اذکار و اوضاع اور ساری ہیئات ایک ہی نماز میں جمع کر کے اس کے سامنے پیش کی جائیں۔

اسلامی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں جمع ہیں لیکن حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نبی اپنا معجزہ قرآن لاکر پیش کیا جو تمام کتب سادہ کے علوم کا جامع تھا اور اس سے بنی نوع بشر کی ذہنیت اس درجہ منور ہوئی کہ ساری اقوام کی ذہنیتیں یکدم اس کے سامنے سرنگوں تھیں اور اس معرفت کاملہ سے اس کی ذہنیت مکمل ہوئی۔ جس سے وہ تمام شون ربانی ان پر کھل گئیں جو مختلف اقوام پر مختلف قرون و دور میں کھلی تھیں، تو فطرت الہی نے وہ تمام اوضاع و اطوار جو اقوام عالم کی مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔ مسلم قوم کی نماز میں ساری لاکر جمع کر دیں۔ گویا یہ قوم جیسے معارف اقوام کی جامع ہوئی اور جیسے کہ معارف الہی کی جامع ہوئی، گویا ایسے ہی تمام عبادات اقوام کی بھی جامع ہوئی اور اس کی صلوة گویا مجموعہ صلوة اقوام ہو گئی۔

نماز جامع ہیئات ہے چنانچہ اس کی جامع نماز کی ہیئات میں قیام تو درختوں کا سا ہے، رکوع چوپایوں کا سا، صف بندی فرشتوں کی سی اور گردش و دوران آسمانوں اور سیاروں کا سا ہے کہ ایک رکعت سے چل کر پھر ویسی ہی دوسری رکعت کی طرف لوٹ آتا ہے، وہی افعال پھر کرتا ہے، جو پہلی رکعت میں کئے تھے اور یہی فرائض صلوة میں سے ہے کیوں کہ ایک رکعت نماز نہیں کم سے کم نماز ایک شفعہ ہے اور جبکہ نماز ہی کی ساری ہیئتیں جمادات، حیوانات، نباتات میں منتشر تھیں۔ تو یوں کہا جاتا ہے کہ مسلم کی نماز میں موالید تلاش کی نمازیں جمع تھیں۔ پھر یہی ہیئتیں جبکہ ملائکہ کی نماز میں بھی ہیں۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ ملائکہ کی تمام نمازیں بھی اسلامی نماز میں جمع ہیں اور یہی ہیئتیں جبکہ اقوام عالم میں منقسم تھیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی نماز میں دنیا کی ساری قوموں کی نمازیں بھی جمع ہیں۔

نماز جامع اذکار بھی ہے..... ادھر اذکار کو دیکھو تو ملائکہ کے طبقات ہوں یا انسانوں کے پرند ہوں یا چرند ہوں کسی پر تسلیم و تقدس کا غلبہ ہے کسی پر تحمید و تجید کا، کسی پر تعوذ کا غلبہ ہے اور کسی پر سوال کا غلبہ ہے اور کسی پر دعا کا، کسی پر کتاب کا غلبہ ہے اور کسی پر اسمائے الہی کی یاد کا، کسی پر درود شریف کا غلبہ ہے اور کسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پاک کا۔ غرض مختلف استعدادیں ہیں اور مختلف اذکار۔ مسلم کی استعداد اپنے پیغمبر کی جامع فطرت کے طفیل میں۔ چونکہ جامع مقامات تھی اس لیے اسلامی نماز میں ذکر الہی کی ہر ہر نوع جمع کر دی گئی ہے، اس میں تسبیح بھی ہے کہ اس کی ابتداء تسبیح سے ہے اور تحمید بھی ہے کہ الحمد اس کے لیے لازم ہے اس میں تعوذ بھی ہے کہ اعوذ باللہ سے قرأت شروع ہوتی ہے اور تسمل بھی ہے کہ اس کے بعد بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔ اس میں تکبیر بھی ہے کہ وہ شعار صلوٰۃ ہے اور اس میں سوال بھی ہے کہ سورۃ مسئلہ (فاتحہ) اس نماز کا جزو اعظم ہے اور دعا بھی ہے کہ اس کا اختتام بھی دعاؤں پر ہے اس میں تلاوت کتاب اللہ بھی ہے کہ وہ فریضہ صلوٰۃ ہے اور اسماء حسنی کی یاد بھی ہے کہ رکوع و سجود وغیرہ میں تسبیح الہی مختلف اسماء عظمت سے کی گئی ہے اس میں درود شریف بھی ہے کہ تشہد اس سے بھرپور ہے اور ذکر پاک نبوی بھی ہے کہ التحیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سب سے زیادہ بلند پایہ سیرت یعنی معراج کا ذکر ہے جو انتہائی قرب اور اللہ سے اعلیٰ تقرب کے وقت ہوا تھا۔

نماز جامع صلوٰۃ اعضاء ہے..... پھر اعضاء و اجزائے بدن کو لو تو ان سب پر بھی نماز حاوی ہے، زبان اس میں ذکر ہوتی ہے قلب اس میں خاشع ہوتا ہے، دماغ اس میں متفکر ہوتا ہے ہاتھ پیر اس میں متحرک ہوتے ہیں چہرہ اس میں گونسا ہوتا ہے انگلیاں غیر منتشر ہوتی ہیں۔ غرض ہر عضو اپنے مناسب حال اس عبادت میں حصہ لیتا ہے اس لیے نماز تمام ان افعال کی بھی جامع ثابت ہوتی ہے جو اعضائے بدن سے متعلق اور ان کے مناسب ہیں۔

نماز جامع اوقات بھی ہے۔!..... پھر ساتھ ہی نماز اوقات عبادت کی بھی جامع ہے یعنی جو وقت بھی فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔ صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نماز فجر نے اسے لے لیا، ظہر کا وقت کسل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔ عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلاب آفات کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔ عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نماز عشاء نے خاتمہ بالخیر کر دیا۔ پھر نفلی نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیات کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔ گویا اگر ایک انسان تمام اذکار، عبادات کے بجائے صرف ان مقررہ واجب و نفل اوقات نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو ترقی کر کے یہاں تک کہوں گا کہ یہ اوقات زندگی ہی میں نماز موت کے اوقات کو بھی گھیرے ہوئے ہے یعنی قبر میں اگر کوئی عبادت جاری رہتی ہے یا جس کی ادائیگی کا دھیان بندہ جاتا ہے تو وہ صرف نماز ہے۔ حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے **اَلَا نَبِیَّاءُ اَحْیَاءُ فِیْ قُبُورِهِمْ یُصَلُّوْنَ** اسی طرح حدیث میں

ارشاد ہے کہ مومن کو قبر میں عین سوال و جواب کے وقت غروب آفتاب کا قرب دکھلایا جاتا ہے تو وہ گھبرا کر ملائکہ (تکیرین) سے کہتا ہے دَعُونِيْ اُصَلِّيْ پس قبر میں عامہ مومنین کو دھیان آتا ہے تو نہ حج کا، نہ روزہ کا، نہ زکوٰۃ کا، بلکہ صرف نماز کا، اور فعل کے درجہ میں اگر کوئی اطاعت قبر میں ادا ہوتی ہے تو وہ نماز ہے پس نماز کا احاطہ زندگی کے اوقات پر نہیں بلکہ بعد الموت کی زندگی پر بھی حاوی ہے۔

غرض ہمیشہیں بھی نماز میں وہ سب موجود ہیں جو تکريم و تعظيم اور نیاز مندی کے اظہار کے لیے عقلاً ممکن ہیں اور اذکار بھی وہ سب ہیں جو اللہ کی شان اقدس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اطہر کے لیے ممکن سے ممکن ہو سکتے ہیں، اوقات بھی وہ سب ہیں جو عبادت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسلامی نماز جامع اذکار ثابت ہوتی ہے جس سے کمال جامعیت خوب نمایاں ہو جاتا ہے۔ پھر بایں معنی بھی اس کی جامعیت واضح ہے کہ یہ تمام افعال و اذکار کا جو سارے عالم سے لاکر اس میں جمع کیے گئے ہیں وہ نماز میں پہنچ کر فی نفسہ بھی اتنے کامل بن گئے ہیں اور اس کی حالت کی نسبت زیادہ مکمل طریق پر بیان کیے گئے ہیں جس قدر وہ نماز سے باہر یا قدیم نمازوں میں مامور ہو کر تھے، جن کا ہر گوشہ مکمل اور پر ہیئت اور جس سے نماز بذاتہ نہایت مہذب بن گئی ہے۔

ہیئت نماز کی خوبصورتی چنانچہ اس کے قیام کی خوبی اور خوبصورتی دوسری اقوام کے قیام سے بدرجہا زائد و مکمل ہے۔ جس میں چہرہ کا رخ جاء مستقیم پر، آنکھوں کی نگاہ سجدہ گاہ پر، ہاتھوں کی بندش ناف پر جو ادب کی انتہا ہے پیروں کی سیدھ اور فاصلہ مناسب، انگلیوں کی توجہ کعبہ کی طرف، بدن کا سڈول رکھا جانا، جس میں بیچ و تاب نہ ہو، غرض قیام کی ہر ادا موزوں اور قاعدہ میں جس سے نیاز مندی انتہائی نمایاں اور خوبصورتی کافی عیاں، رکوع میں مسطح، نہ اس میں کوب نکلا ہوا، نہ گڑھا پڑا ہوا۔ سر کر کی برابر، نہ ابھرا ہوا نہ نیچے لٹکا ہوا۔

گویا پورا انسان ایک قوس بن جاتا ہے جس سے نیاز مندی بھی واضح ہوتی ہے اور جستی اور چابک دستی بھی مترشح ہوتی ہے جیسا کہ چاکران خدمت گزار پوری تواضع کے ساتھ چاق و چوبند ہو کر اپنے آقا کے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں۔ سجود میں ناک اور پیشانی زمین پر۔ ہاتھ منہ سے الگ ہوتا ہے کہ منہ ہاتھوں پر نہ ٹکے اور خشوع میں فرق نہ آئے۔ بدن کشادہ نہ کہ سکڑا ہوا۔ تاکہ کسل مندوں اور ست آدمیوں کی وضع نہ بننے پائے۔ ہاتھوں کی انگلیاں غیر منتشر کہ بے فکری نہ ہیکے کہنیاں رانوں پر ٹکی ہوئی نہیں کہ کم ہمتی نمایاں ہو، قعود میں چوڑی کی نشست نہ ہو کہ تکبر واضح ہو۔ نہ ہاتھ کی ٹیک ساتھ ہو کہ آرام طلبی نمایاں ہو۔

نہ سرین زمین پر ٹکے ہوئے ہوں کہ جانوروں کی ہیئت پیدا ہو، نہ پیروں کے پنجوں پر نشست ہو کہ جلد بازی کھٹکے۔ بلکہ دوزانوں ہو جو ادب و تعظیم کی انتہائی نشست ہے۔ پھر اس نشست میں بھی دونوں پیروں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں تاکہ ہاتھ ادب سے زانوں پر ہو اور انگلیاں جڑی ہوئی ہوں تاکہ تہذیب کا دائرہ قائم رہے۔ شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی ہو تاکہ توحید کا شعار بلند رہے۔ پھر نماز سے خروج اور واپسی بھی اللہ کے نام سے ہو یعنی جیسا کہ

اس کی ابتداء اللہ کے نام سے ہوئی تھی یعنی اللہ اکبر سے۔ پس تکبیر سے شروع اور تسلیم پر ختم۔ فَخَرِ بِمُهَا التَّكْبِيرُ وَتَحْلِيلُهَا التَّسْلِيمُ۔ تاکہ ابتداء و اختتام میں فطرت و کبریا حق کا آواز بلند ہو۔

نماز کے اجزاء میں ترتیب عقلی پھر ترتیب افعال کیسی پاکیزہ کہ عقلاً بھی اس کے سوا دوسری نہیں ہو سکتی۔ اول قیام جو رکوع کی تہید ہے پھر رکوع جو سجدہ کی تہید ہے۔ پھر سجدہ جو اصل مقصود ہوتا ہے۔ گویا ہر اگلا رکوع پچھلے سے نیاز مندی میں ابلاغ اور بلوغ تر۔ پھر قیام فی نفسہ عبادت نہ تھا کہ اس میں انتہاء تذلل نہ تھا تو اس میں فاتحہ اور ثناء رکھ دی۔ تاکہ اس میں ذکر ہی سے نیاز مندی اور سوال کی الحاج و زاری پیدا ہو جائے۔ رکوع و سجود عبادت تھے تو انہیں تسبیح الہی سے بھر پور کیا گیا، تاکہ بندے اپنے کو ملوث اور خدا کو تلوٹ سے پاک جانیں۔

غرض جو تقسیم ابھی ہم نے نماز میں کی کہ اور عبادتیں فی نفسہ عبادتیں نہیں۔ اور نماز بذاتہ عبادت ہے۔ وہ دونوں نمونے بھی عین نمازیں جمع کر دیئے گئے کہ اس کے بعض اجزاء بذاتہ اطاعت نہیں جیسے قیام و قعود اور بعض بذاتہ عبادت ہیں جیسے رکوع و سجود وغیرہ۔ اس لیے قیام میں تعبدی ذکر غالب رکھا گیا ہے اور رکوع اور سجود فی نفسہ عبادت تھے تو ذکر قلیل کافی سمجھا گیا، شاید یہی وجہ ہے کہ قیام تعظیسی کو جائز رکھا گیا کہ یہ فی نفسہ عبادت نہیں اور رکوع و سجود تعظیسی کو بھی جائز نہیں رکھا گیا کہ وہ فی نفسہ عبادت ہیں اور چونکہ ان ارکان میں نیاز مندی تدریجاً بڑھتی گئی ہے اس لیے قرب بھی بتدریج بڑھتا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: إِذَا قَامَ الْعَبْدُ فِي صَلَاتِهِ ذَرَأَ الْبُرِّ عَلَى رَأْسِهِ حَتَّى يَرْكَعَ فَإِذَا رَكَعَ غَلَبَهُ رَحْمَةُ اللَّهِ حَتَّى يَسْجُدَ وَالسَّاجِدُ يَسْجُدُ عَلَى قَدَمَيْ اللَّهِ فَلْيَسْأَلْ وَلْيَرْغَبْ ①

غرض جس بیت کو دیکھو خود بذاتہ اپنی وضع اور ساخت کے لحاظ سے اتنی مکمل اس قدر مہذب اور ایسی شائستہ کہ جانور تو بجائے خود رہے، ملائکہ تو الگ رہے خود اشرف المخلوقات انسان کی پچھلی اقوام کی نمازوں کے منقسم اجزاء میں اس تہذیب و شائستگی اور خوبصورتی کا پتہ نہیں ملتا۔ اس لیے اسلامی نماز بایں معنی بھی جامع ہے کہ اس نے کوئی نیاز مندانہ ہیئت نہیں چھوڑی جو نماز نے نہ لے لی ہو۔ اور بایں معنی بھی جامع ہے کہ اس کی ہر ہیئت خود اپنے طبعی پہلوؤں کے لحاظ سے بھی اس قدر جامع ہے، اور مکمل ہے کہ کوئی گوشہ غیر فطری نہیں ہے۔ پس اسلامی نماز اس طرح اعلیٰ جامعیت کے ساتھ ہر قسم کی نیاز مندوں کا مجموعہ نکلتی ہے۔

نماز جامع عبادت بھی ہے پھر یہی نہیں کہ وہ اقوام عالم کے اذکار و طاعت کا ایک جامع مرقع ہے بلکہ اگر غور کرو تو خود اسلام کی بھی جس قدر عبادات اور طاعات ہیں ان سب کو بھی اس نماز میں لا کر جمع کر دیا گیا ہے۔ روزہ کو دیکھو تو نماز میں موجود۔ کیوں کہ روزہ کی حقیقت نیت صادق کے ساتھ کھانے پینے اور عورتوں سے منتفع ہونے سے بچنا ہے۔ غور کرو تو یہ ساری چیزیں نماز میں لازم ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک چیز مفید صلوة ہے

بلکہ نماز کا روزہ رمضان کے روزہ سے بھی زیادہ مکمل ہے کیوں کہ روزہ میں تو یہ تین چیزیں ہی ممنوع ہیں لیکن نماز میں ان تین کے علاوہ سلام و کلام، عورتوں کو چھونا، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا اور عام نقل و حرکت سب ہی ممنوع ہے۔ یعنی نماز میں ان سب چیزوں کا بھی روزہ ہوتا ہے، اس لیے نماز میں روزہ اپنی انتہائی مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف کو لو تو وہ بھی نماز میں مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے کیوں کہ اعتکاف صوم میں ضروریات بشریہ کو پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے، کھانے پینے کی تو اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب، امور ممنوع اور مفسدہ صلوٰۃ ہیں۔ حتیٰ کہ بحالت نماز بیرون مسجد تو بجائے خود ہے، خود مسجد میں بھی ٹہلنے اور نقل و حرکت کی بھی اجازت نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ نماز کا اعتکاف روزہ کے اعتکاف سے بھی زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نگلی۔

پھر حج کو لو تو وہ بھی نماز میں موجود ہے، کیوں کہ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔ سو نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط صحت صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ استقبال قبلہ بھی قبلہ کی اعلیٰ تعظیم ہے۔ چنانچہ یہ ہیئت تعظیم ایسے اوقات میں ممنوع کی گئی ہے جو گندے اور خسیں افعال کے اوقات ہیں جیسے کہ استنجاء کرتے وقت استقبال قبلہ ممنوع قرار دے دیا کہ تعظیسی ہیئت افعال تعظیسی کے وقت سر اوڑھ کر نہ کہ افعال خسیہ کے وقت، پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں سمت بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کا دوران شروع کرتے ہوئے تعظیماً رفع یدین کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نبص حدیث طواف کو حکم میں نماز کے فرمایا گیا۔ الا یہ کہ اس میں سلام و کلام جائز ہے نماز میں نہیں اور پھر جس طرح طواف طرح طرح کے اذکار و ادعیہ سے معمور ہے ایسے ہی نماز بھی ہر طرح کے اذکار و ادعیہ سے بھر پور ہے۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تاج عرفات یا بحق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں ذکر الہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جس طرح وہاں حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے اسی طرح نماز میں اولاً ہی اعوذ پڑھ کر اس کے فتنوں سے پناہ مانگی جاتی ہے، اسی طرح نماز میں سلام و اداع کر کے دربار الہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے ہی اجزاء کے ساتھ نماز میں مجسمہ یا مبثغہ موجود ہے اس لیے نماز حج کی عبادت پر بھی مشتمل نگلی۔

اسی طرح زکوٰۃ بھی نماز میں اپنی پوری حقیقت اور پوری صورت کے ساتھ قائم ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی حقیقت تزکیہ نفس ہے یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا جس کا معظم حصہ مال ہے تاکہ محبت حق کے لیے جگہ خالی ہو۔ پس مال نکال کر قلب کو حظوظ دنیا سے پاک کر لیا جاتا ہے۔ نماز کا ما حاصل ہی حب ماسوی اللہ سے آزاد ہو جانا ہے، وہاں ابتداء ہی سے رفع یدین کر کے گویا بندہ ساری دنیا کی نسبت کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے کہ میں سب سے بیزار ہوں اور صرف اللہ کی طرف آتا ہوں اور ظاہر ہے کہ یہی تزکیہ نفس کی روح ہے کہ نفس ماسوا اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل

ذکر کا ہو کر رہے، اس لیے نماز، حقیقت، زکوٰۃ پر حاوی نکلی۔ حقیقت زکوٰۃ کی تو نماز میں واضح ہو گئی۔ لیکن غور کرو تو زکوٰۃ کی صورت بھی نماز کے ساتھ وابستہ ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی صورت اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ نماز کے لیے فی سبیل اللہ مصارف بھی لازم ہیں۔ مثلاً نماز کے لیے وضو شرط ہے اور وضوء کے لیے پانی جمع کرنا بغیر تھوڑے بہت خرچ کے ممکن نہیں اور خصوصاً جن ممالک میں پانی کی قلت ہے جیسے حجاز وہاں پانی کے لیے بہت کثیر رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی نماز کے لیے جگہ لازمی ہے اور زمین کا ٹکڑا بغیر مصارف کے ممکن الوصول نہیں، پھر اس پر مسجد کی تعمیر مصارف چاہتی ہے۔ پھر مسجد کی ضروریات راتبہ یعنی مقررہ حوائج تیل، بتی، فرش، لوٹے، پانی۔ اگر ان مصارف کا اوسط لگایا جائے تو اس کی کچھ نہ کچھ مقدار ہر نمازی پر بقدر حصہ لازم نکلتی ہے بلکہ بعض اوقات زکوٰۃ کے مصارف سے بھی ان کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ پس زکوٰۃ کی حسی صورت یعنی اتفاق فی سبیل اللہ بھی موجود ہے۔ اس لیے زکوٰۃ بھی حساً و معناً اور صورتاً و حقیقتاً نماز کے اندر موجود نکلی۔ اسی طرح جہاد بھی نماز میں جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آنے والی ہیں اسی طرح اس میں ہجرت بھی ہے کیوں کہ ہجرت کی حقیقت موطن طبعیت سے نکل کر موطن فطرت پر آنا ہے، یعنی معاصی کو ترک کر کے طاعات کی طرف اقدام کرنا ہے اور اسکی صورت مکان غفلت سے منتقل ہو کر مکان طاعت کی طرف چلا جانا ہے۔ غور کرو کہ نماز کی صورت میں، ہجرت کی صورت بھی موجود ہے۔ آدمی گھربار چھوڑ کر بیوت الہی میں جا پہنچتا ہے اور حقیقت ہجرت بھی قائم ہے کہ معاصی سے تاواضع و صلوة تو بچاؤ رہتا ہی ہے پھر خود نماز کی خاصیت بھی معاصی سے بچانا ہے۔ اس لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے عَلَیْكُمْ بِالْصَّلٰوةِ فَاِنَّهَا اَفْضَلُ الْجِهَادِ وَالْهَجْرَةِ (نماز کو مضبوط پکڑ لو کہ وہ افضل ترین جہاد اور عمدہ ترین ہجرت ہے۔)

غرض جس طرح سے کہ مسلم انسان جامع ادیان اور جامع حقائق عالم تھا تو اس کے لیے نماز بھی ایسی ہی جامع ہونی چاہیے تھی کہ جس میں تمام ہی انواع عبادات جمع ہوں اور ہر ایک کی نماز کی ہر ممکن سے ممکن صورت اور محتمل سے محتمل حقیقت موجود ہو۔ اگر نباتات اور درختوں کی نماز قیام تھا اور نباتات کے نمونے خود انسان میں موجود تھے تو ان کی نمازوں کا قیام بھی اس کی نماز میں آنا چاہیے تھا، اگر حیوانات کی نمازوں میں رکوع و سجود تھا۔ اور انسان میں خود حیوانات کے ہی سارے نمونے موجود تھے تو اس کی نماز میں رکوع و سجود بھی آنا لازم تھا اور اگر پہاڑوں کی نماز میں قعود، ملائکہ کی نمازوں میں صف بندی، زمین کی نماز میں سکون، سیارات اور اسماء کی نماز میں دوران اور جنت و نار کی نماز میں سوال و دعاء ہے اور ان تمام چیزوں کے نمونے انسان میں موجود ہیں تو ان کی نمازوں کی یہ ساری ہی حقیقتیں اور نمونے اس کی نماز میں بھی موجود ہیں حتیٰ کہ اگر شیاطین کا کام اضلال و گمراہی پھیلانا اور وسوسہ اندازی تھا اور گویا تکوینی طور پر ان کی اطاعت تھی کہ وہ سرکشی کرنے ہی میں پابند تخلیق الہی ہیں اور اس سے سرمو تجاوز نہ کریں تو انسان اس سے بھی خالی نہیں، کیوں کہ انسان میں یہ شیطان نفس امارہ کی صورت میں موجود ہے جو اسے ہر وقت بغاوت و طغیان پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی نماز میں یہ شیطانی کارگزاری بھی موجود ہے یعنی عین

صلوٰۃ میں نفسانی تخیلات، وساوس اور طرح طرح کے ہوا جس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو اس کے خشوع و خضوع میں خلل ڈالتے۔ گویا نفس تخیل آفرینی اور نماز میں خلل اندازی کرنے کی تکنیکی طاعت اور تکنیکی نماز میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی نماز وساوس و خطرات سے پر رہتی ہے اور جو بات کہیں بھی یاد نہ آئے وہ لازمی طور پر نماز میں ضرور یاد آ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں کا مقولہ سننے میں آیا ہے کہ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور یاد نہ آتی ہو تو نماز شروع کر دے وہ خواہ مخواہ بھی یاد آ جائے گی۔

بہر حال جیسا مسلم انسان تکنیک و تشریع کے لحاظ سے جامع تھا ویسے ہی نماز بھی اسے جامع دی گئی۔ اور اس لیے دی گئی کہ ساری کائنات کے ذرہ ذرہ پر اسے فائق بنانا تھا تاکہ خلافت کا شرف سنبھالنے کے قابل ہو اور یہ فوقیت بغیر عبادیت کاملہ کے ناممکن تھی اور عبادیت کاملہ اس کے بغیر ناممکن تھی کہ عبادت کی تمام انواع اس کی نماز میں موجود نہ ہوں۔ نماز اور عالمِ انفس..... پھر یہی نہیں کہ نماز صرف انسان سے باہر باہر کی اشیاء کی نمازی میٹھوں کی جامع ہے بلکہ خود انسانی نفس کے تمام پہلوؤں کی عبادت کو بھی جامع ہے کہ اس کے جو ارح قیام و قومہ اور رکوع و سجود میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی زبان ذکر اللہ کی عبادتوں میں سرگرم ہوتی ہے اس کی انگلی توحید کے اشاروں پر عبادت میں لگی ہوتی ہے۔ اس کے حواس خمسہ تصور کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا قلب اخلاق کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔ اس کی روح معرفت کی عبادت میں لگتی ہے۔ اس کا سر مشاہدہ کی عبادت میں سرگرم ہوتا ہے۔ غرض نفس کا ہر مقام اپنے مناسب حال عبادت کرتا ہے اور یہ ساری عبادتیں اسلامی نماز کے اجزاء ہیں۔ اس لیے نماز جیسے آفاقی نمازوں کے نمونوں پر مشتمل تھی۔ ایسے ہی انفسی نمازوں کے بھی سارے ہی نمونوں پر مشتمل نکلتی ہے کہ نماز صرف بدن اور قالب ہی کو شائستہ بناتی ہے بلکہ قلب اور اخلاق قلب کو بھی مہذب اور مزی کرتی ہے جس کے یہ سب ثمرات ہیں۔ کیوں کہ اگر اخلاق پاک نہ ہوں تو کوئی باطنی اور ظاہری حرکت شائستہ اور مہذب نہیں ہو سکتی۔ نماز اور تہذیب اخلاق..... پس اصلاح نفس کے لیے نماز ایک فائق ترین مجاہدہ بھی ہے جس سے اخلاق نفس درست ہو جاتے ہیں اور بد خلقی کا فور ہو جاتی ہے جس کا راز یہ ہے کہ نفس کی بد خلقی کی بنیاد انانیت اور کبر نفس پر ہے جس سے غدر نفس پیدا ہوتا ہے اور کتنی ہی بد خلقیوں اور بد اعمالیوں کی اساس قائم ہوتی بالخصوص ذات الین کے فساد کی بنیاد ہی اس خلق پر ہے کیوں کہ کبر یا تعظیم نفس سے اول تو تفاخر کی عادت پڑتی ہے اور جب آدمی اپنے کو سب سے بڑا اور سب سے فائق سمجھتا ہے تو بجز اس کے پیٹنگیں بڑھاتا اور ڈینگیں بگھارتا رہے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس فخر و ریا کا قدرتی اثر تحقیر غیر اور دوسروں کی تنقیص ہے جس سے ان اغیار کا برا بیچھٹنا ہونا، جھنجھلانا اور ان کے دلوں میں غبار کا بھر جانا ایک قدرتی امر ہے اس کا اثر نفرت اور منافرت باہمی ہے اور منافرت کا طبعی اثر نزاع باہمی اور جدال و قتال ہے۔ یہ جدال و نزاع اول زبان سے ہوتا ہے تو بد گوئی اور سب و شتم کا دروازہ کھلتا ہے جس سے زبان قابو میں نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے حق میں غائبانہ بدگوئیوں کا سلسلہ قائم ہوتا ہے جس سے ایک

دوسرے کی غیبت، چغلی اور دوسرے مختلف معاصی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قوی سلسلہ میں ان معاصی سے بڑھ کر کوئی بھی معصیت اخلاق کو گندہ کرنے والی اور انسانی آبرو کو گرانے والی نہیں۔ پھر نزاع آگے بڑھتا ہے تو ہاتھ پائی کی نوبت آتی ہے اور زرد کوکب شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظاہری اعضاء کا یہ انتہائی فساد ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بنی آدم کو کسی وقت بھی امن نہیں مل سکتا۔ اس سے آگے بڑھا تو جارحہ واسلحہ اور آلات حرب و ضرب کی نوبت آتی ہے جس سے قتل و غارت نمایاں ہو کر خونریزی سرزد ہوتی ہے جو ذرات البین کے لیے انتہائی مفسدہ اور دنیا کے امن کے لیے انتہائی خطرہ ہے۔

غرض اس سلسلہ میں کبر نفس کا آخری نتیجہ خونریزی نکلتا ہے جو فسادات البین کی آخری سے آخری حد ہے۔ اور پھر یہی خلق اگر کسی قوم میں اجتماعی طور پر سرایت کر جائے یعنی قوم کی قوم متکبر اور دوسری اقوام کی تحقیر کنندہ ہو جائے، تو پھر یہ جدال و قتال بھی ہوگا جس سے پورا ملک یا پوری دنیا ہی جہنم زار بن جائے گی۔

پھر اگر اس متکبر کے سامنے کوئی اور مغرور جو اس کے اثرات میں دب نہ سکے بلکہ خدا اس کی بھی وہی حیثیت مستقل ہو تو اس سے متکبر میں حسد کی بنیاد پڑتی ہے اور اس صورت میں جبکہ یہ متکبر غیر کو نہیں جلا سکتا تو خود بیٹھ کر آتش حسد میں جلتا ہے اور گھٹتا ہے کہ کسی طرح اپنے محسود کو نیچا دکھائے۔ لوگوں کو اس کے خلاف اکسا اور بھڑکا کر چاہتا ہے کہ اس کے بارہ میں سب کو مبتلا کر دے تاکہ اس کے غیظ کو کسی طرح شفا حاصل ہو سکے۔

پس حسد سے بدخواہی خلق ابھرتی ہے اور اس سلسلہ میں حاسد میں طرح طرح کی چالاکیاں، عیاریاں اور مکاریاں کرتے رہنے سے مکر و فریب کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ غیظ میں بے صبری اور از خود درگی نمایاں ہوتی ہے اور وہ سب کچھ ظاہر ہوتا ہے جو شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں حسد سے کیا۔

غرض کبر نفس سے بدگوئی، مفاخرت، ریاکاری، بدخلقی، سب و شتم، غیبت، چغلی، ہذیان اللسانی، حسد کاری، مکاری، فریب بازی، ایزادہی، آبروریزی اور انجام کار خونریزی غرض جب حسد، بغض، مکاری، جھلسازی، بے صبری اور از خود درگی کے اخلاق و اعمال ظہور پذیر ہوں، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ انسانی اخلاق ہیں یا ان اخلاق سے دنیا میں امن چین کا منہ دیکھ سکتی ہے؟ بلکہ یہ وہ شیطانی خلق ہے جس کے ماتحت اس نے ازل میں ”انسا خبیرو منہ“ کہا تھا اور اسی انانیت کی بنا پر مرد و دوا بدی ٹھہرا۔

پس انسان کو بھی بارگاہ حق سے کلیدِ مَرَد و ٹھہرانے میں یہی انانیت مؤثر ہوتی ہے اور اس لیے ہوتی ہے، کہ اس سے یہ مختلف الانواع معاصی پیدا ہوتے ہیں جس سے دنیا کے بدامنی کا گہوارہ بن جانے سے لوگوں کی عافیت تنگ ہو جاتی ہے اور ادھر انسانی قلوب سیاہ اور ظلماتی بن جاتے ہیں۔

پھر اسی تحقیر غیر کا دوسرا اثر یہ ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسرے کو اپنے سے کم رتبہ سمجھ کر اس پر اپنا ہر قسم کا حق سمجھنے لگتا ہے اور ان حقارت زدہ انسانوں کا کوئی بھی حق اپنے اوپر نہیں جانتا اس کا اثر یہ ہے کہ دوسروں کے حق کو

پامال کرنا۔ ان پر ہر طرح کا ظلم و ستم روا رکھنا۔ اور لوٹڈی غلاموں سے بدتر حالت میں انہیں دیکھتے رہنا اور ان کی املاک کو اپنی ملک تصور کر کے ان میں ہر قسم کا تصرف کرنا۔ مال چھین لینا۔ عورتوں پر ہاتھ ڈالنا، بچوں کی خدمات کے لیے قبضہ لینا وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت میں جاہ کے ساتھ ساتھ باہ کے جذبات بھی بھڑکتے ہیں جن کی اساس حرص ہے اور حریصانہ خصلتوں کے آثار اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ ہر ایک چیز پر آدمی کی نگاہ ہو اور جس طریق پر بھی ممکن ہو اس سے چھین لینے کے دوائی دل میں ابھرے ہوئے ہوں۔ اس سے غصب، نہب، ڈکیتی، سرقت، رشوت، شہوت، پھر بخل، طمع، جمع اموال وغیرہ کے جذبات دل میں راسخ ہوتے ہیں۔ یہ خلق بلاشبہ انسانی نفس کا ذاتی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام بھی نسیا ناہ بتلا ہوئے۔ لیکن کرامت انسان کے بہر حال خلاف ہے جس کا اعلان وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ میں کیا گیا ہے بلکہ ایک فتنا افزاء خلق ہے جس سے عالم میں فساد پھیلتا ہے۔

غرض کبر نفس کا آخری اثر ایک طرف تو انجام کار خوریزی اور دوسری طرف آخر کار فساد ہے اور یہی وہ دو (۲) اصولی مفاسد ہیں جن سے فرشتوں نے نوع بشر کو خلافت دیئے جانے سے خوف کھایا تھا اور بکمال ادب بارگاہ حق میں عرض کیا تھا کہ اَنَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ①

جس سے واضح ہے کہ فساد فی الارض (بدامنی) اور سفک دماء (خوریزی) تمام مفاسد کی جڑ ہے۔ خوریزی، جاہ پسندی یعنی کبر نفس سے سرزد ہوتی ہے یہ ایک انتہا درجہ کافرش ہے جو باہ کو بھڑکاتا ہے اور ایک انتہا درجہ کانکر ہے جو جاہ کو ہیجان میں لاتا ہے۔

اور انہی دو بنیادوں سے جاہ و باہ کے ہمہ قسم معاصی پھیلتے ہیں جن کی جڑ بنیاد کبر نفس اور انانیت نکلتی ہے، یہ سلسلہ سمجھ لینے کے بعد اب نماز کو دیکھئے تو اس کا ہر ہر رکن اور ہر فعل اس کبر نفس کے لیے تبرا و تیشہ ہے۔ کیوں کہ اس کی ہر ہر اداسے آدمی نہ صرف ذلت نفس کا اظہار ہی کرتا ہے بلکہ دل سے باور کرنے کی عادت ڈالتا ہے کہ حق کے سامنے میری کوئی ادنیٰ عزت اور کوئی معمولی سی بھی حرمت نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی۔ ترفع و کبر تو بجائے خود ہے میں تو انتہائی پستی اور آخری ذلت کے لیے ہوں کہ ناک اور پیشانی تک بھی خاک پر گر کر رہا ہوں۔

پس جب کہ نماز کبر نفس کو اس طرح مٹا دیتی ہے جیسے آفتاب شبنم کو اور نور ظلمت کو تو ظاہر ہے کہ کبر کے یہ آثار خبیثہ یعنی جاہی اور باہی معاصی بھی کیسے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں جو دنیا میں فساد اور خوریزی کے کفیل اور فحش و منکر کے ضمانتدار تھے، اسی لیے قرآن نے نماز کی خاصیت فحش و منکر ہی کا ختم ہو جانا بتلایا ہے ارشاد حق ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ② اس سے واضح ہے کہ اگر دنیا نمازی بن جائے تو فحش، و منکر، جاہ و باہ کی بد مستیاں تولی اور فعلی معاصی قلبی اور اخلاقی کھوٹ کو دنیا میں پناہ نہیں مل سکتی اور بدامنی و بے چینی عالم میں محض بے کس ہو کر رہ سکتی ہے۔

قرن اول میں نماز کی اہمیت حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور کو خیر القرون، ان کی زندگیوں کو خیر الحیات اور ان کی ذوات کو خیر اہل الارض اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس میں ان دونوں انواع کے معاصی کا پتہ نہ تھا، جاہ اور باہ دونوں خیر سے مغلوب اور دین کے ماتحت تھیں۔ اس لیے جو امن اس دور میں تھا وہ عالم کو پھر نصیب نہیں ہوا۔ اس کا راز یہی ہے کہ ان کی عام ترقی نماز کے ذریعہ تھی اور زندگی کا مقصد اعلیٰ اور اصلی نماز ہی تھا، نماز ہی معیار عبادت تھی اور نماز ہی معیار خلافت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے لیے جس میں عبادت و خلافت کے دونوں منصب شامل ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب یہ کہہ کر فرمایا کہ وہ خیر الامت بعد الانبیاء ہیں تو انہیں اپنے سامنے امام صلوة ہی بنایا تھا جو بالآخر ان کے خلیفہ ہونے کی دلیل ثابت ہوئی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت ہی یہ کہہ کر کی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارا امام صلوة بنا کر ہمارا دین ان کے سپرد کر دیا اور اس پر ہم راضی ہو گئے تو ہمیں پھر دنیا انہیں سوچ دینے میں کون مانع ہو سکتا ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تمام دین کی بقاء نماز کی بقاء میں اور تمام دین کی اضافت نماز کی اضافت میں سمجھی اور خلافتی حکم کے ساتھ اس کا اعلان فرمایا اِنَّ اَهَمَّ اُمُورِكُمْ عِنْدِي الصَّلٰوةُ فَمَنْ ضَيَعَهَا فَهُوَ لِسَاوِاَهَا اَضْيَعُ ① نیز تمام صحابہ لگی دینی ترقی اسی نماز کے مجاہدہ سے ہوئی ہے۔ چنانچہ اوائل عہد اسلام میں تمام راتوں کے بڑے حصہ میں صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام فرماتے یہاں تک بیروں پر ورم آجاتا۔ اور پیر پھٹ کر خون بہہ نکلتا۔ جس کا قرآن نے یوں اعتراف کیا ہے: اِنَّ رَتِّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُومُ اَذْنٰى مِنْ ثُلَاثِي الْاَيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلَاثَةً وَطَايِفَةً مِنَ الدِّيْنِ مَعَكَ وَاللّٰهُ يَقْدِرُ الْاَيْلَ وَالنَّهَارَ ②

بہر حال صحابہ رضی اللہ عنہم کی دینی و انتظامی ترقی کی ضمانت نماز ہی نکلتی ہے اور نماز ہی ان جانی و باہی مفاسد اور انواع معاصی کے لیے ضرب کاری ثابت ہوتی ہے: اس لیے نتیجہ کہا جاسکتا ہے کہ جو قوم نماز گزار نہیں وہ کتنی ہی ترقی کر جائے یا تو وہ خالص دنیا کی ترقی ہوگی جس میں سرے ہی سے اخلاقیات نہ ہوگی اور اگر روحانیت یا مذہبیت لیے ہوئے ہوگی تو فحش و منکر سے پاک نہ ہوگی جس کا انجام پھر وہی جاہ و باہ، فساد و خوریزی اور فحش و منکر ہوگا۔ نماز سے تہذیب نفس کی کیفیت رہا یہ سوال کہ یہ کبر نفس آخر نماز پڑھنے سے زائل کس طرح ہو جاتا ہے؟ سو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا راز یہ ہے کہ کبر نفس جہی تک باقی رہ سکتا ہے جب اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو۔ اگر کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر و غرور پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔

چنانچہ بڑے سے بڑا نواب بادشاہ کے آگے جھک جاتا ہے وہاں اپنے نفس کی بڑائی باقی نہیں رہتی۔ کیوں کہ مسئلہ بڑا سامنے ہے۔ ایک بڑے سے بڑا فاضل و عالم اپنے استاد کے آگے جھک جاتا ہے کہ اپنے سے بڑا سامنے

① مؤطا مالک، باب وقوت الصلاة ج: ۱ ص: ۷۰. السنن الكبرى للبيهقي، باب كراهية تاخير العصر ج: ۱

ص: ۲۳۵. ② پارہ: ۲۹، سورة: المزمل، الآية: ۲۰.

ہے۔ یہاں اس کے دل میں اب اپنے علم و فضل کا خطرہ بھی نہیں گذر سکتا۔ ایک چہرہ اسی تھانہ دار کے سامنے تھانیدار انسپکٹر پولیس کے سامنے، کلکٹر کمشنر کے سامنے اور کمشنر گورنر کے سامنے، وائسرائے کنگ کے سامنے جھک جاتا ہے کہ اب وہ سامنے ہے جس کی عظمت سے دل لرز ہے۔ غور کیجئے کہ جب انسان، انسان کے آگے دوسرے کی عظمت سے جھک کر اپنے کبر و خودی کو پامال کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ عظیم انسان اسی صغیر انسان جیسا ہے، نہ اس کی ذات میں کوئی مادر نہ خوبی ہے نہ اس کی ذات میں، تو پھر اگر وہ ذات پیش نظر ہو جائے جو خوبیوں کی مالک، کمالات کا سرچشمہ، بھلائیوں کا خزن، اور تمام ہی اخلاق حسنہ اور صفات مستحسنہ کا منبع ہے۔ بلکہ جہاں بھی خوبی کا کوئی کرشمہ ہے وہ اسی کا ہے جسے بھی کوئی خوبی ملی ہے اسی کی دہلیز کا فیض اور اسی کے یہاں کی در یوزہ گری کا اثر ہے تو سوچئے کہ اس کے سامنے کبر نفس کا کوئی نشان باقی رہ سکے گا؟ یہ نہیں کہ کبر مغلوب ہی ہو جائے گا بلکہ جڑ سے نکل جائے گا اور بے نقیسی اور بے لوثی سامنے آکھڑی ہوگی۔

اب آپ غور کر لیں کہ نماز میں جس چیز کو سامنے رکھا جاتا ہے وہ بجز عظمت حق کے اور کیا چیز ہے؟ نماز کے ہر ہر کلمہ سے اسی کی عظمت، اسی کا علو مراتب، اسی کی ثناء و صفت، اسی کی تقدیس و تجید، اسی کی شان کبریائی و رفعت اور اسی کی ہمہ قسم بزرگیوں کا اظہار، ہر ہر ادا سے اعلان اور قلب کی گہرائیوں سے اقرار و اعتراف کیا جاتا ہے۔ پس جس قلب کے رگ و ریشہ میں حق کی یہ عظمت راسخ ہوگی اس قلب میں اس نفس ناپاک جاہل ازلی اور بے کمال حقیقی کی وقعت کیا باقی رہ سکتی ہے، کہ کبر و غرور پاس بھی پھٹک سکے اور جب نفس نہ رہا تو وہ تمام فتنے بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اس کبر سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کی تفصیل ابھی عرض کی گئی ہے۔ اس کو محققین کی اصطلاح میں تحلیلہ کہتے ہیں یعنی نفس کا رذائل سے پاک ہو جانا۔

اور ظاہر ہے کہ جب نفس خالی ہو کر اور اس کے پیرایہ میں طالب حق ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے ہے تو ظاہر ہے کہ اب جو کچھ اثرات بھی نفس میں راسخ ہونگے وہ حق ہی کے ہو سکتے ہیں کیوں کہ نفس کے اثرات تو رذائل ہو چکے اور نفس کے بعد درجہ حق ہی کا ہے۔ جیسا کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! میں آپ تک کیسے پہنچوں؟ فرمایا گیا۔ ذُغْ نَفْسًا فَتَعَالَ (خواہشات نفس اور ہوائے نفس کو چھوڑ دو اور آ جاؤ) گویا نفس گذاری اور وصول بحق میں صرف ایک ہی قدم کا درمیانی فاصلہ ہے کہ نفس کو چھوڑ دو اور واصل ہو جاؤ۔ ع:

تو خود حجاب خودی حافظ از میاں بر خیز

اور جب کہ آثار نفس یہ رذائل تھے تو ظاہر ہے کہ آثار حق فضائل ہوں گے۔ رذائل کا سرچشمہ کبر و غرور نفس تھا تو فضائل کا سرچشمہ تواضع للحق ہوگی۔ جو کبر کی ضد ہے اور جیسے آثار کبر وہ بداخلاقیاں تھیں جن کی تفصیل ابھی ذکر کی گئی تو تواضع کے آثار ان رذائل کی ضد ہوں گی یعنی اس تواضع سے جو نماز کے ذریعہ حاصل ہوگی، حرص نہیں بلکہ قناعت ہوگی، ہوسنا کی نہیں جس سے فساد پھیلتا ہے۔ بلکہ سیر چشمی نمایاں ہوگی جس سے صلاح تمام اور رفہ عام پیدا ہوتا ہے

پھر تو واضح کا اثر خوریزی نہیں بلکہ عصمت دم اور حفظ اموال ہے۔ خود غرضی نہیں بلکہ خیر خواہی خلق اللہ ہے بذربانی نہیں بلکہ حق گوئی ہے، نزاع وجدال نہیں بلکہ محبت باہمی ہے۔ لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ ایثار ہے۔ حق تلفی نہیں بلکہ ادائے حقوق ہے، فسادات نہیں بلکہ صلاح ذات الین ہے۔ آبروریزی نہیں بلکہ تحفظ عرض و آبرو ہے مکر و فریب نہیں، بلکہ دانش و حق پسندی ہے۔ بغض و عناد نہیں بلکہ محبت و مودت ہے۔ حسد نہیں بلکہ ہی خواہی اور طلب ترقی غیر ہے۔ غرض وہ تمام مفاسد جو آثار نفس میں سے تھے، مٹ کر وہ تمام مصالح انسانی نفس میں داخل ہو جاتے ہیں جو آثار حق میں سے ہیں۔ اور انسان مظہر کمالات الہی اور مرکز اخلاق ربانی بن جاتا ہے جس سے دنیا امن و چین کا سانس لینے لگتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نماز کے سلسلہ میں دو چیزیں سامنے ہوتی ہیں، ایک نفس، ایک رب۔ نماز جب نفس کی تحقیر و تذلیل کرتی رہتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی جب عظمت مطلقہ سامنے کر دیتی ہے تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں اور رب کریم اپنے فضائل سے نوازتا ہے تو آثار حق زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یوں سمجھئے کہ نماز کا ایک جز تحقیر نفس تو رذائل نفس کو مٹاتا ہے جسے تجلیہ کہتے ہیں اور ایک جز تعظیم حق فضائل کو پیدا کرتا ہے۔ جسے تجلیہ کہتے ہیں پس تجلیہ اور تجلیہ دونوں مقاموں کے لیے نماز ہی کفیل و ضامن لگی اور سب جانتے ہیں کہ فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے اور تہذیب نفس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہو جائیں۔

اس لیے واضح ہو گیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لیے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ جس سے ایک طرف معرفت نفس اور دوسری طرف معرفت رب حاصل ہو کر اخلاق ظلماتی مفلوج ہو جاتے ہیں اور اخلاق نورانی پیدا ہو جاتے ہیں..... (جس نے اپنے نفس کے عیوب و نقائص کو پہچان لیا اس نے اپنے رب اور اس کے کمالات و محامد کو پہچان لیا)

نماز اور نفس کے مقامات و احوال..... نماز کے اس تزکیہ نفس کے بعد قدرتی طور پر خود بخود نفسانی احوال و مقامات پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ ہو جاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے۔ لیکن بلا واسطہ بھی نماز میں یہ تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہو جاتے ہیں اور آدمی بلند پایہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے، صبر کو لو تو نماز میں ہر ایک لذت سے آدمی صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزہ سے زیادہ مکمل ہے۔ اخلاص کو لو تو نماز کا موضوع ہی ”إِيَّاکَ نَعْبُدُ وَإِيَّاکَ نَسْتَعِينُ“ جس کی حقیقت ماسوا اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے، تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس تک سامنے ہو وہاں تواضع تو پھر اوپر کی بات ہے۔ رضا بالقضاء کو لو تو جہاں عبدیت محضہ اور خالص عبادت عمل میں آرہی ہو وہاں رضا و توکل تو ادنیٰ درجہ ہے۔ سخاوت کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا ہے اور اس سے صبر کر لیتا ہے۔ شجاعت کو لو تو اس میں

سخت ترین مقابلہ خود اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔ صدق و عفاف کو لو تو ریا کاری، نفاق اور فریب و کذب سے تکبیر تحریمہ ہی کے وقت کانوں پر ہاتھ دھر لیے جاتے ہیں اور سچائی کے ساتھ اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضری ہوتی ہے۔

شوق و ذوق اور انس کو لو تو جہاں سرچشمہ کمالات و عنایات سامنے ہوا اور اسی کی طرف عاشقانہ دوڑ ہو رہی ہو، تو وہاں لذت و شوق اور انس و ذوق کی کیا کمی ہو سکتی ہے؟

غرض اوّل تو یہ تمام مقامات صالحہ انانیت کے ازالہ ہی سے نفس میں فی الجملہ پیدا ہو جاتے ہیں کہ نماز خلق تواضع کو مکمل کر دیتی ہے اور یہ تمام محاسن اخلاق تواضع ہی کے سرچشمہ سے نکلتے ہیں، لیکن نماز بالجائزہ بھی اپنے افعال سے ان مقامات کو انسان میں پیدا کرتی ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں نماز نے جو خاص جوہر پیدا کیا تھا وہ یہی تھا کہ وہ وقار مجسم بننے کے ساتھ ہی تواضع مجسم اور بے تکلف اخلاق کے بھی مالک بن گئے تھے۔ بڑے سے بڑے کروفر کا وجود انہیں تواضع و سادگی سے بیگانہ نہیں بناتا تھا اور وہ نفس انسانی کی اصلیت کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار تھے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رکاب تھام کر ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیا۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ گھبرا کر بولے کہ اے عم رسول اللہ! یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے علماء کی اسی طرح عظمت کرو۔ اس کے بعد زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے گھوڑے سے اتر کر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیروں پر لے کر ابن عباس رضی اللہ عنہ گھبرا گئے وہ کیوں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور گھبرا کر بولے کہ اے حضرت! یہ کیا غضب کیا؟

فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی طرح تکریم کرو۔ پس وقار کے ساتھ تواضع اور منصب ارشاد و تربیت کے ساتھ یہ ذاتی عبدیت اور اخلاق ستودہ اس نماز ہی نے ان حضرات کو سکھائے تھے۔

بہر حال واضح ہوا کہ نماز جیسے تمام کائنات کی عبادت کو جامع ہے اور جیسے تمام اجزائے انسانی کی عبادت کو جامع ہے۔ ایسے ہی کائنات انسانی کے تمام اوصاف حمیدہ اور اخلاق ستودہ کی عبادت کو بھی جامع ہے جس سے انسانی نفس میں جامعیت بھی پیدا ہوتی ہے اور جمعیت بھی یعنی نفس انسانی خود اپنے اوپر حاوی ہو جاتا ہے اور اپنے غیر پر بھی۔ اس کی عبادت بھی مکمل ہو جاتی ہے اور خود اس کی شان عبدیت بھی کامل بن جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان پر اس وجہ سے کہ وہ تکوینی حقائق کا جامع ہے اور مخلوقاتی نمونوں کا مجموعہ تھا یعنی اس کی شان مخلوقیت مکمل تھی، نماز جیسی جامع عبادت اس پر عائد کی گئی جس میں عبادت کے سارے نمونے جمع ہیں، خواہ وہ نفسی ہوں یا آفانی،

اس لیے ثابت ہو گیا کہ حقیقی طور پر اس کے مخلوقاتی فریضہ کی ادائیگی نماز کے بغیر ممکن نہیں۔

نماز اور اجتماعیات..... لیکن اب ادھر آؤ کہ جب اس میں خالق کے صفات و کمالات کے نمونے بھی سب کے سب رکھے گئے ہیں۔ گویا مادیت کی طرح اس کی استعداد روحانیت بھی مکمل ہے، جس میں خدائی کمالات کے جلوے سمائے ہوئے ہیں، تو ان ربانی نمونوں کی وجہ سے اس پر ویسا ہی فریضہ عائد ہوتا تھا جیسا کہ اس کے خالق کا عمل اپنی مخلوق کے ساتھ ہے اور وہ تربیت خلاق ہے، اگر انسان بنی نوع کی ہمدردی اسی نمونے پر کرنے لگے تو اسی کا نام خلافت ہے، اس لیے بالفاظ دیگر انسان پر عبادت کے ساتھ دوسرا فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے، جبکہ وہ کمالات الہیہ کے نمونوں کا جامع بھی بنایا گیا ہے۔ غور کرو تو اس فریضہ کی ادائیگی بھی نماز ہی سکھلاتی ہے کیوں کہ نماز ہی کے ذریعہ خدا نے بھی اپنے خدائی کاموں کو چھیڑا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ خالق کا کام اپنی مخلوق کی نگہداشت فرمانا اپنی تمام صفات کمال کے ساتھ ان کی تربیت فرمانا انہیں مادی اور روحانی رزق دے کر ہر ایک کے مناسب حال اس کی تکمیل فرمانا اور اپنے فطری اصول پر حق داروں کو حقوق پہنچانا اور شریروں اور ناحق کو شوں کو سزا دینا۔ اور مختصر یہ کہ تمام جہانوں پر قوت و ممانعت کے ساتھ اپنے عدل کا نظام قائم رکھنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سب کا منشاء رحمت خداوندی اور فضل ربانی ہے کہ یہ سب کچھ خدا پر واجب اور لازم نہیں ہے۔ محض اپنے فضل و کرم سے اس نے مخلوق کے منافع کی خاطر یہ کام کیا جس کو رحمت کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے حتیٰ کہ شریروں کی سزا دہی بھی گویا بظاہر غضب اور قہر نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً اس غضب کا منشاء بھی..... رحمت ہی ہے کہ اس سے بھی مخلوق ہی کی بھلائی مقصود ہے۔ خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا وہاں کوئی سوال نہیں کہ وہ ذات پاک ہر نفع و ضرر سے بری و بالاتر ہے۔

بہر حال اس سے واضح ہے کہ جہانوں کی تربیت کا نظام صفت رحمت کے بازوؤں پر قائم ہے اور غلبہ رحمت ہی ان نظاموں کو برقرار رکھے ہوئے ہے، ورنہ خالص غضب و قہر عالم کی تیغ و بنیاد ہی باقی نہیں چھوڑ سکتا۔ چہ جائیکہ اس کی ترقی ہوتی۔ اب سمجھو کہ اسی رحمت عامہ کو جس سے جہانوں کی تربیت متعلق تھی، خدا نے اپنی نماز فرمایا ہے اور گویا اس ربوبیت کو صلوة سے تعبیر فرماتے ہوئے خود اپنے ذمہ بھی نماز لازم فرمائی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ①
”وہ ذات وہ ہے جو تم پر صلوة (رحمت) بھیجتی ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تمہیں (ظلم و جہل کی) تاریکیوں سے (علم و عدل کی) روشنی میں لے آئے کیوں کہ وہ ایمان والوں پر بہت مہربان ہے۔“

یہ الگ بات ہے کہ یہاں صلوة کی حقیقت عجز و نیاز مندی نہیں کہ وہ ذات بابرکات ہر عجز و نیاز اور ہر ایک احتیاج سے بری و بالا ہے بلکہ وہی رحمت بھیجنے اور تربیت کرنے والے ہیں چنانچہ آگے و کمال بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا سے اسی کی طرف صاف اشارہ موجود ہے مگر بہر حال اس کو تعبیر صلوة ہی کے عنوان سے فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہو گیا

کہ اگر بندے نماز ادا کرتے ہیں تو حق تعالیٰ بھی فعل صلوٰۃ کی ادائیگی فرماتے ہیں گو حقیقت صلوٰۃ دونوں جگہ جدا جدا ہے۔ بندوں میں صلوٰۃ کی حقیقت تدلل و مسکت ہے اور خالق میں اس کی حقیقت ترحم و شفقت یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تمام صفات کمال میں ہر ایک صفت ایک ہی اسم سے بندہ پر بھی بولی گئی ہے اور اسی اسم سے خدا پر بھی مگر حقیقتیں اور کیفیتیں دونوں جگہ الگ الگ ہیں۔ مثلاً سمیع و بصیر و علیم و خیر و رحیم و منعم وغیرہ بندوں کو بھی کہتے ہیں اور خدا کو بھی۔ ہاتھ پاؤں کو کھ پنڈلی چہرہ اور آنکھ وغیرہ بندہ کے لیے بھی ثابت ہے اور خدا کے لیے بھی۔ عوارض میں عروج و زول، ہنسنا، بولنا، خوشی اور خفگی بندہ کے لیے بھی ہے اور خدا کے لیے بھی شریعت نے مانی ہے، مگر باوجود اس کی اشتراک کے حقیقتوں اور کیفیتوں میں اتنا ہی بعد بعید ہے، جتنا بندہ اور خدا میں ہے۔ چنانچہ یہ سب احوال و اوصاف بندوں میں انفعال ہیں اور خدا میں فعل۔ وہاں تاثرات ہیں اور یہاں تاثیرات۔ ٹھیک اسی طرح صلوٰۃ کا فعل شریعت نے بندہ کے لیے ثابت کیا ہے اور خدا کے لیے بھی، مگر بندہ میں بمعنی عبادت ہے اور خدا میں بمعنی عنایت و رحمت۔

لیکن بہر حال صلوٰۃ کا عنوان دونوں جگہ یکساں قائم ہے۔ جس سے صلوٰۃ کی یہ ہمہ گیری واضح ہونے کے علاوہ کہ وہ تمام مخلوق سے گذر کر عالم قدس کے بھی چپہ چپہ پر چھائی ہوئی ہے، یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ نماز میں عبدیت کے پہلو کے ساتھ ایک پہلو رحمت و شفقت اور بعنوان دیگر خلافت کا بھی لگتا ہے جس کی صورت بندہ میں یہ ہے کہ اگر وہ منفرداً نماز پڑھے تو اس کی نماز کا جو رخ خدا کی طرف ہے وہ بلاشبہ عبودیت ہے اور جو رخ خود اپنے نفس کی طرف ہے وہ بلا ریب شفقت و رحمت ہے کہ خود اپنے کو پاک بنایا جا رہا ہے اپنے کو بلند مقامات پر پہنچایا جا رہا ہے۔ اور اپنے نفس کے لیے دارین کی صلاح و فلاح حاصل کی جا رہی ہے تاکہ نفس امارہ ان افعال صلوٰۃ سے تربیت پا کر اپنی حد کمال کو پہنچ جائے اسی کو ہم خلافت انفرادی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اگر نماز باجماعت ہے تو امام نماز جو تمام مقتدیوں کا خا من ہے اور اس دربار الہی میں ان کا وکیل ہے۔ اس کی نماز کا وہ رخ جو خدا کی طرف ہے عبودیت کا ہے یعنی وہ اپنی نیاز مندی اصالاً اور اپنے مقتدیوں کی وکالتاً اللہ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اسی امام کی نماز کا وہ رخ جو بندوں کی طرف ہے وہ خلافت و نیابت کا حق ہے کہ اسے جو کچھ رحمتیں ادھر سے دستیاب ہو رہی ہیں وہ خدا سے لے کر پہلے۔ اپنے نفس کو اور پھر مقتدیوں کو پہنچا رہا ہے۔ تاکہ وہ خود بھی اور اس کے مقتدی بھی اس اجتماعی تربیت سے اپنی حد کمال کو پہنچ جائیں اور مقصد حیات بالآخر حاصل ہو جائے پس یہ صلوٰۃ جماعت اپنے بالائی رخ کے لحاظ سے اجتماعی عبادت ہوئی اور اپنے تحتانی رخ کے لحاظ سے اجتماعی شفقت ہوئی جو اپنے بنی نوع پر متوجہ ہوئی، جیسا کہ خود اللہ اپنے بندوں پر بلا واسطہ رحمت و شفقت فرماتا تھا۔

پس امام جماعت کی بحیثیت نائب حق یہ رحمت و شفقت ہی خلافت اجتماع کہلاتی ہے۔ اسی لیے خلافت الہی کا مکمل نمونہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی نماز کی بدولت عالم انفس میں نمایاں ہوا، جس کی حقیقت تربیت و ربوبیت عامہ و خاصہ نکلے جسے رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی شان رحمت و ربوبیت جس کو قرآن نے صلوة الہی سے تعبیر کیا ہے عالم کے نظام کو چلا رہی ہے اور سارا جہان فطرت کے اصولوں کی پیروی کرتا ہوا ان کے اقتداء میں دوڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ تاکہ اس تکوینی تنظیم و تربیت کے ماتحت کائنات کا ہر ہر مقتدی ذرہ ذرہ اپنی حد کمال کو مقررہ وقت پر پہنچ جائے گویا حق تعالیٰ اس صلوة و تربیت میں اپنی ساری کائنات کے لیے امام الکل ہیں اور بذات خود امام اور قبلہ تو جہات ہیں۔ اور یہ سارا اسباب و مسببات کا جزا ہوا سلسلہ صف بندی کئے ہوئے ان کا مقتدی ہے جو ان کے تکوینی اشاروں کی اقتداء کرتے ہوئے اپنی ترقی و تکمیل کی خاطر ان کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

ٹھیک اسی طرح نماز باجماعت میں امام نماز نائب حق کی حیثیت سے اپنے سے پہلے پچھلی صفوں کے لیے امام الکل ہے، اور اس کے سارے مقتدی اس کے اشاروں پر راہ خدا میں دوڑ رہے ہیں۔ تاکہ اپنا اپنا مقررہ روحانی حصہ پا کر اپنے نفس کو اس مقام معلوم پر پہنچا دیں جو ان کے لیے اس سعی پر مقرر کیا گیا ہے۔ پس یہ امام اس جہت میں اسی رحمت و ربوبیت الہی کا مظہر اتم ہوتا ہے جس سے نظام عالم کی تربیت کی جارہی ہے، اسی لیے نماز میں عبادت کے پہلو کے ساتھ خلافت کا پہلو بھی کھل جاتا ہے خواہ وہ خلافت انفرادہ ہو جیسے منفرد کی نماز یا خلافت اجتماع ہو جیسے جماعت کی نماز۔

نماز اور اجتماعی معاشرہ نماز کی اس شیرازہ بندی اور پانچ وقت جماعتی مظاہرہ سے قدرتا جو آثار نمازیوں پر پڑتے ہیں وہ معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے سے میل ملاپ، ہمدردی اور باہمی تعاون و تناصر کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ یعنی لوگ قدرتی طور پر اجتماعی حیات کی طرف آنے لگتے ہیں کیوں کہ جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے انفراد اور خلوت کو چاہتی ہے، اسلام نے یہ اجتماع اور جلوت پیدا کی ہے کہ جس سے نماز عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ خلافت کا بھی حق ادا کرنے لگے تو معاشرہ و مدنیت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے جلوت و اجتماع چاہتی ہے ایک نمازی انسان کیسے انفراد پسند بن سکتا ہے۔ اس لیے اسلامی نماز کا خاصہ لازمی ہی یہ ہے کہ وہ مسجد کے فرش پر اجتماعیت کا سبق پڑھا کر خدا کی پوری زمین پر جوامت کے لیے مسجد عامہ بنادی گئی ہے، اجتماعیت عامہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور نماز کی اس خلافت صغریٰ ہی سے خلافت کبریٰ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک پختہ نمازی جو نماز کی حقیقتوں کو دل میں حاضر کر کے نماز ادا کرتا ہو اور جو حاضری مساجد کے التزام کے ساتھ حضور مساجد کے اجتماعی تصور کو بیدار کر کے مسجد میں آتا ہو وہ یقیناً زندگی کے اس اجتماعی مرحلہ پر پہنچ کر رہے گا جو مسلمان کی زندگی میں اسلام کو پیش نظر ہے۔ اور وہ یہی ہے اس نے مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ کو خواہ وہ تدبیر منزل سے تعلق رکھتا ہو یا سیاست و مدن سے، عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، اجتماعی بنانا چاہا ہے۔ مثلاً باہمی تعلقات اور آپس کے تعاون کو استوار کرنے کے لیے کہیں اسلام نے عبادت مریض رکھی تاکہ ایک کی دوسرے کے دل میں جگہ ہو اور قطع راہ و رسم کی صورت نہ ہونے پائے۔ کہیں جنازوں کی متابعت عامہ رکھی کہ میت کی خدمت بھی کسی ایک گھرانے یا قبیلے سے مخصوص نہ رہے بلکہ عامہ مسلمین کا فریضہ ہو جائے۔

کہیں تقریب میت عمومی رکھی تاکہ سب کے سب مرنے جینے میں ایک دوسرے کے شریک حال رہیں۔ کہیں زیارت اخوان اور دوستوں سے ملاقات رکھی تاکہ محبت باہمی کی تجدید ہوتی رہے۔ کہیں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کی رسم قائم کی تاکہ دلوں کی کدورتیں صاف ہوتی رہیں اور اجتماعی مقاصد میں فرق نہ پڑے۔ ادھر ہر یگانہ و بیگانہ کے لیے تحیہ و سلام رکھا تاکہ ایک دوسرے سے قریب رہیں۔ مصافحہ پر مغفرت کے وعدے دیئے تاکہ ایک دوسرے سے ہاتھوں کی طرح خود بھی ملے رہیں۔

صلہ رحمی رکھی تاکہ قرابتیں مضبوط رہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو گھروں پر بے تکلف پہنچ کر کھانے پینے کی رسم قائم کی تاکہ باہمی بشاشت و بے تکلفی مستحکم ہو ساتھ مل کر بلکہ ایک برتن میں کھانے کا ڈھنگ ڈالاکہ ایک کو دوسرے سے کراہت اور آپس کی چھوٹ باقی نہ رہے۔

جماعت میں سے ایک کا وعدہ سب کا وعدہ اور ایک کا ذمہ سب کا ذمہ قرار دیا تاکہ باہمی بے اعتمادی کو راہ نہ ملے۔ قرابتوں اور اخوتوں کے حقوق قائم کئے تاکہ ایک دوسرے سے مربوط رہے۔ بناوٹی مراتب کی تقریریں مٹائیں تاکہ باہمی یگانگت قائم ہو کر ایک دوسرے کے کام میں بے تکلف حصہ لے سکے۔ سوء ظن، غیبت، چغلی اور آپس کے مخفی حالات کی ٹوہ ممنوع قرار دی تاکہ کوئی ایک دوسرے سے غیر مطمئن نہ ہونے پائے۔ مہمان داری اور اس کے فضائل پر جھکایا تاکہ ملکوں اور وطنوں میں اجنبیت باقی نہ رہے۔ ابن السبیل اور مسافروں کی خدمت رکھی تاکہ کوئی بے وطن اپنے کو غریب اور بے وطن نہ سمجھے، سانکوں کو چھڑکنے سے روکا تاکہ امیر غریب میں منافرت کی ختم ریزی نہ ہونے پائے۔

حتیٰ کہ ہدایت جیسی چیز جو ہر انسان کا شخصی فریضہ ہے اور بلاشبہ ایک کا ہدایت پانا کسی حالت میں بھی دوسرے کے ہدایت پانے پر متعلق نہیں۔ لیکن اس جیسے فرض عین کو اللہ سے مانگنے کا طریقہ بھی سکھایا گیا تو وہ بھی اجتماعی اور جماعتی رنگ سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے ہدایت کے الفاظ حسب ذیل تلقین فرمائے: اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِیْ مَنْ

هَدَيْتَ وَاعْفَانَا فِیْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّانَا فِیْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لَنَا فِیْمَا اَعْطَيْتَ وَفِنَا شَرَّ مَا قَضَيْتَ. ①

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! میں ہدایت بھی تنہا کی نہیں چاہتا کہ میں تنہا ہدایت چاہتا ہوں اور سب گمراہ ہوں بلکہ جماعتی چاہتا ہوں۔ میں عافیت بھی انفرادی نہیں مانگتا، میں برائیوں سے بچاؤ بھی اکیلا نہیں چاہتا۔

غرض مثل مشہور ہے کہ تنہا رونا بھی برا اور ہنسنا بھی برا۔ اس لیے ہدایت پانا اور بالفاظ، دیگر اسلام میں آنا اور اسلامی اعمال کے راستہ پر پڑ جانا باوجود یکہ عینی اور شخصی فرض تھا جس میں قدرتا انفرادیت تھی۔ لیکن اسے بھی انفراد کے ساتھ مانگنا پسند نہیں کیا گیا، بلکہ اجتماعی صیغوں کے ساتھ اس کا سوال کرنا سکھایا گیا۔ تاکہ ایک انسان اپنی حقیقی خلوتوں کے اوقات میں بھی اجتماعیات کے تصور سے خالی نہ رہنے پائے اور اس کی ساری زندگی جماعتی زندگی کی

صورت اختیار کر لے۔

اسلام کے اس اجتماعی پروگرام کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو یہ پروگرام اپنی دینی حقیقت کے ساتھ صرف ایک نماز ہی کا پروگرام پائیں گے اسی میں یہ نظامِ عمل حقیقی للہیت و ایثار کے ساتھ کارفرما نظر آئے گا۔ کیوں کہ نماز ہی اپنے پانچ وقت کے اجتماعی مظاہرہ سے جو نماز جماعت کے ضمن میں اس کے سامنے ہوگا اور خود اسی سے سرزد ہوگا۔ اپنی طبیعت کو عام احوال زندگی میں اجتماعی رنگ پر ڈھلتا ہوا دیکھیے گا۔ تو معاشرہ میں بھی ان ہی اجتماعی جذبات سے کام لے گا۔

غرض نماز سے پیدا شدہ جذبات عام انسانی ہمدردی کو ایک ایسی حد پر قائم کر دیتے ہیں کہ خدمتِ خلق عبادتِ رب کے ہم پلہ نظر آنے لگتی ہے اور اس میں انفرادیت کے بجائے اجتماعی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس خدمتِ خلق اللہ ہی کی تنظیم کے لیے امامتِ کبریٰ اور خلافتِ رکھی گئی ہے تاکہ جماعتی شیرازہ بندی ہو کر خلق اللہ کی ہر ایک خدمت خواہ وہ مادی ہو یا روحانی۔ امام اور خلیفہ حق کے ذریعہ منظم طریق پر وجود میں آتی رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز کی یہ امامت صغریٰ جبکہ ہر طرح سے امامتِ کبریٰ کی کامل صلاحیت پیدا کر سکتی ہے اور جماعتِ صلوٰۃ ہی میں مشترک مفاد اور اجتماعی حیات کے جذبات بالخاصہ ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے نمونہ ہے اللہ کی صلوٰۃ جس کی حقیقت تربیتِ عالم ہے۔

چنانچہ جس طرح وہ صلوٰۃ ربانی باجماعت تھی کہ سارا عالم تکوینی طور پر اس احکم الحاکمین کی امامت کے تحت اس کے منشاء کی اقتداء کرتا ہے اور اسی تنہا کو عملاً مرکز مانتا ہے۔ اسی طرح یہ انسانی نماز بھی باجماعت ہو کر دنیا میں جماعتی زندگی اور مرکزیت قائم کرتی ہے۔ تاکہ یہ انسان بحیثیت خلیفہ الہی اسے پیچھے لا کر اس پر اپنا کنٹرول قائم کر کے اس میں قانون الہی جاری کرے اور تشریحی طور پر بھی اسے مالک الملک کے سامنے اسی طرح جھکا دے۔ جس طرح کہ وہ تکوینی طور پر اس کے آگے جھکی ہوئی تھی اور جیسے وہاں تربیتِ الہی اس خدائی نماز یعنی رحمت و شفقت سے ہی ممکن تھی ایسے ہی یہاں بھی تربیتِ بنی آدم صرف نمازی انسانوں کی نماز ہی سے ہو سکتی ہے جو عبادت کے پہلو سے ادھر کی رحمت و شفقت جذب کرتے ہیں۔

غرض جو آثارِ خدا نے اپنی صلوٰۃ سے عالم پر ڈالے اگر ایک انسان خود بھی وہ آثار اس دنیا پر ڈالنا چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ بھی صلوٰۃ ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح نماز برنگِ عبادت انسان کے خلوت پسندانہ جذبات کی تربیت کرتی ہے۔ جس سے اس کی شانِ جمعیت نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ برنگِ رحمت و تربیت اس کی جلوت پسندی کے دوائی کو بھی ابھارتی ہے جس سے اجتماعیت کا نظام پیدا ہوتا ہے اور خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ جس طرح نماز کے وصفِ جامعیت نے اسے ایک مکمل ترین عبادت ظاہر کیا تھا اسی طرح اس کی شانِ اجتماعیت نے اسے مکمل ترین خلافتِ الہی بھی ثابت کیا ہے اور اس طرح نماز کی اس جامعیت اور اجتماعیت سے

جہاں عبادت کا حق ادا ہوتا ہے وہیں خلافت کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔

بلکہ اگر نماز میں یہ شان اجتماعیت نہ ہوتی اور وہ عبادت رب میں لگا کر خدمت خلق سے بیگانہ بنا دیتی تو شاید وہ اسلامی رنگ کی عبادت ہی نہ کہلائی جاسکتی، کیوں کہ اس کا شرہ وہی رہبانیت اور گوشہ گیری نکلتا ہے جسے مٹانے اور اس کی جگہ عبادت و ہدایت تک میں جلو تیں اور اجتماعیتیں پیدا کرنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا، اسی لیے اس نے عادت و عبادت کو اس طرح باہم ملا دیا کہ یہ دونوں متقابل چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئیں اور ایک شے کے دو (۲) پہلو نظر آرہے ہیں ہر عادت سے عبادت اور ہر عبادت سے عادت کا رنگ جھلکتا ہے۔

تو نماز جیسی اکمل ترین عبادت ان اصول اجتماعیات سے کس طرح خالی رہ سکتی تھی کہ وہ محض انفرادی راہ پر انسان کو ڈال کر خاموش ہو جاتی، نہیں اس نے اپنے ہر پہلو سے اجتماعیات انسانی کے وہ فطری اور محیر العقول اصول قائم کئے ہیں کہ ایک بڑی سے بڑی سلطنت کا نظام اجتماعی بھی صرف ان ہی اصولوں پر چلایا جاسکتا ہے جن کو اس عبادت (نماز) نے اپنی تنظیم کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔

نماز سے اصول اجتماعیات کا استخراج..... مثلاً سب سے پہلے نماز نے جو اسوہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ فرض نمازیں گھروں میں ادا نہ کی جائیں۔ بلکہ مساجد میں حاضر ہو کر، یعنی ادائیگی نماز کے لیے سب سے پہلی چیز گھر کی چار دیواری سے باہر ہو جانا ہے۔

ترک خلوت..... گویا نماز نے سب سے پہلے خانگی خلوت توڑ کر ایک انسان کو میدان میں نکالا اور جلو توں کے ہجوموں میں دیکھنا چاہا۔ جس کا راز ہے کہ گھر کی چار دیواری میں محدود رہ کر انسان کی نگاہ اس کا تخیل، اس کی سعی اور اس کا علم سب محدود اور تنگ رہتے ہیں اس کی نگاہ گھر میں رہ کر خانگی ہی امور تک محدود رہ سکتی ہے۔ اسے عام شہر یا قوم سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نماز نے گھروں سے مساجد کی طرف سفر کرایا تاکہ انسان کے باطن اور ظاہر میں وسعتیں نمایاں ہوں۔ اور کوئی ایک مسلم بھی تنگ دل، تنگ ظرف اور تنگ حوصلہ باقی نہ رہے کہ جس کے سامنے صرف اس کا نفس اور اس کا گھر ہو۔ بلکہ اس کے ظرف میں گھر سے باہر نکل کر مسلمانوں کے پورے جتنوں اور جھمکنیوں کی گنجائش ہو اور اس کے دل میں صرف اپنا اور اپنے بچوں ہی کا خیال نہ ہو نیز فی نفسہ بھی اس کا تجربہ اور علم گھر کی چار دیواری تک محدود نہ ہو بلکہ بیرونی جامع میں پہنچ کر سب کو دیکھ کر اور سب کی سن کر اس کا علم خیال اور تجربہ وسیع تر ہو جائے جس سے اس میں عالی حوصلگی اور وسیع النظری کے نورانی آثار نمایاں ہوں اور جب کہ گھر سے محلہ کی مسجد تک کا یہ مختصر سفر ان مبارک نتائج کا پیش خیمہ تھا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے سفر کی مزید وسعت ان نورانی آثار میں کس قدر مزید اضافہ کر سکتی تھی، سو اسلام کی حکیم شریعت اس سے کیسے اغماض کرتی؟ اس نے تدریجاً اس سفر میں مزید وسعتیں پیدا کیں۔ ہفتہ بھر تو ایک نمازی کو مسجد محلہ ہی کی طرف سفر کرایا لیکن ہفتہ میں جمعہ کا ایک دن رکھ کر اس سفر کو اور وسعت دی کہ شہر بھر کے مسلمان گھروں سے نکل کر ایک ہی مسجد جامع کی طرف سفر کریں۔ اگر

چاہئیں محلہ بھی چھوڑنا پڑے اور مسجد جامع اور جمعہ کے فضائل بیان کر کے ایک طالب اجر نمازی کو بخور و مسرور بنادیا اور پھر اس سفر کو اور وسیع کیا تو سال بھر میں عیدین رکھ دیں کہ مسلمان نہ صرف گھروں سے اور نہ صرف محلوں سے بلکہ شہر سے بھی باہر نکل کر عید گاہ (مصلیٰ) میں جمع ہوں اور پھر آخر اس سفر کو اور وسعت دی تو شہر چھوڑ کر ایک اقلیم تک محدود نہ رکھا بلکہ حکم دیا کہ مسلمان عمر بھر میں ایک دفعہ مسجد حرام کی طرف سفر کریں، یعنی گھر بھی چھوڑیں، محلہ بھی چھوڑ دیں، شہر بھی چھوڑ دیں، صوبہ بھی چھوڑیں، حتیٰ کہ اپنا ملک بھی چھوڑیں، اور دوسری اقلیم میں پہنچ کر مسجد حرام میں حاضری دیں اور پھر اس میں بھی وسعت دی تو مسجد حرام کے بعد حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد اقصیٰ بیت المقدس کو بھی شامل فرمادیا کہ: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْأَقْصَى وَمَسْجِدِي هَذَا. ① ”سفر عبادت صرف تین مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔ مسجد حرام (بیت اللہ) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس اور میری مسجد“ (بیت الرسول)

ظاہر ہے کہ جب محلہ کی مسجد تک نکلنے میں گھر بیلو خلوت ٹوٹ کر آدمی کا دل و دماغ روشن اور وسعت پذیر ہوتا تھا تو مسجد جامع پھر مسجد عید، پھر مسجد حرام، پھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر مسجد اقصیٰ تک نکلنے میں گھر بیلو کیا شہری اور ملکی خلوت بھی ٹوٹ جائے گی اور کسی درجہ میں بھی آدمی میں تنگ دلی اور تنگ حوصلگی کا وجود باقی نہ رہے گا۔ بلکہ اگر اس سفر کا شرعی حق ادا کیا جائے۔ تو ایک عظیم الشان جلوت پیدا ہو کر کسی درجہ آدمی کا دل و دماغ روشن ہو جائے گا؟ بہر حال نماز نے اس اسوہ سے اس اصول کی طرف رہنمائی کی کہ مسلمانوں کا گھر اور باہر سفر اور حضر وطن اور غیر وطن سب برابر ہیں۔ اور جب تک وہ اپنی انفسی اور خانگی زندگی چھوڑ کر باہر نہیں نکلیں گے وہ کبھی اپنے دین، اپنی قوم، اور اپنے ملک کا حق ادا نہیں کر سکتے، بس اجتماعیات کے لیے جب کہ سب سے پہلی چیز خلوت کا توڑ پھینکنا تھا، تو نماز نے پہلے اسے ہی توڑا۔ اور اجتماعیات کی اولین اساس قائم کر دی۔

قطع انفرادیت پھر مسجد میں لا کر یہ نہیں کہا گیا کہ مسجد میں ہر ایک شخص اپنی اپنی نماز الگ الگ پڑھ کر چلا جائے کہ اس میں خلوت تو ٹوٹ جاتی مگر انفرادیت باقی رہ جاتی جو معنوی خلوت و تنگی ہے اور اجتماعی زندگی کے منافی۔ اس لیے نماز نے دوسرا اسوہ یہ پیش کیا کہ مساجد میں پہنچ کر نماز مل کر پڑھی جائے اور ایک جماعت بن کر فریضہ نماز جماعتی ہیئت سے پیش کیا جائے۔ چنانچہ نماز کے بارہ میں مختلف عنوانوں سے تنبیہیں اور تاکیدیں فرمائی گئی ہیں۔ قرآن پاک نے فرمایا: وَارْتَعَفُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ. ② ”نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔“

جس سے جماعت کا وجود اور اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے خواہ سنت موکدہ ہو کر ہو جیسا کہ ائمہ حنفیہ کا قول ہے یا واجب ہو کر جیسا کہ شوافع کا دعویٰ ہے یا فرض قطعی ہو کر جیسا کہ بعض دوسرے ائمہ کا مذہب ہے۔

① الصحيح للبخاری، کتاب الجمعة، باب مسجد بیت المقدس ج: ۴ ص: ۳۸۸ رقم: ۱۱۲۲.

② پارہ ۱: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۳.

بہر حال جماعت کی تاکید اور شدت تاکید بطور قید مشترک ہر مذہب کے مطابق قرآن شریف سے ثابت ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ صلوٰۃ خوف میں بھی ترک جماعت کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ مستقلاً قرآنی حکم آیا کہ عین جہاد کے میدان میں بھی جماعت سے نماز پڑھو، گواہ اس میں جماعت کے دو حصے کر کے آسانی بھی پیدا فرمادی۔

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی ضرورت کے ساتھ اس کے سہل الوصول بنانے کی صورتیں ذکر فرمائیں۔ اور اسباب ترغیب ذکر فرمائے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **إِنَّ صَلَوةَ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكَىٰ مِنْ صَلَوةِ وَحْدَهُ وَصَلَوَتُهُ مَعَ الرَّجُلَيْنِ أَزْكَىٰ مِنْ صَلَوةِ مَعَ الرَّجُلِ وَمَنْ كَثُرَ فَهُوَ أَحَبُّ إِلَيَّ اللَّهُ ①** ”آدمی کی نماز دوسرے کی نماز سے مل کر یعنی (دو کی جماعت سے) اس کی تنہا نماز سے زیادہ پاکیزہ ہے اور دو آدمیوں کی جماعت کے ساتھ ایک کے اجتماع سے زیادہ پاکیزہ ہے اور پھر جس قدر بھی جماعت بڑھ جائے اتنی ہی اس نماز کی محبوبیت اللہ کے یہاں بڑھ جاتی ہے۔“

اسی سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہر نماز میں احادیث سے وقت کا وہ حصہ اختیار کیا ہے جس میں اجتماع زیادہ ہو سکے۔ فجر میں غلّس کے بجائے اسفار کو ترجیح دی کہ چاند نہ ہونے پر آدمی زیادہ مجتمع ہو سکیں گے۔ ظہر میں تعجیل کے بجائے ابراؤ کو اختیار کیا کہ جماعت طویل ہو سکتی ہے..... عصر میں ایک مثل کے بجائے دو مثل کو جس میں ہر پسماندہ شریک جماعت ہو سکتا ہے۔

ادھر عشاء میں اگر تاخیر کے بجائے قدرے تعجیل کی تو وہاں نکثیر جماعت کا مقصد پیش نظر ہے تاکہ لوگ سونہ رہیں۔ صرف مغرب رہ جاتی ہے سو اس میں گویا تاخیر نہیں چاہی مگر وسعت وقت کے بارہ میں احادیث کی تفسیر وہ اختیار کی جس کی رو سے مغرب کا وقت غروب شفق تک تھا تو شفق سے مراد شفق ابیض لی نہ کہ شفق احمر کہ وقت ذرا آگے کو سرک کر وسیع ہو جائے اور لوگ زیادہ سے زیادہ جمع ہو سکیں کیوں کہ شفق ابیض شفق احمر کے بعد غروب ہوتی ہے اور وقت وسیع ہو جاتا ہے۔ غرض حنفیہ کے یہاں ہر نماز میں تاخیر مستحب ہے بجز مغرب کے اور مقصد سب کا وہی جماعت کی زیادتی ہے کہ عبادت میں جتنا زیادہ سے زیادہ اجتماع ہوا اتنا ہی اس کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے۔

پھر نصوص شرعیہ میں مختلف عنوانوں سے جماعت کی ضرورت اس کی فضیلت اور اس کے ترک کی مذمت پر مؤثر پیرایوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہیں فرمایا گیا کہ جماعت سنن ہدیٰ میں سے ہے اگر تم جماعت چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ رہو گے تو تم منافق ٹھہرو گے۔ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں عشاء کی جماعت قائم کر کے اپنے نوجوانوں کو حکم دیتا کہ ان گھروں اور گھر والوں کو آگ دے دیں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے حتیٰ کہ نابینا تک کو جماعت چھوڑنے اور گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

پھر کہیں فرمایا گیا کہ اگر کسی دیہات اور جنگل میں صرف تین ہی آدمی ہوں اور نمازیں جماعت سے نہ ہوں تو

① السنن للنسائی، کتاب الامامة، باب الجماعة اذا كانوا الثین ج: ۳ ص: ۳۵۶.

ضرور ہے کہ ان پر شیطان غالب آکر رہے گا۔ کہیں فرمایا کہ جماعت ہی کے سہارے آدمی کی یہ عبادت قائم رہ سکتی ہے کہ ریوڑ سے الگ نگی ہوئی، بھیڑ ہی کو بھیڑ یا اچک کر لے جاتا ہے۔ پورے گلے یا گلہ میں منسلک شدہ بکری پر ہاتھ ڈالنے کی اسے جرأت نہیں ہوتی۔ بہر حال نماز میں امت کو تفریق کلمہ اور انتشار سے بچا کر وحدت کلمہ پیدا کرنے کی اشد تاکید کی گئی ہے۔ اس سے واضح طور پر نماز سے اجتماعیت عامہ کا اصول نکلا۔ اور نتیجہ خود بخود ذہن نشین ہو گیا کہ اس اصول کے تحت جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے خلوت کو چاہتی ہے۔ یہ جلوت پیدا کی گئی ہے تو اسی اصول کے تحت خود جلوت کے کاموں میں شریعت کو جلوت و اجتماعیت کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا؟ چنانچہ اجتماعی معاشرت کی متعدد مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں جن کی طرف نماز باجماعت ادا کرنے سے طبعیت خود بخود چل پڑتی ہے اور اجتماعیت عامہ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ پس نماز باجماعت ہمیں دن میں پانچ مرتبہ عملی طور پر بتلاتی ہے کہ جس طرح خدا کے اس گھر (مسجد) میں تم مل کر اسے یاد کر رہے ہو۔ اسی طرح خدا کے بنائے ہوئے اس بڑے گھر (دنیا) میں بھی مل کر ہی اسے یاد رکھو یعنی جماعتی زندگی اختیار کرو، اور انفراد وحدت کو ترک کر دو کہ برکت و خیریت، قوت و نصرت، معاملات معاشرت، قومی کلمہ وحدت پھر قومی و برتری فضیلت صرف جماعتی زندگی میں ہے۔

اگر قوم میں جماعت نہیں تو اس قوم میں کوئی فضیلت بھی نہیں۔ پس نماز باجماعت پوری معاشرتی زندگی کو بھی جماعتی کر لینے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ مل کر کام کرنے کی خو پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ مساجد میں پانچ وقت کی حاضری اور اجتماع سے دن رات میں پانچ مرتبہ ایک دوسرے کی آنکھ سامنے ہوگی تو سامنے پڑی آنکھ کا اثر لینا اور لحاظ و پاس کرنا ہے۔ جس کا اثر وہی تعاون باہمی اور تناصر ہے اور ظاہر ہے کہ تمدن کا دار و مدار اسی تعاون و تناصر اور مل کر کام کرنے پر ہے کہ ایک دوسرے کے لیے باعث اذیت ہونے کے بجائے باعث راحت و معاونت ہو۔ معاشرت کے تمام شعبوں، تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت و حرفت میں ایک دوسرے کا دست و بازو بنے اور مددگار ہو۔ اور جب کہ نماز سے یہ تمدنی روح ریل میل اور تعاون وغیرہ کی خوبی بالخاصہ پیدا ہوتی ہے جس سے مدنیت کی اساس قائم ہوتی ہے تو نماز کے ذریعہ اصول اجتماعیت صاف طور پر پروان چڑھتا ہوا محسوس ہو جاتا ہے۔ نماز باجماعت میں معیار اجتماعیت اب نماز کے اس پہلو پر غور کرو کہ کسی مسجد میں نماز کے لیے مجتمع ہونے کے وقت ہرگز یہ شرط نہیں کہ وہ اسی مقام کا باشندہ ہو جہاں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑی ہے۔ نہیں:۔ بلکہ باہر سے آنے والا ہر جگہ کا مسلمان اپنے پورے حق کے ساتھ شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ شرط بھی نہیں کہ وہ اسی قوم کا ایک فرد ہو جو مسجد کا متولی ہے بلکہ ہر قوم اور قوم کے ہر طبقہ کا آدمی جماعت میں شریک ہونے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ یہ شرط نہیں کہ ایک مسجد کے شرکائے جماعت کسی ایک ہی نسل کے ہوں، بلکہ ہر نسل کا ایک انسان ایک دوسرے کے دوش بند و شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اس سے گویا نماز روزانہ اس اصول کا اعلان کرتی ہے کہ

مسلمانوں میں اجتماعیت کا معیار نہ وطن ہے نہ قومیت، نہ نسل ہے نہ رنگ، نہ خون ہے نہ قرابت بلکہ صرف اسلامیت ہے۔ مسلمانوں کی قوم قوم ہی من حیث المذہب ہے، نہ کہ من حیث الوطن، من حیث النسل جس کی مصیبت التزم تفریقوں میں آج دنیا کے سارے مشرقی اور مغربی وطن پرست گرفتار ہیں اور سر پھٹول انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اگر مسلمانوں کی قوم کا معیار اجتماعیت وطن یا نسل ہوتا تو اسلام نہ حجاز سے باہر نکلتا اور نہ عربی النسل افراد سے تجاوز کرتا۔ اور پھر بھی اگر وہ مختلف وطنوں میں بکھرے ہوئے اور بود و باش اختیار کئے ہوئے ہوتے اور اسلام انہیں خون یا وطن کے رشتہ سے جوڑنے کی کوشش کرتا تو اس صورت میں اسلام کوئی دین یا مذہب نہ ہوتا بلکہ وہ ایک قومی تحریک ہوتا جس کا مقصد نسل یا وطن کے لحاظ سے اپنی قوم کی شیرازہ بندی یا فوقیت یا برتری ہوتی، نہ کہ للہیت اور دیانت عامہ۔ پس نماز نے ہمیں اجتماعیت کے ساتھ معیار اجتماعیت بھی بتلایا کہ وہ وطن اور نسل نہیں بلکہ صرف دین ہے اور یہ کہ اسلام کوئی رسمی تحریک نہیں بلکہ خدائی مذہب ہے، جو ہر وطن اور ہر نسل پر خود چھایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم اجتماعیت جبکہ مذہب اور دین کے معیار سے تھی، تو اس کی اجتماعیت میں اگر ٹکڑے ٹکڑے بھی ہوئے تو وہ بھی مذہب ہی کے معیار سے ہوئے۔ کیوں کہ قدرتی طور پر جو جماعت مذہب کے نام پر بنتی ہے وہ مذہب ہی کے نام پر بگڑتی ہے اور جو مذہب کے اعتبار سے مجتمع ہوتی ہے۔ وہ اسی کے نام پر منتشر بھی ہوتی ہے۔

پس مسلمانوں میں اگر بے نظیر وحدت اور اجتماعیت اسلام اور دین کے لحاظ سے تھی تو اس میں فرقے بھی مذہبی ہی پیدا ہوئے، یعنی مذہبی عقائد اولا بگڑے جن سے قوم میں اختلاف رونما ہوا اور وہ بلحاظ عقائد گروہ گروہ ہو گئی کہ اس میں جیسی وحدت تھی ویسی ہی فرقت بھی ہوئی۔

چنانچہ حدیث میں اگر ۳ فرقوں کی خبر دی گئی ہے تو وہ اختلاف عقائد ہی کی رو سے دی گئی ہے۔ جو بلاشبہ مذہبی عقائد ہیں۔ کیوں کہ ان ۳ فرقوں میں سے ایک کو جنتی اور بقیہ کو ناری فرمایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اخروی لحاظ سے عقائد مذہب ہی کے حسن و قبح سے ممکن تھا۔ نہ کہ محض خیالات معاشرت اور طرق مدنیت سے کہ یہ چیزیں فی نفسہ دین اور دیانات نہیں بلکہ محض مقامات دین یا دینی شوکت کے ذرائع میں سے ہیں جو نیت دین سے دینی بنتی ہیں ورنہ دنیا سے محض رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے دیانات و معاشرت اور معاملات کی تقسیم میں دیانات کو معاملات اور معاشرت کا تقسیم اور بد مقابل بنایا گیا ہے۔ جو ان کے باہمی تغافل کی دلیل ہے۔ پس جبکہ مسلمانوں کی فرقہ بندی بعض حدیث دیانت کے معیار سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ معاشرت و اقتصادیات اور سیاسیات کی رو سے۔ اس سے صاف ظاہر واضح ہے کہ یہ قوم، قوم ہی بلحاظ دین ہے جس کا اجتماع بھی معیار دین ہی سے ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی جو وحدت و اجتماعیت مطلوب ہے، وہ اسلامی اور دینی حیثیت ہی کی مطلوب ہے، جو دینی معیار سے ہو۔ اس سے ایک نکتہ یہ حل ہوتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں تمدنی اور سیاسی حیثیت سے فرقہ بندی ہو رہی ہے تو اس عرض کردہ اصول پر یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ اب ان کی وحدت کا بھی معیار بدل گیا ہے۔ وہ آج متحد ہونا

ضرور چاہتے ہیں لیکن عصری سیاسی مقاصد کے معیار سے۔ نہ کہ دینی عقائد کے معیار سے آج ان کا وہ دینی معیار ست پڑ چکا ہے اور وہ اپنی بنیاد سے ہٹ چکے ہیں۔ کیوں کہ آج کل ان کی فرقت سیاسی ہے تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ وحدت بھی سیاسی ہی چاہتے ہیں اور سیاسی بھی وہ جو محض قومیت کی رسم لیے ہوئے ہو۔ نہ وہ جو اسلامی دیانت سے پیدا شدہ اور لادینی سے دور خالص للہی سیاست ہو، جس کا حاصل دنیا میں خدائی اخلاقی اور خدائی قانون کا رواج دنیا اور انسانی دساتیر کی ظلماتی بندشوں سے بنی آدم کو رہائی دلانا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسلامی نقطہ نظر سے اس لیے سخت افسوس ناک ہے کہ اجتماعیت تو امت میں برسوں سے گم بلکہ صدیوں سے مضحک ہے اور عرصہ ہائے دراز سے اس قوم کو تفرق اور انتشار کلمہ نے گھیر رکھا ہے، جو آج بھی موجود ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ پہلا انتشار یا تخریب مذہبی اور دینی حیثیت سے تھا جو اس کی دلیل تھا کہ ابھی تک ان کا معیار اجتماعیت بھی دینی ہے اور جب بھی مجتمع ہوں گے تو دینی اساس ہی پر تعمیر اجتماع کریں گے۔

لیکن آج کا انتشار ملکی، تمدنی، اقتصادی اور عصری سیاست کے معیار سے ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی قومیت اور اجتماعیت کا معیار خالص دین نہیں رہا ہے بلکہ اس میں خالص دنیا کا دخل آ گیا ہے۔ گویا پہلے تو آفات ان کی دنیا پر پڑتی تھیں، دین محفوظ تھا اور اب آفات ان کے دین پر ہیں۔ اور دنیا کے تحفظ کی فکر ہے جو یقیناً امت کے لیے قابل تحسین پہلو نہیں ہے۔ اس سے میری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں قوم کو سیاسیات یا اجتماعیات میں حصہ لینے سے روکنا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرا تو موضوع ہی اس وقت اجتماعیات ہیں جیسا کہ اس تقریر سے آپ سمجھ رہے ہیں، نیز میرے نزدیک قوم میں ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو سیاسی شعور سے آراستہ ہوں اور نہ صرف شرعی سیاست بلکہ عصری سیاست کو بھی پوری طرح سمجھتے ہوں۔ نیز ایسے افراد کی بھی میرے نزدیک سخت ترین ضرورت ہے، جو سیاسی میدان میں بھی بے جگری کے ساتھ کودے ہوئے ہوں۔ پس میرا مقصد سیاسی اقدامات سے روکنا نہیں، غرض صرف یہ ہے کہ ایک سیاسی مسلمان کا ہر ایک اقدام خالص شرعی ہدایات کے ماتحت اور شرعی رنگ میں ہو اور سیاسیات میں رہ کر بھی اسوہ ہائے سلف کا دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تاکہ اس کے دماغ میں دیانت کی اہمیت بھی باقی رہے کہ وہی مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی ہے۔ نیز یہ کہ اس کا معیار اجتماعیت محض سیاست اور وہ بھی عصری سیاست نہ رہ جائے جس کا دوسرا نام مکرو فریب اور دھوکہ دہی یا ہوسناکی ہے بلکہ اس کا معیار اجتماعیت وہی ہو جو قرون اولیٰ کی اجتماعیت اور شیرازہ بندیوں کا تھا، جس کی روح اخلاص و دیانت اور پاک بازی و ولایت تھی۔

پس اس تنقید سے میری غرض سیاسی جذبات کا فائدہ کرنا نہیں، بلکہ ان جذبات کی بے ڈھنگی رفتار اور بے اصول کردار کو روکنا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج مسلمانوں کا معیار اجتماعیت بدل گیا ہے یعنی دین کے بجائے دنیا اور حظوظ آخرت کی جگہ حظوظ دنیا نے معیاری صورت اختیار کر لی جس سے لوگ فتن اور مہالک کا شکار ہو رہے ہیں اور

دنیا میں ہیبت ناک آفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو اس صحیح معیار اجتماعیت کے سمجھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف جماعت میں غور کر لینا کافی تھا۔ اور اب بھی تصحیح خیال کی مختصر صورت یہی ہے کہ ہم نماز پڑھ کر اس کے شرعی جوڑ بند پر دھیان کریں اور غور کریں کہ وہ ہمیں کس رفتار پر لے جانا چاہتی ہے تاکہ اسی رفتار کو ہم اپنی پوری دنیا اور اجتماعی زندگی میں بھی اختیار کر سکیں۔

اجتماعیت، معیار اجتماعیت اور نوع اجتماعیت..... نماز کا اہم بنیادی حصہ جماعت کی صورت یہ ہے کہ جو بھی مسجد میں آجائے وہ اگلی جماعت میں داخل ہونے اور شریک جماعت ہونے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ کسی وطن کا باشندہ ہو اور خواہ اس کی اقتصادی حالت اور سیاسی نظر کچھ بھی ہو شرط صرف یہ ہوگی کہ وہ مسلم ہو اور اس میں اسلامیت ہو، اس صورت حال سے نماز سے اجتماعیت بھی ثابت ہوئی اور معیار اجتماعیت بھی واضح ہو گیا کہ نہ وہ وطنیت ہے، نہ رنگ و نسل بلکہ صرف اسلامیت ہے۔ اسی کے ساتھ اگر نماز ہی میں غور کریں گے تو اجتماعیت کی نوعیت بھی واضح ہو جائے گی کہ وہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز کے اجتماع میں اجتماعیت کے معنی محض جمع ہو جانے یا بھیڑ بھڑ کا کہ نہیں ہیں بلکہ نظم و تنظیم کے ساتھ خاص قسم کے اجتماع کے ہیں۔ ورنہ یوں تو مسجد میں جماعت کھڑے ہونے سے پیشتر بھی اجتماع ہوتا ہے اور کافی بھیڑ ہوتی ہے مگر نہیں کہا جاتا کہ جماعت ہو رہی ہے جبکہ تک کہ اس میں تنظیم اور ایک منظم ہیئت پیدا نہ ہو جائے۔

اس نظم کا پہلا رکن جو ظاہر نظم سے تعلق رکھتا ہے، اصطفا ہے یعنی صف بندی اور پراباندھ کر کھڑے ہونا۔ جیسا کہ ملائکہ صف بندی کرتے ہیں تاکہ مجمع میں ترتیب قائم ہو کر یکسانی کی صورت نمایاں ہو۔ ورنہ بغیر اس کے نظم جماعت ہی قائم نہیں ہو سکتا، چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حقیقت کو تفصیل سے واشکاف کیا گیا ہے جس کو حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ: خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَانَا حِلْفًا فَقَالَ مَا لِي أَرَاكُمْ عَزِينَ ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ أَلَا تَصْفُونَ كَمَا تَصِفُ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا فَلْنَا رَسُولَ اللَّهِ وَكَيْفَ تَصِفُ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا قَالَ يَتِمُّونَ الصُّفُوفَ الْأُولَى وَيَتَرَاوُونَ فِي الصَّفِّ ①

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ہمیں حلقہ در حلقہ اور ٹولیاں بنے ہوئے دیکھا، فرمایا کیا بات ہے کہ میں تمہیں منتشر دیکھ رہا ہوں؟ پھر تشریف لائے تو فرمایا تم صف بندی کیوں نہیں کر لیتے جیسا کہ فرشتے اپنے پروردگار کے پاس صف بندی کیے رہتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اور فرشتے کیسے صف بندی کرتے ہیں اپنے رب کے پاس؟ فرمایا پہلے اولین صفوف کو پورا کرتے ہیں اور صفوف میں گتھ کر اوٹل کر کھڑے ہوتے ہیں۔“ (مشکوٰۃ)

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب الاجر بالسكون في الصلاة والنهي عن الاشارة باليد، ج: ۱۰ ص: ۳۶۲

اس حدیث سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو اس پر ملامت فرمائی کہ تم لوگ متفرق کیوں بیٹھے ہو، جو اس کی علامت ہے کہ تمہارے دلوں میں مل بیٹھنے کی خواہش نہیں ہے گویا حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو۔ پھر فرمایا کہ محض مل جانا اور جمع ہو جانا یا اکٹھے ہو جانا بھی کافی نہیں بلکہ اس اجتماع میں ترتیب نظم پیدا کرو، یعنی صف بندی کرو۔ پھر محض صف بندی بھی کافی نہیں بلکہ صفوں کا اتمام کرو جب تک صف اولیٰ مکمل نہ ہو دوسری صف مت بناؤ کہ آدھی تہائی اور ادھوری صفیں بھی بد نظمی اور بد سلیقگی ہے اور پھر تمام صفوں کا اس منوال پر مکمل کر لینا بھی کافی نہیں جب تک کہ ان میں تر اص یعنی گتہ کر کھڑے ہونے کی صورت پیدا نہ ہو۔ یعنی ایک دوسرے سے خوب مل کر کھڑے نہ ہوں جس سے ذرا بھی درمیانی فرقہ باقی نہ رہے کہ یہ بھی نظم کے منافی ہے اور پھر ان سارے آداب اجتماعیت کے بعد بھی یہ اجتماعیت کافی نہیں جب تک اس میں *عَنْدَرِ يَهَا كَيْ قِيدَ نَهْ پائی جائے۔* یعنی اللہ کے سامنے حاضر ہو کر حضور قلب اور خشوع باطن کے ساتھ قرب و نزدیکی کی نیت سے یہ اجتماعیت ہو کہ اس کے بغیر یہ ساری تنظیم محض ایک رسمی ہوگی۔ جس میں کوئی بھی حقیقت نہ ہوگی۔ پس صورت تفریق مٹانا، صورت وحدت قائم کرنا، اس میں نظم و ترتیب کا لحاظ رکھنا۔ پھر درجہ بدرجہ اپنی ترتیبات کو تدریجاً مکمل کرنا۔

پھر تو اصل باہمی پیدا کرنا جس میں میل ملاپ ظاہری بھی ہو۔ اور پھر ان سب مہمات میں للہیت اور بے نفسی سے کام لینا۔ کیا عام نظام ملت قائم کرنے کے لیے اس اصول کے سوا بھی کوئی اور راستہ ہو سکتا ہے جس پر حیات اجتماعیت کی عمارت کھڑی کی جائے؟ ہرگز نہیں۔ پس نماز فرض مسجد پر اجزائے ملت کا ایک ایسا با اصول اور مکمل نظام روزانہ تیار کرتی ہے کہ اس سے ان اصول پر مطلع ہو کر نمازی قوم اگر پوری ملت کا نظام قائم کرنا چاہے تو با آسانی کر سکتی ہے، کیوں کہ عمل کے بدل جانے سے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ورنہ اصول کا اصول ہونا ہی باقی نہ رہے۔

اس لیے یہ اصول مسجد میں جماعت صلوٰۃ بنائیں گے۔ اور بیرون مسجد نمازی ملت کی مکمل تشکیل کر دیں گے۔ جس سے حیات اجتماعی کا نقشہ خود بخود ملت میں نمایاں ہو جائے گا۔ پس ان اصول سے گویا نماز ہمیں عملاً ہدایت کرتی ہے کہ میری جیسی تنظیم جو تم مسجد میں آکر کرتے ہو۔ اپنے گھروں میں اور اپنے ممالک میں بھی اختیار کرو، تمہاری خانگی زندگی اور ملکی زندگی بھی ایسی ہی ایک صف اور ایک لائن کی ہونی چاہیے جس میں تم باہم گتھے ہوئے ہو، تمہارے درمیان فرقے اور تفرقے نہ ہوں، تم میں اجتماعیت ہو، تفرق کلمہ نہ ہو، گروہ بندیاں نہ ہوں بلکہ تمام مسلمان مل کر ایک ہوں اور ایک جسد کی طرح ہوں، اس قومی جسم میں اعضاء مختلف سہی مگر روح سب کی ایک ہو، پھر اس وحدت یا قوم کی وحدانی شکل کے لیے کسی پنڈال یا مقام پر جمع ہو جانا یا زائد سے زائد کسی خاص نقطہ خیال اور نظریہ پر آ جانا اور ایک پارٹی بن جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں نمازی اصول کے مطابق تنظیم نہ ہو۔ یعنی خیالات کی رو یکسانی کے ساتھ کسی نظم کے ماتحت نہ دوڑ رہی ہو یا جماعت کی عملی سطح اور افکار ایک نہ ہوں پوری قوم صف صلوٰۃ کی طرح ایک آہنی دیوار کی طرح سے نہ کھڑی ہو۔ جس میں کسی دیکھنے والے کو کوئی ادنیٰ فتور یا خلل نظر نہ

آئے۔ پھر صفوف نماز کی استقامت اور سیدھ کی طرح اس مسلم جماعت میں بھی جماعتی استقامت ہو یعنی قلوب میں زلغ نہ ہو، خیالات میں تزام اور مخالف نہ ہو، مقاصد ایک ہوں، دل ایک لائن پر چل رہے ہوں، اور وہ بھی صرف اپنی ہی لائن پر جتے ہوئے ہوں۔

پھر ساتھ ہی نماز کے عیند رہا کی طرح اس اجتماعی حیات میں بھی مسلمانوں کا شعار رجوع و انابت الی اللہ اور اخلاص و التہیت ہو۔ یعنی وہ جو کچھ بھی کر رہے ہوں دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت کی خاطر۔ نفس کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے اور نفسانیت سے نہیں بلکہ للہیت سے کر رہے ہوں۔ غرض عیند رہا کا یہاں بھی پورا ظہور ہو۔ نماز اور مرکزیت ادھر نماز نے ان منتشر افراد کو جمع کر کے ایک پہلو یہ اختیار کیا کہ ان سب جمع شدہ افراد کے آگے ایک فرد واحد کو بنام امام آگے بڑھا کر ساری قوم کو اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس سے ایک اصول یہ نکلا کہ اس جماعتی تنظیم کا قوام ان تمام مذکورہ شرائط اور حدود و قیود کے باوجود پھر بھی قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس جماعت کا شیرازہ بند اور بندھن موجود نہ ہو۔ یہ صف بندی، یہ لائنوں کی یکسانی، یہ گتھ کر کھڑے ہونا جب ہی تو وجود پذیر ہو سکتا ہے کہ کوئی طاقت اس کو بروئے کار لائے اور اس میں سے تشمت کی راہیں مسدود کر دے، کیوں کہ محض اصول کتنے ہی معقول ہوں کافی نہیں ہو سکتے، جب تک کہ ان اصول کو چلانے والی کوئی طاقت نہ ہو۔

پس نماز کی ان صف بندیوں اور عام تشکیلات کو جو طاقت بروئے کار لاتی ہے اور اس میں صورت نظم یا اجتماعیات قائم کرنے کے لیے بندھن کا کام دیتی ہے وہ نصب امام ہے۔ اگر امام نہ ہو تو جماعت ہی نہیں بلکہ ایک بھیڑ ہے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت روکار کی ساتھ کھڑی ہو۔ کیوں کہ وہ سب چلنے والے ہیں، چلانے والا تو امام ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فقہاء تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ مسجد میں جماعت کو کھڑے ہو کر صف بندی ہی اس وقت کرنی چاہیے جب کہ امام مصلیٰ پر پہنچ جائے۔ ورنہ بلا امام جماعت کا اقدام گویا جماعتی نہ ہوگا بلکہ انفرادی ہوگا گو بہت سے افراد کے ایک دم اکٹھے ہو جانے کے سبب اس کی شکل جماعت کی ہی ہو جائے۔

اب سمجھ لیجئے کہ نصب امام کا جو اصول اس امامت صغریٰ میں ضروری تھا۔ بعینہ وہی اصول امامت کبریٰ میں بھی ناگزیر ہے۔ گویا نماز نے ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کتنی ہی خوبصورت تنظیم کی رسم پیدا کر لے وہ جماعت نہیں کہلائی جاسکتی۔ جب تک کہ اس کے لیے کوئی امیر اور امام منتخب نہ کیا جائے جو سب کو ایک خاص لائن پر چلائے اور ان کی اول و آخر کی نگرانی کرے۔ نیز امام کے بغیر ایک جماعتی نظم ہی نہیں بلکہ باہمی ربط بھی قائم نہیں ہو سکتا جو نظم کی بھی روح ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ ایک اصل کے چند شریک جس طرح سب کے سب اصل سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ باہم بھی مربوط ہوتے ہیں۔ جیسے ایک باپ کے چند بیٹوں میں محبت و اخوت ہوتی ہے۔ ایک جد کے چند قبائل میں جد کے ساتھ ساتھ باہم بھی قبائل میں نسلی تعلق ہوتا ہے۔ گو قرب و بعد کا تفاوت بھی ہو کہ اصل قریب کے شرکاء کا باہمی ربط زیادہ مضبوط ہوتا ہے بہ نسبت اصل بعید کے۔ مگر

نفس رابطہ قدرتی ہے۔ ایسے ہی معنوی رشتوں میں بھی یہ فطری اصول کارفرما ہے بلکہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ۔ چنانچہ ایک استاد کے چند شاگرد استاد سے بھی اور باہم بھی مربوط ہوتے ہیں کیوں کہ استادان کی معنوی اصل ہے۔ ایک پیر کے چند مرید پیر سے بھی اور آپس میں بھی متحد ہوتے ہیں کہ پیران کی معنویت کی اصل ہے۔ اسی طرح امام صلوٰۃ تمام مقتدیوں کی نماز کی اصل ہے تو اس اصول کی رو سے لازمی ہے کہ مقتدیوں کو امام سے بھی اور بواسطہ امام آپس میں بھی ایک رابطہ اخلاص و اتحاد ہو۔

بشرطیکہ امام و مقتدی اپنی شرعی شرائط پر پورے اترتے ہوں کیوں کہ امام مقتدیوں کی نماز کا اصل اصول ہے گویا اصل نماز اس کی ہے اور اس کے ضمن میں پھر نماز مقتدیوں کی ہے، اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے: **أَلَا مَامٌ ضَامِنٌ** ① امام (بحق جماعت) ضامن ہے۔

پس امام ضامن ہے اور مقتدی مضمون ہے جو اس کے ضمن میں لپٹا ہوا راہ صلوٰۃ میں چلا جا رہا ہے۔ امامت کا یہ اصول جو اس امامت صغریٰ میں بتایا گیا ہے، عینہ امامت کبریٰ کی بھی روح ہے اور اس میں بھی اسی طرح کارفرما ہے۔ امام المسلمین یا امیر المؤمنین تمام مسلمانوں کی ایک اصل کلی ہے۔ اور بمنزلہ ربی باپ کے ہے جو ان کی علمی، دینی، سیاسی اور اخلاقی تربیت کا ذمہ دار اور ان مدارج کی روح رواں ہے کیوں کہ وہ خلیفہ الہی اور خلیفہ رسالت پناہی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ: **أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ** ② ”میں تمہارے لیے بمنزلہ (روحانی) باپ کے ہوں“۔

اس لیے لازمی ہے کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمان اس امیر عامہ سے مربوط ہوں تاکہ وہ اسی ربط کی قدر آپس میں بھی مربوط ہو جائیں۔ بشرطیکہ امیر بھی ان شرائط و صفات سے موصوف ہو جو شریعت نے اس کے لیے تجویز کی ہیں اور رعایا بھی اس کی تربیت سے اسی لائن پر ہو جو اس کے لیے شریعت نے بچھائی ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر ایسے امیر اور رعایا سے شریعت نے بیزاری کا اظہار کیا ہے جن میں یہ باہمی ربط نہ ہو اور یہ صورت اسی وقت ہے کہ راعی اور رعایا دونوں مقررہ شرعی اوصاف سے عاری ہوں۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

خِيَارُ أَيْمَتِكُمُ الَّذِينَ تَحِبُّونَهُمْ وَيَحِبُّونَكُمْ وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ أَيْمَتِكُمُ الَّذِينَ تَبْغُضُونَهُمْ وَيَبْغُضُونَكُمْ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَقْلًا نَنَابِذُهُمْ؟ قَالَ أَلَا مَا أَقَامُوا فِيكُمْ الصَّلَاةَ أَلَا مَنْ وَلَّى عَلَيْهِ مِنْ وَالٍ فَرَأَاهُ يَأْتِي شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللَّهِ فَلْيَكْرَهُ مَا يَأْتِي مِنْ مَعْصِيَةِ اللَّهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ. ③

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب ما يجب علی المؤذن من تعاهد الوقت ج: ۲ ص: ۱۱۰۔

② السنن لابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب کراہیۃ استقبال القبلة عند قضاء الحاجۃ ج: ۱ ص: ۱۲۔

③ الصحيح لمسلم، کتاب الائمۃ، باب خیار الائمۃ وشرارہم ج: ۳ ص: ۱۳۸۲ رقم: ۱۸۵۵۔

”تمہارے بہترین امراء وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو۔ اور وہ تم سے تم انہیں شفقت سے یاد کرو اور وہ تمہیں، اور تمہارے بدترین امراء وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو کیا ایسے امراء کو ہم چھوڑ دیں؟ فرمایا نہیں! جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کرتے رہیں ہرگز نہیں، لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ جو شخص کسی پر دالی (امیر) بنایا جائے اور وہ امیر میں کسی معصیت کا مشاہدہ کرے تو اس گناہ کو تو برا سمجھتا رہے مگر امیر کی اطاعت سے منہ نہ موڑے۔“

اس سے جہاں امام کی شرائط واضح ہوئیں کہ وہ اپنے مامورین کا محبت ہو یعنی اخلاق ربانی رکھتا ہو اور معصیت کا نہ ہو، وہیں مقتدیوں اور رعایا کی شرط بھی واضح ہوگئی کہ وہ بہر حال محبت امیر اور با اخلاق بن کر اس کی اطاعت پر کمر بستہ رہیں اور گاہے بگاہے امیر کی ذاتی حرکات ناشائستہ بھی دیکھیں تو اطاعت سے منحرف نہ ہوں جب کہ وہ اقامت دین کرتا رہے جس کی بڑی زبردست علامت یہ ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ مل کر نماز قائم کرتا رہے۔

پس جو اصول نماز نے اپنی امامت میں بتلایا تھا وہی بعینہ امامت کبریٰ کے لیے بھی ناگزیر نکلا۔ یعنی امام کا خلیفہ و متواضع اور ساتھ ہی مہمات دین سے باخبر ہونا۔ اس کے بعد نماز نے امامت کے سلسلہ میں شرائط امام کے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ امام صلوٰۃ کے لیے کسی حد تک امتیازی نشان بھی ہونا چاہیے تاکہ مقتدیوں پر امام کو کوئی نہ کوئی فوقیت و برتری حاصل رہے۔ جس کے سبب مقتدیوں کو اس کی اقتداء میں عار نہ پیدا ہو۔ چنانچہ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا کہ: يَوْمَ الْقِيَامِ اَقْرَبُهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ فَاِنْ كَانُوا فِي الْفِرَاءِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسَّنَةِ فَاِنْ كَانُوا فِي السَّنَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هَجْرَةَ فَاِنْ كَانُوا فِي الْهَجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْلَمُهُمْ سِنًا. ① ”امامت قوم کی وہ کرے جو ان میں سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہو اگر قرآن قرآن میں سب برابر ہوں تو جو ہجرت رکھتے ہوں تو پھر امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ عالم سنت ہو۔ اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جو ہجرت میں سب سے مقدم ہوں اور اس میں بھی سب مساوی ہوں تو جو عمر میں سب سے زیادہ ہو۔“

آگے اسی اصول پر فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر سن میں بھی سب برابر ہوں تو نسب میں جو اعلیٰ ہو۔ اور اگر نسب میں بھی سب مساوی ہوں تو حسن و جمال میں جو سب سے بہتر ہو۔ اس سے اصول یہ نکلا کہ امام میں کوئی نہ کوئی امتیازی فضیلت ایسی ہونی چاہیے کہ مقتدی اسے اپنے سے بڑھا ہوا تسلیم کر لیں اور اس کی اقتداء سے گریز نہ کر سکیں، ہاں اگر اس ساری تعلیم کے باوجود کوئی شخص خواہ مخواہ ازراہ زبردستی امامت کے مصلیٰ پر جا کھڑا ہو، درحالیہ اس میں کوئی بھی خاص فضیلت یا خصوصیت نہ ہو۔

بلکہ فرض کر لو کہ اس میں فق و فجور بھی پایا جاتا ہو تو پھر یہ نہیں کہا گیا کہ جماعت ترک کر دو، یا اسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹاؤ، جب تک کہ وہ نماز ہی خراب کرنے کی فکر میں نہ پڑ جائے۔ کیوں کہ اس میں فتنہ ہے اور فتنہ قتل سے

① الصحيح لمسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب من احق بالامامة ج: ۳ ص: ۲۲۸.

بھی بڑھ کر شدید اور ناقابل برداشت ہے۔ الایہ کہ فتنہ کا خوف نہ ہو تو پھر بلاشبہ ایسے امام کو بدل دینا چاہیے۔ غور کرو تو یہی اصول حیات اجتماعی کی بھی روح ہے اور اس کے بغیر سیاسی اور ملکی زندگی میں بھی کوئی نظم قائم نہیں ہو سکتا۔ یعنی امامت کبریٰ کے سلسلے میں بھی امیر میں کچھ اوصاف امتیازی اور فضیلتیں ممتاز ہونی چاہئیں تاکہ لوگ اس کے سامنے گردن اطاعت خم کر سکیں۔ قرآن نے ان امتیازی فضائل کی دو جامع نوعیں ذکر فرمائی ہیں کہ وہ وجاہت ظاہری اور وجاہت باطنی یا جسمانی قوت و صحت اور روحانی علم و معرفت میں امتیازی شان رکھتا ہو۔

چنانچہ طاہرالت کے بارہ میں فرمایا گیا جب کہ اسے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا گیا تھا اور اذہ بَسْطَةَ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ. ① گواہی یہ بھی ارشاد ہے کہ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكُكَ مَنْ يَّشَاءُ (خدا جسے چاہے اپنا ملک سوچ دے) جس سے واضح ہے کہ نفس امارت و ملکویت مطلقاً کسی نہ کسی بادشاہ کے برسر اقتدار آجائے سے بھی معتبر ہو جاتی ہے، ہاں مطلوب امارت وہی ہے جس میں امیر اپنے منصوص اوصاف کے ساتھ تخت امارت پر جلوہ گر ہو۔ جن کی مزید تفصیلات احادیث میں اور تشریحات فقہ میں مذکور ہیں۔ جن کے بارہ میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے ہوئے کسی غیر صالح شخص کو امیر منتخب کرے گا تو وہ بلاشبہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کا مرتکب ہوگا۔

بہر حال اصولی ضابطہ یہی ہے کہ کسی صالح اور فائق فرد کو امام بنایا جائے خواہ نماز ہو یا غیر نماز، امامت صغریٰ ہو یا امامت کبریٰ۔ لیکن اس کے خلاف کوئی امیر مغتلب ہو کر زبردستی قوت کے سہارے خلافت کی گدی سنبھال لے تو پھر اسے ہٹانا بھی جائز نہیں کہ اس میں فتنہ اور اجتماعیت کی تخریب ہے۔ اس کے بعد نماز نے یہ پہلو پیش کیا کہ نماز میں اس پیش امام کی اقتداء کرو اور سب وطاعت سے پیش آؤ کہ اس کی اطاعت فرض ہے اور جو ذرا بھی اس کی اطاعت سے گریز کرے گا۔ اس کی نماز نہ ہوگی۔ گویا یہ عباداتی زندگی راگال ہو جائے گی۔ ہاں اس کی اطاعت سے انحراف ایسے وقت کیا جائے گا جب کہ وہ نماز ہی کو خراب کرنے کے فکر و عمل میں لگ جائے ظاہر ہے کہ اس اصول سے اجتماعی زندگی میں بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ امیر کی اطاعت واجب ہے کہ وہ طاعت حق ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي وَمَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي ② جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

ہاں امیر کی اطاعت سے صرف اس وقت انحراف و گریز جائز بلکہ واجب ہے کہ وہ کفر صریح اور اسلام کی کھلی تخریب پر اتر آئے کہ لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ ③ (خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں) جس کی وجہ یہ ہے کہ نصب امام کی غرض و غایت شوکت دین اور اقامت حدود اللہ ہے،

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیہ: ۲۳۷۔ ② الصحيح للبخاری، کتاب الاحکام، باب قول الله تعالى: واطيعوا الله

واطيعوا الرسول ج: ۶ ص: ۲۶۱۱ رقم: ۶۷۱۸۔

③ الصحيح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعة الامراء ج: ۹ ص: ۳۷۱ رقم: ۳۳۲۳۔

جب وہی نہ رہے تو خود امام کی ذات مقصود نہیں۔ اس لیے ایسے مخرّب دین امام کا عزل واجب ہو جائے گا۔ ورنہ بہر صورت سب طاعت واجب رہے گی۔ چنانچہ کثرت سے احادیث و آثار سب طاعت کے حق میں آئے ہیں۔ نیز کثرت سے احادیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ فتنہ اور اختلاف و نزاع کے وقت امام کی جانب اختیار کرو، نظم کا ساتھ دو، غدر کے ساتھی مت بنو، اور مسلمانوں کے کسی قائم شدہ نظام کی تخریب مت کرو۔ ہاں کفری نظام بہر صورت بقدر استطاعت توڑ پھینکنے ہی کے لائق ہوتا ہے اور وہ عالم بشریت کے حق میں مرض ہے اور مرض ازالہ ہی کے لیے ہے نہ کہ پالنے کے لیے۔

بہر حال جماعت بغیر مرکزیت کے نہیں ہو سکتی اور مرکزیت بغیر انتخاب امیر اور نصب امام کے ناممکن ہے اور یہ سب اصول نماز نے قائم کر دیے۔ اس کے بعد نماز نے ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ نماز میں اسی مرکز جماعت امام کو مطاع تو اس درجہ میں مانا گیا کہ ایک ہی آواز پر جماعت کے لاکھوں افراد جھک جائیں جو وہ کرے سب وہی کرنے لگیں اور جو وہ کہے سب وہی کہیں۔

إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَإِذَا رَكِعَ فَأَرْكَعُوا وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِينَ ① ”امام اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو، وہ سجدہ میں جائے تو تم سجدہ میں چلے جاؤ، وہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کہے تو تم آمین کہو۔“

غرض! اس کے ایک اشارہ پر لاکھوں گرد نیں خم ہو جائیں اور اس کی ایک حرکت بدن پر لاکھوں بدن حرکت میں آجائیں، کسی ایک مقتدی کی مجال نہیں کہ امام سے انحراف کر سکے۔ ورنہ نماز نہیں ہو سکتی، لیکن ساتھ ہی اس مطاعت کے باوجود امام کو استبداد سے بھی اتنا ہی دور رکھا گیا ہے جتنا کہ اسے واجب الطاعت بنایا گیا ہے۔ چنانچہ یہی مطیع جماعت اس کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ اگر امام کی کوئی غلطی کسی رکن صلوٰۃ میں دیکھ پائے تو جماعت کے لیے ہرگز اجازت نہیں کہ اس غلطی پر صبر کر کے خاموش ہو رہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ امام کو ٹوکے اور اس کی غلطی پر اسے متنبہ کرے مثلاً امام، قرأت میں غلطی کر جائے تو مقتدی اسے لقمہ دیں اور اگر ارکان و افعال صلوٰۃ میں کوئی غلطی یا سہو کرے تو فوراً پیچھے سے سبحان اللہ وغیرہ پکار کر اسے متنبہ کریں۔

حتیٰ کہ اگر عورتیں بھی مقتدی ہوں تو وہ بھی امام کی اصلاح سے نہ چوکیں مگر قول سے نہیں کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔ بلکہ تالی بجا کر، اور امام کا فرض ہے کہ قوم کی اس تنبیہ پر اپنی غلطی کو مانے اور عملاً اس کا اعتراف کرتے ہوئے سجدہ سہو میں جھک جائے۔ یہ عملی طور پر اپنی خطا کا اعلان و اعتراف بھی ہے اور تذکر بھی اس سے اصول یہ نکلا کہ امام کا استقلال تو اتنا ہونا چاہیے کہ اس کے اشاروں پر صفوں کی صفیں جھک جائیں مگر ساتھ ہی قوم کا وقار بھی

① الصحيح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب النهی عن مبادرة الامام بالتكبير وغيره ج: ۱ ص: ۱۰۰ رقم: ۴۱۵۔

اتنا ہی ہونا چاہیے کہ امام کی غلطی دیکھ کر اعتراض سے نہ چو کے کیوں کہ امامت و امارت خود قوم کی امانت ہے جو امیر کے پاس ہے، اس کی ذاتی ملک نہیں کہ اس میں کسی کو دم زدن کی مجال نہ ہو۔

نماز نے اسی اصول کو قائم کر کے ملت کو متنبہ کیا ہے کہ جماعت کبرائے اور ملت مسلمہ کا نظام بھی اسی اصول پر قائم کرو کہ امت کا امام و امیر مطاع تو اتنا ہو کہ اس کے اشاروں پر پوری امت نقل و حرکت کرے، کسی طرح جائز نہ ہو کہ مع و طاعت کے دائرہ سے باہر نکلے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **إِنْ أَمَرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقْذُكُم بِكِتَابِ اللَّهِ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا** ① ”اگر تم پر کسی ہاتھ پیر کئے ہوئے ناکارہ غلام کو بھی امیر بنادیا جائے تو مع و طاعت سے کام لو اور اس کی اطاعت کرو“ کسی کو حق نہیں کہ اس امیر جماعت کی مرجعیت اور مرکزیت میں فرق ڈالے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **مَنْ أَمَّاكُمْ وَآمَرَكُمْ بِجَمِيعِ عَلَى رَجُلٍ وَاحِدٍ يُرِيدُ أَنْ يَشُقَّ عَصَاكُمْ أَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوهُ** ② ”جب کہ تم ایک شخص واحد پر مجتمع ہو اگر کوئی شخص اس مرکزیت میں خلل انداز ہو اور تمہاری بندگی بندھائی الاٹھی کے دو ٹکڑے کرنا چاہے تو اسے قتل کرو“۔

پس امیر کی حفاظت و طاعت تو یہ ہو اگر اسی کے ساتھ قوم کی عظمت و شان بھی ایسی ہو کہ امام میں استبداد کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ اسے کوئی حق نہ ہو کہ وہ اپنی ہر من مانی بات منوا کر قوم کو جس راہ اس کا جی چاہے چلا سکے، کیوں کہ وہ بحیثیت ذات قوم کا مرکز نہیں بلکہ خلافت و نبیات قوم کا مرجع ہے اس لیے جس کا وہ خلیفہ اور نائب ہے، اسی کے قانون اور بتائے ہوئے راستہ پر وہ قوم کو چلانے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ قانون الہی کے ماتحت احکام جاری کرے اور حکم کا جو گوشہ اس پر مخفی رہ جائے اس میں قوم سے مشورہ کرے۔ اس لیے تجویز احکام میں امام کے لیے تو مشورہ لازمی ہے۔ **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ**۔ اور قوم کے لیے امام پر تنقید اور اسی روک ٹوک یا نصیحت کا حق حاصل ہے تاکہ امام میں شائبہ استبداد باقی نہ رہے۔ جیسا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا کہ ”اگر میں حکم دوں تو کیا تم اطاعت کرو گے؟ سب نے کہا، کریں گے، فرمایا کہ ”اگر کتاب اللہ کے خلاف حکم کروں؟“ کہا گیا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم تلکے کی طرح اس تلوار سے تمہارے بل نکال دیں گے۔ بہر حال اسلام نے امیر کو مرتبہ عظیمہ بھی دیا ہے کہ وہ نائب حق ہے مگر جب کہ وہ مقام معصومیت پر پہنچا ہوا نہیں ہے تو اس کا ہر کہا ہوا علی الاطلاق واجب الاطاعت بھی نہیں ہے۔ جبکہ قانون الہی کے معیار پر پورا اترتا ہوا نہ ہو۔

غرض امامت میں جمہوریت تو یہ کہ قوم کو حق رائے دہندگی حاصل ہے اور ساتھ ہی شخصیت یہ کہ صاحب عزم صرف امام ہی ہوگا جس کی اطاعت لازم ہوگی۔

① الصحيح لمسلم، كتاب الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة ج: ۲، ص: ۹۳۳، رقم: ۱۲۹۸.

② الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب حكم من فرق امر المسلمين وهو مجتمع ج: ۳، ص: ۱۳۸۰، رقم: ۱۸۵۲.

وَسَاوِرُهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ① ”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ لوگوں سے مشورہ فرمائیں اور جب عزم فرمائیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کریں۔“

پس امام کو مفروض الطاعت بھی رکھا ہے جبکہ وہ راہ راست پر چلے اور اس کی تقویم و اصلاح بھی جماعت پر واجب کی ہے۔ جب کہ وہ بے راہی پر آجائے کہ اس کے بغیر جماعت کا نظام حق و صداقت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ غرض نماز نے نظام ملت کے اس اہم رکن کے لیے بھی ایک طبعی اور عقلی اصول پیش کیا ہے جو نظام کی روح ہے۔ ہاں اس کے بعد نماز نے ایک اور اصولی راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اگر قوم کے متنبہ کرنے پر امام صلوٰۃ اپنی غلطی کو تسلیم کرے اور تدارک کی طرف متوجہ ہو یعنی سجدہ سہو کرے جس میں گویا علانیہ اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ تو پھر قوم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس غلطی تک میں امام کا ساتھ دے اور اس کے تدارک میں بھی اتباع کرے۔

گویا قوم بھی اپنے عمل سے اعلان کر دے کہ باوجودیکہ امام کا یہ فعل غلط اور سہو سے سرزد ہوا مگر جب کہ وہ علانیہ اس غلطی کا معترف اور تدارک پر آمادہ ہے۔ تو ہم سب اس کے اس مخلصانہ رجوع کے سبب اس کے ساتھی اور حامی ہیں، کیوں کہ اس نے جان بوجھ کر صلوٰۃ کی تخریب کرنا نہیں چاہی تھی، گویا قوم عمل سے اعلان کرتی ہے کہ ہم منقطع و مکرمہ میں اپنے امام کے ساتھی اور مطیع ہیں اور یہی نظم صلوٰۃ کی اساس ہے حتیٰ کہ اگر امام سے کوئی مخفی غلطی ہو جائے جس پر قوم مطلع بھی نہ ہو اور وہ سجدہ سہو کر لے، تو اس میں بھی قوم کو ساتھ دینا واجب ہے اور اس غلطی اور تدارک میں اپنے کو بھی شریک امام بنانا ناگزیر ہے تاکہ نظم صلوٰۃ میں انتشار اور دو عملی واقع نہ ہو۔

نماز نے بتلایا کہ یہی صورت امامت کبریٰ میں بھی ہونی چاہیے کہ اگر کسی خطاء اجتہادی پر قوم، امیر کو متنبہ کرے تو امیر کا فرض ہے کہ اس غلطی کے تدارک کی فکر کر کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور جب ایسا کر لے تو قوم اسے تہانہ چھوڑے، بلکہ اس کا ساتھ دے اور اطاعت میں فرق نہ آنے دے، خواہ یہ غلطی مخفی طور پر ہوئی ہو یا علانیہ، جس پر قوم نے متنبہ کیا ہو کہ نظام ملت اس معتدل راستہ کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر قوم مطلقاً امیر کی مطیع بن جائے خواہ وہ برا کرے یا بھلا تو یہ بھی نظام ملت کی تباہی ہے اور اگر ذرا ذرا سی جزئیات پر امیر کی اطاعت چھوڑنے پر آمادہ رہے تو یہ بھی تخریب نظم اور ملت کی بربادی ہے۔ معتدل راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ امیر کی اطاعت منقطع و مکرمہ میں واجب اور اس کی اغلاط پر صحیح مشورہ بھی واجب۔ تاکہ نہ؟ لا مرکزیت پیدا ہو، نہ استبداد کا ظہور ہو۔

شرائط امام یا مناصب امام کے سلسلہ میں نماز نے ایک اور زریں اصول یہ رکھا کہ وہ مقتدیوں میں ممتاز ہے۔ مگر منصب امامت پر پہنچ کر اس کے لیے یہ امتیاز کافی ہے کہ امام ہے۔ رسی امتیازات، ظاہری شوکتیں اور نمائشی اقتدارات کی اسے حاجت نہیں، مثلاً امام کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کرنا کہ سب میں اونچا نظر آئے مگر وہ کہا گیا حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے مدائن میں امامت کی اور کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہوئے جس سے مقتدی سب نیچے تھے، تو

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور عمار رضی اللہ عنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے اتار لائے۔ جب جماعت ہو چکی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ جب آدمی کسی قوم کی امامت کرے تو قوم سے اونچا نہ کھڑا ہو، عمار رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ پھر اسی بناء پر تو میں نے کوئی چون و چرا نہیں کی اور تمہارے اشارہ پر نیچے اتر آیا۔ نماز کے اس جماعتی مسئلہ نے بتلایا کہ امامت کبریٰ کے امیر کو بھی امارت کی عزت کافی ہے۔ ظاہری کروفر، جشم و خدم اور عجم کے رسمی تکلفات اسلامی امیر کا شیوہ نہیں۔ اس کی امارت جب تک کہ صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی امارت کی سی سادگی اور بے تکلفی اور حقیقی عظمت لئے ہوئے نہ ہو وہ اسلامی نقطہ نظر سے خلافت نہیں ہے۔ ملوکیت ہے جو اسلام میں مطلوب نہیں۔

غرض جماعتی زندگی کے تمام اہم مقامات امیر کی سادگی، امیر کی امتیازی شان، امیر کی حق پسندی، امیر کی امتیازی فضیلت، جماعت کی اطاعت، مطیع جماعت کی حریت و نصیحت کیشی۔ امیر کا اعتراف حق اور جماعت کا منشط و مکرمہ میں ساتھ دینا، نماز کے مختلف پہلوؤں سے ثابت ہو جاتے ہیں اور صرف نماز ہی کو سامنے رکھنے سے ملت کا پورا اجتماعی نظام تشکیل پاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نماز نے اپنے اجتماعی نظام میں فرق مراتب کا سسٹم بھی قائم کیا ہے تاکہ مساوات عامہ کے ساتھ مراتب کے فروق بھی نظر انداز نہ ہوں کہ اس کے بغیر عدل کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

نماز نے جماعت میں مثلاً مرد و عورت کا فطری درجہ اور مرتبہ قائم رکھا، مردوں میں بالغ و نابالغ کے مراتب کے فروق ملحوظ رکھے۔ بالغوں میں تقدم و تاخر کا فرق قائم کیا۔ تقدم صفوف میں یمن و یسار کے درجات قائم کئے۔ یمن میں قریب و بعید کا تفاوت پیش نظر رکھا۔

قریب میں امام کے محاذی اور غیر محاذی کی تفریق سامنے رکھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **يُسَبِّحُ مِنْكُمْ أُولُو الْأَخْلَامِ وَالنَّهْيُ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ** ① (چاہیے کہ جماعت صلوٰۃ میں) عقلاء اور بالغ مجھ سے قریب رہیں یعنی صف اولیٰ میں رہیں، پھر جوان سے قریب ہوں، اور پھر جوان سے قریب ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: **عَنْ أَبِي مَالِكٍ ۖ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ أَلَا أُحَدِّثُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ أَقَامَ الصَّلَاةَ وَصَفَ الرِّجَالَ وَصَفَ بِهِمُ الْعِلْمَانِ ثُمَّ صَلَّنِي بِهِمْ ثُمَّ قَالَ هَكَذَا صَلَاةُ أُمِّي** ② (ابو مالک الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تمہارے سامنے بیان نہ کروں؟ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز قائم فرمائی، تو مردوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اولین صف بندی کی اور لڑکوں نے ان بالغوں کے پیچھے صف بنائی، پھر

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۳۳۲.

② السنن لابی داؤد، كتاب الصلوة، باب مقام الصبيان من الصف ج: ۲ ص: ۳۲۱.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو نماز پڑھائی اور فرمایا اسی طرح ہے نماز میری امت کی۔
اس روایت سے واضح ہے کہ اولین صفوف بالغ مردوں کی ہونی چاہئیں اس کے بعد لڑکوں اور نابالغ بچوں کی۔
دوسری ترتیب کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: صَلَّی النَّبِيُّ ﷺ فِي بَيْتِ أُمِّ سَلِيمٍ
فَقُمْتُ وَبَيْنَهُمْ خَلْفَتُهُ وَأُمُّ سَلِيمٍ خَلْفَتَا. ① ”ام سلیم کے گھر میں، میں نے اور ایک یتیم لڑکے نے حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (صف بنا کر) نماز پڑھی اور ام سلیم ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی تھیں۔“
اس سے واضح ہوا کہ عورتوں کا مقام لڑکوں سے بھی پیچھے ہے، کیوں کہ لڑکوں کی نوعیت بہر حال مردوں کی ہے،
بلحاظ عقل و فہم کے جو عورتوں کی نوعیت سے اکمل ہے گوئی الحال وہ حد بلوغ پر نہیں ہے۔
بیمین و یسار کے فرق کے بارہ میں ارشاد ہے کہ دائیں جانب کے مقتدی عنایات خاصہ کے مورد ہوتے
ہیں۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَىٰ مَنِائِمٍ مِنَ الصُّفُوفِ. ② ”اللہ اور اس
کے فرشتے صفوں کے دائیں جانب پر رحمت بھیجتے ہیں۔“

پھر میاں اور دائیں جانب کے مقتدیوں کے بارہ میں فرمایا کہ جو امام ہے وہ رحمت سے زیادہ قریب ہے،
پھر ان مقربین کے بارہ میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: وہ رحمت اولاً امام کے سر پر آتی ہے، اس سے پھر
صف اولیٰ میں اس شخص کی طرف چلتی ہے جو ٹھیک امام کی سیدھ میں ہے اور اس سے پھر دائیں جانب جو قریب ہے
اول اس کی طرف۔ پھر اسی طرح ترتیب وار درجہ بدرجہ صف اولیٰ کے دائیں جانب آخر تک چلتی جاتی ہے۔ اور اس
کے بعد پھر اسی صف اولیٰ کی بائیں جانب کے مقتدیوں کی طرف اسی ترتیب سے لڑتی ہے۔

بہر حال نماز نے بتلایا کہ قرب و بعد کے معیار سے مقتدیوں کے مراتب میں تفاوت ہے، اور اس قرب و بعد
کا معیاری نقطہ امام ہے کہ قرب و بعد کا اعتبار امام سے کیا جاوے گا جو اس سے قریب ہوگا وہ قریب سمجھا جائے گا اور
جو اس سے بعید ہوگا بعید شمار ہوگا۔ پس اس سے یہ اصول واضح ہوا کہ جماعت کے قلوب تھانے کے لیے من اللہ اس
اجتماع صلوٰۃ میں بھی جو مساواة کا انتہائی مظاہرہ ہے۔ فرق مراتب معتبر مانا گیا ہے۔ ورنہ مختلف المراتب اشخاص
کبھی جماعتی لائن میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ان میں باہم کبھی اعتماد و اطمینان اور بشاشت کی لہر نہ دوڑ سکتی۔
ادھر فرق مراتب سے ممکن تھا کہ اعلیٰ مراتب پانے والے اشخاص کے قلوب میں غرور و نفس سے ادنیٰ مراتب
کے افراد کی تحقیر سما جاتی تو اس فرق مراتب کو ساتھ ہی ساتھ کلمہ صلوٰۃ نے مظاہرہ عامہ مساوات ہی کا قائم کر لیا ہے
اور ان متفاوت المراتب اشخاص کو حکم یہی دیا ہے کہ سب کے سب رہیں، ایک ہی صف میں ایڑی ٹخنہ ایک سیدھ
میں کر کے اور موئذ سے موئذ ہالما کر کھڑے ہوں۔ اگر صف میں ذرا آگے پیچھے ہوئے تو انہیں دھکی دی گئی ہے

① الصحيح للبخاری، کتاب الاذان، باب صلاة النساء خلف الرجال ج: ۳ ص: ۳۸۱ رقم: ۶۲۴.

② السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من يستحب ان يلي الإمام، ج: ۲ ص: ۳۱۹.

کہ تمہارے دلوں میں بھی اللہ ایسا ہی اختلاف ڈال دے گا، جیسا یہ ظاہر میں تم نے پس و پیش ہو کر گوارہ کر لیا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **لَتَسُوْنُ صُفُوْفُكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ** ① ”یا تو تم اپنی صفیں سیدھی کر لو اور یا پھر اللہ تمہارے دلوں میں اختلاف ڈال دے گا“۔ چنانچہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو باہم مختلف اور لڑتا جھگڑتا دیکھ کر تسوئہ صفوف کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا کہ: **فَاَنْتُمْ الْيَوْمَ اَشَدُّ اَخْتِلَافًا** ② ”تم آج کے دن سب سے زیادہ اختلاف کے شکار ہو“ (کیوں کہ صفیں برابر کرنے کا اہتمام نہیں کرتے)۔ کہیں تا کید فرمائی گئی کہ: **خَاذُوْا بِالْاَغْنَاقِ** کہ دونوں کو ایک سیدھ میں رکھو ③ کہیں فرمایا: **خَاذُوْا بِئِنَّ مَنَا كِبِكُمْ** ④ ”مونڈھوں کو ایک سیدھ میں رکھو“۔ پھر مونڈھ سے درست کرنے کے لیے جو شخص بھی بڑھے یعنی صفوں کی سیدھ کی خاطر یا ان کے ملانے کی خاطر اس کے بارہ میں نرمی برتنے یعنی اطاعت کا حکم دیا۔ **لَيَسُوْا فِيْ اَيْدِيْ اِخْوَانِكُمْ** ⑤ ”اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کے بارہ میں نرمی اور نرم خوئی اختیار کرو“۔ اس میں اطاعت کرنے والے کے لیے فرمایا: **خِيَارُكُمْ اَلْيُنْكُمْ مَنَاصِبُ فِي الصَّلٰوةِ** ⑥ ”تم میں بہترین وہ ہے جو صف بندی صلوٰۃ میں مونڈھوں کے بارے میں نرم ہو یعنی کہتے ہی مونڈھ سے مونڈھ ہاملا لے اور صف سیدھی کر لے“۔ پھر ایک لائن کے لوگوں کو ہدایت ہوئی کہ ایک صف میں قریب قریب اور مل کر کھڑے ہوں کہ تمہارے قلوب میں بے گنگی اور چھوت نہ پیدا ہو۔ **لِهٰذَا تَقَطِّعُ صُفُوْفٌ مَّت كُرُو**۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **مَنْ وَّصَلَ صَفًا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًا قَطَعَهُ اللّٰهُ** ④ آگاہ ہو کہ جس نے صف ملائی یعنی صف میں مل کر کھڑا ہوا، اسے اللہ اپنے سے ملا لے گا اور جس نے صف کاٹ دی یعنی مل کر کھڑا نہ ہوا تو خدا بھی اسے اپنے سے قطع کر دے گا۔

کہیں فرمایا کہ اتمام صف بھی کرو۔ یہ نہ ہو کہ پہلی صف مکمل ہوئے بغیر ہی دوسری بنائی جائے کہ اس عمل سے کہیں پیچھے رہنے کی خونہ پڑ جائے کہ پھر جو خود پیچھے ہوا تو اللہ بھی اسے پیچھے کر دیتا ہے۔ نیز صفوں کا ادھورا چھوڑنا، بد نظمی اور بد ہیبتی بھی ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **اَتَيْمُوا الصُّفَّ الْمُقَدِّمَ ثُمَّ الَّذِيْ يَلِيْهِ فَمَا كَانَ مِنْ نَّقْصٍ فَلْيَكُنْ**

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۳۳۶.

② الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۳۳۲.

③ السنن لابی داؤد، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف، ج: ۲ ص: ۳۱۰. ④ مسند احمد، حديث ابی امامة

الباهلی الصدی، ج: ۳۵ ص: ۲۲۸. حديث صحيح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۲۸۶. ⑤ مسند احمد، حديث

ابی امامة الباهلی الصدی، ج: ۳۵ ص: ۲۲۸. حديث صحيح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۲۸۶.

⑥ السنن لابی داؤد، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف ج: ۲ ص: ۳۱۳.

⑦ السنن للنسائی، كتاب الامامة، باب من وصل صفا ج: ۳ ص: ۳۱۸.

فِي الصَّفِّ الْمَوْخَرِ ① ”صف اولیٰ مکمل کرو، پھر اس سے پچھلی صف، جو بھی کمی رہے وہ سب سے پچھلی صف میں دینی چاہیے۔“ پھر باہمی میل اور شدت تو اصل کے لیے تراص کا حکم دیا کہ آپس میں گتہ کر کھڑے ہوں، بیچ میں فاصلہ ذرا سا بھی نہ ہو۔ اُقِصُّوا صُفُوفَكُمْ وَتَرَاصُّوا ② صفوں میں گتہ کر اور خوب مل کر کھڑے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: سُدُّوا الْخَلَلَ ③ درمیانی فاصلہ کو بھرو۔

بہر حال ایک طرف اگر یہ منشاء تھا کہ فرق مراتب قائم رہے اور قریب و بعید کا فرق جیسے سی ہے ویسے ہی بلحاظ ثمرات و اجر بھی رہے تاکہ مقربین کی امتگ قائم رہے اور متاخرین کا تکاقل ٹوٹے اور نہ ٹوٹے تو پھر ندامت قائم رہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی منشاء ہے کہ ان متفاوت مراتب افراد جماعت کی مساوات باہمی اور قانونی یکسانی میں بھی کوئی فرق نہ آنے پائے تاکہ متقدمین مغرور نہ ہوں، اور متاخرین دل شکستہ نہ ہوں، نماز نے اپنی جماعت میں جو یہ اصول اعتدال قائم کیا جس میں فرق مراتب بھی ہے اور آئینی یکسانی بھی۔ تو ظاہر ہے کہ اس اصول کے بغیر ملت کا جماعتی نظام بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نماز ہی سے ملت کی شیرازہ بندی اور وحدت بندی اور وحدت عمل پر بھی اصولی روشنی پڑی۔ کیوں کہ جب اجتماع عبادت اس اصول کے بغیر ناممکن تھا تو اجتماع ملت یا تمدنی اور اجتماعی زندگی اس اصول کے بغیر کیسے قائم ہوتی؟

ضروری تھا کہ ایک طرف امیر مسلمین لوگوں کے مراتب میں فرق قائم رکھے تاکہ وہ بکھرنے نہ پائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مراتب و مناقب پر روشنی ڈالی اور ان کے واقعی اوصاف کمال کو جو فیضان نبوت سے ان میں قائم ہوئے، خوب خوب سراہا اور درجات مراتب کا تفاوت واضح فرمایا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے رتبہ اور اپنے ساتھ قرب خاص کے بارہ میں ارشاد فرمایا: غَسِرَ بِنِي اِلٰی السَّمَاءِ فَمَارَ اَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَجَدْتُ اَسْمِيْ مَكْتُوبًا مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاَبُوْ بَكْرٍ الصِّدِّیْقُ خَلِیْفَتِیْ ④ ”مجھے آسمانوں کی معراج کرائی گئی تو میں نے کوئی چیز ایسی نہ دیکھی جس پر نہ لکھا ہوا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور ابو بکر صدیق ان کے خلیفہ ہیں“۔ شیخین کے بارہ میں فرمایا: اَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ مِیْنِیْ بِمَنْزِلَةِ السَّمْعِ وَالْبَصَرِ ⑤ ”ابو بکر و عمر میرے لیے آنکھ اور کان جیسے ہیں“۔ کہیں فرمایا: اِقْتَدُوا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ ⑥ ”میرے بعد ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم کی اقتداء کرو“۔ پھر خلفاء اربعہ کے مراتب کے بارہ میں ارشاد

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ باب تسوية الصفوف ج: ۲ ص: ۳۱۳۔ ② السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الامامة والجماعة ج: ۱ ص: ۲۸۸ رقم: ۸۸۹۔ ③ مسند احمد، مسند عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ج: ۱۲ ص: ۳۔ ④ کنز العمال، ج: ۱۱ ص: ۵۳۹ رقم: ۳۲۵۸ (الحسن بن عرفة فی جزئه، عدو ابو نعیم فی فضائل الصحابة عن ابی هريرة) ⑤ المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه: قیس ج: ۱۱ ص: ۲۳۳۔ علامہ بیہقی فرماتے ہیں: وفيه حماد بن عمر النصیبی وهو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۱۵۶۔ ⑥ السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر و عمر ج: ۱۲ ص: ۱۲۱ رقم: ۳۵۹۵۔

فرمایا: يٰعَالِيُّ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَتَّخِذَ اَبَا بَكْرٍ وَزَيْنًا وَعُمَرَ مُشِيْرًا وَعُثْمَانَ سَنَدًا وَاِيَّاكَ ظَهِيْرًا اَنْتُمْ اَرْبَعَةٌ، فَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَكُمْ فِيْ اَمِّ الْكِتَابِ لَا يُحِبُّكُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُكُمْ اِلَّا فَاجِرٌ اَنْتُمْ خَلَاِئِفٌ نُّبُوْتِيْ وَعَقْدٌ ذِمَّتِيْ وَحُجَّتِيْ عَلٰى اُمَّتِيْ. ①

”اے علی! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ابوبکرؓ کو وزیر اور عمرؓ کو مشیر اور عثمانؓ کو سند و حجۃ اور تجھے مددگار بناؤں، تم چار ہو تمہارے بارہ میں اللہ نے میثاق و عہد دیا ہے لوح محفوظ میں کہ تم سے صرف مؤمن ہی محبت کر سکے گا اور تم سے بغض رکھنے والا فاجر ہوگا، تم چاروں میری نبوت کے خلف رشید ہو اور میری ذمہ داریوں کی مضبوطی ہو اور میری حجۃ ہو، میری امت پر“۔ (الحديث ابن السمان في الموافقة (من رواية الرياض)

غرض خلیفہ اول کا مرتبہ پھر شیخین رضی اللہ عنہما کا مرتبہ پھر خلفاء کا درجہ ترتیب وار ارشاد فرمایا۔ پھر ان حضرات کے علاوہ بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا فرق مراتب بھی کھولا، فقہاء صحابہ کا امتیاز واضح فرمایا۔ اصحاب بدر کی تفصیل بیان فرمائی۔ اصحاب حدیبیہ کے مقامات پر روشنی ڈالی، شہد احد کی فضیلت ظاہر فرمائی مہاجرین اول کا مرتبہ کھولا۔ پھر عامہ صحابہ تک کے باہمی مراتب و فضائل بیان فرمائے مثلاً فرمایا: اَنَا سَابِقُ الْعَرَبِ وَصُھَيْبُ سَابِقُ الرُّومِ وَسُلَيْمَانُ سَابِقُ الْفَرَسِ وَبِلَالٌ سَابِقُ النَّجَشِ. ② ”میں عرب میں اول ہوں، صہیب روم والوں میں، سلمان، فارسیوں میں اور بلال حبش میں سب سے مقدم ہیں دین میں“۔

غرض ہر صاحب منفیت کے مناقب کھول دیئے، جس سے ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ ہر ایک کے کمالات سے دوسرا متغ ہو۔ اور ان کے باہمی مراتب کا فرق نمایاں ہو گیا، لیکن ساتھ ہی ان کی منہی مساوات قائم رکھنے کے لیے یہ بھی فرمایا کہ: اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بَابِهِمْ اَفْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ، ③ ”میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ستاروں کی مانند ہیں، جس کی بھی اقتداء کر لو گے ہدایت پا جاؤ گے“۔

جس سے ان کے ہادی مہدی ہونے کی شان مساوات کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ اسی طرح ان کے منہی اور آئینی حقوق میں بھی کوئی تفاوت نہ تھا۔ مجلس نشینی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ معاشرتی اجتماعات میں کسی قسم کی تمیز اور تفریق نہ تھی۔

غرض ایک طرف حضرت امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مومنین اور قوم میں فرق مراتب کو بھی کھول کھول کر نمایاں کر دیا اور دوسری طرف ان میں مساوات اور یکسانی کی روح بھی بدرجہ اتم پھونک دی۔

① کنز العمال، ج: ۱۳، ص: ۲۳۳، رقم: ۳۶۷۰۳۔ (الزوزنی، خط و ابو نعیم فی معجم شیوخہ وفی فضائل

الصحابۃ والدیلمی، کرواہن النجار من طرق کلھا ضعیفہ)

② المعجم الکبیر للطبرانی ج: ۷، ص: ۱۸، رقم: ۷۱۳۵۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب فضل صہیب

وغیرہ ج: ۹، ص: ۳۰۵۔ ③ تخریج کذریجی ہے۔

پس مساوات و تقاض کا جو اصول امامت صغریٰ میں تھا وہی بعینہ امامت کبریٰ میں رہا۔ اور نماز نے جماعتی زندگی کے اس اہم پہلو کو بھی واضح کر دیا۔

اسی کے ساتھ نماز نے ہمیں یہ بھی بتلایا کہ امام نماز کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مقتدیوں کو خدا کے سامنے لے جا کر ڈال دے اور جھکا دے اور انہیں رجوع الی اللہ، اثابت اور تضرع و زاری کے مقام پر لا کھڑا کرے۔ دوسرا یہ ہے کہ کلمات ربانی باواز بلند سب کو سنا دے اور اعلائے کلمۃ اللہ سے سب کے کان کھٹکھٹائے۔ قرأت قرآن یعنی ارشادات الہی اور ان کی معنوی ہدایت مقتدیوں کے کانوں تک پہنچا دے۔

اس سے نماز نے رہنمائی کی کہ امامت کبریٰ اور نظم ملت میں بھی امیر کا وظیفہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ قوم کو تفوق اور قیث کے مرض میں مبتلا کرے یا امارت کو اپنے لیے ذریعہ جاہ و باہ بنا لے۔ بلکہ اس کا اولین اور آخری فریضہ اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کے نام کی عالم میں منادی کرنی ہے، نیز اس کے بندوں کو اس کی بارگاہ تک پہنچانے کے لیے انہیں نصیحت کرنا، انہیں معرّف اور نیکیوں کا آژور دینا اور بدی سے باز رکھنا ہے۔ تاکہ دنیا میں خدا کا نام اور اس کا قانون عام رائج ہو اور ساری دنیا اس کے زیر سایہ زندگی بسر کر کے اسن ورفاہ کی فضائے عام پیدا کر سکے۔

الَّذِينَ اِنْ مَّكَّنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَامَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُورِ ①

غرض نماز نے جماعتی زندگی امامت و امارت، امام کی شان و صفت رعیت کے فرائض، امام کا نصب العین اور جماعتی زندگی کے دوسرے لوازم پر ایسی اصولی روشنی ڈالی ہے کہ اگر امیر قوم صرف نماز ہی کو سامنے رکھ کر امارت شرعیہ کے اصول وضع کرنا چاہے تو وضع کر سکتا ہے۔

پھر جماعتی شیرازہ بندی کو توڑنے اور فاسد کر دینے والے محرکات بھی نماز میں موجود ہیں۔ سب سے پہلے جو چیز جماعتی نظام کو تباہ کرتی ہے وہ افراد جماعت کا کبر نفس ہے کہ متکبر انسان دوسرے سے کبھی مربوط نہیں ہو سکتا۔ یہ کام صرف متواضع انسان ہی کا ہے کہ وہ اپنے سے فائق انسان کے سامنے حق پسندی کے ساتھ جھک جائے اور بغاوت و سرکشی سے کنارہ کش رہے۔ سو نماز سے زیادہ کبر توڑنے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے، جس کا موضوع ہی تواضع للہ ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔

دوسری چیز ہوائے نفس ہے کہ بسا اوقات انسان اپنی اغراض اور خواہشات کی بناء پر جماعتی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ گو اس میں کبر نفس نہ ہو، سو ہوائے نفس کو نماز کی عبادت سے زیادہ فنا کرنے والی چیز اور دوسری کیا ہو سکتی ہے کہ وہاں سرے سے نفس ہی کو شکست دی جاتی ہے۔

تیسری چیز سوء ظن ہے کہ بلا تین اندھیرے میں رہ کر آدمی کسی کی نسبت کوئی بری رائے قائم کرے اور پھر اس

سے متارکت کر بیٹھے جس سے جماعتی نظام برباد ہو جائے سو نماز میں اس کا علاج بھی موجود ہے۔ جب کہ وہ نمازی کو بے لوث اور بے غرض بنا کر اس کے قلب میں ایسی نورانیت پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی خیر و شر میں خود ہی امتیاز پیدا کر لیتا ہے اس کے دل میں بے اصول اور مضر چیز کوئی جگہ اور وقعت نہیں پاتی کہ وہ بتلائے سوء ظن ہوا اور ہوتا ہے تو بغیر تحقیق و تفتیش اسے کسی کی نسبت بری رائے قائم کرنا خلاف عدل محسوس ہونے لگتا ہے۔ بہر حال نماز کی ترویج اور روشنی سے جہاں ساری کائنات کے حقائق کھلنے لگیں وہاں ظنی گنجکلوں کا وجود کیا رہ سکتا ہے؟

چوتھی چیز درجاتی امتیازات، نسلی تفریقیں اور جماعتی تعصبات ہیں جو نظام کو درہم برہم کرتے ہیں تو نماز کی مساوات اور صفوں کی یکسانی اس تہملکہ کو بھی مٹا ڈالتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسباب تفریق و اختلاف کو بھی اگر دیکھا جائے تو نماز میں اصولی طور پر ان کا علاج بھی موجود ہے۔ یعنی اس میں جہاں اجتماعیت کا ثبوت ہے وہاں مہملکت اجتماعیت کا مداد ابھی تنقیح کے ساتھ موجود ہے۔ اس لیے نماز اجتماعیت اور نظم ملت کے مالد و ماعلیہ کے لیے بھی جامع نکلی۔ جس سے نمایاں ہوا کہ ایک نمازی انسان جس درجہ نظام ملت کی بقاء و استحکام کا ذریعہ بن سکتا ہے بے نمازی آدمی نہیں بن سکتا کیوں کہ نماز تمام مخرجات نظم کا ایک مکمل علاج ہے۔ اس لیے با نماز انسان میں تخریب نظم کے جراثیم کبھی بھی قوت سے نہیں ابھر سکتے۔ غرض نماز نے اصول تقویت نظام پر فکری روشنی بھٹی ڈالی اور عملاً بھی وہ نظام ملت کے لیے ایک آہنی دیوار ثابت ہوئی۔

ہاں پھر نظام ملت کے لیے جہاں اصول کی ضرورت ہے وہاں طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی نظام بغیر طاقت کے نہیں چل سکتا۔ اصول کتنے ہی معقول ہوں لیکن طبائع کی ظلمت انہیں بلا مادی شوکت و طاقت کے قبول نہیں کرتی۔ شریر انفس انسان ہر دور میں موجود رہے ہیں جنہوں نے اصول حق اور عمل صالح کو اپنی اغراض پر بھینٹ چڑھانے کی سعی کی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے افراد کا مقابلہ محض اخلاق سے نہیں ہو سکتا کہ وہ اخلاقی انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ طاقت سے ہوتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اس نماز جیسی عبادت خالصہ نے مقابلہ اور مقابلہ کے اصول جنگ اور جنگی تدبیر سکھانے میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ شاید نماز کو جس قدر مناسبت جہاد سے ہے اتنی کسی اور عبادت سے نہیں ہے۔ چنانچہ ایک حقانی اور راست باز انسان کے دو ہی قسم کے دشمن ہیں جو اسے راہ حق سے ہٹاتے ہیں۔ ایک ظاہری دشمن جیسے کفار و فجار اور ایک باطنی اعداء جیسے شیاطین یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ انسان کی حق و صداقت کے دشمن شیاطین، مگر شیاطین دو قسم کے ہیں ایک بصورت انسان جو نوع انسان میں سے ہوں اور ایک جنات جو نوع شیطانی میں سے ہوں۔

قرآن نے شیاطین ہی کی دونوعیں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کہہ کر قائم فرمادی ہیں۔ یعنی شیاطین الانس اور شیاطین الجن۔ شیاطین کی یہ دونوعیں ایک منٹ کے لیے بھی کبھی گوارا نہیں کر سکتیں کہ دنیا میں اللہ کا کوئی مطیع بندہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں کامیاب ہو شیاطین جن چونکہ مخفی دشمن ہیں اور انسانی نفس میں اپنی جیسی سرکشی اور

ظلمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے ذکر اللہ اور یاد حق سے طرح طرح سے ہٹاتے ہیں۔ اور پھر خصوصیت کے ساتھ نماز جیسی قرب افزاء عبادت میں تو ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اس رابطہ کو قطع کر دیں جو اللہ اور بندہ کے درمیان نماز سے قائم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نماز اور متعلقات نماز کے لیے شیاطین کا ایک مستقل لشکر کمر بستہ ہو کر آتا ہے جو وضوء کے وقت سے انسان کے گھات میں لگتا ہے۔ وضوء میں دوسو سے ڈالنے والے شیطان کا نام ہے وَلَهَّان اور نماز کو خراب کرنے والے شیطان کا نام حَنْزُب ہے۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ کتنے وَلَهَّان اور کتنے حَنْزُب پرے باندھ کر نمازی انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہوں گے۔ کہ ان کو قرب الہی کے ملک سے باہر نکال دیں۔ اس لیے نمازی کو بھی پوری تیاریوں کے ساتھ صفوف صلوٰۃ میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس جنگ میں ان دشمنان جنی سے ہزیمت نہ اٹھائیں۔

چنانچہ بعض اوقات حسی طور پر بھی یہ خفی دشمن آجاتے ہیں اور آنکھوں سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اللہ اپنے مخصوص بندوں کو قدرت دیتا ہے کہ وہ انہیں پکڑ کر سزا دے سکیں۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اِنَّ عِفْرِیْتًا مِّنَ الْجِنَّ تَقْلُبُ الْبَارِحَةَ لِيَقْطَعَ عَلٰی صَلَوتِیْ فَاَمْكِنْنِیْ اللّٰهُ مِنْهُ فَاَخَذَتْهُ فَاَرَدَتْ اَنْ اَرْبِطَهُ عَلٰی سَارِیَةِ مِّنْ سَوَارِی الْمَسْجِدِ حَتّٰی تَنْظُرُوْا اِلَیْهِ کُلُّکُمْ فَلَذِکَ دَعْوَةُ اَخِیْ سُلَیْمَانَ ”رَبِّ هَبْ لِّیْ مُلْکًا لَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ فَرَدَّدَتْهُ حَاسِبًا“ ① ایک شیطان جنات میں سے رات میرے سامنے آ گیا کہ میری نماز کو قطع کر دے، اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ مگر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعاء یاد آگئی کہ ”الہی! مجھے ایسی سلطنت دے جو میرے بعد کسی کو نہ ملے یعنی جنات تک پر قدرت حاصل ہو جائے۔ سو میں نے اسے نامراد بنا کر چھوڑ دیا۔“

جس سے صاف واضح ہے کہ نماز میں مقابلہ ان دشمنان خفی سے ہوتا ہے اور نماز فی الحقیقت ایک معنوی جہاد ہے جو خصوصیت سے شیاطین اور ان کی اندرونی فتنہ پردازیوں کو روکنے کے لیے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ نماز کے کل معاملات میں رخنہ اندازی اگر ہے تو شیطانوں ہی کی طرف سے ہے۔ حتیٰ کہ اوقات نماز تک کے سلسلہ میں شیطان مقابلہ سے نہیں چوکتا۔ چنانچہ طلوع وغروب اور استواء کے اوقات نماز کے لیے اسی لیے ممنوع قرار دیئے گئے ہیں کہ ان میں شیطان کے اثرات کا فرما ہوتے ہیں۔ گویا یہ اوقات شیطان کے معنوی اثرات کی غیر محسوس چھاؤنیاں ہیں جن میں اس کے ناپاک اسلحہ شرک و کفر وغیرہ جمع رہتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے نمازی کو جو شیاطین کے مقابلہ میں خدا کا سپاہی ہے حکم دیا کہ وہ دشمن کی چھاؤنی میں نہ گھسے کہ مغلوب ہو کر اسے واپس آنا پڑے، اس لیے ان اوقات ثلثہ میں گھس کر نماز پڑھنا ممنوع ہوا۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الاسیر او الغریم یربط فی المسجد ج: ۲ ص: ۲۵۹۔

ہاں جب شیاطین خود آکر نمازی کے اوقات میں خلل ڈالے تو اسے مقابلہ کے لیے تیار رہنا چاہیے بلکہ اس کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعتی تدابیر اختیار کر لینی چاہئیں۔ چنانچہ نماز کے حقیقی اوقات شروع ہوتے ہی شیاطین ہجوم کر کے آنے شروع ہوتے ہیں تو اذان رکھی گئی جس کا آغاز تکبیر الہی سے ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ اذان کے وقت شیطان آتا ہے کہ اعلان حق میں خلل اندازی کرے تو اذان کی تکبیر سے اس کے سر پر زد پڑتی ہے۔ اور انھیں حدیث گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے پھر نماز شروع ہونے پر عین صلوٰۃ میں صفوں میں آکر گھستتا ہے کہ اس باہمی ریل میل اور ملاپ میں فرق ڈالے۔ پھر نمازیوں کو کچھ گھسا کر مدہوش کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذکر اللہ سے غافل ہو جائیں پھر جماعت سے کوئی رہ جائے تو اس کی نماز کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ جیسے ریوڑ سے رہی ہوئی بکری بھیڑیا اچک کر لے جاتا ہے۔

پھر سوسہ اندازی الگ کرتا ہے تاکہ نماز میں دل جمعی اور یکسوئی باقی نہ رہے۔ کبھی رکعتیں بھلا دیں۔ کبھی قرأت میں شک ڈال دیا۔ کبھی رکوع و سجود میں شبہ پیدا کر دیا۔ بہر حال نماز کے مبادی سے لے کر مقاصد تک اول سے لے کر آخر تک شیطان کی سعی ہوتی ہے کہ پورا مقابلہ کر کے آدمی کو اس راہ حق اور طریق وصال ربانی سے ڈک گائے اس لیے بندوں کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بھی نماز میں اس ظالم کا پورا مقابلہ کریں۔ صف بندی کر کے اجتماعی صرب و ضرب کے لیے تیار ہو جائیں، اور مسلح ہو کر کمر بندی کر لیں، تاکہ اس دشمن انسانیت شیطان کی کمر ٹوٹ جائے۔ اور وہ اس جنگ میں شکست کھا کر ہزیمت پر مجبور ہو جائے۔

حدیث میں ارشاد ہے: الصَّلَاةُ تُسَوِّدُ وَجْهَ الشَّيْطَانِ وَالصَّدَقَةُ تُكَبِّرُ ظَهْرَهُ وَالتَّحَاتُّبُ فِي اللَّهِ وَالتَّوَدُّدُ فِي الْعَمَلِ يَقْطَعُ ذَائِرَةَ فَإِذَا قَعَلْتُمْ ذَلِكَ تَبَاعَدَ مِنْكُمْ كَمَطْلَعِ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا۔ ① ”نماز شیطان کو روسیا کر دیتی ہے اور صدقہ اس کی کمر توڑ دیتا ہے اور لوجہ اللہ باہمی محبت اور عمل میں باہمی رسائی اس کی جڑ کاٹ دیتی ہے پس جب تم یہ عمل کرو گے تو شیطان تم سے اتنا ہی دور ہو جائے گا جتنا کہ مشرق و مغرب میں بعد ہے۔“

نماز نے اس جنگ معنوی کے سلسلہ میں جن معنوی اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا ہے ان میں سب سے بڑا ہتھیار تعوذ ہے کہ اللہ کی پناہ میں آ جاؤ اور پہلے ہی اعوذ باللہ پڑھ لو جس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص حسی دشمن ہو تو آدمی سامنے جا کر مقابلہ کرے کہ ہتھیار نہ ہو تو ہاتھ ہی سے لڑے، حملہ کی قدرت نہ ہو تو صرف بچاؤ ہی کر لے۔ دشمن بھی سامنے ہے اور اس کا حملہ بھی سامنے ہے۔ لیکن جب کہ دشمن گھات میں ہو پیچھے سے آئے اور اس طرح اچانک حملہ کر بیٹھے کہ ہم اسے دیکھ بھی نہ سکتے ہوں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔

إِنَّهُ يَرُكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْهُمْ ② ”وہ (شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔“ تو بجز اس کے اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ایسی ذات کی پناہ لیں جو اسے بھی دیکھتی

① کنز العمال، ج: ۷ ص: ۲۸۴ رقم: ۸۸۹۳، (فر عن ابن عباس) ② پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۲۷۔

ہو اور ہمیں بھی دیکھ رہی ہو اور ساتھ ہی اس کے زبردست حملے اور ہمارے عجز و لاعلمی سے بھی خوب واقف ہو اور اوپر سے قدرت والی ایسی ہو کہ سارے جن وانس اور مجرد بریل کر بھی آجائیں تو اس کے ملک میں ذرہ برابر کمی نہ کر سکیں۔ بلکہ اسے پا بھی نہ سکیں۔ لَا تَنْزِلُ كُنْهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ① ”نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک رکھتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔“ اسی لیے آغاز صلوٰۃ ہی میں جب کہ ثناء کے بعد قرأت کا آغاز ہوتا ہے جو قیام صلوٰۃ کا اصل مقصود ہے، پہلے اعوذ پڑھی جاتی ہے۔ گویا شیطان کے مقابلہ کے لیے تعوذ کا ہتھیار سنبھال لیا جاتا ہے نماز کے اس عام طرز عمل نے ہمیں بتلایا کہ دشمن کی اپنی چھاؤنی بھی ہوتی ہے۔ جیسے شیطان کے مخصوص اوقات، تو ان میں خود نہ گھسوکہ تمہیں اس کی اندرونی طاقت کا علم نہیں ہے۔ دشمن کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعت کا بھی بندوبست رکھو۔ جیسے اذان کا اصول ہے دشمن تمہارے مورچوں میں شگاف بھی ڈالے گا۔ جیسے شیطان صفوں کے بیچ میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو خوب گتھ کر صرف بندی کرو۔ دشمن پروپیگنڈا کر کے تمہارے خیالات بھی تبدیل کرے گا جیسے شیطان دوسرے اندازی کرتا ہے سو ذکر اللہ سے بیدار رہو۔ دشمن تم پر خواب آور گیس بھی پھینکے گا، جیسے شیطان صفوں کے درمیانی فاصلوں میں گھس کر غفلت آور شیشیاں سنگھاتا ہے۔ جس سے معنوی ہوش جاتے رہتے ہیں تو درمیانی خلل ہی مت چھوڑو کہ اسے آنے اور شیشی سنگھانے کی نوبت آئے چونکہ دشمن اور اس کی چالیں غیر مرئی ہیں تو ایک ایسی طاقت کے قلعہ سے قلعہ بند ہو جاؤ جو دشمن کی طاقت سے لامحدود فوقیت و برتری رکھتی ہو۔ جیسا کہ تعوذ سے پناہ خداوندی کے قلعہ میں آجانے کی تدبیر سے واضح ہے کیا اگر امارت عامہ کے ماتحت پوری ملت اسلامیہ کا نظام قائم کیا جائے اور معاندین حق کے مقابلہ پر جنگی طاقت فراہم کی جائے تو کیا ان اصول جنگ کے سوا کوئی چارہ کار ہے جو نماز نے ہمیں تلقین کیے ہیں؟ اس لیے نماز جہاں ایک بزمی عبادت ہے، جس میں سکون ہی سکون ہے، وہیں ایک رزمی عبادت بھی نکلی جس میں ہجوم ہی ہجوم اور حرکت ہی حرکت ہے۔

پھر اس مجموعی تفصیل سے جو کلی اصول نکلتا ہے وہ یہ کہ جیسا شیطان ہو ویسے ہی اسلحہ بھی فراہم کیے جانے چاہئیں۔ اور ویسی ہی بچاؤ کی مناسب تدبیریں بھی اختیار کی جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس اصول سے جہاد میں بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری ہوگا کہ اسی ڈھنگ پر جہاد میں بھی پہلے ہی سے ہتھیار درست کر لیے جائیں اور وہ بھی دشمن کے طاقت کی مناسب حال۔

پس جہاد میں جبکہ دشمن حسی ہیں تو ہتھیار بھی حسی فراہم کیے جانے ناگزیر ہوں گے۔ اور پھر جس قسم کے ہتھیاروں سے یہ دشمنان انہی آراستہ ہوں گے اسی نوع کے ہتھیار ملت کو بھی فراہم کرنے پڑیں گے۔ جیسے نماز میں دشمن خفی تھا۔ تو ہتھیار بھی خفی اور معنوی ہی سنبھالے گئے۔

پھر اس سلسلہ میں مزید غور کرو تو معلوم ہوگا کہ نماز میں وسوسہ انداز شیطان کے لیے ابتداء ہی جنگ کی اجازت نہیں۔ بلکہ پہلا حکم یہ ہے کہ اسے طرح دو فلسفہ نہ لیتو (شیطان وسوسہ ڈالے تو ادھر دھیان بھی مت کرو۔ صرف خدا سے پناہ مانگو) یعنی اس سے اعراض کرو۔ اور ایک طرف قلب کو کرلو۔ جب نہ مانے تو پھر تعوذ کے ساتھ اسے تھکا دو۔ گویا ابتداء عدم تشدد اور پھر تشدد اور کھلی جنگ ہے کیا جہاد میں بھی اس اصول کے سوا کوئی دوسرا طریق کار ہو سکتا ہے کہ اگر کفار تعدی پر آمادہ ہوں تو ابتداء انہیں طرح دی جائے۔ امن قائم رکھنے کی سعی کی جائے، لیکن جب وہ حملہ آوری کی ٹھان ہی لیں تو پھر جم کر ان کا مقابلہ کیا جائے، چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے: لَا تَتَمَنَّوُا الْفِئَاءَ الْعَدُوَّ... فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا۔ ① ”دشمن سے بھڑنے کی تمناء مت کرو، لیکن اگر سامنے آجائے تو پھر جم جاؤ“ (اور جم کر مقابلہ کرو) غرض نماز کے ایک ایک اصول نے جہاد کے جنگی اصول پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے اور عبادت کی صف میں بھی پورا نقشہ جنگ ایک بہادر انسان کے پیش نظر رکھا ہے تاکہ وہ عین عبادت کی خلوتوں میں بھی جہاد کی ہنگامہ خیزیوں کو فراموش نہ کر سکے۔ پس نماز کا ہر جزو گویا جہاد کا ایک ایک پہلو ہے۔ نماز کی جماعت میں اگر صف بندی ضروری ہے تو جہاد میں بھی لازمی ہے، پھر نماز کی صفوف میں جو امام سے متصل ہیں وہ مرتبہ میں اعلیٰ ہیں اور پچھلی صف والے ادنیٰ، ایسے ہی جہاد میں بھی صف اولیٰ افضل ہے صف آخری سے جو سب سے پہلے گولی اپنے سینے پر لیتی ہے اور امام سے قریب رہتی ہے، پھر نماز کی صفوں میں اگر یمنیں ویار ہے تو صفوف جہاد میں بھی میمنہ اور میسرہ ہے نماز میں میمنہ اور میسرہ کے درمیان صف اولیٰ کا وہ مقتدی جو امام سے اقرب اور اس کا محاذی ہے، بمنزلہ قلب کے ہے تو جہاد میں بھی یمنیں ویار کا درمیانی لشکر قلب ہے جو امام جہاد سے اقرب اور بمنزلہ اس کے پیش دست کے ہے۔ پھر نماز میں اگر گھٹ کر کھڑے ہونے کا حکم ہے تاکہ صفوف میں کوئی رخنہ نہ رہے تو عسکری صفوف کے رخنہ بند کرنے کا بھی حکم ہے تاکہ دشمن درمیان میں گھس کر کسی مورچہ کو کمزور نہ کر دے۔

پھر اگر نماز کی صفوں کے آداب ہیں کہ ادھر ادھر مت دیکھو صرف سجدہ گاہ پر نظر رہے آسمان کی طرف نگاہیں مت اٹھاؤ۔ جانوروں کی ہیئت مت اختیار کرو، چنانچہ تدبیر حمار (رکوع کے وقت گدھے کی طرح کمر میں کوب نکال دینا) بروک جمل (اونٹ کی طرح اگلے ہاتھ فیک کر بیٹھنا) انشاء کلب (کتے کی طرح سرین زمین پر رکھ دینا) افتراش تعلب سجدہ میں لومڑی کی طرح بازو اور پینچے زمین پر رکھ دینا، نقد دیک (ادائیگی ارکان میں جلد بازی کرتے ہوئے رکوع و سجود میں مرغی کی سی ٹھوکیں مارنا) تنخسر شیطان (کو کھ پر ہاتھ رکھ کر شیطان کی طرح کھڑے ہونا)

غرض جیسے نماز کے لیے قواعد ہیں اور صفوف صلوٰۃ میں یکسانی اور تسویہ پیدا کیا جاتا ہے۔ تاکہ پوری جماعت ایک آہنی دیوار نظر آئے، ٹھیک اسی اصول پر جہاد کی صفوف کے بھی عسکری قواعد رکھے گئے ہیں کہ بیٹوں کی یکسانی

① الصحيح للبخاری، کتاب الجہاد والسمیر، باب کان النبی ﷺ اذالم یقاتل اول النهار اخر القتال حتی نزول

ہو۔ نقل و حرکت میں معیت اور تساوی (برابری) ہو، ادھر ادھر التفات نہ ہو۔ مجاہدین کی صفیں ایک سیدھ میں رہیں، ساری فوج ایک دیوار نظر آئے، سب کا فعل ایک ہو، ایک ساتھ سب کا ہاتھ اسلحہ پر پڑے، یکبارگی سب کا حملہ ہوتا کہ ترتیب میں فرق نہ آئے۔

غرض یہاں بھی قواعد اور پریڈ اسی طرح یکسانی قائم رکھنے کے لیے وضع کی گئی ہے تاکہ اس قوی دشمن جنی (شیطان) پر متحدہ زد پڑے اور اس کی ہزیمت سے خدا کا یہ لشکر کامیاب ہو کر اپنی مراد کو پہنچے۔

پھر جیسے نماز میں امام کی آواز پر رکوع و سجود کی طرف انتقالات ہوتے ہیں جو شیطان پر سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہوتے ہیں اور وہ خائب ہو کر بھاگتا ہے۔ ٹھیک اسی اصول پر جہاد میں بھی امام کے اشاروں پر فوجی نقل و حرکت اور اقامت رکوع رکھا گیا ہے جس سے دشمن کے پچھلے چھوٹنے ہیں۔

پھر جیسے صلوٰۃ کا شعار نعرہ تکبیر ہے کہ نماز کے سارے انتقالات اسی نعرہ سے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جہاد میں بھی نعرہ تکبیر ہی شعار بنایا گیا ہے جو عموماً اقدام و هجوم کے وقت لگایا جاتا ہے۔ اور جس طرح نماز کی تکبیر سے شیاطین بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اذان میں بھی جب اللہ اکبر کہا جاتا ہے تو ہنس حدیث شیطان میلوں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی جہاد میں نعرہ تکبیر سے کفار کے دل لرز جاتے ہیں اور وہ بھی چھوٹے ہوئے دل سے بھاگتے ہی نظر آتے ہیں۔ اگر سچے قلوب کی گہرائیوں سے یہ نعرہ سرزد ہو۔ پھر جو آثار نماز کے اہتمام پر مرتب ہوتے ہیں وہی جہاد پر ہوتے ہیں مثلاً حدیث میں ہے کہ نمازیوں کی صف آرائی کے وقت حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے (کَمَا يَلْقَىٰ بَشَائِهِ) کہ دیکھو میرے بندے کس طرح اپنے عیش و آرام کو چھوڑ کر میرے گھر کی طرف دوڑ رہے ہیں اور میرے دشمن شیطان کو مار بھگانے کے لیے آمادہ ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہنس حدیث مجاہدین کی صف بندی کے وقت بھی حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ دیکھو میرے بندے کس طرح سروں کو تقبیل پر لیے ہوئے میری راہ میں جان دینے کے لیے آ رہے ہیں۔

پھر جیسے نماز کی جماعت اور شیاطین کی اجتماعی مدافعت گھروں میں نہیں رکھی گئی۔ بلکہ اس کے لیے مخصوص مکانات ہیں جنہیں مساجد کہا جاتا ہے اور انہی میں اس کی ادائیگی کی ضرورت اور افضلیت ہے۔ ٹھیک اسی طرح جہاد بھی گھر کے کونوں میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے مخصوص میدان ہوتے ہیں جن میں یہ اجتماعی مقابلے عمل میں آتے ہیں، پھر جیسے نماز کے ختم پر اور اداؤں کا رات اور تسبیح و تہلیل وغیرہ رکھی گئی ہے جو مثل ایک غنیمت بارہ کے ہیں کہ اصل نماز کا ثواب لینے کے بعد یہ زوائد... فوائد اور فاضل برکات ہیں جنہیں لوٹنا اور ان میں حصہ قائم کر لینا نمازیوں کے لیے لھم الحسنی و زیادۃ کا صدق ہوتا ہے۔ اور گویا یہ روح صلوٰۃ کا تہمتہ ہیں جنہیں کمالے جانا غنیمت ہے اور فضیلت ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کی عبادت کا تہمتہ احراز غنیمت (مال غنیمت لوٹنا ہے کہ اجر و ثواب بھی اور مادی منفعت بھی ہے پھر جیسے نماز کا آغاز و انجام سب ہی ادعیہ و اذکار پر ہے بلکہ اس کی روح ہی ذکر اللہ ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صد ہا انواع اذکار و ادعیہ مروی ہیں جو نماز کے اول و آخر اور درمیان میں پڑھے

جاتے ہیں۔ ایسے ہی جہاد کا آغاز و انجام بھی ذکر اللہ اور مختلف قسم کی دعاؤں پر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ احادیث میں یہ اذکار مختلف مواقع جہاد کے لیے روایت کیے گئے ہیں، پھر جیسے نماز کے مقدمہ سے لے کر خاتمہ تک انتشار معاصی یعنی گناہوں کے بکھرنے کی صورتیں رکھی گئی ہیں کہ بندہ کے گناہ بھی معاف ہوں اور ساتھ ہی اس کے لیے نشاط خاطر کی صورت بھی پیدا ہو جائے جس سے وہ سرور ہو کر بار بار اس عبادت کو شوق کے ساتھ ادا کرے۔ مثلاً وضو میں ایک ایک عضو دھونے سے اس کے کئے ہوئے گناہ جھڑتے ہیں۔ نیز عین صلوٰۃ میں بھص حدیث نمازی جب رکوع میں جاتا ہے تو اس کے کندھوں پر اس کے گناہوں کو لادتے ہیں۔ اور جب وہ کھڑا ہوتا ہے یا سجدہ میں جاتا ہے تو وہ گناہ دونوں طرف سے خشک پتوں کی طرح گرنے اور بکھرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کے بارہ میں فرمایا گیا کہ اَلْسَيْفُ مَحَاةٌ لِلذُّنُوبِ۔ (تلواریں گناہوں کو ختم کر دینے والی ہے۔)

جس سے ایک ایک گناہ جھڑ جاتا ہے اور خون کے ایک ایک قطرہ کے ساتھ آدمی کا نفس دھل کر صاف ستھرا اور چمک دار ہو جاتا ہے۔ غرض نماز اور جہاد میں مناسبت ہی نہیں بلکہ مشابہتوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ قائم ہے اور اس کا جزو جزو اس کے جزو جزو سے مطابقت کھاتا ہے۔ پس اگر جہاد کے اصول معلوم کرنے ہوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں جنگی اسپرٹ تیار کرنی ہو تو نماز ہی اس کی بھی اسکیم اپنے اندر رکھتی ہے، اور دن میں پانچ مرتبہ اس جنگی اسپرٹ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور اس کے آداب و قواعد سکھاتی ہے، شاید اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جہاد کے متعلق ضروری ترتیبات نماز میں سوچ لیتا ہوں۔ حالانکہ یہ صورت اگر اسی معنی کر لی جائے کہ نماز میں انہیں بے فکری ہوتی ہوگی جس سے طبیعت میں یکسوئی آجاتی ہوگی اور کافی سوچ بچار کا موقع مل جاتا ہوگا تو بظاہر یہ بر محل نہ ہوگا۔ کیوں کہ نماز از قسم افعال ہے، از قسم ترک نہیں ہے۔ افعال میں تو خود انہی افعال کی طرف طبیعت متوجہ رہ سکتی ہے نہ کہ دوسرے افعال کی طرف۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ افعال صلوٰۃ کی طرف سے توجہ ہٹا کر افعال جہاد کی طرف منعطف کرتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ عین صلوٰۃ میں افعال صلوٰۃ سے گریز کر کے افعال جہاد کو سوچنا حضرت عمر جیسی برگزیدہ شخصیت سے بعید ہے کیوں کہ منافی خشوع صلوٰۃ ہے ہاں ایسا سکون ترک میں تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کی نیت کے ساتھ کچھ کاروبار ترک کر کے بیٹھ رہے اور فارغ شدہ طبیعت کو دوسرے افعال کی طرف لگا دے۔ مثلاً صوم ترک کا مجموعہ ہے فعل اگر ہے تو وہ صرف قلب کا ہے یعنی نیت، اور اس کا استحصاء ہر آن ضروری نہیں ہے اس لیے سوچ بچار کی فراغت روزہ میں زیادہ ہو سکتی ہے نہ کہ صلوٰۃ میں۔ نیز ایام صیام میں شیاطین بھی قید ہوتے ہیں کہ دوسووں کا خطرہ ہو اور نفس کا دانہ پانی بھی بند ہوتا ہے کہ وہ تخیلات و افکار میں مبتلا کرے۔ اس لیے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرماتے کہ میں روزہ کی حالت میں جہاد کی تشکیلات سوچ لیتا ہوں تو ایک بر محل بات بھی تھی۔ یہ نماز کی کیا خصوصیت ہے کہ اس میں جنگی تشکیلات کو ترتیب دیا جائے۔

جبکہ اس عبادت میں علاوہ افعال صلوٰۃ کے خود بہت سے شیاطین متقلّٰہ معروف و سوسہ اندازی رہتے ہیں جس سے طبیعت کی یکسوئی اور دوسرے امور کی سوچ بچار کے لیے نماز کو کیوں خاص فرمایا گیا؟ سو بخیاں احقر اس کی دل لگتی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ نماز خود ایک جنگی اسپرٹ اپنے اندر رکھتی ہے اس کے ہر ہر رکن کو جہاد سے مشابہت کامل ہے۔ ایک نماز گزار اگر حقیقت صلوٰۃ کو پیش نظر رکھ کر نماز ادا کرے تو وہ خود ہی تمام مراحل جہاد سے گزرے گا، گو وہ معنوی اور غیر حسی ہوں، مگر نوعیت تو جنگ ہی کی رکھتے ہیں کہ جہاد معنوی ہے سو اگر اس کی طبیعت اس جہاد معنوی سے جہاد حسی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ ان مختلف جہادی مقامات پر گزرتے وقت جہاد حسی کے ان ہی مقامات کی طرف توجہ کرے جن کی طرف قدرتا بھی اس کی طبیعت متوجہ ہے اور پھر ان حسی جہادیات کی وہی ترتیب و تشکیل سوچنے لگے۔ جس کی نوعیت کی طرف بلا سوچے سمجھے بھی اس کی طبیعت چل رہی تو یہ نہ صرف غیر عجیب ہی نہیں بلکہ ہونا بھی یوں ہی چاہیے۔ کیوں کہ نماز کو اگر کسی چیز سے جزیئی جزیئی مطابقت ہے تو وہ صرف جہاد ہی سے ہے اس لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خاص کر نماز میں جہاد کی تشکیلات سوچ لینا کسی بے فکری یا خشوع صلوٰۃ سے اعراض کی دلیل نہیں بلکہ عین صلوٰۃ میں توجہ کی دلیل ہے کہ صلوٰۃ اور جہاد اصولاً ایک دوسرے پر کلیۃً منطبق اور ایک دوسرے سے بالکل یکساں ہیں پس فاروق اعظم کا مقولہ درحقیقت نماز و جہاد کی ایک مستقل مشابہت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ہمارے عرض کردہ مضمون کی زبردست تائید بلکہ برہان ہے۔

بہر حال اس سے واضح ہوا کہ نماز کے افعال اور حقائق میں پورا نظام سیاست، امام اور امیر ملت کی صحیح پوزیشن، شخصیت اور جمہوریت کی حدود و نصب امام، پھر امام کا مقام پھر قوم کا منصب، سمع و طاعت، امام کے ساتھ تعاون، قومی وحدت، اتفاق و اتحاد۔ پھر سیاست کا جنگی پروگرام۔ فوج کے جنگی پروگرام، فوج کے جنگی قواعد تشدد اور عدم تشدد، فوج کی صف بندی و یکسانی، پھر اس میں مرکزیت، جنگی مورچے اور ان کا استحکام، جنگ کے آداب، جنگ میں خالص اللہ کے لیے لڑنا، احراز غنیمت دشمن کے ساتھ مناسب حال معاملہ، خلاصہ یہ کہ تعمیری اور تخریبی پروگرام کی ساری ہی اصولی تفصیلات کچھ پڑی ہیں۔ پس اگر ایک شخص اپنی ذاتی اصلاح چاہتا ہے تو بھی اس کا درماں نماز ہی ہے۔ اور اگر ایک شخص نظام سیاست اور نظم مملکت قائم کرنا چاہتا ہے تب بھی اسے ساری راہنمایاں نماز میں غور کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں پس نماز ایک طرف تو اللہ سے ملاتی ہے۔ ایک طرف مخلوق سے بھڑاتی ہے ایک طرف انفرادیت اور تجل سکھاتی ہے اور ایک طرف اجتماعیت تو صل پر لاتی ہے۔ ایک طرف سلم و سلامتی دکھاتی ہے اور ایک طرف حرب و ضرب پر آمادہ کرتی ہے۔ ایک طرف شخصی حالت درست کرتی اور ایک طرف جماعتی و سپلین اور نظام قائم کرتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ نماز میں جہاں جمعیت ہے وہاں جامعیت ہے اور جہاں جامعیت ہے وہاں اس میں اجتماعیت بھی ہے۔ جمعیت سے شخص نفوس قرار پکڑتے ہیں جامعیت سے جماعتی تشکیل ہوتی ہے اور اجتماعیت سے نظام و ڈسپلین قائم ہو کر جماعت باعزت و شوکت بن جاتی ہے۔

اب دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عبادات اور عادات کا جو مفصل پروگرام سارے اسلام میں پھیلا ہوا ہے وہ سب کا سب تنہا ایک نماز میں سمٹا ہوا موجود ہے۔ پس اگر اسلام اسلام کبیر ہے تو نماز اسلام صغیر ہے، پس نماز خود بذات مکمل اسلام بھی ہے اور پورے اسلام کی میزان الکُل بھی ہے کہ اسلام کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں، اقوال کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور اکوان کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور افعال کی اس میں اور اقوال کی اس میں ہیئت کی عبادتیں اس میں ہیں اور اشارات کی اس میں ہیں۔ پھر انسان کی شخصی عادات کا مداوا اس میں ہے اور جماعتی خصائل و شمائل کی اصلاح اس میں۔ خلوت اس میں ہے اور جلوت اس میں تجل اس میں ہے اور تو اصل اس میں۔ صلح اس میں ہے اور جنگ اس میں۔ غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اصولاً نماز میں موجود نہ ہو۔ پس اگر اسلام محض اس لیے دنیا کا ایک جامع ترین مذہب ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ اسلامی مذہب صرف اس لیے اکمل ترین مذہب ہے کہ اس میں جمیعت نفوس جامعیت اقوام اور اجتماعیت نظام کے سارے اسوے موجود ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ نماز کو مستقل اسلام نہ کہا جائے اور کلیۃً اسے پورا دین کہہ کر نہ پکارا جائے کہ یہی سارے سارے شعبہ ہائے حیات اس میں عجیب و غریب کمال تشریع کے ساتھ جمع فرمادیئے گئے ہیں پس اسی کیفیت کے ساتھ نماز گویا ایک تخم ہے پورا اسلام اسی تخم میں سے نکلا ہوا ایک شجرہ طیبہ ہے۔ جو چیز نماز میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہی سب چیزیں اسلام میں تفصیلی جزئیات کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ پس پورا دین بڑا اسلام ہے اور صرف نماز چھوٹا اسلام ہے یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک و مسلم کے درمیان میں اگر کسی چیز کو فارق فرمایا ہے تو وہ نماز ہے: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرَكَ الصَّلَاةِ** ① ”ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق نماز ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ کسی عبادت کے ترک کو آپ نے کفر سے تعبیر نہیں فرمایا، بجز نماز کے۔ ارشاد ہے: **مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ** ② ”جو قصد اتارک صلوٰۃ ہو گیا، اس نے کفر کیا۔“ کیوں کہ نماز جب پورے اسلام کی میزان الکُل ہے اور بلحاظ حقیقت خود اسلام ہے تو ظاہر ہے کہ اس ترک اسلام کو کفر کے سوا اور کیا لقب دیا جاسکتا تھا، اس لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نماز کا گرا دینا پورے دین ہی کو منہدم کر دینا ہے۔ **الصَّلَاةُ عِمَادُ الدِّينِ مَنْ أَقَامَهَا فَقَدْ أَقَامَ الدِّينَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّينَ** ③ ”نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قائم رکھا اس نے دین قائم رکھا اور جس نے اسے منہدم کر دیا اس نے دین کی عمارت منہدم کر دی۔“

① الصحيح لمسلم، کتاب الایمان، باب اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ ج: ۱ ص: ۲۲۸.

② المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ جعفر ج: ۷ ص: ۳۶۲. ③ شعب الایمان للبيهقي، الحادی والعشرون من شعب الایمان وهو باب فی الصلوٰۃ. علامہ ہشتی امام ہادیؑ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ”الصلوٰۃ عماد الدین لمن ترکها فقد هدم الدین“ البيهقي، ضيف دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات ج: ۱ ص: ۳۸.

جس کا راز وہی ہے کہ فی الحقیقت پورا اسلام اور جامع عبادات اسلام ہے اس سے یہ لطیف نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب نماز جامع عبادات ہے تو گویا نماز کا ادا کرنا درحقیقت ساری عبادتوں کا اجمالاً ادا کرنا ہے، اور ساتھ ہی تفصیلی ادائیگی کے لیے مستعد ہو جانا ہے، اسی لیے حدیث میں ہے کہ روز قیامت جب سے پہلے نماز ہی کی پرسش ہوگی، اگر نمازیں پوری نکلیں تو فرمایا جائے گا کہ اب دوسری عبادتیں تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نمازیں پوری نہ ہوں تو فرمایا کہ اس کی اور عبادتیں بھی پوری نہ ہوگی لہذا سب کی پڑتال اور چھان بین کی جائے۔ اس کا راز بھی وہی ہے کہ نماز میں ساری عبادتوں کے نمونے موجود تھے جب وہ ادھوری رہی تو ساری عبادتیں ادھوری رہیں۔ پس اور ساری عبادتیں نماز کے لحاظ سے جزوی نکلیں اور نماز سب طاعات کے لحاظ سے کلی نکلی کہ یہ سب عبادتیں اس کے دامن میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا ادا کرنا گویا اس سب کا اجمالاً ادا کر دینا ہے اور تفصیلی عمل کے لیے تیار ہو جانا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ تارک نماز گویا ساری ہی عبادتوں کا تارک ہے اور سب سے بڑا ظالم ہے۔ جیسا کہ فاعل صلوٰۃ ساری ہی عبادتوں کا فاعل ہے کہ وہ سب عبادتیں اس میں بھی تھیں اور سب سے بڑا عادل ہے اور شاید اسی لیے نماز کو شغف سے ادا کرتے رہنے سے اور عبادتوں کی ادائیگی کی طرف خود بخود میلان اور رجحان ہوتا ہے کہ آدمی ان کے اجمال کو نماز ہی میں انجام دے لیتا ہے اور گویا ان کا مزہ کچھ لیتا ہے جس سے اسے تفصیلی ادائیگی کا شوق پیدا ہو جانا چاہیے۔ مزید غور کرو تو نماز پڑھنے کی ذاتی خاصیت بھی یہی ہو سکتی ہے کہ اور عبادتیں بھی سہولت سے ادا ہونے لگیں اور تمام حسنات کی توفیق ہو، گویا نماز علاوہ جامع عبادات ہونے کے مفتاح عبادات بھی ہے، اس کے کرنے سے اور طاعات کی ادائیگی کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کاموں کو مستمر آچلاتے رہنے کا راز انضباط اوقات میں مضمر ہے یعنی اوقات منضبط کر لینے سے تمام کام بروقت ہوتے رہتے ہیں اگر کسی کے کاموں کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں جب جی میں آیا کر لیا، جہاں یاد آیا انجام دے لیا۔ نہ وقت مقرر، نہ جگہ معین۔ تو قدرتی بات ہے کہ کاموں میں ناغہ بکثرت ہوگا۔

اور ناغہ کی خاصیت ہے کہ بالآخر کام رہ جاتا ہے۔ اور جب ایک کام اپنے وقت سے ٹلا تو دوسرے کاموں پر بھی طبعاً اثر پڑتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے شخص کے سارے ہی کاموں کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور جہاں یہ عملی زندگی منتشر ہوئی وہیں اس کا اثر یہ ہے کہ قلب کا سکون و اطمینان جاتا رہتا ہے۔

پس جیسا کہ ضبط اوقات اور نظام عمل کی برکت ہے کہ ہر ایک کام اپنی اپنی جگہ بروقت گویا خود بخود انجام پاتے رہنے سے قلب کو تسکین اور بشارت وطمین حاصل رہتی ہے۔ اب سمجھو کہ نماز کے بارہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: **إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا** ① ”نماز مومنوں پر ایک باوقت فریضہ ہے۔“ نماز وقت کی عبادت ہے جس کے لیے زمانہ بھی متعین ہے اور مکان بھی یعنی مسجد، جب ایک شخص کے مہم کے

اوقات جو درحقیقت دن رات میں صرف اوقات نماز ہی ہیں، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، نماز میں مصروف ہو گئے تو علاوہ اس کے کہ اسے پابندی اوقات کی عادت پڑے گی، قدرتی طور پر نمازوں کے درمیان کے اوقات کے کام بھی خود بخود متعین اور منضبط ہو جاویں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ یہ درمیانی کام نیکیوں ہی کے متعین ہوں گے بدیوں کے نہیں، کیوں کہ دو نمازیں نمازی کے قلب کو اس درمیانی فاصلہ کے لیے اتنا منور اور متاثر کر دیتی ہیں کہ اس کی اندرونی رہنمائی عموماً نیک ہی کام کی طرف ہو سکتی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ توفیق نماز سے عین نمازوں ہی کے اوقات نہیں بلکہ نمازوں کے درمیانی اوقات میں بھی انضباط پیدا ہو جانا ضروری ہے اور یہ کہ یہ اوقات نیکیوں ہی سے بھر پور رہیں گے جس سے واضح ہوا کہ نماز مفتاح طاعات ہے کہ باعث انضباط اوقات ہے۔

پس جبکہ نماز گویا دوسری طاعات کو سترم ہے تو اگر اس لحاظ سے بھی قیامت کے دن نمازوں کو مکمل دیکھ کر حکم لگایا جائے کہ اس کی اور عبادتیں درست اور پوری ہیں۔ تو اس میں کیا غیر موزونیت ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ نماز نے ان سب طاعات کو ضبط اوقات اور تنظیم عمل کی وجہ سے سہل الوصول اور بے تکلف معمول بنایا ہوا ہوگا جس سے وہ یقیناً پوری ہی ادا شدہ نکلیں گی۔ بہر حال اس سے واضح ہوا کہ نمازی آدمی درحقیقت تمام اعمال دین اور تمام اوصاف ایمان کا جامع اور تمام امور دنیا کی طرف سے مطمئن ہوتا ہے اور تارک نماز ان سب خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے تمام اوصاف، کمال اعمال، اسلام بلکہ اس کے تمام دنیوی امور بھی پراگندہ رہتے ہیں جس سے اس کے قلب میں نہ سکون ہوتا ہے نہ سلامتی، طمانیت، نہ بشارت اور نہ نورانیت بلکہ وہ ایک مریض قلب ہوتا ہے جس کا علاج ہو تو درست بنے ورنہ ابدی موت مر جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

غرض تعلق مع اللہ کے جتنے شعبے ہیں نماز میں ان سب کی تکمیل ہو جاتی ہے اور عبادت کی تمام انواع اس مختصر اور سہل عبادت کے اندر لپٹ کر خود بخود ادا ہو جاتی ہیں اس لیے نماز کو تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت کا فرد کامل کہنا چاہیے گویا عبادت صرف نماز ہی ہے اور بالذات عبادت ہے۔

پس اس معنی کو بھی عبودیت کا حصر نماز ہی میں نکلا کہ نماز کے سوا اور دوسری عبادتیں محض اضافی عبادتیں ہیں جنہیں امتثال امر نے عبادت بنا دیا ہے ورنہ بذات خود عبادت نہیں اور اس معنی کو بھی عبادت کا انحصار نماز ہی میں نکلتا ہے کہ اس کی ادائیگی سے اور عبادتوں کی تقویم بھی ہوتی ہے اور ساری عبادتیں اسی ایک عبادت کے ذیل میں آ جاتی ہیں، گویا یہ اصل ہے اور سب دوسری اس کی فرع ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فروغ کے وجود اور ثبوت کا دار و مدار اصل پر ہوتا ہے اس لیے اصلی وجود اصل ہی کا ہوتا ہے نہ کہ فروغ کا فروغ گویا اصل کے سامنے معدوم اور بے وجود ہوتی ہیں اس لیے بھی عبودیت کا انحصار نماز ہی میں نکلا۔ پس تنہا ایک نماز ہی اس لیے عبادت ہے کہ اور عبادتوں میں عبادت کے معنی ہی نہیں پائے جاتے، صرف اس میں پائے جاتے ہیں اور اس لیے بھی وہی تنہا عبادت ہے کہ

اگر کسی عبادت میں کچھ بھی عبودیت کی شان پائی جاتی ہے تو وہ نماز کی بدولت ہے۔

غرض جو معنی ہوں بہر صورت تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں فرد کامل اور جو ہر فرد نماز ہی ثابت ہوتی ہے جس سے معارف الہیہ کھل کر ذات و صفات کے کمالات نہ صرف عیاں ہوتے ہیں بلکہ بندے میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں نماز ہی سے نظام ملک و ملت درست ہوتا ہے، تمدن کی روح آ جاتی ہے یعنی میل ملاپ، تعاون و تناسر اور توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر تعلق مع النفس کے سلسلہ میں بھی نماز ہی سے نفسانی اخلاق و مقامات درست ہو جاتے ہیں آدمی بہیمہ (جانور) اور شیطان نہیں رہتا بلکہ آدمی بن جاتا ہے۔ پس آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جیسا کہ انسان عالم صغیر تھا کہ اس میں عالم کبیر کے تمام نمونے اور نقشے مجتمع تھے۔ اسی طرح نماز اسلام صغیر ہے جس میں اسلام کبیر کے تمام نمونے اور نقشے جمع ہیں، اگر انسان تکوینیات میں جامع الحقائق تھا تو نماز تشریعیات میں جامع الحقائق ہے۔ اس لیے جامع کا رشتہ جامع ہی سے ہونا چاہیے تھا تو انسان کو منتخب کیا گیا کامل نماز کے لیے اور مسلم انسان کو منتخب کیا گیا، اسلامی نماز کے لیے جو جامع الصلوٰۃ ہے کہ مسلم انسان ہی معرفت میں سب اقوام سے اکمل تھا اور اگلوں پچھلوں کے تمام معارف اسلام کی بدولت اس پر منکشف تھے کہ یہ آخری قوم تھی اور اسلامی نماز تمام اقوام کی نمازوں کو جامع تھی کہ آخری نماز تھی۔

پس مسلم انسان کا اسلامی نماز کے لیے انتخاب کیا جانا امر طبعی تھا تا کہ اس کی ہر تشریحی حقیقت سے نورانیت اور جلا پیدا ہو۔ اور انسانیت کا ہر ہر گوشہ نماز کے ہر ہر گوشہ سے منور ہو جائے، تو پھر جس طرح یہ انسان نماز کی جامعیت کی وجہ سے تشریع کی ہر ہر عبادت کا ادا کنندہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی ذاتی جامعیت کے ہر ہر نورانی پہلو کے سبب تکوین کی ہر ہر حقیقت کے علم کا جامع اور اس سے آشنا ثابت ہوگا۔ یعنی تکوینیات کی تمام حقائق نماز کی وجہ سے اس میں چمک اٹھیں گی، اور جمادات نباتات، حیوانات، سب ہی کی حقیقتیں اس پر پوری طرح کھل جائیں گی تو اس کی باخبری اور علم و معرفت کے اس وافر سے اس کی فوقیت بھی ان پر ثابت ہوگی اور نمایاں برتری کے سبب اس کی حکومت بھی ان پر قائم ہوگی جس سے خلافت الہیہ کا وہ مقصد پورا ہو جائے گا جس کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی، اسی لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، نے تمام محروسہ ہائے اسلامی میں ضابطہ کا فرمان نافذ فرمایا تھا: اِنَّ اَہَمَّ اُمُوْرٍ دِیْنِکُمْ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ فَمَنْ ضَلَّہَا فَہُوَ لَمَّا سَوَاہَا اَصْبَحَ۔ ”تمہارے دینی امور میں میرے نزدیک سب سے اہم نماز ہے جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسری طاعات کو اس سے زیادہ ضائع کرے گا۔“ گویا ضیاع صلوٰۃ کو ضیاع دین سمجھا، جس سے نماز کی غیر معمولی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام عبادات تو اسلام میں اس طرح نازل ہوئیں کہ کسی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الہام فرمایا گیا۔ کسی عبادت کو وحی ملک کے ذریعہ نازل کر دیا گیا، کسی عبادت کو خواب کے ذریعہ منکشف کیا گیا... کسی کو دوسروں کے فعل اور حضور تقریری سکوت سے شروع کیا گیا۔ لیکن نماز کی فرضیت کے لیے ان سب سے نرالا اور جدا اور ایک ممتاز طریقہ اختیار فرمایا

گیا اور وہ یہ کہ نماز کی فرضیت کے لیے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے اپنے پاس بلا بھیجا۔ شبِ معراج میں عرشِ عظیم پر مدعو فرمایا۔ اور پھر انتہائی قرب سے مقرب بنا کر یہ نماز کا ہدیہ عطا فرمایا۔ اور عبادتیں تو خود اوپر سے نیچے اتریں اور اس عبادت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچے سے اوپر اٹھایا گیا۔ اور عبادتوں کی وحی زمین پر ہوئی اور نماز کی وحی آسمانوں سے بھی اوپر ہوئی اور عبادتیں تو بواسطہ ملائکہ مشروع ہوئیں اور نماز بلا واسطہ خود معبودِ حقیقی نے بطور شرعی تحفہ عنایت فرمائی۔ اس سے نماز کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ حق تعالیٰ کو اس عبادت کا کس قدر اہتمام ہے جس کا راز وہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامع طاعات خود ایک مستقل مذہب اور پورا مجمل اسلام ہے، اس لیے حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: **الصَّلَاةُ مِعْوَاةُ الْمُؤْمِنِينَ**۔ ”نماز مؤمن کی معراج ہے۔“ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کوئی تشبیہ و تمثیل نہیں بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ نماز کو نماز میں معراج ہوتی ہے خواہ اسے ابھی فوری احساس ہو جائے اگر وہ کالمین میں سے ہے یا بعد مرگ احساس ہوا اگر ناقص ہے۔ مگر معراج بہر حال ہر ایک نمازی کو نصیب ہوتی ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ساتھ ہی بایں معنی بھی معراج ہونا واضح ہے کہ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو برکات اور روحانی سر بلندیاں عطا ہوئی ہیں ان کا خلاصہ تین چیزیں ہیں۔ ایک مشاہدہ حق جیسا کہ قرآن نے کہا: **مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى** ① (قلب نے جو کچھ دیکھا وہ اس میں جھوٹا نہیں تھا) دوسرے قربِ انتہائی۔ قرب کا ارشاد ہے: **ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ۖ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى** ② تیسرے مکالمہ حق۔ چنانچہ التحیات میں اسی مکالمہ کی حکایت کی جاتی ہے جو تشہد میں ابدال دھر تک دہرایا جائے گا۔ اگر باخبری سے کام تو سرور کائنات علیہ افضل التحیات والتسلیمات کی جوتیوں کے طفیل میں ہر نمازی مسلمان کو یہ تینوں مقامات دن میں پانچ مرتبہ نماز میں عطا ہوتے ہیں۔ اول مشاہدہ، تو حدیث میں ارشاد ہے کہ بحالت قیام بندہ کی نظر اللہ کے چہرہ پر ہوتی ہے جیسا بھی چہرہ اس کی شان کے مناسب ہے۔ دوم قرب کی انتہاء ہو جاتی ہے کہ نص حدیث اللہ کے قدموں پر بندہ کا سر پڑا ہوتا ہے۔ جیسے بھی قدم اس کی شان کے مناسب ہیں۔

سوم کلام، تو وہ ہر رکعت میں میسر ہوتا ہے کیوں کہ ہر رکعت میں فاتحہ لازم ہے اور فاتحہ کے بارے میں حدیث میں صریح ارشاد ہے۔ کہ اس کے ایک ہر جملہ کا جواب اللہ کی طرف سے ہاتھ دہرا ہوا تھا دیا جاتا ہے **الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ**۔ وہ فوراً فرماتے ہیں **حَمْدُنِي عَبْدِي** بندہ کہتا ہے **الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ** فوراً فرماتے ہیں **أَتْنِي عَلَى عَبْدِي**، بندہ کہتا ہے **يَوْمَ الدِّينِ** تو وہ فوراً فرماتے **مَجْدُنِي عَبْدِي** بندہ کہتا ہے **إِنَّا كَ نَعْبُدُ وَإِنَّا كَ نَسْتَعِينُ** تو وہ فوراً فرماتے ہیں **هَذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي** بندہ کہتا ہے **أَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ** (ال آخر السورة) تو فرماتے ہیں **هَذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ**۔ نیز یوں بھی نماز میں قرآن کی تلاوت فرض ہے۔ اور

تلاوت قرآن ہمیں حدیث اللہ سے ہمکلام ہونا ہے۔

پس جبکہ نماز میں بھی قرب انتہائی ہے، مشاہدہ بھی حقیقی ہے اور کلام بھی منہ در منہ اور یہی تین چیزیں معراج کی روحیں تھیں تو پھر نماز کو مومن کی معراج فرمانا محض تشبیہ واستعارہ کیسے کہا جاسکتا ہے؟ جب کہ معراج کی سب حقیقتیں واقعیت کے ساتھ نماز میں موجود ہیں جس کو اہل مشاہدہ تو دنیا ہی میں محسوس کر لیتے ہیں اور اہل مراقبہ معرفت کے درجہ میں پہچان لیتے ہیں اور اہل مجاہدہ ایمان رکھتے ہیں جن کے مشاہدہ کا وقت مجاہدہ موت کے بعد آتا ہے۔

اس وقت انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حقیقتاً ہم نے دنیا میں بسلسلہ نماز اللہ سے کلام بھی کیا تھا جس کا حظ ہم میں اب راسخ نظر آ رہا ہے۔ اس کا قرب بھی ہمیں انتہائی ہوا تھا۔ جس کی ٹھنڈک ہم اب محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس کا مشاہدہ بھی ہم کرتے تھے جس کا انس اس وقت ہم میں رچا ہوا ہے اور اب ہم اس معرفت بلکہ استحضار پر ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کی تجلیات ہمارے سامنے آجائیں تو ہم فوراً پہچان لیں گے کہ یہ وہی تجلی ہے جو روزانہ ہماری روحوں پر کھلا کرتی تھی اور ہم اس سے وابستہ ہوتے تھے۔ چنانچہ حدیث حشر سے واضح ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے سامنے ایک خاص صورت سے تجلی ہوں گے اور فرمائیں گے انسا الرحمن (میں رحمن ہوں) تو یہ سب کہہ دیں گے کہ (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ) ہم اللہ کے ساتھ تھے سے پناہ مانگتے ہیں (پھر یَوْمَ يَكْشِفُ عَنْ سَاقِدِ) کے وعدہ کے مطابق پنڈلی والی تجلی منکشف ہوگی تو سب سجدہ میں گر پڑیں گے اور اس کے رحمن ہونے کا اعتراف کریں گے اس سے واضح ہے کہ کوئی نہ کوئی جلوہ حق ان کا متعارف اور پہچانا ہوا ہوگا۔ جب ہی تو ایک جلوہ سے وحشت اور ایک سے انس کا اظہار کریں گے، پنڈلی والے جلوہ کو سب پہچان جائیں گے اور سب سجدہ میں گر جائیں گے۔ شاید یہ پنڈلی کی تجلی وہی ہو جس کے نچلے حصے (قدم) پر یہ لوگ سجدہ میں روزانہ سردھرا کرتے تھے اور ان کا سر اللہ کے قدموں پر پڑتا تھا۔ اسی لیے اسے ہر شخص پہچان لے گا کہ عادتاً روزانہ اسی تجلی کے سامنے سر بسجود ہوا کرتا تھا اور اس تجلی سے روح نے کافی مناسبت پیدا کر لی تھی..... خلاصہ یہ کہ عوام الناس اگر قدم الہی کا یہاں مشاہدہ نہیں کر سکتے تو یہ بھی نہیں کہ وہ اس قدم اور ساق کو بالکل پہچانتے ہی نہیں ہیں۔

اسی پر مکالمہ الہی اور قرب حق کو بھی قیاس کر لیجئے۔ غرض یہ نماز میں مکالمہ حق اور یہ انتہائی قرب اور یہ مشاہدہ تجلی قدم کوئی استعارہ وتشبیہ نہیں بلکہ واقعہ ہے اور یہی تین چیزیں معراج کی روح ہیں اس لیے ہر مومن کو حقیقتاً روزانہ پانچ مرتبہ نماز میں معراج ہوتی ہے۔

یہاں سے ایک لطیفہ یہ بھی کھلا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ مراتب عبادیت سب ختم تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد کامل تھے اور عبادیت تو واضح اللہ ہی میں رفعت و سر بلند ہوتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بقدر عبادیت ہی رفعت دی گئی۔ یعنی عبادیت انتہائی تھی تو رفعت بھی انتہائی عطا ہوئی۔ جسے معراج کہتے ہیں۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش تک رسائی میسر ہوئی اور پھر اس معراج میں نماز کا ہدیہ عطا ہوا۔ تو اس سے واضح ہوا

کہ نماز کو کچھ عروج و معراج و رفعت اور بلندی سے کافی ربط و مناسبت ہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ جب مطلقاً تواضع اور عبدیت کے لیے رفعت کا ثمرہ ہے اور رفعت و بلندی بقدر تذلل و پستی ملتی ہے تو نماز میں تو آدمی اپنی ذلت کی انتہا کر دیتا ہے، اس لیے نماز کے ذریعہ رفعت کی بھی انتہا ہونی چاہیے۔ اس لیے اگر مطلق تواضع و عبدیت سے مطلقاً رفعت ملتی ہے تو نماز جیسی انتہائی تواضع و عبدیت سے رفعت بھی انتہائی ملنی چاہیے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس جبکہ تذلل اللہ میں انتہائی درجہ رکھتی تھی تو معراج بھی انتہائی ہوئی اور اوپر سے نماز میسر ہوئی تاکہ تذلل اللہ اور بڑھتا جائے تو مقامات رفعت و عروج بھی اور ترقی کرتے جائیں، اس سے واضح ہوا کہ نماز کی ابتداء میں بھی عروج و معراج ہے۔ اور انتہاء میں بھی عروج و معراج ہے اور نماز کو دو طرفہ معراجوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس بناء پر اگر بقدر قابلیت و استعداد ہر مسلمان کو نماز میں عروج نصیب ہو اور روحانی طور پر نماز میں اسے معراج نصیب ہوا کرے تو یہ نماز کا ایک طبعی خاصہ اور ناقابلِ تعجب بات ہوگی۔

چنانچہ اس حقیقت کو کسی قدر صاف لفظوں میں حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نماز کو دو طرفہ عروج و معراج سے نہ صرف مناسبت ہی ہے بلکہ اس کا اثر ہی معراج ہے اور نہ صرف پیغمبر ہی کے لیے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل میں ہر ایک نمازی مسلمان کے لیے۔ پھر نماز کو اس سے نرالے ڈھنگ سے فرض کر دیئے جانے کے بعد نماز کا عملی اسوہ قائم کرنے کا بھی نرالا ہی ڈھنگ یہ اختیار کیا گیا کہ ہر عبادت فرض ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب منور کی رہنمائی اور حق تعالیٰ کے الہام سے اس کا عملی نمونہ خود قائم فرمایا اور امت کو وہ عبادت کر کے دکھلا دی تاکہ دنیا اس کی عملی شکل کو پہچان لے اور اس کے عملی گوشوں کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے سمجھ لے۔ لیکن نماز کے بارہ میں یہ صورت کافی نہیں سمجھی گئی، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی نماز کا ایک نمونہ لا کر رکھا گیا تاکہ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عملاً سمجھا تھا ویسے ہی رجال غیب کے عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہر گوشہ عمل کو محفوظ فرمالیں اور اس میں کسی ادنیٰ لغزش کا احتمال نہ رہے۔

چنانچہ کسی عبادت کو کر کے دکھلانے کے لیے فرشتے نہیں بھیجے گئے لیکن نماز کی عبادت کو کر کے دکھلانے نیز اس کے اوقات کی تحدید کرنے کے لیے سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دو دن تک دنیا میں بھیجا گیا جنہوں نے اوقات نماز کی تخصیص کے لیے اس کے اوقات کا اول و آخر عملاً مشخص کر کے دکھلایا۔ جیسا کہ احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ عند اللہ اس عبادت کی کس درجہ اہمیت تھی، گویا حضرت جبرئیل پورے اسلام کا توحی کے ذریعہ محض علم ہی لے کر دنیا میں آئے مگر نماز کا پورا عمل اور پورے اوقات کی تحدیدات بھی دے کر بھیجے گئے کہ اس کا علم براہ راست حق تعالیٰ نے شب معراج میں عطا فرمادیا تھا اس کو لے کر آنے کی ضرورت ہی نہ تھی جس سے نماز کا اہتمام شان واضح ہے کہ تعلیم اس کی براہ راست حق تعالیٰ دیں بیت نبوت میں نہیں بلکہ اپنے گھر عرش پر بلا کر دیں۔ اور عمل

اس کا سید المقرئین جبرائیل علیہ السلام کے ہاتھ بھیجیں، ظاہر ہے کہ ایسی عبادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کس درجہ تک وجہ تسلی ہو سکتی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ. ① ”میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔“ اور اس لیے صرف نمازی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر کوئی شخص دن میں پانچ مرتبہ نہر میں غسل کرے جو اس کے دروازے کے سامنے بہ رہی ہو تو کیا اس کے بدن پر میل پچیل باقی رہ سکتا ہے؟ عرض کیا گیا، ہرگز نہیں! فرمایا کہ نماز درحقیقت روحانی غسل ہے جو دن میں پانچ مرتبہ ہوتا ہے تو اس کے بعد روح میں معاصی کا میل پچیل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا کہ: الصَّلَاةُ كَفَّارَةٌ ② ایک نماز دوسری نماز تک کے درمیانی گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

اور جبکہ یہ نماز اس درجہ کی اہم عبادت تھی کہ اس کے سلسلہ میں براہ راست حق تعالیٰ کا یہ اہتمام، ملائکہ کی مساعی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عروج اور اس کے علم و عمل دونوں کے لیے دوڑ دھوپ ہوئی۔ وہ اسلام کا مرکزی نقطہ تھی اور بلاشبہ تھی کہ اسلام کا موضوع عبادت ہے اور عبادات کا فرد کامل نماز ہے۔ تو پھر ضرور تھا کہ اس مرکزی نقطہ کے لیے اسلام کا کوئی حسی مرکز قائم ہو جو پورے اسلام کا حسی شعار ہو۔ جیسا کہ نماز اس کا عملی شعار ہے۔ تو یہیں سے کعبہ کی بنیاد نماز ہی کے لیے رکھی گئی جس کا نام مسجد حرام ہے۔ مسجد کے معنی سجدہ گاہ کے ہیں اور سجدہ مکان کا اصل مقصود ہے اس لیے مسجد حرام بیت اللہ کی بنیاد فی الحقیقت نماز ہی کے لیے ڈالی گئی اگر اس کے ارد گرد طواف ہوتا ہے تو طواف میں بھی یہ اہمیت اسی لیے آئی ہے کہ وہ حکم میں نماز کے ہے، چنانچہ حدیث میں صراحتہً فرمایا گیا ہے کہ طواف بھی حکماً نماز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس حکمی نماز میں سلام و کلام جائز ہے، اصل صلوة میں جائز نہیں۔

بہر حال بیت اللہ کی بنیاد کی غرض و غایت اگر طواف کو بھی رکھا جائے تو وہ بھی چونکہ حکماً صلوة ہی ہے۔ اس لیے اس کے واسطے سے بھی مسجد حرام کی بنیاد نماز ہی کے لیے رہتی ہے۔ غرض اس مرکزی عمل کے لیے جگہ بھی مرکزی بنائی گئی ہے کہ جیسے نماز کی طرف ہر مخلوق کا رجوع ہے۔ ایسے ہی نماز حقیقی و حکمی کی خاطر اس بیت عتیق کی طرف بھی سارے ہی عالم کا رجوع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کے اس کے ارد گرد اپنی اولاد کو آباد کرنے کی غرض و غایت صرف نماز ظاہر فرمائی ہے۔ اور صرف نماز ہی کے ذریعہ سے اولاد کی مقبولیت چاہی جس کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں نقل فرمادیا ہے۔ ارشاد حق ہے: رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْنِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ ③ ”اور آخر میں پھر

① المعجم الصغير للطبرانی، باب الفاء، من اسمه الفضل ج: ۲، ص: ۳۷۲.

② مسند احمد، مسند ابی ہریرۃ ج: ۲۱، ص: ۲۱۵. ③ پارہ: ۱۳، سورۃ: ابراہیم، الآیۃ: ۳۷.

مستقلاً جو دعائے ہے وہ صرف یہی ہے کہ مجھے اور میری اولاد کو نمازی بنادیا جائے۔“

غرض ابوالانبیاء سے لے کر خاتم الانبیاء علیہ السلام تک اور جبرئیل علیہ السلام سے لے کر عام فرشتوں تک نماز کا ایک خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ نماز کے لیے مساجد کی تعمیر الگ ہو رہی ہے۔ نماز کے لیے شہر الگ بسائے جا رہے ہیں، نماز کے لیے انبیاء علیہ السلام التجائیں کر رہے ہیں۔

غرض دین کا اول و آخر اور عالم کا مقصود واحد نماز ہی نماز نظر آتی ہے۔ اور تو اور انتہائی بات یہ ہے کہ نماز سے حق تعالیٰ نے بھی اپنے کو مستثنیٰ نہیں رکھا۔ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ اس کی صلوٰۃ کے معنی عیاذاً باللہ تدلل کے نہیں ہیں کہ وہ ہر عیب سے پاک اور ہر احتیاج و ذلت سے منزہ و مقدس ہے، وہاں صلوٰۃ کے معنی انزال رحمت ہی کے ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ لیکن بہر حال عنوان ہی کے درجہ میں سہی، اللہ نے اپنے کو صائم یا مزمی یا حاجی نہیں فرمایا مگر مصلیٰ منور فرمایا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ﴾ ① خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں جامعیت انتہائی ہے جمعیت بھی اعلیٰ ترین ہے اور اجتماعیت بھی فوق العادت ہے اور اس لیے اس میں تہذیب نفس بھی اکمل ترین ہے۔ تدبیر منزل کے اصول بھی بہترین انداز سے جمع ہیں اور سیاست مدن کے قواعد و مقاصد بھی انتہائی کمال کے ساتھ جمع ہیں جس سے آدمی مہذب بن کر اپنی خانگی اور شہری زندگی کا نظام درست کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی عبادات ادا کرنے سے انسان میں تہذیب نفس کے ذریعہ خدائی کمالات اجاگر ہوتے ہیں اور وہ خدا کے ان کمالاتی نمونوں کی وجہ سے اس قابل بنتا ہے کہ جو کام خدا کا اپنی مخلوق کے ساتھ یعنی ان پر رحم و کرم اور شفقت کر کے ان کا دینی و دنیوی نظم درست فرمانا اور ان کی ظاہری و باطنی اور مادی و روحانی تربیت کر کے انہیں حد کمال پر پہنچانا۔ وہی کام ان خدائی نمونوں کے جامع ہونے کی حیثیت سے انسان کا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ خود صالح بن کر دوسروں کو صالح بنائے ان کا نظام تہذیب و تمدن درست کرے اور ان پر قانون الہی کا کنٹرول کرے، انہیں خدائی حکومت کی وفادار رعایا بنائے اور اس کی شہنشاہی کا ڈنکا دنیا میں بجا دے۔ جس سے واضح ہوا کہ نماز ہی کے ذریعہ آدمی عبادت الہی کا فریضہ بھی ادا کر سکتا ہے اور نماز ہی کے ذریعہ آدمی خلافت الہی کا مقصد بھی پورا کر سکتا ہے ہر قرن اول اس صلاح و اصلاح کو لے کر اٹھا جو نماز کی برکت سے ان میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے فقیری میں بادشاہتیں کیں اور بادشاہتوں میں فقری کی شانیں دکھائیں۔ یعنی بادشاہتوں کے وقت تو ان کی نماز سے پیدا شدہ تواضع نہیں جاتی تھی اور تواضع و غنائے نفس کے وقت ان کی نماز سے پیدا شدہ اجتماعیت اور تنظیم ملت فنا نہیں ہوتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور کندھے پر پانی کی مشک ہے اور رعایا کے گھر میں پانی بھرتے پھر

رہے ہیں۔ عرض کیا گیا کہ امیر المؤمنین بیت المال کے کسی خادم کو حکم فرما دیتے۔ فرمایا کہ کل روم کا سفیر میرے پاس آیا تھا اور وہ مجھ سے مرعوب ہوا جس سے میرے نفس میں ایک قسم کا عجب اور خود پسندی کا نزہ پیدا ہوا، اس کا علاج کرتا پھر رہا ہوں، دیکھ جو کہ وہ مسند خلافت پر بھی ہیں مگر خوئے عبادت اور تواضع نفس دامن کی ساتھ ساتھ ہے۔ ایک دن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شب میں گشت کر رہے تھے تاکہ رعیت کے احوال سے باخبر ہوں۔ سڑک پر ایک مکان میں سے گنگناہنے کی آواز آئی کہ کوئی عورت یہ شعر پڑ رہی ہے:

فَوَاللّٰهِ لَوْ لَا اللّٰهُ تُخْشَىٰ عَوَاقِبُهُ
لَزُخْزَخَ عَنْ هَذَا السَّرِيرِ جَوَابُهُ
خدا کی قسم! اگر اللہ کے عذاب کا ڈر نہ ہوتا تو آج اس چار پائی کی چول چول ڈھیلی ہو جاتی یعنی میں کسی کے ساتھ اس چار پائی پر ہم بستری میں مشغول ہوتی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ بے باکانہ شعر سن کر غضبناک ہوئے۔ اور جوش ایمان میں ایک دم بند مکان میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور زور سے فرمایا کہ کون ہے جو اس قسم کا فحش اور منوع شعر پڑ رہا ہے؟ وہ عورت گھبرا گئی مگر جرات کے ساتھ بولی کہ امیر المؤمنین! آپ مجھے تو کہہ رہے ہیں کہ میں نے خلاف شریعت اقدام کیا لیکن آپ خود اپنے کو نہیں دیکھتے کہ اس وقت کھڑے کھڑے تین باتیں خلاف شریعت کی ہیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور فرمایا، میں نے کیا کیا؟ اس نے کہا سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ اللہ کا حکم ہے: (غالباً یہ دو واقعے مخلوط ہو چکے ہیں۔ حضرت عمر کا مکان میں گھسنے کا واقعہ کسی اور شخص کے ساتھ پیش آیا تھا، دیکھیے حیاۃ الصحابہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ①
آپ نے نہ استیذان کیا نہ سلام کر کے ہی گھر میں داخل ہوئے (دوسری بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ:
وَأَتُوا النِّبُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ② اور آپ دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہوئے آپ کو اس کا کیا حق تھا، تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: وَلَا تَجَسَّسُوا ③ اور آپ نے گھر میں گھس کر خصوصی طور پر اسرار کا تجسس کیا۔ اور ایک گھر میں پڑی ہوئی عورت کے مخفی احوال پر مطلع ہونا چاہا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہیں کھڑے کھڑے رو پڑے اور اس عورت سے معافی چاہی، واپس ہوئے اور تمام رات استغفار میں مشغول رہے، صبح ہوتے ہی اس عورت کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ اب بحیثیت امیر المؤمنین کے میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ وہ شعر تو نے کیوں پڑھا، جس سے بے حیائی کی بو آ رہی تھی؟ اس نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین میں نو جوان ہوں اور شادی کو ابھی ایک ماہ گزرا ہے۔ میرا خاوند آپ کی فوج میں جہاد پر گیا ہوا ہے۔ اپنے جوش جوانی اور اس کے فراق میں بے ساختہ یہ اشعار زبان پر جاری تھے۔ ورنہ الحمد للہ زنا اور بدکاری سے پاک ہوں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اپنی بیوی سے جا کر پوچھا کہ جوان عورت خاوند سے کتنے دن صبر کر سکتی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تین ماہ، اسی وقت امیر المؤمنین نے حکم فرمایا کہ فوج میں

① پارہ: ۱۸، سورۃ: النور، الآیۃ: ۲۷۔ ② پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹۔ ③ پارہ: ۲۶، سورۃ: الحجرات، الآیۃ: ۹۲۔

کوئی شخص تین ماہ سے زائد نہ روکا جائے، تین ماہ ہوتے ہی اسے رخصت دی جائے اور اس کی جگہ دوسرا پہنچ جائے۔ اس واقعہ سے یہ واضح ہے کہ ان پاک باز افراد اور مقدس حضرات کے ہاتھوں امارت و خلافت کے فرائض بھی انجام پارہے ہیں کہ رعایا کی تربیت اور ان کے اخلاق کی نگہداشت خود امیر المؤمنین راتوں رات گھوم کر فرما رہے ہیں جو اجتماعی زندگی کا اس المال ہے کہ ایک غریب عورت تک پر شفقت ایسی ہی مبذول ہے جیسے قوم کے ایک بڑے سے بڑے فرد پر ہو سکتی تھی، جس سے شفقت علی الخلق واضح ہے مگر ساتھ ہی عبدیت کا عالم یہ ہے کہ اسی عورت کے ڈانٹنے پر رو بھی رہے ہیں اور اس سے معافی چاہ رہے ہیں۔ اور معذرت کر کے رخصت ہو رہے ہیں جو جامعیت احوال کی انتہاء ہے کہ نہ دوسروں کو بھول رہے ہیں نہ اپنے کو اور حالت مقتضاً کا حق ادا کر رہے ہیں۔ پھر عبادت کا یہ عالم ہے کہ پوری رات کھڑے ہو کر استغفار اور توبہ میں مصروف ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی تین نافرمانیاں کیں۔ حالانکہ وہ عصیان نہ تھا۔ اور فرائض کے سلسلہ میں امیر کو تفتیش اسرار کا حق حاصل ہے جبکہ صلاح خلق پیش نظر ہو، مگر اپنے بلند مراتب کے لحاظ سے اسے گناہ ہی سمجھ رہے۔ اور رات بھر توبہ و زاری میں بھی مصروف ہیں جو جمعیت خاطر کا اعلیٰ مقام ہے۔ پس اجتماعیت اور جمعیت تینوں مقامات ایک دم موجود اور زیر عمل ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم! جمیع میں یہ کیفیت اسی تعلق مع اللہ نے پیدا کی تھی جس کا مظہر اتم نماز تھا، چنانچہ ان کی ابتداء نماز ہی سے ہوتی ہے اور تمام تمام رات نماز میں رہ کر انہوں نے اپنے صالح نفوس کو مانجا اور صاف کیا تھا۔

بہر حال نماز کی جامعیت دیکھو تو تمام احوال بشری کے مناسب اس میں شرعی حقائق کا اجتماع ہے اور اجتماعیت کو دیکھو تو ہر قسم کے معاملات باہمی کی اصلاح کے اصول اس میں موجود ہیں اور جمعیت کو دیکھو تو اس سے زیادہ دلوں کے گوشوں کو سکون و طمانیت اور حقائق کا نجات اور حقائق الہیات کے علم و معرفت سے بھر دینے والی چیز دوسری نہیں ہے۔ جس سے آدم زاد کی عبادت و نیابت دونوں مکمل ہو جاتی ہیں جو اس کی تخلیق کا اصل مقصد ہے اور ان ہی تینوں مقامات جامعیت، اجتماعیت اور جمعیت اور پھر ان کے دو موالید عبادت و نیابت کی یہ شرح ہے جو تفصیل وار عرض کی گئی ہے۔

یہی ہے نماز کی وہ حقیقت جس کو آپ فلسفہ کے عنوان سے سننا چاہتے تھے لیکن کیا حقیقتاً فلسفہ ہمیں ان حقائق تک پہنچا سکتا ہے؟ کبھی نہیں! فلسفیت نزاد عمل کی رسائی ان امور تک کبھی نہیں ہو سکتی کہ یہ عقل کی پرواز ہی سے بالا چیزیں ہیں۔ اسی لیے کسی فلسفی کے کلام میں آپ اس قسم کے معارف الہیہ ملاحظہ نہیں کر سکتے۔ یہ چیزیں محض انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت، ان پر ایمان لانے کے طفیل اور وحی کے اتباع سے میسر آ سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ معرفت کی چیزیں ہیں تعقل کی چیزیں نہیں۔ ان کا دائرہ عقلیات کا دائرہ نہیں بلکہ وجدانیات کا دائرہ ہے جو سمعیات سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ کہاں میں اور کہاں علی حقائق۔ یہ محض اپنے بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ اس موضوع کے چار حرف زبان پر آ گئے اور انہی کے کلام و فیض کا طفیل ہے کہ ہماری زبان کو

کچھ رسائی مل گئی اور ذہن کو کچھ راستہ ہاتھ آ گیا؟ فَلْيَلْهِ ذَرْهُمُ۔

ہاں پھر نماز کے یہ تمام مقامات بندہ میں کب آتے ہیں جبکہ وہ ذکر اللہ اور یاد حق کی خاطر نماز ادا کرے اور اس کے جزو جزو میں ذکر اللہ رچا ہوا ہو ورنہ اگر ذکر کی بجائے غفلت ہو تو پھر نہ جمیعت آ سکتی ہے نہ جامعیت نہ اجتماعیت، بلکہ غفلت اور قساوت بڑھ جاتی ہے اور غفلت آمیز نماز منہ پر مار دینے کے قابل ہو جاتی ہے چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”بعض نماز پڑھنے والے نماز سے پورا حصہ لے کر لوٹتے ہیں، بعض نصف، بعض پاؤں اور بعض خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں، انہیں کچھ بھی نہیں ملتا، اور وہی ہیں جنہوں نے ذکر کے بجائے غفلت کو نماز میں لحاف کی طرح اپنے اوپر اوڑھ لیا اور فرش کی طرح بچھا لیا ہو“ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل فلسفہ اور حقیقت و غایت ذکر اللہ ہے، پھر ذکر اللہ کی برکت سے یہ تینوں مقامات مذکورہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان تینوں مقامات ہی سے عبادت و خلافت کے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اس لیے شروع میں میں نے یہ آیت پڑھی وَإِقَامِ الصَّلَاةِ لِذِكْرِي ① (نماز قائم کرو میری یاد کے لیے) جس سے ذکر اللہ کا روح صلوة، حقیقت صلوة، منشاء برکاتہ صلوة۔ اور مرکز آثار صلوة ہونا واضح ہو جاتا ہے مگر یہ ذکر اللہ کی روح نماز میں کب پیدا ہوتی ہے؟ اس وقت جبکہ نماز کو اس کی حقیقی ہیئت و کیفیت کے ساتھ ادا کی جائے۔ اس کے آداب و شروط اور سنن و واجبات کی مکاحقہ رعایت کی جائے۔ یہ چیز محض فعل صلوة سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اقامت کے معنی نماز کو درست کر کے پڑھنے کے ہیں۔ اور درستی کی حقیقت وہی استیفاء و شروط اور اقامت حدود ہے، اسی لیے قرآن حکیم نے آیت مذکورہ میں یوں نہیں فرمایا کہ صَلِّ لِذِكْرِي بلکہ فرمایا ﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ جس کا حاصل وہی ہے کہ نماز میں مگر میں مت مارو، بلکہ اس کے آداب و سنن اور واجبات و فرائض کا حق ادا کرو۔ اس کے سنن و مستحبات کی رعایت کر کے پڑھو، تاکہ اس کے حقیقی ثمرات اس پر مرتب ہوں، پس خلاصہ یہ نکلا کہ اقامت صلوة پر ذکر اللہ موقوف ہے اور ذکر اللہ پر یہ تین مقامات معلق ہیں، اور ان تین مقامات پر خلقت آدم کے دو مقاصد عبادت و خلافت مبنی۔ اگر اقامت صلوة نہیں اور اس میں ذکر اللہ نہیں تو جمیعت جامعیت اجتماعیت کچھ بھی نہیں اور جب یہ تینوں چیزیں نہیں تو عبادت و خلافت نہیں۔ اس لیے نماز کی اصل اساس جس پر اس کی یہ ساری عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے، جو پورے اسلام کے ہم پلہ ہے محض ذکر اللہ ہے۔ اگر فی الحقیقت نماز اس روح کو لیے ہوئے ادا ہو تو اس کا اثر اس لیے ہم پر ہی نہیں غیر اقوام پر بھی پڑتا ہے، میں نے ایک ہندو سے کہا کہ میاں تم لوگ مساجد کے سامنے پلجہ وغیرہ پر مسلمانوں سے لڑتے ہو اور چاہتے ہو کہ مساجد کے آگے باجے زور شور کے ساتھ لے جاؤ کیا تم اس معقول بات کو نہیں سمجھتے کہ نماز عبادت الہی ہے مخلوق کو ستانا نہیں ہے؟ پھر کیوں اس پاک چیز کو تم نے جھگڑے اور فساد کا حیلہ بنا رکھا ہے؟ اس کی تو حرمت ہر مذہبی انسان کو کرنی چاہئے۔ اس نے جواب دیا کہ میں کٹ گیا اور ندامت سے بجز

سکوت اختیار کرنے کے اور کچھ نہ کر سکا۔ اس ہندو نے کہا کہ مولوی صاحب نمازی رہے کہاں ہیں اگر گچی نمازیں پڑھنے والے ہوں تو ہمارے گھر بھی ان کے لیے حاضر ہیں۔ اور کس کی مجال ہے کہ بے حرمتی کر سکے مگر اب تو ہر چیز سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے رہ گئے ہیں۔ دین سے اللہ کے نام سے، نماز کے اسم سے، اسلام کے لفظ سے اپنی اغراض پورے کرنے والے رہ گئے ہیں اس لیے دوسری قوموں کا معاملہ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی ہو گیا جیسے وہ ہیں۔ حقیقتاً اس نے صحیح جواب دیا اور مجھے سکت ہونے کے سوا اور کچھ نہیں پڑا، اگر گچی نماز والے سچے مسلمان ہوں تو اللہ اکبر! غیر اقوام تک پر رعب پڑتا ہے۔ جب کہ نماز شیاطین کو پسپا کر دیتی ہے اور ان سے جنگ کرتی ہے۔ تو شیاطین الانس کی اس کے سامنے کیا حقیقت ہے کہ وہ بٹھریں، یا مرعوب نہ ہوں؟

فلکنتہ کے گول میدان میں جب عید کی نماز ہوتی ہے اور غالباً بارہ لاکھ آدمی جمع ہو کر ایک امام کے پیچھے اقتداء کرتے ہیں، تو یہ منظر دیکھنے کے لیے اکثر غیر مسلم بھی جمع ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان تماش بینوں میں مسز سروجی نائیڈو بھی آئی جو اس وقت کے لیڈروں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر حیران تھی اس نے کہا کہ یہ ڈپلن اور یہ نظام کہ لاکھوں کی مرتبہ صفیں صرف ایک لیڈر کی آواز پر حرکت کر رہی ہیں؟ کیا ٹھکانہ ہے اس نظم کا؟ یہ نظم آج کسی قوم کو بھی میسر نہیں جو مسلمانوں کو مذہباً میسر ہے۔ سو یہی حقیقت ہے کہ اس صورتِ صلوٰۃ میں رعب اندازی کے آثار ہیں اگر کہیں اقامتِ صلوٰۃ میسر ہو جائے جس کی روح ذکر اللہ ہو اور مسلمانوں کا اتنا عدد ہو تو کیا دنیا کا نقشہ یہی رہ سکتا ہے جو آج ہے؟

پس میرے خیال میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے صرف ایک نماز اور اس کی یہ عرض کردہ حقیقت و خصوصیت ہی کافی ہے۔ اور غیروں میں بھی کوئی منصف مزاج انسان ہو تو وہ اس اعتراف کے سوا چارہ نہ دیکھے گا۔ کہ یہ عبادت یقیناً منجانب اللہ ہے۔ جس میں اس قسم کی رعایتیں رکھی گئی ہیں کہ کسی انسان کی عقل انہیں کبھی تجویز نہیں کر سکتی۔ اور متفرق طریق پر کچھ کر بھی سکے گی تو سہل متمتع کے طور پر اس مختصر سے عمل میں ان سب کو جمع کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کوئی بھی انسان خواہ وہ کیسا ہی فلسفی ہو اپنی کسی مجوزہ اسکیم میں اتنی لامحدود رعایتیں نہیں رکھ سکتا کہ جن میں دین، دنیا، اخلاق، معاشرت، عبادت، عادت، خلوت، انفرادی سیاست، حکومت، صلاح و اصلاح، اعلا، کلمۃ اللہ اور اسفال کلمۃ کفر۔ سب ہی چیزیں بیک آن جمع ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نماز باجماعت کو دانتوں سے پکڑ لیں۔ کہ اس سے ان شاء اللہ فتن ان کے پاس کھڑے نہ رہیں گے، اور اسی سے پورے اسلام میں گھس جانے کا انہیں راستہ مل جائے گا۔ بس اب میں دعائے توفیق پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. وَ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ.

محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ۲۱ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ

آداب نماز ماخوذ از تبلیغ دین

حق تعالی فرماتا ہے کہ ”میری یاد کے لیے نماز قائم کرو“ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”نماز دین کا ستون ہے“ خوب سمجھ لو کہ تم نماز میں اپنے پروردگار سے باتیں کرتے ہو۔ لہذا دیکھ لیا کرو کہ نماز کیسی پڑھ رہے ہو۔ اور چونکہ اللہ پاک نے اقامۃ صلوٰۃ یعنی نماز کے درست کرنے کا حکم فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز اور نماز کے متعلق تمام ضرورتوں کی پوری رعایت کرو، لہذا نماز میں ان تینوں باتوں کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اول: نماز سے پہلے وضو کی نگہداشت کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو میں جس قدر سنتیں اور مستحبات ہیں ان کو بجا لاؤ اور ہر عضو کے دھونے کے وقت وہ دعا پڑھو جو حدیث میں آئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کپڑوں کا اور وضو کے پانی کا خیال رکھو کہ دونوں پاک ہوں۔ لیکن اس میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ وسوساں تک نوبت پہنچ جائے کیوں کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور شیطان اکثر عبادت کرنے والے نیک بندوں کے اوقات شش و پنج میں ضائع کرتا ہے۔

وضو کرنے اور کپڑوں کی طہارت میں ایک عجیب حکمت جاننا چاہیے کہ نمازی کے کپڑوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کا چھلکا اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کی گری اور مغز۔

ظاہر مقصود مغز ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اس ظاہری پاکی سے بھی قلب کا پاک ہونا اور نورانی بنانا مقصود ہے۔ شاید تم کو یہ شبہ ہو کہ کپڑے کے دھونے سے قلب کس طرح پاک ہو سکتا ہے۔ لہذا سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے ظاہر اور باطن میں ایک خاص تعلق رکھا ہے جس کی وجہ سے ظاہری تعلق کا اثر باطنی طہارت تک ضرور پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب چاہے دیکھ لو کہ جب تم وضو کر کے کھڑے ہوئے۔ ہو تو اپنے قلب میں ایسی صفائی اور انشراح پاتے ہو جو وضو سے پہلے نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ وضو ہی کا اثر ہے جو بدن سے بڑھ کر دل تک پہنچتا ہے۔

نماز پڑھنے سے بہر حال نفع ہے اگرچہ اس کے اسرار کو نہ سمجھے دوم: نماز کے جموعاں وہ سنتیں ہوں یا مستحبات اور ذکر یا تسبیح سب کو اپنے قاعدے پر ادا کرے اور یاد رکھو کہ جس طرح بدن کی ظاہری طہارت نے قلب کی باطنی صفائی میں اثر دکھایا تھا اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نماز کے ارکان کا اثر قلب میں ہوتا ہے اور نورانیت پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح مریض کو دوا پینے سے ضرور نفع ہوتا ہے اگرچہ دوا کے اجزاء کی تاثیروں سے واقف نہ ہو اسی طرح تم کو نماز کے ارکان ادا کرنے سے ضرور نفع پہنچے گا اگرچہ تمہیں اس کے اسرار اور رموز سے واقفیت نہ ہو۔

نماز کی روح اور بدن جاننا چاہیے کہ جاندار مخلوق کی طرح حق تعالیٰ نے نماز کو بھی ایک صورت اور روح

مرحمت فرمائی ہے چنانچہ نماز کی روح تو نیت اور قلب ہے اور قیام و قعود نماز کا بدن ہے اور رکوع و سجود نماز کا سر اور ہاتھ پاؤں ہیں اور جس قدر اذکار و تسبیحات نماز میں ہیں وہ نماز کے آنکھ، کان وغیرہ ہیں اذکار۔ تسبیحات کے معنی کو سمجھنا گویا آنکھ کی بینائی اور کانوں کی قوت سماعت وغیرہ ہے اور نماز کے تمام ارکان کو اطمینان اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا نماز کا حسن یعنی بدن کا سڈول اور رنگ و روغن کا درست ہونا ہے۔

الغرض اس طرح پر نماز کے اجزاء اور ارکان کو بحضور قلب پورا کرنے سے نماز کی ایک حسین و جمیل اور پیاری صورت پیدا ہو جاتی ہے اور نماز میں جو تقرب نمازی کو حق تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے اس کی مثال ایسے سمجھو جیسے کوئی خدمتگار اپنے بادشاہ کی خدمت میں کوئی خوبصورت کنیز ہدیہ پیش کرے اور اس وقت اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل ہو۔ پس اگر تمہاری نماز میں خلوص نہیں ہے تو گویا مردہ اور بے جان کنیز بادشاہ کی نذر کر رہے ہو اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی گستاخی و بے باکی ہے کہ ایسا گستاخ شخص اگر قتل کر دیا جائے تو عجب نہیں۔ اگر نماز میں رکوع و سجدہ نہیں ہے تو گویا لنگڑی لولی اور اپانچ لوٹڑی پیش کرتے ہو..... اور اگر ذکر و تسبیح اس میں نہیں ہے تو گویا لوٹڑی کے آنکھ کان نہیں اور اگر سب کچھ موجود ہے مگر ذکر و تسبیح کے معنی نہیں سمجھے اور نہ دل متوجہ ہوا تو ایسا ہے جیسے کہ اعضاء تو سب موجود ہیں لیکن اس میں حس و حرکت بالکل نہیں، یعنی حلقہ چشم موجود ہے مگر بینائی نہیں ہے اور کان موجود ہیں مگر بہرے ہیں کہ سنائی نہیں دیتا، ہاتھ پاؤں ہیں مگر شل اور بے حس ہیں۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اندھی بہری کنیز شاہی نذرانہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ شاید تمہیں یہ شبہ ہو کہ جب نماز کے فرض اور واجب ادا کر دیئے جاتے ہیں تو علمائے شریعت اس نماز کے صحیح ہو جانے کا فتویٰ دے دیتے ہیں خواہ معنی سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں اور جب نماز صحیح ہوگئی تو جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا سمجھنا نماز میں ضروری نہیں لہذا سمجھ لو کہ علماء کی مثال طبیب کی سی ہے پس اگر کوئی لوٹڑی اپانچ اور کیسی ہی عیب دار کیوں نہ ہو اگر اس میں روح موجود ہے تو طبیب اس کو دیکھ کر ضرور یہی کہے گا کہ یہ زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔

بلا حضور قلب والی نماز کی صحت پر علماء کا فتویٰ اور شبہ کا جواب..... اسی طرح نماز کی روح اور اعضاء رتبہ کے موجود ہونے سے علماء فتویٰ دے دیں گے کہ نماز صحیح ہے اور فاسد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں طبیب نے اور عالم نے اپنے منصب کے موافق جو کچھ کہا ہے مگر نماز تو شاہی نذرانہ اور سلطانی تقرب حاصل ہونے کی حالت ہے اور اتنا تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عیب دار کنیز اگرچہ زندہ ہے مگر سلطانی نذرانہ پیش کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ ایسی کنیز کا تحفہ پیش کرنا گستاخی ہے اور شاہی عتاب کا موجب ہے۔ اسی طرح اگر ناقص کے ذریعہ سے اللہ کا تقرب چاہو گے تو عجب نہیں کہ پھٹے اکپڑوں کی طرح لوٹادی جائے اور منہ پر پھینک ماری جائے۔

الغرض نماز سے مقصود چونکہ حق تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ لہذا نماز کے سنن اور مستحبات و آداب میں جس قدر بھی کمی ہوگی، اسی قدر احترام و تعظیم میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔

نماز کی روح اور اعضاء..... سوم: نماز کی روح کا زیادہ خیال رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک اخلاص اور حضور قلب قائم رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک جو کام اعضاء سے کرتے ہو ان کا اثر دل میں بھی پیدا کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رکوع میں بدن جھکے تو دل بھی عاجزی کے ساتھ جھک جانا چاہیے اور جب زبان سے اللہ اکبر کہے تو دل میں بھی یہ ہو کہ بے شک اللہ سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ اور جب الحمد للہ پڑھو قلب بھی اللہ کی نعمتوں کے شکر یہ سے لبریز ہو۔ جس وقت زبان سے ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ نکلے تو دل بھی اپنے ذلیل و ضعیف اور محتاج ہونے کا اقرار کرے۔ یعنی قلب میں بھی یہی ہو کہ بے شک بجز خدا کے کسی چیز کا نہ مجھے اختیار ہو نہ کسی دوسرے کو غرض تمام اذکار و تسبیحات اور جملہ ارکان و حالات میں ظاہر و باطن یکساں اور ایک دوسرے کے موافق ہونا چاہیے اور سمجھ لو کہ نامہ اعمال میں نماز وہی لکھی جاتی ہے جو سوچ سمجھ کر پڑھی گئی ہو۔

پس جتنا حصہ بغیر سمجھے ادا ہو گا وہ درج ہو گا ہاں یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں پوری طرح حضور قلب قائم رکھنے میں تم کو بہت دشواری معلوم ہوگی لیکن اگر عادت ڈالو گے تو رفتہ رفتہ ضرور عادت ہو جائے گی۔ اس لیے اس کی طرف توجہ کرو اور اس توجہ کو آہستہ آہستہ بڑھاؤ مثلاً اگر تمہیں چار فرض پڑھنے ہوں تو دیکھو کہ اس میں حضور قلب تم کو کس قدر حاصل ہوا۔

حضور قلب حاصل کرنے کی تدبیر..... فرض کرو کہ ساری نماز میں دو رکعت کی برابر تو دل کو توجہ رہی اور دو رکعت کے برابر غفلت رہی تو ان دو رکعتوں کو نماز میں شمار ہی نہ کرو، اور اتنی نفلیں پڑھو کہ جن میں دو رکعت کی برابر حضور قلب حاصل ہو جائے۔

غرض جتنی زیادہ غفلت ہو اسی قدر نفلوں میں زیادتی کرو، حتیٰ کہ اگر دس نفلوں میں چار فرض رکعتوں کا حضور قلب پورا ہو جائے تو امید کرو کہ حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے فراغ کف نقصان ان نفلوں سے پورا فرما دے گا۔ اور اس کی تدارک نوافل سے منظور فرمائے گا۔

تفسیر سورۃ الملک

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

حق تعالیٰ شانہ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی ہے۔ کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پر یہ کھیتیاں اپنے طریق پر آگ رہی ہیں۔ پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پر آ رہے ہیں سورج اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔ چاند اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے کونینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرتے پیدا کرتا ہے اس میں اپنی بدکرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے اپنی بادشاہت جتنا چاہتا ہے۔ دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پندی آئے گی تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی۔

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يُهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَبِرَاجَا مُبْتَلِيًّا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. O

تمہید..... پہلے اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کارگزاری ہے وہ حق تعالیٰ شانہ کی صفات کمال ہیں۔ ہر صفت کمال سے جلوہ گر ہیں اور ہر صفت اپنا کام کر رہی ہے، ان میں سے ایک صفت حق تعالیٰ کی ہے ”ملک“ ہونا کہ وہ بادشاہ ہیں، جیسے وہ معبود ہیں۔ جیسے رحمن اور رحیم ہیں اور جیسا کہ قدوس اور سلام اور مومن اور مہمکن ہیں، اسی طرح سے وہ ملک بھی ہیں، بادشاہ بھی ہیں اور ساری کائنات کے، ان کی جیسے اور صفات اس عالم میں جلوہ گر ہیں وہ اپنی اپنی کارگزاری دکھا رہی ہیں۔

خدائی بادشاہت کی جلوہ گری..... اسی طرح سے صفت ملوکیت، بادشاہت کی صفت (ہے) جو کہ جلوہ گر ہے

اس عالم میں، اور ذرہ ذرہ میں اللہ کی حکومت، حکمرانی اور بادشاہی نمایاں ہے اور اس سے ایک نظام قائم ہے۔ یہ نظام اجتماعی فطرت اللہ ہے۔ یعنی کائنات حق تعالیٰ نے جو بنائی اور اس کو چلایا عیاذاً باللہ کوئی بد نظمی سے نہیں چل رہا۔ بلکہ ایک نہایت ہی محکم نظام ہے اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اس نظام کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک چیز بھی اپنے نظم سے نہیں ہٹ سکتی۔

نظام تکوین فرق اتنا ہے کہ ایک نظام ہے تکوینی جس کا تعلق اللہ کے افعال سے ہے یہ نظام اس قدر محکم ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً اس کائنات میں اللہ نے سورج پیدا فرمایا، روشنی کے لیے اس کی ایک حرکت قائم رکھی اس حرکت سے رات اور دن بنتے ہیں اور پھر رات اور دن کے مجموعے سے مہینے بنتے ہیں اور مہینوں کی ایک خاص تعداد سے سال بنتے ہیں جس سے ہم سن اور مہینے اور دن گھنٹے متعین کرتے ہیں تاکہ ہمارے جتنے کاروبار ہیں یہ اس نظم کے اندر بندھے رہیں اور ضبط و انتظام کے ساتھ ہماری زندگی گزرے۔

اس سورج کی حرکت میں اور دن رات بنانے میں کبھی کوئی ادنیٰ فرق نہیں پڑا۔ یہ اللہ نے ایسی گھڑی بنائی ہے کہ جب اسے چاہی دی ہے دوبارہ کبھی چاہی دینے کے ضرورت نہیں پیش آئی۔ نہ اس گھڑی کی بال کمائی کبھی گزرتی ہے نہ کبھی اس میں مرمت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ گھٹا اور بڑھادیں۔ ایک سلسلے کے ساتھ نظام عالم چل رہا ہے۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الْاَيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ① ”نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ کوئی جلدی کر بیٹھے“ چاند کو جا پکڑے، نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ ذرا آگے تو بڑھ کر دن پر قبضہ کر لے۔“

نظام الاوقات دن اپنے وقت پہ آ رہا ہے۔ رات اپنے وقت پہ، پھر ان رات اور دن سے یہ زمانہ بن رہا ہے، موسم بن رہے ہیں۔ یہ موسم اپنی اپنی جگہ سب محکم اور استوار ہیں، گرمی اپنے وقت پہ آئے گی۔ سردی اپنے وقت پہ ہے، برسات اپنے وقت پہ ہے، پھر ہر موسم سے متعلق جو پھل اور پھول اور دانے ہیں وہ اپنے ہی وقت پر نکل رہے ہیں۔ بہت سے پھل ہیں جو کہ برسات کے ہیں۔ بہت سے ہیں جو سردیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے ہیں جو گرمیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے اپنے وقت پر آگ رہے ہیں اور نکل رہے ہیں، لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

تقسیم اوقات اسی طرح سے دن بنایا تاکہ ہمارے کاروبار چلیں، تو دن کی روشنی میں ہم اپنے کاروبار چلا رہے ہیں، تجارت کے زراعت کے کارخانے داری کے اور چونکہ انسان کی قوت محدود ہے وہ خرچ ہونے سے گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ اس لیے تعب اور تھکان بھی پیدا ہوتا ہے کہ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو رات کا وقت رکھا اور اس کو فرمایا: وَجَعَلَ الْاَيْلُ مَسْكَنًا ② ”رات کو ہم نے سکون کا ذریعہ بنایا۔“

کہ اس میں تھکے ماندے آرام کریں اور جو سو رہے ہیں وہ پھر اگلے دن کے لیے تازہ دم ہو کر کھڑے

ہو جائیں اور اپنے کاروبار میں لگیں۔

حکمت اوقات..... تو رات کو سکون کے لیے رکھا، دن میں بھی پانچ چھ گھنٹے کام کر کے طبعاً آدمی تھک جاتا ہے تو وقت نہار دن کا بیچ کا حصہ قیلولہ کے لیے رکھا اور اسے سنت قرار دیا گیا۔

بلکہ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ دن کے بارہ بجے جب آدمی سوتا ہے تو اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ آج کے تمدن میں بارہ بجے کا قیلولہ ہی باقی نہیں آج ٹھیک بارہ اور ایک بجے کھانا کھاتے ہیں، ظہر کے وقت پھر قیلولہ کا وقت تو گزر جاتا ہے کھانے کے انتظار میں اور کھانے کا وقت آتا ہے تو اس کا اثر کام پر پڑتا ہے ظہر اور عصر کے درمیان میں جو کام کر سکتے ہیں اس میں فرق پڑے گا۔ تو غرض جو کھانے کا وقت تھا وہ انتظار میں گزرا، جو کام کا وقت تھا وہ کھانے میں گزرا اور اس کے بعد جو آگے کام کا وقت تھا یا بے کاری میں گزرا، یا تعب اور تکان میں گزرا اور اس واسطے روایت میں فرمادیا کہ بارہ بجے کا وقت ہے سکون کا، اور اس میں آدمی دس منٹ آدھ گھنٹہ بھی اگر قیلولہ کر لے تو نشاط پیدا ہو جاتا ہے طبیعت میں اور جو ایک پسماندگی سی پیدا ہو جاتی ہے تھکن و تعب، وہ نکل جاتا ہے، پھر آدمی بقیہ آدھے دن کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

تو گویا رات رکھی سکون کے لیے اور دن میں بارہ بجے کا وقت رکھا سکون کے لیے..... پھر تین حصوں پر منقسم فرمایا کہ دو حصے دن کے ہیں، وہ کاروبار کے لیے بیچ کا حصہ سکون کے لیے اور رات پوری سکون کے لیے اس رات میں پھر واجب نہیں فرمایا۔

اوقات مقبولہ..... مگر افضلیت اس کی بیان کی، استحباب بیان کیا کہ تہجد پڑھے آدمی کہ رات بھی دو حصوں میں منقسم ہو جائے، ایک حصہ سکون و آرام کا، ایک حصہ طاعت و عبادت کا، اور وہ طاعت و عبادت کا جو رات میں وقت رکھا گیا ہے وہ سب سے زیادہ مقبول وقت ہے۔

حدیث میں فرمادیا ہے کہ آخری تہائی رات میں حق تعالیٰ اترتے ہیں آسمان دنیا پر جیسا اترنا ان کی شان کے لائق ہے۔ وقت تہجد نزول باری تعالیٰ..... وہ اترنا اس طرح کا نہیں ہے کہ جیسے ہم اوپر کے محلے سے نیچے کے محلے میں آجائیں درجہ بدرجہ سیڑھی بہ سیڑھی اترتے ہیں۔ یہ اجسام کے متعلق ہے، حق تعالیٰ شانہ پاک ہیں جسم سے وہ بری و بالا ہیں اس لیے ان کا اترنا انہی کی شان کے مطابق ہے اترنے کا لفظ حقیقت پر محمول ہوگا۔ لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس کیفیت سے اترتے ہیں۔ جیسی ان کی جناب قدوس ہے اسی انداز کا ان کا اترنا بھی ثابت رہا ہے ہم کیفیت نہیں بیان کر سکتے۔ اتنا ہم جانتے ہیں دنیا میں کہ بہت سی چیزوں کی طرف اترنے کی نسبت کی جاتی ہے۔

کیفیت نزول..... مگر ہر ایک کا اترنا اپنی شان کے مطابق ہوتا ہے، اگر آپ یوں کہیں کہ میں پانچویں محلے سے اتر اور نچلے محلے پہ آیا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک سیڑھی ہوتی ہے جس پر درجہ بدرجہ آپ اترتے ہیں، لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ میرے دل میں ایک مضمون اتر آیا تو کیا وہاں مضمون کے لیے بھی سیڑھی لگائی گئی؟ مضمون

ایک لطیف چیز ہے، معنوی چیز ہے، اس معنوی چیز کے اترنے کا طریقہ بھی معنوی ہے، وہ جسمانی نہیں ہو سکتا کہ جسم اترتے ہیں جسمانی سیڑھیوں سے اور معنویات اترتی ہیں معنوی انداز سے۔

آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کی محبت میرے دل میں گھر کر گئی، اتر آئی تو وہ کوئی سیڑھی سے نہیں اترتی، وہ اپنی شان کے مطابق اترتی ہے، جیسے محبت ایک معنوی چیز ہے، ویسے ہی اس کا زینہ بھی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کی ذات وہ ہے کہ جسم سے بھی بری ہے اور پاک اور جس کو آپ روح کہتے ہیں اس سے بھی بری اور پاک روح بھی ان کی پیدا کی ہوئی ہے اور جسم بھی ان کا پیدا کیا ہوا ہے کہ روح اور جسم دونوں محدود چیزیں ہیں اور ہر محدود چیز کچھ نہ کچھ مرکب ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے اور حق تعالیٰ شانہ ترکیب سے بری ہیں، مرکب ہونے سے بھی بری، مجرد، ہونے سے بھی بری، اَلْیَسَّ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ①

ان کی کوئی مثال نہیں کہ بیان کی جاسکے۔ اس لیے کہ مثال جو بھی دے گا ان کے سوا، وہ مخلوق ہوگی اور خالق اور مخلوق میں زمین اور آسمان سے بھی لاکھوں گنا زیادہ فرق ہے تو ان کا مثل تو کوئی نہیں ہو سکتا، مثال البتہ ہو سکتی ہے، لیکن اگر کچھ سمجھا جائے مگر وہ مثال بھی محض فہم کے قریب لانے کے لیے بولی جاتی ہے مثال پوری طرح ان پر منطبق نہیں ہو سکتی، وہ ہر مثل سے بری، مثال سے بری ہیں تو بہر حال حق تعالیٰ شانہ کی ذات منزہ اور مقدس ہے، ان کا اترنا آسمان دنیا پر ان ہی کی شان کے مطابق ہے جس کو ہم نہیں جانتے، نہ ہم اس کیفیت کو بیان کر سکتے ہیں، لیکن حاصل یہ کہ اترتے ہیں اور پھر یہی نہیں کہ اتر آتے ہیں آسمان دنیا پر بلکہ انتہائی رحمت اور شفقت سے۔

مقصد نزول..... حدیث میں ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلا نا بھی انہی کی شان کے لائق ہے جیسا کہ ان کی جناب کے مناسب ہے اور فرمایا کہ دونوں ہاتھ کھول کر پھیلا کر فرماتے ہیں کہ اَنَا الْمَلِکُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَطْلُبُ مِنْهُ میں بادشاہ ہوں، کوئی ہے مانگنے والا مجھ سے اَنَا الرَّزَّاقُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَرْزِقُ مِنْهُ ② میں رازق ہوں، رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق کا طلبگار اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَغْفِرُ مِنْهُ میں بخشنے والا ہوں کوئی ہے بخشش مانگنے والا، پھر خود فرمایا کرتے ہیں کہ مانگو مجھ سے اور گویا جھجھکتے ہیں سونے والوں کہ کوئی ہے مانگنے والا، کوئی ہے پکارنے والا، پھر ایک تو یہ کہ بادشاہ کی ڈیوڑھی پر آپ خود حاضر ہوں اور جا کر اطلاع کرائیں کہ حاضر ہونا چاہتے ہیں ممکن ہے اجازت ملے، ممکن ہے نہ ملے، محروم واپس آنا پڑے۔ لیکن بادشاہ عالمین خود آتے ہیں اتر کر آپ کی طرف عرش عظیم سے اتر کر آسمان دنیا پر اور یہ آسمان دنیا آپ کی چھت ہے اس دنیا کی جس کے اوپر اور آسمان ہیں سب سے نیچے آسمان ہے یہ آسمان دنیا، آسمان و دنیا.....

یہ اس لیے ہی کہلاتا ہے کہ دنیا کی چھت ہے تو گویا آپ کے مکان کی چھت پر آ کر آواز دیتے ہیں کہ سونے والو! کوئی ہے مانگنے والا۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں گے رہو منزل ہی نہیں
تو ایک تو یہ کہ ہم سوال کریں تو کچھ عطا فرمائیں وہ خود سوال فرماتے ہیں کہ کوئی مانگنے والا ہو تو مانگے، ہم
دینے کے لیے آگئے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس وقت کوئی مانگے گا تو وہ سوال اور دعا خالی نہیں جاسکتی، رایگانہ نہیں جائے
گی۔ کیوں کہ بادشاہ کہہ کر دعا منگوار ہے ہیں آپ سے سوال کر رہے ہیں خود سوال کرائیں پھر محروم کر دیں اسے
عقل قبول نہیں کرتی اس واسطے یہ وقت خاص مقبولیت کا ہوتا ہے۔ اس وقت جو مانگا جائے ملتا ہے۔

عطا کا وقت حکمت کے مطابق ہے..... باقی کوئی آدمی امتحان لینے کے لیے جائے اللہ میاں کا کہ اچھا میں
مانگ رہا ہوں تو کل کو آٹھ بج کر پانچ منٹ پر مجھ مل جانا چاہیے تو وہ آپ کے پابند نہیں ہیں۔ وہ جیسے دینے والے
ہیں ویسے ہی حکیم بھی ہیں، حکمت کے تحت دیتے ہیں۔ اگر حکمت کا تقاضا ہے کہ فوراً دے دیا جائے، فوراً منہ مانگی
مرا دل جائے گی اور اگر حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ وقفہ کیا جائے تو وقفہ لگتا ہے اس میں اور اگر حکمت کا یہ تقاضہ ہے
کہ وہ چیز نہ دی جائے جو آپ مانگ رہے ہیں اس سے کوئی بڑی چیز دے دی جائے تو پھر وہ دے دیتے ہیں۔ اور
بعد میں آپ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہوا، کسی قبولیت کا وقت تھا میں تو یہی مانگ رہا تھا مجھے تو اس سے زیادہ مل گئی۔ میں
تو پھول مانگنے گیا تھا مجھے پورا باغ ہی مل گیا۔ میں ایک ٹکڑا مانگتا تھا وہاں پوری روٹیوں کا دسترخوان ہی مل گیا۔ تو کبھی
فوراً منہ مانگی مراد ملتی ہے کبھی دیر لگتی ہے اور دیر سے ملتی ہے کبھی وہ چیز نہیں ملتی جو مانگی گئی تھی اس سے بڑھ کر دی ہے۔
یہ حکمت کے تحت ہوتا ہے آپ اپنے نفع نقصان کو نہیں جانتے، اللہ ہی جانتا ہے آپ کے نفع نقصان کو، تو وہ دیتا ہے،
مگر آپ کی مصلحت دیکھ کر۔

اب یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک باپ لکھ پتی ہو اور بیٹا اس سے یوں کہے کہ مجھے سو روپے روزانہ جیب
خرچ کے لیے آپ دیا کرو تو کبھی تو ایسا ہے، کہ باپ نے محبت میں عنایت میں آکر فوراً مقرر کر دیا، روزانہ سو روپے
ملنے لگے لڑکے کو کبھی ایسا ہے کہ وہ مانگ رہا ہے مانگتے مانگتے دو مہینے گزر گئے، لڑکے کے دل میں یہ خیال آیا کہ بس
جی باپ کے دل میں کوئی شفقت نہیں رہی میری طرف سے، نہ وہ محبت باقی رہی، مانگ رہا ہوں دو مہینے ہو گئے کچھ
بھی نہیں ملتا۔ لیکن دو مہینے کے بعد اچانک باپ نے جاری کیا سو روپے ماہوار کا وظیفہ..... تو بیٹے نے کہا کہ میں تو دو
مہینے سے مانگ رہا تھا، دیا اب آپ نے؟.....

باپ کہتا ہے کہ بے وقوف! تو جگر کی بیماری میں مبتلا تھا، جگر بڑھا ہوا تھا، معدہ خراب تھا اگر میں سو روپے روز
دیتا تو تو کھانے اڑانے میں لگتا اور بیماری بڑھ جاتی، اس لیے میں نے روک لیا اور علاج کیا تیرا، بجائے اس کے
کہ سو روپے میں اعلیٰ اعلیٰ چیزیں لے کر کھاتا میں نے کڑی دوائیں پلانا شروع کیں۔ اب دو مہینے میں تیری صحت
قابل اعتماد ہو گئی۔ سو روپے چھوڑ کر تو دو سو روپے روز لے لیا کر، تیرے ہی واسطے کم رہا ہوں میں..... تو بیٹا
ممنون ہو گا کہ واقعی میں اپنی نا تجربہ کاری سے نہیں جانتا تھا کہ مجھے یہ نہ ملنا چاہیے مگر باپ جانتا تھا، اگر اس وقت

دے دیتا تو ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا اب جبکہ مجھے اس نے دیا تو اب میں بھی اطمینان سے سو روپے خرچ کروں گا اور باپ کی خوشی کا باعث بھی ہوگا۔

عطاء کا وقت خود متعین کرنا باعث نقصان ہے..... اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے اور مانگتے مانگتے ایک دو مہینے نہیں چار پانچ ماہ نہیں، دس بیس برس گزر گئے اور بیٹے کے دل میں یقین ہو گیا کہ باپ کے دل میں کوئی شفقت باقی نہیں ہے۔ کروڑ پتی ہے، اگر دو سو روزانہ بھی دے تب بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر نہیں دیتا۔ معلوم ہوا بخیل ہو گیا۔ لیکن دس برس کے بعد باپ نے پچاس ہزار روپے کی تھیلی بھر کر رکھ دی اور یہ کہا کہ تو جا کر جیب میں ڈال، اگر میں تجھے سو روپے دو سو روپے روز دیتا تو کھانے اڑانے میں خرچ کر دیتا، مال ضائع ہوتا اور تیری عادتیں بگڑ جاتیں، پھر فضول خرچی کا عادی ہو جاتا تو عمر بھر یہ لت نہ چھوٹی۔ اب اس دس برس کے اندر تجھے تجربہ پیدا ہو گیا، نفع نقصان کی خبر ہو گئی۔ اس واسطے پچاس ہزار دیتا ہوں تجارت کر لو۔ سو چھوڑ تو پانچ سو روپے روز کمالے گا۔ تیرا اصل مال بھی باقی رہے گا اور نفع میں سینکڑوں روپیہ روزانہ تجھے ملے گا، یہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے کہ سو روپے دو سو روز دیتا اور تو ضائع کر دیتا، تو بیٹا ممنون ہوگا، کہ میں اپنی غلط فہمی سے سمجھ رہا تھا کہ باپ بخیل ہو گیا، مگر وہ تو انتہا سے زیادہ بخشنے والا ہے میں اس دس برس میں اگر سو روپے روز لیتا تو اتنے بیٹھتے اور اب مجھے ایک لاکھ روپیہ مل گیا جو سو روپے میں روز میں نہ پڑتا۔ یہ میرے نفع کے لیے ایسا کیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ بھی اسی ح دیکھتے ہیں کہ اگر بندہ میں بری عادتیں ہیں، گناہ گاریاں ہیں، بدکاری کی عادت پڑی ہوئی ہے تو بعض دفعہ دولت دینے کی بجائے جودی ہوئی ہے وہ بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ عیاشی میں مبتلا ہے تو مفلس ہو گیا اور مانگتا ہے باپ سے باپ نہیں دیتا۔ لیکن دو چار برس میں دھکے کھا کر عیاشیوں کے برے نتیجے سامنے آنے کے بعد اب اس پر منکشف ہوا کہ میں بری زندگی گزار رہا تھا، اس نے توبہ تلائی راستہ درست ہو گیا، اب باپ نے دینا شروع کر دیا کہ اب تیرے ہی لیے ہے جو کچھ ہے مگر اس حالت میں تیرے لیے مضر تھا۔

سرمائے کے جمع اور ظہور کا وقت..... تو میرا مطلب یہ ہے کہ مانگنے کے بعد کبھی وہ فوراً مل جاتا ہے، کبھی دیر لگتی ہے اور کبھی دیر کے باوجود وہ چیز نہیں ملتی اس سے بڑی مل جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمر بھی نہ ملی، مانگتا رہے آدمی عمر گذر گئی۔ لیکن جب انتقال کرے گا تو حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اجر و ثواب کے عظیم ذخیرہ اس کے سامنے لگے ہوئے ہونگے عرض کرے گا کہ: ”اے اللہ! میں نے تو کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کا یہ نتیجہ ہوتا۔“

فرمائیں گے کہ تو مانگتا تھا، تو دعائیں کرتا تھا، تیری دعائیں ہم نے ذخیرہ کر رکھی تھیں تاکہ ہم اس وقت دیں تاکہ ابد الابد تک تیرے لیے نفع کا باعث بنے دنیا تو گزرنی تھی گزر گئی عیش سے گزارتا جب ختم ہو جاتی مصیبت سے گزارا جب ختم ہوئی، لیکن زندگی اصل یہ ہے کہ ہم نے تیرا سرمایہ اس زندگی کے لیے جمع رکھا۔ تو اس وقت یہ کہے گا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میری دعا اس وقت قبول نہ کی، اب جا کر کی، وہاں میں ضائع کر دیتا اپنی عمر کو

بھی، اپنی دولت کو بھی اور یہاں میری عمر بھی دوا می گئی اور میری دولت بھی دوا می بن گئی۔

بلکہ حدیث میں ہے کہ بعض اہل مصیبت حسرت میں ہوں گے اس دن اور کہیں گے جب ان کے سامنے اجر و ثواب کے ڈھیر آئیں گے مصیبتوں کے ثمرہ میں تو وہ کہیں گے کہ: ”اے اللہ! اس سے بڑی بڑی مصیبتیں ہم پر کیوں نہ نازل کیں آپ نے؟ اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ قینچیوں سے ہماری کھالیں کاٹی جاتی۔ جب تھوڑی مصیبتوں پر یہ اجر و ثواب مل رہا ہے تو بڑی مصیبتوں پر معلوم نہیں کیا ملتا۔“

تو بعضوں کو حسرت ہوگی کہ مصیبت کم کیوں پڑی ہمارے اوپر، زیادہ کیوں نہ آئی، اس وقت قدر آئے گی کہ یہ مصائب بھی بڑی نعمتیں تھیں۔ یہ ذریعہ بنادی گئیں ہمارے لیے ترقی درجات کا، آخرت کے درست ہونے کا۔ تو غرض آدمی جب بھی مانگے، مانگنے میں کسر نہ چھوڑے، مگر امتحان نہ لے قدرت کا کہ دیکھو! مانگ رہا ہوں، ملتا ہے یا نہیں ملتا۔

دعا کے وقت قدرت کا امتحان نہ لے..... امتحان لینا گستاخی اور بے ادبی ہے، اس میں ایسا نہ ہو کہ سرے سے دعا ہی رائیگاں کر دی جائے کہ ہم سنتے ہی نہیں ایسے لا ابالی شخص کی دعا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ الدُّعَاءَ مِنْ قَلْبٍ لَا هَ۔ ① ”جو لوہو و لعب میں پڑے ہیں ان کی دعا اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی نہ سنی جاتی۔“ جو مانگ رہا ہے اللہ سے تخلیات میں مبتلا ہے، نہ اخلاص ہے نہ صدق ہے، نہ تضرع اور زاری اور ابہتال ہے کہ متوجہ ہوں، اس کی دعا نہیں قبول کی جاتی۔

اسی طرح سے وہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی جس میں قیدیں اور شرطیں لگائی جائیں کہ اسی وقت ملے، فلاں ہی دن ملے، فلاں موقع پہ ملے۔ فلاں چیز ملے۔ سائل کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بیٹھ بیٹھ کر متعین کرے کہ یہ چیز دیجو، یہ نہ دیجو۔ یہ دعا مانگنا نہیں، یہ تو مشورے دینا ہے اللہ میاں کو کہ جیسے جب آپ دیں تو فلاں چیز دیں، جیسے حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے دعا مانگی کہ: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبَیْضَ فِی الْجَنَّةِ یا اللہ! مجھے جنت میں سفید رنگ کا محل دیجو، واٹ ہال دیجو جو بالکل سفید انڈہ سا ہو۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا دعا ہے کہ اپنی طرف سے قیدیں لگا رہے ہو، سفید اور سرخ اور سبز، تم بنانے والے ہو جنت کے؟ تم بنانے والے ہو درجات کے؟ تمہارا مشورہ چلے گا وہاں؟ وہاں تو ایک کوڑے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، تم قیدیں لگا رہے ہو تو وقت کی قید لگانا یا کسی نوعیت کی قید لگانا یہ بے ادبی اور گستاخی ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت مانگے آدمی اور خوب الحاح سے مانگے، نیچا بن کے مانگے۔

دعا کے وقت استغناء نہیں بلکہ تضرع چاہیے..... اس واسطے کہ اگر یوں مانگنے لگے کہ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِّیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ اِنْ شِئْتَ یا اللہ! مجھے دے دیجئے اگر آپ چاہیں، میری مغفرت کر دیجئے اگر آپ

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ ج ۱۱ ص: ۳۸۳۔

چاہیں۔ تو یہ دعا مانگنا نہیں یہ تو استغناء کا اظہار کرنا ہے۔ سائل تو محتاج ہوتا ہے نہ کُنی، آپ جب یوں کہہ رہے ہیں اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ اِنْ شِئْتَ بخش دیں اگر آپ چاہیں، اس کا مطلب ہے کہ آپ کا دل چاہے تو بخش دیں تو بخش دیں نہیں تو مجھے تو ضرورت ہی نہیں آپ کی مغفرت کی۔ اس میں استغناء نکلتا ہے کہ سائل بھی ہو آدمی اور مستغنی بھی بنے۔ یہ تو اجتماع ضدین ہے۔ اس واسطے دعا مانگنے میں سوائے عجز و انکسار کے، سوائے بندگی کے ابہتال کے اور انتہائی زاری اور تضرع کے، نہ کوئی قید نہ کوئی شرط ہو۔ بس مانگے آدمی۔ اور میں کہتا ہوں کچھ بھی نہ ملے دعا مانگنے کی توفیق ملی۔ دعا بھی تو عبادت ہے۔ یہ تھوڑی چیز ملی کہ دعا منگوادی گئی آدمی سے۔ اَلدُّعَاءُ مَبْعُ الْعِبَادَةِ :- ”دعا مغز اور خلاصہ ہے عبادت کا“۔ ①

اوقات مقبولہ میں غفلت سے احتراز خیر بہر حال یہ بات دور جا پڑے گی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہ آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا! ہم دینے کے لیے تیار ہیں جو خوش قسمت ہیں اور اس وقت جاگتے ہوئے ہوتے ہیں وہ مانگتے ہیں اور منہ مانگی مراد ملتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا۔ اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً قبولیت کی ہوائیں چلتی ہیں تم سب ڈھونڈتے رہو، ایسا نہ ہو کہ وہ ہوا چلے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے سوتے رہو، ان اوقات کو ضائع نہ کرو۔ اور ضائع نہ جانے دو، بلکہ ٹوہ میں لگے رہو کون سا وقت مقبولیت کا ہے۔“

تو کچھ ساعتیں ہوتی ہیں مقبولیت کی، کچھ اوقات ہوتے ہیں قبولیت کے اس میں جب آدمی مانگتا ہے تو مانگنا بھی خود عبادت، عظیم عبادت بنتا ہے اور منہ مانگی مراد بھی ملتی ہے۔ تو یہ کہہ کر وہاں آسمان دنیا پر اترتے ہیں کہ: اَنَّا الْمَلِکُ۔ میں بادشاہ ہوں۔ یعنی آپ کسی رئیس سے مانگ لیں، دو چار روپے دے دے گا، کسی بڑے جاگیردار سے مانگ لیں۔ ممکن ہے سو پچاس ہزار روپے دے دے، لیکن بادشاہ وقت جو پورے ملک کا حاکم ہے اس سے اگر مانگیں اور وہ خود یوں کہے کہ بھلا مانگو مجھ سے تو اندازہ کیجئے، کیا کچھ نہیں دے گا، بادشاہ، اور بادشاہ بھی وہ جو عالموں کا بادشاہ ہو، بادشاہوں کا بادشاہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی کی کنجیاں ہوں وہ اگر یوں کہے کہ مانگو مجھ سے میں دوں گا تو پھر کیا کچھ نہیں ملے گا۔

ماہ رمضان کا امتیازی بدلہ یہی وجہ ہے کہ یہ روزہ جو ہے اس کے جہاں اور ہزاروں فضائل اور برکات ہیں۔ من جملہ ان کے بڑی عظیم برکت اور روزے کی فضیلت یہ بھی ہے کہ روزے کے بارے میں فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ: الصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ ① ”روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا“، یعنی اور طاعتوں اور عبادتوں کا بدلہ تو ضابطہ کا ہے کہ ملائکہ کو حکم دیں گے کہ ضابطہ کی اجرت تقسیم کر دو، ایک عمل کے دس عمل

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، باب منہ ج: ۱۱ ص: ۲۲۱ رقم: ۳۲۹۳۔

② الصحيح لمسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام ج: ۲ ص: ۸۰۷ رقم: ۱۱۵۱۔

ہوں تو دس گنا دے دی۔ لیکن روزے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ روزہ میرا ہے اور میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا۔ یعنی ملائکہ بیچ میں نہیں خود عطا کروں گا روزہ دار کو اس کا اجر اور اس کا ثواب۔ تو روزہ فرمایا کہ میرا ہے۔

یہ اس واسطے فرمایا کہ اور عبادتوں میں امکان ہوتا ہے کہ آدمی دکھلاوے کے لیے کرے، نماز پڑھے یہ دکھلانے کو بڑا عابد زہد آدمی ہے۔ زکوٰۃ دے یہ دکھلانے کے لیے کہ بڑا سخی داتا ہے، لیکن روزے کی کوئی شکل ہی نہیں کہ دکھلائے، وہ تو اللہ ہی کے لیے ہو سکتا ہے اور اگر روزہ رکھ کر آدمی کہتا پھرے کہ جناب میں روزہ دار ہوں تو بجائے عزت کے اور تذلیل ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ بھی کسی پر احسان کیا ہے جو روزہ رکھا ہے جو ڈھول پیٹتا پھر رہا ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہے تو جب تک آدمی زبان سے نہ کہے روزے کا روزہ ہونا معلوم نہیں ہوتا، زبان سے نہ کہے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ اور کہے گا تو اور رسوائی ہوگی، اس لیے خواہ مخواہ دم بخور ہے گا، لیکن یہ ہے کہ روزہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا اور جب روزہ کسی کے آگے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ تو اس میں نہ ریا کاری کا دخل ہے، نہ سناوے کا نہ دکھلاوے کا، نہ شہرت کا۔ یہ تو خاص اللہ ہی کے لیے ہو سکتا ہے، تو چونکہ یہ عبادت خالص اللہ کے لیے ہے اس واسطے فرماتے ہیں کہ جب اس میں ریا کا دخل نہیں، دکھلاوے کا دخل نہیں۔ خالص میرے لیے ہے تو میں ہی اس کا اجر بھی دوں گا یہ ضابطہ کا اجر نہیں ہوگا۔ بادشاہ جب خود بانٹنے کے لیے بیٹھے وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے آپ کی حیثیت کے مطابق نہیں۔ اور اللہ کی جوشان ہے وہ لامحدود ہے تو پھر دے گا بھی اتنا کہ اس کی کوئی حد نہایت نہیں ہوگی..... تو بانٹنا جب خود چاہیں اور فرمائیں کہ میری چیز ہے، میں بانٹوں گا تو وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے، تو جب یہاں اخیر رات میں یہ فرمایا کہ اَنَا الْمَلِکُ میں بادشاہ ہوں۔

مَنْ ذَا الَّذِي يَدْعُنِي؟ ہے کوئی مانگنے والا؟ تو مانگنے والا جب مانگے گا تو اپنی شان کے مطابق اسے دیں گے، آپ کی شان کے مطابق نہیں۔ آپ کتنا ہی مانگیں وہ محدود چیزیں ہوں گی وہ جو دیں گے وہ اپنی شان کے مطابق دیں گے وہ لامحدود ہوں گی، تو برکات کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ بہر حال بادشاہت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر سائل کو دیں، ہر فریادی کی فریادیں اور جب خود کہیں کہ میں سننے کے لیے موجود ہوں۔ کہو، تو پھر ظاہر بات ہے کہ کیا کچھ نہیں ملے گا۔

مظلومیت کے وقت کی بددعاء..... لیکن مظلوم کے بارے میں فرمایا کہ: اَتَّقُوا دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهَا تَحْمِلُ عَلَى الْغَمَامِ يَقُولُ اللَّهُ وَعِزَّتِي وَجَلَالِي۔ ”مظلوم کی بددعاء سے بچو اس لیے کہ اس کی دعا سیدھی جا کر عرش سے ٹکراتی ہے اور پھر اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں جب مظلوم جس پر ظلم ہو رہا ہے وہ ہاتھ اٹھا کر فریاد کرتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں کہ میری عزت اور جلال کی قسم: اَنْصُرْكَ وَلَوْ بَعْدَ حِينٍ۔ میں تیری مدد کروں گا۔ گھبراہٹ مت، خواہ تھوڑا سا وقت لگ جائے حکمت کے تحت۔ ① مایوس مت ہو جانا کہ دیر لگ گئی

① السنن للترمذی، کتاب صفة الجنة، باب ماجاء فی صفة الجنة ونعيمها ج: ۹ ص: ۶۸۔

تھوڑی سی مظلومیت چلے گی مگر پریشان مت ہونا، میں تیری مدد کے لیے پہنچا۔

ضرورتِ خلافت تو بہر حال حق تعالیٰ شانہ ملک ہیں۔ اور ملوکیت کے بہت سے لوازم ہیں۔ اس سورۃ مبارکہ میں اللہ کی شہنشاہی بیان فرمائی گئی ہے، اس شہنشاہی کے لوازم اور اس کے آثار اور طریقے، یہ اس پوری سورت میں ظاہر فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں جب ہم نظام قائم کریں کوئی تو اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق اس نظام کو چلائیں، اس لیے کہ حقیقی معنی میں حکمرانی اور بادشاہت صرف اللہ کا حق ہے انسان کو بادشاہت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

اسی واسطے اسلام میں ملوکیت نہیں رکھی گئی، خلافت رکھی گئی ہے۔ خلافت کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اللہ تعالیٰ ہیں، ان کے نائب بن کر ان کے قانون کو ہم چلا رہے ہیں۔ خود بادشاہ نہیں ہیں۔ اقتدار ان کا ہے۔ ان کے اقتدار کے زیر سایہ ہم چل رہے ہیں۔ نظام ان کا ہے، ان کے نظام کو ہم چلا رہے ہیں، بادشاہی ان کی ہے، ہم ان کی ڈھنڈوری پیٹ رہے ہیں، دنیا میں راج کر رہے ہیں تو ہم خود بادشاہ نہیں ہیں، ہم خود صاحب اقتدار نہیں ہیں، اقتدار اللہ کا ہے۔ اس کو چلانے کے لیے دنیا میں انسان خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے ایسے ظاہری اسماء جن سے کسی اور کے لیے اقتدار مطلق کی بوائی ہو یا ایہام ہی ہوتا ہو اس کو ناپسند سمجھا گیا اسی لیے سب سے زیادہ بغض اور عداوت اللہ کو جس نام سے ہے وہ مَلِکُ الْاَمَلَاک یعنی شہنشاہ کا کوئی لقب اپنے لیے رکھے، کنگ رکھے اور کہے کہ وہ شہنشاہ ہے۔ یہ سب سے زیادہ اللہ کو بغض ہے، اس لیے کہ یہ لقب تو اس کا ہے۔ وہ ہے شہنشاہ، وہ ہے دونوں جہانوں کا بادشاہ۔ تو انسان کے لیے شہنشاہی اور بادشاہت نہیں رکھی گئی، عبادت اور بندگی رکھی گئی ہے اور بندگی یہ ہے کہ اس کے نظام کو اس کا آلہ کار بن کر، اس کا خادم بن کر چلائے، اسے خلیفہ کہیں گے، اسے نائب کہیں گے۔

نظام عالم چلانے کے لیے اوصافِ شاہی تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ شانہ نے اللہ کی بادشاہی کے اصول بیان فرمائے ہیں، اللہ کی شاہی کا نظام ارشاد فرمایا تو نظام بادشاہت میں سب سے پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف کہ بادشاہ کیسا ہونا چاہیے اور حق تعالیٰ شانہ بادشاہ ہیں تو شان کیا ہے، ان کی بادشاہی کی۔ تو بادشاہی کے مناسب کون سی شان ہے حق تعالیٰ کی کہ جس سے بادشاہت انہیں کے لیے سزاوار ہے، دوسرے کے لیے نہیں، تو پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف اور کمالات کہ بادشاہ کس کمال کا ہونا چاہیے۔ وہ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ جب بادشاہ ہے تو اس کی بادشاہت کے لوازم کیا کیا ہیں، کون کون سی چیزیں بادشاہت کے لیے لازم ہیں۔ اس کے بغیر بادشاہت عالم اسباب میں نہیں چلتی۔

تیسرے یہ ہوگا کہ بادشاہت کہ ان لوازم کے آثار کیا ہیں، جس ملک میں بادشاہ، بادشاہی کر رہا ہے تو اس کی بادشاہی کے آثار کیا پڑ رہے ہیں، اچھے پڑ رہے ہیں یا برے پڑ رہے ہیں مخلوق سکون و اطمینان سے ہے یا پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہے، کیا آثار پڑ رہے ہیں؟ ان آثار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ بادشاہت بہت اونچی

ہے اس لیے سکون اور اطمینان ملک کے اندر ہے یا معاذ اللہ! بادشاہ بہت خراب ہے اس لیے کہ ملک میں تو بد نظمی پھیلی ہوئی ہے۔

تو حق تعالیٰ شانہ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پہ کھیتاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں، پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پہ آ رہے ہیں، سورج اپنے وقت پہ نکل رہا ہے، چاند اپنے وقت پہ نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے کونینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرتے پیدا کرتا ہے اس میں اپنی بد کرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے۔ اپنی بادشاہت جتنا چاہتا ہے، دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی، تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی، جب ایک شخص یوں چاہے گا کہ میں بڑا بنوں اور دوسرے چھوٹے رہیں تو دباؤ میں آئے، قہر میں آئے ممکن ہے چھوٹے بن جائیں، لیکن دلوں میں نفرت ہوگی کہ اسے حق کیا ہے ہمارے اوپر حکمرانی کرنے کا؟ جیسے ہم ویسا یہ ہمارے برابر کا ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ مجھے بادشاہ مانو، تو گوارہ نہیں کرے گی مخلوق، مخلوق کرے گی تو دباؤ میں، اور اگر یوں کہے کہ مجھے بادشاہ نہ تو بادشاہ ہم سب کا بادشاہ اللہ ہے۔ قانون اس کا ہے میں تو چلانے والا ہوں، سب کے دلوں میں عظمت بیٹھ جائے گی، تو اپنی جاہ پسندی اپنے اقتدار دوسری مخلوق پر لا نہیں سکتے، لیکن زور دباؤ میں آئے اپنا اقتدار چلاتے ہیں۔

تو مخلوق فکر میں رہتی ہے کہ کوئی موقع پڑے تو اس کے اقتدار کو ختم کر دو، پلٹ دو، اس نے پارٹیاں بنالیں، اس نے ایجنسی ٹیشن شروع کیا، اس نے پبلک کو ہمارا کیا، بغاوت پھیلانی تو یہ جو بد نظمی ملک میں ہوتی ہے، اس کا سبب ہم ہیں، اللہ کی حکومت سبب نہیں۔ جہاں بلا واسطہ اس کی حکومت ہے اس میں تل برابر فرق نہیں ہاں! حکومت تمہارے واسطے سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ تمہاری عزت قائم ہو اور وہاں ہم اپنی ذاتی عزت سمجھ کر اس نظام کو بگاڑتے ہیں۔ وہیں سے بد نظمی پیدا ہوتی ہے تو بد نظمی کا ذمہ دہر دنیا میں انسان ہے جہاں حق تعالیٰ شانہ نہیں، ان کی بلا واسطہ بادشاہت میں ذرہ برابر فرق نہیں۔

جہاں تمہیں واسطہ بنایا وہاں تم نے اپنی کھدورتوں کو داخل کر دیا۔ تو نظام بگڑ جاتا ہے اس لیے اس سورت میں اصول بیان فرمائے گئے ہیں کہ نظام عالم کن اصول پر چلنا چاہیے۔ وہی اصول ہیں جو اللہ کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ انہی پر چلو گے، تو تمہارا نظام درست رہے گا۔ ان سے ہٹو گے درست نہیں ہوگا۔

وصف اول..... اس لیے پہلی چیز تو بادشاہ کے اوصاف۔ بادشاہ کے اندر سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قابلیت اور لیاقت ہونی چاہیے۔ کسی جاہل کو آپ بادشاہ بنا کر بیٹھا دیں۔ تو جاہل کی بادشاہت جاہلانہ ہی ہوگی اور ان جاہلانہ

چیزوں کا اثر بڑے گا تو نظم کی بجائے بد نظمی پھیل جائے گی، تو بادشاہت کے اندر خود قابلیت اور کوئی کمال ہونا چاہیے کہ جس کی وجہ سے لوگ بھی اس کے آگے جھکیں اور اس کا کام بھی چلے۔ اور وہ یہ کہ ”خیر“ جو چیز ہے وہ بادشاہ کے اندر ہونی چاہیے، اگر معاذ اللہ وہ شرور کا مجموعہ ہو اور ایسوں کا، وہ برائی پھیلے گی اس واسطے کہ مثل مشہور ہے کہ: **النَّاسُ عَلَى دِينِ مُلُوكِهِمْ**۔ جیسا راجہ ویسی پرچہ، جیسا بادشاہ ویسی رعایا۔ اگر بادشاہ ناہنجاز ہے تو رعایا میں بھی ناہنجاری پیدا ہوگی۔ اگر بادشاہ کے اندر بھلائیاں ہیں تو رعایا میں بھی بھلائیاں پیدا ہوں گی رعایا تو کوشش کرتی ہے کہ بادشاہ کے قریب تر چلے۔

اوصاف شاہی کے قوم میں آثار..... جب جنگ عظیم جاری تھی تو قیصر جرمنی نے تقریر کی اور اس نے تقریر میں چند جملے کہے تھے اس میں کہا تھا کہ اگر دنیا سے ترک مٹ جائیں تو شجاعت اور بہادری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جہاں بھی بہادری پھیلی ہوئی ہے وہ ترکوں کی بہادری کا اثر ہے۔ تو اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ، اور اگر جرمنی مٹ جائیں تو سائنس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (اس زمانے میں اول نمبر پر سائنسی ایجادات میں جرمنی کا ملک تھا۔ امریکا اب بعد میں بنا ہے۔)

تو اس نے کہا کہ اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ... اور اگر جرمنی مٹ جائے تو سائنس کا خاتمہ (اور اگر فرانس مٹ جائے تو عیاشی اور بے حیائی کا خاتمہ ہو جائے گا..... اور اگر انگریز دنیا سے مٹ جائیں تو ڈپلومیسی، مکاری، فریب، دغا بازی ان چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تو ہر قوم کی، ہر حکمران قوم کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور جب وہ قوم حکومت کرتی ہے تو پبلک میں وہ خصوصیت پھیلتی ہیں۔ اگر مکار بادشاہ ہے تو پوری قوم کے اندر مکر و فریب اور چالاک اور بے ایمانی اور غل غفل۔ یہ چیزیں پھیل جائیں گی، اور اگر بادشاہ دیانتدار ہے، متدین ہے تو پوری رعایا کے اندر دیانتداری کا اثر ہوگا۔

رعیت بادشاہ وقت کا ذوق اپناتی ہے..... خلفاء بنی امیہ میں سلیمان بن عبد الملک یہ بہت بڑا اونچے درجے کا خلیفہ ہے اسے نکاح کرنے کا بہت شوق تھا، بہت جوان ہوا بڑا مضبوط تھا، تو شرعی حدود میں نہ رہتا اگر چار سے زیادہ بیک وقت کرتا لہذا چار سے زیادہ بیویاں تو کرتا نہیں تھا، مگر چھ مہینے میں طلاق دی، مہر ادا کیا، ایک اور سے نکاح کر لیا، پھر پانچ مہینے اسے رکھا، طلاق دی، پھر تیسری سے تو سینکڑوں نکاح کیے۔

گویا جائز عیاشی کہنا چاہیے، قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوا، مگر سینکڑوں نکاح کر ڈالے، تو اس زمانے میں امراء جب جمع ہوتے تھے کسی مجلس میں تو پوچھا جاتا تھا کہ آپ کتنے نکاح کر چکے ہیں؟ تو اس نے کہا میں۔ آپ نے کتنے کیے؟ میں پچاس کر چکا ہوں، تیسرے کہتے ہیں۔ میں جناب ساٹھ نکاح کر چکا ہوں ایک صاحب کہتے ہیں میں نے سو نکاح کیے ہیں اب تک، تو اس زمانے میں مابہ انفریبی چیز بن گئی تھی کہ کتنے نکاح کیے، اس لیے کہ بادشاہ کا طریقہ یہی تھا کہ دے نکاح، دے نکاح، دے نکاح۔

تو رعیت کے اندر بھی یہی جذبہ پھیل گیا کہ یہ ہی کوئی بڑی شان و شوکت کی چیز ہے... حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وہ خلیفہ عادل ہیں اور تین سو نفل رات میں روزانہ ان کی ثابت ہیں۔ باقی ان حضرات کے اوقات میں اللہ برکت دیتا ہے، دن بھر تو پبلک کی خدمت میں، مقدمات فیصل کرنے میں، ملک کے تحفظ میں، بقاء میں اور رات کو تین سو نفلیں بھی..... تو کس وقت سوتے ہوں گے، معلوم ہوتا ہے چوبیس گھنٹے عبادت میں ہی گزارتے ہیں، تو تین سو نفلیں رات میں ثابت ہیں..... اس زمانے میں امراء میں فخر کی بات کیا تھی؟ جب کسی مجلس میں جمع ہوئے، آپ رات میں کتنی نفلیں پڑھتے ہیں، انہوں نے کہا میں، آپ کے پڑھتے ہیں، میں تو چالیس پڑھتا ہوں، تیسرا کہتا ہے کہ میں پچاس نفلیں پڑھتا ہوں، میں سو نفلیں پڑھتا ہوں تو فخر کی بات یہ ہو گئی تھی کہ نفلیں زیادہ پڑھی جائیں تو ایک اصول ہے۔ جیسا راجہ ویسی پر جا۔ جیسا بادشاہ ویسی رعیت۔

خیر و برکت والی شاہی..... ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ بادشاہ ہوں تو وہاں تو شر اور برائی کا نشان بھی نہیں۔ اَلْخَيْرُ كُلُّهُ مِنْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ۔ ”ساری خیر و برکت تو اس کی ہے جہاں بھی خیر ہے وہ اس کی ہے، شر اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی۔“ نہ اس کی ذات میں ہے نہ باہر کی شر وہاں تک جاسکتی ہے۔ وہ بری ہے ہر شر سے تو جب خیر مطلق بادشاہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ عالم میں خیر پھیلے گی۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ بادشاہ کے اندر خیر کا غلبہ ہونا چاہیے اور جب اللہ بادشاہ ہے تو وہاں خیر ہی خیر ہے، وہاں شر کا کوئی نشان ہی نہیں، پھر وہ خیر ایسی ہونی چاہیے کہ اپنی ذات ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ نکل کر دوسروں تک بھی پہنچے، اگر اپنی ذات سے ایک شخص بہت باخیر ہے مگر دوسروں کو اس کی خیر سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو دوسروں کے حق میں خیر ہونا نہ ہونا برابر ہوا، لیکن حق تعالیٰ شانہ کی خیر یہ ہے کہ:

پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے ذرے ذرے کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ بنانے والے تو وہ ہیں وجود انہوں نے دیا اور وجود ہی سرچشمہ ہے ساری خیر و برکت کا تو جس کو وجود دیا اس میں خیر پھیلی ہوئی ہے..... تو اللہ کی خیر وہ ہے جو اس کی ذات بھر پور ہے خیر سے، اور ذرے ذرے پر خیر اس کی پھیل رہی ہے، اسی کا نام ہے شریعت کی اصطلاح میں ”برکت“

برکت کا مفہوم..... برکت کہتے ہیں کہ کسی چیز کی خاصیت، بھلائی تو اس میں ہو اور وہ پھیل کر دوسروں تک پہنچے تو کہیں گے وہ شئی مبارک ہے۔ اگر اس میں خیر نہ ہو یا اس میں کوئی اچھا خاصہ نہ ہو اور دوسروں تک نہ جائے تو کہیں گے خیر و برکت کی بات نہیں۔ پانی ہے مثلاً اس کی خاصیت ہے، ٹھنڈک اس لیے کہ ٹھنڈا خود بھی ہے دوسروں کے دلوں میں بھی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے اگر پانی پیس اور ٹھنڈک نہ پہنچے تو کہیں گے کہ محسوس پانی ہے۔ برکت والا پانی وہ ہے جو خود بھی ٹھنڈک ہے اور دوسروں کو بھی پہنچ رہی ہے ہوا کے اندر خیر یہ ہے کہ اس کے میں رطوبت ہے اور خیر یہ ہے کہ جہاں جہاں ہوا پہنچتی ہے رطوبت پہنچتی ہے، اگر ہوا چلے اور رطوبت کے بجائے خشکی پھیل جائے، خشک سالی

کہیں گے بڑی مخوس ہوا چلی اور اپنی خاصیت نہ دکھلائی اس نے۔

تو جس شے میں خیر چھپی ہوئی ہو اور وہ خیر دوسروں تک پہنچ رہی ہو اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو اس کو کہتے ہیں ”برکت“ اس کو ظاہر فرمایا گیا کہ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ برکت والی ذات ہے اللہ کی۔

یعنی وہ ذات ہے کہ ہر خیر اس میں ہے اور اس کی ہر خیر اس کی مخلوق کو پہنچ رہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ برکت والی ذات ہے۔ اگر ساری خیر اس میں ہوتی اور مخلوق کو نہ ملتی، تو نہیں کہا جاسکتا تھا برکت والی ذات خود بھی خیر سے بھر پور اور دوسروں کو خیر پہنچ رہی ہو، وہ مبارک ذات ہے۔

خیر میں مثلاً علم بہت بڑا کمال ہے تو حق تعالیٰ شانہ سرچشمہ ہیں علوم کا اور اس نے ذرے ذرے کے اندر علم دے دیا ہے۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق، تو برکت والی ذات ہے جو خود بھی علم سے بھر پور اور عالم کے ذرے ذرے میں اس کی شان کے مطابق علم بھیج دیا۔ عمل ہے تو خود بھی اس کی صنایع بے غبار اور بے داغ۔

صُنِعَ اللَّهُ الَّذِي أَتَقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ① اللہ کی صنعت اتنی مضبوط ہے کہ اس میں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی عیب نکال دے آسمان کو جو جیسا بنایا بس ویسا ہی بننا چاہیے، نہ کی ہے نہ زیادتی، زمین کو جیسا بنایا ویسی ہی بننی چاہیے تھی، نہ کی نہ زیادتی، زمین و آسمان کے اندر جتنا فضل ہے اتنا ہی رہنا چاہیے تھا، اس سے کم ہو تب بھی مضرت تھا، زیادہ ہو تو بھی مضرت تھا تو ہر چیز اپنے اپنے موقع پر فٹ اور اپنی اپنی مقدار پر ہے جس فرماتے ہیں: وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنْزِلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ② ”ہر چیز کے خزانے ہمارے ہاں بے انتہاء ہیں مگر ہم اتارتے ہیں عالم میں ایک مقدار اور اندازے کے مطابق“۔

جس کا قفل کر سکے کائنات اتنا ہی دیتے ہیں، تو روشنی لا محدود ہے مگر سورج کو اتنی دی جتنا وہ برداشت کر سکے، اس کے ذریعے سے ہم تک اتنی پہنچائی کہ ہم قفل کر سکیں۔ اگر اتنی تیز روشنی دیتے کہ ہر وقت لوگ چندھیائے رہتے اور بینائیاں زائل ہو جاتیں۔ تو کہتے کہ سورج برکت والا نہیں..... یہ تو نخست ہے، بینائیاں چھن گئیں تو اتنی روشنی دی کہ جس کو وہ قفل کرے اور جس کو ہم برداشت کریں۔

چاند میں اتنی ٹھنڈک دی کہ جتنی اس کے مناسب تھی اور اتنی ہم تک پہنچائی کہ جس کو ہم برداشت کریں۔ تو خیر بھی ہے اور خیر پھیل بھی رہی ہے اور اس خیر میں اضافہ بھی ہے، مخلوق آ رہی ہے اور جارہی ہے مگر خیر میں کمی نہیں ہے ایک سے دوسرے کو، دوسرے سے تیسرے کو، تو علم کی خیر، صنعت کی خیر، عمل کی خیر، اخلاق کی خیر، یہ ساری چیزیں پھیل رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہی ذات بادشاہت کے لیے مناسب اور موزوں ہو سکتی ہے جو ہر خیر سے بھر پور ہو، علم ہے تو لا محدود، صفت ہے تو لا محدود اخلاقی کمالات ہیں تو لا محدود، برکات ہیں تو لا محدود تو مبارک حقیقت ہیں اللہ کی ذات ہے، جس میں کچھ اثر آ جائے گا اسے کہیں گے برکت والا ہو گیا، مبارک ہو گیا دن میں ایک چیز اچھی

ڈال دی تو کہا جاتا ہے کہ بڑا مبارک دن ہے آج، اس میں تو بڑی بھلائیاں پہنچیں مخلوق کو۔ رات میں جو کوئی بھلائی نکل آئے، کوئی اچھا واقعہ پیش آئے تو کہا کرتے ہیں بھی بڑی مبارک رات تھی آج کی، دیکھو کیا واقعہ پیش آیا، تو مبارک وہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے اندر خود بھی خیر ہو اور وہ خیر دوسروں کو پہنچے اور اس میں گھٹنا نہ ہو بلکہ بڑھنا ہو، اضافہ ہی اضافہ ہو اس کو ”برکت“ کہتے ہیں۔

بادشاہت کی پہلی شرط..... تو جب اللہ کی ذات برکتوں سے بھرپور ہے تو بادشاہت کے لائق بھی وہی ہے، اور کوئی بادشاہی کے لائق نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو اس کا نائب بننے کے لائق جیسے انبیاء علیہم السلام کو مبارک بنایا، ان کے علم میں برکت، ان کے عمل میں برکت، ان کے اخلاق میں برکت، ان کے افعال میں برکت، وہ کھانا سامنے رکھ دیں، اس میں برکت کہ ایک کا دو کو، دو کا دس کو کافی ہو جائے، برکت ہی برکت ہے..... تو وہ نائب بننے کے لائق ہیں، بادشاہ انہیں بھی نہیں بنایا۔ یوں فرمایا کہ بادشاہت ہماری ہے ہماری نیابت میں یہ حکمرانی کریں گے..... تو بادشاہ کے لیے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ وہ خیر سے بھرپور ہو، ارادے بھی اس کے نیک ہوں، بدنیت نہ ہو، علم بھی اس کا صحیح ہو غلط نہ ہو، اخلاق بھی اس کے اونچے ہوں گھٹیا نہ ہوں، افعال بھی اس کے صحیح ہوں بے قاعدہ اور بد نظمی لیے ہوئے نہ ہوں اس واسطے کہا جائے گا کہ وہ بابرکت ہے تو فرماتے ہیں تبارک مبارک ہے اللہ کی ذات..... کیوں کہ ساری اس میں ہے، ساری خیر اس میں ہے، ساری خیر پہنچ رہی ہے اور خیر میں اضافہ ہے، کوئی کمی نہیں ہے، تو پہلی چیز تو آگئی کہ بادشاہ کے لیے شرط تھی کہ اس کی ذات خیر سے بھرپور ہو، اس میں برائی کا نشان نہ ہو تو تبارک کے لفظ سے تو اپنی ذات کی نوعیت بیان فرمائی کہ برکت والی ہے اور برکت کہتے اسے ہیں کہ ہر خیر جمع ہو اور دوسروں تک پہنچے۔

بادشاہت کی دوسری شرط..... دوسری چیز بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ جس ملک میں حکمرانی کرے وہ قبضہ میں ہو۔ اور جو قبضہ ہی سے باہر نکلا ہو اہولی یعنی حکام ہاتھ میں نہیں بد نظمی پھیل رہی ہے، بھاؤ غلط ہو رہے ہیں دُغَل میں فُسل ہو رہے تجارت میں، رشوتیں لی جا رہی ہیں اور حکومت کو قابو حاصل نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ ملک اس کے قبضہ میں نہیں ہے زبردستی لیا قبضہ میں مگر حکومت اپنے قبضے کو چلانہیں سکتی، ہاتھ پلے کچھ نہیں پڑا، نہ پبلک کے ہاتھ پلے پڑا، نہ بادشاہ کے ہاتھ پلے پڑا اور یوں ڈگرا پنا چل رہا ہے تو چلتا رہا لیکن حقیقتاً جسے قابو میں آنا کہتے ہیں وہ وہ ہے کہ حکام کی اس پر گرفت ہو۔

ذرا ادھر ادھر نہ ہٹ سکے اور تھوڑا ہٹے تو بادشاہ کا علم وسیع ہے، تو وہ فوراً دار و گیر کرتا ہے اور سب سنبھل جاتے ہیں۔ تو بادشاہ کے لیے علم کی وسعت اور قبضے اور اقتدار کی وسعت ہونی چاہیے، اگر ملک قابو میں نہ آئے تو ظاہر بات ہے کہ حکومت نہیں چل سکتی اور چلے گی تو ظلم اور جور کی حکومت ہوگی، بد نظمی کی حکومت، تو پہلی شرط یہ ہے کہ بادشاہ باخبر ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا قبضہ صحیح ہو، قابو سے نکلی ہوئی بات نہ ہو۔

شاہجہان کے ولی عہد مقرر کرنے کا قصہ..... کہتے ہیں کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے ولی عہد بنانا چاہا تو دو بیٹے ہیں ایک اورنگ زیب اور ایک داراشکوہ، تو داراشکوہ کے لیے شاہ جہاں کا خیال تھا کہ وہ اورنگ زیب سے بھی بڑا تھا اور باوجاہت بھی، اور ملکہ بھی یہی چاہتی تھی کہ داراشکوہ ہندوستان کا بادشاہ بنے، اور عام پبلک کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے۔

لیکن وزیراعظم کی رائے یہ تھی کہ اورنگ زیب بادشاہت کے لائق ہے، داراشکوہ بادشاہت کے لائق نہیں، ملک کو سنبھال نہیں سکے گا، اس کے قلب میں اتنی جان نہیں۔ بہر حال یہ قصہ چل رہا تھا تو وزیراعظم نے خیال کیا کہ دونوں کا امتحان کراؤں اور ساتھ میں ایک پارٹی کو لیا تا کہ جو امتحان ہو سب کے سامنے آجائے، تو اس نے سب سے پہلے داراشکوہ کے یہاں اطلاع کرائی کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

داراشکوہ نے استقبال کا سامان کیا، ملک کا وزیراعظم آ رہا ہے۔ تو بڑے حشم خدم اور بڑی آؤ بھگت کے ساتھ وزیراعظم کو لایا اور اس کی شایان شان اس کا استقبال کیا اور مسند بچھائی اور اپنے برابر اس کو بٹھایا، قریب کیا، خیر وزیراعظم بیٹھ گیا۔ اب وزیراعظم نے کچھ سوالات کرنے شروع کیے کہ دکن میں چاولوں کا کیا بھاؤ ہے تو داراشکوہ جواب نہ دے سکا، بنگال میں کیا بھاؤ ہے؟ پتہ نہیں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ کچھ پتہ نہیں..... مگر تعظیم و تکریم بہت کی، خیر وزیراعظم وہاں سے واپس آئے اس کے بعد اطلاع کرائی اورنگ زیب کے یہاں کہ میں آنا چاہتا ہوں، اس نے کہا آ جاؤ۔ اورنگ زیب نے نہ کوئی استقبال کا سامان کیا جیسا اس کا مکان تھا ویسے ہی بیٹھ رہے بلکہ اور ذرا لالہ بالی پن میں سرور پھیلا کر بیٹھ گئے۔ وزیراعظم آئے تو بہت استغناء تھا، کوئی تعظیم و تکریم خاص نہیں۔ اس واسطے کہ جانتے تھے اورنگ زیب کہ امتحان لینے آ رہا ہے تو امتحان کی آؤ بھگت کے معنی تعلق اور خوشامد کے ہوتے کہ میں ہوں تو نہیں اس قابل مگر پاس کر دینا نمبر دے دینا۔

اورنگ زیب چونکہ خود ملک کی تمام اطراف و جوانب کا علم رکھتا تھا، اس لیے اس میں استغناء تھا اور استغناء کے ہوتے ہوئے ضرورت نہیں کہ تعلق اور خوشامد کرے، تو بہت استغناء سے بیٹھا۔ وزیراعظم آئے تو خاص تکریم نہیں کی کہا:

السلام علیکم..... علیکم السلام!..... بیٹھ جاؤ!..... اب اس نے پوچھنا شروع کیا، تو اس نے چار ہی سوال کیے اورنگ زیب نے پورے ملک کی حقیقت بتلا دی کہ فلاں جگہ یہ بھاؤ ہے، فلاں جگہ حکام بد نظمی میں مبتلا ہیں اور فلاں جگہ عدل و انصاف ہو رہا ہے۔ فلاں حاکم صاحب ہیں، اس کی ذہنیت ایسی اور اس کی ذہنیت ایسی..... اور اس کی ذہنیت ایسی۔ الغرض پورے ملک کا ایک نقشہ کھینچ دیا، اب یہ بے چارہ چپ! اسے تو خود اتنی معلومات نہیں تھیں۔ حالانکہ وزیراعظم تھے، جتنی اس شہزادہ کو معلوم تھیں۔

شاہ جہاں کے پاس آئے، شاہ جہاں نے پوچھا کیا اثر لے کر آئے، اس نے کہا جہاں پناہ تو یہ چاہتے ہیں کہ

بادشاہ دارالشکوہ ہو۔ اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ ہو اور اللہ ہی کا چاہا پورا ہوگا۔ اس کے بعد حالات سنائے، تو بات وہی تھی کہ جو قابو پاسکے ملک پر وہی بادشاہ بنانے کے لائق ہے اور قابو وہ پائے گا جس کا علم صحیح ہو، علم کے وسائل صحیح ہوں کہ کہاں کیا چیز گزر رہی ہے؟ رعایا میں بے چینی ہے، بد نظمی ہے، سکون ہے، امن ہے، بد امنی ہے، حکام ظلم تو نہیں کر رہے، تاجروں کو دیکھا جائے کہ بلیک میں تو جتلا نہیں ہیں، نفع خوری میں تو جتلا نہیں ہیں، حکام رشوت ستانی میں تو جتلا نہیں تمام چیزوں کی اطلاع ہو۔

اور علم ہونے کے بعد قدرت اور قوت بھی حاصل ہو کہ طاقت سے ان کو برائی سے ہٹایا جاسکے، اگر قبضے میں ہی نہیں ملک تو حکومت نہیں چل سکتی، اس لیے حق تعالیٰ نے پہلی تو اپنی ذات کی شان فرمائی۔
تَبَارَكَ... مبارک ذات ہے جس میں ہر خیر جمع ہے۔

ہر خیر کا سرچشمہ ہے اور اس سے خیر پھیل رہی ہے..... اور دوسری شان یہ ہے کہ اَلَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔ اس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ ذرا برابر ادھر ادھر نہیں چل سکتا۔ ممکن نہیں ہے کہ اس کی منشاء کے خلاف کوئی چل جائے، ٹھیک ٹھیک اس کی منشاء پر چلے گا، جو قضاء و قدر اس نے کر دی دنیا اس کی پابند ہے، کائنات پابند ہے سارے جہان مل کر اس کے ارد گرد گھومیں تَوْبِيْدِهِ الْمُلْكُ

بادشاہت کی تیسری شرط..... اور تیسری چیز فرمائی کہ: وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ ہر چیز پر وہ قادر ہے۔ اور جب قدرت اسے ہر چیز پر حاصل ہے، اقتدار ہر چیز پر حاصل ہے تو با اقتدار کوئی چوں نہیں کر سکتا، اسے تو ڈر ہوگا کہ کہیں مجھے معزول نہ کر دے تو تین وصف بیان فرمائے، ایک برکت اور ایک قدرت (قبضہ) اور ایک چیز اپنا اقتدار، تو تین چیزیں انتہائی ضروری ہوتی ہیں حکومت کے لیے۔ یہ لامحدود طریق پر اسی کی ذات میں موجود ہیں تو بادشاہت کے لائق بھی اس کی ذات ہے۔

سورۃ الملک کے دیگر نام..... یہ سورۃ ملک ہے جس کی تفسیر شروع کی گئی ہے۔ اس سورۃ کا نام ”سورۃ مَنَافِعُ“ ہے اور سورۃ مُنَجِّیۃ بھی ہے۔ مانعہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ عذاب قبر کو منع کرتی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قبر بیتِ ظلمت ہے، اندھیریوں کا گھر، یہاں تاریکی کے سوا کسی اور چیز کا نشان نہیں۔ اور سورت تَبَارَكَ اَلَّذِي يَهْدِي الْقُبُورَ لِلرُّشْنِ، یا اس کا پڑھنے والا قبر کی روشنی مہیا کرتا ہے۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ روزانہ سوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تَبَارَكَ اَلَّذِي اور اَلَمْ تَسْجُدْ یہ دونوں سورتیں آپ پابندی کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں سورتیں قبر کی روشنی ہیں۔ اس لیے اس سورۃ کا نام رکھا گیا ”مَنَافِعُ“، یعنی مانع ظلمت، تاریکیوں کو دفع کرنے والی اور قبر میں اندھیری کو ٹھٹھری کو ایک روشن میدان بنا دینے والی ہے۔ اس وجہ سے بھی کہ اس کی تلاوت کا خاصہ طبع نورانی ہے تو گویا تاریک قبر اس کی تاثیر سے روشن ہو جائے گی۔

کمال مملکت اس کا نام سورۃ ملک بھی ہے جس میں اللہ کی حکومت کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں اور اللہ کی حکومت لامحدود ہے، سارے جہانوں میں اسی کی حکومت ہے تو ملک کی اندر وسعت داخل ہے۔ ملک کہتے ہی اس کو ہیں کہ پھیلا ہوا ہو، پھیلا ہوا نہیں ہوگا تو اسے ہم صوبے کی حکمرانی اور ریاست کہیں گے، اور تک ہو جائے گی تو اسے ضلع کی حکومت کہیں گے، اور تک ہو جائے گی تو اسے قصبے کی حکومت کہیں گے... اور تک ہو جائے گی تو اسے قبیلے کی حکومت کہیں گے، اور زیادہ تک ہو جائے گی تو اسے گھر کی حکومت کہیں گے تو حکمرانیوں میں ملک کی حکومت سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اور اللہ کا ملک ہی ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے، جہاں غیر اللہ کی حکمرانی ہے وہ (بھی) سب اسی کا ملک ہے اسی لیے اس کی وسعت کی کوئی حد و نہایت نہیں، اس ملک میں عالم دنیا بھی داخل ہے اور دنیا کہتے ہیں دنی کو یعنی خسیں اور ذلیل کو، تو سب سے زیادہ ذلیل عالم یہ ہے اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ الدُّنْيَا لَا تَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ ① کہ پوری دنیا مل کر اللہ کے یہاں اتنی بھی وقعت نہیں رکھتی جیسے چھمکری ایک ٹانگ ہوتی ہے۔ تو یہ بے وقعت عالم ہے۔

کمال قدرت یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس بے وقعت عالم میں ایسے افراد پیدا کیے کہ وہ سارے جہانوں پر اپنے کمالات کے سبب سے بڑھ جائیں..... تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اس سے اس دنیا کو اظہار قدرت کے لیے بنایا۔ اگر انسان کو پیدا کرتے اور وہ فرشتوں میں رہتا تو وہاں اگر نورانیت ہوتی تو زیادہ عزیز بات نہ سمجھی جاتی اس لیے کہ فرشتے بھی نورانی ہیں، ان کا ملک بھی نورانی، وہ خود بھی ایمانی ملک ہے، وہاں کفر کی کھپت ہی نہیں۔ وہاں غلاظت نہیں، نجاست نہیں، صاف ستھرا ملک ہے، پاک و صاف، تو اس میں رہ کر انسان ترقی کرتا تو قدرت کا پوری طرح سے نمونہ ظاہر نہ ہوتا۔ لیکن لا کر رکھا انسان کو اس جہان میں کہ یہ گندگیوں کا عالم ہے، ہر طرف نجاست حتیٰ کہ انسان کی پیدائش بھی نجاست سے، ایک گندے قطرے سے ہے۔

پھر اس گندے قطرے کو پرورش دیتے ہیں، نو مہینے تک ایک گندے عالم میں جسے رحم مادر کہتے ہیں جو ماسوائے حیض اور گندے پانی کے اور کچھ نہیں، غذا انسان کی وہ گندی، حیض کا خون بند ہو جاتا ہے وہ غذا بنتا ہے۔ اسی سے اجزاء بنی آدم کے بنتے ہیں... نہایت ہی ظلمانی عالم ہے، نہ اس میں روشنی ہے، نہ چمک، سوائے اندھیریوں کے اور پھر اندھیریوں میں بھی تین اندھیریاں فرمائی گئیں۔ يَخْلُقْكُمْ فِي بُطْنٍ اُمِّهِمْ خَلَقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٍ ② ”تمہیں ہم نے پیدا کیا ہے ماں کے پیٹ میں دو درہ دور یعنی تمہاری خلقت میں مختلف دور آئے ہیں۔“

کبھی انسان نطفہ ہے، جنس حدیث چالیس دن گزرنے کے بعد خون کی بوند بن گیا، پھر چالیس دن گزرے تو ایک مضغ گوشت بن گیا..... پھر چالیس دن گزرے تو اس میں ہڈیاں پہنادی گئیں، پھر چالیس

① الحدیث أخرجه الامام الترمذی فی سننه ولفظه: لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ماسقى كافراً منها

شریۃ ماء ج: ۸ ص: ۲۹۹. ② پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ: ۶.

دن گزرے تو کھال بنادی گئی، اس کے بعد روح ڈالی جاتی ہے..... تو پیدائش بھی گندے قطرے سے، غذا بھی گندی، مکان گندا اور وہ مکان بھی اندھیرا اور اندھیریاں بھی تین، ایک اندھیری کوٹھڑی کہ ماں کا پیٹ ہے اس میں کوئی چمک نہیں، کوئی نورانیت نہیں اس اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے جس کو رحم مادر کہتے ہیں۔ یہ اس سے بھی زیادہ تنگ اور تاریک ہے، اور اس میں پھر ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے وہ ہے مشیمہ وہ جھلی جس میں لپٹا ہوا بچہ پیدا ہوتا ہے اور دایہ اس کو کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ، اس میں رحم مادر، رحم مادر میں وہ مشیمہ یعنی وہ جھلی، تو تین اندھیری کوٹھڑیوں میں انسان کو بنایا اور گندے قطرے سے بنایا اور گندی غذا سے بنایا اس گندے انسان کو جب پاک بنایا تو اتنا پاک بنایا کہ فرشتوں سے بھی بازی لے گیا، تو اس میں اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔ اگر انسان کو جنت ہی میں رکھتے اور وہیں ترقی دیتے تو کوئی زیادہ کمال نہ سمجھا جاتا۔

ایک پاک عالم، نورانی عالم اس میں اگر نورانی مخلوق بن گئی تو یہ بنا کوئی تعجب انگیز نہیں، عجیب چیز یہ ہے کہ ظلمتوں میں سے، گندگیوں میں سے پاک باز انسان نکالا، تو اس سے خدا کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کو لا کر رکھا دنیا میں کہ دنیا میں خود گندگی، کھانا پینا، بول و براز، نجاست اور گندگی اس سب کے اندر رہ کر پھر انسان پاک باز بنتا ہے۔ تو اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔

سورۃ ملک میں وسعت قبر اور مانع عذاب قبر ہونے کی تاثیر کیوں ہے؟..... تو ملک حق تعالیٰ کا یہ ساری کائنات ہے، اس میں کم تر عالم یہ دنیا ہے اس سے بڑے بڑے عالم ہیں:

تاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ایک ایک ستارے کو دیکھو، سورج کو دیکھو، آج کل کی تحقیقات کے مطابق چار کروڑ گنا بڑا ہے زمین سے، یعنی چار کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں اس میں اور یہ چھوٹا ستارہ ہے اور بڑے بڑے ستارے ان گنت ہیں، ان کی بڑائیوں کی کوئی انتہا نہیں، پھر ان کے اوپر آسمان ہیں سات، ان کے اوپر چنٹیں ہیں سو (۱۰۰) اور ان کے اوپر پھر عظیم الشان دریا ہے کہ جس کی ایک ایک موج پورے آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہوتی ہے اس کے اوپر عرش عظیم ہے اور کرسی ہے۔ تو حق تعالیٰ بادشاہ ہیں اور شہنشاہ ہیں، فقط ایک ملک کے نہیں ہفت اقلیم کے نہیں۔ صرف دنیا جہان کے نہیں بلکہ کروڑوں جہانوں کے بادشاہ ہیں اور اتنی بڑی بادشاہت میں کوئی ذرہ بھی بغیر ان کی مشیت کے، اور ان کے حکم کے اور اذن کے حرکت نہیں کر سکتا۔ تو ملک کے اندر وسعت داخل ہے اللہ کے ملک میں تو کوئی حد وسعت کی نہیں۔ اس سورۃ ملک میں کیونکر اللہ کے ملک کی وسعت بیان کی گئی ہے۔ اس واسطے کہ اس میں خاصیت یہ ہے کہ یہ وسیع کر دیتی ہے قبر کو یہ قبر کو اتنا وسیع بنا دیتی ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: مومن جب سوال و جواب میں پورا اترتا ہے تو اس کی قبر وسیع کی جاتی ہے... اتنی وسیع کہ تا حد نظر وہ میدان ہی میدان باغ و بہار نظر آتا ہے۔

تو تنگ جگہ کو اتنا وسیع بنا دیا کہ حد نظر تک وہ وسعت محفوظ ہوتی ہے اور حد نظر حسی تو یہ ہے کہ آدمی جب لیٹتا ہے

تو ایک دم اس کی نگاہ آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔۔۔

بہر حال وسعت نظر اتنی ہے کہ وہاں تک پہنچتی ہے یہ حسی نظر ہے اور وہاں کی نظر روحانی ہوتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی ہوگی۔ تو قبر کو اتنا بڑا عالم بنا دیتے ہیں کہ وہ دنیا سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے تو گویا اس سورۃ کو ”مانعہ“ کہا گیا ہے کہ وہ ظلمت کو روکتی ہے اور اتنی نورانیت پیدا کرتی ہے کہ تا حد نظر نور ہی نور نظر آتا ہے، تو ”مانعہ“ اس بناء پر فرمایا گیا ہے۔

اس سورۃ کے منجیہ نام رکھے جانے کی وجہ..... اور اس سورۃ کا دوسرا منجیہ نام ہے، یعنی نجات دینے والی تو عذاب قبر سے بھی نجات دیتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ بائیں طرف سے عذاب آتا ہے تو روکتی ہے، دائیں طرف سے آتا ہے تو روکتی ہے اور اوپر سے، نیچے سے، غرض چہاں طرف سے روکتی ہے تو بندے کو عذاب قبر سے نجات دے دیتی ہے۔ تنگی سے نجات دیتی ہے ظلمت سے نجات دیتی ہے، عذاب سے نجات دیتی ہے، اس واسطے اس کا نام منجیہ بھی ہے۔

برکات در برکات اور ملک اس واسطے اس کا نام ہے کہ اللہ کی شہنشاہی کے اصول اس میں بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ دنیا میں اسی انداز سے ہم نظام قائم کریں اور خلیفۃ اللہ بن کر اللہ کی حکومت کو دنیا میں پھیلانیں۔ اس واسطے اس کا نام ملک ہے۔ میں نے جو عرض کیا تھا کہ ملک میں سب سے پہلے چیز جو آتی ہے وہ ہے بادشاہ کی ذات، اس کے بعد بادشاہ کی صفات آتی ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ کے افعال آتے ہیں۔ اور اس کے بعد افعال کے آثار کہ اس سے ملک میں اس کی حکومت کے کیا اثرات پھیلے۔

اس میں سب سے پہلے تو اللہ کی ذات کو بیان کیا گیا ہے ”تبارک“ کے لفظ سے کہ بڑی مبارک ذات ہے، برکت والی ذات ہے تو برکت کے معنی میں نے یہ عرض کیے تھے کہ ساری خیر کا مجموعہ اور پھیلنے والی خیر تو خود ذات بادشاہ خیر کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اور اس سے خیر پھیلتی ہے تو جہانوں میں پھیل رہی ہے، ولادتیں ہو رہی ہیں، حیات ہو رہی ہے، زندگی ہو رہی ہے۔ زندوں میں سے زندہ پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر ان میں سے اور پیدا ہو رہے ہیں انسان میں سے انسان، پھر انسان کی ضرورت کے لیے جانور بنائے۔ تو جانور میں سے ایک جانور اس میں سے دوسرا، اس میں سے تیسرا، کروڑوں جانور پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر انسان کی ضرورت کے لیے مثلاً درخت اور نباتات ہیں تو درختوں میں یہ برکت کہ ایک درخت میں قلم لگایا تو دوسرا، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا، لاکھوں کروڑوں، اربوں، کھربوں درخت بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جمادات کو دیکھو کہ پہاڑ ہیں، پہاڑوں میں پتھر ہیں، پتھر بڑھ بڑھ کر پہاڑ بن گئے ہیں۔ ریت جمع ہوا وہ پہاڑ ہو گیا، پہاڑوں میں سے پہاڑ نکلتے چلے جا رہے ہیں تو برکت والے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ عالمین کی ذات بھی بابرکت کہ ہر خیر کا مجموعہ اور سرچشمہ اور اس برکت کے آثار اتنے کہ برکت در برکت در برکت پھیلتی چلی آ رہی ہے، ملک بھر میں برکات کا ظہور ہے۔ تو اللہ کی ذات یعنی بادشاہ بحیثیت ملک اور بادشاہ ہونے کے اس کی شان یہ ہے کہ وہ خیر کا سرچشمہ اور پھیلنے والی خیر ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ”برکت

”کہ خود ذات میں بھی خیر اور اور وہ پھیلے اتنی کہ کوئی انتہا نہ ہو، تو اللہ سے مبارک کس کی ذات ہے؟ برکت والی کس کی ذات ہے؟ تو فرمایا: ”مبارک“ بڑی برکت والی ذات ہے جدھر دیکھو برکت پھیل رہی ہے۔ پھر فرمایا کہ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ اس کی ذات وہ ہے جس کے قبضے میں ہے ملک۔ اور ملک چھوٹا موٹا نہیں۔ کروڑوں، اربوں، کھربوں جہاں ہیں۔ اور ان کی یہ شاخ در شاخ برکات سب اس کے قبضے میں ہیں کوئی ذرہ بھی نہیں مل سکتا کہ جب تک کہ اس کی مشیت نہ ہو، تو قبضے کا یہ عالم ہے ملک کے اوپر۔

پھر نظام حکومت بھی ہے کہ جو چیز جس طرح بنادی وہ اسی محور پر گھوم رہی ہے۔ سورج چاند ہے، زمین ہے، اپنے ایک مرکز کے ارد گرد سارے اس کے افعال چکر کھا رہے ہیں۔ حرکت کر رہے ہیں۔ تَوْبِيْدِهِ الْمُلْكُ ساری چیزیں اس کے قبضے میں ہیں۔ نظام اس کے قبضے میں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب نظام پر بادشاہ کا قابو ہے تو ذرہ نہیں مل سکتا۔ تو اس کی مملکت کتنی پرامن ہوگی، کتنی بابرکت ہوگی۔

عالمی بے برکتی کے عوامل..... اب جو بے برکتی پیدا ہوتی ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ جہاں انسان کا دخل آگیا ہے (اسے حکم تو دیا گیا تھا) کہ تو ہمارے نمونہ پر چل، وہ اپنی حرص و ہوا سے اپنا ذاتی اقتدار چاہتا ہے اور اللہ کے اقتدار کو بھول کر اپنا ذاتی اقتدار قائم کرتا ہے۔ اس کی طاقت کو فراموش کر کے اپنی طاقت پر غرہ کرتا ہے۔ جب وہ اپنی طاقت پر غرہ کرے گا، دعویٰ کرے گا۔ دوسرے اس کے مخالف بنیں گے تو ملک میں بد نظمی پھیلے گی، اگر وہ اپنی جاہ چاہے گا تو ہر انسان جاہ پرست ہے، وہ بھی جاہ کی طرف چلے گا اگر دونوں ہیں جمع ہوں گی تو ٹکرائیں گی، ایک دوسرے کو گرانا چاہے گا، وہیں سے فتنہ و فساد پھیلے گا۔ تو جہاں پر حق تعالیٰ کی تکوینی حکومت ہے اس میں کوئی بد نظمی نہیں، ہر چیز اپنے محور پر چل رہی ہے اور جہاں تکمیلی چیز آئی جس میں انسان کو واسطہ بنایا تو اگر انسان درست، پاکیزہ ہیں، تب تو اللہ کے نظام کو چلائیں گے، جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں کہ ذرہ برابر ان کے دلوں میں اپنی ذات کا اقتدار نہیں ہوتا۔ حالانکہ اللہ نے انہیں سب سے زیادہ با اقتدار بنایا ہے، اپنی ذات کے بارے میں انبیاء علیہ السلام کو جاہ پسندی کا خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا اسی طرح سے جو انبیاء کے بلا واسطہ متبعین ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین وہ بھی اسی انداز پر اللہ کی حکومت کو چلاتے ہیں کہ ان میں نہ جاہ پسندی ہے۔ نہ مال پسندی ہے نہ مال کی محبت، نہ جاہ کی محبت۔ فقط جاہ ہے تو اللہ کے سامنے ہے، ملک ہے تو اللہ کے سامنے ہے، اپنے کو خادم کی حیثیت سے رکھتے ہیں ان کے دل میں قطعاً نفسانیت کے وسوسے نہیں ہوتے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔

نظام حکومت میں تزکیہ کے آثار..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ تنہائی میں ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے یہ بھی نہیں کہ کوئی سامنے ہو کہ دکھلانے کو کہہ رہے ہوں، تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہیں حیرت سے بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے کو خطاب کر کے: بَخِ يَا ابْنَ الْخَطَابِ أَصْبَحْتَ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ① حیرت ہے اے

① کتاب الزہد لابن ابی عاصم، زہد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ج: ۱ ص: ۱۱۵۔

عمر تو امیر المؤمنین؟ تیری بھی یہ قابلیت ہے کہ تو خلیفہ بنایا جائے (امیر المؤمنین بنایا جائے) اس درجہ بے نفسی کہ تنہائی میں بیٹھ کر حیرت میں ہیں کہ مجھے کس طرح خلیفہ بنادیا۔ مجھ میں تو یہ لیاقت نہیں تھی۔

تو ان لوگوں کے قلوب اتنے پاک اور صاف ہیں کہ سلطنت اتنی بڑی کہ سلاطین عالم کا پتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر..... اور خود حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو دیکھو تو ان کے دل میں خیال بھی نہیں کہ میں کوئی چیز ہوں۔ حیرت سے خود ہی کہہ رہے ہیں کہ تو امیر المؤمنین.....؟

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور بلا واسطہ خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن قلب کی صفائی اور تزکیہ کا یہ عالم ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی زبان باہر نکال کر ایک ہاتھ سے پکڑا، دوسرے ہاتھ سے اسے لکڑیاں مارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: هَذِهِ اَوْ دَنَى الصَّوَادِ ① یہ زبان ہے جس نے مجھے مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے، مصائب میں پھینکا اور ہلاکتوں میں ڈالا۔ خدا جانے میری زبان کیا بکواس کرتی ہو، کیا چیزیں کہتی ہو، میرے عمل کہیں ضائع نہ ہو جائیں، اس درجہ بے نفسی کا عالم ہے کہ زبان پر اعتما نہیں کہ کوئی کلمہ خلاف شرع نہ نکل جائے، کوئی جھوٹ نہ نکل جائے، تو زبان کو لکڑیاں مار رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس دن کچھ ذرا سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، کپڑا کوئی کم خواب کا نہیں تھا، کوئی اعلیٰ نہیں تھا، یہی معمولی زمینداروں کے کپڑے، بیٹھے بیٹھے ایک دم گھبرا کر فرمایا کہ قینچی لے آؤ، قینچی لائی گئی۔ تو ایک آستین یہاں سے کاٹ دی اور ایک یہاں سے کاٹ دی، بدہیئت بنادیا کرتے کو، لوگوں کو حیرت ہوئی۔ عرض کیا کہ:-

امیر المؤمنین! ایک اچھے خاصے کرتے کو آپ نے خراب کر دیا، بدہیئت بنادیا، اگر آستین برابر کاٹ دیتے تو چلو نیم آستین ہی کا کرتا ہو جاتا۔ ایک ہیئت تو رہتی، ایک کو تو مونڈھ سے کاٹ دیا، ایک کو آدھے سے کاٹ دیا۔ فائدہ کیا ہوا؟۔ فرمایا: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی کپڑا پہن کر اترانے لگتا ہے تو غضب خداوندی اس پر اترتا ہے اور منڈلانے لگتا ہے۔ اگر تو بے نہ کی تو غضب آپڑتا ہے، تو بے کی تو غضب واپس ہو جاتا ہے۔

تو یہ کپڑا پہن کر میرے دل میں اتر اہٹ کا وسوسہ گزرا کہ میں بھی کوئی چیز ہوں۔ میں نے دیکھا کہ غضب الہی اوپر آ رہا ہے اس لیے میں نے گھبرا کر قینچی منگوائی، بدہیئت بنایا، جس سے میرے قلب کا وسوسہ دور ہو گیا اور غضب خداوندی اوپر واپس ہو گیا۔ تو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو کہ اپنے نفس کے بارے میں انہیں خطرہ بھی نہ گزرے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔ وہ تو اللہ ہی کی حکومت چلائیں گے، اپنی حکومت نہیں چلائیں گے، نہ جاہ کے خطرات ہوں نہ مال کی محبت ہو۔ حکومت کی اہلیت..... حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، خراج کی رقمیں اور فنے کی رقمیں اور جزیہ کی رقمیں بھری ہوئی تھیں تو دیکھ کر فرمایا: یا دنیا غری

غیری اے دنیا! دھوکہ میں کسی اور کو ڈالنا، ہم تیرے دھوکے میں آنے والے نہیں، ہم تجھنے والے نہیں ہیں۔ اور یہ کہہ کر حکم دیا کہ تقسیم غریبوں میں شروع کرو، صبح سے شام تک پورا خزانہ خالی ہو گیا اور یہ کہہ کر واپس ہو گئے یَا ذُنُوبَا غَسِرَتْ غَصِرَتِی دھوکا کسی اور کو دینا اے دنیا! ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں نہ ہم اترا ہٹ میں آنے والے ہیں نہ کبر و عنوت میں۔ تو جن لوگوں کے قلوب اتنے صاف تھے کہ نہ محبت مال کا نشان، نہ محبت جاہ کا نشان، وہی اہل اور احق تھے کہ اللہ کے نائب بنیں اور اس کی حکومت چلائیں۔ تو جہاں تکمیلی حکومت ہے یعنی انسانوں کے واسطے سے حکومت ہے، اگر ایسے انسان ہوں تو وہ حکومت پاکباز ہے، اس حکومت میں امن ہے، امان ہے، برکات ہیں، خیر ہے، ساری چیزیں ہیں، لیکن اگر دوسری قسم کے انسان آجائیں جو اللہ کے اقتدار کو چھوڑ کر اپنا ذاتی اقتدار چاہیں، بجائے بندگی کرنے کے خدائی شروع کریں مال کی محبت میں غرق ہوں..... اور خود غرضی کی وجہ سے مال بٹورنے کی فکر میں ہوں تو رعایا کا ناس ہوگا۔ ظاہر ہے ملک کے اندر بد نظمی پیدا ہوگی، تو یہ بد نظمی، اللہ کی حکومت میں نہیں ہے۔ اس نے اپنی حکومت میں جب انسان کو واسطہ بنایا تو اس انسان نے بد نظمی پھیلائی۔

جب تک وہ انسان رہے جو غیر محبت جاہ اور غیر محبت مال تھے جنہوں نے خالص اللہ کی حکومت دنیا میں کی، اور جب ایسے آگئے جن کے قلوب صاف نہیں تھے نہ مال کی محبت سے بری تھے، نہ جاہ کی محبت سے، وہیں آ کر خرابی واقع ہوئی۔ تو اللہ نے بتلادیا کہ حکومت تو ہماری ہے، مگر کوئی اس کو ڈھنگ سے چلاتا ہے اور کوئی بے ڈھنگے پن سے چلاتا ہے، مگر چلو انہیں گے تمہارے ہاتھ سے تاکہ نظام تمہارے ہاتھوں قائم ہو، اگر ہمارے ہاتھ سے نظام رہے، تمہارا واسطہ نہ ہو تو انسان مجبور محض ظاہر ہوگا۔ کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اگر مجھے اپنی خلافت و نیابت دیتے تو میں یوں چلا کے دکھاتا، مگر اب نہیں کہہ سکتا۔ ہم بتلائیں گے کہ جنہوں نے چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں اور جنہوں نے نہیں چلا کے دکھلایا وہ یہ ہیں۔ یہ مستحق ہیں ہماری رحمت کے اور یہ مستحق ہیں ہمارے عذاب کے، تو ایک بلا واسطہ حکومت الہی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین نظم رکھتی ہے۔ ایک بالواسطہ ہے تو واسطے جیسے ہوں گے ویسے حکومت بنے گی مگر اصول انہیں وہی اختیار کرنے پڑیں گے جو اللہ کی حکومت کے ہیں۔ اس لیے اس سورۃ مبارکہ میں حق تعالیٰ نے اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کے اصول بیان فرمائیں ہیں کہ شہنشاہی کس طرح چلتی ہے۔

عناصر بادشاہت..... تو ذات کو بیان کیا کہ بادشاہ وہ ہونا چاہیے کہ جو **1** خیر کا سرچشمہ ہو، **2** نیت بھی پاک ہو، **3** علم بھی اعلیٰ ہو، **4** عمل بھی صاف ہو، **5** اخلاق بھی بلند ہوں، اس کے اندر سخاوت بھی ہو اور عدل بھی ہو، سخاوت میں آ کر فضول خرچی میں نہ آئے، عدل اس کی روک تھام کرے اور عدل میں آ کر اسراف نہ داخل ہو۔ ہر چیز اپنے محل پر ہو تو بادشاہ کے اوصاف میں یہ ہے کہ بخیل نہ ہو، اگر بخیل ہوگا تو رعایا تنگ ہو جائے گی، سخی ہوگا تو رعایا کے اندر تصرف الحالی پیدا ہوگی، مگر اس کے ساتھ عدل ہو، کیوں کہ اگر ظلم کے ساتھ سخاوت ہو تو بادشاہ جانب داری کرے گا، ایک طبقے کو دے گا اور ایک کو محروم کرے گا، ملک میں بد نظمی پیدا ہوگی، لیکن اگر سخاوت کے

ساتھ عدل کرے گا تو سب کو برابر برابر ملے گا، کسی کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے ماں باپ کے لیے کہ اولاد کے اندر سخاوت کرو، مگر عدل کے ساتھ، سب کو برابر برابر دو، ایک نظر سے دیکھو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ محبت تو ساری اولاد سے انسان کو طبعاً ہوتی ہے مگر ایک سے کچھ زیادہ دوسرے سے نہیں ہوتی،..... غیر اختیاری طور پر لیکن معاملہ کر لے میں چاہے تو مساوات کہ جتنا ایک کو دے اتنا ہی دوسرے کو، اگر برابری نہ رکھی تو ان میں باہم لڑائی اور منافقت پیدا ہو جائے گی۔ اور پھر دونوں مل کر باپ کے مد مقابل آئیں گے تو گھر کی حکومت میں بد امنی پیدا ہو جائے گی۔ بد نظمی پیدا ہوگی، اس لیے بادشاہ کو چاہیے کہ سختی بھی اعلیٰ درجے کا ہو اور ساتھ ہی عادل بھی اعلیٰ درجہ کا ہو۔

سخاوت میں اسراف سے عدل روکتا ہے، اور عدل کی برکت سے سخاوت اپنے اصل محور پر چلتی ہے، اسی کے ساتھ بادشاہ میں دو چیزیں اور ضروری ہیں ایک مدبر اور شجاعت، بہادر بھی ہو، قلب کا جری بھی ہو، اگر بادشاہ بزدل ہو گیا تو پھر وہ کسی پر غالب نہیں آسکتا، اس میں وہ عناصر راہبر جائیں گے کہ جو ظالم ہیں اور فساد ہی ہیں انہیں کا غلبہ ہوگا اور تدبیر کے بے بیچارے پیچھے رہ جائیں گے۔

لیکن اگر بادشاہ کے اندر تدبیر ہے تو وہ اپنی تدبیر سے سب کو یکساں، اپنی جگہ قائم رکھے گا، ساتھ میں شجاعت اور بہادری بھی ہو، بزدل نہ ہو، اگر بزدل ہوگا تو دشمن ملک کا راستہ دیکھ لے گا اور مدافعت کی قوت نہیں ہوگی تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔ تو چار چیزیں لازمی ہیں بادشاہ کے لیے، ایک سخاوت اور ایک عدل اور ایک شجاعت اور ایک تدبیر، یہ چار چیزیں جمع ہوں گی تب بادشاہی اصول پر چلے گی تو ان چاروں کے مجموعہ کو کہا گیا ہے برکت اور خیر، تَوْقَاتُكَ اَلَّذِیْ بِرِکْتِیْ وَالذَّاتِ خَیْرٌ ہر چیز حد کمال پر ہے اور نہ صرف حد کمال پر بلکہ وہی سرچشمہ تمام خیر و برکت کا ہے، دوسروں کو خیر ملتی ہے تو اسی سے ملتی ہے۔ اور بِیْدِہُ الْمُلْکُ ملک اس کے قبضے میں ہے، اس کے ہاتھ کے نیچے ہے کہ ایک ذرہ بھی ادھر ادھر نہیں مل سکتا، اس کے ساتھ ساتھ قدرت بھی ہے کہ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس کی قدرت بھی بڑی وسیع ہے، قابو ہی میں نہیں بلکہ قادر بھی ہے ہر چیز پر۔ اور قدرت عام بادشاہوں میں تو یہ ہوتی ہے کہ جب جیل بھیجے کو لایا تو جیل بھیج دیا، کسی کو سزا دے دی، کسی کو انعام دے دیا۔ قدرت ہے۔

بلندی قدرت..... لیکن اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیْوۃَ موت اور زندگی کی باگیں بھی اس کے ہاتھ میں ہیں، کسی انسان یا کسی بھی مخلوق کے ہاتھ میں موت اور زندگی کی باگ ڈور نہیں ہے کہ جس کو چاہے زندہ کر دے جس کو چاہے موت دے دے۔

اور زندگی اور موت دینے کے یہ معنی نہیں جو مرود نے سمجھے کہ یہ مر گیا، ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے اس کے دربار میں آکر کہا کہ خدائی کا دعویٰ مت کر، وہ بھی خدائی کا مدعی تھا، خدائی کا دعویٰ مت کر، خدا کو مان اور اپنے مالک کو پہچان، کہتا ہے کہ کون مالک ہے میرے سوا؟ اَلَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ ”وہ مالک ہے جو زندگی

بھی دیتا ہے اور موت بھی دیتا ہے۔“

اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں، اسی وقت دو قیدی نکلوائے جیل سے ایک کے قتل کا حکم دیا اور ایک کو چھوڑ دیا، کہنے لگا، دیکھو ایک کو مار دیا، ایک کو زندہ کر دیا، اس کوڑھ مغز نے یہ نہ سمجھا کہ وہ جو زندگی تھی جس کو تو نے قتل کیا وہ تیری دی ہوئی تھی؟ پھر قتل ہی تو کیا، قتل سبب بنتا ہے موت کا، لیکن موت نہیں دے سکتا کوئی

موت کہتے ہیں جان نکالنا، اپنے قبضے سے اور قدرت سے رگ رگ سے اندر سے حیوۃ کو نکال دینا، یہ تھوڑا ہی کر سکتا تھا، اس نے قتل کر دیا، قتل پر موت مرتب ہوئی مگر دینے والے موت کے حق تعالیٰ ہی تھے۔ اگر یہ قتل کر دیتا، گردن کاٹ دیتا اور وہ یہ چاہے کہ زندگی نہ نکلے نہیں نکل سکتی۔ واقعات ہیں ایسے شہداء کے بہت سے کہ ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا انہوں نے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسرا ہاتھ کٹ گیا جھنڈا انہوں نے منہ میں لے لیا اور اس کے بعد جھنڈا منہ سے گر گیا تو انہوں نے لینے ہی لینے لڑھک کر کئی ایک کو مار ڈالا، اس کے بعد کہیں جا کر جان نکلی۔ تو محض قتل ہونے سے جان نکلنا ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہے تو جان جاتی ہے، ورنہ مقتول کے اندر بھی جان رہتی ہے، تو بہر حال اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (القرآن) موت بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، حیات بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جس کو چاہے زندگی دے جس کو چاہے موت دے۔

زندگی کی حقیقت زندگی دینے کے معنی ہیں ”عطائے وجود“ وجود دے دینا دوسرے کو تو ظاہر بات ہے کہ انسان میں قدرت نہیں ہے کہ دوسرے کو وجود دے دے، اس لیے کہ خود اس کا وجود ہی اس کے قبضے میں نہیں۔ اگر بالفرض اس نے اس کو اولاد دی تو وجود دینے والا باپ یا ماں نہیں، وہ زندگی دینے کا اور وجود دینے کا سبب بنا ہے۔ لیکن دینے والا دوسرا ہے، اگر اس کے ہاتھ میں، قبضے میں وجود ہوتا تو یہ خود کبھی نہ مرتا، کون موت کو پسند کرتا ہے، اگر حیات قبضے میں ہو تو آدمی موت کو روک لیا کرتا۔

اگر زندگی دینا قبضہ میں ہو۔ تو جن کے اولاد نہیں ہوتی وہ ضرور اولاد کو پیدا کر لیا کرتے، اولاد پیدا ہونے کے اسباب سارے مہیا کرتے ہیں اور برس گزر جاتے ہیں اولاد نہیں ہوتی، کوئی دعائیں کراتے ہیں، کوئی تعویذ کراتے ہیں کوئی طبیبوں کے پاس جاتے ہیں۔ اگر قبضے میں زندگی تھی تو کیوں نہ دے دی اور بچے کو پیدا کر لیا، پھر اگر کوئی مر رہا ہو تو کسی کے قبضے میں نہیں کہ پل بھر کے لیے روک لے زندگی کو۔ ساری دنیا کے خزانے جمع کر لو اور یہ چاہو کہ ایک منٹ کے لیے اس میت کو روک لو، جان نہ نکلے تو یہ قبضہ قدرت میں نہیں، سب عاجز بنے ہوئے دیکھتے ہیں۔ نزع ہو رہا ہے، سانس چل رہا ہے، ماں باپ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن کچھ نہیں کر سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور حیات ان کے قبضے میں نہیں ہے، اسباب زندگی کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، اسباب موت کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، لیکن خود موت و حیات ان کے ہاتھ میں نہیں۔

تو اللہ کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ موت اور حیات اس کے قبضے میں ہے جسے چاہے وجود دے دے جس سے

چاہے وجود چھین لے، تو جو ایسا قادر مطلق ہوگا حکومت اس کے سزاوار ہے، حکمرانی اسی کا حصہ ہے، اسی واسطے اسلام میں حکومت اس کی ہوگی، چلانے والے تم ہو گے تاکہ تمہیں اجر ملے، ثواب ملے۔ تم خود حاکم نہیں اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰہِ صرف اللہ کا کام ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰہِ ملک صرف اسی کا ہے، تو ملک کا مالک کوئی نہیں، قدرت کا مالک کوئی نہیں، زندگی اور موت کا مالک کوئی نہیں یہ صرف اللہ رب العزت ہے کہ وجود اور عدم موت اور حیات دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو فرمایا کہ اس سے زیادہ اقتدار والا بادشاہ کون ہے کہ موت و حیات بھی قبضہ میں ہے۔ تو خود ذات مبارک تَبَارَكَ اور اَلَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ قبضہ پورے ملک کے اوپر ہے اور وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ ہر چیز پر قادر ہے حتیٰ کہ موت اور حیات پر قادر۔

مقصد موت و حیات..... اور یہ موت و حیات کیوں دی، کیا ضرورت تھی اس سلسلے کی کہ کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، کوئی آ رہا ہے، کوئی جا رہا ہے، کسی کو غم ہے، کسی کو خوشی ہے، یہ کیوں کیا: لِيَسْلُوْكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ اللہ جانچ لے کہ تم میں کس کا عمل اچھا ہے، کس کا برا ہے، اس واسطے کہ انسان سب سے پہلے میت ہی تھا، کوئی تھا ہی نہیں وجود اس کا، اس کے بعد حق تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا وجود دیا تو وہ عدم سے وجود میں آیا، اس کے بعد پھر موت دی تو قبر میں چلا گیا۔ اس کے بعد پھر حیات دیں گے تو حشر میں پہنچ جائے گا۔ تو دو دو موتیں اور دو دو حیاتیں واقع ہوتی ہیں۔

موت و حیات کے تدریجی نظام کی حکمت..... اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! حیات بھی مسلم اور موت بھی مسلم، مگر یہ سارے انسان ایک دم پیدا ہو جاتے ہیں، ایک دم ایک دن میں سب کا انتقال ہو جاتا ہے، روز روز کی جھک جھک نہ رہتی، کوئی مر رہا ہے کوئی جی رہا ہے، تو ایک ہی دفعہ موت دے دیتے، ایک ہی دفعہ زندگی۔ (آخر ایسا کیوں نہیں کیا؟) اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر ایک دن سب مرتے، عبرت پکڑنے والا کوئی نہ رہتا، تو موت کو جہاں ذریعہ بنایا ثمرات ظاہر ہونے کا، وہاں عبرت کا بھی تو ذریعہ ہے، کہ دوسرے کی موت دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے کہ مجھے بھی اس راستے جانا ہے تو میں کوئی اچھا عمل کر لوں۔ تو عمل پر ابھارنے کے لیے ضرورت تھی کہ موت اور حیات کا سلسلہ مسلسل رہے (ایسا نہ ہو کہ) ایک ہی دن میں سب پیدا ہوں اور ایک دن میں سب مریں (بلکہ) کوئی مرے کوئی جئے، کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے تو آنے پر خوشی، جانے پر رنج آنے پر توقع کہ اچھے اعمال کا ظہور ہوگا۔ جانے پر عبرت کہ جب یہ جا رہا ہے اور اب یہ بھگتے گا تو ایسا نہ ہو کہ ہم جانے لگیں اور کوئی ایسی بری حرکت کر کے جائیں کہ ہمیں بھگتنا پڑے تو عبرت کا مقام نہ ہوتا، اگر موت و حیات کا مسلسل سلسلہ نہ رہتا، تو موت پر قادر، حیات بھی قادر اور موت اور حیات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ بیک دم نہ موت نہ بیک دم حیات رکھی، تاکہ عبرت موعظت، ترقی درجات مدارج، یہ انسانوں کو حاصل ہوں اور یہ جب ہی ہوں گے کہ میت کو دیکھے اور عبرت پکڑے کہ کل کو ہمارے لیے بھی یہ دن آنے والا ہے۔ تو اَلَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَسْلُوْكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔

محبوب القلوب بادشاہ..... اور فرمایا کہ یہ ہم کیوں قادر ہیں؟ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ۔ اس لیے کہ ہم عزت والے ہیں، عزت کی ہمارے یہاں کوئی انتہاء نہیں، تو جس کی عزت اور جس کا اقتدار ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ تو جو بے عزت ہو اس کی وقعت ہی نہیں ہوگی تو وہ حکمرانی کیا کرے گا.....

عزت والا ہی تو حکمرانی کرتا ہے۔ اگر بادشاہ کی نسبت تو ہیں بیٹھ جائے کہ یہ تو بڑا ذلیل آدمی ہے، اس کے تو بڑے بڑے افعال ہیں تو وقعت ہی نہیں ہوگی، تو حکم ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ جو سلاطین بد اخلاق گزرے ہیں یا سید کا رگزرے ہیں مخلوق لعنتیں بھیجتی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے یہ ختم ہو جائے۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایسے کا حکم ماننا زبان سے تو ممکن ہے، مگر سور غبت سے کوئی ماننے والا نہیں۔ اور حق تعالیٰ کا مشاء یہ ہے کہ انسان جب ہمارا نائب بن کر حکومت کرے تو وہ اتنا محبوب القلوب ہو کہ رعایا اس کے لیے دعا مانگے، اس کے لیے یوں کہے کہ اس بادشاہ کی عمر دراز ہو، برکتوں کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں، پورے ملک کے اندر برکات پھیل رہی ہیں۔

تو بادشاہ کے لیے محبوب القلوب ہونا ضروری ہے، جب بادشاہ کی محبت نہیں ہوگی، کام نہیں چلے گا، اور محبت جب ہوگی جب سرچشمہ خیر و برکت ہوگا، تب محبت ہوگی ورنہ عداوت ہوگی..... تو محبت ہونی چاہیے، محبت جب ہوگی، جب عزت والا ہو، اور عزت والا وہی ہے جو خیر و برکت کا حامل ہے، خیر نہ ہوئی شر ہوا، تو عزت کے بجائے ذلت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ وَهُوَ الْعَزِيزُ وَهُوَ الْعَزِيزُ وہ عزت والا بھی ہے اور اقتدار اور جلال والا بھی ہے کہ سب ہیئت زدہ بھی ہیں، محبت والے بھی ہیں، مگر اس کے بعد فرمایا کہ جلال محض نہیں۔ بخشے والا بھی بہت ہے، نخی بھی بہت ہے، داتا بھی بہت ہے (چاہے) اس کا نام لینے کو برا کہیں، اس کے مقابلے پر لوگ آگئے ہیں، لیکن نہ سورج نکلنا بند ہوتا ہے، نہ سبزیاں اگنی بند ہوتی ہیں، نہ بارشیں برسی بند ہوتی ہیں۔

ادیم زمین سفرۃ عام اوست چہ دشمن بریں خوان ینغاچہ دوست

اس کا دسترخوان پھیلا ہوا ہے، دوست اور دشمن سب کھا رہے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ سورج نکلے تو دوستوں کے گھر پر تو دھوپ ڈالے اور جو اللہ کے دشمن ہیں ان کے گھر میں اندھیرا ہے وہاں بھی سورج پہنچ رہا ہے۔ بارش میں یہ نہیں رکھا گیا کہ دوستوں کے گھر پر اور ان کے کھیتوں پر تو بارش ہو اور دشمن کے کھیت خشک ہو جائیں۔ جب بارش آتی ہے تو سب کے کھیتوں پر جاتی ہے تو ایسا عام دسترخوان ہے کہ دوست دشمن سب بل رہے ہیں۔ تو مغفرت والا بھی ہے، رحم و کرم والا بھی ہے۔ اپنی مخلوق کے اوپر بے انتہا شفیق بھی ہے۔

جلال و جمال کی جامع بادشاہت..... جیسے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے بیان فرمایا: ایک شخص نے ایک چڑیا کے بچے پکڑ لیا، وہ بچوں کو لے کر آیا تو اس کی ماں چڑیا وہ اس کے سر پر منڈلا رہی ہے اور وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی پھر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اسے بچوں کی محبت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! اتنی بڑی محبت ہے اس کے دل میں اس لیے پھڑ پھڑا رہی ہے اور اپنی جان دینا گوارا کرے گی مگر بچوں

پر آج آنے کو گوارا نہیں کرے گی۔ فرمایا بے حد محبت میں یہ پھڑ پھڑا رہی ہے اس کو سامنے رکھ کر فرمایا: سمجھ لو کہ جب ایک جانور اور ماں بنا جانور اور یہ محبت ہے تو اللہ جو سرچشمہ ہے سب کے وجود کا جس نے بنایا اسے کیسے محبت نہ ہوگی اپنی مخلوق سے اسے کہیں زیادہ محبت ہے اپنی مخلوق سے جتنا کہ جانور کو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ جب وہ محبت والا ہے، جبھی تو بخشش عام ہے، مسلم ہو یا کافر ہو، مطیع ہو یا فاسق، دھوپ، بارش، غلہ، کھانا، پینا، اور پھل سب کے لیے عام ہے، ورنہ دوستوں کے لیے کرتے، دشمنوں کے لیے نہ رکھتے، وہ بحیثیت مخلوق کے ان پر بے حد شفیع ہے۔ تو: **الْعَزِيزُ الْغَفُوْرُ** (القرآن) عزت والا بھی ہے اور چشم پوشی کرنے والا بھی ہے۔

اخیر میں جب کوئی نہیں مانے گا تو فطرت کے مطابق سزا دیں گے، لیکن عین گناہ کی حالت میں فوراً سزا نہیں دیتے کہ شاید اب بھی سنبھل جائے، اب بھی سنبھل جائے، بخشش کا دروازہ عام ہے، تو یہاں چار وصف ہو گئے، ایک تو یہ کہ ذاتِ بادشاہ یعنی اللہ کی ذاتِ مبارک ہے، برکت والی ہے۔ دوسرے یہ کہ قادر ہے۔ **بِيَدِهِ الْمُلْكُ**۔ اس کے قبضے میں ہے۔ تیسرے یہ کہ: **عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ**۔ قدرت اور اقتدار اس کا انتہائی ہے۔

اور ساتھ میں یہ کہ عزیز بھی ہے عزت والا بھی ہے جس کی وجہ سے سب مغلوب ہیں اور ساتھ میں غفور بھی ہے کہ محبت بھی کرتے ہیں، تو محسن بھی ہے، صاحبِ جلال بھی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ: **نَبْنِي عِبَادِي أَنْتَنِي أَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ** ۵۰ **وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيْمُ** ① اے پیغمبر! مطلع فرما دیجئے مخلوق کو اور اپنی امت کو، میں کون ہوں؟ **أَنَا الْغَفُوْرُ**..... (میں بہت ہی بخشش کرنے والا ہوں)

تو جمال متوجہ ہوتا ہے، تو بادشاہ اگر محض جابر و قاہر ہی ہو کہ جبر و قہر ہی کرے، تو رعایا کا ناس مارا جائے، اگر محض جیل ہی جیل ہو کہ رحم و کرم کرتا رہے، غصہ نہ کرے، تب بھی ناس مارا جائے۔ اس لیے کہ بہت سی حرکات غصہ اور قہر سے رکتی ہیں، محض انعام و اکرام سے نہیں رکیں، دونوں شانیں ہونی چاہی ہیں، بادشاہ میں کہ جلال بھی ہو اور اکرام بھی ہو، جلال بھی ہو اور جمال بھی ہو، عزت و اقتدار اور قہر بھی ہو اور مغفرت و بخشش اور تدبیر بھی ہو۔ **وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُوْرُ**۔ یہ پانچ اوصاف بیان کیے گئے، یہ ذاتِ بادشاہ کے اوصاف تھے۔

لوازمِ بادشاہت..... اور یہ کہ اس کے افعال کیا ہیں وہ اس سے اگلی آیت میں ہیں وہ انشاء اللہ پھر کل بیان ہوں گے۔ میں نے کل عرض کیا تھا کہ یہ سورت شہنشاہی خداوندی کے اصول پر مشتمل ہے اور حکمرانی کے اصول اور لوازم ارشاد فرمائے گئے ہیں، سب سے اول بادشاہ عالمین کی ذات کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ مبارک ہے، پھر اس کی صفات کمال کا تذکرہ کیا گیا جو حکومت کے لیے ضروری ہیں، ان کی کل تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ آج کی آیتوں کی تفسیر کا حاصل لوازمِ بادشاہت ہوگا۔

یہ فطرتِ انسانی میں داخل ہے کہ جب کوئی حکومت قائم کی جاتی ہے تو سب سے اول دارالحکومت کی بنیاد

ڈالتے ہیں، دارالسلطنت یا دارالخلافہ کہ جس کو باب عالی یا باب حکومت کہا جاتا ہے وہ قائم کرتے ہیں، اور اس کو نہایت مستحکم اور مضبوط بناتے ہیں۔ دشمنوں کا حملہ سب سے پہلے دارالسلطنت پر ہوتا ہے اگر وہ قبضہ میں آ جاتا ہے تو پورا ملک فتح مند سمجھا جاتا ہے، اس لیے دارالحکومت کو بہت ہی زیادہ مضبوط اور مستحکم بنایا جاتا ہے، بڑے بڑے قلعے تعمیر کئے جاتے ہیں اور اگر کوئی بڑی سلطنت ہے تو ساتھ ساتھ شہر پناہ میں قائم کی جاتی ہیں اور ہر شہر پناہ کے اندر بڑی بڑی فوجیں رکھی جاتی ہیں۔ جن کے ساتھ میں سامان جنگ ہوتا ہے، جس زمانے کے مناسب جو کچھ سامان ہو یا جس ملک کے مناسب جو سامان ہو وہ فراہم کیا جاتا ہے۔ گولہ اور بارود اور آج کے دور میں مثلاً بم اور بڑی بڑی دور مار توپیں اور مشین گنیں جیٹ طیارے یہ زیادہ سے زیادہ دارالسلطنت کے لیے مہیا کیے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق اطراف ملک میں بھی یہ قوتیں قائم کی جاتی ہیں، مختلف چھاؤنیاں بناتے ہیں..... مگر دارالسلطنت کو مضبوط رکھتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ غنی ہیں کہ ان کی حفاظت کے لیے کوئی دارالسلطنت بنے یا ان کے لیے قلعے بنائے جائیں وہ تو خود حافظ و حفیظ ہیں وہ خود جہانوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، ان کی حفاظت کے کوئی معنی ہی نہیں۔
لوازم سلطنت..... لیکن چونکہ ان کی صفت ہے ”مَلِک“ اور بادشاہ ہونا ہے۔ اس صفت کے اظہار کے لیے تمام لوازم سلطنت قائم کئے جاتے ہیں۔ تو سب سے پہلے شاہی قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اور وہ بھی سات پناہوں کا جن کو سات آسمان کہتے ہیں۔ تو آسمان زمین سے زیادہ مضبوط ہے، زمین کمزور ہے لیکن آسمان مضبوط ہے۔ زمین میں روزانہ آپ تصرف کرتے ہیں، کہیں کھود کر کنویں بنارہے ہیں کہیں سڑکیں نکالی جا رہی ہیں، روزانہ تغیر و تبدل زمین میں ہوتا ہے، لیکن آسمان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں، جب سے آسمان بنائے گئے ہیں، ہزاروں برس سے اس وقت تک یکساں حالت پر قائم ہیں۔

بادشاہ کی سات شہر پناہیں اور انسان کی وہاں تک رسائی؟..... اب یہ کہ وہ آسمان کہاں ہیں؟ تو ہو سکتا ہے کہ یہ جو نیلگوں اور چھت سے نظر آتی ہے یہی آسمان ہو، لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں کہ یہ آسمان نہیں، تو ہمیں بھی کوئی اصرار نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نیلگوں چھت جو ہے اس کے اوپر آسمان ہو اور یہ نیلگوں چھت ایسی ہو جیسے ایک بڑی چھت کے نیچے شہتیری لگا دیتے ہیں اور شامیانہ تان دیتے ہیں۔ تو ہو سکتا ہے کہ یہ نیلگوں آسمان نہ ہو، آسمان اس سے بالاتر ہو۔

اس لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک پانچ سو برس کی مسافت ہے اور چونکہ مبالغہ اور استحسان ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس واسطے وہ پانچ سو برس کی مسافت تیز رفتاری پر طے ہونی چاہیے، زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری ہو وہ پانچ سو برس میں وہاں تک۔ آج بڑی سے بڑی تیز رفتار سواری اگر ہو سکتی ہے تو راکٹ ہو سکتا ہے کہ جو ایک گھنٹے میں، پچیس سو میل یا پچیس ہزار میل جانے والی سواری ہے اور ممکن ہے کل کو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار

سواری بن جائے تو وہ ایک گھنٹے میں پانچ سو کے بجائے پانچ ہزار یا پچیس ہزار کے بجائے پچاس ہزار میل طے کر لے، ایک لاکھ میل طے کر لے، پل بھر میں پہنچ جائے تو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سواری پر اگر سوار ہو کر جایا کرے تو پانچ سو برس میں آدمی آسمان پر پہنچ سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کی نہ اتنی عمر ہے کہ وہ اس سواری پر سوار ہو کر اور پانچ سو برس طے کرے، آج بڑی سے بڑی عمر ہے تو وہ ساٹھ ستر برس کی ہے، سو برس کی ہو جائے گی تو اس عمر پر انسان طے نہیں کر سکتا جب تک کہ مدد خداوندی شامل حال نہ ہو۔ اسی واسطے ایک موقع پر قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

يَسْمَعُ سِرَّ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ إِنَّ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَنِ. ① اے جنوں! اور انسانو! اگر تم یہ کوشش کرنا چاہتے ہو کہ زمین اور آسمانوں کے فاصلے طے کر لو اور ان کی اقطار سے گزر جاؤ۔ قطر کہتے ہیں اس خط کو جو دائرے کے بیچ میں ہوتا ہے، اس سے پار ہو جاؤ تو ہو سکتے ہو، محال نہیں، لیکن ہونہیں سکتے، إِلَّا بِسُلْطَنِ. جب تک کہ اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہ دی جائے تمہیں۔ کوئی حجت تمہارے ہاتھ میں نہ ہو، اس وقت تم آسمانوں تک نہیں جا سکتے، آسمان سے نیچے نیچے جہاں تک تمہارا نبی چاہے چلے جاؤ، جہاں تک طاقت ہو۔

بادشاہ کا نظام کو اکب..... آج اگر کوئی چاند پر پہنچنا چاہے تو وہ پہنچ سکتا ہے۔ شریعت کے اصول سے کوئی بعید بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نظام کو اکب، ستاروں کا نظام سب آسمانوں سے نیچے ہے..... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صریح روایت میں موجود ہے اس میں ہے کہ یہ تمام ستارے یہ آسمان کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں اور ان میں سونے اور چاندی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں اور ملائکہ کے ہاتھ میں ہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہیں۔ قیامت کے دن جب آسمان ٹوٹیں گے اور ملائکہ علیہم السلام کو بھی وفات دے دی جائے گی، زنجیریں چھوٹ جائیں گی، وہ سارے ستارے ٹکڑے ہو کر نیچے آ پڑیں گے قیامت قائم ہو جائے گی۔

آج کی دنیا میں کہا جاتا ہے کہ ستارے باہمی کشش سے قائم ہیں، ایک دوسرے ستارے کو کھینچ رہا ہے اس لیے وہ معلق ہیں۔ تو انہوں نے اسے کشش سے تعبیر کر دیا شریعت نے اس کشش کی حقیقت بتلا دی کہ وہ ملائکہ ہیں جنہوں نے اپنی طاقت سے ستاروں کو تھام رکھا ہے۔ تو ہمیں کشش سے انکار کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ پھر حیات پر پہنچے ہے حسی چیزوں میں کشش ہوتی ہے، شریعت اس کا انکار کیے بغیر اس کی حقیقت بتلاتی ہے کہ اس پر کشش کو تھام رکھا ہے فی الحقیقت ملائکہ علیہم السلام نے ان کی معنوی قوت نے ستاروں کو لٹکا دیا۔ تو یہ سارا نظام کو اکب آسمانوں سے نیچے نیچے ہے آسمان اس سے بالاتر ہے تو سات آسمان تعمیر کئے گئے، گویا سات شہر بنا دیے گئے۔

عظیم بادشاہ کا عظیم دار السلطنت اور اس کے حفاظتی انتظامات..... اس لیے کہ جب بڑی حکومت ہوتی ہے تو چھوٹا موٹا قلعہ کام نہیں دیتا، جب تک کہ ساتھ ساتھ شہر بنا دیں نہ ہوں۔ تو سات شہر پناہ کا ایک

دار السلطنت بنایا گیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آخری حصہ میں تخت شاہی رکھا جاتا ہے تو ساتوں آسمانوں کے اوپر جا کر عرش عظیم قائم کیا گیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے قلعے جب تعمیر ہوتے ہیں تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے ان کے ارد گرد خندقیں کھودی جاتی ہیں، پانی بھرا جاتا ہے ان میں اگر کوئی قریب بھی پہنچے تو دیوار تک نہ پہنچ سکے قلعے کی۔ سب سے زیادہ گہری خندق ڈالتے ہیں اور اس میں بہت گہرا پانی ہوتا ہے۔ اب اس میں کوئی کشتیاں بنائے اتنے بنائے گا قلعے والے اوپر سے گولیاں برسا کر اس کا استیصال بھی کر دیں گے۔ تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے اول تو سات قلعے بنائے گئے اور پھر اس کے باہر جا کر ایک بڑی خندق بناتے ہیں جس میں پانی بھرتے ہیں تو پانی کے اوپر نرم مخلوق ہے۔ اس پر چلنا آسان نہیں ہے اس واسطے پانی پر آ کر دشمن رک جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے سات آسمان بنائے گویا سات قلعے تعمیر کیے اور اس کے بعد ایک عظیم الشان سمندر بنایا۔

تخت شاہی کا مقام..... اس سمندر کی بڑائی حدیث میں آتی ہے کہ ”آسمانوں اور زمینوں کے برابر اس دریا کی ایک ایک موج ہے“ اس سے اوپر عرش عظیم قائم کیا، تو سات قلعے ہیں اس کے، اس کے بعد خندق بنائی گئی اور وہ خندق بھی جیسا قلعہ ہے ویسی خندق، جیسا بادشاہ ہے ویسا ہی اس کے لیے سامان۔ تو خندق ایک عظیم سمندر ہے اور اس سمندر کی ایک ایک موج آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔

اس کے اوپر عرش عظیم قائم کیا گیا، تو گویا دار السلطنت قائم کرنے میں پہلے قلعے بناتے ہیں، قلعے کے بعد خندق بناتے ہیں اور ساتویں قلعے میں پھر تخت شاہی رکھا جاتا ہے جو بادشاہ کی علامت ہوتی ہے۔ اسی تخت سے احکام جاری ہوتے ہیں، تو وہ تخت شاہی عرش عظیم ہے، ساتویں آسمان کے اوپر سمندر ہے، ان پر عرش عظیم قائم کیا گیا ہے۔

تو عرش کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے یہ سات آسمان قیوں (گیند) کی طرح سے ہیں، ایک دوسرے کے اوپر، اور عرش نے سب کو گھیر رکھا ہے، سارے آسمان، ساری زمینیں، سارے سیارات اس عرش کے نیچے ہیں تو ترتیب معین ہوگئی کہ نیچے زمین، اوپر آسمان، اوپر سمندر، اس سے اوپر پھر عرش عظیم ہے، تو ایک شاہی قلعہ بنا اور تخت شاہی رکھا گیا۔

سرکاری مہمانوں کے لیے گیسٹ ہاؤس..... تو یہ بھی قاعدہ ہے کہ بہر حال حکومت کے مہمان بھی آتے ہیں تو ان کے لیے ایک ایک گیسٹ ہاؤس بنایا جاتا ہے، ایک بہت بڑا مہمان خانہ، اتنا بڑا کہ جو سارے مہمانوں کے لیے مناسب ہو۔ اس لیے کہ بادشاہ کے پاس چھوٹے موٹے قسم کے لوگ تو پہنچتے نہیں، وہاں والیان ملک اور بڑے بڑے نواب، راجہ بھی پہنچ سکتے ہیں کہ جو بادشاہ کے مہمان ہوتے ہیں تو ان کے مناسب حال ضرورت تھی کہ گیسٹ ہاؤس بنے، سرکاری مہمان خانہ بنے۔ تو وہ سرکاری مہمان خانہ اسی کا نام جنت ہے یہ جنت جو ہے یہ عرش عظیم کے نیچے ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سات آسمان ہیں۔ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا مقام سدرة المنتہی ہے اور یہ ساتویں آسمان

پر ہے۔ اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰی﴾ ① سدرۃ المنتہی کے پاس سے جنت الماوی شروع ہوتا ہے، تو حدیث اور آیت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکل آیا کہ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور چوتھی ایک دوسرے کے اوپر سو (۱۰۰) ہیں ایک ایک جنت آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے، تو اندازہ کیجئے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے تو لاکھوں آسمانوں کے برابر ایک جنت ہی ہوگی۔ یہ ہے سرکاری مہمان خانہ کہ جس میں سرکاری مہمان رکھے جائیں گے۔

آمد مہمانان اور سرکاری مہمان کب پہنچیں گے؟ جب آسمان بچ سے نکال دیئے جائیں گے جب ہی تو پہنچیں گے، اس لیے کہ اصل مہمان ملائکہ تو ہیں نہیں، یہ تو خدام ہیں جو کام کر رہے ہیں۔ مہمان تو وہ جو اللہ کے بتلائے ہوئے طریق پر اور راستے پر چل کر اس تک پہنچیں گے۔ وہ راستہ شریعت ہے اس پر چلنے والے انسان ہیں، تو حقیقت میں سرکاری مہمان یہ انسان ہوں گے جو ٹھیک اس راستہ پر پہنچ کر جو جنت کو جا رہے ہیں وہیں پہنچ جائیں۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد جتنے اہل جنت ہیں وہ جنت میں بطور مہمان کے داخل کئے جائیں گے۔

خصوصی مہمانی اور خوب ان کی مہمانی ہوگی کہ ان کے لیے زمین کی روٹی اور مچھلی کے جگر کا سالن بنایا جائے گا اور تین دن کی مہمانی اس انداز سے ہوگی کہ ان کو روٹی تو دی جائے گی اس زمین کی یعنی یہ پوری زمین اس کی ایک روٹی بنادی جائے گی اور زمین جس پر قائم ہے وہ ایک عظیم الشان مچھلی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے اس کے جگر کے کباب ہوں گے، تو زمین کی روٹی اور مچھلی کے کباب اور وہ بھی اس کے جگر کے جو سب سے زیادہ لذیذ گوشت ہوتا ہے، وہ غذادی جائے گی۔

مہمانی کے لیے زمین کی روٹی کا انتخاب آپ سوال کریں گے کہ یہ زمین تو مٹی ہے اور اس کی روٹی تو بڑی چڑی ہوگی تو کھائی کس طرح سے جائے گی؟ اللہ چلاں کے یہاں مہمانی ہو اور چڑی روٹی ملے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ آج جو آپ غذا کھا رہے ہیں وہ بھی تو زمین ہی کھا رہے ہیں اس لیے کہ زمین ہی میں غلہ بھی دانے بھی، چنے بھی، گیہوں بھی، پھل پھول فروٹ سب زمین سے نکلتے ہیں تو یہ زمین کے ٹکڑے ہیں جو آپ کھاتے ہیں۔ لیکن اللہ نے کچھ ایسی مشینیں لگا رکھی ہیں قدرتی کہ ان کے ذریعے چڑیا مادہ صاف کر کے خالص مڑے کی چیز بنادی جاتی ہے۔

سیب کے کھانے میں کبھی چڑیا پن محسوس نہیں ہوتا، انگور کھانے میں کبھی چڑیا پن نہیں، حالانکہ یہ وہی مٹی ہے۔ اسی کا اللہ نے جو ہر بنا کر چڑیا پن، باطنی مشینوں سے نکال دیا اور صاف ستھرا مادہ خوشبودار سیلا بنا کے آپ کو دیا۔ تو جب آج بھی آپ مٹی کھا رہے ہیں۔ اور چڑیا مادہ نہیں آتا تو کیا تعجب ہے کہ حق تعالیٰ اس دن ساری زمین

کا چڑا چڑامادہ نکال کر اس کا اصل جوہر بنادیں۔ اس لیے کہ سارے مزے اس زمین ہی میں تو چھپے ہوئے ہیں، یہ سیب، انگور، انار، امرود جو ہے زمینی ہے، تو زمین ہی میں یہ سارے ذائقے چھپے ہوئے ہیں، مٹینوں کے ذریعے ان ذائقوں کو الگ الگ کر کے چڑا چڑامادہ نکال دیتے ہیں تو سارے ذائقوں کا مجموعہ یہ زمین ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ اس دن اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کے سارے مزے ایک جگہ جمع کر کے چڑا چڑامادہ الگ کر دیں۔ اور ان سارے مزوں کی ایک روٹی بنادیں، تو دنیا کے جتنے پھل اور فروٹ ہیں سب کے ذائقے اس روٹی کے اندر ہوں گے، کوئی ذائقہ نہیں چھوٹا ہوا ہوگا، سارے ذائقے آجائیں گے۔

زمینی روٹی اور مچھلی کے سالن کی حکمت اور یہ اس لیے کریں گے کہ اول تو دنیا میں ہر انسان نے دنیا کا ہر پھل نہیں چکھا ہر ملک کے الگ الگ پھل ہوتے ہیں، جو ترکی میں ہے وہ ہندوستان میں نہیں جو ہندوستان میں ہے وہ ایران میں نہیں، جو ایران میں ہے وہ افغانستان میں نہیں۔ تو لاکھوں کروڑوں انسان وہ ہیں جو اپنے اپنے خطے کے پھل تو کھائے ہوئے ہیں لیکن ساری زمین کے سارے ذائقوں سے واقف نہیں، ہو سکتا ہے کہ شکایت کرے بنی آدم کہ ہمیں آدھے تہائی پھل دیئے، وہ انہیں دیئے۔

کچھ ہمیں دیئے، ہم تو واقف نہیں زمین کے سارے ذائقوں سے، اس لیے سارے ذائقے جمع کر کے بنی آدم کو جو روٹی ہے وہ کھلا دیں گے تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اور سالن بنائیں گے مچھلی کے جگر سے، اس لیے کہ غذائیں دوہی ہیں دنیا میں یا بری یا بحری، تو بحری غذاؤں میں سے سب سے اعلیٰ ترین غذا مچھلی اور بری غذاؤں میں سب سے اعلیٰ ترین غذا یہ فروٹ اور پھل اور دانے، تو زمین کا جو ہر نکال کے تو سارے فروٹ اور دانے جمع کر دیئے اور ان کا مزہ ایک جگہ ہو گیا۔ اور بحری چیزوں میں وہ مچھلی کہ ساری مچھلیوں کی ماں ہے، وہ اور اس میں سے ساری مچھلیاں نکلی ہیں اور مچھلیوں کی اقسام ہیں۔ کسی مچھلی کا کچھ ذائقہ ہے، کسی کا کچھ ہے۔ اقسام ہیں وہ ساری قسمیں جمع ہو جاتی ہیں اس مچھلی میں جا کے جس پر زمین قائم ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دریائی غذاؤں کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اور بری اور خشکی کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اس کی روٹی بنادی اور اس کا سالن بنادیں گے، تو بحر و بر کی ساری غذائیں سارے بنی آدم نے چکھ لیں۔ اور یہ کیوں چکھائیں گے؟ ابتدا ہی میں جنت کی غذائیں کیوں نہ دے دیں؟ بتلانا یہ ہوگا ساری زمین کے ذائقے کھلا کر بس یہ ہیں وہ ذائقے جن پر تم رات دن لڑتے مرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بس سب کچھ یہی ہے۔ اب یہ کھا کر اب ہمارے بنائے ہوئے ذائقے کا مزہ چکھو جو ہم نے تیار کیے ہوئے ہیں، جنت میں مقیمین کے لیے تاکہ توازن اور تقابل کر سکو۔ وہ موت کی تلخی نے سارے ذائقے بھلا دیئے، کوئی چیز ذہن میں نہیں کہ کیا کھائے کیا نہیں کھایا۔ اس واسطے ان سارے ذائقوں کو عین جنت میں کھلا کر تازہ کر دیں گے کہ بس یہ تھے وہ ذائقے جن پر آپ جی جی کر سر پھٹول کیے رہے، اور مارا مار ہی کیے رہے۔ اور ایک افراتفری کی یہ تھے وہ ذائقے اسی

کے لیے تو لڑائی ہوتی تھی۔ یہ کل ڈالتے چکھ لیے یہ کل تمہاری لڑائی کی کائنات تھی۔

دنیوی لذتیں چھڑانے کی حکمت..... اور جس کائنات کا اور جن نعمتوں اور لذتوں کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے اب وہ چکھو تو اس وقت مخلوق کو حیرانی ہوگی۔ جب مٹی ملا ہوا گھونٹ اس قدر ذائقہ دیتا ہے، تو جب مٹی بالکل صاف ہو کر خالص ذائقہ دیں گے تو اس میں کیا کیفیت ہوگی اور کیا سرور ہوگا؟ لیکن اس سرور کو سمجھانے کے لیے پہلے یہاں کے مزے چکھا دیں گے کہ اب تقابل کرو کیا چیز ہم نے چھڑوائی تم سے اور کیا ہمیں دینا ہے؟

ہم اگر چھڑوا رہے تھے دنیا کی لذتیں تو معاذ اللہ! تمہارے ساتھ عداوت نہیں تھی بلکہ یہ تھا کہ ادنیٰ کو چھوڑ کر اعلیٰ کی طرف جاؤ۔ جنہوں نے چھوڑا انہوں نے تو اسے پایا، اور جنہوں نے نہیں چھوڑا اونچے میں دھکے کھائے اس چیز کے تئیں۔ مگر بہر حال جب وہ بھول بھال چکے اب ہم وہ اپنے ڈالتے چکھاتے ہیں، مگر یاد دلانے کے لیے پہلے ان ذائقوں کو سامنے کیے دیتے ہیں تاکہ تمہیں جنت کی قدر محسوس ہو، تو بہر حال اہل جنت کو جنت میں تین دن مہمان رکھا جائے گا اور اس میں غذا وہ دی جائے گی جس سے وہ مانوس تھے اور برس با برس کھائے ہوئے آرہے تھے۔

ابدی قیام کی بشارت..... تین دن کے بعد جب مہمانی پوری ہو جائے گی، تو قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ارشاد فرمادیتے کہ اب نکلو جنت سے کہ بس تین دن کی مہمانی، تین دن سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں، لیکن کریم کی شان سے یہ بعید ہے کہ کوئی نعمت دے کر پھر اسے واپس لے۔ اس لیے فرمائیں گے کہ جس نے جس محل پر قبضہ کیا، آج سے ابد الابد تک وہ محل اسی کا ہے، وہ سارا رقبہ اسی کا ہے، اب ہم واپس نہیں لیں گے..... یہ کریم کی شان سے بعید ہے کہ گھر میں رکھ کر اور پھر کہے نکلو گھر سے، بس جس گھر میں آگئے وہ آج سے تمہارا گھر ہے اور وہ محل کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہوگا۔

جنت کی ادنیٰ بادشاہت کا عالم..... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو جو رقبہ اور حصہ دیا جائے گا وہ دس دنیا کے برابر ہوگا، گویا دس دنیائیں بن جائیں اس کے اندر سے مع زمین اور بحر اور پہاڑوں سے تو دس گنا ہوگا، اس لیے کہ اللہ نے دس گنا کا اجر بھی رکھا ہے دنیا میں۔ اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی، یہ ضابطہ کا اجر ہے اور دس سے بڑھادیں تو یہ ان کے فضل سے بعید نہیں۔ چاہے سات سو گنا کر دیں۔ چاہے ستر ہزار گنا کر دیں، مگر دس گنا وہاں قاعدے میں ہے داخل، ضابطہ میں اسی قاعدے کے مطابق کم سے کم حصہ دنیا کا دس گنا ہوگا۔ یہاں مفت اقلیم پوری دنیا کی بادشاہت اور اسے دس جگہ جمع کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ستر اقلیم کا بادشاہ ہوگا آدمی وہاں اور وہ اقلیم بھی وہ کہ جہاں کوئی کدورت نہیں، کوئی غبار نہیں، کوئی طمع نہیں، کوئی پرانا پن نہیں۔ بلکہ بالکل صاف ستھری ابدی نعمت ہوگی اور دس دنیا کے برابر۔ تو یہ حق تعالیٰ کی کریمی ہے کہ مہمان بنا کر داخل کریں گے اور جو جہاں پہنچ گیا پھر اس سے واپس نہیں لیں گے کہ اب یہیں رہو اور ابد الابد تک رہو، کوئی تمہیں نکالنے والا نہیں، یہ ہے سرکاری مہمان خانہ۔ اور سرکاری مہمان خانہ ظاہر ہے کہ شاہی محلات کے قریب ہی ہوتا ہے تاکہ مہمانوں کو بادشاہ کے پاس آنے جانے میں دشواری نہ ہو، دوری نہ ہو۔

سرکاری جیل خانہ اور زیارۃ خداوندی سے محرومی..... جیل خانہ میں البتہ دور رکھتے ہیں، اس لیے کہ قیدیوں سے ملنے کے کوئی معنی نہیں، قیدی تو دور ہی رہے تاکہ اس کو حسرت ہو کہ میں نعمت کے گھر کے قریب بھی نہیں۔ تو جیسے سرکاری مہمان خانہ ضروری ہے، ایسے ہی سرکاری جیل خانہ بھی ضروری ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں ”جہنم“ ہے۔ اس میں وہ رہیں گے جو مجرم اور قیدی ہیں۔ اس کو ساتویں زمین کے نیچے رکھا گیا ہے جنت رکھی گئی ساتویں آسمان کے اوپر اور جہنم رکھا گیا ساتویں زمین کی تہ میں۔ تاکہ وہ اللہ کی رحمت سے بعید سے بعید ہو جائے اور اس کے قرب کی لذت کا تصور اس کے قلب میں نہ آ سکے اور قید کو اور عذاب کو اچھی طرح سے چکھے، تو بعد بھی ہوگا اور عذاب بھی ہوگا۔ اول تو اللہ سے بعید ہونا یہی ایک مستقل عذاب ہے اور بعید ہو کر بھی حسی عذابات بھی ہوں اور یہ عذاب در عذاب اور وہ عذاب ابدی اور دائمی ہوں۔ تو یہ عذاب در عذاب ہے تو بعد بھی ہوگا، عذاب کی نوعیت بھی شدید ہوگی۔ اور ابدال آباد کا عذاب ہوگا۔

مہمان خانہ میں زیارۃ خداوندی کے درجات..... اس کے بالمقابل سرکاری مہمان خانوں کے لیے قرب بھی انتہائی، کہ ہر وقت بادشاہ کی زیارت کر سکیں، حدیث میں ہے کہ بعض تو وہ ہوں گے جن کو چوبیس گھنٹے حق تعالیٰ کا مشاہدہ رہے گا۔ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کہ ایک لمحہ کے لیے بھی تجلیات خداوندی ان کی نگاہوں سے غائب نہیں ہوں گی۔ ہر وقت اللہ کو دیکھتے رہیں گے اور بعض وہ ہوں گے کہ ہفتے میں دو تین بار زیارت ہوگی جیسے اکمل اولیاء اللہ، اور علامہ مؤمنین وہ ہوں گے کہ ہفتے میں ایک بار ان کو زیارت کرائی جائے گی، دربار منعقد کیا جائے گا، انہی سو جنّتوں کے اوپر دریا ہے اور دریا پر عرش عظیم ہے اور عرش عظیم کے بازو میں ایک میدان ہے جس کا نام میدان مزید ہے۔

میدان مزید کی وسعت..... اس میدان کی بڑائی کا یہ عالم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو سید الملائکہ ہیں اور چھ سو بازو کے فرشتہ ہیں، چھ سو بازو ہیں اور جشان کا وہ ہے کہ اصلی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو دفعہ جو دیکھا۔ ایک دفعہ شب معراج میں اور ایک دفعہ وحی کی آمد کے وقت، وہ اس شان سے دیکھا کہ زمین سے آسمان تک جتنی فضا ہے سب بھری ہوئی ہے جبرئیل کے بدن سے۔ مشرق میں مونڈھا ہے اور مغرب میں دوسرا مونڈھا ہے اور سر آسمان کے قریب ہے اور پیر زمین کے قریب اور ایک نورانی چہرہ ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے اور تاج ان کے سر اوپر ہے اور سبزہ رداء (چادر) ان کے بدن کے اوپر۔ اس شان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا تو اتنے ذلیل ڈول کا فرشتہ، حضرت جبرئیل علیہ السلام وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس میدان میں گھومتا ہوں، مگر اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں کہ یہ میدان کہاں تک ہے۔ وہ میدان دربار خداوندی کا میدان ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے وسط میں بچھائی جائے گی کرسی حق تعالیٰ کی، جس کا ذکر ہے قرآن کریم میں: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۖ ① وہ کرسی آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے۔

حدیث میں ہے کہ کرسی جو سات زمین اور ساتوں آسمانوں سے زیادہ بڑی ہے۔ وہ ایسی ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھلا ڈال دیا جائے تو میدان کی بڑائی اور عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ کرسی بچھائی جائے گی میدان کے وسط میں۔ اس کے چاروں طرف منبر ہوں گے نور کے، وہ انبیاء علیہم السلام کے منبر ہوں گے اور گول دائرہ بنایا جائے گا، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام ان پر بیٹھیں گے اور ہر نبی کے منبر کے پیچھے اس کی امت کی کرسیاں ہوں گی، درجہ بدرجہ، جو دنیا میں جتنا زیادہ اطاعت گزار تھا اتنا ہی قریب ہوگا جینبر علیہ السلام کے۔ تو ہفتہ میں ایک دن جو جمعہ کا دن ہوگا، دربارِ خداوندی کا ہوگا۔

سرکاری سواریاں اس دن میں تمام اہل جنت اپنی اپنی سواریوں پر اس میدان میں آنے کے لیے چلیں گے اور کوئی نیچے کی جنت میں ہے، کوئی بیچ کی جنت میں ہے اور کوئی اوپر کی جنت میں ہے اور زمینوں اور آسمانوں سے بڑی سوچتیں ہیں۔ اس لیے ان کو سواریاں دی جائیں گی اور وہ سواریاں براق ہوں گی۔ رُفرف ہوں گے، تخت رواں ہوں گے کہ بڑی بڑی مسندیں سمجھی ہوئی ہیں اور قوت خیال سے وہ اڑیں گے۔ کوئی مشین نہیں ہوگی کہ کل گھمانی پڑے اور پیٹرول دینا پڑے۔ اس کا سارا پیٹرول مشینری ہماری قوت خیال ہوگی۔ وہ اتنی مضبوط بنا دی جائے گی کہ خیال یہ کیا کہ وہاں پہنچیں، پل بھر میں وہاں پہنچ گئے، پل بھر میں نیچے آ گئے، تو پلوں میں یہ مسافعتیں طے ہوں گی، سب اس میدان کے اندر جمع ہوں گے۔

نشست گاہیں اور مقاماتِ قلبیہ سے ان کا تعین اور فرمایا گیا ہے حدیث میں کہ ہر ایک کی سیٹیں متعین ہوں گی جیسے درباروں میں سیٹیں بچھائی جاتی ہیں، تو کارڈ چھپے ہوئے لگے ہوئے ہوتے ہیں جن پر نمبر تک پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بٹھلانے والے اسی نمبر پر بیٹھنے والے کو بٹھاتے ہیں، یہ نہیں کہ کسی دوسری پر کوئی جا بیٹھے۔ اپنی سیٹ پر، وہاں بٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ہر ایک شخص اپنے مقام کو اپنی طبعی اور قلبی کشش سے پہچانے گا اور وہیں جا کر رہے گا جو اس کی سیٹ ہے اور اس کی کرسی۔ یہ نہیں ہے کہ غلطی کر جائے اس لیے کہ وہ مقامات متمثل ہوں گے جو اپنے قلب کے مقامات ہیں۔ مقاماتِ قرب حق تعالیٰ کے نزدیک کتنے ہیں قوتِ ایمانی کے مقامات، ہر شخص اپنے مقام کو خوب پہچانتا ہے کہ میرا ایمان کس درجہ کا ہے، میرے اخلاق کس مرتبہ کے ہیں، وہی اخلاق، وہی مقامات، وہ متمثل کیے جائیں گے سیٹوں کی صورت میں ہر شخص اپنے مقام پر بیٹھے گا۔ انبیاء اپنے مقامات پر ہوں گے۔ اب یہ دربار پر ہو گیا، بھر گیا، کرسیاں ہوں گی اور ان کرسیوں کے پیچھے اس میدان کے کناروں پر بڑے بڑے قالین ہوں گے۔ چوتروں پر اور چوتروں پر ہوں گے۔ مشک اور زعفران کے اور ان پر وہ غالیچے ہوں گے۔ عوام جو کم درجہ کا ایمان رکھتے تھے ان کے پاس کرسیاں نہیں ہوں گی، بلکہ وہ ان قالینوں پر بیٹھیں گے۔

میدانِ مزید میں کرسی حق پر تجلیات کا ظہور اب گویا پورا میدان بھر گیا۔ سیٹیں پر ہیں۔ انبیاء علیہ السلام

اپنی جگہ اور کرسی حق تعالیٰ کی خالی۔ جب دربار پر ہوگا اس کے بعد تجلیات کا ظہور کرسی کے اوپر شروع ہوگا، اور یہی طریقہ بھی ہے کہ درباری جب ایک جگہ جم جاتے ہیں تب بادشاہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ بادشاہ پہلے بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی ہونہ ہو، لوگ آئیں تو بیٹھیں، جب سب جم جاتے ہیں، تب بادشاہ نکلتے ہیں اور سر پر وہ کھولا جاتا ہے اور نقیب اور چوہدار آوازیں دیتے ہیں اور بادشاہ آتے ہیں تو سب تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ کے حکم سے کچھ تحائف تقسیم ہوتے ہیں، کچھ کھانے پینے کو دیا جاتا ہے یہی صورت یہاں بھی ہوگی کہ تجلیات ربانی کا ظہور شروع ہوگا۔

احادیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح سے چڑ چڑائے گی کہ جیسے ٹوٹ کر گرنے والی ہے۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہے، بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے کرسی چڑ چڑائے گی۔ تجلیات کا ظہور ہوگا اور بندے اپنے قلوب کی بصیرت سے پہچان لیں گے کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں دربار خداوندی میں مشروب تواضع..... حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے ملائکہ کو کہ جس شراب طہور اور پاک شربت کا ہم نے وعدہ کیا تھا وہ پلاؤ، تو ملائکہ وہ نورانی صراحیاں لے کر شراب طہور تقسیم کریں گے۔ شراب کے معنی مطلق پینے کی چیز کے ہیں۔ اسے شراب نہیں کہتے جو نشے والی ہو۔ اسے خر کہتے ہیں عربی زبان میں۔ شراب ہر پینے کی چیز کو شربت کو بھی شراب کہیں گے، دودھ کو بھی شراب کہیں گے کہ پینے کی چیز ہے۔ خیر پینے کی کوئی چیز دی جائے گی۔ اس میں سرور کی یہ کیفیت ہوگی کہ پینے کے بعد یہ محسوس ہوگا کہ غم و الم کا تو نشان ہی نہیں ہے۔ رگ رگ میں فرحت اور سرور بڑھ رہی ہے اور ہر ایک میں ایک عجیب امنگ ہوگی اور معرفت بڑھ جائے گی اور حق تعالیٰ کی پہچان بڑھ جائے گی۔

سکر معرفت میں از دیاد..... اور اسی میں یہ بھی فرمائیں گے، داؤد علیہ السلام کو یہ بھی فرمائیں گے کہ ان کو معجزہ دیا گیا تھا آواز۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی حضرت داؤد علیہ السلام کی کہ جب وہ مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند پرند ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے، محو اور مست ہو جاتے تھے یہ معجزہ تھا۔ ان کو فرمایا جائے گا کہ اہل جنت کو وہ مناجاتیں سناؤ جو اللہ کی مدح اور ثناء میں تمہیں دی گئی تھیں اور حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر اور آواز بھی بڑی معجزانہ اور قرب خداوندی، ملائکہ کا قرب، اللہ کا قرب اور اللہ کی حمد و ثناء۔ وہ جو پڑھیں گے اپنی لے میں تو کیفیت یہ ہوگی کہ تمام اہل جنت گویا گم ہوں گے۔ انہیں کچھ پیہ نہیں ہوگا کہ کہاں ہیں، وہ محو ہوں گے حق تعالیٰ شانہ میں، ایک اور عجیب کیفیت یہ طاری ہوگی مشابہ اس کیفیت کے کہ جو اہل اللہ پر معرفت کے نشے میں کیفیت طاری ہوتی ہے۔ سکر کی اور نشے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت طاری ہوگی جس سے روحانیت ہزار گنا بڑھ جائے گی۔ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے۔ سَلُّوْنِي مَا شِئْتُمْ۔ ”جس کا جو جی چاہے مانگے۔“

اہل علم کی احتیاج..... اب سب حیران ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ عرض کریں گے کہ اے اللہ! کوئی نعمت ایسی ہے جو جنت میں آپ نے عطا نہیں فرمادی، باقی کیا ہے کہ جس کو ہم مانگیں۔ فرمائیں گے نہیں مانگو جس کی جو مرضی

ہو مانگے، تو اب سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کیا مانگیں، ہر نعمت کھانے پینے کی مل چکی، محلات، شہر، حکومت، جاہ، عزت ساری مل گئیں۔ کیا چیز مانگیں اور قرب خداوندی اس سے بڑھ کر نعمت نہیں اور کیا مانگیں۔ جب سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب لوگ علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ اہل علم سے مشورہ کریں، وہ اپنے علم کی طاقت سے کچھ بتلائیں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے، کہ مانگیں؟

گویا مولویوں کی محتاجی وہاں بھی جا کر رہے گی، لوگ یہاں اپنا پیچھا چھڑانا چاہیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے، وہاں بھی محتاجی رہے گی۔ یہ محتاجی علم کی ہوگی، کسی ذات کی نہیں ہوگی۔ آج بھی اگر ہم علماء کے محتاج ہیں تو گوشت پوست کے محتاج نہیں ہیں، وہ تو ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ ان کے علم کے محتاج ہیں، وہ راہنما ہے، راہ دکھانے والا ہے کہ علم سے کسی جہان میں بھی آدمی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جتنے بڑے جہاں میں پہنچے گا اتنے ہی بڑے علم کی ضرورت ہوگی، وہاں کی راہیں طے کرنے کے لیے ضرورت ہوگی۔ تو سب علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ ادھر سے تو حکم ہے کہ مانگو اور ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چیز باقی نہیں جو ہمیں نہیں مل گئی۔

جمال خداوندی کے دیدار کا سوال..... وہ کہیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے، وہ مانگو اور وہ ہے دیدار خداوندی۔ اس کا سوال کرو کہ اپنا جمال مبارک دکھلا دیجئے۔ جس کی طمع میں ہم رات دن عبادت کرتے تھے اور عبادت میں یہ جوش ہوتا تھا کہ کس طرح اللہ کو دیکھ لیں، تو پہلے ہم دیکھتے تھے عقل کی آنکھ سے، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے ایمان اور عقیدہ کی آنکھ سے، اس کے بعد دیکھتے تھے خواب میں، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے کشف کے ساتھ، اب یہ سارے مراتب طے ہو گئے، اب یہ چاہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے عیاں اپنے پروردگار کو دیکھیں، یہ مانیں گے، جب سوال سمجھ میں آجائے گا ایک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ: ”اے اللہ! سب کچھ آپ نے دے دیا، سب کچھ مل گیا، اب جمال خداوندی دکھلا دیجئے، پس ہم اس کو مانگتے ہیں۔“

کیفیت جمال..... یہ دعاء و درخواست قبول کی جائے گی۔ اور حدیث میں ہے کہ پہلے حق تعالیٰ فرمائیں گے: اِنَّ كَمَا اَنْتُمْ. ”ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے“ اس لیے کہ اگر یہ نہ فرمائیں تو: لَا خُرْقَتْ سُبْحَاتٌ وَجْهَهُ مَا بَيْنَ يَدَيْهِ. ① اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دیں۔

چوں سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بزیب علم ور کشد
جب سلطان عزت نمایاں ہوگا پھر کس کا وجود باقی رہ سکتا ہے۔ ایک آفتاب جو اس کی مخلوق ہے، اگر ٹکٹکی باندھ کر ایک منٹ دیکھ لو تو غیر آفتاب سب نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ تو آدمی جدرنگاہ کرتا ہے آفتاب ہی کی ٹکٹکی نظر آتی ہے، سرخ یا سبز یا زرد۔ غیر آفتاب جو ہو جاتا ہے، آنکھوں میں کسک نہیں رہتی کہ دیکھے۔ اپنے اندر بھی نگاہ ڈالے گا وہاں بھی آفتاب نظر آئے گا، ادھر دیکھے گا وہاں بھی آفتاب، تو آفتاب ایک مخلوق ہے۔ اس کی نورانیت کا یہ عالم ہے

① الصحيح لمسلم، کتاب الایمان، باب فی قوله علیہ السلام ان الله لا ینام ج: ۱ ص: ۳۱۹ رقم: ۲۶۳.

کہ اگر پل بھر دیکھ لے تو ہر ما سوا غائب ہو جاتا ہے۔ تو اللہ رب العزت کا جمال مشکشف ہو اور تجلی کھلے اور پھر غیر کا کہیں وجود رہ جائے؟ ممکن نہیں وجود ہی باقی نہ رہ سکتا۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ آفتاب کو دیکھنے کے بعد اشیاء کا وجود تو ختم نہیں ہوتا ہماری نگاہ میں ختم ہو جاتا ہے، ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن وہاں وجود نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وجود کا سرچشمہ حق تعالیٰ ہے جب اصل وجود آئے گا تو ضمنی وجود کا پتہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے پہلے ہی فرمادیں گے۔ اَنْ كَمَا اَنْتُمْ۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اور اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ بس صرف ایک حجاب کبریائی و عظمت کا رہ جائے گا۔ باقی سب حجابات اٹھ جائیں گے اس وقت بندے عیاں اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔

کیف جمال..... اور اتنے گم ہوں گے کہ نہ جنت یاد رہے گی نہ اور کوئی نعمت یاد رہے گی بلکہ یوں محسوس ہوگا کہ اب تک کوئی نعمت ملی ہی نہیں تھی۔ سب چیزیں رومی تھیں جو ہمیں ملی تھیں۔ اب نعمت ہمیں ملی ہے۔ اس دیدار کا اثر یہ ہوگا کہ قلب کے اندر قوت و اطمینان پورے انشراح کے ساتھ رک و پے میں اور زیادہ پھیل جائے گی چہروں کا نور اور جمال اتنا بڑھ جائے گا کہ لوگ سو فیصد خوبصورت اور حسین بن جائیں گے۔ اس طرح سے یہ دربار ہفتے میں ایک دن ہوگا۔

اور اس کے بعد فرمائیں گے کہ اہل جنت! اب اپنے اپنے محلات کو جاؤ۔ اور ہفتہ بھر بعد پھر دربار منعقد ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام ہر وقت گویا حاضر باشان دربار رہیں گے، اکمل اولیاء اللہ ہفتے میں تین بار حاضر باش ہوں گے۔ عامہ مؤمنین کو ہفتے میں ایک دن دیا جائے گا، تو سرکاری مہمان خانہ اتنا قریب ہونا چاہیے کہ بادشاہ کے پاس آمد و رفت پائی جائے۔ اس لیے جنتوں کو عرش عظیم کے نیچے رکھا گیا۔

جنت کی لائٹ کا نظام..... حتیٰ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنتوں میں جو چاندنا ہوگا، آفتاب اور ماہتاب نہیں ہوں گے۔ آفتاب بے چارہ کی کیا حقیقت؟ عرش عظیم کی روشنی سے جنت روشن رہے گی اور یکساں روشنی رہے گی وہاں رات نہیں آئے گی یکساں روشنی رہے گی۔

اور اس کی مثال احادیث میں دی گئی ہے کہ صبح صادق کے بعد جو چاندنا ہوتا ہے سورج نکلنے سے پہلے ٹھنڈا چاندنا، تو اس کے اندر آنکھیں خیرہ بھی نہیں ہوتی آنکھوں میں چھین نہیں ہوتی، بلکہ فرحت کا اثر پیدا ہوتا ہے، وہ نوعیت ہوگی جنت کے چاند نے کی اور بارہ مہینے ایک سا چاندنا رہے گا۔

وہاں دن اور رات کا ہیر پھیر نہیں، تو جنت میں روشنی عرش کی ہوگی اس سے گویا قرب دکھلایا گیا ہے کہ سرکاری مہمان خانہ ہے تو مہمان خداوندی قریب میں رہیں گے، تو بعید نہیں ان کو رکھا جائے گا۔ بعید تو مجرم رہا کرتے ہیں۔ تو مجرمین البتہ ساتویں زمین کی تہ میں جہنم میں رکھے جائیں گے، تو میں نے عرض کیا کہ جب دار السلطنت بنتا ہے تو سب چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ قلعہ بناتے ہیں، قلعہ کے اندر تخت رکھتے ہیں، اس کی حفاظت کے سامان رکھتے ہیں اور سرکاری مہمان خانہ بنتا ہے، تو قلعہ شاہی کے بارے میں تو فرمایا گیا کہ: اَلَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا۔ ”وہ ذات ہے بادشاہ۔ اللہ کی ذات شاہانہ وہ ہے کہ اس نے سب سات آسمانوں کے تہہ بہ تہہ قلعے بنائے۔“ اور فرماتے ہیں مضبوط اتنا

کہ مَاتَرِی فِی خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُّتٍ ”تم اگر غور سے دیکھو تو اس کے اندر کوئی فرق نہیں“، کوئی دراز نظر آرہا ہے، کوئی اونچ نیچ نظر آرہی ہے، کچھ بھی نظر آرہا ہے یکساں ہے ہزاروں برس سے یکساں ہے، نہ اس کی کوئی مٹی جھرتی ہے، نہ پلستر گرتا ہے نہ کوئی اینٹ گرتی ہے۔ جس حالت میں ہے اسی حالت میں ہے۔

شاہی قلعوں کی مضبوطی اور ان کا مہیریل اس لیے کہ وہ دھاتوں سے بنائے گئے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ۔ پہلا آسمان چاندی کا ہے، دوسرا سونے کا ہے، تیسرا زمر کا ہے، چوتھا یاقوت کا ہے پھر الماس کا ہے اور ساتواں آسمان خالص ایک موتی کا ہے، لیکن کیسا ہوگا چاندی سونا؟ یہ یہاں کا چاندی سونا نہیں۔ دنیا میں چاندی سونے میں کچھ نہ کچھ کدورت، کچھ نہ کچھ سیاہی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ روپیہ گننے بیٹھنے تو دس پانچ منٹ میں انگلیاں کالی ہو جاتی ہیں، انگلیوں میں بو آنے لگتی ہے۔ تو وہاں کا سونا اور چاندی کدورت ملا ہوا نہیں خالص سونا، تو وہ آسمان زمین سونے اور چاندی جواہرات اور خالص موتی کے ہیں۔ اس واسطے ان میں کوئی جوڑ بھی نہیں، کہ بھی اینٹ ہی گرگئی، چونانکل گیا، یہ نہیں ایک ذات ہے سارا آسمان مَاتَرِی فِی خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُّتٍ ”تم کوئی فرق نہیں دیکھو گے اللہ کی بناوٹ میں۔ اس لیے کہ یہ شاہی قلعہ ہے تمہارا مکان نہیں بنا ہوا۔ اللہ نے اپنا مکان بنایا ہے۔ مَاتَرِی فِی خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُّتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ”پھر دوبارہ لوٹا کر نگاہ کرو۔ کوئی فطور نظر آتا ہے تمہیں؟ پھر لوٹاؤ نگاہ کو..... دوسرے دیکھ کر نگاہ لوٹ کر آئے گی۔ اور نامراد واپس ہوگی، کوئی عیب لے کر نہیں آئے گی، چونکہ دارالسلطنت کو انتہائی طور پر مضبوط بناتے ہیں، فطرت یہی ہے تو فطرت الہی، سے تو یہ فطرت انسانوں نے لی ہے، وہاں اصل فطرت نے کام کیا۔

دارالحکومت کی افواج..... تو سب سے پہلے دارالحکومت کی تعمیر کی گئی اور اس میں سات شہر بنا دیے گئے اور شہر بنا ہوں کے اندر فوجیں رکھی گئیں اور فوجیں ہیں ملائکہ، جو نہایت ہی قوی فوج ہے کہ اگر سارے جہان، ساری کائنات، سارے شیاطین بھی مل جائیں تو ایک فرشتہ ان کے قابو میں نہیں آسکتا۔

حدیث میں ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کی دو صفیں قرآن کریم میں بیان کی گئیں ہیں۔ ایک قوی اور ایک امین کہ وہ قوی بھی ہیں اور امانت دار بھی ہیں، تو امانت کے بارے میں تو یہ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل کہ اللہ کے لاکھوں اسرار میرے سینے میں ہیں، آج تک میں نے ظاہر نہیں کیے۔ حق تعالیٰ ہی کا امر ہوتا ہے تو کسی مخصوص بندے پر کوئی ایک چیز ظاہر کرتا ہوں، جسے ہم لوگ عارف کہنے لگتے ہیں کہ فلاں بزرگ معرفت رکھتے ہیں۔ اور اسرار خداوندی کو جاننے والے ہیں تو کروڑوں اسرار میں سے بذریعہ ملائکہ کے کوئی ایک آدھ چیز قلب میں ڈال دی جاتی ہے۔ وہ ہماری معرفت بن جاتی ہے تو اس ذات کے بارے میں قیاس کیا جائے کہ جبرئیل کتنے بڑے عارف اور کتنے بڑے صاحب معرفت ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لاکھوں اسرار میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ آج تک میں نے انہیں کسی سے ظاہر نہیں کیا، وہ امانت خداوندی ہیں، تو امانت کا تو یہ حال ہے۔

اور قوت کا یہ عالم ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا تو جبریل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ تم ان کی بستیاں پلٹ دو، انہوں نے ایک ہاتھ ڈال کے وہ سارے شہر اور اقلیم ایک ہاتھ سے اٹھا کر اوندھے کر دیئے، ان کو پلٹ دیا، یہ حال قوت کا ہے تو فرشتے کی یہ طاقت ہے تو جیسا بادشاہ ویسی اس کی فوج، بادشاہ لا محدود قوت والا ہے تو اس کی فوج بھی اتنی قوت والی ہے کہ ایک فرشتہ پورے جہان کے لیے کافی ہے۔ سب کو اٹھا کر لوٹ دے، تو ملائکہ علیہم السلام ان آسمانوں میں مقیم کئے گئے، جیسے فوجی۔

فوج کی عظمت و تقدس..... چونکہ بادشاہ سُبُوْحٌ قُدُّوْسٌ ہے اور پاک ہے اس لیے فوجیں بھی پاک، دنیا کی فوجوں میں تو ایک درجے کا تعین بھی ہوتا ہے آزادی بھی ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ فوجی کو تو سات خون معاف ہیں، جس پر چاہے گولی چلا دی، کسی ہستی میں گھس گئے تو ناموس تباہ ہوتا رہتا ہے، آبرو میں جاتی رہتی ہیں، کھیت اجڑ جاتے ہیں، باغ اجڑ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کی فوج ہے، اس کے قلعوں کے محافظ ہیں، وہ پاکباز مخلوق ہیں۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ نہایت ہی کرام والے مکرم بندے ہیں، کرامت والے بندے ہیں۔ سب صاحب کرامت ہیں۔ اور: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ① ”کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی ہمیشہ احکام ربانی کے پابند ہیں“۔ منشاء ربانی کو پاتے ہیں تو کر چلتے ہیں، تو مخلوق بھی نہایت پاکباز ہے، جس کی فوج بنائی گئی ہے کہ اس سے زیادہ مطیع اور مقدس مخلوق دوسری نہیں اور ان کا کام دن رات اطاعت اور عبادت ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے، کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔ تو اتنی فوجیں رکھی گئیں ہیں کہ چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے کہ کوئی سپائی موجود نہ ہو، تو ان گنت فوج اس لیے کہ جیسا بادشاہ ویسی بادشاہی، ویسی ہی اس کی فوج، ویسی ہی پاک باز فوج۔ گویا سات قلعے بنے اس میں فوجیں رکھی گئیں اس کے اوپر وہ خندق ہے جو سمندر ہے جس کی ایک ایک موج زمینوں آسمانوں کے برابر ہے۔ اور اس کے اوپر جا کر بے کرسی اور کرسی اتنی بڑی کہ سارے آسمان اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے جھلے۔ وہ پائیدان ہے عرش کا۔ مرکز نفاذ احکام..... کرسی کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ تخت پر چڑھنے کے لیے جو سیڑھی بنائی جاتی ہے وہ کرسی درحقیقت عرش پر چڑھنے کا پائیدان ہے، تو جب سیڑھی اتنی بڑی ہے تو عرش کتنا ہوگا۔ جو ساری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے، تو یہ تخت شاہی جس سے يُذَبَّرُ الْأَمْرُ يُفْضَلُ الْآيَاتِ ② اللہ نے عرش پیدا کیا۔ اور اس پر سے ہی تدبیرات الہیہ جاری ہوتی ہیں۔

ان جہانوں میں جو کچھ چیزیں ہیں وہ دنیا ہو یا ستارے ہوں، ان سب میں جو امر خداوندی جاری ہے وہ عرش سے چلتا ہے احکام وہاں سے نافذ ہوتے ہیں يُذَبَّرُ الْأَمْرُ تدبیر امر وہاں سے ہوتی ہے۔ تو عرش عظیم گویا سب سے بڑی علامت ہے حکومت کی، اسی واسطے کہا کرتے ہیں کہ تخت کے سامنے ادبا

نذریں پیش کی جائیں۔ یوں نہیں کہتے کہ بادشاہ کو نذر دے رہے ہیں۔۔۔ درباری تخت کے سامنے نذر پیش کر رہے ہیں۔ یعنی بادشاہ تو بڑی چیز ہے۔ وہاں کس کی پہنچ، تخت شاہی کے پائے کو چومتے ہیں وہی اظہار عقیدت ہوتا ہے بادشاہ سے، تو عرش عظیم گویا علامت ہے شہنشاہی الہی کی اس کے سامنے نذریں پیش کرتے ہیں، اس کے سامنے اطاعت کے لیے جھکتے ہیں۔

سورج مرکز سے باجائز طلوع ہوتا ہے..... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ سورج جب چلتا ہے تو اونٹ حاصل کرتا ہے، پہلے سجدہ کرتا ہے عرش کے نیچے اور پھر کہتا ہے: اجازت ہے جانے کی۔؟ اجازت مل جاتی ہے تو پھر اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ دورہ کے بعد پھر پہنچا، پھر اذن چاہا، قیامت کے دن فرمائیں گے کہ آگے جانے کی اجازت نہیں۔ پیچھے لوٹ جا، تو آفتاب طلوع کرے گا مغرب سے اور وسط میں آ کر پھر لوٹ جائے گا، اس کے بعد پھر حسب معمول طلوع ہونے لگے گا یہ علامت کبریٰ ہوگی قیامت کی،.....

بہر حال تخت کے آگے جھکنا یہ بادشاہ کے آگے جھکنا ہے۔ تو سب سے بڑا نورانی کرہ اس عالم میں آفتاب ہے وہ روزانہ سجدہ کر کے عرش کے نیچے اجازت طلب کرتا ہے، تب اسے جانے کی اجازت ملتی ہے۔ تو سرکاری مہمان خانہ بھی ہو گیا اور شاہی قلعہ بھی ہو گیا اور شاہی قلعہ کی فوج بھی ہو گئی اور عرش عظیم بھی اس کے اوپر نک گیا۔ حکومت الہی کی پالیسی..... اب بادشاہ کے لیے تاج بھی درکار ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ شانہ کے لیے تاج مناسب نہیں کہ تاج بادشاہ کے سر کے بھی اوپر ہوتا ہے اور اللہ العلیٰ العظیم ہے اس سے بلند کوئی چیز نہیں۔ اس لیے وہاں تاج کی مثال ایسی رکھی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ عرش پر حق تعالیٰ نے ایک لوح اور تخت رکھی کہ جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں سے بھی کہیں زیادہ ہے، اس پر لکھ کر رکھا ہوا ہے۔ اِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ۔ ① ”میری رحمت ہمیشہ میرے غضب سے اوپر غالب رہے گی۔“

اگر گنہگار آئے کہ نیکیاں کی بھی ہوں اور جرم بھی۔ پہلے رحمت بڑھے گی کہ نیکیوں کا صلہ لے، غضب نہیں بڑھے گا کہ اس کو سزا دے۔ اگر کسی نے جرائم ہی جرائم کیے ہوں تو مجبوری کو غضب بڑھے گا، ورنہ رحمت ہی بڑھے گی اور آغوش رحمت میں اٹھائے گی۔ تو یہ دستاویز رکھی، یہ وہ ہے جیسے کہا کرتے ہیں، حکومت کی پالیسی حکومت جب پالیسی بناتی ہے، منشور بناتی ہے تو فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا اور فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا۔ وہ پالیسی طے ہو جاتی ہے۔ تو پھر وزراء، امراء سب اسی پر عمل کرتے ہیں تو پالیسی حکومت الہی کی یہ طے ہوئی کہ رحمت الہی غالب رہے گی، غضب پیچھے رہے گا۔

استحکام حکومت کا اصول..... اسی واسطے عرش عظیم پر جب بادشاہی کی حیثیت سے حق تعالیٰ نے استوی فرمایا تو

① الصحيح لمسلم، کتاب التوبۃ، باب سعة رحمة الله تعالى وانها سبقت غضبه ج: ۴ ص: ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۷۵۱۔

فرماتے ہیں: اَلرُّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی . ① رَحْمٰن چھا گیا عرش کے اوپر۔ یوں نہیں کہا: اَلْقَهَّارُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی۔ قہر والا چھا گیا۔ اَلْفَضَّابُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی۔ غضب والا چھا گیا۔

اگر غضب کی تجلی چھاتی تو ساری کائنات ختم ہو جاتی، رحمت کے ساتھ سب کے ساتھ معاملہ کیا جا رہا ہے۔ یہ رحمت کے ساتھ ہے تو شکل ایسی بن گئی کہ ساری کائنات، اس کے اوپر آسمان اس کے اوپر دریا، اس کے اوپر عرش، عرش کے اوپر رحمت خداوندی تو گویا پوری کائنات کو رحمت نے ڈھانپ رکھا ہے۔ رحمت نے چلا رکھا ہے۔ اس سے گویا اشارہ نکلتا ہے کہ جو بادشاہ غضبناک ہو وہ ملک کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتا۔ وہی بادشاہ چلا سکتا ہے جس میں شفقت اور کرم غالب ہو اور جس کے اندر قہر اور غضب اور تعصب اور عناد غالب ہو گا زیادہ دیر اس کی حکومت نہیں چل سکتی وہ ختم ہو جائے گی۔ گویا اصول نکل آیا کہ پائیدار حکومت بنانا چاہتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بناؤ جو رحیم و کریم ہو۔ جس کی رحمت غالب ہو، غضب مجبوری کو جائے، جب بحر میں تنگ ہی کر دیں تب جا کر غضب کے احکام نازل کرے ورنہ رحمت چلتی رہے تو پہلے تو فرمایا: الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا بادشاہانہ وہ ذات ہے اللہ کی جس نے سات طبقات میں آسمان بنائے، اور: مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفَوُّتٍ۔ تم اللہ کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں محسوس کرو گے۔ اور ہم کہتے ہیں: فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ نَظْرًا کُلُوْا وَشَرُّوْا، غور کرو، ہے کوئی فرق؟ نہیں ہے۔ پھر لوٹاؤ، دوبارہ لوٹاؤ، تو لوٹ کر آجائے گی نگاہ مگر کوئی عیب اور فرق نہیں نکال سکے گی۔

بے مثال روشنی کا انتظام اب ظاہر بات ہے کہ قلعے تو بن گئے مگر اس میں اندھیرا بھٹ پڑا ہو تو رہنے والے کیسے رہیں گے، ظلمت ہو، تاریکی ہو تو ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے گا کام کیسے چلے گا اس لیے آگے فرمایا: وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ . بڑے بڑے چراغوں سے اور ہنڈوں سے ہم نے روشن کیا۔ آسمان دنیا کو، اور وہ چاند اور ہنڈے وہ چاند سورج ہیں، ستارے ہیں اور وہ ہماری ضرورت اس لیے کہ آسمان سے بالاتر جو عرش عظیم کی روشنی ہے جنتوں میں بھی، وہاں خوبصورت چاند کی نہیں چلتی۔ یہ تو معمولی درجے کی روشنی ہے، تو دنیا والوں کو ضرورت تھی، انہیں کے لیے چھت بنایا آسمان دنیا کو، اور طبعی طور پر لائٹنیں چھت میں ٹانگی جاتی ہیں۔ زمین میں چراغ کوئی نہیں رکھا کرتا یا دیوار پر لگاتا ہے یا چھت کے قریب اور جب بجلی کی روشنی ہو تو قہقہے تو چھت ہی میں ٹانگے جاتے ہیں۔ تکلف کے طور پر وہ دیوار میں لگا لے لیکن اصل مقام چھت ہے۔ اسی واسطے دنیا کی چھت بنایا آسمان دنیا کو اور اس آسمان سے نیچے یہ تمام ہنڈوں کا ایک نظام سجا دیا، کوئی زیادہ روشن، کوئی کم روشن۔ سورج تیز روشن ہے تاکہ کام کاج کر سکیں۔ دن کا وقت ہے۔ رات میں ضرورت پڑتی ہے سونے کی تو سورج نہیں چمکایا چاند چمکایا تاکہ ٹھنڈی روشنی ہو۔ بالکل اندھیرا گھپ ہو گا تو وحشت بڑھے گی، نیند نہیں آئے گی۔ کچھ چاند نا بھی ہو، مگر نگاہوں میں چھنے والا نہ ہو۔ تو چاند کی روشنی رکھی۔

یہ وہی روشنی ہے مگر وہ ریفریکٹر کے اندر کو نکل رہی ہے کہ جو ٹھنڈی کر کے پیش کی جاتی ہے۔ تو وہی سورج کی روشنی یہاں چاند میں ٹھنڈی بنادی گئی اور اگر چاند بھی نہ ہو تو کروڑوں ستارے روشن کر دیئے کہ کچھ نہ کچھ چاندنا رہتا ہے زمین پر، اگر ایک بھی ستارہ نہ ہوتا تو گھپ اندھیرا ہو جاتا، اس لیے فرمایا کہ ہم نے کائنات بنائی تو روشنی کا بھی سامان کیا۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ .

دفاعی نظام اب ظاہر بات ہے کہ جتنی بڑی سلطنت ہوتی ہے اتنے ہی بڑے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ تو فوجیں بے شک قوی ہیں، سلطنت بڑی عظیم ہے مگر جتنی بڑی حکومت ہے اتنے ہی دشمن بھی۔ سارے شیاطین دشمن ہی تو ہیں، یہ کب چاہتے ہیں کہ اللہ کا حکم چلے، انبیاء علیہم السلام احکام لے کر آتے ہیں، ساتھ ہی انہیں چلانا چاہتے ہیں لیکن قدم قدم پر شیطان رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ تو ایک پل بھر کے لیے شیطان نہیں چاہتے کہ احکام خداوندی دنیا میں چلیں بلکہ سارے آدمی مل کر اللہ کے دشمن بن جائیں، مد مقابل آجائیں۔

تو حق تعالیٰ نے اپوزیشن پارٹی بھی پیدا کی، حالانکہ اس کی حکومت کو ضرورت نہیں تھی مگر ایک مخالف پارٹی پیدا کی تاکہ اس کا کام یہی ہو کہ اللہ کی حکومت میں دین میں اعتراضات نکالتی رہے۔ تاکہ دوست تو یہ سمجھیں کہ یہ اعتراض کی چیز ہے، اس کا یہ جواب دیں گے تو ان کا علم وسیع ہے اور دشمن جتنے ہیں وہ بھول بھلیاں میں رہیں تاکہ اچانک جب منہ پر گرفتاری کا عذاب آئے تو اس وقت اچانک گرفتار کر لیا جائے۔ تو دوست بھی اپوزیشن پارٹی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دشمن عداوت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، دوست محبت اور دوستی میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال ایک مخالف پارٹی کا وجود فطرت ہے ضروری ہے۔ ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ مخالفت کرنے والی کوئی جماعت نہ ہو۔ اس واسطے شیاطین کی جماعت پیدا فرمائی جس کا کام مخالفت ہے اور جب ہے تو وہ جیسے دنیا میں نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو۔ وہ آسمانوں میں بھی نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو، لیکن آسمان قلعے ہیں۔ اگر وہاں حکومت ختم ہو تو دنیا میں بھی باقی نہیں رہے گی، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ وہیں سے مٹانے کی کوشش کرو، اس لیے حق تعالیٰ نے حفاظتی سامان بنایا تو فرمایا کہ ستارے جو ہم نے مصباح اور چراغ بنادیئے ہیں انہی سے ہموں کا بھی کام لیتے ہیں وَجَعَلْنَاهُمْ أَجُومًا لِلشَّيَاطِينِ .

جہاں شیاطین آسمان کے کناروں تک پہنچے اور یہ ہم ان کے اوپر برسنے شروع ہوئے شہاب ثاقب اور یہ بھسم ہو جاتے ہیں۔ تو گویا ملائکہ علیہم السلام سارا گولہ بارود کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ ہم بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں دشمن الہی آسمانوں کے قریب پہنچا وہیں سے انہوں نے وہ گولہ پھینک کے مارا اور وہ بھسم ہوا

تو فرماتے ہیں کہ ان چراغوں سے ہم دو کام لیتے ہیں۔ ایک روشنی کا اور اس کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے دفع کرنے کا، تو مدافعت کا سامان بھی ہمارے یہاں پورا ہے اور پوری طاقت موجود، ساری دنیا کے شیاطین جمع ہو جائیں وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ دروازے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ وہ تو ذرا قریب پہنچے وہیں سے ان کے

اوپر ہم پڑا وَجَعَلْنَاهَا جُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ .

دنیا میں حق کے ساتھ باطل کو بھی باقی رکھا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد شیاطین تو پٹ پٹا گئے، مگر وہ انسانوں کے دشمن ہیں وہ تو چاہتے ہیں..... کہ انہیں بھی اللہ سے جدا کر دو، تو بہت سوں کو درغلانے سے خدا کی دشمنی پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام کی بھی مخالفت کریں، اولیاء اللہ کی بھی مخالفت کریں، علماء ربانی کی بھی صلحاء امت کی بھی سب کے مد مقابل آئیں اور ایسی ایسی چیزیں کریں گے کہ حق کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ ایسا کرتے رہتے ہیں، تو فرماتے ہیں انہیں ہم دنیا میں تباہ نہیں کریں گے، دنیا تو آزمائش گاہ ہے، اگر وہیں یہ تباہ ہو جائیں تو حق کے علو کا سامان کیا رہے حق تو باطل ہی کے مقابلے میں اونچا ہوتا ہے تو باطل بھی باقی رکھیں گے۔ باقی اخیر میں ایک جیل خانہ ہم نے ان مجرموں کے لیے تیار رکھا ہے، تو یہ شیاطین مع اپنے شتو گمروں کے مع اپنی پارٹی کے سب اس کے اندر جائیں گے اور وہ اپوزیشن پارٹی وہ ساری کی ساری ختم کر دی جائے گی۔ اس لیے کہ حکمرانی کا جنتوں میں کارخانہ خالص حق کا ہو گا وہاں باطل کا نشان نہیں۔ دنیا میں حق اور باطل کی آمیزش تھی۔ دونوں پارٹیاں لگڑدیں۔

آخرت میں حق و باطل کا امتیاز کر دیا جائے گا..... جب مخلوط عالم ختم ہو: اب رہ گئے خالص عالم۔ تو جنت خالص حق کا عالم ہے اور جہنم خالص مصیبت کا عالم ہے۔ ساری اپوزیشن وہاں اور سارے مطیع یہاں الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ وَجَعَلْنَاهَا جُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ وَاعْتَذَرْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ”ان کے لیے ہم نے ایک نہایت کھولتا ہوا عذاب تیار کر رکھا ہے تو وہ وہاں پہنچا دیئے جائیں گے“۔ وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ . اور جتنے ان کی پیروی کریں گے ان شیاطین کی ان کے لیے وہی کارخانہ موجود ہے وہ سرکاری جیل خانہ کہ جس میں مجرموں کو رکھا جائے گا۔

سرکاری جیل خانہ کی اندرونی کیفیت..... اور ساتھ میں ان کی کیفیت بھی بیان کی کہ اِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ . جب داخل کئے جائیں گے جہنم میں تو جہنم کے جوش کا یہ عالم ہو گا کہ جیسے غضب ناک ایک چیز ہوتی ہے اور جوش سے پھٹ پڑے۔ بہت ناک آوازیں اور اس کی بہت ناک پلیٹیں اور اس کی بہت ناک تیزی سے یہ معلوم ہو گا کہ جیسے وہ کھول رہی ہے اور غضب ناک ہے پھٹ پڑے گی۔ تَكَادُ تَمَيِّزُ مِنَ الْغَيْظِ ”گویا غیظ کے سبب سے پھٹ جائے گی“۔

ملا نکلے جہنم کا اپوزیشن سے مقابلہ..... كَلِمَاتٍ أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا جَبْ كَفَّارٍ كُوِيَ پارٹی ڈالی جائے گی تو جہنم کے جو محافظ اور گمران ملا نکلے ہیں سوال کریں گے کہ: اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا؟ جس نے اس جہنم سے تمہیں ڈرایا ہو اس عذاب خداوندی سے؟ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ڈرانے والے پہنچے، مگر ان پر تمام جت کے لیے اور ان میں حسرت پیدا کرنے کے لیے کہ عذاب دو گنا تکنا ہو جائے ان سے

کہیں گے کہ: اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ کُوْنِیْ ذُرّانے والا تمہارے پاس نہیں پہنچا کسی نے نہیں بتلایا کہ اللہ کا جیل خانہ بھی تیار ہے: قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ. شرمندگی سے کہیں گے کہ ہاں پہنچے۔ ہمارے پاس ذُرّانے والے آئے۔

جنہوں نے حق کا راستہ دکھلایا، محبت اور پیار سے سمجھایا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ فَکَذَّبْنَا۔ ہم نے انہیں جھٹلایا۔ وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ اللّٰهُ نے کوئی چیز نہیں بھیجی ہے یہ تمہارے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں،..... کچھ مولویوں نے بنالیا ہے، کچھ علماء نے بنالیا ہے۔ یہ تمہاری بنائی ہوئی چیزیں، خدا نے کوئی چیز نہیں بھیجی اس نے تو عقل بھیجی وہ ہمارے پاس موجود ہے ہم اس سے سمجھتے ہیں۔ فَکَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِی ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ ۝ قَالُوْا اِس وقت وہ کہیں گے: لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ کہیں گے: اے کاش! ہم کچھ سوچ لیتے یا مان لیتے تو یہ عذاب کا دن ہمیں نصیب نہ ہوتا۔

تلاش حق کے (۲) دور راستے..... اس لیے کہ حق کے ماننے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو یہ کہ آدمی بلا چون و چراں مان لے کہ یہ کہنے والا حق پر ہے، اس کے ساتھ علامت حقانیت تھی تو مان لے تو سب اور طاعت تھی کہ کانوں سے سنا اور اطاعت کی اور اگر محض سن کر اطاعت نہ ہو، کچھ چھان بین کی ضرورت ہے تو پھر عقل دی ہے۔ اللہ نے اس عقل سے غور کرے اور حق کے طلب کرنے کی کوشش کرے تو وعدہ خداوندی ہے کہ جب عقل لڑا کر چاہے گا آدمی کہ ہدایت پا جاؤں تو ضرور ہدایت دیں گے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیْهُمْ سَبِیْلًا. (القرآن) جو ہمارے راستے میں جدوجہد کرے گا ہم ضرور اسے راستہ دکھلائیں گے۔ تو دیکھنے کے راستے کی دو ہی صورتیں ہیں یا سب طاعت کہ سن کر اور مان لے اطمینان کر لے آدمی یا یہ کہ پھر عقل لڑا کر غور کر لے اور سوچ سمجھ کر مانے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دونوں سے کام نہ لیا۔ لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ کہتے ہیں کہ ہم نے دونوں سے کام نہ لیا۔ لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ” پھر ہم ان جہنم والوں میں سے نہ بنتے۔“ مگر ہم نے وہ چیز کھودی، وہ وقت گزاردیا۔ لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ فَاَعْتَرَفُوْا بِذُنُوبِهِمْ.

اعتراف بے وقت..... اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا مگر اس وقت اعتراف کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ مثل مشہور ہے کہ اب پچھتائے کیا حوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، جب کھیت ہی نہ رہا اور چڑیاں ہی نہیں ہیں اب اگر تم نے پرکھا کہ چڑیاں نہیں ہیں تو اب کیا پرکھنا، یہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔

وہاں تو ہر ایک مومن بن جائے گا جاکے۔ آزمائشی ایمان تو دنیا میں تھا کہ مخالف اسباب موجود تھے۔ مگر پھر انبیاء علیہ السلام کی حقانیت کو سامنے رکھ کر سب چیزوں کو پرے ڈال کر آدمی اطاعت کرتا سنتا، تو کہیں گے کہ افسوس ہم نے وقت کھودیا۔ فَاَعْتَرَفُوْا بِذُنُوبِهِمْ (ملک) ”اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا۔“ مگر اس وقت جواب کیا ہوگا۔ فَسُخِّفَ لَآصْحٰبِ السَّعِیْرِ. (ملک) پھٹکار ہو ان لوگوں کے لیے، ان کو دوردھکیل دو، یہ

قریب بھی نہ آنے پائیں اور زیادہ بعید (دور) سے جہنم میں ڈال دو فسُحْقًا لَا صُحْبَ السَّعِيرِ۔
اطاعت کے پاکیزہ ثمرات اب جب مجرموں کی بات بتلا دی تو سوال پیدا ہوا کہ مطیعوں کا حشر کیا ہوگا؟
إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ۔ ① اور جو لوگ غیب سے ڈرتے تھے، غیب
مطلق یعنی حق تعالیٰ کو مانا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ کو ہم آنکھوں سے دیکھ لیں جب مانیں گے۔ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى
نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً۔ ② ہم تو اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اللہ کو آنکھ سے نہ دیکھ لیں۔ تو غیبی چیزیں دیکھ
کر نہیں مانی جاتیں، سمجھ کر مانی جاتی ہیں۔ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ جَوْزِرْتُمْ بِهِ تَحْتِ اللَّهِ عِزِّهِمْ خُذُوا حَافِظًا
ہوا تھا کہ وقت آخر آنے والا ہے، جس غیب سے ہم یہاں آئے ہیں لوٹ کر پھر اسی غیب میں جانے والے ہیں۔
إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ جنہوں نے خوف اور خشیت اللہ اختیار کیا قلب کی رقت اور نرمی
اختیار کی اور جب کوئی حق بات سامنے آئی تو گردن جھکا دی کہ حق ماننے ہی کے لیے ہوتا ہے۔

ان کے لیے مغفرت بھی ہے، یعنی اگر ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہوئے وہ بخش دیئے جائیں گے اس لیے کہ
نیت ان کی نیک ہے۔ عقیدت ان کے قلب میں موجود تھی، بشریت سے کچھ لغزشیں ہو گئیں تو ہماری طرف سے
مغفرت تیار ہے اور جونیکیاں کیں اس کے لیے اجر عظیم تیار ہے، پاکیزہ ثمرات تیار ہیں۔ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ
كَبِيرٌ۔ ③ وَأَسِرُوا أَقْلُكُمْ أَوْ أَجْهَرُوا بِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔

عالم انکشاف آگے پھر ایک کلیہ فرمادیا کہ تم کسی بات کو چھپاؤ یا کھول کر کہو وہ تمہارے دلوں کی کھٹک سے
واقف ہے کوئی چیز تم اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ وہاں مخلوق سے تم نے پردہ ڈال لیا، چھپالی چیزیں مگر وہاں جا کر تو
سب عیاں ہو جائیں گی وہ ساری پردہ داریاں، وہ سارے پردے وہاں چاک ہو جائیں گے تَوَّانَهُ عَلَيْهِمْ بِذَاتِ
الصُّدُورِ اور اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ: أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ کیا پیدا کرنے والا
جانے گا نہیں کہ میں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟

پہلے تو اسی کو علم ہوگا کہ اس مخلوق میں کیا چیزیں رکھ رہا ہوں، کتنی عقل رکھی ہے میں نے کتنا فہم رکھا ہے۔ کتنا
علم رکھا تو جو بنانے والا ہے مخلوق کا وہ تو اس کے اندر باہر سے سب طرح واقف ہے، ورنہ وہ خالق ہی کیسا جو واقف
نہ ہو، تو عقلی دلیل بھی بیان فرمادی اور نقلی بھی، فرمادیا کہ وہ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ ہے اور کیوں نہیں ہوگا عَلِيمٌ
بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا خالق بھی نہیں جانے کا مخلوق کو اور کون جاننے والا ہوگا؟ وَهُوَ
اللطيفُ الخبيرُ اور اس کے لیے پھر دلیل یہ کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ جسم سے بھی پاک اور روح سے بھی پاک اس
لیے وہ تو ہر چیز کی رگوں کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے رگ رگ کی اسے اطلاع ہے اور پتہ ہے۔

اس کی ذات ہی منبع انکشاف ہے اسے کوئی باہر سے خبر نہیں دیتا، اس کی ذات میں سے علم پھوٹتا ہے۔ جیسے

آفتاب میں سے کرنیں پھوٹا کرتی ہیں۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ یہ ہوا گویا پہلے رکوع کا خلاصہ کہ جس کے اندر ذات باریکات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان صفات کو جو بادشاہی کے لیے ضروری ہیں پھر ان لوازم سلطنت کو جو بادشاہت کے لیے ضروری ہوتی ہیں، اس کا ایک رکوع کا خلاصہ یہ ہے اب دعا کر لیجئے۔
هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ ۚ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ اَمِنْتُمْ مِّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يُخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُورُ اَمْ اَمِنْتُمْ مِّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرٌ ۚ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرٌ

وہی ہے جس نے تمہارے آگے زمین کو پست کیا، اب چلو پھر وہ اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اس کی طرف جی اٹھنا ہے، کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ سداے تم کو زمین میں، پھر تب ہی وہ لرز نے لگے یا نڈر ہو گئے؟ اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسا دے تم پر مینہ پتھروں کا، سو جان لو گے کیسا ہے میرا ڈرانا۔ اور جھٹلا چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے، پھر کیسا ہوا میرا عذاب؟۔

ظاہر و باطن پر اس کی حکومت ایک حصہ تو وہ ہے جو ان آنکھوں سے نظر آتا ہے اور آسکتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے جو حصہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اس کا نام ہے ملک اور جو حصہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے اس کا نام ہے ملکوت، دو حصے ہوئے حکمرانی کے ایک ملک اور ایک ملکوت۔ جیسا کہ شروع میں فرمایا گیا کہ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ تو ملک کے جتنے حصے ہیں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں ملک میں داخل ہیں اور عرش سے لے کر فرش تک اور فرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جتنے حصے ہیں۔ ان سب کا نام ہے ملک اور جو روحانی آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں یعنی عالم روحانیت ہیں اس کو ملکوت کہتے ہیں جس کو سورہ یٰسین میں فرمایا گیا کہ: فَسُبْحَنَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ ”پاک ہے وہ ذات کہ جس کے قبضے میں ہے ملکوت ہر چیز کا“۔ دونوں پر اسی کی حکمرانی ہے۔ ظاہر کا ملک عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جس میں عرش عظیم، کرسی، جنتیں، آسمان اور پھر زمین کے نیچے جہنم۔ یہ سب عالم ملک ہے اور ان کے اندر جو روحانیت اور معنویت کام کر رہی ہے عرش سے لے کر فرش تک، اسی کا نام ہے ملکوت، وہ باطنی حصہ ہے۔

ملک کے تین علاقے اور ان کے ذمہ دار تو اس ملک کے تین حصے قرار دیئے گئے ہیں ایک آسمانوں سے اوپر اوپر، جس میں جنتیں، عرش، کرسی سب داخل ہیں اور ایک آسمانوں سے نیچے نیچے جس میں زمینیں اور دنیا اور اس کے نیچے جہنم یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ ان سب کے کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے حکمرانی کرتے ہیں۔ حکم اس کا چلتا ہے وسائل وہ ہوتے ہیں۔ جیسے آسمانوں میں ملائکہ علیہم السلام ہیں تو سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جن کی حکومت پورے عالم سلطنت میں ہے۔

اس دنیا کے اندر کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں، تو اصل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور ان کے ماتحت ہیں، ان کی وفات کے بعد پھر جوتے ہیں ان میں پھر عہدے ہیں، کسی کا نام ابدال ہے۔ کوئی اقطاب ہے، کوئی اغواث ہے، اس طرح سے تفصیل ہے۔

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں کہ جن کا باطنی طور پر حکم چلتا ہے۔ ظاہری حکام کے قلوب میں وہی چیز ڈالی جاتی ہے جو ابدالوں میں طے ہوتی ہے۔ ابدالوں کے نیچے پھر اقطاب ہیں، جو چالیس ابدال ہیں وہ شام میں رہتے ہیں جو ایک وفات پاتا ہے، نیچے ترقی دے کر ابدالوں میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ ۴۰ کا عدد پورا رہتا ہے۔ پھر اقطاب ہیں ان کے نیچے پھر اغواث ہیں۔ درجہ بدرجہ یہ گویا اس دنیا کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ تو ان کے قلوب پر حق تعالیٰ کی مشیت وارد ہوتی ہے اور وہ اسی مشیت سے پھر قلب سے ہمتیں متوجہ کرتے ہیں ان ہمتوں سے ظاہری حکام کے دل میں وہ چیزیں پڑتی ہیں کہ جو ظاہری حکم چلتا ہے۔

اللہ کا خلیفہ اعظم..... اور پھر حق تعالیٰ کی جانب سے ایک شخصیت وہ بنائی گئی ہے کہ ملک سے لے کر ملکوت تک اسی کی حکمرانی قائم کی گئی ہے۔ وہ اللہ کا خلیفہ اعظم ہے اور وہ ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ سلطنت وارضین میں آپ کے اثرات ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے چار وزیر ہیں: وَزِيرَايَ فِي السَّمَاءِ وَوَزِيرَايَ فِي الدُّنْيَا. ① دو وزیر میرے آسمانوں میں ہیں اور وہ ہیں جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہ السلام اور دو وزیر میرے دنیا میں ہیں اور وہ ہیں ابوبکر صدیق، اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما جو ان کے قائم مقام چلتے ہیں دنیا میں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وزارت عالم سلطنت میں بھی قائم ہے اور عالم ارض میں بھی قائم۔ جیسے بادشاہ کے ماتحت ایک نائب السلطنت ہوتا ہے کہ پوری سلطنت میں اس کا حکم اور اس کے اثرات غالب ہوتے ہیں، وہ ذات بابرکات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی..... تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کے دو وزیر آسمانوں میں ہیں اور دو وزیر دنیا میں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ وزیر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بادشاہ کے نائب السلطنت کے زیر اثرہ کر احکام چلائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماتحتی سب کے اوپر قائم کر دی گئی۔ اس کا ظہور شب معراج میں فرمایا گیا۔ کہ مسجد اقصیٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا اور تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام ملائکہ اور حضرت جبرئیل علیہ جو ان کے ذمہ دار ہیں، انہوں نے اقتدا کی۔ گویا ظاہراً بھی دکھلایا گیا کہ آپ بالادست ہیں اور آپ کے ماتحت ہیں انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام تو اس طرح سے عالم ملک کا انتظام بنا ہوا ہے۔ لیکن ایک شخصیت ملک اور ملکوت دونوں میں کام کر رہی ہے اور مشیت خداوندی اس کے قلب پر وارد ہوتی ہے۔ تو اس کا ایک حصہ تو ہے آسمان اور ایک حصہ ہے زمین اور ایک حصہ ہے بیچ میں جو اور فضا یا خلا جسے کہتے ہیں یہ تابع ہے

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما کلہما ج: ۱۲ ص: ۱۳۹۔

آسمانوں کے اور زمینوں کے۔ گویا زمین کا پہلے ہے آسمان پہ جو فضا ہے اور آسمان کا ماحول ہے زمین پر وہی فضا، بیچ میں دونوں جہانوں کے، اس لیے اصل دو عالم نکل آئے ایک عالم سلوات اور ایک عالم ارضین... تو عالم سلوات کا ذکر تو پہلے رکوع میں کیا گیا ہے جس کی کچھ تفصیل ابھی کی گئی کہ اس میں جنتیں بھی آ جاتی ہیں، جہنم بھی، ماننے والے بھی نہ ماننے والے بھی۔ قانون خداوندی ذات و صفات حق تعالیٰ کی یہ پہلے رکوع میں بیان کی گئی ہیں۔

تسخیر خزائن..... اس دوسرے رکوع میں زمین کا ذکر ہے۔ جس کو فرمایا کہ: هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ، انسانوں کو خطاب فرمایا جا رہا ہے کہ زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل (مردا تال) بنا دیا تمہارے کام میں لگا دیا، کتنا عظیم گزہ ہے زمین کا جس میں ہزاروں پہاڑ ہیں جنگل ہیں بحر ہے، تر ہے۔ وہ سب تمہارے لیے مسخر کیا گیا کہ اس مادے سے تم کام کرو، سب سے پہلی چیز ہے اشفاق، اس سے نفع اٹھانا۔

تو زمین میں رزق کے خزانے رکھ دیئے گئے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں وہ سب زمین سے نکلتی ہیں۔ اسی طرح سے معدنیات ہیں، جواہرات ہیں وہ زمین سے نکلتی ہیں، سونا چاندی ہو، اسی طرح سے اور معدنیات ہیں جیسے تیل کے چشمے ہیں، پیٹرول ہے، کوئلہ ہے۔ یہ سب چیزیں انسانوں کے کام میں آتی ہیں اور اللہ نے انسانوں کے اندر فطرت میں ان چیزوں کا تصرف ڈال دیا کہ وہ کھود کرید کر کے پتہ چلاتا ہے کہ تیل کے خزانے کہاں ہیں، جواہرات کہاں چھپے ہوئے ہیں، سونا کہاں سے نکلے گا؟ چاندی کہاں سے نکلے گی؟ اس کی تدبیریں ذہن میں ڈال دی گئیں کہ مشینوں کے ذریعہ یا ہاتھ سے دستکاری کے ذریعہ مٹی سے سونے کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ چاندی کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔

تیل اگر نکلے اس میں اجزاء زمین کے ملے ہوئے ہیں تو صاف کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ پہلے لوگ اپنی دستکاری سے صفائی کرتے تھے۔ اب دور مشینی دور ہے تو مشینوں کی بات اللہ نے ذہنوں میں ڈال دی اور ایسی ایسی مشینیں انسان نے ایجاد کر لیں کہ منوں میں ہزاروں من مٹی میں سے سونا نکال لیتے ہیں، چاندی نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح سے جواہرات، اسی طرح سے قسم قسم کے پتھر، سنگ خارا اور سنگ مرمر۔ اور مرمر کی پھر اقسام ہیں، سرخ اور سبز اور زرد، وہ سب انسان نکالتا ہے اور اپنے کاموں میں لاتا ہے تاکہ دنیا میں تصرفات چلیں۔

تو فرمایا کہ ہم نے ذلیل کر دیا تمہارے لیے زمین کو وہ چوں نہیں کر سکتی، حالانکہ تمہاری اصل ہے تم سے کہیں زیادہ بڑی ہے لیکن اس کو کھودے جاؤ اس میں نہریں بناؤ، کنوئیں بناؤ، ذرا بھی چوں و چراں نہیں کرتی اور تمہارے ہاتھ میں مسخر ہے اس کے اخلاط طبعی یعنی جگر کے کلڑے۔ سونے چاندی نکالے جاؤ وہ ذرا بھی چوں نہیں کرتی، یہ سب تمہارے لیے حاضر ہے۔

ایجاد و تصرف..... پھر اس میں تصرف کی طاقت بھی رکھی کہ دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز پیدا کر لو، یہی

انسان کی ایجاد کی حقیقت ہے۔ ایجاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی مادہ خود انسان پیدا کر دے، سونے کو خود پیدا کر دے، چاندی کو پیدا کر دے، یہ نہیں ہے۔ بلکہ چند چیزوں کو ملا کر ایک چیز نکالتا ہے، یا دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز بنالیتا ہے۔ دودرخت ہیں، دوقسم کے پھل ہیں، ان میں قلم لگایا اور ایک تیسری نوع تیار کر لی۔ سونے اور چاندی کو ملایا تو اس سے طرح طرح کے ظروف اور برتن بنالیے تو انسان کی ایجاد کی حقیقت ترکیب اور تحلیل دو چیزوں کو ملا کر تیسری چیز بنالینا یا ایک چیز کا تجزیہ کر کے اس سے اجزاء نکال لینا اور اس سے چیزیں بنانا، تو ترکیب کر دینا دو کی، یا ایک کی تحلیل کر کے اس کے اجزاء کر دینا، یہی انسان کی ایجاد کا حاصل ہے۔ ایک ذرہ برابر زمین نہیں پیدا کر سکتا آدمی۔ پیدا شدہ میں سے کام نکال سکتا ہے آفتاب کی ایک کرن ساری دنیا کے انسان ملیں تو نہیں بنا سکتے، لیکن ان کرنوں کی گرمی اور روشنی سے طرح طرح کی چیزیں بنا سکتے ہیں۔

ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل نکل آتا ہے اس میں تصرف کیے جاؤ اور نکالے جاؤ، تو پیدا کی ہوئی تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں، ان کو جوڑنا، کھول دینا، ملا دینا الگ کر دینا اس کی طاقت انسان کو دی گئی ہے اس سے وہ اپنے کام نکالتا رہتا ہے۔ تو زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل بنا دیا ہے اور زمین ہی میں سارے خزانے چھپے ہوئے ہیں، ان خزانوں کو تمہارے ہاتھ میں مسخر کر دیا اس کے لیے ضرورت پڑتی ہے کہ آدمی زمین میں چلے اور پھرے تاکہ ان معدنیات کا پتہ چلائے کتنے سفر کرنے پڑتے ہیں۔

زمین اور فضا آسمانی کی تسخیر جدیدہ..... اس لیے فرمایا کہ: **فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا**، زمین کے کندھوں پر چلو اور پھرو، سفر کرو اور سیر کرو، کہیں آدمی پیدل چلتا ہے، پیدل نہیں چل سکتا تو سواریاں، کچھ قدرتی سواریاں ہیں کہ گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر آدمی جائے، جس کو فرمایا۔ **وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً** ”گھوڑے اور گدھے اور خچر یہ سب کے سب ہم نے تمہارے لیے بنائے“۔ **لِتَرْكَبُوهَا** تاکہ تم سواری بھی کرو ان پر **وَزِينَةً** اور اپنا ٹھٹھا اور کروفر بھی دکھاؤ۔ جب جلوس نکلتے ہیں تو گھوڑوں پر، ہاتھیوں پر بڑی بڑی جھولیں، دھرپال ڈالی جاتی ہیں تاکہ چشم خدم پیدا ہو، تو زینت بھی ہے اور سواری بھی۔ **وَيَخْلُقْ مَا لَا تَعْلَمُونَ** ① فرمایا: یہ تو وہ سواریاں ہیں جو آج موجود ہیں اور جو آگے اللہ پیدا کرے گا وہ بہت ہیں۔

سو برس پہلے دو سو برس پہلے کس کو خبر تھی کہ موٹر ایجاد ہو جائے گی، ریلیں ایجاد ہو جائیں گی۔ یہ اونٹ جو سواریاں ہیں ان پر سواریاں شروع کیں، جب یہ ریل اور موٹر ایجاد ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایروپلین ایجاد ہو جائیں گے۔ آج ہوائی جہاز ایجاد ہو گئے تو مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں آدمی طے کر لیتا ہے پھر ان جہازوں میں نئی نئی ایجادات ہیں کہ ایک جہاز ڈھائی سو میل چلتا تھا تو پانچ سو میل کی رفتار فی گھنٹہ میں نکال لیا۔ اب اس کے بعد اطلاعات آرہی ہیں کہ ایک گھنٹہ میں ایک ہزار میل ہوائی جہاز اڑے گا، یا چندرہ سو میل

اڑے گا، تو پندرہ سو میل ایک گھنٹہ میں طے ہوں گے، ڈھائی ہزار میل ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہو جائیں گے۔ گویا یہاں سے آدمی ڈیڑھ گھنٹہ میں جدہ پہنچ جائے گا اور جدہ سے آدھ گھنٹہ میں مکہ پہنچ جائے گا۔

اور ایک وقت آئے گا کہ آدمی چاہے پی کر گھر سے کہے گا کہ میں ذرا عمرہ کر آؤں جا کے اور کھانا پییں آ کے کھاؤں، تو وہ چائے پی کے جائے گا ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچ گیا، عمرہ کیا اور جہاز سے واپس آ کر گھر پر کھانا کھالیا تو جو مسافت کہ آدمی اپنے پیروں سے نہیں طے کر سکتا تھا۔ حق تعالیٰ نے قلوب میں ایسی حکمتیں القاء فرمائیں کہ نئی سے نئی سواری آدمی نے ایجاد کی: فَاَمْسُوْا فِیْ مَنَاكِیْہَا۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔ اور زمین کے تابع ہے فضا تو فضا میں اڑو، وہ بھی اس کے ساتھ میں آگئی تو آسمان زمین کے درمیان میں بچو اور خلا ہے اس میں انسان اپنے سواریاں پہنچا رہا ہے حتیٰ کہ اس نے ہمتیں باندھیں کہ میں تو چاند پر پہنچ جاؤں گا اور اگر وہ پہنچنا چاہے اور اللہ تعالیٰ قدرت دے تو آدمی پہنچ بھی سکتا ہے اس میں کوئی مانع نہیں ہے کوئی وہ چیز ممنوع نہیں ہے، تو: فَاَمْسُوْا فِیْ مَنَاكِیْہَا۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔

یا دِ حَقِّ کے ساتھ انسانی تقصیرات منشاءِ خداوندی ہیں..... اب اس سارے سیر و سفر کا حاصل کیا ہے: کہ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِہٖ ”زمین کے رزق سے فائدہ اٹھاؤ“۔ کھانے کی چیز سے کھانے کا فائدہ، استعمالی چیز سے استعمال کا فائدہ، زمینت کی چیز سے زمینت کا فائدہ، کچھ چیزیں پیٹ میں جاتی ہیں، کچھ چیزیں بدن کے اوپر رہتی ہیں اور کچھ بدن کے باہر رہتی ہیں۔ پیٹ میں کھانا جاتا ہے، بدن کے اوپر لباس رہتا ہے، لباس سے باہر باہر مکان اور بلڈنگ اور بنگلے رہتے ہیں اور یہ سب زمین ہی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ سب کے مادے زمین ہی سے نکل رہے ہیں، تو زمین کو ایک عجیب و غریب خزانہ حق تعالیٰ شانہ نے بنا دیا اور انسان کے ہاتھ میں دے دیا کہ تصرف کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی تصرف سے روکا نہیں گیا بلکہ منشاءِ قدرت ہے کہ تصرف کرو۔

مگر ایک چیز بتلا دی کہ سب کچھ کرو، مگر ہمیں مت بھولو، اس لیے کہ ہم ہی تو ہیں محسنِ حقیقی، ہم نے ہی تو یہ زمین بنائی، ہم نے ہی تو تمہارے دلوں میں یہ چیزیں ڈالیں کہ کس طرح اس زمین کے مادے کو، اس کی نعمتوں کو استعمال کرو۔ تو یہ سارا جو کچھ بھی ہے ہمارے انعام اور احسان کا ثمرہ ہے تو بد فطرت ہو گا وہ انسان کے منعم کا انعام کھائے اور منعم کو بھول جائے، محسن کے احسان سے فائدہ اٹھائے اور محسن کو بھلا دے، وہ بد فطرت کہلائے گا۔ سلیم الفطرت انسان وہ ہے کہ جتنی نعمت بخشی جائے اتنا ہی شکر بڑھتا جائے، اتنی ہی طاعت بڑھتی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ سلیم الفطرت انسان ہے، دنیا کی ہر چیز کو اللہ نے نعمتوں سے مالا مال کیا۔

کرامت انسانی..... مگر سب سے زیادہ نعمتیں جو دیں وہ انسان کو عطا کیں، سب سے زیادہ جیتی مخلوق اللہ کی اور پیاری مخلوق وہ انسان ہے اس لیے اسے وہ کچھ دیا کہ وہ کسی کو نہیں ملا، اسی کو ایک جگہ فرمایا گیا کہ:

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنَیْ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰہُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰہُمْ مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَفَضَّلْنٰہُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ

مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْصِيلاً. ① ہم نے انسان کو معظم اور مکرم بنایا اور بحر و بر میں اسے اٹھایا کہ بر میں جہاں چاہے چلا جائے اور بحر میں بھی جہاں چاہے چلا جائے۔ بر کے لیے سواریاں الگ..... دریا کے لیے سواریاں الگ دیں، فضا کے لیے سواریاں الگ دیں۔ دنیا کا ہر جاندار اپنے پیروں سے چلتا ہے، آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ گھوڑا گھوڑے پر سوار ہو کر جائے، شیر شیر پہ، سانپ سانپ پر، بچھو بچھو پر، ہر ایک چیز اپنے پیروں پر سفر کرتی ہے۔ حتیٰ کہ دریا میں بھی اگر گر جائے تو تیر کر نکلتی ہے، یہ کرامت انسان کو دی گئی کہ دریا میں جائے تو سواریاں موجود، خشکی میں چلے تو سواریاں موجود، فضا میں جائے تو سواریاں موجود حَمَلْنَهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ پھر دنیا کے جس جاندار کو آپ دیکھیں گے اس کی ایک غزا متعین ہے، مثلاً شیر خون ہی پئے گا، گوشت ہی کھائے گا، پرندے ہیں وہ دانہ چلکیں گے وہ گوشت نہیں کھاتے، حیوان چرندے ہیں وہ گھاس کھائیں گے، لیکن انسان کے لیے ساری چیزیں وقف ہیں، گھاس یہ کھا جائے، ماس یہ کھا جائے، مٹی یہ کھا جائے پتھر یہ کھا جائے۔ سونا اور چاندی یہ کھا جائے، جواہرات یہ کھا جائے، اول تو ساری چیزیں مٹی سے بنی ہوئی ہیں..... تو آدمی ویسے بھی مٹی کھاتا ہے۔ اب یہ پان کھاتے ہیں ہم یہ چونا مٹی کے سوا اور کیا ہے، پتھر بھی کھالیا آدمی نے، پھر سونے اور چاندی کہیں ورق بن رہے ہیں تو وہ دواؤں میں کام آ رہے ہیں سونے اور چاندی کے زیور تو الگ ہیں، کھانے میں بھی سونا اور چاندی استعمال کیا جاتا ہے۔ جواہرات ہیں تو یاقوتیاں بنتی ہیں وہ مقوی باہ ہوتی ہے، وہ مقوی بدن ہوتی ہیں۔ تو یاقوت اور زمرد آدمی بھی کھا جاتا ہے۔ تو گھاس بھی کھا جائے، ماس بھی کھا جائے، پتھر بھی کھا جائے، مٹی بھی کھا جائے، پھر کون سی سبزی ہے جو آدمی نہیں کھاتا۔ ترکاریاں ہر قسم کی بجز اس کے کہ کوئی کڑوی ہو اور نہ منہ میں چلے تو چھوڑ دے اس کی عنایت ہے۔ کھانے والے اسے بھی کھا جاتے ہیں تو غرض دنیا کی ہر چیز انسان کھاتا ہے۔ تو فرمایا کہ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ہر پاکیزہ چیز ہم نے انسان کو دی۔

ناپاک چیز سے روک دیا کہ وہ مت کھاؤ، کھانے کے لیے بہتری پاک چیزیں ہیں۔ مردار مت کھاؤ، خنزیر مت کھاؤ، شراب مت پو کہ یہ چیزیں نجس بنائی گئی ہیں، تم نجاستوں کے استعمال کے لیے نہیں بنائے گئے، تم بنائے گئے ہو پاک باز، معظم اور مکرم، تو تمہاری غذا بھی پاک ہونی چاہیے۔ نہ کہ ناپاک چیزیں۔ تو پاک چیزیں اتنی بنادی ہیں کہ ان کی حدود نہایت نہیں، تو یہ کیا مصیبت ہے کہ ناپاک کی طرف آدمی جائے۔ ناپاک کی طرف جب جائے کہ جب پاک چیزیں نہ ہوں۔ حرام خوری جب کرے کہ جب حلال چیزیں نہ ہوں۔ ناجائز پیشہ جب اختیار کرے کہ جب جائز پیشہ نہ ہو۔ تجارت ہے، زراعت، صحافت، ملازمت، صنعت ہے، حرفت ہے، کیا ضروری ہے کہ آدمی سود ہی لے اور بے ہی لے اور چوری اور ڈکیتی کرے، اور ڈکیتی، یہ ناجائز پیشے ہیں۔ تو جائز پیشے اس لیے ہم نے بنادیے ہیں کہ تم ان کے اندر محدود ہو، تا کہ حرام اور ناجائز کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہ صرف حرص و ہوس ہے کہ انجام سے بے

خبر ہو کر حرام چیزوں میں بھی آدمی پڑ جاتا ہے جس سے دنیا بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ استعمال اشیاء میں جائزات شرعیہ سے تجاوز ممنوع ہے..... اس لیے فرمایا کہ زمین، مخر، سارے خزانے تمہارے، استعمال کرو مگر اللہ کو مت بھولو، یعنی ان اصول کے تحت رہو جو اللہ نے حرام و حلال کے اصول بنا دیئے جائزات کے حدود میں رہو، اسراف مت کرو۔ اپنے استعمال میں چیز لاؤ، مگر فضول خرچی سے نہیں بلکہ حدود کے اندر، دوسرے کو استعمال کے لیے دو، عنایت کرو، ہدیہ دو مگر حدود کے اندر، یہ ہدیہ نہیں ہے کہ سارا گھر لٹا دے آدمی، اور یہ بھی نہیں ہے کہ اسماک اور بخل میں آ کر ایک پانی بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکلے، تو دینے میں عطا کرنے میں بھی درمیانی چال ہونی چاہیے، اپنے استعمال میں درمیانی چال ہونی چاہیے، حتیٰ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر دریا کے کنارے بیٹھ کر وضو کرو: لَا تُسْرِفْ فِي الْمَاءِ۔ اسراف مت کرو کہ خواہ مخواہ پانی اچھال رہے ہو۔ بیٹھے ہوئے اور ایک لوٹے میں وضو ہو سکتا ہے تو دو گھڑوں میں وضو کر لیا وہ اسراف میں شمار ہوگا، کپڑا پہنو مگر حدود کے اندر۔ فرمایا گیا ہے کہ جو آستین پہنچوں سے نیچے لگی ہوئی ہو وہ اسبال اور سدل کے حکم میں ہے وہ فضول خرچی ہے اس پر عند اللہ مواخذہ ہوگا... تو کپڑا پہننے میں بھی حد بندی کر دی، کھانے پینے میں بھی حد بندی کر دی، خزانے پر بیٹھے ہو مگر حدود کے اندر استعمال کرو، یہ مت سمجھو کہ جب دس لاکھ روپے ہیں میرے پاس تو جس طرح چاہے خرچ کر لوں۔ اس میں بھی حد بندی ہے کہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرو، نہ اتنا خرچ کرو کہ کل کو تم خود بھک مٹکے بن جاؤ، نہ اتنا اسماک اور بخل کرو کہ نہ اپنے کام آئے نہ غیر کے کام آئے۔ ایک درمیانہ چال رہے۔ انہیں اصول پر چلنا اور جائزات شرعیہ کے اندر رہنا یہی ہے حد بندی اور اللہ کو یاد کرنا۔

ذکر اللہ کے دو معنی..... تو ایک اللہ کو یاد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ استعمال کرتے وقت قلب میں غفلت نہ ہو، ذکر جاری ہو کوئی اچھی چیز کھائی تو الحمد للہ کہے، کھانے کی ابتداء کرے تو بسم اللہ سے کرے، لباس پہنے آدمی تو بسم اللہ سے لباس پہنے، اور جب پہن لے تو حمد و ثناء کرے، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هَذَا ”اللہ کی حمد ہے کہ جس نے مجھے پہنے کو دیا“۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنِيْ ”اللہ کی حمد ہے اس پر کہ مجھے کھانے کو دیا“۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ سَقَانِيْ ”اللہ کی حمد ہے مجھے پینے کو دیا“، گھر میں داخل ہوں تو ذکر اللہ یہ ہے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَزَقَنِيْ هَذَا الْبَيْتَ ۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ بلند گ دی، یہ مجھے مکان دیا۔ تو قدم قدم پر یہ دعائیں بتلائیں تاکہ مالک یاد رہے تو ایک تو ذکر اللہ کے یہ معنی ہیں کہ آدمی پڑھتا رہے۔ مختلف اوقات کی جو دعائیں بتلائی گئی ہیں، ان کو استعمال کرتا رہے، حمد و ثناء کرتا رہے۔

اور دوسرے یہ ہے کہ اس شے کو اصول شریعت کے مطابق استعمال کرے، یہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے چاہے زبان سے ذکر اللہ ہو یا نہ ہو مگر جب جائز کی حد میں ہے، طریقہ شرعیہ پر چل رہا ہے، سنت کے مطابق چل رہا ہے وہ عملی ذکر ہے..... اگرچہ زبان پر ذکر نہیں، تو ذکر اللہ کے اور منعم اور محسن کو یاد کرنے کے دو طریقے بیان کیے گئے

ہیں۔ ایک یہ کہ زبان سے یاد کرو اس کے لیے وہ دعائیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیں۔ ذکر اللہ کی نہایت سہل صورت اور اگر کسی کو وہ دعا نہ بھی یاد ہو تو ہر کام میں جو نعمت ہو کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے۔ یہ تو کہہ سکتا ہے استغناء کر کے واپس آئے اگر دعا یاد نہ ہو تو کم سے کم کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے میرے اندر سے تو نے فضلات نکال دیئے ہیں ہلکا ہو گیا۔ یہ تو کہہ سکتا ہے زبان سے، سونے کے لیے لیئے اگر وہ دعا یاد نہ ہو تو آیتہ الکرسی پڑھ کر سو جائے۔ بسم اللہ پڑھ کر سو جائے، غرض اللہ کے نام سے سوئے جاگ جائے تو گویا موت کے بعد زندگی دی (اللہ نے) تو چاہے کہ وہ دعا پڑھے جو حدیث میں فرمائی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اٰخِیَانَا بَعْدَ مَا اَمَّا تَنَا وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ① ”حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے موت کے بعد زندگی دی اور میں اسی کی طرف لوٹ کر جانے والا ہوں۔“

لیکن اگر یہ دعا یاد نہ ہو تو کم سے کم کلمہ ہی پڑھتا ہوا اٹھے آدمی، سبحان اللہ کہتا ہوا اٹھے، الحمد للہ کہہ کر اٹھے۔ تو ایک ہے لسانی ذکر اس میں اعلیٰ طریقہ وہ ہے کہ سنت کے مطابق جو الفاظ ثابت ہیں انہیں یاد کر لے، بچوں کو یاد کرادیئے جائیں، بآسانی یاد کر لیں گے، جو بچے پورا قرآن شریف یاد کر لیتے ہیں وہ کیا دعائیں حدیث کی یاد نہیں کر سکتے، مہینے بھر میں سب دعائیں یاد ہو جائیں گی اور اگر نہ ہو تو کم سے کم اللہ کا نام زبان پر ہو یہ لسانی ذکر ہے۔ اور ایک یہ کہ ہر چیز کے استعمال میں یہ دیکھ لے کہ شریعت کے مطابق کر رہا ہوں استعمال یا نہیں، وہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے، کمانے کے لیے بیٹھے آدمی تو یہ دیکھ لے کہ جائز پیشہ اختیار کیا ہے یا ناجائز، جائز کو اختیار کرے، یہ بھی ذکر اللہ میں شامل ہے یہ بھی اللہ کی یاد ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ نعمتیں استعمال کرو، کوئی روک نہیں، مگر حدود میں رہ کر، اسراف نہ ہو فضول خرچی نہ ہو، جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا کہ: یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنْ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ② ”اے رسولوں کے گروہ پاک غذائیں استعمال کرو، کھانے کی ہوں، پہننے کی ہوں لیکن عمل صالح کرتے رہو۔“ وہ ذکر اللہ آگیا تاکہ محسن کا حق ادا ہوتا رہے۔ اور اس کا احسان دل کے اندر تازہ بہ تازہ رہے۔ یہ جو نمازیں پڑھتے ہیں یہ بھی وہی ذکر اللہ ہے کہ اے اللہ! ہم نے نعمتیں استعمال کیں مگر آپ کو نہیں بھلایا، جو اوقات فرض کر دیئے حاضر ہیں آپ کی بارگاہ میں، مؤذن اذان دیتا ہے اللہ اکبر اللہ اکبر۔

یہ محض اعلان نہیں کہ اطلاع دے دی کھا جاؤ نماز کے لیے، یہ یاد دلانا ہے ذکر اللہ کا کہ تم ہر وقت اللہ کی کبریائی اور عظمت دل میں رکھو اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ توحید اپنے دل میں رکھو، اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ نبوت کی عظمت اور عقیدت اپنے دل میں رکھو، حَسْبِ عَلٰی الصَّلٰوةِ نماز کی طرف جھکو، حَسْبِ عَلٰی الْفَلَاحِ دنیا و آخرت کی بہبود اور فلاح کی طرف آؤ، تو کبریا خداوندی، توحید الہی، نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ یاد دلانے کے لیے مؤذن

① الصحيح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب ما یقول عند النوم وأخذ المضجع ج: ۱۳

ص: ۲۳۷ رقم: ۳۸۸۶۔ ② پارہ ۲۳، سورۃ: المومنون، الآیۃ: ۵۱۔

پانچ وقت کھڑا ہوتا ہے تاکہ بندے غفلت میں نہ پڑ جائیں اور اگر اپنی نعمتوں میں پڑے ہوئے ہوں تو اذان کی آواز سننے ہی چونک جائیں ایک دم کہ اب ہمیں حق بھی ادا کرنا ہے اس محسن کا جس نے یہ ساری نعمتیں دیں اس لیے فرمایا کہ زمین کی نعمتیں استعمال کرو اس کے کندھوں پر سیر و سیاحت کرو، سفر کرو، مگر ہمیں مت بھلاؤ۔

سفر تنہائی..... اس لیے کہ اگر تم بھول گئے تو اِنَّہِ النُّشُوْرُ دیکھو کل کو آتا ہے ہمارے سامنے، اگر یہیں رہنا ہوتا دنیا میں ابدال آباد تک کے لیے تب بھی انسان یہ غور کرتا کہ جانا تو مجھے ہے ہی نہیں (چاہے یاد کروں چاہے نہ کروں زمین میری۔ لیکن ایک دن زمین کو چھوڑنا ہے اور موت کا منظر سامنے ہے، ہزاروں لاکھوں انسان گزر رہے ہیں اس زمین کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جو لکھ بپتی تھے وہ بھی جا رہے ہیں جو بھک منگے تھے وہ بھی جا رہے ہیں۔ غرض ایک نہ ایک دن اس زمین کو چھوڑنا ہے اور اس کی ساری نعمتوں کو چھوڑنا ہے اور چھوڑ کر جانا کہاں ہے؟ فرماتے ہیں ہمارے ہی پاس تو آنا ہے جہاں سے گئے تھے وہیں تو لوٹ کر آؤ گے، تو اس دن کو بھی یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اسے بھلا دو اور اس کو فرماتے ہیں؛ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فَرَادٰی كَمَا خَلَقْنَاكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَّآخِوْلَكُمْ وَّرَاٰ ظُهُوْرُكُمْ، وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَاكُمْ اَلَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُُمْ فِیْكُمْ شُرَكَآءُ، لَقَدْ تَقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَصَلٌ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ①

ہمارے پاس تم تنہا تھا آؤ گے کوئی لشکر ساتھ نہیں ہوگا، بادشاہ ہے وہ بھی اسی زمین فرش خاک پر ہمارے پاس آئے گا۔ اور فقیر ہے وہ بھی اسی فرش خاک پر کوئی لاؤ لشکر تمہارے ساتھ نہیں ہوگا، تو جیسے تنہا ہم نے بھیجا تھا تمہیں کہ ماں کے پیٹ میں تم ہی تھے، اسی طرح سے زمین کے پیٹ میں جو اصل ماں ہے تم تنہا ہی آنے والے ہو۔ فرماتے ہیں کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فَرَادٰی پھر اس خیال میں مت رہنا کہ کوئی تمہارے ساتھ لاؤ لشکر ہوگا جو ہمارے مقابلہ میں تمہاری مدد کر دے گا، تنہا آؤ گے اور اگر ساری دنیا کا لشکر لے کر بھی آؤ تو ہمارے مقابلہ میں تمہاری کیا چل سکتی ہے؟ ہم تو خالق ہیں، پیدا کرنے والے ہیں، جب چاہیں موت دے دیں، جب چاہیں ضعیف کر دیں، کمزور بنا دیں، تو مقابلہ اس کا کرو جو عاجز ہو، قادر مطلق کا کیا مقابلہ؟ اول تو تم تنہا آؤ گے، یہ سارا لاؤ لشکر یہیں رہ جائے گا اور اگر کسی کے ساتھ بالفرض ہو بھی لشکر ہمارے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا، اس لیے فرمایا: وَالِیْہِ النُّشُوْرُ۔

لشکر الہی سے بے خونی کی کوئی صورت نہیں..... یہاں سے انسان کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اللہ کا لشکر جو ہے وہ تو فرشتے ہیں جو دار السلطنت میں رہتے ہیں آسمانوں کے اندر جو میں ہیں فضا میں ہیں۔ بھلا اتنے لشکر آئے گا اتنے میں ہم اپنا کام کر لیں گے، تو کیا ضرورت ہے یاد کریں، مقابلہ کے لیے تیاری کر لو، اس سے ہم اپنا کام کر گزریں گے، بہر حال لشکر کو بننے سنور تے دریگتی ہے، اتنے میں ہمارا کام ہو جائے گا، تو کیا مقابلہ ہوگا اس لیے آگے فرمایا کہ: اَمْسِئْتُمْ مِّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّخْسِفَ بِكُمْ الْاَرْضُ۔ تم فرشتوں کے لشکر کو لے رہے ہو یہ

زمین بھی تو ہمارا لشکر ہے اگر اس کو ہم زلزلے سے دھنسا دیں اور سب دھستے ہی چلے جاؤ۔ تو کسی فرشتے کے بھی آنے کی ضرورت نہیں جو زمین فرش بنی ہوئی تھی وہی منٹ بھر کے اندر قبر بن جاتی ہے۔ اسی میں آدمی دفن ہو جاتا ہے تو ءَامِنْتُمْ مِّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يُّخْسِفَ بِكُمْ الْاَرْضُ۔ کیا آسمان والے سے تم بے پرواہ ہو گئے؟ اگر زمین کو ہم زلزلے میں ڈال دیں اور لگے موجیں مارنے اور جگہ جگہ اس میں دراڑ کھل جائیں اور پناہ نہ ملے تب کیا ہوگا؟ فرشتوں کو آتے آتے اگر بالفرض دیر بھی لگی تو لشکر اوپر کا کیا آئے گا۔ یہ تو نیچے ہی لشکر موجود۔

اور میں کہتا ہوں زمین بھی بعد کی چیز ہے ایک چیونٹی کو مسلط کر دے، کان میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے..... ایک کیڑا مکوڑا ناک میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے..... تو ایک چیونٹی جسے ختم کر سکتی ہے وہ قادر مطلق کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھے گا کہ فرشتے آویں گے، مقابلہ ہوگا، دیکھی جائے گی، فرشتے تو بعد آویں گے جو تمہارا فرش خاک ہے وہی تمہارے لیے مقابلہ کا لشکر ہے اس کی پیداوار میں ایک چیونٹی تمہارا مقابلہ کر سکتی ہے۔

قادر مطلق تکبر و نخوت کو جس طرح چاہے توڑ دے..... نمرود جیسے عظیم بادشاہ کو جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا، ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کا دماغ نیچے آتا ہی نہیں تھا، وہ تو کہتا تھا کہ میں رب ہوں، اس کو کیا نیچا دکھایا کہ ایک مجھ پر اس کی ناک میں گھس گیا اور دماغ میں جا کر لپٹ گیا اور وہ بھڑ بھڑ کرتا تھا، اب وہ بے چین، تو اس نے طریقہ یہ رکھا تھا ایک خادم مقرر کر رکھا تھا کہ وہ جوتے سر پر مارتا تھا، جب جوتے پڑتے تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر گیا پھر اور جہاں جوتے الگ ہوتے مھر مھر پھرایا، پھر اس نے خادم کو بلوایا تو جن پر خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا انہیں کے ہاتھ سے سر پر جوتے پٹوادیئے، تو مطلب یہ ہے کہ چیونٹیاں بھی بعد کی چیز ہیں، خود انسان ہی کو مسلط کر دے تمہارے اوپر جس کو تم اپنا بندہ جانتے ہو خدائی کا دعویٰ کر رہے ہو اسے ہی جوتیاں دے کر تمہارے سر پر مسلط کر دے تو کیا کرو گے، تو خالق سے بچ کر کہا جائے گا آدمی، تو زمین ہے، زمین کی پیداوار ہے اور خود انسان ہے، وہ تمہارے حق میں مد مقابل آجائیں گے اور ایک فوج انسانوں کی کھڑی کر دے اور وہ تلواریں لے کر آجائے تو سارا کروفر رہ جاتا ہے۔ تو انسان ہی انسان کو بتلا دیتا ہے وہ درحقیقت خدا کی طرف سے لشکر مسلط ہوتا ہے۔ تاکہ متکبروں کا غرور توڑ دیا جائے نخوت شعاروں کی نخوت توڑ دی جائے، انسان انسان پر مسلط ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں وَالْيَاسُورُ بِهَرِّهٖ اَلْاَسْبَابُ مَوْتِ هَزَارُوْنَ هِيَ!..... اور موت کے اسباب ہزاروں ہیں، جانور کاٹ لے، ہارٹ فیل ہو جائے، زمین میں دھنس جائے، کوئی اوپر سے مصیبت آپڑے، ہزاروں اسباب ہیں کہ جن کے ذریعے سے ہم تک آؤ گے، تو اس وقت کو بھی یاد رکھو کہ سدا یہ وقت نہیں رہے گا کہ بلند نگ بھی ہے، دولت بھی ہے، کام چل رہا ہے۔ یہ سب وقتی چیزیں ہیں اصل وہی وقت ہے کہ جو آنے والا ہے وَالْيَاسُورُ اِسٰی کی طرف تمہیں پھیل کر جانا ہے۔ ءَامِنْتُمْ مِّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يُّخْسِفَ بِكُمْ

الْأَرْضُ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ۝ أَمْ أَمِنتُمْ مَنِ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ كَيْتَمِمْ مَطْمَئِنُّونَ ۖ
ہوا آسمان والے سے اگر پتھر برسا دے آسمان سے، بادل آئیں اور بجائے پانی برسنے کے پتھر برسنے لگیں اور میں کہتا ہوں کہ یہ اولے جو پڑتے ہیں پتھر ہی تو ہیں اسی پانی کو نجد کر کے جما کر پتھر کی شکل دے دیتے ہیں۔ اگر وہ بڑھ جائیں دو دوسیر کا ایک اولہ پڑنے لگے تو پناہ نہیں مل سکتی، مکان ٹوٹ جاتے ہیں، ڈھ جاتے ہیں، انسان تو بجائے خود بے کمر و تو کس چیز نے تمہیں مطمئن بنا رکھا ہے، مالک کی طرف سے کون سی پناہ گاہ ہے کہ اس سے بچ کر تم اس میں پناہ پا لو گے اِنَّ مَا تَكُونُوا يُلْذِرُكُمْ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ ①

اگر تم بڑے بڑے سنگین قلعوں میں بڑے بڑے پتھر کے برجوں میں، لوہے کے برجوں میں زہو گے موت وہیں جا پکڑے گی، یہ نہیں ہے کہ موت میدان میں آتی ہے اگر برجوں کے اندر تم کوئی منفذ ہی نہ رکھو، ہوا کا راستہ نہیں تو جس دم ہو کر آدمی ختم ہو جائے، ہوا کا راستہ رکھو تو بھی بہر حال ختم ہو سکتا ہے تو فرشتے موت کے ان کے یہاں نہ سنگین کوئی چیز ہے نہ لوہے کے قلعے کوئی چیز ہیں۔ جیسے بجلی جب آتی ہے تو کتنا ہی بڑا لوہا ہو وہ تو اس کے جگر میں سا جاتی ہے۔ تو ملائکہ تو بجلی سے بھی زیادہ لطیف ہیں۔ وہ ہر چیز میں سا کر اندر دخول کرتے ہیں تو موت کے فرشتے وہیں پہنچ جائیں گے۔

تو فرماتے ہیں کہ زمین بھی سبب موت بن سکتی ہے پانی بھی سبب موت بن سکتا ہے، بادل بھی سبب موت بن سکتے ہیں، اولے برس جائیں، پتھر برس جائیں..... آخر لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے اور کیوں برسائے گئے اس لیے کہ انہوں نے حدود سے تجاوز کیا، جائز طریقہ دیا گیا تھا کہ نکاح سے عورتوں کی طرف آؤ انہوں نے لڑکوں کو استہمال کیا، اس لواطت کے جرم میں آسمان سے پتھر برسائے گئے اور کوئی پناہ نہیں پاسکے۔ قوم شہود، ان کو تباہ کر دیا گیا، ایک چنگھاڑ سے جبرئیل علیہ السلام نے ایک ڈانٹ دی، گھر کی دی، کیلچہ پھٹ گئے، قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا کہ سات دن تک ہوا کے جھکڑ چلے ہیں۔ اس طرح سے کہ جو مکان گہری گہری بنیادوں کے تھے مع بنیادوں کے ہوانے اکھاڑا اور اوپر لے جا کر پٹیا نیچے کی طرف حدیث میں ہے کہ جب مکان اوپر جاتے تھے تو جانوروں کی آوازیں اوپر سے سننے میں آتی تھیں فضا سے مع جانوروں کے مکان اوپر گئے اور لے جا کر شیخ دیئے گئے تو وہی ہوا جس سے ہم زندگی حاصل کرتے ہیں وہی موت کا ذریعہ بن جاتی ہے وہی زمین جو فرش تھا ہمارے لیے جو ہی قبر بنا دی جاتی ہے۔ وہی بادل جو پانی برساتے تھے اور زندگی کا سامان ہوتا تھا وہی ذریعہ موت کا بنے..... تو ہم تو زندگی کے اسباب کو چاہیں تو موت کا سبب بنادیں پھر تم مطمئن ہو کر کیسے بیٹھ گئے، کس طرح سے غفلت میں پڑے، اس واسطے ادھر توجہ دلائی کہ زمین کا ملک بے شک تمہارے لیے ہم نے کیا، مگر دیکھو دینے والے کو مت بھلاؤ اَمْ اَمِنتُمْ مَنِ فِي السَّمَاءِ اَنْ يُخْسِفَ بِكُمْ الْاَرْضَ زَمِيْنٌ مِّسْكِنٌ ۚ اَمْ اَمِنتُمْ مَنِ فِي السَّمَاءِ اَنْ

يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا... یا پھر بر سادیئے جائیں آسمان سے فَسْتَغْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرٌ۔ اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ڈرانے والے کا ہے سے ڈراتے تھے۔ اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ انبیاء علیہم السلام نے جن چیزوں سے ڈرایا تھا وہ معاذ اللہ! وہی بتا ہی باتیں نہیں تھیں۔ وہ ایک امر واقعہ تھا جو ہونے والا تھا تو اس وقت نذیروں کی نذارت کا پتہ چلے گا، ڈرانے والوں کے ڈرانے کا پتہ چلے گا اس وقت تم ایمان لاؤ گے کہ سچ کہتے تھے وہ، لیکن اس وقت ایمان لانے سے کیا فائدہ کہ جب موت سر پر آگئی۔ موت سے پہلے پہلے درجہ ہے ایمان کا بھی اور ڈرنے کا بھی۔

تصدیق و تکذیب کا انجام..... اس میں فرماتے ہیں کہ پھر دو قسم کے لوگ ہوں گے، ایک وہ کہ جنہوں نے تصدیق کی اور جو کچھ انبیاء نے فرمایا انہوں نے اٹھنا کہہ کر دل میں جگہ دی اور ان کے طریق پر چلے دنیا بھی بن گئی۔ اور آخرت بھی ان کے لیے۔ ایک جھٹلانے والے تھے، جنہوں نے تکذیب کی اپنے غرور میں آکر کسی نے دولت کے گھمنڈ میں کسی نے رسمی علم کے گھمنڈ میں کسی نے اپنی تھوڑی سے عقل کے گھمنڈ میں وحی کو نہ مانا، انبیاء کی باتوں کو جھٹلایا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرٌ۔ اس وقت وہ لوگ کہ جو جھٹلانے والے تھے جب وہ انجام بد سامنے آئے گا تب وہ کہیں گے کہ واقعی جو نکیر کی جارہی تھی وہ اب سامنے آئی۔ بالکل ایسی اس کی مثال ہے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ میں نو مہینے سے اندر پرورش پا رہا ہے اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری زمین اور آسمان بس یہی ہے ماں کا پیٹ۔ اس کا دھیان ہی آگے نہیں جاتا ایک آنے والا وہاں خبر دے کہ جس عالم میں بسر کر رہا ہے یہ تو مہا گندا عالم ہے۔ بہت تھوڑا سا عالم ہے۔ ایک عالم ہے دنیا، بڑا بھاری عالم ہے۔ ماں کے پیٹ جیسے مکان کروڑوں بن سکتے ہیں اس کے اندر، تو وہ یوں کہے گا کہ یہ وہی باتیں کہہ رہا ہے۔ بھلے اس سے بڑھ کر کوئی اور عالم ہو سکتا ہے، حیض کا خون مل رہا ہے کھانے کو اور پانی کے اندر میں تیر رہا ہوں کتنا اعلیٰ مکان ہے اس کے بساط میں ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو سمجھے اس نے دنیا کو جھٹلایا، لیکن جب پیدا ہوا اور دنیا میں آیا تو اس نے دیکھا کہ واقعی ماں کے رحم جیسے تو کروڑوں عالم بن سکتے ہیں اس دنیا میں، وہاں غذا ملتی تھی گندے خون کی۔ یہاں اعلیٰ درجے کی مٹھائیاں ہیں، غذائیں ہیں، تو کہنے والا سچ کہتا تھا۔ میں نے جھٹلایا اب وہ نادم ہے، لیکن جب اس دنیا میں آگئے تو اسی آنے والے نے پھر کہا، اب ایک دفعہ تو جھٹلا چکا ہے اب میں خبر دیتا ہوں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور بہت بڑا عالم آنے والا ہے جس کو عالم برزخ کہتے ہیں اور وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیا میں جیسی کروڑوں بن سکتی ہیں اس کے اندر، جب ایک میت کے سامنے قبر وسیع کی جائے گی اور حد نظر تک ایک عالم نظر آئے گا تو ایک ایک برزخ والے کو اتنا بڑا ملک ملے گا جیسی ایک دنیا۔

تو دنیا میں کروڑوں بن سکتی ہیں عالم برزخ میں سے، اتنا بڑا عالم ہے تو آنے والا کہتا ہے کہ ایک دفعہ تو نہیں سمجھا، مگر اب سمجھ جا، اس کے بعد ایک عالم آنے والا ہے اور اس کے بعد ایک اور آنے والا ہے جس کو عالم جنت کہتے ہیں۔ تو یہ برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں سے بن جائیں، وہاں ادنیٰ جنتی کا حصہ دس دنیا کے برابر ہوگا

یہاں تو ایک ہی دنیا کے برابر ہے۔ تو جھٹلانے والے تو آخر تک جھٹلاتے چلے جائیں گے اور تصدیق کرنے والے ابتداء سے ہی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ بھی سچ کہا کہنے والے نے، اگلی بات بھی سچ کہی، اس سے اگلی بھی سچ کہی، تو تصدیق کرنے والا امن میں ہے اس لیے کہ جسے مان لیا تھا وہ چیز آگئی اس کی آنکھوں کے سامنے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: **وَوَدَّاعِي أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابُ النَّارِ أَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا** اہل جنت کہیں گے ہم نے تو اللہ نے جو وعدے کیے تھے، ٹھیک اس کے مطابق پالئے، تمام انعامات ہمیں مل گئے، تمہیں بھی وہ چیز مل گئی جس کا تم سے کہا گیا تھا کہ اگر نہیں مانو گے تو جہنم ملے گی تو تمہیں مل گیا اللہ کا وعدہ۔ **قَالُوا نَعَمْ** کہیں گے، ہاں اب ہم اقرار کرتے ہیں کہ مل گیا لیکن اس وقت کا اقرار کام نہیں دے گا۔ **فَإِذَنْ مُوَدَّنَ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ** ① ایک نداء کرنے والا نداء کرے گا کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت جو اب آکر سمجھے ہیں وہاں ایمان نہیں لائے۔

قبولیت ایمان کا وقت..... تو بعد میں ایمان لانا وہ ایمان نہیں ہے وہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔ جب موت کے فرشتے سامنے آگئے اور آنکھوں سے نظر آگئے اب کوئی کہے میں ایمان لاتا ہوں وہ ایمان نہیں ایمان کہتے ہیں غیب کی خبر کو ماننا، غیب کی خبر اس نے نہیں مانی تو وہ فرعون کا سا ایمان ہے، فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں مانی، جب غرق کیا گیا اور گلے گلے پانی آیا تو اس وقت کہا کہ میں ایمان لایا موسیٰ کے خدا پر، بنی اسرائیل کے خدا پر اس وقت فرمایا گیا: **آلَسُنْ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ** ② اب ایمان لایا اور چار سو برس تک زمین میں فساد پھیلا یا، وہاں تو موسیٰ کی بات نہ مانی اب کہتا ہے کہ میں ایمان لایا، تو وہ ایمان مجبوری کا ہے، جب آنکھوں کے سامنے عذاب آگیا تو اب بھی ایمان نہیں لائے گا؟ تو اسے ایمان تھوڑا ہی کہتے ہیں تو وقت کے بعد کسی چیز کو سمجھنا وہ ایسا ہی ہے جیسے مثل مشہور ہے فارسی کی:

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکله خود باید زد

دشمن نے جب آکر گھیر لیا اور سب ہتھیار بے کار ہو گئے اس وقت کہا کہ افوہ! قلعے میں فلاں ہتھیار بھی تو رکھا ہوا ہے۔ تو اب اس ہتھیار کو اپنے منہ پر مارنا چاہیے دشمن تو قابض ہو گیا۔ تو بعد از وقت جو چیز یاد آتی ہے وہ بے کار ہوتی ہے اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ نعمتوں کے زمانے میں ہمیں یاد کرو۔ جب مصیبت آپڑی اس وقت کا یاد کرنا یاد نہیں کہلائے گا۔

یاد خداوندی کا وقت..... ایک حدیث میں ہے: حدیث قدسی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں بندوں سے خطاب کرتے ہیں کہ ”اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانہ میں مجھے یاد کرتا کہ تیری بیماری کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے تو اپنی نعمت کے زمانہ میں مجھے یاد رکھتا کہ تیری مصیبت کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں۔

اور اپنی زندگی میں مجھے یاد کرے، تاکہ تیری موت کے وقت میں تیری دست گیری کروں۔“ جب اس وقت یاد نہ کیا تو موت کے وقت کیا یاد کرے گا اور جب نعمت میں یاد نہ کیا تو مصیبت کے وقت کیا یاد کرے گا؟ تو یاد کرنا وہ ہے کہ آدمی قبل از وقت یاد کرے۔

سات قسم کے آدمی قیامت کے دن عرش الہی کے سائے میں ہوں گے..... اسی واسطے فرمایا گیا حدیث شریف میں کہ مَبْعُثَةٌ يُظِلُّهُمْ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ ① ”سات قسم کے افراد ہوں گے کہ جن کو قیامت کے دن عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ نہیں ہوگا بجز اللہ کے“ سائے کے، ان میں سے ایک قسم فرمائی گئی کہ شَابٌ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللَّهِ وہ نوجوان جس نے نوجوانی میں اللہ کو یاد کیا اور عبادت میں وقت گزارا، اس لیے کہ بڑھاپے میں اگر عبادت کرے وہ زیادہ عجیب بات نہیں، جب قبر میں پیر لٹکا چکا آدمی دنیا کی قوتیں جواب دے گئیں، جذبات سرد پڑ گئے امنگ باقی نہیں رہی، کٹھے میٹھے کی طرف کوئی توجہ نہیں رہی، اب بھی اگر اللہ کو یاد نہ کرے گا تو اور کون سا وقت آئے گا تو وہ مجبوری کا یاد کرنا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یاد کرنا وہ ہے جو جوانی کے زمانہ میں یاد کر لے آدمی جبکہ امنگوں کے سبز باغ سامنے ہیں، امنگیں سامنے ہیں، دنیا کی بہاریں سامنے ہیں، قوت اندر موجود ہے، اس وقت ہر چیز سے کٹ کر آدمی متوجہ ہو اللہ کی طرف وہ زیادہ عجیب چیز ہے تو وقت آنے سے پہلے پہلے یاد کر لے، یہی یاد کھلاتی ہے اور وقت آ جانے کے بعد یاد کرے وہ یاد، یاد نہیں ہے۔

قیامت کے حساب سے پہلے اپنا حساب کر لیں..... اس لیے اس آیت میں توجہ دلائی گئی وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ وَالْيَهْ النُّشُورُ زمین سے فائدہ اٹھاؤ، چلو پھر وہ ہمارے خزانوں سے متفع ہو مگر اسے یاد رکھو کہ لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے اور حساب دینا پڑے گا اور ایک ایک چیز کا، ایک ایک ذرہ کا حساب دینا ہوگا، اس کو ایک جگہ فرمایا گیا قرآن کریم میں کہ ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ② پھر قیامت کے دن نعمتوں کا سوال کیا جائے گا تم سے، کہاں سے کیا یا کس طرح استعمال کیا۔

نعیم کی تفسیر..... اور نعیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سردی کے زمانہ میں گرم پانی بھی نعیم ہے۔ پوچھا جائے گا کہ سردی میں ہم نے گرم پانی دیا تم نے کیا شکر ادا کیا اور گرمیوں کے زمانہ میں ٹھنڈا پانی نعیم میں داخل ہے تو سوال کیا جائے گا کہ برستی ہوئی آگ میں ہم نے ٹھنڈا پانی دیا تم نے الحمد للہ کہا یا نہیں؟ تم نے توجہ کی ہماری طرف یا نہیں؟ وہاں ایک ایک ذرہ کا سوال کیا جائے گا، ایک ایک چیز کا إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ یہ ساری اربوں کھربوں مخلوق ہر ایک سے اس کی اربوں کھربوں چیزوں کا حساب لیا جائے گا اور حق تعالیٰ سوال کر لیں گے اور پچاس ہزار برس کا دن رکھا ہے قیامت کا تاکہ ساری امتوں کا حساب اس دن آجائے تو ایک ایک چیز کا سوال کیا جائے گا تو اس سے پہلے کہ

① الصحيح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقة ج: ۲ ص: ۷۵ رقم: ۱۰۲۱.

② ہارہ: ۳۰، سورۃ: التکاثر، الآیۃ: ۸.

وہاں سوال کیا جائے یہیں اپنے ذہن سے کیوں نہ سوال کرو، حدیث میں ہے کہ **خَاصِمُوا قَبْلَ أَنْ تُحَاسِبُوا** ① قبل اس کے کہ حساب لیا جائے قیامت کے دن تم ہی اپنا کچا چٹھا کیوں نہیں درست کر لیتے یہاں، پہلے ہی اپنا حساب کیوں نہیں لے لیتے۔

مراقبہ کے ذریعہ روز کار و روز حساب ایک معمولی سائل ہے اگر اسے ہی کر لے آدمی تو ساری زندگی درست ہو جائے۔ آپ بہر حال دن بھر کام کاج کر کے رات کو پڑ کے سوتے ہیں، چار پائی پر لیکٹ کر ایک دس منٹ مراقبہ کر لے آدمی یہ سوچے کہ آج دن بھر میں میں نے کتنی اللہ کی اطاعت کی ہے، کتنی نافرمانی کی، نعمتوں پر کتنا شکر ادا کیا کتنا غفلت میں گزارا، جتنی چیزیں غفلت میں گزریں، جتنی چیزیں معصیت کی ہوں، گناہ کی ہوں، سچے دل سے توبہ کرے اور فرمایا گیا **الْأَسْأِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ** ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا، اگر حقوق العباد ہیں تو سوچ لے رات کو پڑ کے کہ کس کس کی حق تلفی کی ہے، مال کی حق تلفی، کسی کو گالی دی ہے، کسی کو تیز جملہ کہا ہے کسی کا دل دکھایا ہے، یہ بھی حق تلفی ہے، اگلے دن اس سے معذرت کر لے کہ بھئی وقتی بات تھی جذبہ آگیا تھا، میں نے تمہیں یہ کہہ دیا تم اللہ کے لیے معاف کرو، کچا چٹھا صاف ہو گیا کسی کی چیز زبردستی جھپٹ لی ہے واپس دے دو، اگر وہ خود تمہیں رضا سے دیدے رکھ لو، معاملہ صاف ہو گیا۔ کسی کو گالی دی ہے اس سے معافی مانگ لو معاملہ صاف ہو گیا۔ تو قبل اس کے کہ ان گالیوں کا ان معصیوں کا وہاں حساب لیا جائے اس سے پہلے ہی کیوں نہ حساب لیا جائے۔

تو اگر روزانہ آدمی سوتے وقت ایک دس منٹ سوچ لے، تو دن بھر کی تو ساری باتیں یاد رہتی ہیں کہ کتنی نیکیاں کیں، کتنی بدیاں کیں، جتنی بدیاں کی ہیں ان سے توبہ کر لیں، جتنی نیکیاں کیں کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، میں تو اس قابل نہیں تھا کہ یہ نیکی انجام دوں، تیری توفیق بخشی سے انجام دیں تو شکر پر وعدہ ہے کہ **لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ** جتنا شکر کرو گے نعمت پر نعمتوں کو میں بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکیوں پر شکر کیا تو نیکیاں بڑھتی جائیں گی اور بدی سے توبہ کی تو وہ مٹتی رہے گی، تو روزانہ اگر آدمی چٹھا صاف کر لے، بدیاں مٹا دے، نیکیوں میں اضافہ کر لے یہ کوئی مشکل بات ہے اگر پانچ دس منٹ سوچ لیا کرے چار پائی پر لپیٹ کر تو روز کار و روز حساب ہوتا رہے گا۔ اور اگر نہیں سوچتا اور اس غرضے (چکر) میں ہے کہ جب موت کا وقت آئے گا جب کر لوں گا اکٹھی توبہ، تو اول تو جسے آج توفیق نہیں ہوئی کیا ضروری ہے کہ کل کو توفیق ہوگی۔

کل جب آئے گی تو کہے گا کہ کل کو کر لوں گا، پھر وہ کل آئی تو کل کل میں گزر جائے گی، اسے موقعہ ہی نہیں ملے گا، اور اگر موقعہ بھی ملا موت سے قبل تو اس وقت کہاں اتنا موقعہ ہے کہ اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور جو

① المصنف لابن ابی شیبہ ج: ۷ ص: ۹۶ رقم: ۳۳۳۵۹۔ (یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔)

② المعجم الکبیر للطبرانی ج: ۸ ص: ۳۹ رقم: ۱۰۱۲۸۔ مجمع الزوائد، باب التوبۃ علی الذنب ج: ۱۰ ص: ۹۹۔

چیزیں کی ہیں ان کی تلافی کرے وہ تو مرنے کا وقت ہے، اس واسطے قبل از موت کرے، آسان محاسبہ..... اس میں سہولت یہ کہ روز کا روز حساب کرتا رہے نامہ اعمال درست ہوتا رہے گا۔ جیسے ایک سرکاری ملازم ہو اگر وہ روز کا روز اپنا حساب دیکھ لے، کاغذات درست کر لے وہ مطمئن رہے گا کہ چیکر جس وقت بھی آجائے گا میں پیش کر دوں گا یہ میرا حساب صاف ہے۔ ہر وقت اسے امید لگی ہوئی ہوگی اور وہ چاہتا ہوگا کہ کوئی چیکنگ کرنے کے لیے آئے تاکہ میرا صاف ستھرا حساب دیکھے تو میری ترقی ہوگی اور گورنمنٹ سے میرا اعزاز ہوگا۔ اور ایک وہ ملازم ہے کہ اپنا وقت آرام سے گزار رہا ہے اس نے کہا غلطیاں ہیں مہینہ کے ختم پر کر لوں گا اکٹھی لیکن مہینہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ بیچ میں چیکر آ گیا اب جو چیکنگ کی تو معلوم ہوا سارا حساب غلط ہے، تو سوائے بروخاستگی کے، سوائے جرم مانے کے، سوائے جیل خانہ کے اور کیا ہوگا اس کے لیے.....؟ تو بہترین شخص وہ ہے جو روز کا روز حساب اپنا درست کر لے تاکہ انجام کے وقت مطمئن ہو کر چلا جائے کہ میرا چھٹا تو صاف ہے:

آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ پاک

جس کا حساب صاف ہے اس کو محاسبہ اور چیکنگ سے کوئی بھی ڈر نہیں ہوگا وہ تو تمنا میں رہے گا کہ کاش کوئی چیکنگ کرے تو میرا انعام بڑھے میری ترقی ہو۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ مہینہ اور سال کو چھوڑ کر اگر روز کا روز سوتے وقت ایک دس منٹ آدمی غور کر لیا کرے کہ کتنی میں نے حق تلفیاں کیں اور کتنی حقوق کی ادائیگیاں کیں۔ جتنی ادائیگی اللہ کے حقوق کی، بندوں کے حقوق کی ہوئی شکر کرے، حمد کرے اور کہے کہ یا اللہ! یہ تیری توفیق سے ہوا میں تو اس قابل نہ تھا اور جتنی غلطیاں ہوئیں فوراً معافی مانگ لے جو اہل حقوق ہیں ان سے معاف کرا لے، وہ صاف ستھرا رہے گا، پھر اس کے قلب میں تشویش نہ ہوگی، طمانیت ہوگی، بشارت ہوگی، بادشاہوں کی مانند اس کی زندگی ہوگی کہ میں کسی کا قرض دار نہیں ہوں، کسی کا دیندار (مقروض) نہیں ہوں۔ وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرے گا، یہ بہتر ہے کہ ایک آدمی فقیر، پریشان پراگندہ حال کی طرح زندگی بسر کر دے، یا یہ بہتر ہے کہ بادشاہ بن کر زندگی بسر کرے، جس کا قلب صاف ہے وہ بادشاہت میں ہے اور جس کے قلب میں بے چینی ہے وہ فقیر ہے پریشان حال ہے تو اس پریشانی کو دور کرنے کی صورت شریعت نے محاسبہ رکھی کہ روزانہ اپنا حساب لے لیا کرے اس لیے فرمایا **وَالْيَهُ النُّشُورُ** نعمتوں کے استعمال سے ہم نہیں روکتے مگر دو باتیں چاہتے ہیں ایک تو یہ کہ حدود میں استعمال ہو، حد سے گزرا ہوا نہ ہو اور ایک یہ کہ موت کو یاد کرتے رہو، بے فکر ہو کر مت رہو۔

کار آمد عبادت..... تو گویا مسلمان کی حقیقت نکلی منتظر، وہ فکر میں رہے کہ میرے کسی کی حق تلفی نہ ہو جائے، ہر وقت فکر لگی ہوئی ہو، اسی کو حدیث میں فرمایا گیا ہے: **تَفَكَّرُ سَاعَةً خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةٍ سَنَةً** ① ایک گھڑی فکر

① علامہ مجلسی امام فاکھائی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت سری سقطی کا قول ہے، نیز فرماتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوذرؓ سے ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: فکرۃ ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ۔ دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۳۱۰۔

کرنا اپنے معاملے میں یہ ایک برس کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے۔

اس لیے کہ صحیح فکر سے ایک برس کی عبادت کا راستہ درست ہو جاتا ہے، کھل جاتا ہے تو بے فکری عبادت کا رآمد نہیں ہے، فکر مندانہ عبادت ہوگی وہ کارآمد ثابت ہوگی، اس لیے **إِلَيْهِ النُّشُورُ** سے توجہ دلائی گئی ہے کہ حساب آتا ہے اور ہماری طرف پہنچنے والے ہو، تم اس وقت کو پیش نظر رکھ کر کرو، جو تمہارا جی چاہے کرو، چاہے اسلام اختیار کرو چاہے کفر کرو مگر یہ سمجھ لو کہ آکر حساب دینا ہے۔

صوبہ زمین کے احکام کا حاصل اور اگر یہ کہو کہ ہمارے فرشتے وقت پر نہیں آئیں گے۔ اول یہ خام خیالی ہے لیکن اگر یہ ہو بھی تو فرشتوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ زمین ہی کافی ہے تمہارے لیے بادل ہی کافی ہیں، ایک چمچر ہی کافی ہے۔ **وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ**۔ اللہ کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا کہ کہاں کہاں ہیں۔ چاہے چمچروں سے کام لے لے، چاہے چیونٹیوں سے کام لے لے، چاہے بادلوں سے کام لے لے چاہے زمین سے کام لے لے۔ **وَالْيَهُ النُّشُورُ** پہلے سے پہلے نذیروں کے ڈرانے کو یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ وقت کے وقت پر تمہیں یاد آئے تو کہو کہ واقعی ڈرانے والے صحیح کہہ رہے تھے ہم ہی غلطی پر تھے۔ اس وقت کا اعتراف کا رآمد ثابت نہیں ہوگا، تو یہاں تک حق تعالیٰ نے گویا زمین کا جو صوبہ ہے اس کی حکومت کا، اس کے متعلق ایک اجمالی صورت بیان فرمائی کہ نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی، حدود بتلادیں۔ اب دوسرا علاقہ جو ہے وہ جو اور فضا کا ہے جس کو آگے شروع کیا گیا ہے۔

فضا پر خدائی حکومت **أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفْتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمَسِّكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ** ۝ **أَمَّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ** ۝ **أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ بَلْ لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ** ۝ **أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ**

”اور کیا نہیں دیکھتے ہواڑتے جانوروں کو اپنے پر کھولے ہوئے اور پر چھپکتے ہوئے۔ ان کو کوئی نہیں تھام رہا رحمان کے سوا، اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز بھلا وہ کون ہے جو فوج ہے تمہاری، مدد کرے تمہاری رحمن کے سوا منکر پڑے ہیں برے بہکائے میں۔ بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی، کوئی نہیں پر اڑ رہے ہیں، شرارت اور بدکنے پر۔ بھلا ایک جو چلے اوندا ہوا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر“۔

حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں میں نے عرض کیا تھا کہ حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں جو اس سورۃ میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور ایک سلطنت، آسمان اور اس کی مخلوق اور اس پر حکمرانی کا انداز اور ایک زمین اور زمینی مخلوق اور اس پر حکومت کا انداز اور ایک جو اور فضا جو آسمان اور زمین کے درمیان میں ہے، اس

پر حکمرانی کا طریق تو دو علاقوں کے بارے میں میں نے بقدر ضرورت تفسیر عرض کی۔ یہ تیسرا علاقہ ہے جو اور فضا کا جس کو اَوَّلَمْ یَسْرُوْا اِلَیْ الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صَفًّیٰ وَ یَقْبِضُنْ ، سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ زمینی مخلوق میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی حکومت کو مانیں اور اس کے قانون پر چلیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان پر بلیات اور فتنے برسیں گے اور وہ مصائب میں مبتلا ہوں گے، منجملہ ان کے دو چیزیں بیان فرمائی گئی تھیں کہ کیا تم آسمان والے سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ گے کہ زمین تمہیں دھندلا دے اور حُف کر دیئے جاؤ یا یہ کہ آسمان سے پتھر برسا دیئے جائیں اور ان سے انسانوں پر پتھراؤ ہو جائے، اس پر انسان اگر سلامتی کے ساتھ غور کرے اور اطاعت شعاری کے جذبے سے غور کرے تو بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔

انسانی روگ، عقل کا بے جا استعمال..... مگر انسان میں ایک روگ یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام میں خود رائی کو دخل دیتا ہے اور اس خود رائی کا منشاء ہوتا ہے عقل۔ تو عقل تو دی گئی تھی اس لیے کہ اللہ کے احکام کو سمجھے اور غور کرے اور کوئی شبہ پیش آئے تو عقل سے اس شبہ کو صاف کر لے، اس نے عقل کو استعمال کیا معارضہ میں اور حق تعالیٰ کے مقابلے میں، عقل کو اللہ کے احکام میں طرح طرح کے شبہات نکالنے کا، شکوک پیدا کرنے کا اور اس میں الجھنے کا ذریعہ بنایا، تو قلب موضوع ہو گیا۔ عقل اس لیے دی گئی تھی کہ احکام کو سمجھے اور کوئی شبہ طبعی طور پر پیش آئے تو عقل سے اس کو دفع کر لے۔ اس نے کیا یہ کہ عقل کو لڑائی کا ذریعہ بنایا اللہ سے اور اس کے احکام میں طرح طرح کے شکوک اور شبہات نکالنے شروع کئے اور معارضہ شروع کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ گویا یہ احکام معاذ اللہ عقل کے خلاف ہیں، پھر میں انہیں کیوں مانوں؟....

تو اپنی برأت ذمہ کے لیے اس نے عقل کو حق کے مقابلہ میں استعمال کیا حالانکہ عقل دی گئی تھی حق کی اطاعت کے لیے کہ پوری طرح سے سمجھو تو یہاں بھی انسان نے یہی کیا کہ جب فرمایا کہ ہم آسمان سے پتھر برسا دیں گے تو اس نے کہا بھلے یہ کیسے ہو سکتا ہے، پتھر تو ایک وزنی چیز ہے اور وزن دار چیز ہمیشہ نیچے کی طرف کو آتی ہے۔ زمین مرکز ثقل ہے اور وہ اپنی طرف کھینچتی ہے، اسے اوپر نہیں جانے دیتی تو آسمان میں پتھر کہاں ہیں جو وہاں سے برسیں، یہ عقل کے خلاف ہے کہ وزنی چیزیں اوپر جائیں۔

خالق طبیعت کو خلاف طبیعت بھی قدرت ہے..... حالانکہ اگر وہ اس پر غور کرتا کہ جس خالق نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان میں طبعی رفتار رکھی ہے تو طبیعت کا پیدا کرنے والا بھی تو وہی ہے، اگر وہ طبیعت کو بدل دے تو اس کے اختیار میں ہے، اتنا تو اس کا اختیار سمجھا کہ وہ طبیعت کے مطابق بنادے اور یہ نہ سمجھا کہ طبیعت ان کے خلاف کرے، حالانکہ جو طبیعت کا خالق ہے وہ طبیعت کو ادھر بھی چلا سکتا ہے ادھر بھی چلا سکتا ہے۔ طبیعت کے خلاف کرے تو طبیعت اس پر حاکم تو نہیں ہے، حاکم تو طبیعت کے اوپر وہ ہے۔

ایک درخت جب پیدا ہوتا ہے اور آپ منوں مٹی کے نیچے بیج ڈال دیتے ہیں، اس بیج میں سے کوئل نکلتی ہے

کو پہل اتنی کمزور ہے کہ اگر چنگی سے مسلمین تو مسل دی جائے۔ لیکن اللہ نے اس کو اتنا طاقت ور بنایا کہ منوں مٹی کے جگر کو چیر کر اوپر کی طرف آتی ہے۔ حالانکہ طبیعت یہ تھی کہ نیچے کی طرف کو جائے، بچے کو اگر آپ جھوڑ دیں تو وہ نیچے جائے گا، اوپر نہیں جائے گا، لیکن وہی پتا جب بیج سے نکلتا ہے تو وہ جاتا ہے اوپر کی طرف، اول تو منوں مٹی کو چیرتا ہے، اس کے جگر کو شق کر کے باہر نکلتا ہے پھر باہر نکل کر بھی یہ نہیں کہ نیچے کی طرف جائے وہ چڑھ کر آسمان کی طرف جاتا ہے اور ایک بڑا تنا درخت بن جاتا ہے۔ یہ طبیعت کو کس نے بدل دیا، طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ درخت نیچے کی طرف آئے لیکن نیچے کے بجائے اسے اوپر کی طرف لے گئے تو قدرت ہے مالک کی۔ وہ اس طبیعت کے خلاف حکم جاری کر دے، طبیعت کو اپنے خلاف چلنا پڑے گا، طبیعت کے موافق اگر حکم دے موافق چلنا پڑے گا۔ طبعی چیز یہ ہے کہ آدمی اگر نقش و نگار بنائے تو کاغذ پر بنا سکتا ہے اور پتھر پر بنا سکتا ہے لکڑی پر نقش و نگار بنا سکتا ہے، لیکن کیا یہ کسی کو قدرت ہے کہ پانی کے اوپر نقاشی کروئے مگر اس کی قدرت یہ ہے کہ ایک گندے پانی کے قطرہ کے اوپر ایسے نقش و نگار بناتا ہے کہ انسان بن جاتا ہے۔

تو ایک پانی کے قطرے پر نقاشی کرنا یہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہے لیکن اللہ کی قدرت کے خلاف تو نہیں تو جب قدرت والے کو قدرت والا مان لیا تو مان کر پھر اسے مقید کرنا کہ آپ ادھر کو چلیں ادھر کو نہ چلیں۔ یہ انسان کی کج فطرتی کی بات ہے۔ ورنہ وہ یوں کہتا کہ طبیعت کو چلا دیا ادھر یہ بھی اس کی قدرت ہے اور طبیعت کو اس کے خلاف چلا دیا یہ بھی اس کی قدرت ہے، پتھروں کے نیچے ڈال دے..... یہ بھی اس کی قدرت ہے اور اوپر اٹھا کر لے جائے یہ بھی اس کی قدرت ہے تو پہلے تو غور کرنا چاہیے تھا کہ عقل سے مگر عقل کو اللہ کی قدرت کے مقابلہ پر استعمال کیا اور اپنی موافقت کے گویا عقل میری ہے اور میری تائید کرے گی، آپ کے خلاف کرے گی اور یہ نہ جانا کہ عقل بھی انہی کی پیدا کی ہوئی اور تم بھی انہی کے پیدا کئے ہوئے، تمہیں حق کیا ہے کہ مالک کے خلاف چلو اور اپنے آلات اور قوی کو اس کے خلاف میں استعمال کرو، تو یہ تو ہے لیک عقلی چیز۔

خلاف طبیعت پر قدرت کی تاریخی مثال..... لیکن حق تعالیٰ نے جواب دیا دو طرح پر ایک تاریخ پیش کی، اور ایک حسی مثال پیش کی، تاریخ کی طرف تو اشارہ کیا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ پچھلوں نے بھی اعتراضات کیے لیکن پچھلوں پر تاریخ شاہد ہے کہ پتھر برسائے گئے، تو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسا دیے گئے۔ ایک تاریخی واقعہ ہے اور سچی تاریخی حقیقت ہے اور سچائی سے بیان کیا گیا ہے۔ تو اسی کو دیکھو عبرت پڑو تھوڑی سی کہ جس نے ایک قوم پر پتھروں کو برسا دیا وہ آج بھی برسا سکتا ہے، گنہگار جب بھی تھے اور آج بھی ہیں تو جس نوع کے گناہ پر پچھلے دور میں پتھر برس سکتے ہیں تو اس دور میں اس قسم کے گناہ پر آج کے دور میں کیوں نہیں برس سکتے۔

یہ تو رحمۃ للعالمین کا فضل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کا فضل ہے کہ اس قسم کے عام عذابوں میں امت کو مبتلا نہیں کیا گیا، لیکن اس کی نفی بھی نہیں کی گئی کہ اگر ضرورت پڑی تو اس امت پر بھی عذاب

نازل کریں گے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: لَيْسَ عَذَابُ أُمَيِّيَ الْخَسْفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْمُ إِنَّ عَذَابَ أُمَيِّيَ الْفَقْتُ وَالْقَتْلُ وَالزَّلَازُلُ۔

میری امت کا عام عذاب یہ نہیں ہوگا کہ ان کی صورتیں مسخ کر دی جائیں جیسے پچھلی امتوں کو بندر بنادیا گیا، بعضوں کو خنزیر بنادیا گیا۔ اس امت پر یہ رحمت ہے کہ عام طور سے نہیں ہوگا، لیکن جزوی طور پر اگر ہو جائے کسی کو مسخ کر کے خنزیر کی صورت بنادیا جائے یا کسی کو بندر کی صورت دے دی جائے تو یہ آج بھی ممکن ہے اور واقعات پیش آئے ہیں۔ امم سابقہ کے اجتماعی عذاب کی جزوی صورت آج بھی ممکن ہے!..... آپ نے سنا ہوگا کہ اخبارات میں ایک واقعہ آیا، بھوپال میں یہ قصہ گزر اور وہ یہ کہ ایک عورت کے اولاد نہیں ہوتی تھی تو اس نے کسی سادھو سے رجوع کیا اور کہا کہ کوئی تدبیر ایسی بتلائیے کہ میرے اولاد ہو جائے۔ اس کم بخت نے کہا کہ قرآن شریف کو نیچے رکھ کے اس کے اوپر بیٹھ کر تو غسل کر تو تیرے اولاد ہو جائے گی، حالانکہ وہ مسلمان عورت تھی۔ لیکن بعض دفعہ عورتیں اولاد کی طمع میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیتی ہیں اور اس قسم کے ٹونے اور ٹوکوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس ظالم نے یہ حرکت کی اور ایمان کو پس پشت ڈال کر قرآن شریف پر بیٹھی اور وہاں سے اٹھ کر جب آئی تو اس کی صورت خنزیر کی سی تھی۔ بال وال تو تھے سر پر جس سے یہ پہچانا گیا کہ وہ انسان تھی لیکن شکل مسخ ہو گئی۔ یہ واقعہ اخبارات میں بھی آ گیا۔

اور بعضوں کو شبہ ہے کہ صاحب، اخبار میں کیوں اس واقعہ کو لکھ دیا اس سے تو معاذ اللہ! اسلام کی توہین ہوئی کہ ایک مسلمان بدک گیا، میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف میں واقعات اس قسم کے کیوں بیان کئے کہ پچھلی امتیں مومن ہوتے ہوئے جب حق کے مقابلہ پر آئیں تو انہیں خنزیر کی صورت دے دی گئی، اگر اس سے اس دور کے اسلام کی توہین نہیں تھی تو آج بھی اگر اس قسم کا واقعہ آئے اور وہ عام کیا جائے تو اس میں اسلام کی توہین نہیں۔

یہ تو کفر کی توہین ہے کہ اسلام چھوڑ کر جب کفر اختیار کیا تو صورت مسخ ہوئی اگر عیاذ اللہ! یہ ہوتا کہ اسلام قبول کرنے پر تلاوت قرآن کرنے پر معاذ اللہ صورت بگڑ جاتی تو اسلام کی توہین تھی۔ لیکن اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف آنے میں جب صورت بگڑی تو اسلام کی عظمت نمایاں ہوئی، کفر کی اہانت اس میں واضح ہوئی تو یہ اسلام کی توہین نہیں بلکہ کفر کی توہین ہے اور اسلام کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے اور اگر اس میں اہانت تھی تو حق تعالیٰ قرآن کریم میں ایسے واقعات ہی بیان نہ فرماتے، تو اگر آج کے لوگوں نے اس قسم کے واقعات کو نقل کر دیا ہے تو قرآن کی پیروی کی کہ اللہ نے پچھلے واقعات نقل کیے انہوں نے سامنے کا واقعہ نقل کر دیا۔ اسلام کی عظمت اس سے نمایاں ہو گئی۔

امم سابقہ کے تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کی جائے..... بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ خسف یا مسخ یہ عام تو نہیں ہوگا رحمتہ للعالمین کی اس امت میں لیکن خاص طور پر ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ تقدیر کو جھٹلانے والے بعض طبقات زمین کے اندر دھنسا دیے جائیں گے۔ اس امت کے اندر بھی ایسے

واقعات ہونگے، تو اگر ایسا واقعہ پیش آئے معاذ اللہ! اس کو نقل کر دے مسلمان، تو یہ ڈرانا ہوگا اس سے کہ دیکھو تقدیر کے خلاف کرنے میں یہ وبال پڑتا ہے، لہذا تقدیر کی حمایت کرو اسلام کے مطابق چلو تا کہ اس قسم کے وبال سے بچ جاؤ۔ تو قرآن کریم نے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ پچھلے دور میں ایسا ہو چکا ہے وہ ہوا ہے پورے طبقے کے طبقہ منہج کر دیئے گئے پوری امت ڈرادی جائے یا پوری امت دھنسا دی جائے، اس واسطے کہ یہ امت دوائی اور ابدی ہے اور اس کے مٹنے کے بعد کوئی اور امت آنے والی نہیں اس لیے قیامت تک یہ امت رہے گی اور ایک طبقہ حق پر رہے گا، خلاف کرنے والوں پر اس قسم کے عذابات آئیں گے اور اس قسم کے وبال ڈالے جائیں گے۔ تو اشارہ دیا قرآن کریم نے کہ جنہوں نے پہلے تکذیب کی تھی ان پر یہ واقعہ ہوا، لہذا تم بچو اس قسم کی تکذیب سے کہ تم نہ کہیں مبتلا کر دیئے جاؤ، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ تاریخی واقعات سے عبرت پکڑو، لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّآلِیِ الْاَلْبَابِ ①

قرآن کریم نے جو پچھلی امتوں کے واقعات بیان کیے ہیں وہ قصہ کہانی کے طور پر نہیں ہیں کہ وقت گزاری کے لیے تفریح طبع کے لیے کچھ قصے سنا دیئے۔ وہ بیان کیے گئے عبرت کے لیے تاکہ آدمی غور کرے کہ پچھلوں کی ان حرکتوں پر جب یہ عذاب آیا تو آج اگر وہ حرکتیں ہو گئیں تو آج بھی عذاب آ سکتا ہے، یہی معنی اعتبار کے اور عبرت پکڑنے کے ہیں تو ایک جواب تو دیا ہے تاریخی۔

قدرت خداوندی کا حسی ظہور..... اور دوسرا جواب ہے حسی اور وہ یہ کہ: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفًّیٰ وَ یَقْبِضُنَّ بِاَیْمِ اللّٰهِ کِی قدرت نہیں دیکھتے کہ یہ پرندے فضا کے اندر اڑ رہے ہیں وہ بھی تو اجسام ہیں پتھر جسم ہے، وہ بھی تو مٹی کے بنے ہوئے پرندے ہیں، لیکن ہزاروں گز اوپر ہوا میں ان کو تھام رکھا ہے تو کس نے تھاما ہے ان کو...؟ اگر آپ یہ کہیں کہ ان میں قوت ایسی تھی کہ وہ تھم گئے تو سوال یہ ہے کہ وہ قوت کس نے ان کے اندر رکھی۔ اس لیے فرمایا ان کو تھامنا یہ اللہ کی قدرت ہے اور جب چاہتے ہیں انہیں گرا دیتے ہیں، بعض دفعہ اڑتا اڑتا جانور ایک دم نیچے آ پڑتا ہے، وہ قوت اس وقت اس میں سے سلب کر لی جاتی ہے۔ جھین لی جاتی ہے۔ تو جب ایک جسم کو حق تعالیٰ ہزاروں گز فضا کے اندر اڑا کر تھامتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ ایک پتھر جسم کو اڑا دیں اور وہ چلا جائے نیچے اور اسے ڈال دیں نیچے پہلے تو اوپر جائے اور رکے فضا میں اور پھر نیچے آجائے۔

اگر اس پر یوں کہا جائے کہ صاحب ہو سکتا ہے کہ ایک جانور بے چارہ ہوا اڑا کر لے گئی اور وہ چلا گیا وہ ہوا کی طاقت سے اڑ گیا۔ ہوا بیچ میں سے نکل گئی وہ نیچے آ پڑا تو یہ ہوا کہ کارستانی ہے قدرت کی تھوڑا ہی ہے۔ عیاذ باللہ اگر کوئی (کہے) تو اس بارے میں فرماتے ہیں اور اِلٰی الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ تمہارے سروں پر یہ پرندے اڑ رہے ہیں اور صف..... بکڑیاں اور جماعتیں بن بن کر اڑ رہے ہیں، اگر ہوا اٹھا کر لے جاتی تو ایک کو دود کو چار کو ایک اتفاقی

واقعہ پیش آتا، لیکن یہ تو ترتیب وار صف بندی کر کے جانور اڑتے ہیں، یہ تو ان کے شعور اور ارادہ کا دخل ہو اور اللہ نے ان کے اندر پیدا کیا تو یَقْبِضَنَّ خدا کے سوا کسی نے روک رکھا ہے انہیں اور وہ صف بن کر اڑتے ہیں جیسے مرغابیاں اڑتی ہیں تو ہمیشہ مثلث کی صورت پر اڑتی ہیں دو ٹکڑیاں ہوتی ہیں مثلث، آگے ان کا سر دار ہوتا ہے، وہ آگے آگے چلتا ہے اور پیچھے وہ چلتی ہیں جیسے پریڈ کرتی ہوئی فوج جاتی ہے، ترتیب وار، تو مرغابیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں، بطنیں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں۔ چھوٹی چڑیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار ٹکڑیاں بن بن کر اڑتی ہیں، تو سارے نمونے دکھلا دیئے، انفرادی طور پر بھی پرندے اڑتے ہیں صف باندھ کر بھی اڑتے ہیں، ٹکڑیاں بن کر بھی اڑتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محض طبعی کارخانہ نہیں ہے بلکہ فاعل مختار کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں کہ کسی کو اس طرح بنادیا، کسی کو اس طرح۔ اگر طبعی بات ہوتی تو طبیعت کی ایک رفتار ہوتی جب جانور گرائیچے آپڑتا لیکن ترتیب وار اڑنا قاعدہ سے اڑنا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص نظام کے تحت وہ اڑ رہے ہیں، کسی اختیار کے تحت وہ اڑتے ہیں صفیں باندھ کر،

کوئی اگر یوں کہے کہ صاحب پر چونکہ ان کے بنائے ہوئے ہیں وہ کھول دیئے، لہذا اڑ رہے ہیں تو پروں کی کارستانی ہے تو فرماتے ہیں ویَقْبِضَنَّ ایسا بھی تو ہے کہ پر سمیٹ لیتے ہیں اور پھر جارہے ہیں دور تک، تو اب کیوں جارہے ہیں؟ اگر پروں کی کارستانی تھی تو پروں کو سمیٹ کر بھی بہت سے جانور اڑتے ہیں۔ بہت سے پر پھیلا کر اڑتے ہیں۔ بہت سے پروں کو سمیٹ کر اڑتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ایک مسافت تک پر کھولے ہوئے ہیں اور ایک مسافت میں پر سمیٹ لیے اور چلے جارہے ہیں تو اگر پروں کی وجہ سے اڑ رہے ہیں تو وہاں بھی پروں کو سمیٹ لیا گیا اب کیسے اڑ رہے ہیں.....؟ اب کس نے تھام رکھا ہے انہیں؟ تو پروں سے بھی اڑتے ہیں اور پروں کو سمیٹ کر بھی اڑتے ہیں۔ یہ طبعی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کے اختیار اور قدرت کی بات ہے۔ وَيَقْبِضَنَّ اور ان پر کو وہ سمیٹ دیتا ہے وہ پھر بھی اڑتے ہیں اور فضا میں معلق ہو جاتے ہیں بہت دیر تک، بعضے جانور نہیں اڑتے لٹکے ہوئے ہیں فضا میں۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرُّحْمٰنُ کے سوا کون ہے جس نے تھام رکھا ہے تو جوان پرندوں کے اجسام کو اوپر تھام سکتا ہے وہ اگر پتھروں کو تھام دے تو تمہاری عقل اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ عقلیں یہاں لڑائی تھیں لیکن انہی کی طبعی رفتار نے تمہاری عقلوں کو کند کر دیا ہے۔ جواب دے دیا تو پتھر کے بارے میں بھی سمجھ لو کہ تمہاری عقلیں کند ہیں قدرت اللہ کی تابع نہیں ہے، تمہاری عقلوں کے یا تمہارے ڈالے ہوئے وسوسوں کے وہ تو اپنی قدرت سے کام کرتا ہے تو مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرُّحْمٰنُ حاصل یہ نکلا کہ تاریخ دیکھو تب واقعات ثابت، پھر کیوں نہیں مانتے انہیں؟ تاریخ پر نظر نہ کرو تو محسوسات یہ نظر کرو جو ہر وقت تمہارے سامنے ہیں اس کو سامنے رکھو اب اگر تم نہ اسے مانو نہ اسے مانو تو معلوم ہوا مقصود مقابلہ ہی ہے حق تعالیٰ کا یہ عقل کا نام محض حیلے کے طور پر لے رکھا ہے ورنہ عقل تو بھار ہی ہے کہ جب یہ واقعہ پرندوں میں پیش آ سکتا ہے تو پتھر میں بھی پیش آ سکتا ہے۔

عقل پرست طبقہ سے ایک سوال اگر میں کہوں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ جب آپ اینٹ پھینکتے ہیں تو میں گز تک چلی جاتی ہے حالانکہ اینٹ کی طبعی رفتار کا تقاضا ہے کہ نیچے آئے مگر آپ کے ارادہ کی قوت اسے اوپر پھینک دیتی ہے، جب آپ کے ارادہ کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اصلی رفتار پہ آکر اینٹ نیچے آ جاتی ہے۔ تو آپ کے ارادہ میں تو یہ طاقت ہو کہ اینٹ کی طبیعت کے خلاف اسے اوپر پہنچا دے اور اللہ کے ارادہ میں یہ طاقت نہ ہو کہ وہ اس کو طبیعت کے خلاف اوپر پہنچا دے تمہارا ارادہ زیادہ سے زیادہ پچاس گز تک اس کی قوت جاسکتی ہے اللہ کا ارادہ لامحدود ہے۔ وہ اگر پچاس ہزار گز سے اوپر اڑا دے تو اس کی طاقت سے بعید نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ باہر کی طاقت لے جاسکتی ہے اوپر اشیاء کو اور جتنی طاقت ہوگی اتنا لے جائے گا۔ انسان کی طاقت محدود کہ اس نے میں گز پھینک دیا ڈھیلا اور اللہ کی طاقت لامحدود ہے۔ اس نے پچاس ہزار گز سے اوپر پھینک دیا پتھر کو اور پھر نیچے ڈال دیا۔ تو مطلب یہ ہے کہ حسی طور پر دیکھو، عقلی طور پر دیکھو، تاریخی طور پر دیکھو، کوئی وجہ انکار کی نہیں ہے سوائے ڈھٹائی کے، سوائے سرکشی کے، اس واسطے فرمایا کہ مَا يُؤْمِنُ كُفْرُهُمْ إِلَّا الرَّحْمَنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بِصِيرٌ۔ اس واسطے کہ وہ ہر چیز کو بصیرت سے جانتا ہے اس لیے کہ وہی تو پیدا کرنے والا ہے، اسے تو معلوم ہے کہ کس چیز میں میں نے کتنی قوت رکھی ہے اور کس طرح میں اسے استعمال کروں گا تو اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بِصِيرٌ۔ تم پتھر پھینکتے ہو تو تمہیں بصیرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے اندر کیا قوت ہے کیا نہیں ہے؟ تم نے تو اٹھا کر ڈھیلا پھینک دیا۔ چلا گیا، وہ بصیرت کے ساتھ اپنی طاقت کے ساتھ لے جائے اس پر تو اعتراض اور تم جو بے بصیرتی کے ساتھ ایک حرکت کر گزرو اس پر کوئی اعتراض نہیں تو یہ سوائے عصبیت اور جہالت کے اور کیا چیز ہے کوئی عقلی دلیل تو نہیں ہے کہ انکار کرو۔

مخلوق، مخلوق کے ذریعہ خالق سے کیا مقابلہ کرے گی؟ حاصل اس کا یہ نکلا کہ تمہیں تو اللہ میاں سے لڑنا ہی مقصود ہے۔ نہ عقل سے کام لینا، نہ حس سے کام لینا، نہ تاریخ سے عبرت پکڑنا، نہ لڑنا مقصود، تو فرمایا کہ اچھا آؤ لَوْ: اَمَنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُونِ الرَّحْمَنِ يَكُونُ هُوَ جَوْدًا كَ الْمَقَابِلَةِ پر وہ لشکر آئے گا تمہاری مدد کرے گا اس لشکر کو بھی ہمیں بتا دو وہ کون سا لشکر ہے؟

یہ لشکر جتنا تم لاؤ گے اس مخلوق میں سے لاؤ گے، یہ تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہے تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے ہی مقابلہ پر تھوڑا ہی آسکتی ہے۔ تمہاری کوئی بنائی ہوئی چیز ہو، وہ تمہارے مقابلہ پر نہیں آتی تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے مقابلہ پر کیسے آجائے گی؟ اور تم جو بھی لشکر لاؤ گے وہ مخلوق میں سے لاؤ گے اس لیے کہ خالق سے تو تم نے تعلق پیدا نہیں کیا کہ اس کے تابع بننے، اس کی طاقت کو لیتے، اس سے تو لڑائی ٹھان لی اب مقابلہ کرو گے تو اپنی طاقت سے اور مخلوق کی طاقت سے تو بتلاؤ وہ کون سی مخلوق ہے جو ہمارے مقابلہ پر آئے گی۔ اَمَنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُونِ الرَّحْمَنِ اِنَّ الْكُفْرَانَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ”وہ کون ہے جو کفر کے

مقابلے پر تمہاری مدد کرے گا۔“ اِنْ الْكَافِرُونَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ سِوَاِے اِسْ كے کہ تم دھوکے میں پڑے ہوئے ہو اور بیکے ہوئے ہو اور کیا کہا جائے۔ عقل کی تم نہیں کہتے، جس کی تم نہیں کہتے، تاریخ کی تم نہیں کہتے، کوئی قوت تمہارے ہاتھ میں نہیں کہ خدا کا مقابلہ کرو اور لڑنے کے لیے تیار، بقول شخصے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لڑنے کو موجود اور نہ ہاتھ اور ہاتھ میں تلوار، اور پھر وہ قوتیں بخشی ہوئی خدا کی ہیں تو اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس کے مقابلہ پر لانا اس سے زیادہ حماقت کی بات اور کیا ہوگی تو: اَمَنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ

اللہ سے مقابلہ کی سوچ صرف انسان کی ہے..... اب آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ صاحب، سامان اور وسائل ہمارے ہاتھ میں ہیں، ہم بجلی کی مدد سے کام لیں گے۔ ہم گیس کی طاقت سے کام لیں گے، ہم راکٹ سے کام لیں گے، ان چیزوں کو لائیں گے مقابلہ پر، تو اول تو ظاہر ہے کہ یہ تو مخلوقات خداوندی ہیں، ان میں یہ جراثیم کہاں ہے کہ اپنے خالق کا مقابلہ کریں۔ یہ حماقت تو انسان ہی پر سوار ہے کہ وہ خالق کا مقابلہ کرتا ہے، نہ پتھر مقابلے پر ہیں نہ درخت مقابلے پر ہیں نہ پہاڑ نہ دریا، کوئی چیز مقابلے نہیں کرتی یہ چیزیں حق ہیں: اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا اِتٰی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ① ”آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ عبد اور بندہ (غلام) بن کر اللہ کے سامنے آیا ہوا ہے۔“

ڈھٹائی پر یہی انسان ہے کہ مقابلہ کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ ہم نے کچھ طاقتیں دے دی تھیں کچھ عقل کی طاقت دے دی تھی کچھ وسائل دے دیئے تھے تو سوال یہ ہے کہ اَمَنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُکُمْ وہ رزق دینے والا ان سامانوں کا وہ کون ہے؟ تم نے خود پیدا کر لیے تھے؟ بجلی تم نے پیدا کی ہے؟ پیدا اللہ نے کی ہے۔ کام اس سے تم لے لیتے ہو۔ زمین اللہ نے پیدا کی ہے، کام تم اس سے لے لیتے ہو، بیج کا درختوں کو اگانے کا، لیکن نہ درخت تم نے پیدا کیا، نہ بیج تم نے پیدا کیا، نہ زمین تم نے پیدا کی، تمہاری بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں استعمال کرنے کی کچھ قوت ہے تمہارے اندر، تو حاصل یہ نکلا کہ رزق دینے والے حق تعالیٰ ہیں، وہ دانے کا رزق ہو، کیڑے کا رزق ہو، عقل کا رزق ہو، قوتوں کا رزق ہو، ہتھیار کا رزق ہو، دینے والے وہ ہیں۔

اچھا اگر وہ اپنے رزق کو چھین لیں پھر تم کیا کرو گے، تمہارے قبضے میں تو نہیں، ایک بارش رک جائے، دانہ نہ ہو، بیٹھ جاتے ہیں حضرت انسان، اب آگے کچھ نہیں، بارش صرف روک دے اور بارش تو خیر سال بھر میں آتی ہے ہر وقت آپ دھوپ سے اور ہوا سے کام لیتے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے وہ اپنی ہوا نکال لے، اب کیا ہوگا؟ بس سانس گھٹ کر ختم ہو جائے گا انسان، یہ کل آپ کی طاقت ہے تو اسی کے دیئے ہوئے رزق پر غرہ اور اسی کا مقابلہ

کرنا اس سے زیادہ حماقت اور سفاہت کیا ہوگی، کوئی اپنی چیز لاتے جو خدا کے مقابلے پر استعمال کرتے تو اپنی چیز تو کیا ہوتی تم خود بھی اپنے نہیں، تم نے خود بنالیا ہے اپنے آپ کو؟ بنانے والے نے بنایا ہے تم کون ہو، تو جب تم خود نہیں بنے اپنے آپ تو بقیہ چیزیں تم کیا بنا سکتے ہو، جو کچھ ہے وہ رزق دیا ہوا ہے اللہ کا تو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِي يَزِدُّكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهُ "اگر اللہ اپنا رزق روک لے تو وہ کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں آکر تمہیں رزق دے گا"۔ اچھا، ہم بارش روک لیتے ہیں اور ساری مخلوق کو اکٹھا کر لو کہ وہ تمہیں رزق دے تو کہاں سے دے دے گی اس لیے دار و مدار بارش پہ اور وہ قبضے میں ہے اس کے، ہم نے رزق روک لیا تو جس کا رزق ہم روکنا چاہیں وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے دے، ہم نے رزق روک لیا تو کون ہے جو دروازے رزق کے تمہارے اوپر کھول دے تو اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهُ بات کیا ہے بَلْ لِّجَوَابِيْ غُتُوْ وَنُفُوْرٍ

سوائے اس کے کہ یہ بدک رہے ہیں، سوائے اس کے کہ سرکشی پر ہیں اور ڈھٹائی پر جھجے ہوئے ہیں۔ ہٹ دھرمی کے سوا کوئی حجت ان کے ہاتھ میں نہیں ہے نہ عقل کی، نہ حس کی، نہ طبع کی، نہ قوی کی، کوئی چیز ان کے قبضے میں نہیں ہے، ڈھٹائی پر آمادہ ہیں اور وہ ڈھٹائی انہی کے انجام کو خراب کرے گی، اللہ میاں کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اپنے آپ کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔ ہل لجو ا فی غتو و نفور۔

منزل مقصود پر پہنچنے والا کون ہو سکتا ہے؟..... تو اب ان کی مثال ایسی ہوگی کہ جیسے ایک شخص تو وہ ہے کہ سیدھے راستے پر دیکھتی آنکھوں چل رہا ہے اور منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے اور ایک وہ ہے کہ میڑھا تر چھا راستہ اور اوندھا لیٹ گیا اس کے اوپر، آنکھ بھی کام نہیں کرتی، ہاتھ پیر بھی کام نہیں کرتے اور چاہتا یہ ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جائے تو کون پہنچے گا منزل مقصود پر؟ وہ پہنچے گا کہ جو سیدھے راستے پر جا رہا ہے، عقل سے کام لے رہا ہے، محسوسات کو دیکھ رہا ہے، اپنی قوتوں کو خالق کی راہ میں اختیار اور استعمال کر رہا ہے، راستہ دیکھ کر چل رہا ہے، وہ پہنچے گا یا وہ پہنچے گا کہ جو اوندھا لیٹ گیا ہے اور ہاتھ پیر بھی چھوڑ دیئے، آنکھیں بھی زمین میں دھنسا دیں، نہ رستہ سامنے نہ منزل سامنے۔

تو تمہاری مثال وہی ہوگی کہ رستہ کے اوپر ہو مگر اوندھے لیٹ کر، نہ آنکھ سے دیکھتے ہو، نہ دل سے سوچتے ہو، نہ غور و فکر کرتے ہو اور چاہتے ہو منزل پر پہنچ جائیں تو منزل پر تو وہی پہنچیں گے جو تبعین انبیاء علیہم السلام ہیں کہ راستے پر پڑے ہوئے ہیں چل رہے ہیں ہاتھ پیر استعمال کر رہے ہیں، آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں،

عقل سے حق کا راستہ معلوم کر رہے ہیں اس کی تائید کر رہے ہیں وہ پہنچیں گے منزل پر تم نہیں پہنچو گے تو تمہاری مثال اس شخص کی ہے کہ زمین کا راستہ سامنے ہے۔ بجائے چلنے کے اوندھا لیٹ جائے سب قوی کو بے کار کر دے، ہاتھ پیر کو بے کار، اس لیے کہ جب کسی قوت سے بھی کام نہیں لیتے تو اور کیا مثال ہے تمہاری یہی مثال بن سکتی ہے تو اس کو فرمایا کہ: اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُّكِبًا عَلٰی وُجْهِهِ اَهْدٰی اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ "آیا وہ شخص جو چل رہا ہے اوندھا چہرہ کے اوپر الٹا پڑا ہوا ہے۔ وہ ہدایت پائے گا یا وہ پائے گا جو سیدھے

راستے پر سیدھا سیدھا چل رہا ہے؟“ تو جو سیدھے چلنے والے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام ہیں، ان کے متبعین ہیں، ان کے پیروکار ہیں کہ علم وحی سامنے آیا کانوں سے سنا، آنکھوں سے دیکھا، عقل سے سوچا اور چل پڑے راستے کے اوپر، وہی پہنچیں گے منزل پر، وہ نہیں کہ آنکھ بھی بند کر لی، یعنی اوندھے لیٹ گئے، دل کو بھی بے کار کر لیا یعنی عقل سے بھی نہ سمجھا، ہاتھ پیروں کو الٹا ڈال دیا کہ چلنے کے قابل نہ رہے اور مدعی اس کے ہیں کہ ہم پہنچیں گے منزل مقصود پہ تو سوائے اس کے کہ اندھا پن کہا جائے اور کیا کہا جائے گا۔ وہ راستے پر پہنچے گا یا یہ راستے پر پہنچے گا۔

اپنی ذات میں مشاہدہ کی دعوت اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو ہے سامان سہای، مختلف چیزیں، ہم نے دیں، عقل دی، سب کچھ دیا۔ لیکن خود تم اپنے اوپر غور کرو تم کہاں سے آئے؟ آیا تمہیں اللہ نے بنایا یا خود بخود بن گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود بخود تو بنے نہیں، اگر خود بخود بن جاتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وجود تمہارے ہاتھ میں ہے تو اگر وجود ہاتھ میں تھا تو یہ موت کیوں قبول کرتے ہو جبراً؟ کس کا جی چاہتا ہے کہ مرجائے تو اگر وجود ہاتھ میں ہے تو ملک الموت کو واپس کر دیا کرو کہ صاحب، ہم زندگی دینا نہیں چاہتے آپ کو یہ خود ہمارے قبضہ میں تھی وہاں تو چپ پڑے رہتے ہو، وہاں تو سانس چلنے لگتا ہے، جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہو، معلوم ہوتا ہے تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں تو جب روکنا زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ تو لانا بھی زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے، جب ہم پیدا ہو رہے تھے تو ہماری درخواست نہیں تھی، خواہش نہیں تھی اللہ کو دینا تھا جان تو لینی پڑی، مجبوراً آنا پڑا، چاہے ہمارا جی چاہتا تھا آنے کو یا نہیں چاہتا تھا اور جب لے جائیں گے تو جانا پڑے گا، چاہے ہمارا جی چاہے نہ چاہے۔ عقل کے اندھے تو وجود تو آپ کا یہ ہے کہ نہ حیات پر قبضہ نہ اپنے وجود پر قبضہ۔ اور دعوے یہ ہیں کہ اللہ کے احکام میں (”من“ ”میں“ نکالنا کہ ہم یوں کر ڈالیں گے اور قدرت کے چیلنجوں کو منظور کرتے ہیں، یہ جو درمیان میں بہت سے سیلاب آئے اور انہوں نے بستیوں کو غرقاب کیا ہزاروں آدمی مارے گئے تو بعض عقل کے اندھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم نے بند لگانے شروع کر دیئے ہیں اور قدرت کے چیلنج کو ہم نے قبول کر لیا ہے، ہم مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ جو بند باندھے اگلے ہی سال اس میں شق واقع ہو گئے دراڑ واقع ہو گئے، پھر مرمت شروع ہوئی اور خدا جانے کب تک وہ مرمت کام دے گی۔ خدا خواستہ وہ پھٹ پھٹا گئے پھر ساری بستیاں اور جلدی غرق ہو گئی۔

بعض عقل کے نابینا وہ بھی ہیں کہ وہ قدرت کی پکار کو چیلنج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے چیلنج مان لیا، ہم مقابلہ کریں گے اور طاقت یہ ہے کہ اپنی زندگی بھی اپنے ہاتھ میں نہیں، اپنی قوت بھی نہیں اپنے ہاتھ میں۔ تو فرماتے ہیں قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ . جن کوئی پر تم نازاں ہوا نکھ پہ ناک پہ یہ دینے والا کون ہے أَنْشَأَكُمْ وہی ہے جس نے تمہیں ابتداء میں بنایا اور از سر نو بنایا اور وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ تم میں سننے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات سن کر حاصل کرو، آنکھوں میں دیکھنے کی

طاقت رکھی کہ کچھ معلومات دیکھ کر حاصل کرو، دل میں بوجھنے کی طاقت رکھی تاکہ غور و فکر سے کچھ معلومات میں اضافہ کرو۔ یہ ساری قوتیں حق تعالیٰ نے دیں اور عجیب صنایع کے ساتھ دیں۔

قلبی بینائیاں اللہ نے قلب کو ایک عجیب کائنات بنایا، اس قلب کے اندر جیسے محققین لکھتے ہیں کہ دو دروازے ہیں، ایک نیچے کی طرف کھڑی کھلی ہوئی ہے قلب میں ایک اوپر کی طرف۔ اوپر کی کھڑکی کھلتی ہے تو عالم غیب کے مشاہدات کرتا ہے وحی اور الہام ربانی اور جمالات اور کمالات خداوندی کو دیکھتا ہے۔ عالم غیب منکشف ہوتا ہے اور نیچے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے تو محسوسات نظر پڑتے ہیں، دریا اور پہاڑ اور جنگل، تو محسوسات کو نیچے کے سوراخ سے دیکھتا ہے اور مغیبات کو اوپر کے سوراخ سے دیکھتا ہے قلب ایک ہی ہے، لیکن اس میں بینائیاں دو قسم کی رکھیں۔ ایک اوپر کے دیکھنے کی ایک نیچے کے دیکھنے کی۔ ایک ظاہری چیزیں دیکھنے کی، ایک باطنی چیزیں دیکھنے کی۔ ظاہری چیزوں کے دیکھنے کے لیے آلات بنائے قلب کے لیے، آنکھ بنائی تاکہ شکلیں اور صورتیں دیکھے، کان بنائے تاکہ آوازوں کو سنے، زبانیں دیں تاکہ ذائقوں کو چکھے، ناک دی تاکہ خوشبو اور بدبو کو سونگھے، تو کسی شے کی صورت بھی انسان دیکھتا ہے کسی شے کو خوشبو، بدبو کا بھی ادراک کرتا ہے کسی۔ شے کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ آوازیں سن کر بچاؤ بھی کرتا ہے اپنے کام بھی نکالتا ہے اگر شیر کی دھاسنی تو بچنے کی کوشش کرتا ہے تو کان ذریعہ بنتے ہیں بچنے کا اور اگر آوازیں کی کسی اچھے خوشنما پرندے کی تو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ گھر کی زینت بناؤں گا۔

تو کان ذریعہ بنا منافع حاصل کرنے کا بھی اور مضار کی مضرتوں سے بچنے کا بھی۔ اسی طرح سے آنکھ ذریعہ بنتی ہے چیزوں کے لینے کا بھی اور چیزوں سے بچنے کا بھی۔ اگر صورت دیکھ لے سانپ کی تو بھاگتا ہے آدمی، اگر صورت دیکھ لے کسی اچھے خوشنما پتھر کی سونے کی چاندی کی، دوڑتا ہے اس کے اٹھانے کے لیے۔ اگر آنکھ نہ ہوتی تو نہ نفع حاصل کر سکتا نہ مضرت سے بچ سکتا۔ تو آنکھ کو اللہ نے ذریعہ بنایا دور سے دیکھ کر منافع حاصل کرنے کا اور مضرتوں سے بچنے کا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سامنے نہیں ہیں، ان کی آواز بھی نہیں آتی، لیکن ان کی بدبو اور خوشبو سے سمجھ لیتا ہے کہ یہاں فلاں چیز موجود ہے۔ شیر کے منہ میں بدبو ہوتی ہے اگر وہ سامنے بھی نہیں تو اس کے منہ کی بدبو دور تک آدمی سونگھ سکتا ہے، سمجھ لیتا ہے کہ یہاں شیر موجود ہے، وہاں سے بھاگتا ہے اور اگر دوسرا جانور ہے اس کی بو آتی اور وہ استعمال کا ہے تو شکار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ناک ذریعہ بنتی ہے بہت سی چیزوں سے بچنے کا اور بہت سی چیزوں کے حاصل کرنے کا، اسی طرح سے ذائقہ بعضی چیزوں کو چکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ یہ مضر ہوں گی، اس کا ذائقہ بتلا رہا ہے کہ یہ مضر ہے بعض ذائقے ہیں جو فرحت بخشے ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قوت قلبیہ کے ادراک تو آنکھ، ناک، منہ یہ تمام چیزیں آلات ہیں مگر حقیقت میں ان ساری چیزوں کا ادراک کرنے والا قلب ہے۔ یہ سب خدام ہیں اس کے۔ آنکھ حقیقتاً خود نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہ عینک چڑھی ہوئی ہے دل کے اوپر آنکھ، آنکھ خود نہیں دیکھتی، بسا اوقات آپ کسی بازار میں چلے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے اعلیٰ

مناظر، بڑی بہترین دکانیں اور روشنیاں ہیں، گھر آکر دوسرا کہتا ہے کہ بھی بڑے بڑے تماشے تھے آج تو بازار میں تو آپ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں پڑتا، کہتا ہے میاں آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں، افوہ! میں تو فلاں خیال میں غرق تھا، مجھے تو کچھ نہیں نظر آیا۔ معلوم ہوا آنکھ دیکھنے والی نہیں ہے دل دیکھنے والا ہے۔ جب دل متوجہ ہے دوسری طرف کچھ نہیں نظر آتا۔ آپ کسی دھیان میں پڑے ہوئے ہیں اور زور سے گھنٹہ بجا، آپ کو پتہ بھی نہ چلا تو دوسرے نے کہا کہ میاں تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ گھنٹہ جونگ گیا تھا اور تم نے افطار نہیں کیا وہ اتنا بڑا گولہ چھوٹا تھا۔ اے ہے! میں نے تو سنی ہی نہیں، اے میاں! بڑے زور سے بجا ہے، کہتے ہیں افوہ! میں تو فلاں خیال میں ڈوبا ہوا تھا مجھے تو دھیان ہی نہ آیا، معلوم ہوا کہ دل سنتا ہے کان نہیں سنتا، جب دل متوجہ ہے تو کان سنیں..... اور دل متوجہ نہیں تو کھلے ہوئے کان نہیں سنتے، اسی طرح سے ذائقہ کی بات ہے بعض دفعہ دھیان نہیں ہوتا تو نہ کھٹے کا ذائقہ آتا ہے نہ میٹھے کا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے، حضرت مولانا فلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سالے تھے حاجی مقبول صاحب، بڑے بزرگ لوگوں میں سے تھے تو حضرت کے یہاں رہتے تھے، کھانا وانا سب وہیں تھا، اتفاق سے دو تین دن سے روزانہ چنے کی دال پک رہی تھی، تو انہوں نے بہن سے شکایت کی کہ روز چنے کی دال، کوئی اور دال بھی پکالیا کرو۔ خیر انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکائی، کھانا کھانے کے بعد کہنے لگے آج بھی وہی چنے کی دال پکائی تھی، انہوں نے کمر میں دو ہٹر ماری، اندھے یہ دال چنے کی ہے ماش کی؟ کہا کہ افوہ! مجھے وہی دھیان رہا جو تین دن سے تھا، اسی دھیان میں کھاتا رہا، مجھے وہی مزا آتا رہا جیسے چنے کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے زبان نہیں چکھتی بلکہ دل چکھنے والا ہے اگر دل متوجہ ہو جائے تو آدمی متوجہ ہو کر سب کچھ چکھ لیتا ہے۔ دل متوجہ نہ ہو نہیں چکھتا۔ تو اصل میں دیکھنے والا بھی دل ہے، سننے والا بھی دل ہے، چکھنے والا بھی دل ہے اور صورتیں دیکھنے والا بھی دل ہے تو دل عجیب چیز نکلا وہ ان تمام خدام کو استعمال کرتا ہے۔ محسوسات کو دیکھتا ہے۔

اور اکات کا تحفظ..... اچھا اب اس کے بعد پھر ایک عجیب کائنات دل کی یہ بھی ہے کہ ان ساری چیزوں کے ذریعے اس نے دیکھ بھی لیا، سن بھی لیا، چکھ بھی لیا، چکھنے کے بعد وہ ذائقہ غائب ہو جانا چاہیے تھا، دیکھنے کے بعد صورت غائب ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن دل نے اتنا قبول کیا کہ اب وہ شئی سامنے نہیں ہے لیکن ذرا آپ نے گردن جھکائی تو شئی دل کے سامنے ہے، یہ کہاں موجود ہے، یہ آنکھ میں تو موجود نہیں اگر آنکھ میں ہوتی موجود تو دوسری چیز دیکھنے کے قابل نہ رہتے، وہ چیزیں ہی ٹکراتی رہتیں تو آنکھ کہاں سے دیکھتی، آنکھ دیکھ کر فارغ ہوئی قلب نے فوٹو اتار لیا اور قلب کے اندر وہ نقشہ موجود ہے، اب جب چاہیں گے آپ دیکھ لیں گے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

پس جہاں مراقبہ کیا اور سامنے موجود چیز، جہاں غور کیا چیز موجود، تو دل فقط دیکھتا ہی نہیں بلکہ لگتا بھی ہے۔ ان چیزوں کو۔ دیکھنے میں تو یہ ہے کہ دیکھ لیا باہر کی چیز ہے، دیکھ کر اس کی صورت کو لگتا ہے اپنے اندر اور اس کا

نقشہ کھینچ لیتا ہے، نوٹ لے لیتا ہے تو دل ایک بڑا زبردست کیمبرہ بھی ہے تو اس میں صورتیں بھی موجود ذائقے بھی موجود، ذائقے جو چکھتے تھے وہ بھی موجود، آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کے یہاں میں نے ایسا عجیب و غریب سالن کھایا کہ آج تک ذائقہ میری زبان میں موجود ہے، وہ زبان میں نہیں دل میں ذائقہ موجود ہے۔ اگر زبان میں وہ ذائقہ ہوتا تو دوسرا ذائقہ ملا کے کوئی ذائقہ باقی نہیں رہتا خلط ملط ہو جاتا تو زبان چکھ کر الگ ہوئی اس نے پہنچا دیا قلب کے اندر، تو درحقیقت ہر کارے اور اور خدام ہیں، جو صورتیں، آوازیں، ذائقے، بوڑ کر قلب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں گویا یہ ایک سی آئی ڈی ہے کہ جس کے ذریعے سے قلب تمام چیزوں کے احوال معلوم کرتا ہے، صورتوں کے بھی، آوازوں کے بھی، ذائقوں کے بھی، خوشبو بدبو کے بھی قلب ہے حامل۔

قلب کے ظاہری و باطنی پانچ پانچ دروازے..... تو قلب ایک عجیب کائنات نکلی تو اس نے پانچ دروازے رکھے حواسِ خمسہ کے، ان کے ذریعہ محسوسات کو دیکھ کر اپنے اندر لے لیتا ہے اور پانچ ہی پھر حواس ہیں باطنی، قوت و ہم اور قوت خیال اور قوت متفرقہ اور قوت عاقلہ، تو ان کے ذریعہ سے وہ غیبی چیزیں دیکھتا ہے۔ علوم میں جب غور کرتا ہے تو نئے نئے علوم اس کے سامنے منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بدن کے اندر نہیں ہے روح میں ہے، اور روح کا کنکشن ہے روحِ اعظم سے تو وہاں سے علوم اترتے ہیں، تو قلب ہی کے اندر یہ خاصہ ہے کہ جب غیب کی طرف متوجہ ہو تو وہاں سے علوم اور کمالات لیتا ہے، تو عجیب کائنات اللہ نے بنائی ہے۔ تو اتنی سی ڈبیہ گاجری شکل کی سینے کے بائیں جانب پڑی ہوئی ہے لیکن ایک لٹن اس کا وہ ہے جو اوپر کی چیزیں منکشف ہے اور ایک لٹن وہ ہے جو نیچے کی چیزیں منکشف۔

تو اگر انسان اوپر کے دروازے کو بند کر دے اور صرف نیچے کی چیز دیکھ نہ علم ہو، نہ کمال ہو، نہ اللہ کا اعتقاد ہو، وہاں سے علوم ہوں تو وہ اندھا ایسے ہی کام کرے گا جس کی شکایت کی جارہی ہے کہ وہ آنکھیں بھی بند کر لے، ہاتھ بھی سکوڑ لئے، کچھ بھی نہیں کر رہا۔ اور ایک وہ لوگ ہیں جو محسوسات کو بھی دیکھتے ہیں اور ساتھ میں مغیبات کے علوم بھی ان کے قلب میں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے وہ ان علوم کے ذریعہ سے وہ ان ساری محسوسات کو اپنی اپنی حد پر رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس محسوس کو کہاں استعمال کرنا چاہیے اور کہاں نہیں اور کہاں جائز ہے، کہاں ناجائز ہے۔ کہاں حرام ہے کہاں حلال۔

حلال و حرام کا مدرک بھی قلب ہے..... تو حرام و حلال کی تمیز علمِ غیب سے ہوتی ہے، ان محسوسات سے نہیں ہوتی، اور وہ سمجھنے والا صرف قلب ہے، آنکھ، ناک، کان یہ حق اور باطل دونوں چیزیں قبول کرتے ہیں آنکھ اگر آپ جائز چہرے پر ڈالیں جب بھی لذت لے گی اور حرام چہرے پر ڈالیں جب بھی آنکھ لذت لے گی، ہاتھ اگر آپ جائز مال پر ڈالیں اسے بھی گرفت کر لے گا اور اگر رشوت کا مال لیں تو وہ چبھے گا نہیں، ہاتھ میں اسے بھی قبضہ کر لے گا۔ اسی طرح سے کان ہے اگر آپ کسی ناجائز آواز پر گانے بجانے پر متوجہ کر دیں اس سے بھی کانوں کو لذت ہوگی

اور جائز آوازیں ہیں، تلاوت قرآن ہو رہی ہے، ذکر اللہ ہو رہا ہے۔ وہ بھی کان لے لیں گے۔

تو آنکھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتی، ہاتھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا لیکن قلب وہ ہے کہ وہ امتیاز کرتا ہے حق اور باطل میں، اگر غلط چیز آئی تو کھٹکتا رہے گا قلب، جب تک کہ کچی بات سامنے نہیں آئے گی مطمئن نہیں ہوگا، ناجائز مال آئے گا قلب کے سامنے کھٹکتا رہے گا۔ چور کے دل میں کبھی اطمینان نہیں ہوگا ضمیر ملامت کرتا رہے گا کہ برا کیا، چاہے نفس مانے نہ مانے، تو قلب احساس کرتا ہے حرام کا بھی، حلال کا بھی، جائز کا بھی ناجائز کا بھی۔ لیکن یہ کس طرح سے، یہی علوم غیب کے ذریعے وہی جو اوپر سے ضمیر میں آرہی ہے چیز، اوپر سے اس کے ذریعے سے حق اور باطل کا امتیاز ہوتا ہے۔ صورتوں اور شکلوں میں امتیاز نہیں ہوتا حق و باطل کا، تو جن لوگوں نے اوپر کا دروازہ بند کر دیا قلب کا، نہ انبیاء علیہ السلام کی بات سنی نہ علم وحی کو قبول کیا، نہ اللہ کے احکام کو لیا، ان کے سامنے صرف محسوس زندگی رہ گئی یہی اینٹ ڈالا، پتھر، خوشبو یہی چیزیں رہ گئی، اب اس پر چاہے غرور کرے وہ بھی جہالت ہوگی کیوں کہ اوپر کا علم نہیں ہے عظمت خداوندی سامنے نہیں ہے۔ اسے غلط استعمال کرے تو کر سکتے ہیں اس لیے کہ اوپر کا علم سامنے نہیں ہے جو غلط کو غلط بتاتا ہے اور صحیح کو صحیح بتاتا ہے، تو ان کی آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود اندھی ہیں، ان کان کھلے ہونے کے باوجود پڑے۔ یہ نہ وہ حق اور باطل میں امتیاز نہیں کر سکتے۔

تو صورتوں کا دیکھ لینا کمال نہیں، جانور بھی دیکھتا ہے، بیل بھی دیکھتا ہے صورتیں، ان صورتوں میں یہ امتیاز کرنا کہ یہ دیکھنے کے لائق ہیں یا نہیں، یہ حلال یا حرام یہ قلب کا کام ہے مگر وہی قلب جس کے اندر ایمان کی روشنی ہو، جس میں انبیاء کی اطاعت کا جذبہ ہو، ان لوگوں نے جب وہ جذبہ کھود یا تو ظاہر بات ہے کہ صرف محسوسات رہ گئیں اسی کے چکر میں پڑے رہے نہ عقل کام دے گی نہ علم کام دے گا۔

حقیقت علم..... مجازی طور پر آپ سائنس کو، فلسفے کو علم کہہ دیں مگر یہ علم نہیں ہے یہ حس ہے یعنی محسوسات کو دیکھنا، تجربات سے اس میں نئی نئی چیزیں پیدا کرتے رہنا۔ یہ بس دیکھنا ہے اور دست کاری..... علم کہتے ہیں مغیبات کو یعنی ایسی چیز جانے کو کہ جو آنکھ اور کان سے نہ دیکھی جاسکے، اس چیز کا نام ہے علم۔ اور وہ علم اللہ کا ہے جو وحی کے ذریعے آتا ہے تو علم کہلانے کا مستحق وہ ہے۔ یہ حسی چیزیں ہیں حس سے تصرفات کریں گے۔ یہ احساسات سے تعلق رکھتے ہیں، اسے حس کہیں گے علم نہیں کہیں گے اور حس جانور میں بھی ہوتی ہے اور انسان میں بھی، جانور کے لاشی مار دو گے وہ بھی تکلیف پائے گا۔ انسان کی خصوصیت نہیں، اس کو ڈھیلا مارو، وہ بھی جذبہ میں آجائے گا یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا، طبیعت سے تعلق رکھتا ہے۔ حس سے تعلق رکھتا ہے تو یہ جتنی چیزیں ہیں یہ احساسات ہیں علوم نہیں ہیں۔ علوم کا تعلق ہے مغیبات سے اور وہ جہی آتا ہے جب قلب کے اوپر کا دروازہ کھلے اور اس دروازے میں وہاں سے علم کی آمد شروع ہو جائے۔ اس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ انہوں نے اوپر کا دروازہ بند کر لیا ہے قلب کا، اور وہ کام نہیں لیتے جو قلب کا کام ہے کہ جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں، صورتیں دیکھنے پر قناعت کر رہے ہیں تو پھر

کہاں سے انہیں منزل مقصود نظر آئے گی اور پھر یہ سامان بھی جتنا ہے دیکھنے کا یہ بھی ہمارا ہی تو دیا ہوا ہے، اس نے خود کہاں پیدا کیا ہے، اگر ہم روک لیں تو دیکھ بھی نہ سکے، چکھ بھی نہ سکے، تو ان طاقتوں کے بل بوتے پر ہمارے مقابلے پر آ رہا ہے جس کے خالق ہم ہیں۔ تو حماقت اور جہالت واضح فرمائی گئی۔

انسانی ذوات و صفات کی معطی ایک ہی ذات ہے..... اس کو فرمایا: قُلْ هُوَ الَّذِي اَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۚ كَهْدِ رَتَبْتُمْ اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ وہی ہے اللہ جس نے تمہیں پیدا کیا، پیدا کرنے والا وہ ہے اور پیدا بھی کیا اس شان سے کہ جن قوتوں پر ناز کرتے ہو وہ اس نے رکھیں۔ سننے کی طاقت اس نے رکھی، دیکھنے کی طاقت اس نے رکھی، بوجھنے کی طاقت اس نے رکھی، دل دیا، آنکھ دی، کان دیئے مگر قَلِيلًا مَا تَشْكُرُوْنَ بہت کم ہیں جو شکر گزار ہیں اللہ کے، کہ ان نعمتوں کو نعمت سمجھیں بس یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری ملکیت ہے کون ہے دینے والا؟

تو نہ شکر کا کام ہے نہ حمد کا کام ہے، تو جب حمد و شکر نہیں اس واسطے اس کا استعمال بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ ادھر عقل لڑاتے ہی نہیں قَلِيلًا مَا تَشْكُرُوْنَ یہ تو ہیں توئی اور فرماتے ہیں یہ جو قوتیں ہیں اب خود اپنی ذات کو دیکھ لو جس میں یہ قوتیں رکھی گئیں، وہ ذات کہاں سے آئی؟ وہ بھی تو اللہ ہی نے بنائی ہے، تم تو خود ہی نہیں بنے تو اس کو فرمایا قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْاَرْضِ ۚ وَالْيَه تَحْشَرُوْنَ آپ فرمادیتے! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں بکھیر دیا عجیب اعجازی شان سے کہ ایک نقش واحد کو پیدا کیا آدم علیہ السلام کو، اور اس کے ذریعے سے اربوں کھربوں انسان پوری زمین میں بکھیر دیئے تو یہ بکھیرنے والے ہم ہیں یا تم ہو؟

ہم نے ہی تو تمہاری ذات کو دنیا کے اندر بھیجا تو ذات جب ہم نے بھیجی تو ذات میں جو کرامات رکھی ہیں سننا، دیکھنا، عقل، یہ بھی تو ہم ہی رکھنے والے ہیں جو ذات کا دینے والا ہے وہ صفات کا دینے والا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ذات تو تم بناؤ اور صفات میں ہم تمہارے تابع ہو جائیں یا ذات ہم بنائیں اور صفات تم رکھ لو جو ذات بنائے گا وہی صفات بنائے گا۔

سارے بیان کا حاصل..... تو حاصل یہ نکلا کہ اگر اللہ کی قدرت پر غور کرو تب بھی جواب موجود ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو اور عبرت پکڑو اور اگر عقل سے غور کرو تو عقل بھی بتلاتی ہے کہ دینے والا جو ہے اس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اگر حس پر غور کرو تو، پرندوں کو دیکھ لو وہی ہے اوپر لے جانے والا، وہ پتھروں کو اوپر لے جا کر برسساں کرتا ہے، اگر تاریخ پر غور کرو تو پچھلوں میں ایسے واقعات پیش آچکے ہیں، لیکن جب نہ تاریخ سامنے رکھو، نہ آنکھ، کان کھول کر دیکھو، نہ عقل سے دیکھو، نہ ایمان لاؤ تو سوائے ہٹ دھرمی کے اور کیا ہے.....؟

انسان کی کٹ جتنی..... اس کا حاصل یہ ہے کہ تم گویا مستعد بن رہے ہو ہمارے عذاب اٹھانے کے لیے تو ہم عذاب بھیجنے والے ہیں۔ ہم نے دنیا میں بھی عذابات دیئے ہیں قیامت کا دن بھی رکھا ہے کہ اس میں آخری طور پر

عذاب دیں گے۔ اب آگے جبکہ یہ بات ہوئی تو فرمایا کہ گویا جب تم عذاب ہی چاہ رہے ہو تو اچھا تیار ہو عذاب کے لیے مگر مصیبت یہ ہے کہ انسان کی کٹ جتنی پرکے تیار ہونے کے باوجود پھر تیار نہیں وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ . اچی صاحب! وہ عذاب کب کو آئے گا، وہ قیامت کب آئے گی؟.... اب اس پر بھی یقین نہیں کہ آنے والا ہے اس لیے کہ یقین کا سبب اور اسباب تو پیدا کیے نہیں۔ اس سے کام نہیں لیا تو قیامت کی دھمکی دی تو اب قیامت مانگنے کو تیار کہ متیٰ هَٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقٰیْنَ.....

اثبات قیامت..... یہاں سے پھر آگے قیامت کا اثبات شروع کیا کہ آخری سزا کے لیے قیامت کا دن تیار ہے، دنیا میں جب تک گزار رہے ہو گزار لو، یہاں بھی عذاب آئے گا، اور وہاں بھی عذاب آئے گا، یہاں کے عذاب کو ممکن ہے کہ تھوڑا بہت اسباب کے ذریعے ٹال لو گو وہ ٹالے گا نہیں، لیکن قیامت کے دن تو کوئی صورت ہی نہیں ہے نلنے کی، وہ تو آنے والا ہے چاہے اسے مانگو تم، چاہے نہ مانگو، اس واسطے آگے قیامت کے ثبوت اور قیامت کے اثبات پر بحث فرمائی ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقٰیْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيرٌ مُّبِیْنٌ ۝ فَلَمَّا رَاُوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقِیْلَ هَٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدْعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَاۤءَ یُتِمُّ اِنْ اَهْلَكْنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیْ اَوْ رَحِمْنَا وَلَقَدْ یُجِزِی الْكَافِرِیْنَ مِنْ عَذَابِ الْیَمِّ ۝ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اَمَّنَا بِهٖ وَعَلِیْهِ تَوَكَّلْنَا فَسْتَغْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ قُلْ اَرَاۤءَ یُتِمُّ اِنْ اَصْبَحَ مَاوْكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یُّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مُّعِیْنٍ ۝

”اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو تو کہہ! خبر تو ہے اللہ کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈرنا دینا ہے کھول کر پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آگیا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے تو کہہ! بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے تو کہہ! وہی رحمن ہے، ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا، سو اب تم جان لو گے کون پڑا ہے صریح بہکائے میں، تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک، پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی تمہارا۔“

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو قیامت سے ڈرایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ پوری دنیا ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوگی تو اُس زندگی کے لیے اس زندگی میں کچھ کر لیا سامان تو اگلی زندگی..... راحت سے کٹے گی اور اگر نہ کیا یا برا سامان مہیا کیا تو اگلی زندگی تکلیفوں میں کٹے گی۔ اور چونکہ وہ اگلی زندگی دوائی اور ابدی ہے۔ اس لیے راحت کا سامان کیا تو راحت بھی دوائی ہوگی اور مصیبتوں کے سامان کر لیے تو وہ مصیبتیں بھی دوائی اور ابدی رہیں گی، جو کالے نہیں کٹیں گی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کو پیش

فرمایا، تو اس پر قوم نے جھٹلایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کی شکایت فرمائی حق تعالیٰ نے کہ وَیَقُولُونَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

یہ جو آپ لوگ قیامت سے ڈراتے ہیں، وعدہ دیتے ہیں وہ کب کو آئے گی، وہ آکیوں نہیں جاتی قیامت؟ اگر ہو تو اسے لے آئیے جلدی سے، برسوں برس سے صدیوں سے ہزاروں برس سے وعدے دے رکھے ہیں آپ نے کہ دنیا ختم ہوگی تب وہ آئے گی تو اسے اگر آتا ہے تو وہ جلدی کیوں نہیں آ جاتی تاکہ آپ کو بھی ہمیں جھٹلانے کا موقع نہ رہے۔ قیامت سامنے آ جائے تو مجبور ہو کر ہم یقین کر لیں۔ یہ سوال کیا کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ کب آئے گی وہ قیامت؟

قیامت کے سوال کا منشاء..... اس سوال کا منشاء دو ہو سکتے ہیں اور تھے بھی دو، ایک تو یہ کہ بعض قیامت ہی کے منکر تھے کہ کوئی زندگی اگلی آنے والی نہیں ہے..... ان کے مزاجوں میں دہریت تھی، نہ وہ اس عالم کی ابتداء کے مقرر تھے نہ انتہاء کے مقرر تھے کہ بس یونہی چلا آ رہا ہے قصہ، یونہی چلتا جائے گا ابد الابد تک مَا هِیَ اِلَّا حَیٰثُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ

یہ زندگی ہماری، مر رہے ہیں، جی رہے ہیں یونہی دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ یونہی دیکھتے ہوئے چلے جائیں گے تو زمانہ ہمیں زندگیاں دے رہا ہے زمانہ ہی آتا ہے، وقت گزرتا ہے موت آ جاتی ہے، یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ نہ قیامت ہے نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، تو کچھ دہر یہ مزاج تھے کہ جو شروع ہی سے منکر تھے قیامت کے۔ منکرین قیامت..... جیسا کہ فلاسفہ یونان، وہ بھی منکر ہیں قیامت کے، وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے دنیا اور ہمیشہ اسی طرح چلی جائے گی، نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، نہ کوئی انتہاء ہے اس عالم کی۔

فلاسفہ ہند یہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ابتداء بھی نہیں ہے اور انتہاء بھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی انتہاء تو وہ انتہائیں بھی ہزاروں آئیں گی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اتنے ارب اتنے کھرب اتنے کروڑ اتنے لاکھ برس تک یہ قائم رہتی ہے دنیا اور پھر پر لو آ جاتی ہے۔ قیامت آ جاتی ہے، عالم مٹ جاتا ہے اور پل بھر میں پھر از سر نو بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اور چار بیسی یعنی جو سب سے اول پیدا ہوتے ہیں تبت کے پہاڑ وہ ہیں، ان پر ریت اترتا ہے۔ پھر دنیا چلتی ہے اور چار ارب اور چار کھرب اور چار کروڑ برس تک پھر چلتی رہے گی۔ پھر پر لو آئے گی اور پھر از سر نو، تو اروح ان کے یہاں گنتی کی متعین ہیں وہی لوٹ پھیر کر آئے جاتی ہیں۔ وہ مختلف جون بدلتی رہتی ہیں تو ابتداء و انتہاء کے یہ بھی قائل نہیں اور فلاسفہ یونان بھی قائل نہیں یعنی جتنے بھی بندگان عقل ہیں وہ قائل نہیں ہیں قیامت کے۔ ان کا خدا ان کی عقل ہے، ان کے نظریات ان کے عقائد ہیں۔ اس واسطے ان کے عقائد میں یہ چیز آتی نہیں کہ اس عالم کی ابتداء ہے، تو وہ درحقیقت خدا کے وجود کے بھی منکر ہیں اور کائنات کی انتہاء کے بھی منکر ہیں تو ایک نمونہ عرب میں موجود تھا جو قیامت کے منکر تھے، تو ایک منشاء تو ان کے سوال کا استہزا اور مسخرہ پن ہے کہ جو چیز آنے

والی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اس سے ڈرارہے ہیں، نہ قیامت آوے، نہ عالم ختم۔

بعض قائل تھے قیامت کے مگر اس کے مقصد سے واقف نہیں تھے کہ حقیقت کیا ہے قیامت کی۔ اس کی جہالت کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا تم سحر آمیز کہ مَنیٰ هَذَا الْوَعْدُ کب کو آئے گی وہ قیامت۔ تو قیامت کی حقیقت پیش نظر نہیں یعنی یہ پیش نظر نہیں تھا کہ ایک زندگی ختم ہو کر اس کے ثمرات اگلی زندگی میں نکلیں اور اس کے لیے لازمی ہے کہ ایک عالم ختم کیا جائے اور دوسرے عالم کی بنیاد ڈالی جائے۔ تاکہ مجموعہ بنی آدم کی نتائج دیکھنے کا موقع ملے اچھے اور برے۔ یہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک جہان بدل کر دوسرے جہان نہ لایا جائے، تو بعضے اس حقیقت کے منکر تھے تو قیامت کے قائل تھے مگر حقیقت سے لاعلم تھے اس واسطے یہ سوال کیا کہ کب کو آئے گی وہ قیامت؟

تعدد قیامت لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا انکار ہوا قیامت کے مقصد کا انکار ہو، یہ اپنی بھی تکذیب ہے، اور مشاہدات کی بھی تکذیب ہے، خود اپنے دیکھے کو جھٹلانا ہے اس واسطے کہ قیامت ایک ہی نہیں ہے بلکہ کئی ہیں قیامتیں، ایک قیامت شخصی ہے اور ایک قیامت قرنی ہے، اور ایک قیامت کلی ہے۔ شخصی قیامت ہر شخص کی موت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ تو یہ شخصی قیامت ہے کہ ہر شخص کے اوپر آرہی ہے یعنی ایک زندگی ختم ہوتی ہے اگلی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ تو شخصی زندگی ہے، شخصی موت ہے اور شخصی قیامت بھی۔

دوسری قیامت ہے قرنی، یعنی ایک نسل کا اختتام جس کا اندازہ تخمینہ سو برس ہے، سو برس کے اندر اندر ایک نسل ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نسل کا آغاز ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کسی فرد کی عمر اتفاق سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ سو سو برس ہو جائے تو ایک فرد کا نام زمانہ نہیں ہوتا، زمانہ کہتے ہیں اکثریت کو کہ ایک نسل کی نسل آجائے اور نسل کی نسل ختم ہو جائے، ایک آدھ فرد رہ جائے تو اس سے نسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو ایک صدی گویا رکھی گئی ہے ایک نسل کے لیے تخمینہ طور پر۔ اسی واسطے حدیث میں تجدید کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے کہ دین کو تازہ بہ تازہ کیا جائے گا۔ تو ہر صدی کے اوپر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس امت میں تو نبی نہیں آئے گا۔ اس امت میں یہ نبوت آخری ہے لیکن مجددین آئیں گے ہر سو برس کے بعد اللہ تعالیٰ مجدد پیدا کریں گے کہ لوگ اپنی خود رانیوں سے دین میں جو غلطی ملط کریں گے، کچھ بدعات ملادیں گے، کچھ منکرات، مجدد آکر پھر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر دے گا اور پھر از سر نو دین تازہ بہ تازہ ہو جائے گا..... اس لیے وعدہ دیا گیا ہے کہ ایک طبقہ ہمیشہ اس امت میں حق پر رہے گا کبھی حق منقطع نہیں ہوگا اس سے وہی ایک بیج کی مانند ہوگا اس میں سے کونٹیں پھوٹیں گی اور نبی شاخیں پھرا بھرا آئیں گی اور مجددین آکر دین کی تجدید کریں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْ يُحْدِثُ لَهَا دِيْنَهَا ①

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائۃ ج: ۱۱ ص: ۳۶۲۔

اللہ تعالیٰ تازہ بہ تازہ کرے گا اس دین کو ہر صدی پر، ہر صدی پر مجدد آئیں گے... تو ہر سو برس کے بعد مجدد کا وعدہ اس لیے کیا گیا ہے کہ سو ہی برس ہوتے ہیں ایک نسل کے جب نئی نسل آتی ہے تو کچھ نظریات بھی نئے ہوتے ہیں کچھ خیالات نئے ہوتے ہیں، زمانے میں کچھ ترقی ہوتی ہے، ان ترقیات سے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے دین کے (بارے میں) مجدد آکر اس قرن کی ضروریات کو سامنے رکھ کر دین کی جب تجدید کرتا ہے تو پھر دین قلوب میں تازہ بہ تازہ ہو جاتا ہے کیوں کہ ایک نسل کے آغاز اور ایک نسل کے اختتام کا عمومی طور پر اندازہ سو برس ہے اسی لیے سو برس پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا حاصل نکلا کہ ہر سو سال بعد ایک قیامت قائم ہوتی ہے۔ یعنی ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کے لیے جگہ چھوڑتی ہے، اسے قیامت قرنی کہتے ہیں۔ اور ایک تیسری قیامت ہے جو قیامت کلی ہے کہ پورے عالم پر موت طاری ہو جائے آسمان سے لے کر زمین، پہاڑ و ریاحتی کہ ملائکہ علیہم السلام ارواح مقدسہ کوئی چیز باقی نہ رہے اور احدیت مطلقہ کا ظہور ہو، صرف ایک اللہ کی ذات قائم رہے۔ تو جیسے اس کا نام واحد ہے کہ وہ ایک ہے ایسے ہی اس کا نام احد بھی ہے کہ وہ یکتا ہے اور بے مثل اور بے مثال، تو یکتائی کا ظہور نہیں ہو سکتا جب تک ہر چیز مت کر تنہا ذات واحد نہ رہ جائے۔ یہ عالم اللہ نے بنایا ہے اپنی صفات کے اظہار کے لیے تو تمام صفات ظاہر ہوں گی رحمانیت بھی ظاہر ہو رہی ہے غفوریت بھی ظاہر ہو رہی ہے، رزاقیت بھی ظاہر ہے۔

احدیت کا ایسا ظہور ہو کہ کوئی نہ ہو اور وہ ہو۔ یہ جب ہی ہوگا جب پورے عالم کا نظام ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد پھر ایک نیا نظام لایا جائے۔ تو احد کی صفت کے ظہور کے لیے قیامت قائم کی گئی ہے۔ جس عالم کے اجزاء قیامت کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس کے مجموعہ میں بھی یہ صلاحیت ہوگی..... تو ایک قیامت شخصی ہوئی۔ ایک قرنی ہوئی، ایک قیامت کلی ہوئی، دو قیامتیں وہ ہیں جو ہر شخص انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہر انسان جب مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہوئی۔ یہ ہر ایک کی نگاہوں کے سامنے ہے، تو جس عالم کے اجزاء پر قیامتیں آرہی ہیں کیسے ممکن ہے کہ اس کے کل پر قیامت نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فنا کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے جی تو ہر ہر جزء اس کا موت کی طرف جاتا ہے، اگر اس عالم میں صلاحیت نہ ہوتی موت کے قبول کرنے کی تو ایک فرد بھی اس کا نہ مرتا۔ ایک جزم میں بھی تغیر نہ ہوتا۔ سارے اجزاء علیٰ حالہ باقی رہتے لیکن جب ایک جزم موت کی طرف جاتا ہے تو مجموعہ بھی یقیناً موت کی طرف جائے گا۔ ان اجزاء کے مجموعہ ہی کا نام تو عالم ہے۔ اب انفرادی طور پر یہ اجزاء جتنے ہیں ایک وقت آئے گا کہ مجموعہ مل کر مٹ جائے گا، پورے عالم پر موت طاری ہو جائے گی تو جس کے ایک جزم میں یہ خاصیت ہے وہ کل کے اندر بھی ہوگی ورنہ اجزاء میں وہ بات پیدا نہ ہوتی اجزاء میں خاصیت نہ آتی۔ تو موت شخصی قیامت شخصی ہر فرد پر ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔ انکار قیامت، انکار مشاہدہ ہے..... انسان ہی نہیں جانور بھی مرتے ہیں اور جانور ہی نہیں تمام اجزاء مرتے

ہیں، ایک پتھر رکھا صحیح سالم وہ ٹوٹ گیا، اس کی ہیئت کذائی مٹ گئی، درخت ہیں ان پر موت طاری ہوتی ہے۔ بعضے درخت کی عمر سال بھر ہے۔ جیسے پیدہ سال بھر میں اگا، اس کے بعد فی شاخ پھوٹ آئی۔ یا کیلا ہے سال بھر رہا ہے اس کے بعد مٹ گیا بعضے درختوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ بعضوں کی سو سو برس ہوتی ہے۔ تو جس طرح سے یہ بنی آدم میں عمریں مختلف ہیں نباتات میں بھی مختلف ہیں۔ تو نباتات بھی مرتے ہیں، جمادات بھی مرتے ہیں حیوانات بھی مرتے ہیں انسان بھی مرتے ہیں، تو جب اس عالم کے سارے اجزاء موت کو قبول کرتے ہیں تو عقل بتلاتی ہے کہ مجموعہ بھی قبول کرے گا اور اس کے اندر موت آنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تو جو لوگ روزانہ دیکھتے ہیں قیامت کو آتے ہوئے وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں مجموعہ قیامت کا یہ تو اپنے مشاہدہ کو جھٹلانا ہے۔

تو قیامت کا انکار کرنا خود اپنی تکذیب کرنا ہے اپنا انکار کرنا ہے۔ ورنہ جو منکر ہیں قیامت کے انہیں چاہیے کہ وہ مرانہ کریں اور ملک الموت کا مقابلہ کریں اور کہہ دیں کہ ہم میں موت آنے کی صلاحیت نہیں ہے، ہم میں تو ابد الابد تک رہنے کی صلاحیت ہے لہذا ہم مرنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اس پر قادر ہوتے تو عالم کے بارے میں بھی دعویٰ کر سکتے تھے کہ اس عالم پر بھی موت نہیں آئے گی، جب اس کے اجزاء پر بھی نہیں آتی تو کل پر بھی نہیں آئے گی لیکن جب آتی ہے اجزاء پر کل پر آنا ممکن ہے اس واسطے یہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے۔

شخصی قیامت کے تعین نہ ہونے کے باوجود اگلے سامان کرتے ہو تو عالمی قیامت کے تعین نہ ہونے پر بھی اگلے سامان کرنا چاہیے..... اب دوسری چیز یہ ہے کہ قیامت کا مقصد پیش نظر نہیں ان کے جس سے وہ انکار کرتے ہیں..... قیامت کا مقصد یہ ہے کہ پہلی زندگی میں کچھ سامان کیا جائے تاکہ اگلی زندگی میں وہ کارآمد ثابت ہو، اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس موت کا علم بھی ہو، یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ زندگی ختم ہوگی تو آدمی اگلی زندگی کا سامان کرے گا۔

مثلاً ایک شخص مرتا ہے تو کیا وہ اپنی زندگی میں اس کی فکر نہیں کرتا کہ میں اپنی اولاد کے لیے کچھ کر جاؤں تاکہ کل کو آنے والے مجھے برا بھلا نہ کہیں، اس واسطے آدمی جائیداد خریدتا ہے، تجارتیں قائم کرتا ہے، کمپنیاں بناتا ہے کہ میں ہی نہیں میری اولاد کے کام آئے، اس کو یقین ہے کہ میں اس عالم سے گزر جاؤں گا تو میری نسل مصیبت میں نہ پڑے۔ احادیث میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ”تم بجائے اس کے کہ مرتے وقت اولاد کے ہاتھ میں بھیک کا ڈھو گہادے جاؤ، یہ بہتر ہے کہ ایسا سامان کر جاؤ کہ تمہاری اولاد خوشحالی کی زندگی بسر کرے“

یعنی تنہا اپنی فکر نہ کرو بلکہ اپنی اولاد کی بھی کرو، تو اولاد کی فکر آدمی اسی زندگی میں تو کرتا ہے اور کرتا ہے اگلی زندگی کے لیے کہ جب میں نہ ہوں جب بھی، تو کیا وہ یہ پوچھا کرتا ہے کہ صاحب! پہلے یہ بتلا دو کہ کون سے دن، کون سی تاریخ میری موت آئے گی، جب میں اولاد کے لیے سامان کروں وہاں مطلقاً اتنا کافی ہے کہ موت کا علم ہو کہ آئے گی ضرور کب آئے گی؟ کون سی تاریخ؟....

یہ ضروری نہیں جبکہ تم اپنی شخصی زندگی کو جانتے ہو کہ ایک زندگی میرے بعد آئے گی، مجھے نیک نامی کا سامان کرنا چاہیے اور اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ موت کے وقت کا علم ہو تو مجموعہ عالم کی موت میں کیوں سوال کرتے ہو کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ یہ کون سی تاریخ کو آئے گی قیامت؟؟ بھی جیسے تمہیں شخصی قیامت کے وقت کا علم نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مجموعہ قیامت کا بھی علم نہ ہو دن تاریخ کا تو اس میں کیا نقصان بیٹھتا ہے؟ وہاں بھی بلا تاریخ کے علم کے اگلے سامان کرتے ہو، یہاں بھی تم اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کا سامان قیامت کے دن کے لیے کرو، وہاں تاریخ نہیں پوچھتے یہاں کیوں پوچھتے ہو؟

وہاں کیوں نہیں کہتے کہ صاحب! موت کب آئے گی، پہلے مجھے یہ علم ہو کہ جنوری کی فلاں تاریخ میں میرا انتقال ہوگا جب تو میں اپنی اولاد کے لیے کچھ آئندہ کا سامان کروں اور اگر یہ علم نہ ہو تو مرنے دو، اولاد کو بھی جانے دو، جب وہاں سوال نہیں کرتے یہاں بھی سوال نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح سے قرنی قیامت قائم ہوتی ہے، ایک نسل ختم ہوتی ہے دوسری نسل آتی ہے یہ نسل بھی تو سامان کرتی ہے کہ ہماری اگلی نسلیں ٹھیک رہیں، اگر کسی نسل میں حکومت ہے تو وہ اپنے دم بھر صحیح کرے گی کہ میرے خاندان میں باقی رہے یہ حکومت میری قوم میں باقی رہے، دوسری قوم اس پر غالب نہ آئے تو کیا وہ یہ پوچھا کرتی ہے کہ ایک صدی کی کون سی تاریخ، کون سے منٹ پر ہماری قوم ختم ہوگی جب تو ہم سامان کریں اگلی نسل کے لیے اور جب معلوم نہ ہو تاریخ تو نہ کریں، کوئی اس کی فکر نہیں کرتا، اسے اتنا معلوم ہے کہ سو برسوں میں اندازاً ایک نسل گزر جائے گی اسے اگلی نسل کی فکر کرنی چاہیے، وہاں وہ کبھی نہیں پوچھتے کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ۔ یہ کب کو آئے گی، کون سی تاریخ ہوگی؟ جب وہاں بلا تاریخ کے علم کے اگلی نسلوں کا بندوبست کرتے ہو تو یہاں بلا علم تاریخ کے کیوں نہیں کرتے قیامت کا بندوبست؟ قیامت کے بعد کی زندگی کی کیوں نہیں فکر کرتے، معلوم ہوا کہ سوال تمہارا مہمل ہے، محض ٹال مٹول کے لیے یہ سوال کر رہے ہو، کوئی معقول سوال نہیں ہے، اگر معقول ہوتا تو شخصی موت میں یہ بھی سوال کرتے اور قرنی موت میں بھی یہ سوال کرتے لیکن وہاں نہیں کرتے۔ اسے غیر معقول جانتے ہو تو کلی قیامت میں اس سوال کو کیوں تم نے معقول سمجھا؟ یہاں بھی غیر معقول۔

مقصد قیامت..... تو اصل میں قیامت کے مقصد کا علم نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس زندگی میں کچھ کر جاؤ تاکہ اگلی زندگی میں کام آئے یہ ایک مقصد ہے۔ یہ شخصی قیامت میں بھی ہے قرنی قیامت میں بھی ہے۔ کلی قیامت میں بھی ہے تو یا تو اس کا علم نہیں یا جان بوجھ کر اپنے کو جاہل بنا رکھا ہے۔ ٹال مٹول کر کے دعوے کو رد کرنا ہے۔ اس واسطے سوالات کرتے ہو، تو حاصل یہ نکلا کہ قیامت کا آنا یہ آنکھوں دیکھی چیز ہے۔ روزانہ قیامتیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جب مشاہدہ ہے تو پھر انکار کرنا اس کا، جھٹلانا ہے اپنے مشاہدے کو وہ اپنی تکذیب ہے، وہ خدا کی تکذیب نہیں، اللہ کا وعدہ اپنی جگہ سچا ہے وہ اس درجہ کا ہے ہی نہیں کہ کوئی جھٹلا سکے۔ اسے جھٹلانے والا اپنے کو جھٹلارہا ہے۔ جیسے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خٰدِعُهُمْ۔ یہ جو اللہ کو جھٹلارہے ہیں درحقیقت

اپنے نفسوں کو جھٹلا رہے ہیں اپنے کو دھوکے میں ڈال رہے، تو مشاہدہ کا انکار وہ خود اپنا انکار ہے جب آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ قیامتیں روزانہ ہیں۔ تو پھر قیامت کا انکار وہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے اور اپنی آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلانا یہ اپنے کو جھٹلانا ہے خدا کو جھٹلانا نہیں، وہ بری ہے اس سے کہ کوئی جھٹلائے اس کو، یہ تو مشاہدہ ہے۔

قیامت قیامت کا عقلی ثبوت اور جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو عقل بھی اس کی مؤید ہے کہ قیامت آئی ہے، عقل خود شاہد ہے اس واسطے کہ یہ ایک عقلی قاعدہ ہے کہ جو چیز مخلوط ہوتی ہے چند اجزاء سے جب تک کہ اسے توڑ کر اجزاء الگ الگ نہ نکالے جائیں وہ نفع نہیں دیتی، جب تک کہ الگ الگ چیزوں کو نفع پہنچاتے ہیں تو مجموعہ کو توڑ پھوڑ کر جب تک اجزاء الگ الگ نہیں کر دیئے جائیں گے وہ نفع بخش ثابت نہیں ہوں گے۔

اس کی مثال کھیتی ہے۔ ایک کسان نے کھیتی بوئی جو، اور چھ مہینے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، چھ مہینے کے بعد کھیتی لہلہا اٹھی، آنکھیں بھی اس کو دیکھ کر مسرور ہو رہی ہیں اور کاشتکار کا دل بھی خوش ہے کہ اب میرے لیے موقع آ گیا ہے۔ میرا گھر بھرے گا، بہت خوش، لیکن جب کھیتی پک گئی اور دانے پختہ ہو گئے تو وہی کسان جس نے خون پسینہ ایک کر کے اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا۔ درانتی لے کر خود ہی اسے کاشنا شروع کر دیا اور ساری کھیتی کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ کاٹ ڈالا پھر اسی پر بس نہیں کہ کھیتی کو کاٹ کر کھلیان میں جمع کیا اور اس کے بعد تیل چلا کے اسے چکنا چور کرنا شروع کیا، ریزہ ریزہ کر دیا پھر اسی پر بس نہیں کرتے کسان کہ بھی کاٹا تھا کاٹنے کے بعد خود اپنے پیروں سے نہیں بلکہ بیلوں کے پیروں سے روندوایا، اس کے بعد تھال میں لے کر اڑا کے ہیں جو ساری بکھر کر الگ الگ ہو جائے اگر کوئی کاشتکار سے یوں کہے کہ بے وقوف! چھ مہینے کی خون پسینہ کی کمائی تیری، تو نے ہی تو اسے آباد کیا تھا، پروان چڑھایا تھا، اور بے وقوف اپنے ہی ہاتھ سے اس کو اجاڑ دیا، یہ تو نے بڑی غلطی کی، غیر معقول بات کی، اپنی پروان چڑھائی ہوئی کھیتی کو کاٹ ڈالا اور ریزہ ریزہ چکنا چور کر دیا، تو وہ یہ کہے گا کہ بے وقوف تم ہو سوال کرنے والے، میں نے عقل مندی کا کام کیا اس لیے کہ میری کھیتی میں بھوسہ اور جو مخلوط تھے۔ بھوسہ غذا ہے بیلوں کی اور جو غذا ہے انسانوں کی، جب تک میں کاٹ کر اسے چکنا چور نہ کروں بھوسہ الگ نہیں ہو سکتا تھا دانے سے، جب میں نے الگ کر دیا تو بھوسہ تو گیا جانوروں کے پیٹ میں اور دانہ گیا انسانوں کے پیٹ میں اپنے اپنے ٹھکانے پر ہر چیز پہنچ گئی۔ مجموعی کھیتی اگر نہ توڑی جاتی، نہ چکنا چور کی جاتی تو ہر ایک کو اپنی اپنی غذا نہیں مل سکتی تھی۔ یہ جواب معقول ہوگا اس کا اور سوال نامعقول ہوگا۔

فرماتے ہیں ”الذُنُیَا مَرْذَءَةُ الْآخِرَةِ“ ① یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، اس میں کفر اور اسلام، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ سب رلا ملا چل رہا ہے دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ایک دوسرے کے منافی ہیں مگر یہاں رلی ملی چل رہی ہیں ایک حقانی دلائل پیش کرتا ہے، ایک باطل پسند کچھ ملمع سازی کر کے حق کو رلا کر باطل میں ملا کر پیش کرتا ہے،

① حدیث کی تخریج گزرجی ہے۔

وہ اپنے باطل کو حق ثابت کر رہا ہے بہت لوگ جو زیرک ہیں دانش مند ہیں وہ تو اصلیت کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ مگر ہزاروں بہک بھی جاتے ہیں اور پھر دلائل کو ایسی ملع سازی سے پیش کریں گے لوگ کہ اہل حق تو بے چارے بیٹھے رہ جائیں گے اور باطل کو فروغ ہو جائے گا تو دنیا میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، اخلاص اور نفاق، کفر اور اسلام سب خلط ملط چل رہا ہے اور ہر ایک مدعی ہے کہ میں حق پر ہوں، الگ نہیں ہے کہ دودھ الگ ہو، پانی الگ ہو، عقل لڑا کر غور کرو تو الگ ہوتا ہے ورنہ دیکھنے میں بالکل یکساں ہیں، ہیرا بھی یکساں ہے اور کچ کا ٹکڑا بھی یکساں ہے۔ اب جو ہری تو کم ہوتے ہیں جو ہیرے کو الگ کر دیں اور کچ کے ٹکڑوں کو الگ سارے تو جو ہری نہیں وہ کہیں گے بھئی یہ جو نقلی ہے، یہ بھی وہی ہے اصلی ہے وہ بھی ہمیں تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ تو دنیا میں دونوں چیزیں چل رہی ہیں خلط ملط، حق تعالیٰ نے اس دنیا کی کھیتی کو پروان چڑھایا، ہزاروں ہزار برس سے اس کو پانی دیا، سیخا لہلہا اٹھی اور قیامت کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے سب کچھ چکنا چور کر کے تباہ و برباد کر دیں گے، آسمان نیچے گر پڑے گا، چاند سورج کے ٹکڑے، زمین کے ٹکڑے، پانی، یہ مٹی سب گڈمڈ ہو کر خلط ملط ہو جائے گا۔

اگر کوئی حق تعالیٰ سے سوال کرے کہ آپ ہی نے تو اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا، ہزار ہا ہزار برس آپ کی قدرت نے اسے سیخا اور بنایا اور اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا، فرمائیں گے اس میں کفر اور اسلام، حق و باطل ملا ہوا تھا، اس میں حق اور حقانی لوگ یہ غذا ہیں جنت کی اور کفر اور کفر والے لوگ یہ غذا ہیں جہنم کی، جب تک اس کھیتی کو کاٹ کر اجزاء الگ الگ نہ کئے جائیں تو جنت کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، جہنم کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، تو میں نے اسے پروان چڑھایا تا کہ پک جائے، پکنے کے بعد اب غذا دینی ہے۔ جنت اپنی غذا مانگ رہی ہے۔

تو اسلام اور صاحب اسلام اس کو دیئے جائیں گے۔ اور کفر اور صاحب کفر جہنم کو دیئے جائیں گے، کھیتی اگر یونہی برقرار رہتی تو جنت بھی خالی رہتی، جہنم بھی خالی رہتی، حالانکہ اس عالم کو بھی بھرنا ہے، تو آج جنت خالی ہے، جہنم بھی خالی ہے، مگر دونوں مانگ رہے ہیں کہ میری غذا دیجئے، جنت بھی رات دن سوال کر رہی ہے کہ مجھے بھیجئے لوگ اور وعدہ ہے اللہ کا کہ ہم بھر دیں گے..... اور جہنم بھی پکار رہی ہے کہ مجھے بھر دیجئے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ ہاں بھر دیں گے، لیکن ذرا بھوک کو کامل ہونے دو، ایک وقت گزر جائے، جب تکمیل کو پہنچ جائے گی بھوک تب غذا دیں گے، تا کہ تمہارے اندر سرور پیدا ہو، بلا بھوک کے اگر کھالیا تو وہ ہضم نہیں ہوگا اور اس کے لطف بھی محسوس نہیں ہوں گے، جب معدہ پوری طرح کامل بن جائے اس وقت غذا دی جائے تو فرحت، سرور اور قوت کا باعث ہوتا ہے اور اگر اشتہاء صادق نہ ہو اشتہاء کاذب ہو، مانگتا رہے معدہ اور بھرتے رہیں گے تو بیماریاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ تو کامل بھوک کے وقت جو چیز دی جاتی ہے وہ بچتی بھی ہے بھیتی بھی ہے اور مسرت کا باعث ہوتی ہے اس کے لیے ہم نے ایک وقت رکھا ہے اس وقت اس کھیتی کو کاٹ کر چکنا چور کر کے دانہ الگ نکال دیں گے، بھوسہ الگ نکال دیں گے بھوسہ جائے گا جہنم میں دانہ جائے گا جنت میں اس جہان میں دانہ ہے حق اور اہل حق اور بھوسہ ہے کفر اور اہل کفر،

وہ جہنم کی غذا ہیں یہ جنت کی غذا ہیں تو جس طرح سے ایک کاشکار اپنی کھیتی کو ہر چھٹے مہینے پامال کرتا ہے تاکہ الگ الگ غذا کرے حق تعالیٰ شانہ اس پورے عالم کی کھیتی کو ایک دن چکنا چور کر کے اجزاء الگ الگ کر دیں گے تو ظاہر بات ہے کہ قیامت کا ماننا گویا عقلاً ضروری ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ ایک عالم آنا چاہیے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ ہو کر نکھر جائے، اسی کا نام قیامت ہے۔

قیامت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے..... تو قیامت حقیقت میں تخریب کا نام نہیں ہے کہ عالم کو اجاڑ دو، تعمیر کا نام ہے بس اتنا ہے کہ اگر کسی پرانے مکان کی جگہ آپ نیا مکان بنائیں تو قاعدہ ہے کہ اسے ڈھا کر جو اچھے اجزاء ہیں وہ لے لیتے ہیں، بقیہ پھینک دیتے ہیں اور نئی تعمیر کرتے ہیں، کونھی دار پرانے اجزاء پھینک دیتے ہیں اور کارآمد ملے میسر میل لے کر نئی تعمیر بناتے ہیں تو قیامت درحقیقت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے مگر وہ بن نہیں سکتا جب تک کہ اس پرانے عالم کو ڈھانڈا جائے اور ڈھانڈنے کے بعد جو میسر میل عمدہ اور مضبوط ہے وہ تو ادھر لے لیں گے اور جو خراب خستہ ہے اسے پرے پھینک دیں گے۔ اس طرح سے ایک نئے عالم کی تعمیر ہوگی تو قیامت درحقیقت تعمیر کا نام ہے۔ تخریب کا نام نہیں ہے مگر تعمیر ہوتی نہیں جب تک تخریب نہ کی جائے، جب تک ڈھانڈا دیا جائے بوسیدہ عمارتوں کو اس وقت تک جگہ خالی نہیں ہوتی اور نیا عالم نہیں بنتا تو اب جب قیامت کا مقصد واضح ہو گیا کہ پرانی چیزوں کو ختم کر کے نئے عالم کی تعمیر ہو اور اس پرانے میں بھی دودھ الگ کر دیا جائے، دانہ الگ۔ بھوسہ الگ اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کی تخریب کر کے چکنا چور کرو پھر نئے عالم کو بساؤ، یہ ایک ایسی معقول چیز ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور جب یہ معقول ہے تو قیامت کا آنا کیوں غیر معقول اور جب وہ غیر معقول نہیں ہے تو یہ سوال کیسا کہ متنیٰ هَذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت.....؟

نادانی کا سوال..... یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک کاشکار نے بیج بویا اور کوئٹل نکل آئیں اور اس نے کہا کہ مجھے توقع یہ ہے کہ اس کھیتی میں دانہ لگے گا اور ہزاروں روپے ہوں گے دوسرا جھٹلا دے دیتا ہے کہ دانہ نکال کیوں نہیں دیتا۔ یعنی آج تو کھیتی بوئی ہے اور کل کو وہ کہے کہ بھئی لے آنا وہ دانہ کہاں ہے؟ اگر نہیں لاتا تو یہ جھوٹ موٹ باتیں کر رہا ہے تو کاشکار کہے گا یہ احمق ہے۔ نہ اسے کھیتی کی خبر، نہ اسے یہ پتہ کہ کتنے دنوں میں اگتی ہے؟

نہ یہ پتہ کیا کہ کیا انداز ہے کھیتی کا؟

بس اس نے تو دانہ کا نام سن کر آج ہی مانگنا شروع کر دیا کہ اگر تو سچا ہے تو لے دانہ حالانکہ آج ہی تو کوئٹل نکلی ہے اور کوئٹل بھی نکلے گی، چار مہینے میں ذرا بڑا ہوگا، اور کوئی یوں کہے گا کہ لاؤ نا بھئی وہ کہاں ہے دانہ؟ تو کہے گا احمق ذرا ٹھہر جا تھوڑے دن یہ تو طبعی رفتار ہے چھ مہینے میں دانہ پختہ ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں ہوتا تو جو اس چھ مہینے کو نہ مانے اور وہی مہینے بعد مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تو سچا ہے تو دکھلا وہ دانہ۔

وہی کفار کی مثال ہے کہ قیامت اپنے وقت پر آئے گی، انہوں نے جھٹلا کے کہا کہ صاحب آئی ہے تو آج ہی

کیوں نہیں آجاتی تو معلوم ہوا کہ یہ سوال بالکل غیر معقول ہے اور جہالت پر مبنی ہے۔ معقول پسندی پر مبنی نہیں ہے صرف ڈھینگا ڈھانگی ہے ہٹ دھرمی ہے کہ ماننا ہی نہیں ہے پیغمبر کی بات، صرف ادھر ادھر کے سوالات میں الجھا دو، لیکن اللہ کے معاملات میں الجھاوا چلتا نہیں فوراً دودھ الگ ہو جاتا ہے پانی الگ۔

اس لیے کہ دین فطرت کا دین ہے اس کی تمام منقول چیزیں معقول بھی ہیں، جب عقل اور نقل سے ثابت ہو تو دوسرا مجبور ہو کر چپ ہوگا اونا معقول ہی اس کا قائل ہوگا، تو قرآن کریم میں پہلے تو ان کا سوال نقل کیا وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ ۚ کہتے ہیں کہنے والے کہ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت؟ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ تا کب کو آئے گی کوئی تاریخ بتلاؤ یا آج ہی لے آؤ اس قیامت کو، حق تعالیٰ نے ان کو دفع کرنے کے لیے جواب دیا کہ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ اے پیغمبر فرما دیجئے بھی مجھے کچھ خبر نہیں کب آئے گی، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ آئے گی، کب آئے گی، کون سی تاریخ میں آئے گی تو یہ علم اللہ کو ہے، یہ مجھے علم نہیں۔

کلی قیامت کا علم نہ دینا ہی قرین مصلحت ہے..... اور اس کی ضرورت بھی نہیں، اس واسطے کہ اگر قیامت کا علم دے دیا جاتا کہ دس ہزار برس کے بعد آئے گی تو جتنی نسلیں اس سے پہلے ہوتیں وہ تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتیں کہ بھی ہمارے اوپر تو قیامت آئے گی نہیں، جن پر آئے گی وہ بھگت لیں گے لہذا ہم تو آزاد ہیں جو چاہے کریں، حرام ہو حلال ہو، جائز ہو ناجائز ہو، پھر اس درجہ ڈھٹائی میں مبتلا ہوں گے کہ کسی کو عمل صالح انجام دینے کا ہوش نہیں ہوگا۔

سوائے اس کے کہ کچھ فکر اس نسل کو ہو شاید جس کے اوپر قیامت آتی، تو ایک تو اس میں یہ مضرت تھی کہ قیامت کی تاریخ بتلا دینے میں جو تاریخ سے بعید لوگ تھے، وہ بے فکر ہو کو دنیا کی زندگی کو تباہ کر لیتے اور عمل صالح کی انہیں توفیق نہ ہوتی۔ لیکن جبکہ ان کو اتنا علم ہے کہ آئے گی تاریخ کا علم نہیں تو ہر وقت ایک خطرہ لگا ہوا ہے کہ معلوم نہیں کہ کب قیامت قائم ہو جائے، اور جب قیامت آنے والی ہے تو بھی اپنی زندگی کو درست کر لو، اس کی فکر کرو۔ اس کے لیے کچھ سامان کرو، تو علم نہ دینے ہی کے اندر مصلحت ہے کہ انسان نیکی کرنے میں آمادہ رہے، علم ہو جانے کے بعد یا نیکی چھوڑ دیتا یا اتنا خائف ہوگا کہ نیکی سے معطل ہو جائے گا۔

قیامت شخص کا علم دے دیا جاتا تو دنیا کی ترقی موقوف ہو جاتی جیسے ہر انسان کی قیامت!..... حق تعالیٰ کی بڑی حکمت اور مصلحت ہے کہ کسی کو اس کی موت کا علم نہیں دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ۚ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۚ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِمَا تَأْمُرُ ۚ ① کسی نفس کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں کب مروں گا اور کہاں انتقال کروں گا، اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اگر ہر انسان کو مطلع کر دیا جاتا کہ تیری عمر ساٹھ برس کی ہے تو اول تو اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی، ہر روز گنتا کہ آج ایک دن کم ہو گیا، آج دو دن کم ہو گئے۔ پھر نہ نیکی کرتا نہ بدی

کرتا، وہ تو ہر وقت لرزتا رہتا کانپتا رہتا اور زندگی اجیرن ہو جاتی اس کی۔ نہ کھانے میں لطف، نہ پینے میں لطف، تو جب سارے ہی انسان ایسے ہی ہو جاتے تو نظام عالم تباہ ہو جاتا، نہ ترقی کی سوجھتی نہ تمدن کی سوجھتی نہ دنیا کو آباد کرنے کی سوجھتی، بس ہر شخص بیٹھا ہوا کانپتا رہتا لرزتا رہتا، کسی کے پاس جاتے کہ بھی کیوں کانپ رہے ہو؟ کہ بھی میری زندگی کے ایک سوانحیاس دن رہ گئے ہیں دوسرا کہتا کہ میاں میرے تو چالیس ہی رہ گئے۔ تیسرا کہتا میرے تیس ہی رہ گئے تو ایک دوسرے سے دکھڑا رو کر رونے میں گزارتے۔ نہ عمل ہوتا نہ دنیا آباد ہوتی اور منشاء خداوندی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلے اور دنیا سے تمدن بھی چلے۔ اس تمدن میں رہ کر ہی تم دین بنا سکتے ہو اس لیے دنیا کی آبادی ضروری ہے اور وہ ہو نہیں سکتی تھی جبکہ موت کے وقت سے تمہیں غافل نہ بنایا جائے، یہ علم تو رہے کہ آنے والی ہے یہ نہ ہو کہ کب آنے والی ہے، تم سے وقت کا اور تاریخ کا چھپانا ہی مصلحت ہے اسی طرح سے قیامت کلی کے وقت کو چھپانا مصلحت تھا اتنا علم دے دیا جانا ضروری تھا کہ آئے گی قیامت اور یہ جہاں ایک دن ختم ہو جائے گا تو جتنا علم دیا وہ بھی معقول اور جتنا نہیں دیا وہ بھی معقول۔

انکار معقول اپنی ہی تکذیب ہے..... اور ظاہر بات ہے کہ معقول کا انکار وہ اپنی عقل کا بھی انکار ہے وہ اپنے کو بھی جھٹلاتا ہے وہ حق تعالیٰ کی تکذیب نہیں بلکہ اپنی تکذیب ہے وہ تو بری ہے تکذیب سے ان کا ہر دعویٰ سچا ہے تو اپنے کو جھٹلا رہا ہے آدمی جبکہ ایک معقول بھی علم کب آئے گی؟ یہ اللہ کے پاس ہے جب پیغمبروں کو بھی خبر نہیں دی گئی اس کی تو میری اور آپ کی حقیقت کیا کہ ہمیں اس کا علم دیا جائے آگے فرمایا۔ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ علم اللہ کے پاس ہے میں تو ڈرانے والا ہوں۔ اتنا علم مجھے دیا گیا ہے کہ آئے گی قیامت تو اسے پیش کر کے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں کہ جب آنے والی ہے تو کچھ سامان کر لو اس کے لیے۔

عقل کی گمراہی..... جیسے کہ فرمایا گیا ہے کہ ”اَعْمَلْ لِلْذُّنْيَا بِمِقْدَارٍ بِقَاتِكَ فِيْهِ وَاَعْمَلْ لِلْآٰخِرَةِ بِمِقْدَارٍ بِقَاتِكَ فِيْهِ“ ①

دنیا کے لیے اتنا سامان کر، جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے، آخرت کے لیے اتنا سامان کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے۔ دنیا میں رہنا ہے چند دن تو یہاں تھوڑا بھی کافی ہے۔ آخرت میں رہنا ہے ابد الابد تک تو وہاں کے لیے لمبا سامان کرنا چاہیے۔ انسانوں نے الناکر دیا کہ جہاں ابد تک رہنا ہے وہاں کا تو کوئی سامان نہیں کر رہے اور جہاں چند دن رہنا ہے وہاں کے سارے سامان کر رہے ہیں تو یہ عقل کی گمراہی ہے، عقل کا کھوٹ ہے۔ ہونا چاہیے تھا برابر، تو آپ نے فرمادیا کہ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ علم اللہ کے پاس ہے کہ کوئی تاریخ ہے قیامت کی، میں تو ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اس لیے کہ مجھے آنے کا علم دیا گیا ہے وہ علم میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور وہی علم مصلحت بھی ہے، تاریخ اور وقت کا علم تمہارے لیے مصلحت نہیں ہے۔

① یہ حضرت سفیان ثوری کا قول ہے۔ دیکھئے: حلیۃ الاولیاء ج: ۳ ص: ۷۳۔

کفار پر قیامت کے آثار..... اور اس کے بعد فرمایا کہ تم جو مانگ رہے ہو کہ جلدی آجائے قیامت فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا تم کیا سمجھے ہوئے ہو قیامت کو جب آئے گی قریب تو حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے، منہ سیاہ ہو جائیں گے تمہارے۔ کفار کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ بڑی آسانی سے تم مانگ رہے ہو، آجائے قیامت، جب وہ آئے گی تو کیا حال ہوگا تمہارا؟ یہ تھوڑا ہی ہوگا جیسے آج مگن بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہو کہ صاحب! لے آؤ قیامت کو، جب آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے، حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے۔

قیامت آنا فانا ہوگا..... اور وہ آئے گی، یہ نہیں ہے کہ کوئی بڑے مقدمات اس کے چلیں گے کہ چھ مہینے پہلے کچھ اطلاعات دی جائیں اور چھ مہینے پہلے کوئی گڑ گڑا ہٹ ہو۔

وہ تو بیل بھر میں قائم ہو جائے گی وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ ① قیامت کا آنا کَلَمْحِ الْبَصَرِ جیسے نگاہ جھپکتی ہے اتنے میں آجائے گی، کوئی پتہ پہلے سے نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دو آدمی کپڑا سکھا رہے ہوں گے رنگریز، ایک پلہ ایک ہاتھ میں ہوگا ایک پلہ دوسرے کے ہاتھ میں وہ اسے سکھا رہے ہوں گے کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ ایک عورت آنا گوندھ رہی ہوگی گھر میں، اس کا ہاتھ آٹے میں ہوگا کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی، پل بھر میں قائم ہوگی۔

نفع صور کی کیفیت..... صور جب پھونکا جائے گا جو عالم کی تباہی کا سبب ہوگا۔ ابتداء بہت ہلکی آواز ہوگی کسی کو وہم بھی نہیں گزرے گا، کہیں گے کوئی چیز ہے کوئی باجا ہے کوئی چیز ہے بج رہی ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھی شروع ہو جائے گی۔ جب آواز بڑھے گی تو اب لوگ چونکیں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے۔ تو ادھر ادھر دیکھیں گے پھر کچھ کام میں لگ جائیں گے۔ اس کے بعد اس میں درد کی سی آواز پیدا ہوگی۔ تو اب حیران ہوں گے، پریشان ہوں گے، درد بیک دم ہوتا ہے یہ تو درجنی طور پر بڑھتا جا رہا ہے جب زیادہ درد ہوگی تو اب اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگی، جنگلوں سے گھروں میں آئیں گے، گھروں سے جنگلوں میں جائیں گے۔

جانور انسانوں میں، انسان جانور میں، کوئی کسی کو اپنی حالت کی خبر نہیں ہوگی اور اس کے بعد جب وہ انتہائی بڑھے گی۔ حدیث میں ہے کہ جیسے سو گر جوں کے برابر ایک گرج ہوتی ہے مسلسل تو پھر کچھ پھٹنے شروع ہوں گے۔ گرنے شروع ہوں گے۔ اور یہاں تک تو جائیں گے جب زیادہ آواز بڑھے گی تو پہاڑ پھٹنے شروع ہونگے۔ سب چیزیں ریزہ ریزہ ہو کر گڈنڈ ہو جائیں گی، دنیا میں بھی جب کوئی بم پھٹتا ہے تو دیواریں ہٹی معلوم ہوتی ہیں اور کھڑکیوں کے کواڑ ٹوٹ جاتے ہیں۔ انسان بعضے بے ہوش ہو جاتے ہیں تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ اصل میں روح جو ہے یہ اللہ نے پیدا کی ہے قوت ہوائی اور آواز جو ہے یہ بھی ہوائی۔ یہ سانس زیادہ نکلتا ہے۔ وہی آواز کہلاتی ہے۔ تو

① یہ حضرت سفیان ثوری کا قول ہے۔ دیکھئے: حلیۃ الاولیاء ج: ۳ ص: ۱۷۳۔

سانس کے ٹھوکنے کا نام آواز ہے، ظاہر بات ہے کہ جب آواز اور ہوا زیادہ گرجتی ہوگی تو وہ جذب کرے گی چھوٹی ہو کر تو یہ ارواح چونکہ ہوا سے پیدا کی گئی ہیں جب اصل مادہ زوروں پر آئے گا اور وہ آواز اور ہوا ہے تو روجوں کو جذب کرنا شروع کرے گا، روحیں بلیٹی شروع ہوں گی تو عرض قیامت قائم ہوگی صورت پھونکنے سے۔

اور صورت بدترج پھونکنے کا تو جب وہ پھونکا جانا شروع ہوگا اور آواز آئے گی تو یہ نہیں کہ پہلے سے کچھ اطلاعات ہوں گی۔ یا پہلے خطرات ہوں گے۔ وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ..... جتنی دیر میں نگاہ جھپکاتے ہو بلکہ اس سے بھی کم میں ایک دم اچانک آجائے گی جیسے موت انسان کی اچانک ہی آتی ہے، یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے سے اطلاعات دی جائیں، بیمار بھی اگر آدمی ہوتا ہے تو یہ اس کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اگلے منٹ میں موت آجائے گی، چل رہا ہے بیماری جب آتی ہے تو ایک دم نزع شروع ہو گیا، لوگ بھی سمجھ گئے کہ بھی مرنے کا وقت آ گیا تو شخصی قیامت بھی اچانک آتی ہے، کلی قیامت بھی اچانک آئے گی۔ اس کا علم دے دیا گیا۔

عمل کے لیے جتنا قیامت کا علم ضروری تھا وہ دے دیا گیا..... تو فرمایا: انما العلم عند الله اس کے دن تاریخ کا علم تو اللہ کو ہے ہمیں نہیں ہے۔ ہمیں تو اتنا علم ہے کہ وہ آئے گی اور وہ ہی کافی ہے ہمارے عمل کے لیے وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ۔ اور تم جو سہولت سے کہہ رہے ہو کہ لے آؤ اس قیامت کو تو فَلَمَّازَاوَهُ زُلْفَةً سَيِّفَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا جب وہ آجائے گی اچانک تو تمہارے حلیے بگڑ جائیں گے، چہرے بگڑ جائیں گے، تم اس حالت میں نہیں ہو گے جس حالت میں آج ہو کہ سہولت سے مانگ رہے ہو، قیامت کو تم سمجھ نہیں رہے کہ ہے کیا قیامت؟ اس واسطے بڑے اطمینان سے مانگ رہے ہو۔ جیسے آدمی گھبرا کر بعض اوقات کسی مصیبت سے تنگ آ کر موت کی دعا کرنے لگتا ہے تو یہی جواب اس کا ہوتا ہے کہ بیوقوف پتہ نہیں ہے کہ موت کیا چیز ہے۔ وہ یوں سمجھ رہا کہ یہ مصیبت تو ہے بہت بری اور موت بڑی معمولی چیز ہے کہ موت آجائے گی تو مصیبت ٹل جائے گی۔ موت تو سب مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ سب سے بڑھ کر مصیبت ہے یہ تیری حماقت اور غلطی ہے کہ اس مصیبت سے تنگ آ کر موت مانگ رہا ہے غالب شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

اب تو گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے اور مر کر بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے
تو یہ سمجھ لینا کہ موت ہلکی چیز ہے یہ دنیا کی مصیبتیں بڑی ہیں یہ غلط ہے یہ ساری مصیبتیں اولین آخرین کی جمع کردی جائیں تب ایک موت بنتی ہے، تو موت سرچشمہ ہے سارے مصائب کا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موت کی کیفیت کے بارے میں سوال..... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا ملک الموت سے کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں کیفیت کیا بتلاؤں جو جس پہ گزرے گی وہ جانے گا مگر میں ایک مثال کے ذریعے کچھ فہم کے قریب کر دوں گا،

اصلیت نہیں سمجھا جاسکتا وہ تو گزرنے کی چیز ہے۔

تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سمجھو کہ انسان کے بدن میں تار ڈالا جائے ایڑی سے لے کر چوٹی تک اور جتنی رگیں بڑیاں ہیں اتنی شاخیں ہوں اس تار میں اور ہر شاخ ایک ایک رگ میں پیوست کی جائے اور ان شاخوں میں کانٹے بھی ہوں لوہے کے، وہ کانٹے دار تار ہر ہر رگ کے اندر پیوست (ہو) تو اب گویا ایک تار انسان کے اندر گیا ہوا ہے اور اتنی شاخیں ہیں جتنی رگیں ہیں، پٹھے ہیں اور ہر تار میں ہر شاخ میں کانٹے ہیں اور وہ پھٹ گیا، اس کے بعد اس کو کھینچنا شروع کرو تو یوں معلوم ہوگا کہ رگ رگ درد سے بھر پور ہے بھری ہوئی ہے۔

اور گویا ساری رگیں کھینچ آئیں گی اوپر، فرمایا کہ یہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اور جان کنی کی اور جیسے رگ رگ کے اندر کانٹوں دار تار ڈال کر اسے کھینچا جائے اوپر تو جو اذیت ہے۔ محسوس کر سکتا ہے آدمی وہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اذیت کی، تو موت کوئی آسان چیز تھوڑا ہی ہے کہ ذرا سی مصیبت میں گھبرا کر آدمی موت مانگنے لگے موت کوئی آسان بات نہیں ہے عظیم چیز ہے۔

مؤمن و کافر کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت کی صورت..... حدیث میں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا ملک الموت سے کہ تم کس شکل میں آکر روح قبض کرتے ہو۔ فرمایا کہ مؤمن کے آگے تو نہایت اعلیٰ اور باجمال صورت ہے اس میں میں آتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر جمال نہیں ہو سکتا، اور کفار کے آگے انتہائی بھیانک شکل میں آتا ہوں کہ جس سے بڑھ کر ڈراؤنی صورت نہیں ہو سکتی، کہا مجھے دکھلا دو وہ صورت، کہا آپ تحمل نہیں کر سکیں گے مگر اصرار کیا تو حدیث میں ہے کہ اس شکل میں آئے جس سے مؤمن کی روح قبض کرتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اگر اللہ کوئی بھی نعمت نہ دے مؤمن کو صرف یہ شکل دکھلا دے تمہاری تو سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے، اس کو دیکھ کر قلب میں فرحت اور سرور بھر جاتا ہے، اس کے بعد کہا کہ اب وہ شکل بھی دکھلاؤ، کہا آپ تحمل نہیں کریں گے، کہا نہیں دکھلاؤ۔ اس شکل میں آئے تو دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ برداشت نہیں کر سکے۔ اس کے بعد ہوش آیا تو کہا کہ اگر کوئی بھی مصیبت نہ آئے کافر پر، فقط یہ شکل دکھلا دی جائے تو ہزار مصیبتوں کی یہ ایک مصیبت ہے۔

اس کی کچھ شکل حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ ملک الموت جس شکل میں آتے ہیں، کفار کے آگے وہ ایک عجیب بھیانک شکل ہے، ایک شخص کی، سیاہ فام اور ہر بدن پر جو رواں ہے وہ مثل نیزوں کے ہے اور ہر نیزے میں ایک شکل بنی ہوئی ہے انسان کی شکل یا جانور کی۔

تو اس طرح سے گویا لاکھوں شکلیں صورتیں ایک شخصیت میں نمایاں ہوتی ہے جتنی گویا ڈراؤنی شکلیں ہیں ہیبت ناک وہ سب سامنے ہوتی ہیں۔ تو وہ دیکھ کر خود ہی خون خشک ہو جاتا ہے وہ مستقل مصیبت ہے۔ تو بہر حال موت کوئی سہل چیز نہیں الایہ کہ حق تعالیٰ ہی سہل فرمادیں کسی کے لیے، اسے سب کچھ قدرت ہے۔

ساری شدت بھی گزرے اور محسوس بھی نہ ہونے دے۔

موت کے آسان ہونے کی صورت جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی صورت فرمائی، فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ ”مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ“ ① جو شخص اس کا خواہش مند ہے کہ میں کب ملوں اپنے اللہ سے ہر وقت منتظر ہے شوق لگ رہا ہے عالم آخرت میں جانے کا اور:-

خرم آں روز کزین منزل ویراں برویم تادر میکده شاداں وغزل خواں برویم

ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ ہم غزل خواں، شاداں و فرحاں اپنے پروردگار سے ملیں گے اور اس اجڑے ہوئے عالم کو چھوڑیں گے تو جن لوگوں کے دلوں میں شوق ہے اللہ سے ملنے کا۔ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے یہاں بھی شوق ہے، وہ بھی منتظر ہیں کہ یہ بندہ کب ملے مجھ سے آئے تو ادھر سے بھی شوق ادھر سے بھی شوق، مرنے کا جب وقت آتا ہے اس مؤمن پر وہ شوق و غلبہ کے ساتھ قلب پر هجوم کرتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح جلدی پہنچوں، لگا ہوا ہے اس شوق میں، اس شوق کے اندر اتنا منہمک ہوتا ہے کہ ساری تکلیفیں بھی گزر رہی ہیں اور کچھ بھی نہیں گزر رہی ہیں، اسے پتہ بھی نہیں چلتا سب کچھ گزر رہا ہے مگر وہ اتنا شوق میں غرق ہے کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کیا تکلیف گزر رہی ہے اور کچھ محسوس بھی ہوتا ہے تو نعمتیں سامنے آتی ہیں کہ وہ کہتا ہے اس سے دو گنی بھی مصیبت گزر جائے یہ سامنے نعمتیں موجود ہیں، اب میرے پاس آنے والی ہیں پل بھر کی بات ہے۔

اخروی نعمتوں کے حصول میں دنیوی مصائب کو روح از خود قبول کر لیتی ہے مثلاً آپ کو ایک گورنمنٹ یہ کہے کہ یہاں سے پانچ میل پر جوائنٹن ہے وہاں ایک پانچ لاکھ کا بنگلہ آپ کے لیے گورنمنٹ نے تیار کیا ہے اور اس میں خزانہ بھی ہے دس لاکھ روپے کا، ابھی پہلی گاڑی سے جاؤ اور اس پر جا کر قبضہ کر لو، آپ خوش خوشی چلے ریل میں گئے تو وہاں بیٹھنا تو بجائے خود کھڑے ہونے کی جگہ نہیں، تھرڈ کلاس میں جا کر کھڑے ہوئے اور اتنا هجوم کہ ہڈی اور پسلی چور ہو جائے تو انتہائی تکلیف میں ہے مگر شوق لگا ہوا ہے کہ پانچ منٹ کی بات ہے، اب گئے اور دس لاکھ کے بنگلے پر قبضہ ہو گیا تو ذرہ برابر آپ کو تکلیف کا احساس نہیں ہوگا، کہیں گے چاہے اس سے دو گنی آجائے بس پانچ منٹ کی تو بات ہے، اب گئے اور جائیداد ملی لاکھوں کی۔ تو جیسا کہ ایک دنیا کی ایک معمولی جائیداد کے شوق میں بڑی سے بڑی تکلیف آپ بھگت جاتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا تو ابد الابد کی نعمت اور وہ نعمتیں جن کا یہاں کبھی تصور نہیں ہو سکتا، وہ سامنے کی جائیں تو لاکھوں من بھی اگر تکلیف کا بوجھ پڑا ہوا ہوگا بھاری نہیں ہوگا کہ منٹ بھر کی بات ہے، اب یہ نعمتیں مل رہی ہیں۔

① الصّٰحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ، ج: ۴

اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ مؤمن کی قبض روح کے وقت ملائکہ علیہم السلام جنت کے کچھ تحائف لے کر آتے ہیں، وہاں کے پھل اور وہاں کے کپڑے اور وہاں کے کفن اور خوشبوئیں، ایک دم روح اس طرح سے گذر جاتی ہے کہ بس یوں کہتی ہے کہ میں پہنچ جاؤں پلی بھر میں چاہے ہزار کانٹوں میں سے گزرنا پڑے۔

تو خود قبول کرتی ہے اس تکلیف کو کہ جتنی بھی تکلیف آئے مجھے بھگتی ہے اس لیے کہ سامنے وہ نعمت موجود ہے، تو اس وقت مشاہدہ ہوتا ہے نعمت کا، انبیاء علیہم السلام اور اکمل اولیاء اللہ ان کو آنکھ سے دیکھنے سے زیادہ یقین ہوتا ہے اللہ کے وعدوں پر، ہر وقت ان کے سامنے وہ نعمتیں ہیں۔ اس واسطے کوئی تکلیف ان کے یہاں تکلیف نہیں ہوتی، ہزاروں ابتلاءات، ہزاروں مصیبتیں انبیاء علیہم السلام پر گزرتی ہیں اور ان کے قلوب مبارکہ پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ کے وعدہ ہائے حق سامنے ہیں اس لیے کہ یہ چند دن کی تکلیف ہے اب وہ نعمتیں آرہی ہیں۔

تو انبیاء اپنی ایمانی قوت سے وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھتے اور ہم آنکھ سے دیکھ کر جتنا یقین کرتے ہیں اس سے زیادہ قوی یقین انبیاء کا اللہ کے وعدوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ساری تکالیف جھیل جاتے ہیں، ورنہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون ہے تکلیفیں اٹھانے والا، لیکن ان کے قلوب پر ذرہ برابر اثر نہیں، قلب مگن اور مطمئن، اس لیے کہ وعدہ ہائے خداوندی اندر موجود ہیں۔ تو بہر حال مؤمن باوجودیکہ موت اتنی شدید ہے باوجودیکہ اتنی ایذا دہ ہے لیکن مؤمن اس سے گھبرائے گا نہیں، خوشدلی سے برداشت کرے گا، اگر خدا نخواستہ کوئی وعدہ سامنے نہ ہوتا تو مرنا بھی موت ہو جاتا۔ لیکن چونکہ نعمتیں موجود ہیں اب تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس واسطے وہ کہتا ہے کہ کوئی پرواہ نہیں چلو، چاہے مصیبتوں میں کانٹوں میں جائیں مگر وہ نعمت ہے ابھی میں پہنچ جاؤں گا دو منٹ بعد، اس لیے ہوتی بھی ہے تکلیف اور نہیں بھی ہوتی، بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی شدید قسم کا آپریشن کیا جائے کسی کا تو پہلے کلوروفارم سوگھا کر بے ہوش کر لیتے ہیں اس کے بعد اس کا سر کاٹ دو، پیر کاٹ دو، اسے کچھ خبر نہیں، تو گزر رہی ساری تکلیف مگر احساس باطل ہو گیا کہ جس سے اس کی اذیت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے موت کی اذیت جب گزرے گی تو محبت خداوندی کا کلوروفارم سوگھا دے گی اس میں وہ اتنا موثر و مگن ہوگا کہ اس تکلیف کا ادنیٰ برابر اسے احساس بھی نہیں ہوگا اور محسوس بھی ہو تو بھادیں بھی نہیں ہوں گی تو نعمتوں کے آگے کیا چیز ہے تکلیف تو پھر ان شاء اللہ مؤمن کے لیے راحت ہے باوجود اذیت کے۔

کیفیت موت اور قوت ایمانی کا سہارا..... حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا کہ یہ کیفیت ہے کہ آدمی کو بیچ میں رکھ کر دو پہاڑوں کو ملا دیجئے۔ اس میں جوازیت ہے بس وہ موت میں ہے۔ اور بعض انبیاء نے مثال دی کہ جیسے ایک نہایت ہی جابر قسم کا قصائی ہو ذبح کرنے والا اور بھی بڑا قوی اور ایک بکری کا بچہ اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ کانٹ چھانٹ کے اس کے کٹڑے کٹڑے کر ڈالے۔ بس یہ حالت ہے موت کی ملک الموت کے سامنے، اس طرح سے ہوگا اس وقت آدمی، تو باوجود اس اذیت کے وہ جو قوت ایمانی ہے وہی

سنجالتی ہے۔ بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے تو تکلیف معلوم بھی نہیں ہوتی وہی قوت ایمانی وہاں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی قبر میں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی حشر کے اندر سنبھالے گی، ہر جگہ تکلیف آدمی جھیل جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف رکھتے تھے مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے ہولناک حالات بیان فرما رہے تھے، تو لوگ لرز رہے تھے، کانپ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ تمام لوگ لرزاں، ترساں اور آپ سے باہر ہو گئے ہیں۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہماری عقل بھی صحیح سالم ہوگی قبر میں، فرمایا ہاں عقل رہے گی، کہا تو اب کوئی فکر کی بات نہیں بس منٹ لیں گے۔ تو عقل سے مراد یہ عقل معاش نہیں تھی جو موثر بنانے کی عقل ہے، ہوائی جہاز بنانے کی عقل ہے عقل معاد تھی جو آخرت کی عقل ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان بھی رہے گا، فرمایا رہے گا۔ تو بس اب جھیل جائیں گے۔

قوتِ ایمانی سب چیزوں کو ہلکا کر دیتی ہے تو اصل چیزِ ایمان ہے، دنیا کی مصیبتوں میں بھی جب آدمی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، تو کل اور صبر سے تو مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اللہ جانے جو کچھ ہوگا، ہو رہے گا، مجھے تو خدا پر بھروسہ ہے تو دنیا کی مصیبتیں بھی اللہ ہی کا یقین اور ایمان سہل کرتا ہے۔ موت کی مصیبت یہی ایمان سہل کرے گا قبر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا حشر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا۔ اور ان سب سے گزر کے اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائے گا وہی جو راحتوں کا ٹھکانہ ہے جس کا نام جنت ہے۔ تو کافر کے لیے یہاں سے لے کر وہاں تک اور ابد تک مصیبت ہی مصیبت ہے اس لیے کہ وہ جو مصائب میں ڈھارس دینے والی چیز ہے وہ اس نے کھودی، وہ ایمان ہے جب وہ نہ رہا تو اب سہارا کوئی باقی نہیں اس واسطے اس کے لیے ہر تکلیف تکلیف ہے مؤمن کے لیے کوئی تکلیف تکلیف نہیں اس کو فرمایا کہ جو قیامت مانگ رہے ہو تم جب وہ آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے ہو کس ہوا میں اس واسطے کہ وہ قوت تو ہے نہیں جس سے سہارا لیتے تم۔

یعنی ایمان کی قوت وہ تو ہے نہیں اور جب وہ نہیں ہے تو مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں حلیے بگڑ جائیں گے، کہاں مانگ رہے ہو اور جس میں ایمان ہے وہ کبھی نہیں مانگے گا قیامت کو۔ وہ کہے گا جب آئے گی آئے گی میں تو اللہ کے وعدے کو سچا جانتا ہوں کہ آنے والی ہے، مجھے تو عمل صالح کرنا ہے، وہ نہ مانگے گا قیامت، فرمایا کہ جب وہ آجائے گی تو ”سَيَسْأَلُ عَنْ جُودِ الَّذِينَ كَفَرُوا“ کفار کے حلیے اور چہرے بگڑ جائیں گے..... اور اس وقت کہا جائے گا کہ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدْعُونَ وہ جو مانگتے تھے یہ ہے، اب اسے بھگتو، وہ آگئی قیامت، لے لو اسے۔

اپنی فکر اول ہے..... قُلْ اَرَاَ يُعْصِمُ اِنْ اَهْلَكْنِيَ اللّٰهُ تَوْخَلِّفَ سَوَالُوْنَ سَے کفار لانا چاہتے تھے عقائد تو پہلا تو یہی سوال کر دیا مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ . کہاں ہے صاحب وہ وعدہ؟ اس کا تو جواب دے دیا گیا تو اس کے بعد جب اس میں چپ ہوئے تو ایک دوسرا سوال شروع کر دیا وہ یہ کہ صاحب! جب قیامت آئے گی نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے، تو فکر کی کیا بات ہے تم بھی ہلاک ہو گے اگر تم پر قیامت آئی، تو تم ہی ہو گئے تو کیا.....

اس کا جواب دیا حق تعالیٰ نے فرمایا پیغمبر سے کہ تم کہہ دو کہ بھی! مجھے یا میرے ساتھیوں کو اگر اللہ ہلاک کریں یا مجھ پر رحم کریں اور ہلاک نہ کریں کوئی بھی صورت ہو تمہیں کیا فائدہ اس سے؟ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہوں یا میں اور میرے ساتھی نجات پائیں تو تمہیں کیا فائدہ پہنچا تم پر جو گزندہی ہے گزرے گی اپنی فکر کرو، ہماری فکر میں کیوں پڑے ہوئے ہو، تم ہم چاہے ہلاک ہوں چاہے نجات پائیں تم تو اپنی فکر کرو،...

اس لیے کہ قیامت تو آنے سے ٹلے گی نہیں اور جب وہ آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی۔ تو اب کوئی شخص یوں کہے کہ چونکہ تم پر آئے گی اس واسطے مجھے کوئی فکر نہیں اس سے زیادہ کون احق ہے۔ بھی تیرے اوپر بھی آئے گی، دوسرے پر کچھ بھی گزرے تو فرمایا قُلْ اَرَاۤءَ يُنۡصَرُ اِنْ اَھْلَکَیۡنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ یَھْلَکُ مَعِیَ کَیۡدَ اللّٰہِ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو یا ہلاک کرے اَوْ زَحَمَنَا یا ہم پر رحم کرے فَمَنْ یُجِیۡرُ الْکَافِرِیۡنَ کفار کو عذاب سے بچانے والی کون سی چیز ہے؟ اگر ہمیں ہلاک ہی کر دیا تو تم بچ گئے عذاب سے؟

تو تم نے اپنی فکر کرنے کے بجائے ہماری فکر شروع کر دی کہ نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے، بھی ہم رہیں نہ رہیں تو تمہارا کیا بگائے گا، تم اپنی فکر کرو تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی سوال مہمل ہے اور یہ سارے سوال اسی لیے ہوتے ہیں کہ عقیدہ کو رلا ملا کر ختم کر دیں، ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال کر اور ضائع کر دیں، اس چیز کو قرآن میں ایک ایک چیز کو پکڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ دیجئے کہ....

اعتقاد صحیح اور عمل صحیح ہی کا رآمد ہے..... قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اَمۡنًا بِہٖ وَعَلِیۡہِ تَوَكَّلۡنَا۔ ہم تو رحمن پر ایمان لے آئے ہیں اور اس پر بھروسہ کر لیا ہے اور اس کی وجہ سے ہم عمل صالح کر رہے ہیں..... اور ہمیں اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ راحتیں ملیں گی اس عالم میں، تو ہم مطمئن ہیں، تم اپنی فکر کرو تم کس چیز پر اطمینان رکھتے ہو، نہ ایمان نہ تم میں توکل اَمۡنًا بِہٖ وَعَلِیۡہِ تَوَكَّلۡنَا۔ ہم تو ایمان بھی لے آئے، عقیدہ بھی درست ہو گیا، توکل کیا تو عمل درست ہو گیا تو ہمارا ایمان بھی درست، عمل بھی درست، ہمیں یقین ہے کہ انجام ہمارا نیک ہوگا، اب تم اپنی فکر کرو نہ ایمان، نہ توکل تو تم کہاں جاؤ گے؟ باتیں بنانے سے عذاب ٹلنے والا نہیں، ایمان لانے سے ٹلنے والا ہے اور تم باتیں بنانا کے چاہے ملا دو عذاب کو، اس طرح نہیں ٹلا کرتا "فَسَتَعْلَمُوۡنَ مَنْ هُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ" عنقریب تم جان لو گے کہ کون گمراہی میں تھا اور کون حق پر تھا... جب نتائج سامنے آئیں گے تو پتہ چل جائے گا تو دنیا میں تو ہم نے تمہیں عقل سے بھی سمجھا دیا۔ مشاہدہ سے بھی سمجھا دیا، عقل صحیح سے بھی سمجھا دیا، اب اگر نہیں سمجھتے مشاہدہ ہی چاہتے ہو تو عنقریب وقت آنے والا ہے، تمہیں پتہ چل جائے گا کون ہدایت پر تھا، کون ضلالت پر، جب برے نتائج آئیں گے سامنے تو سمجھ میں آجائے گا کہ تم گمراہی میں تھے اور جب ہمارے سامنے اچھے نتائج آئیں گے تو ہم بھی سمجھ جائیں گے کہ ہم ہی حق پر تھے.....

دنیا کے ساز و سامان کی حیثیت..... اب آگے تمہیں زیادہ سے زیادہ بھروسہ اس دنیا کے سامانوں پر ہے،

اول تو یہ وہاں نہیں جائیں گے لیکن اگر وہاں نہ بھی جائیں یہ تو بعد کی بات ہے۔ دنیا میں بھی رہنا تو کوئی لازمی بات نہیں ہے۔ سامان ہوتے ہیں اور پھر چھین لیے جاتے ہیں ہزاروں امیر غریب بنتے دیکھے گئے، ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے ہیں، ہزاروں امراء ہیں کہ دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور چین میسر نہیں، حالانکہ دولت کا مقصد یہ ہے کہ چین ہو تو بہت سے دولت مند ہیں چین نصیب نہیں ہیں، کوئی گھن لگ گیا قلب پر، کوئی فکر لگ گئی تو لاکھوں روپیہ رکھا ہوا ہے مگر وہ جو گھن لگا ہوا ہے ساری زندگی کری کری ہو گئی۔

اس سے تو جن سامانوں پر تم بھروسہ کر رہے ہو، آخرت تو بعد کی چیز ہے دنیا میں بھی نفع دینے والے نہیں کہ سامان ہوتے ہیں اور چین میسر نہیں ہوتا۔

سکون کا راستہ ایک ہی ہے..... چین اگر آتا ہے تو پھر وہی ایک رستہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرے آدمی، توکل اور اعتماد اور ایمان، چین اسی سے ملے گا۔ ”اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ“ ① اللہ کے ذکر سے ہی دل چین پاسکتے ہیں۔ سامانوں سے چین نہیں پاسکتے۔ سامان ہیں وہ خود بے چینی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ جتنا زیادہ ہوگا سامان، زیادہ مصیبت پڑے گی وہ کسی عربی کے شاعر نے کہا ہے۔

زیادہ دولت، زیادہ مصائب.....

اِذَا اَذْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً وَّانْ اَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيرًا هُمُومُهَا

”دنیا جب جاتی ہے تو حسرتیں چھوڑ کر جاتی ہے برسوں روتا ہے آدمی اور جب آتی ہے تو سینکڑوں مصیبتیں ساتھ لاتی ہے“ کہیں محافظ کی فکر، کہیں سنتری کی فکر کہیں چور کی کہیں ڈاکو کی ایک مصیبت میں مبتلا اور ایک وہ ہے کہ بقدر ضرورت ہے کھانے پینے کو تو؟ ”کس نیاید بخانہ درویش کہ خراج زمین و باغ بدہ“ درویش کے گھر کوئی نہیں آتا کہ بھی ٹیکس ادا کرو، خراج ادا کرو، وہ اپنا بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔

تو جہاں دولت زیادہ ہے مصائب بھی زیادہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والی نہیں بچ میں جواب دے جاتی ہے بے وفائی کرتی ہے تو ایسی بے وفا پر تم بھروسہ کیے ہوئے ہو آخرت کے بارے میں، آخرت تو بعد میں ہے تم دنیا تو سنبھال لو وہ سنبھلنی لازمی نہیں ایک چیز چھین جائے اللہ کی طرف سے تو ساری زندگی ختم۔

اللہ کے مقابل دعویٰ بڑی نادانی ہے..... وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمْنَا فَمَنْ يُجِيرُ الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابِ اَلَيْمٍ ۚ قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ اَمْنًا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسْتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي صَلَاتٍ مَّيِّبَةٍ ۚ قُلْ اَرَأَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ ۚ

فرمایا کہ ہم مثال دیتے ہیں پانی کی، پانی کنوؤں میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ پانی کو نیچے کر دیں، خشک سالی کے زمانے میں ایسا ہوتا ہے کہ کنوئیں خشک ہو جاتے ہیں، پانی نیچے چلا جاتا ہے، ”اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا“۔ اگر

گہرائیوں میں پانی چلا جائے تو تم کھدائی کر کے نہیں پہنچ سکتے۔ ”فَمَنْ يَأْتِيَكُمُ بِمَاءٍ مُّعِينٍ“ پھر پانی لانے والا تمہارے واسطے کون ہے، یہ سامان تھا اس پر بھروسہ تھا، اللہ نے ذرا پچاس گز نیچے کر دیا اب بیٹھے ہوئے ہیں، نہ کھدائی کر سکتے ہیں، اور اگر کھودیں گے اور نیچا ہو جائے گا، اور نیچا تختِ اللہ کی تک، تو کھودنے سے رہے وہ کھودے جاؤ تو کھودتے رہو گے، مرتے رہو گے زندگی دینے والا کوئی نہیں۔ تو ایک پانی کی مثال دی کہ اسے اگر گہرائیوں میں اتار دے تو زندگی کا کوئی سامان نہیں دریا خشک ہو جائیں اور قحطِ سالیوں کے زمانے میں ہوتا ہے کہ آسمان تو برسنا بند کر دیتا ہے، دریاؤں میں خشکی آ جاتی ہے، کنوئیں نیچے اتر جاتے ہیں تو ہزاروں آدمی مر جاتے ہیں تو ایک پانی پر جب اس کا قبضہ نہیں ہے..... وہ آدمی بھروسہ کرے گا کہ قیامت میں اچھی طرح سے ہوں گا اور قیامت آجائے تو میں منٹ لوں گا، تم ان چیزوں سے نمٹو گے جو تمہارے ہر وقت موجود، اگر آفتاب کے اندر گرمی نہ رکھی جائے تو ساری دنیا برف کی طرح جم کر رہ جائے۔ اس کی حرارت ہے جس نے پگھلا رکھا ہے۔ ہوا اگر منٹ بھر کے لیے روک دی جائے سانس لینے بند ہو جائیں تو زندگی ختم ہو جائے۔ تو آگ نہ رہے جب ختم آدمی، پانی نہ ہو جب ختم، ہوا نہ رہے جب ختم، مگر اور چیزیں تو خیر اوپر کی ہیں پانی تو ہر وقت کا ہے جس کو کھودا اور نکال لیا اس کو نیچے اتار دیں تب اس پر قبضہ نہیں تو آخر کون سی چیز پر تمہارا قبضہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہے ہو کہ صاحبِ لے آؤ قیامت کو جیسے معلوم ہو بڑا لشکر جرار ان کے ہاتھ میں ہے کہ قیامت آئے گی یہ مقابلہ کریں گے اسے دھکیل کر پرے کر دیں گے تم اپنی عمر کے ایک سال کو دھکیل سکتے نہیں، زندگی جاتی ہوئی روک نہیں سکتے۔ آتی ہوئی تو نہیں روک سکتے تو کون سی طاقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے دو اللہ سے لڑنے کا ارادہ کیا تو ”قُلْ أَوْءَيْتُمْ إِنِّي أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيَكُمُ بِمَاءٍ مُّعِينٍ“

فرمادیجئے کہ اگر اس حالت میں تم صبح کرو کہ پانی کنوؤں کے نیچے اتر جائے تو پانی لانے والا کون ہے تمہارے پاس، تو یہ ایک مثال ہے سارے عناصر کو اس پر قیاس کر لو اور پانی پر آگ کو بھی ہوا کو بھی مٹی کو بھی جب ہاتھ پلے کچھ نہیں تو دعوے مت کرو، غالب اور توئی خدا کے سامنے جھک جاؤ یہی پناہ کی صورت ہے لڑنا صورتِ پناہ کی نہیں۔ بس دعا کیجئے، ایک سورت ختم ہو گئی، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

حورہ

۱۶/۱۲/۱۱

وقت اشراق۔

افادات علم و حکمت

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہ العزیز مدارس
کی صورت حال پر ایک فکر انگیز انٹرویو، پس منظر

آج سے بیس سال قبل ۱۳۹۴ھ (مطابق ۱۹۷۴ء) میں جب احقر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ مدینہ پاک تشریف لائے تو احقر کو بھجود اللہ ان کی خدمت میں حاضری اور صحبت کی سعادت میسر آئی، اس موقع پر محترم و مکرم جناب قاری بشیر احمد صاحب دامت برکاتہم کے مکان پر (جو اس زمانہ میں پاک و ہند کے بزرگوں کی اقامت گاہ تھی) حضرت رحمہ اللہ سے مدارس عربیہ کی موجودہ صورتحال پر مجھے ایک انٹرویو ٹیپ کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی، خیال تھا کہ اسے کاغذ پر منتقل کر کے ”البلاغ“ میں اشاعت کے لیے دوں گا، مگر تقدیر خداوندی کہ یہ انٹرویو کاغذ پر پوری طرح منتقل نہ کیا جاسکا اب بیس سال گزر جانے کے بعد یہ کیسٹ دوبارہ ہاتھ میں آئی اور اسے سننے کا موقع ملا تو اس کی اہمیت اور افادیت کا کچھ اندازہ ہوا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نالوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہی نہیں بلکہ جملہ اکابرین دیوبند کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کے مزاج اور مذاق کے امین بھی تھے، اور تقریباً ساٹھ سال تک وہ دارالعلوم دیوبند جیسی نامور دینی درس گاہ کے مہتمم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ اس لیے مدارس کی صورت حال اور ان سے متعلق اصلاحی تدابیر پر حضرت قاری صاحب کی رائے گرامی انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور بیس سال کی مدت گزرنے کے باوجود اس انٹرویو کی تازگی، نافعیت اور شفا بخشی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، بلکہ مدارس کی موجودہ فضا میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس انٹرویو کو کیسٹ سے کاغذ پر منتقل کرتے وقت تحریری انداز اختیار کرنے کے بجائے کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ اور فقرے بعینہ نقل ہوں تاکہ ان کے مفہوم اور تاثر میں کوئی فرق نہ پائے۔ امید ہے کہ متعلقہ حلقوں میں اسے پوری توجہ سے پڑھا جائے گا اور اساتذہ و تلامذہ اس کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل طے کر سکیں گے۔ (واللہ الموفق)

احقر: محمود احمد عثمانی

۵-۵-۱۴۱۵ھ

نصابِ تعلیم

س: کیا جناب مدارس کی موجودہ صورتحال سے مطمئن ہیں؟

ج: جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابلِ اطمینان ہے یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے، جزوی ترمیم اور تغیر البتہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، البتہ اصول وہی ہیں جو نہیں بدل سکتے، جیسے صحاح ستہ، قرآن کی تعلیم، باقی جتنے فنونِ آلیہ ہیں، مبادی ہیں ان میں جزوی طور پر تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ نوعی طور پر نصاب وہی باقی رہا، اس لیے جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابلِ اطمینان ہے۔ طرزِ تعلیم..... دوسری چیز ہے اصل میں طریقہ تعلیم وہ تھوڑا سا بدل گیا ہے۔ اور میں سمجھ رہا ہوں کہ اس کا اثر استعدادوں پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانے کے حضرات اساتذہ ایجاز اور اختصار کے ساتھ نفسِ مطلب عبارت پر منطبق کر کے دلوں میں ایسا ڈال دیتے تھے کہ کتاب ذہن نشین ہو جاتی تھی، اور جب طالب علم نے کتاب دیکھی مطلب سامنے آ گیا، اب لوگ اس مسئلہ کو حیلہ بنا کے اپنی معلومات پیش کرتے ہیں، لمبی لمبی تقریریں، اس سے استعداد خراب ہوتی ہیں، ایک تو یہ فرق پڑ رہا ہے جن سے استعدادیں کمزور ہو رہی ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب سے یہ عوامیت کے نام پر جمہوریت چلی اس میں سارے عوام الناس آزاد ہو گئے، طلبہ بھی بہر حال جوان ہیں، لڑکے ہیں ان پر بھی اثر پڑا، وہ جو عوام کا یا خوردوں (چھوٹوں) کا بزرگوں سے ربط تھا اس میں کمی ہو گئی۔ اس سے علمی قوت میں کمی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی چیز یہ ہے کہ خورد کا تلمیذ کا تعلق استاذ سے قوی ہو، اس میں ادب بھی ہو، تعظیم بھی ہو، اعتماد کامل بھی ہو، اس میں جتنی کمی پڑے گی، استعداد میں اتنی ہی کمی پڑے گی۔

تو موجودہ حالات کی وجہ سے ایک اخلاقی کمی ہو رہی ہے اور ایک طرزِ تعلیم کے بدلنے سے نفسِ تعلیم (اصل تعلیم) میں کمی ہو رہی ہے تو اس کا استعدادوں پر خراب اثر پڑ رہا ہے، باقی جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ بحمدِ اللہ قابلِ اطمینان ہے، اور مدارس میں عامۂ جو بڑے مدارس ہیں ان میں اساتذہ بھی ذی استعداد ہیں اور چھوٹے مدارس میں تو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔

معلم کا اثر..... س: بعض حلقوں کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ مدارس کے نصاب میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، اس کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

ج: یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اور ہم نے اس پر عملدرآمد بھی کر لیا ہے جدید قسم کے جو علوم و فنون جن سے

عقائد کے اوپر اثر پڑ رہا ہے خواہ وہ غلط فہمیوں کی وجہ سے پڑے مگر پڑ رہا ہے۔ جیسے مبادیات سائنس ہیں، فلسفہ جدید ہے، ہیئت جدیدہ ہے اس کو لوگ ذریعہ بناتے ہیں دینیات کی تردید کا، حالانکہ وہ ذریعہ ہیں تقویت دین کا، سائنس جتنی بڑھے گی میں سمجھتا ہوں اسلام کو اتنی تقویت ملے گی، اس لیے کہ اسلام نے عقائد و نظریات کے لحاظ سے جو دعویٰ کیے ہیں ان کے دلائل سائنس مہیا کر رہی ہے، تو دعویٰ ہم کرتے ہیں مگر دلائل وہ لوگ مہیا کرتے ہیں جو اس کے منکر ہیں، اللہ تعالیٰ انہی کے ہاتھ سے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے سائنس ”منافی تو کیا ہوئی“ معین و مددگار ہے..... خرابی درحقیقت ماحول کی ہے، کیوں کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں جو غلط نظریات اور غلط فکر لیے ہوئے ہے اس لیے ان فنون کا اثر بڑا برپا ہوتا ہے لیکن اگر صحیح پڑھانے والے ہوں، تو وہی ذریعہ بن جائیں تقویت دین کا.... آخر یہ قدیم فلسفہ منطق ہیئت ریاضی پڑھاتے ہیں اس کا برا اثر کیوں نہیں پڑا اور موجودہ فنون کا کیوں پڑ رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں کہ دین ان میں پہلے سے راسخ ہوتا ہے اس لیے عقائد پر ذرا برابر برا اثر نہیں پڑتا اور موجودہ زمانے میں عموماً پڑھانے والے وہ ہیں کہ نہ ان کی اخلاقی حالت درست، نہ ماحول درست، اس کا اثر برا پڑتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ علم کا اثر برا ہے حالانکہ وہ دراصل عالم کا اثر ہے جو برا پڑ رہا ہے ورنہ اسلام میں تنگی نہیں، اسلام نے تو ہر علم فن کی تحقیق کی اجازت دی ہے سوائے مخصوص چند علوم کے کہ جن سے روکا ہے کیوں کہ وہ علوم نافع نہیں ہے۔ عام طور سے فرمایا گیا ہے: کَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْحَكِيمِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا ① ”کہ حکمت کی بات دانائے گمشدہ چیز ہے، جب وہ اسے پالے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے“۔ ان جیسی روایتوں نے بتلایا ہے کہ علم بہر حال جہل سے بہتر ہے۔ سوائے ان علوم کے کہ جو مضر ہیں کہ ان کا عام علم ہی رکھنا فضول ہے کیوں کہ وہ فی الحقیقت ضائع ہیں۔

تو علم کسی بھی فن کا ہو وہ برا اثر نہیں ڈالتا، وہ معلم کا اثر پڑتا ہے۔ معلم اگر صاحبِ قال، صاحبِ حال، صاحبِ اخلاق ہے تو اسی سے اخلاق پیدا کر دے گا اور اگر خود بد اخلاق ہے، بد فکر ہے تو وہ قرآن و حدیث سے بھی بد فکری ذہن میں ڈالے گا، اس لیے نئے علوم میں سے اگر اس حد تک کے لیے جائیں کہ جس حد تک وہ معین بننے ہوں دین کے حق میں یا جو ذریعہ بنے ہوئے ہیں دین پر اعتراضات کا تو میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ، انہیں ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ طلبہ کی اخلاقی حالت..... س: حضرت! آپ نے طلبہ کی اخلاقی حالت کا ذکر فرمایا ہے تو ہم یہ بات اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ مدرسہ اور خانقاہ کوئی علیحدہ علیحدہ چیز نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک ہی چیز ہے، مدرسہ خانقاہ بھی، نہ تھا، طلبہ کو تعلیمی طور پر بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاق بھی درست کئے جاتے تھے، تو اب یہ صورتحال کیوں بدل گئی اور اس کی اصلاح کی کیا تدابیر ہیں؟

ج: یہ چیز بالکل صحیح ہے کہ قدیم زمانہ میں مدرسہ ہی خانقاہ ہوتا تھا جس کے اوپر تعلیم کا پردہ تھا..... نام تو نہیں آتا تھا کہ ہم تصوف سکھلا رہے ہیں یا طریقت سکھلا رہے ہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرزِ عمل، ان کا کردار، کریکٹروہ

تھا کہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر خود بخود اخلاق درست ہو جاتے تھے۔ تو اب ظاہر بات ہے کہ کچھ تو اساتذہ میں بھی کمی ہے، اور کمی کی بناء پر جو کچھ بھی ہو، مگر صورتحال یہ ہے کہ عام طور پر اساتذہ کی تکمیل اور تزکیہ اخلاق کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جتنے نئے اساتذہ ہیں ان کی توجہ ادھر نہیں ہے۔

رابطہ کا فقدان..... س: حضرت کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان اب ربط نہیں رہا؟.....

ج: میں تو سمجھتا ہوں کہ فتن اس کی بنیاد ہیں، حالات اتنے بگڑ چکے اور مزاج اتنے فاسد ہو چکے ہیں کہ وہ جو ایک رحمان اور ایک عقیدت اور ایک محبت اساتذہ سے ہوتی تھی وہ نہیں ہے، کچھ تو حالات کا اثر ہے۔

اور مثل مشہور ہے ”کچھ لو ہا کھوٹا، کچھ لو ہا کھوٹا“، کمی تھوڑی بہت اساتذہ میں بھی آئی ہے، ان کو جس درجہ کا معیاری ہونا چاہیے نئے اساتذہ میں وہ چیز کم ہے تو طلبہ پر اثر پڑنا لازمی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اساتذہ چند سالوں کے بعد پرانے بن کر کسی اونچے مقام پر پہنچ جائیں، لیکن ابتدائی حالت اساتذہ کی، نوجوان اساتذہ کی وہ نہیں ہے جو ان کے اساتذہ کی تھی۔

اساتذہ کرام کا معیار..... ہم لوگوں نے تعلیم پائی، اس وقت اساتذہ علمی اعتبار سے بھی معیاری تھے اور تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے بھی معیاری تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولانا نور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) پر اتباع سنت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کے طرز عمل کو دیکھ کر ہم مسئلہ معلوم کر لیتے تھے، اور وہی مسئلہ نکلتا تھا جو ان کا طرز عمل تھا، اس درجہ گویا وہ منہمک تھے اور ہمہ وقت انہیں فکر آخرت ضرور رہتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دوپہر کو چھوٹی مسجد میں آ کے قیلو کہرتے تھے تو عموماً گھنٹے پیٹ میں دے کر لینا کرتے، یعنی سڑک کے، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ پیر پھیلا کے لیٹے ہوں، تو میرے خسر مولوی محمود صاحب رامپوری مرحوم، طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب کے ساتھ چھوٹی مسجد ہی میں رہتے تھے تو ابتداء میں وہ یہ سمجھے کہ امر اتفاقی ہے۔ لیکن جب دیکھا کہ عادت ہی یہ ہے تو انہوں نے ایک دن پوچھا کہ آپ پیر پھیلا کے کبھی نہیں سوتے فرمایا کہ ”بھائی پیر پھیلا کے سونے کی جگہ قبر ہے، دنیا نہیں۔“ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ہر وقت فکر آخرت سوار تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ ہے، جلالین شریف ہم نے ان کے یہاں پڑھی آیت یہ آئی کہ ”لَیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى“ آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے سعی کی ہے، یہ نہیں کہ کسی غیر کی سعی اس کے کام آجائے..... ادھر تو یہ آیت اور ادھر روایت میں ایصال ثواب ثابت، جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی سعی کام آگئی، اب آیت اور روایت میں ایک قسم کا تعارض، جب یہ آیت پہنچی تو حضرت مفتی صاحب نے کتاب میں مثبت پہلو میں مطلب سمجھا دیا اور بعد میں یہ فرمایا کہ میں اس میں الجھا ہوا ہوں اور ابھی رفع تعارض کی صورت سمجھ

میں نہیں آئی کہ حدیث بتلاتی ہے کہ دوسرے کی سعی کا رآمد ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ قطعاً کارآمد نہیں، تو فرماتے تھے کہ کتابیں دیکھیں، رجوع کیا کتابوں کی طرف، مگر تشفی نہیں ہوئی، ایک دن گھر تشریف لائے، رات کا وقت، گرمی کا زمانہ، چار پائی پر لیٹے تو خیال یہ بندھ گیا کہ تجھے ایک آیت میں شک ہے، اگر اسی حالت میں موت آگئی تو آیت خداوندی میں شک لے کر جائے گا تو تیرا ایمان کہاں رہے گا؟ یہ تو ”ریب“ کی کیفیت ہے۔ پس یہ جذبہ آنا تھا کہ اسی وقت کھڑے ہو گئے اور پیدل سفر شروع کر دیا گنگوہہ کا کہ حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس جا کر گفتگو کروں گا پہلا جذبہ تو اس سے معلوم ہوا فکر آخرت کہ وہ (اس علم کو) محض ریسرچ یا تحقیق نہیں سمجھتے بلکہ اپنی آخرت سمجھتے تھے، جب آیت میں ایک قسم کا شک ہے تو وہ ریب ہوا، اور اگر ایمان میں ذرا سا بھی ریب ہو تو ایمان کی بقاء مشکل ہے۔ یہ جذبہ تھا اصل میں محض علمی تحقیقات نہیں تھیں، پیدل سفر کر لیا گنگوہہ کا، ساری رات پیدل چلتے رہے، حالانکہ پیدل سفر کرنے کی عادت نہ تھی، آخر شب میں گنگوہہ پہنچے، صبح کی نماز کا وقت تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہمارے تھے، انہوں نے سلام کیا فرمایا: کون؟...

عرش کیا کہ زین العرین فرمایا کہ اس وقت! کیا رات آئے تھے؟ کہا کہ رات بھر سفر کیا بس ابھی پہنچا ہوں، فرمایا ایسی کیا ضرورت پیش آئی جو ساری رات سفر کیا۔ انہوں نے کھڑے کھڑے وہ اشکال پیش کر دیا کہ حضرت، یہ ایک اشکال ہے کہ آیت میں نفی ہے کہ کسی کی سعی کسی کام نہیں آئے گی اور احادیث میں اثبات ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کے کام آجائے گا ایصال ثواب کی صورت میں۔ یہ تعارض رفع نہیں ہو رہا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے وہیں کھڑے کھڑے فرمایا کہ ”لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى“ میں سعی ایمانی مراد ہے۔ یعنی ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا یعنی نجات کا ذریعہ نہیں بنے گا، عمل کی نفی نہیں، تو حدیث ثابت کر رہی ہے عمل کو کہ عمل کا فائدہ پہنچے گا اور آیت نفی کر رہی ہے سعی ایمانی کی کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا، اس میں کوئی تعارض نہیں تو یہاں ایمان مراد ہے وہاں عمل مراد ہے۔ آیت میں جس چیز کی نفی کی جا رہی ہے حدیث میں اس کا اثبات نہیں اور حدیث جسے ثابت کر رہی ہے قرآن میں اس کی نفی نہیں تو تعارض کہاں سے آگیا؟.....

تو مفتی صاحب یہ کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے یہ معلوم ہوا کہ جیسے علم کا ایک دریا میرے اندر سے پھوٹ گیا، تو یہ غزیر (وسیع) اور گہرا علم تھا ان اکابر کے ایک ایک لفظ میں۔

کیا مدارس کا موجودہ نظام بدعت ہے؟..... حضرت ناٹوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت حدیث میں بدعت کی ممانعت فرماتے ہوئے کہا گیا ہے کہ من احدث فی امرنا هذا ما لیس منہ فہو رد۔ ① جو ہمارے دین میں احداث کرے اور دین کے ذوق کی چیز نہ ہو تو وہ چیز مردود ہے۔“

① الصحيح لمسلم، کتاب الاضیاء، باب نقض احکام الباطلة ورد محدثات الامور ج ۳ ص ۳۳۳ رقم: ۱۷۱۸۔

اس پہ کسی نے کہا کہ پھر یہ مدارس بھی مردود ہونے چاہئیں، یہ قرن اول میں کہاں تھے؟ اور یہ مدرسوں کے لیے گھنٹوں کا تعین اور گھنٹا بجنا یہ کہاں تھا؟ اور یہ جماعت بندی (کلاس بندی) یہ سارے بدعات و محدثات ہیں تو حدیث کی رو سے ممنوع ہونے چاہئیں حضرت نے ایک مختصر سا جواب دیا، فرمایا کہ: ”اِحْدَاثٌ فِی الدِّینِ کی ممانعت ہے، ”اِحْدَاثٌ لِّلدِّینِ کی ممانعت نہیں“ ان دو لفظوں میں (مسئلہ) کھول دیا، یعنی یہ احداث جو ہے، لَتَقْوِیَہُ الدِّینِ، لِإِعَانَةِ الدِّینِ، لِنُصْرَةِ الدِّینِ“ ہے عین دین کے اندر اضافہ نہیں ہے کسی مدرسہ میں صبح کے گھنٹے مقرر ہیں کسی میں شام کے، یہ نہیں ہے کہ اس کو دین سمجھ رہے ہیں کہ یہی چار گھنٹے ہونے چاہئیں، دوسرے نہ ہوں۔ ایک تدبیر ہے، ایک معالجہ ہے، تو احداث للدين اور فی الدین کے فرق سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سارے اشکالات رفع فرمادیئے۔

اکابر کے علوم کی گہرائی جس کا اب فقدان ہے..... اسی پر مجھے یاد آیا کہ مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کوئی عرب ہندوستان پہنچ گئے، تو ہندوستان میں عربوں کی آمد و رفت اس زمانہ میں نہیں تھی، کوئی عرب آگیا تو لوگ چیلوں کی طرح سے اس کے پیچھے دوڑتے تھے کہ عرب صاحب، عرب صاحب! اور عقیدت و محبت سے ہر ممکن طرح مدارت کرتے تھے، ان عرب صاحب کا بھی خیر مقدم ہوا، شافعی تھے، اتفاق سے کسی مسجد میں جہاں سارے جاہل جمع تھے، انہوں نے نماز پڑھی اور رفع یدین کیا جیسا شوافع کرتے ہیں، وہاں سارے جاہل جمع تھے، وہ سمجھ کوئی بد دین ہے اسے نماز پڑھنی نہیں آتی، تو نماز کے بعد تو تو میں میں شروع ہوئی حتیٰ کہ ان عرب پر ہاتھ ڈالا اور انہیں پیٹ دیا اب وہ مہمان تھے، مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کو خبر ہوئی ہے، غصہ آیا، فرمایا کہ اول تو زد و کوب! پھر عرب سے آیا ہوا مہمان جو واجب تنظیم ہے، حکم دیا کہ آج سے ہماری ساری مسجدوں میں رفع یدین ہوا کرے گا، ترک رفع ختم، اب صاحب، تمام مسجدوں میں رفع یدین شروع ہو گیا، کئی دن گزرے تو کہیں رفع یدین اور کہیں ترک رفع، ایک عجیب فتنہ پھا ہوا۔ (ہنس کر فرمایا) اور حقیقی معنی میں رفع یدین شروع ہو گیا، ہاتھ پائی، مار کٹائی میں بھی رفع یدین ہی ہوتا ہے۔ غرض بہت فتنہ ہوا تو لوگ گئے حضرت شاہ عبدالنزیہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ حضرت! وہ آپ کے بھتیجے نے بڑا فتنہ برپا کر دیا اور حکم دے دیا ہے کہ ہر مسجد میں رفع یدین ہوگا تو بڑی مصیبت ہوگئی اور فتنہ پھیل گیا ہے، آپ انہیں سمجھائیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی! اسماعیل کی ذہانت اور ذکاوت سے تم واقف ہو، وہ میرے سے زیر نہیں ہو سکے گا، وہ ذہین اور طباع ہے، میں ایک چیز بیان کروں گا وہ بیس احتمال نکال کر مجھے ہی بند کر دے گا، خود اس کی اصلاح کیا ہوگی۔ اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ خاندان میں شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب عظمت کرتے ہیں، چھوٹے اور بڑے، حالانکہ وہ سب سے چھوٹے بھائی تھے، مگر بڑے بھائی بھی ان کے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ان کی عظمت کرتے تھے، چالیس برس اعتکاف کیا ہے اکبری مسجد میں اور سوائے قرآن کے اور

کوئی شغل نہیں تھا، اور جس دن ان کی وفات ہوئی ہے تو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر منکشف ہوا کہ دلی کے سارے قبرستانوں سے آج عذاب قبر اٹھالیا گیا ہے، ان کی آمد کے احترام میں، تو اس درجہ کے تھے شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

تو شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے لوگوں نے کہا کہ آپ کے بھتیجے نے فتنہ برپا کر دیا ہے، کہا بلاؤ اسماعیل کو۔ خیر مولانا اسماعیل شہید حاضر ہوئے، فرمایا: میاں اسماعیل! تم نے حکم دیا ہے کہ رفع یدین ہوا کرے؟ کہا جی۔ رست! فرمایا کیوں؟ کہا حضرت یہ سنت اتنی مردہ ہو چکی تھی کہ اس کے عمل درآمد کرنے پر لوگ پیٹے جانے لگے اور حدیث میں ہے: مَنْ أَحْيَا سُنَّتِي عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِي فَلَهُ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيدٍ۔ ① جس نے میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو زندہ کیا تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ تو میں نے احیائے سنت کیا ہے، اس درجہ مردہ ہو گئی یہ سنت کہ عمل کرنے پر لوگ مارے پیٹے جانے لگے، اس لیے میں نے حکم دیا کہ یہ سنت زیر عمل آجائے۔ فرمایا کہ میاں اسماعیل! ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم نے حدیث کچھ سمجھ کر پڑھی ہوگی، تمہیں تو مس بھی نہیں فہم حدیث سے، کیا مطلب ہے احیاء سنت کا؟

فرمایا کہ احیاء سنت کا مطلب یہ ہے کہ سنت ختم ہو کر بدعت اس کی جگہ لے لے گا، وہ احیاء سنت ہے جو ماتہ شہید کے برابر ہے، اور یہاں تو سنت کے مقابلہ میں خود سنت موجود ہے، رفع یدین اگر سنت ہے تو ترک رفع بھی سنت ہے اگر ایک امام ادھر گیا ہوا ہے، ایک ادھر، احیاء سنت کا یہ موقع کون سا ہے؟ احیاء سنت وہاں ہے کہ سنت ختم ہو اور بدعت اس کی جگہ آجائے، یہاں کون سی بدعت ہے؟ کہا حضرت! مجھ سے غلطی ہوئی، پھر ساری مسجدوں میں خود کہتے پھر رہے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، لوگ اسی طرح ترک رفع کے ساتھ نماز پڑھیں...

تو یہ بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ ان اکابر کے یہاں لمبی تقریریں نہیں ہوتی تھیں ایک جملہ سے مسائل کا فیصلہ ہوتا تھا اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ استعداد نہایت قوی اور استحضار ہو علوم کا..... اب محنتیں تو ہیں نہیں قوی بھی ویسے نہیں، استحضار وہ نہیں ہے علوم کا، جو کچھ کتاب میں دیکھا وہ صبح کو بیان کر دیا، وہ نقل اور سرور وایت ہوتا ہے جو وہ قلبی کیفیت ہے وہ شامل نہیں ہوتی، اس لیے استعدادوں پر برا اثر پڑا ہے، تو نہ تو نصاب میں خرابی ہے اور نہ کسی اور چیز میں، بلکہ کچھ طرز تعلیم کی، اور کچھ اساتذہ کے ترقی نہ کرنے کی، کہ وہ پڑھ رہے ہیں کہ بس پڑھا دیں گے، پیشہ سمجھ لیا ہے، یہ وجہ ہو رہی ہے استعدادوں کی کمی کی۔

طلبہ کی سیاسیات میں شرکت کے آثار..... اور ادھر طلبہ، کہ ملک کے حالات جمہوریت کے نام پر ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ جو یکسوئی تھی وہ باطل ہو گئی، ہر طالب علم کو فکر کہ تھوڑا سا سیاسیات میں شریک ہو اور تھوڑا سا اجتماعیات میں۔ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "أَلْعِلْمُ لَا يُعْطِيكَ بَعْضُهُ حَتَّى تُعْطِيَهُ"

ٹلک ”علم اپنا بعض اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنا کل اسے نہ دے ڈالو، اب تو تم جزو دو اور اس کا کل لینا چاہو تو یہ ہوگا کیسے تو طالب علم کہیں ادھر متوجہ، کہیں ادھر متوجہ، کہیں معاش اور کیا کیا، اسی میں ضمناً اس نے علم کی طرف بھی توجہ کر لی تو استعداد بنے گی کہاں سے؟....

اس لیے میں نے عرض کیا کہ ”کچھ لو ہا کھوٹا کچھ لو ہا کھوٹا“ کچھ اساتذہ آگے نہیں بڑھنا چاہتے، کچھ طالب علموں میں محنت کی کمی، اب وہ قصور بتا دیتے ہیں نصاب کا..... حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب ہمارے استاذ رحمۃ اللہ علیہ بہت مختصر گو تھے، کسی نے ان سے ذکر کیا کہ حضرت! نصاب میں کچھ تغیر تبدیل ہونا چاہیے، تو جیسے ان کی عادت تھی، ایک لمبی سی ”ہوں“ کر کے فرمایا: دیکھو تعلیم کے سلسلہ میں تین چیزیں ہیں۔ 1 ایک اساتذہ 2 ایک تلامذہ 3 ایک نصاب تعلیم تو اساتذہ کی جماعت تو ہے بڑوں کی جماعت، چھڑی ہاتھ میں، کوئی بولے تو اسی وقت گردن زدنی قرار پائے اور طلبہ اس زمانے کے، بھائی وہ بھڑوں کا چھتہ ہیں، کوئی انہیں چھیڑے گا تو وہ آکے لپٹ جائیں گے، آدمی ڈرتا ہے، بس صاحب اب بے چارہ بے زبان نصاب رہ گیا ہے، اسی میں کتر بیونت کرتے رہو، نصاب میں یہ کمی ہے، یہ کمی ہے۔

کمی ہے استاد میں اور طالب علم میں، نصاب میں کمی نہیں ہے، مگر بے زبان چیز ہے، اسی پر سب مشق آزمائی کرتے رہتے ہیں، تو یہ ہے اصل میں بنیاد..... بہر حال کچھ جدید معلومات کی تو ضرورت ہے کہ طلباء نابلد نہ رہیں۔ فکر معاش نے علمی ترقی روک دی..... س: حضرت! تیسرا سوال یہ تھا کہ محسوس یہ کیا جا رہا ہے کہ جو طلباء مدارس سے فارغ ہوتے ہیں ان میں کام کرنے کا وہ جذبہ نہیں جو پہلے موجود ہوتا تھا باطل سے ٹکرانے، خود اعتمادی اور خود آگے بڑھ کر کام کرنے کی جو صلاحیت تھی وہ اب نظر نہیں آتی، اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج: اول تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: النَّاسُ كَابِلٌ مِائَةِ لَاتٍ كَاذٌ تَجِدُ فِيهَا رَاحِلَةً. ① سوا نوٹوں کی ایک جماعت ہے، دانتوں ہیں سارے، تو سواری کے قابل ایک ہی نکلتا ہے۔

تو ان پچاس ہزار طلبہ میں یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی جو ہر قابل نہ ہو، لیکن سو میں سے ایک آدھ نکلے گا تو وہ نہ ہونے کے برابر دکھائی دے گا تو اب بھی ایسے نکلتے ہیں جو اپنی استعداد پر کام کرتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے چونکہ وہ ننائوے ہیں جو اپنا بیج بن کر پھوٹ رہے ہیں، تو ان کی قدر و منزلت بھی جاتی رہتی ہے جو کام کرنے والے ہیں، مگر ہیں، اگر نہیں ہیں تو اس وقت (دین کا) یہ کام کیسے چل رہا ہے، بحشیں بھی ہیں، مناظرے بھی ہیں، باطل پرستوں کا مقابلہ بھی ہے، لوگ کام کر رہے ہیں اور اس میں نوجوان بھی کرنے والے ہیں، مگر بہت کم ہیں، گنے چنے۔

زیادہ تر اس کی بنیاد یہ ہے کہ معاشی حالات ایسے کمزور ہو چکے ہیں کہ طالب علم کو پڑھنے کے زمانے میں فکر یہ

① الصحيح لمسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب قول النبی ﷺ الناس کابل مائة لات تجد فيها راحلة ج: ۴

ہے کہ جلدی سے پڑھوں تاکہ گھر کا بندوبست کر سکوں باپ ضعیف ہو گیا، ماں کا انتقال ہو گیا، فلاں گزر گیا، چار پیسے کماؤں تو بچوں کو کھلاؤں، فکر تو یہ رہتی ہے تو وہ ترقی کہاں سے کرے؟ اکثر و بیشتر اسی میں مبتلا ہیں۔
پست فکر بھی علمی ترقی نہیں کر سکتا..... اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مدارس میں آنے والے بلند فکر کم ہیں، زیادہ تر وہ ہیں جن کی فکری حالتیں پست ہیں، انہوں نے دیکھا کہ روٹیاں ادھر بھی ملتی ہیں آٹھ نو برس یہاں کچھ مل جائے گا۔ وہ نصاب پر عبور تو کر لیتے ہیں مگر جتنی دماغ کی افتاد ہے، ساخت ہے اس سے باہر تو نہیں جاسکتے، وہ جو، ان کی پست فکری ہے وہ علم کو بھی پست بنا دیتی ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں بتلاؤں کہ اس علم کی ذلت کا کون سا وقت ہوگا؟ عرض کیا گیا، فرمائیے فرمایا کہ جب اراذل ناس اس کو حاصل کرنے لگیں جو خود پست ہیں اور پست فکر ہیں، وہ جب عمل کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کی ہستی علم میں نمایاں ہوگی اور علم بھی پست نظر آئے گا، ورنہ بلند فکر اور اونچے طبقہ کے لوگ اگر علم حاصل کریں تو وہ آج بھی وہ کام کریں گے جو پچھلے کرتے تھے۔
علم کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا، پیدا شدہ بلندیوں کو اونچا کر دیتا ہے..... س: حضرت! جو بلند فکر ہیں اور اچھی سمجھ والے ہیں اور اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے بچوں کو ادھر نہیں بھیجتے، ان طلبہ کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہے.....؟

ج: بات یہ ہے کہ دنیا غالب آچکی ہے، پہلے فکر آخرت غالب تھی اب جو بلند فکر ہیں وہ یہ چاہتے ہیں حکومت میں کرسی ملے، عہدہ ملے، وہ سارے ادھر متوجہ ہیں، ادھر آتے ہیں کم، ادھر وہ لوگ آتے ہیں جو ادھر کی استعداد نہیں رکھتے انہوں نے سوچا کہ چلو دین ہی استعداد بناؤ، مدارس میں تو بھائی دین ہے جو آئے گا ہم سکھا دیں گے، وہ جس درجہ کا بھی ہے، لیکن سلف کے زمانہ میں پرکھتے تھے کہ اسے کس علم سے مناسبت ہے، جس فن سے مناسبت ہوتی تھی اس میں ترقی دیتے تھے تو وہ طبعی رفتار ہوتی تھی اس لیے اس علم و فن کے اندر وہ ماہر ہو جاتے تھے۔

میں جب افغانستان گیا تو سردار نعیم وزیر معارف (تعلیم) تھے، انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ صاحب، ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا، مگر ہماری تمنا نہیں پوری نہیں ہوتی، میں نے کہا صاحب! وہ کیا؟
انہوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی عالم دین کو وزیر خارجہ بنائیں، وزیر داخلہ بنائیں، وہ چلتا نہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب تو میں بعد میں دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔
میں نے جواب میں دوسری لائن اختیار کی ورنہ سیدھا جواب یہ تھا کہ بھائی آج کل کی سیاست تو مستقل فن ہے، جو اسے حاصل کرے گا وہ چلے گا، مگر میں نے یہ جواب اختیار نہیں کیا،..... میں نے کہا آپ کی یہ تمنا میرے خیال میں کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ”کیوں؟“ میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جو افغانستان سے طلبہ بھیجتے ہیں وہ معلوم نہیں کون سے جنگل سے پکڑ کے بھیجتے ہیں، مھصل دماغ کے، کہ دس برس چائیس ان کا ذہن بدلنے کے لیے پھر دس

برس چاہئیں انہیں پڑھانے کے لیے، اگر آپ وزارت کے خاندان، شاہی خاندان اور شاہی کنبہ کے افراد بھیجتے تو ہم آپ کو دکھلاتے کہ علم کیا چیز ہے؟ اب آپ نے جنگل سے پکڑ کر بھیج دیئے جنگلی اور پہاڑی لوگ، ان پر علم کیا اثر کرے گا؟ صدر عالم کہنے لگے۔ جناب مولانا حق می فرمائید، حق می فرمائید۔

اس کے بعد میں نے کہا، میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کیسے ہیں آپ کی نظر میں؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر اور ہندوستان میں انہوں نے وہ وہ کام کیا، میں نے کہا کہ وہ دارالعلوم کے فاضل ہیں کسی یونیورسٹی سے گریجویٹ نہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کیسے ہیں؟ کہنے لگا سبحان اللہ! بہت اونچا مقام ہے، میں نے کہا دارالعلوم کے طالب علم ہیں کسی یونیورسٹی کے فاضل نہیں ہیں۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو پاکستان چلے گئے؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر ہیں میں نے کہا وہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں، میں نے دس بیس نام گنوا دیئے تو میں نے کہا کہ یہ لوگ بلند فکر تھے، تو علم نے ان کی فکر کو اور زیادہ بلند کر دیا، تو علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا، جو پیدہ شدہ چیز ہے انہیں اجاگر کر دیتا ہے۔ اب اگر کسی میں پستیاں ہی بھری ہوئی ہوں۔ وہ اجاگر ہو جائیں گی بلندیاں بھری ہوئی ہوں وہ اجاگر ہو جائیں گی، علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرے گا، تو صدر عالم نے کہا بالکل حق بات ہے۔

اور اس کے بعد کہنے لگے کہ اب ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شاہی گروپ اور وزارتی گروپ کے ہر سال گیارہ طلبہ بھیجیں گے، میں نے کہا پھر ہم آپ کو دکھلائیں گے کہ ان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مگر اب مجھے فکر یہ ہوئی کہ وہ جو بادشاہی خاندان کے آئیں گے ان کی خادمی کون کرے گا؟ ان کا تمدن، ان کی معاشرت علیحدہ اور یہاں غریب طلبہ کی جگہ ہے تو ان کی مہمانداری کے لیے سینکڑوں روپیہ چاہئے، کوئی وزیر کا بیٹا ہوگا کوئی بادشاہ کا بیٹا..... یہ فکر پڑی تو میں نے یہ فقرہ کہا کہ ہم ان کو اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے؟ کہنے لگے نہیں نہیں آپ کو خرچ اٹھانے کی ضرورت نہیں حکومت برداشت کرے گی۔ میں نے دل میں کہا اور مجھے کیا چاہیے تھا میں نے اسی لیے کہا تھا..... اس کے بعد میں نے کہا نہایت مبارک خیال ہے، ہم ان کو تعلیم دیں گے اب ہماری ایک اور درخواست ہے، گیارہ لڑکے ہم آپ کے یہاں بھیجیں گے، اس لیے کہ آپ کے یہاں مختلف زبانوں کے مختلف کالج ہیں، افغانستان میں نجات کالج خالص جرمنی زبان کا کالج ہے، استقلال کالج یہ خالصی فرانسیسی زبان کا کالج ہے، کاکول پے طب یہ خالص ترکی زبان کا کالج ہے، اور انگریزی زبان کا مستقل کالج ہے، تو میں نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب مبلغ تیار ہوں تو غیر مالک میں جا کر تبلیغ کریں مگر زبان سے عاجز ہیں آپ کے یہاں کالج ہیں تو گیارہ لڑکے آپ بھیجیں گے اور گیارہ لڑکے ہم بھیجیں گے آپ انہیں زبان سکھلائیں گے، کہنے لگے ہم مستقل بندوبست کریں گے اور اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے اور نصاب بھی مختصر مقرر کر دیں گے کہ زیادہ وقت بھی نہ لگے اور زبان میں مہارت پیدا ہو جائے، یہ ہمارا اور ان کا معاہدہ ہو گیا مگر وہ جنگ چھڑ گئی تو سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

طبعاً ہی فکری قوت کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں..... تو بات مجھے اس بات پر یاد آئی تھی کہ ذی استعداد تو پیدا ہوتے ہیں مگر استعداد ہی گھٹی ہوئی ہو تو اس کا کیا علاج، فکری طاقت ہی کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں، تو زیادہ تر وہ آتے ہیں جو فکر کے پست ہیں، اور جو بلند فکر ہے وہ ہزار میں ایک دو آتا ہے مگر جو آجائے تو وہ بلند ہو کر چل پڑتا ہے۔ جیسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ۔^① ”جو جاہلیت میں اونچا تھا وہ اسلام میں بھی آکر اونچا رہے گا۔“ جو وہاں نیچا تھا وہ یہاں بھی پست رہے گا، دین سب میں آجائے گا، مگر بلند فکری وہ خلقی چیز ہے، یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے، اب سوائے اس کے کہ لوگ محنت کریں، وعظ اور ترغیب ترہیب سے ہوتا نہیں، آپ لاکھ وعظ کریں کہ بھائی تم آؤ نہیں آئیں گے، ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ وہ مجبور ہو کر علم دین سیکھنے کے لیے آئیں اور ادھر جھلکیں جیسے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا۔

فضلاء کرام کی اپنی مادر علمی سے وابستگی کی ضرورت..... عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں عام طور سے علماء بے چارے بے کس تھے، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، لوگ دنیا داری کی طرف، عہدوں کی طرف متوجہ ہو گئے تو علم دین کوئی حاصل نہیں کرتا تھا، حکومت کے عہدے اور اقتدار نگاہوں میں تھے، رہ گئے بے چارے علماء۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ چونکہ خود عالم تھے، انہیں احساس ہوا، انہوں نے نہ ایک فرمان جاری کیا نہ کوئی نصیحت نامہ لکھا، ایک دن حکم دیا کہ ہم وضوء کریں گے، فلاں والی ملک ہمیں وضوء کرائے۔ تو ان صاحب نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی، بادشاہ کو وضوء کرائیں گے، وہ آفتاب لے کر پہنچے۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، وضوء کتنی سنتیں ہیں؟ واجبات کتنے ہیں؟ اب انہوں نے کبھی وضوء کیا ہو تو بتائیں، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حیرت ہے، آپ ایک بڑے والی ملک ہیں، ہزاروں پر حکمرانی کر رہے ہیں اور مسلمان ہیں آپ کو یہ پتہ نہیں کہ وضوء میں فرائض کتنے ہیں۔ بس صاحب اتنا ان سے کہہ دیا..... اگلے دن کہا فلاں امیر ہمارے ساتھ روزہ افطار کریں، وہ افطار میں شریک ہوئے تو اورنگ زیب نے کہا روزہ میں مفسدات کتنے ہیں؟ مکروہات کتنے ہیں؟ انہیں کچھ پتا نہیں، تو کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے والی اور تمہیں یہ پتہ نہیں؟.....

کسی سے کچھ اور پوچھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب مولویوں کی تلاش شروع ہو گئی کہ مسئلہ معلوم کرو، اگر بادشاہ سلامت یونہی پوچھتے رہے تو بڑی تذلیل ہو جائے گی ہماری، صاحب مولوی کسی قیمت پر نہیں ملتے، مولویوں نے غرے شروع کر دیے صاحب ہم پانچ سو سے کم تنخواہ نہیں لیں گے، ایک نے کہا ہزار سے کم نہیں لیں گے انہوں نے کہا کہ بھائی دو ہزار دیں گے مگر تم آؤ تو، سارے مولوی لگ گئے، تو وعظ و تلقین سے کچھ نہ ہوتا، تدبیر تھی ارباب اقتدار کی، تو اگر کوئی صورت ایسی بن جائے کہ حکومت ادھر توجہ کر کے ایسے قوانین بنادے کہ وہ مجبور ہو جائیں تب تو چلے گی یہ بات، محض وعظ و نصیحت سے نہیں چلے گی۔

① الصحيح للبخاری، کتاب احادیث الانبياء، باب ام كنتم شهداء ج ۳: ص ۱۲۳۵ رقم: ۳۱۹۴۔

حکومت کی ادنیٰ توجہ سے اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں دین آسکتا ہے..... س: حضرت جو طلبہ دینی مدارس سے نکلتے ہیں وہ نکلنے کے بعد متفرق ہو جاتے ہیں، متفرق ہو کر اپنی اپنی جگہ کام میں لگتے ہیں، بعض دینی کام میں لگ جاتے ہیں بعض دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں، جو دینی کام کرتے ہیں وہ بھی متفرق طور پر کرتے ہیں کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہر مدرسہ سے جو طلبہ نکلیں وہ ایک خاص نظام کے تحت اجتماعی طور پر کام کریں؟ اور مدرسہ کی طرف سے انہیں وقتاً فوقتاً ہدایات ملتی رہیں، جو مختلف مسائل ملک میں پیش آتے رہیں، ان کے بارے میں مدرسہ کی جانب سے، مدرسہ کے اکابر کی جانب سے ان کو ہدایات جاری ہوتی رہیں اس طرح وہ سارا کارسار نظام لگا بندھا ہوگا، اور اس سے یہ فائدہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ طلبہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس نہ ہوں گے جب وہ ایک نظام کے تحت ہوں گے تو ان کی مدد بھی کی جاسکتی ہے۔ انہیں مساجد و مدارس میں بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے اور دوسرے کاموں میں بھی، اس تجویز کے بارے میں جناب کی رائے کیا ہے؟...

ج: یہ صحیح ہے ایسا ہونا بھی چاہیے مگر کس طرح سے ہو؟ دو ہی قوتیں ہیں جن سے کسی ایک مرکز پر جمع کیا جاسکتا ہے، ایک تو قوت قہری کہ اقتدار ہاتھ میں ہو اور آپ ملک بھر میں کسی کو منہنے نہ دیں، حکمرانی کی قوت ہو تو یہ قہری قوت ہے۔ ایک قوت ارادت ہے کہ عقیدت مندی کسی شخصیت سے اتنی ہو کہ وہ اشارہ کرے تو سب اس کے اشارے پر چل پڑیں، اس وقت دونوں چیزوں کی کمی ہے ایک کا تو فقدان ہے، قوت قہری تو ہے نہیں آپ کے ہاتھوں میں، اب رہ گئی قوت ارادت اور قوت عقیدت اس میں خال خال افراد ملتے ہیں، بعض تو وہ ہیں کہ مدارس سے تعلق نہیں، شخصی طور پر لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور مدارس میں بھی ہیں ایسے لوگ مگر خال خال..... تو جب تک کہ کوئی قوت نہ ہو جو مرکز سے بیٹے نہ دے، خواہ قوت معنوی ہو یا مادی، اس کے بغیر یہ کام نہیں چل سکتا۔ آپ کے یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کام شروع کیا گیا وفاق المدارس میں اس کی کیا صورت ہے؟...

س: تو تمام مدارس کا ایک مجتمع نظام ہے، میری مراد یہ ہے کہ ہر مدرسہ اپنے طرز پر ایک نظام بنادے کہ اس کے مدرسہ سے جو طلبہ فارغ ہوں وہ لگے بندھے نظام کے تحت اپنے مدرسہ سے وابستہ ہوں۔

ج: یہ فی الجملہ آسان ہے..... بہ نسبت اس کے سارے مدارس ایک نقطہ پر آئیں، وہ تو مشکل ہے مگر سوائے اس کے کہ تحریک کی جائے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ دی جائے، اور اس کے فوائد و منافع ہیں، انہیں قلمبند کر کے انہیں سامنے رکھا جائے، جو مضرتیں پہنچ رہی ہیں وہ دکھائی جائیں.....

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی خیر خواہی کر رہے ہیں، اپنی غرض پیش نہیں کر رہے کہ اگر تم نے اس طرح طلبہ کو مربوط کر لیا تو تمہارا وقار اس میں بلند ہوگا، تمہاری ہی قوت اس میں زیادہ ہوگی..... یہ تجویز ٹھیک ہے، توجہ دلائی جائے اور مذہداروں کو متوجہ کیا جائے..... اب آج کل یہ دستور ہو گیا ہے کہ جو تجویز ہو پہلے عوام کو متوجہ کیا جائے، خواص جن کے ہاتھ میں عوام ہیں انہیں توجہ دلائی جائے، عوام خود بخود آجائیں گے، مدارس کے لوگ ہیں یا

با اثر شخصیتیں ہیں ان کو جمع کر کے تحریک کی جائے۔

اکابر کے خواب کی تعبیر..... س: حضرت! یہ تو مدارس سے متعلق چند سوالات تھے، اب مسلمانوں سے متعلق دو سوال، ایک تو یہ کہ سرزمین پاکستان میں قادیانیوں سے متعلق قرارداد (آسبلی میں) پاس کی گئی ہے، اس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے اور جناب کا کیا تبصرہ ہے؟

ج: ہم اس بارے میں بیان جاری کر چکے ہیں اور اس میں بہت زیادہ سراہا گیا وہاں کے علماء کو بھی اور حکومت کو بھی۔ یہ بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے، جو حکومت پاکستان نے کیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تو ہمارے بزرگوں ہی کا خواب تھا جس کی تعبیر ملی ہے۔ یہی جذبہ رکھتے تھے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ کسی طرح سے یہ التباس ختم ہو کہ یہ مسلم نام سے کام کر رہے ہیں، یہ تلمیس ہے، مگر انگریزوں کا زمانہ تھا، انہیں غیر مسلم کیسے قرار دیا جائے، تو اللہ نے اب آکر یہ خواب پورا کیا۔ ادھر تو مڈل ایسٹ کی ۳۲، انجمنوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ داخل ہی نہیں ہو سکتے اور ادھر پاکستان نے اس کے اوپر مہر کر دی، تو یہ عالمگیر مسئلہ بن گیا اور وہ جو ایک تلمیس اور التباس تھا وہ ختم ہو گیا۔

اب رہیں قادیانی دنیا میں ہزاروں باطل فرقے ہوئے ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر کام نہیں کر سکتے، تو میں نے پاکستانی آسبلی کی قرارداد کی تائید میں بیان دیا پھر کلکتہ اور متعدد جگہوں سے خطوط آئے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جگہوں میں لوگوں نے کہا کہ پھر یہ ہمارے قبرستانوں میں کیوں دفن ہوں، مسلم کو کافر سے کیا تعلق؟ تو مسلمانوں میں یہ چیز پیدا ہو رہی ہے کہ پھر قادیانی ہمارے قبرستانوں میں دفن نہیں ہو سکتے۔ مگر قبرستانوں کی تولیت ہے گورنمنٹ کے ہاتھ میں تو یہ روک نہیں سکتے، تو اب مسلمانوں میں یہ جذبہ ہے کہ ہم حکومت سے لڑیں گے، مطالبہ کریں گے اور فتاویٰ بھی دکھائیں گے کہ قبرستان میں حصے الگ الگ کر دو، ان کا خط الگ متعین کرو، ہم اپنے پاس دفن نہیں کریں گے..... اور بھی بہت سے مسائل سامنے آئے مثلاً پہلے قادیانی مسلمانوں کی مساجد میں آجاتے تھے، بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سو کے قریب قادیانی تائب ہو گئے..... مجھے وہاں کے لوگوں نے لکھا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک سوسائٹی قائم کریں جس کے ذریعہ ان قادیانیوں کے شکوک و شبہات رفع کریں جو اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور ادھر آنا چاہتے ہیں، تو میں نے انہیں لکھا تھا کہ سوسائٹی ضرور قائم کرو لیکن جماعتی طور پر یا جمعوں میں رفع شکوک کا کوئی سلسلہ ہرگز نہ قائم کیا جائے، اس میں تلمیس ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب مجمع ہوں گے، شکوک پیش کئے جائیں گے تو رد و کد میں اور بحث و مناظرہ میں انہیں رستہ نکل آئے گا پیر رکھنے کا..... ہاں انفرادی طور پر رفع شکوک کرو، لیکن مجالس عامہ منعقد ہوں رفع شکوک کرنے کے لیے تو یہ ہرگز نہ کیا جائے، اس بات کو انہوں نے مانا بہر حال اس کا (پاکستان آسبلی کی قرارداد کا) بہت ہی اچھا اثر پڑا ہے۔ ہندوستان

پر۔..... حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ العزیز سے یہ انٹرویو محترم مولانا محمود اشرف عثمانی نے لیا، مرتب خطبات نے عنوانات کے اضافے اور ان کے شکریہ کے ساتھ خطبات کی زینت بنا دیا۔

(از مرتب غفرلنا)

(بہ مقام مدینہ منورہ ۱۹۷۴ء)

صدیق حمیم

ورفیق قدیم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

”ابلاغ“ کا ”مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نمبر“ ایک مدت تک حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مضمون کے انتظار میں روکا رہا، خیال یہ تھا کہ آپ کی تحریر کے بغیر حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ نہایت تشنہ و نامتھام رہے گا، بالآخر جب حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی مصروفیات کی بناء پر مضمون ملنے سے ناامیدی ہوئی تو حضرت کی سابقہ تحریروں سے ایک مضمون مرتب کر کے نمبر میں شامل کر دیا گیا لیکن نمبر کی اشاعت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون موصول ہوا جو ذیل میں بصدا افتخار شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

معیت و رفاقت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سامنے آتے ہی اپنے باہمی تعلقات کی وہ پوری تاریخ ایک دم سامنے آگئی جس میں اس احقر اور مفتی صاحب نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔

مفتی صاحب سے جیسی معیت احقر کو شروع سے حاصل رہی، ویسی کسی دوسرے ہم درس وہم سبق کے ساتھ نہیں رہی، یہ رفاقت رسمی اور ظاہری نہ تھی بلکہ حقیقی اور معنوی تھی جس کی قدر و قیمت اس مخلصانہ تعلق سے بیش از پیش ترقی پذیر رہی جس کا تسلسل برس با برس قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحب کے انتقال مکانی سے احقر کو جتنا ملال اور رنج پہنچا شاید کسی اور کے جانے سے طبیعت اتنی متاثر نہیں ہوئی حتیٰ کہ اپنے مکان میں بیٹھ کر بہت دیر تک آنسوؤں سے روتا رہا۔ گھر والوں نے گھبرا کر پوچھا کہ آج کیا کوئی حادثہ اہم پیش آگیا ہے جو خلاف عادت اتنے گریہ ویکا کا سبب بن گیا ہے؟ تب مفتی صاحب کے فراق کا یہ سبب کھلا۔

رفاقت تعلیم ابتدائی تعلیم میں ہم دونوں ہم درس و رفیق رہے، آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فارسی کے مسئلہ استاذ و قطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے۔ ان کے یہاں فارسی کی تعلیم ایک ساتھ ہوئی، پھر اس سے اوپر کی عربی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی وہی میرے مستقل رفیق درس تھے، تعلیم جن اساتذہ سے پائی وہ بھی مشترک ہی تھے، اساتذہ کی غیر معمولی عنایات و توجہات میں بھی ہم دونوں شریک رہے عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، عالم ربانی حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور محدث وقت حضرت الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور استاذ المعقولات حضرت مولانا رسول خان صاحب، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب اور حضرت علامہ

ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے انسانِ طین علم خوش بختی سے ہمیں ملے، اس طرح آغازِ تعلیم سے لے کر تکمیل تک حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلیمی اور تدریسی رفاقت مسلسل رہی۔ یاد نہیں پڑتا کہ اس رفاقت و معیت میں کبھی کوئی فکری و ذہنی انقطاع رونما ہوا ہو..... اگرچہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی مصروفیات اور مشاغل علم میں مسابقت، ان کے کسی ہم درس و رفیق کے بس کی بات نہ تھی، وہ اس میدان میں سب سے آگے تھے۔

رفاقت تدریس..... تعلیمی دور ختم ہو جانے پر بھی یہ رشتہ اس شکل میں برقرار رہی کہ فراغت کے بعد دونوں ہی کو دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کا ایک ساتھ ہی موقع ملا، احقر کا اولاد تدریس سے اور ثانیہ انتظامی امور سے تعلق ہوا، اور مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اولاد تدریس سے اور ثانیہ افتاء سے تعلق ہوا۔

رفاقت سلوک..... پھر یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مسٹر شدانہ تعلق میں بھی یہ اشتراک و توافق سامنے آیا کہ ہم خانقاہ امدادیہ کے حاضر باش اور فیوض اشرفیہ کے خوشہ چمن بنے۔ اور اس میں بھی معیت و رفاقت اس درجہ رہی کہ حضرت مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہ کی عنایات و افاضات ہم دونوں پر مسلسل مبذول رہیں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر مقامات طے کرتے چلے گئے، احقر دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے سبب اس راہ سلوک میں اتنا تیز روندہ بن سکا، گو حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرما کر تسلی بھی فرمادیا کرتے تھے کہ ان مشاغل میں نیت مجاہدے کی کر لی جائے۔ تو اس میں وہی ثمرات مرتب ہوں گے جو ذکر و شغل پر ہوتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ، لیکن بہر حال وہ طبعی مشغلہ علمی ہمہ وقت بروئے کار نہ رہ سکا۔ تاہم حضرت مفتی صاحب مرحوم سے باطنی رفاقت ہمہ وقت میسر رہی جو ایک طویل مدت پر مشتمل ہے۔

رفاقت خدمت..... جب احقر کو نیابتِ اہتمام کے بعد اہتمام کی مرکزی اور بنیادی ذمہ داری اکابر کی طرف سے تفویض فرمائی گئی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کی بناء پر صدارت افتاء تک جانچنے جو دارالعلوم کے ممتاز مناصب اور اعلیٰ ترین اعزازات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور مددِ رحمت اللہ علیہ جب یہاں سے پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں بیٹھ کر بھی افتاء و فقہ پر جتنا کام تنہا انہوں نے کیا درحقیقت وہ ایک جماعت کا کام تھا جو تنہا ایک فرد نے انجام دیا، جتنی کہ اپنی ان خدمات کی بدولت رائے عامہ نے آپ کو ”مفتی اعظم پاکستان“ کا لقب عطا کیا جو یقیناً ان کے شایانِ شان تھا۔

میری جب کبھی بھی پاکستان حاضری ہوتی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ ملاقات میں پہل فرماتے۔ اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم شرانی گوٹھ کورنگی میں لے جانا اور علمی جلسے اور مجالس منعقد کرنا ایک لازمی بات تھی، خود ان جلسوں میں شریک رہتے اور مجھ پر تقریر کا اصرار فرما کر تقریر سننے اور غیر معمولی طور پر محفوظ محسوس ہوتے تھے۔

یہ تو اپنے راست تعلق کی باتیں تھیں جو سینے میں محفوظ ہیں اور سینے سے سفینے پر قلم برداشتہ آئیں، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بزرگوں کی نگاہ میں کیا تھا اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا

مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخیر عمر کے فتاویٰ کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جن پر وہ نظر ثانی نہیں فرما سکے تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے فتاویٰ پر نظر ثانی کے لیے حضرت مفتی صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) ہی کا انتخاب کیا تھا، اس سے ان کی دقت نظر اور تفقہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انہی خصوصیات نے ہم عمروں میں انہیں ایک ممتاز مقام عطا کیا تھا۔

ان کی زندگی کا آخری شاہکار ”تفسیر معارف القرآن“ ہے یہ ایک ایسی عظیم و رفیع قرآنی خدمت ہے، اگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف یہی ایک خدمت انجام دیتے تو ان کی عظمت و رفعت اور عند اللہ مقبولیت کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ان کی ہر علمی خدمت اپنی جگہ اتنی اہم اور نفع بخش ہے کہ عوام و خواص اس سے مستغنی نہیں رہ سکتے اور ہر اہل علم مفتی صاحب کی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

غرض دارالعلوم دیوبند کے مکمل ترجمان، علمائے حق کی بچی نشانی اور خانقاہ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قابل فخر نمائندے تھے، ان کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے صف اول کے علمائے دیوبند میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا بلکہ خود دارالعلوم دیوبند کے لیے یہ ایک ایسا صدمہ ہے جسے وہ بالخصوص ایسے موقعہ پر شدت سے محسوس کرتا ہے جب کہ وہ اپنے اجلاس صد سالہ اور تقریب دستار بندی کے اہتمام میں مصروف ہے، جس میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کی شرکت اجلاس کو چار چاند لگا دیتی، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس اجلاس کا بہت انتظار تھا اور بڑے شوق و جذبہ سے اس میں شرکت کے لیے آمادہ تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا تعلق تو یقیناً مرتے دم تک رہے گا، البتہ جو بات قابل رشک اور لائق اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لائق اخلاف چھوڑے ہیں۔ بلاشبہ مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا محمد رفیع عثمانی و اخوانہم سلمہم اللہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زندہ کارنامے ہیں جو المولود سرلابیہ کے صحیح مصداق ہیں۔ جنہیں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نبی جانشینی کے ساتھ علمی وراثت بھی بجا طور پر اس طرح منتقل فرمائی کہ ان شاء اللہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کا شجر طوبی زیادہ سے زیادہ برگ و بار لائے گا اور ارباب علم و فضل اس کی گھنی چھاؤں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ احقر اس وقت بیرونی سفر کے لیے پابرجا ہے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علم و فضل اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا موقعہ نہیں۔ دفعۃً ذہن پر جو یاد کی پرچھائیں آئیں، وہ قلم بند کر دیں، ورنہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم کا مصداق ہوتا!

رَحْمَةُ اللَّهِ رَحْمَةً وَاسِعَةً

والسلام: حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

(۲۷ رجب ۱۳۹۹ھ)

حضرت لاہوریؒ کی علمی یادگار مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب کی تشریف آوری

(ابن منظور کے قلم سے)

۲۳ اپریل ۱۹۷۷ء پیر کا دن مدرسہ قاسم العلوم کے لیے ایک خوشگوار اور پر بہار دن تھا جو اپنے جلو میں مسرتوں اور خوشیوں کو سمیٹ لایا، راقم ایک کام کے سلسلہ میں مدیر خدام الدین کی معیت میں جب دفتر خدام الدین پہنچا تو پردہ سماعت سے ایک خوش کن خبر کرائی کہ آج خانوادہ قاسمی کے چشم و چراغ، علم و فضل کے روشن مینار ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی کے سربراہ جناب قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند بلند بخت سے ملنے اور اس ادارہ کو اپنے قدم مینست لزوم سے نوازنے کے لیے پہنچ رہے ہیں، یہ سنتے ہی عقل و شعور کے پردوں میں مسرت و انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی، انفرادی شگفتگی میں بدل گئی۔

ابھی آنے والے پر کیفیت لمحات کا تصور ہی کر رہا تھا کہ جناب قاری صاحب آپہنچے، چہرے پر نظر پڑتے ہی بے تاب نگاہوں نے اپنی تشنگی سیرابی میں بدلتے دیکھی، دل حزیں نے اپنے پہلو میں شبنم کی سی ٹھنڈک محسوس کی، جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور، مدیر خدام الدین اور سابق مدیر ”تجرہ“ مرزا جانا باز اور دیگر حضرات نے آپ کو خوش آمدید کہا، اس موقع پر حضرت انور نے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کا ورود مسعود ہمارے لیے باعث افتخار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ عاطفت تادیر ہمارے سروں پر رکھے۔

محفل میں شریک ہر چہرہ شادان اور ہر دل فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ آخر کیوں نہ ہو جبکہ ان کی نگاہوں کے سامنے اکابر و اسلاف کی آخری نشانی حضرت قاسم العلوم والخیرات کے کاروان حیات کا آخری راہی شہیدان بالا کوٹ کے لشکر کا ایک عظیم سپاہی جلوہ افروز تھا، جو حقائق و معارف کی تعبیر اور شرافت و بزرگی کی تصویر بنے بیٹھا تھا، ملفوظات طبیات سننے کے لیے ہر ایک ہمہ تن متوجہ تھا، نجانے یہ سعادت پے پایاں اور یہ ساعت درافشاں پھر نصیب ہو کہ نہ ہو۔

دوران گفتگو جب مرد مجاہد حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت و انس کا تذکرہ ہوا تو حضرت انور نے اپنا ایک چشم دید واقعہ سنایا جو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا قاری صاحب سے محبت و الفت کا مظہر اور خود حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی حق گوئی و بے باکی کا ایک بین ثبوت ہے۔ جانشین شیخ التفسیر یوں گویا ہوئے کہ

پہل پہل حکومت پاکستان نے سی آئی ڈی کی ضبط پورنگ کی وجہ سے قاری صاحب کو یہاں آنے کی اجازت نہ دی، صورت حال کا علم جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تو باوجود یکہ والد صاحب جو کبھی حاکموں کی رہگذر کے قریب بھی جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ فوراً حاکم پنجاب فیروز خان نون کے پاس پہنچے، ملاقات ہوئی مقصد کا اظہار کیا، فیروز خان لیت و لعل کرنے لے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ قاری صاحب کی آمد سے کوئی گڑبڑ نہ ہوگی، بفرض محال ایسا ہوا بھی تو احمد علی جیل کی صعوبت جھیلنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے گا، چنانچہ اجازت دے دی گئی اور دوسرے روز قاری صاحب ہمارے مہمان تھے۔

مولانا کہنے لگے کہ اس دوران ایک پریشان کن واقعہ ہوا، ہوا یوں کہ فیروز خان نون کی ایک بیوی انگریز تھی جو اسلامی طرز معاشرت سے ناواقف تھی، فیروز خان نون نے جب تعارف کرایا تو اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ روک رکھا تو وہ سخت چپیں بچیں ہوئی۔ لیکن فیروز خان نون نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر اسے انگریزی میں سمجھایا تو وہ کہنے لگی مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یہ جان کر کہ یہ اسلام کے پاکیزہ اصولوں میں سے ایک اصول ہے بہت خوشی ہوئی اور آپ کی احسان مند ہوں وگرنہ اس سے قبل کسی مسلمان نے میری رہنمائی نہیں کی،

کتنے عظیم تھے وہ لوگ جن کی وجہ سے حق و صداقت کے چراغ روشن رہے، جوشاہ و گدائی کی تمیز سے ناواقف اظہار حق میں کوئی باک اور کسی مصلحت کا شکار نہ ہوتے تھے، الغرض تقریباً ایک گھنٹے کی یہ پروقار اور سدا بہار تقریب سعید چائے کے گرم گرم گھونٹوں اور مٹھائی کے شیریں لقموں پر ختم ہوئی اور وہ محفل جو کچھ دیر پہلے ابرار و انوار سے معمور اور علم و حکمت کے موتیوں سے لبریز تھی پل کی پل میں سونی ہو گئی۔

تم کیا گئے رونق بہار گئی

دارالعلوم رحیمہ ملتان کے بارے میں حضرت محترم صدر دارالعلوم کراچی کے تاثرات وارشادات

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّيْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ .

مدرسہ دارالعلوم رحیمہ ملتان، (پیرکالونی ۱) میں آج حاضری تو پہلی بار ہوئی۔ اور یہاں ایک عظیم اجتماع سے جو مدرسہ کے احاطے میں منعقد کیا گیا تھا خطاب کا بھی موقع ملا، لیکن اس بابرکت مدرسہ سے ناچیز بہت پہلے سے غائبانہ واقفیت رکھتا ہے کیوں کہ اس دارالعلوم کے بانی و مہتمم جناب قاری محمد ادریس ہیں جو میرے استاذ محترم شیخ القراء حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید ہونے کے علاوہ میرے بہت ہی کرم فرما بزرگ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب (ہوشیار پوری) رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار صاحبزادے ہیں جو دارالعلوم کراچی میں ناچیز کے ساتھ تقریباً بیس سال تک درس نظامی کے درجہ عالیہ کے استاذ رہے ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمہ کے ہونہار بانی و مہتمم جناب قاری محمد ادریس صاحب (ہوشیار پوری) اور ان کا گھرانہ خاص طور پر خدمت قرآن کا ایک والہانہ انداز رکھتا ہے۔ ان کی ہمیشہ نے دارالعلوم کراچی میں برس ہا برس کی محنت و خدمت سے حافظات و قاریات کی ایک بڑی کھپ ایسی تیار کر دی ہے کہ کراچی میں جگہ جگہ انہوں نے مکاتب قرآنیہ اپنے گھروں میں قائم کر لیے ہیں۔ اور دارالعلوم کراچی کے مدرسۃ البنات میں بھی ایسی کئی حافظات و قاریات تدریس کی باقاعدہ خدمت انجام دے رہی ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمہ ماشاء اللہ اب تقریباً دو برس سے ایک بہت بڑے رقبہ زمین میں منتقل ہو گیا ہے جو بارہ کنال سے زیادہ ہے یہاں طلبہ و طالبات کی الگ الگ تعلیم قرآن کریم حفظ و ناظرہ کا نہایت معیاری کام شیخ القراء حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ کے طرز پر ہو رہا ہے تقریباً ۵۸۰ طلبہ و طالبات حفظ قرآن با تجوید کی تکمیل کر کے فارغ ہو چکے ہیں (۸۷ میں تکمیل کرنے والے ۷۰ طلباء کرام کو شامل کرنے کے بعد کل تعداد بفضلہ تعالیٰ ۶۸۷) ہو جاتی ہے اس وقت اس مدرسے اور اس کی شاخوں میں تقریباً ۶۷۵ طلباء و طالبات قرآن کریم ناظرہ و حفظ کی تعلیم سے فیضیاب ہو رہے ہیں جن میں سے ۲۱۵ طلبہ مدرسہ دارالعلوم رحیمہ کے دارالطلبہ میں مقیم ہیں ان کے قیام و طعام کا مفت انتظام اہل خیر کے مالی تعاون سے اللہ تعالیٰ کر رہے ہیں۔

دوسال سے اس دارالعلوم میں درس نظامی کے ابتدائی درجات کی تعلیم بھی بحمد اللہ شروع ہو گئی ہے جس میں

خطبات حکیم الاسلام — دارالعلوم رحیمہ ملتان کے بارے میں

اس وقت ساٹھ طلبہ زیر تعلیم ہیں اور ان سب کے قیام و طعام کا انتظام بھی احاطہ مدرسہ میں موجود ہے۔ اساتذہ اور معلمات کی تعداد سترہ ہے۔ ماہانہ خرچ کا اوسط تعمیرات کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپے ہے جو زکوٰۃ و صدقات اور عطیات سے ہوتا ہے۔ تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے جس میں ابھی بہت کام کرنا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس عظیم مدرسے کے ساتھ اہل خیر دل کھول کر اتنے بڑے پیمانے پر تعاون فرمائیں کہ اس دارالعلوم کی تعمیرات کی ضروریات بھی تیز رفتاری سے پوری ہو سکیں اور طلبہ و طالبات کی تعداد میں بھی اضافہ برابر جاری رکھا جاسکے۔

ترسیل زر کے لیے: قاری محمد ادیس ہوشیار پوری غفرلہ
مدیر دارالعلوم رحیمہ پیر کالونی نمبر اسورجا بڈ روڈ پک شاہ عباس ملتان
نیشنل بینک نمبر مارکیٹ اکاؤنٹ نمبر ۵۷۷۱۱۵۲ ملتان شہر۔

محمد رفیع عثمانی

۱۴۱۸/۶/۶ھ

کلام

از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نبی اکرم ﷺ، شفیع اعظم ﷺ دکھ دلوں کا پیام لے لو
تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو
قدم قدم پر ہے خوف رہزن زمین میں بھی دشمن، فلک بھی دشمن
زمانہ ہم سے ہوا ہے بدظن، تمہیں محبت سے کام لے لو
شکستہ کشتی ہے تیز دھارا، نظر سے روپوش ہے کنارہ
نہیں کوئی ناخدا ہمارا خبر تو عالی مقام ﷺ لے لو
کبھی تقاضا وفا کا ہم سے کبھی مذاق جفا ہے ہم سے
تمام دنیا خفا ہے ہم سے خبر تو خیر الانام ﷺ لے لو
یہ کیسی منزل پہ آگئے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا ﷺ امام اپنے غلام لے لو
یہ دل میں ارماں ہے اپنے طیب مزار اقدس پہ جا کے ایک دن سناؤں
ان ﷺ کو میں حال دل کا، کہوں میں ان سے سلام لے لو

حضرت حکیم الاسلام کی یہ وہ نعت پاک ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے چند روز پیشتر کی اور ان کے تکیہ

کے نیچے سے ملی۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۱۲

ایکٹ احادیث پر کمال اعراب اور عزیز تحقیق کے ساتھ [۱۲۰] ایسا ان فروع خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو یکجہانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت نازی بخشتا ہے

مرتبہ: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دارالعلوم حیدرآباد دکن

تخریج و تحقیق

مولانا ساجد محمود صاحب
مختص فی احادیث مابعد فاروقیہ کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
مختص فی احادیث مابعد فاروقیہ کراچی

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل مابعد دارالعلوم کراچی

تقدیم و تنگدلی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر: کراچی، پاکستان





قرآن وسنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- ◻ جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں
- ◻ طبع جدید اکتوبر 2011ء
- ◻ تعداد 1100
- ◻ ناشر بیت السلام



بیت السلام
پبلشر - کراچی - پاکستان

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی - فون: 021-32711878

موبائل: 0321-3817119 ای میل: baitussalam_pk@yahoo.com

25	9	تفسیر سورہ قلم.....	عملِ صالح اور دوام بھی نفی جنوں پر دال ہے.....
25	9	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم دعوت.....	مجنوں بھی اصلاحِ عالم کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے؟..
25	9	کفار کے الزام کی تردید.....	اجتماعیتِ عالم کی نعمت مجنوں کے ذریعہ ممکن نہیں....
		رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال دانش مندی	عالمی سلطنت و خلافت کی عظمت نفی جنوں کی مستقل
26	10	اور خدائی دعویٰ.....	دلیل ہے.....
	10	ن اور قلم کی گواہی.....	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے الزامات کا
28	10	حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علوم دینے آتے ہیں	دفعہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا.....
29	11	حضرات انبیاء علیہم السلام کی بلندی فطرت.....	محبوب حق اور مجنوں؟.....
	12	علوم الہامیہ.....	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عقل الانبیاء علیہم السلام
30	13	تاثراتِ خرد و ف.....	ہیں.....
	14	ن اور قلم کی وجہ قسم.....	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی فیصلے سے سردارانِ
30	15	کمال ’’ن‘‘ سے کمال نبوت پر استدلال.....	عرب کی تلواریں میان میں چلی گئیں.....
32	16	کمال نبوت سے کمال اعتدال پر استدلال.....	دوسرا عقلی فیصلہ.....
33		خصوصیتِ نون (ن) سے خصوصیاتِ نبوی صلی	تیسرا عقلی فیصلہ.....
34	16	اللہ علیہ وسلم پر استدلال.....	چوتھا عقلی فیصلہ.....
34	20	’’ن‘‘ سے نفی جنوں اور کمال عقل و علم پر استدلال...	عقل علم کے لئے اور طبیعت عمل کے لئے محلِ نزول ہے
35	20	حرکاتِ قلم سے علوم نبوت پر استدلال.....	پڑوسی کی ایذا رسانی سے تحفظ کی عقلی تدبیر.....
36	21	اعجازِ قلم سے اعجازِ نبوت پر استدلال.....	مجموعہ عالم کے لئے حماقت بھی نعمت ہے.....
36	21	قلم آریوں علوم کے ظہور کا ذریعہ ہے.....	امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلندی عقل.....
		ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی جنوں کے لئے قلم	حضرات اہل اللہ عقل میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
38	21	کی شہادت.....	وسلم کے خلیفہ ہیں.....
	22	افعال و حرکاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی علوم ہیں...	تھوڑے علم کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت
40		عقول کے لئے جلا بخش علوم لانے والے نبی مجنوں	ہے.....
	23	ہو سکتے ہیں؟.....	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام کی
40	23	جو خود مملوب العقل ہیں وہ نبی کو مجنوں کہتے ہیں.....	عقل سے زیادہ ہے.....
41		دوسرے کو مجنوں بتلانا خود کے مجنوں ہونے کی	اعتدالِ مزاج سے اعتدالِ عقل، علم اور اخلاق ہوگا..
	24	علامت ہے.....	ارسطو کے اعتدالِ مزاج اور سکندرِ رومی کی خرابیِ مزاج
41	25	اخلاقِ عظیم کے حامل بھی مجنوں نہیں ہو سکتے.....	کا عجیب واقعہ.....

کمال اخلاق سے نفی جنون	47	رسول خدا کو جنوں کہنے والے کی جنگ بدر میں حذیفہؓ
مراتب اخلاق اور آثار اخلاق	47	کی تلوار سے ناک کٹ گئی
اخلاق حسن	48	انبیاء علیہم السلام کی اتباع میں دنیا و آخرت میں عزت
خلق کریم	50	اور نافرمانی میں ذلت
خلق عظیم	50	عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے
مشاہد و آثار کی عظمت	52	نوازد تمثیل و واقعہ
وجہ عظمت	53	اصحاب الحجۃ کا واقعہ
حدیث مسلسل بالمصافحہ سے استدلال	53	غرباء کا حصہ نہ دینے کا فیصلہ اور مچھلے بھائی کا مشورہ
سید عالی کی فضیلت و برکات	54	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صدقہ دینے سے مال میں کمی
حدیث مسلسل بالماء والتمر سے استدلال	55	نہ آنے کی قسم
خلق عظیم کے آثار	56	صدقہ دینے سے کمی بیشی کا مفہوم
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلق عظیم پر عمل اور اس کے	56	تواضع سے رفعت پر حلف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
آثار	56	فقراء سے مال بچانے کے لئے اندھیرے میں تیز
علمی و عملی قرآن کریم	58	رفقاری
تمسخر پر اہل حق کی خاموشی کا نتیجہ	59	حق تعالیٰ شانہ پر بے اعتمادی کا نتیجہ
نفی جنون کے دو طریقے	60	باغ کے اجڑنے کے بعد ایک دوسرے کو ملامت
تہمت جنون لگانے والے کی عرفی حیثیت	61	ندامت و توبہ کے بعد رحمت حق کی توجہ
دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس بری خصلتیں	61	ندامت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے باغ حیوان کا
مدعی جنون کے اوصاف اہل جہنم جیسے ہیں	62	عطیہ
اہل جنت اور اہل جہنم کے اخلاق	63	اے اہل مکہ باغ دین کے اجاڑنے سے ڈرو
بعض اوقات بدکردار لوگوں کو اولاد و اموال کی کثرت	63	باغ ایمان قبول کرنے کی دعوت
دی جاتی ہے	66	اعترافِ ندامت کے بعد باغ اسلام کی عظیم الشان
ابو جہل نے چند روزہ دنیا کی خاطر آخرت برباد کر لی	67	سرداری دی گئی
سردارانِ قریش کا مشورہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	67	فاروق اعظمؓ سے ایک اعرابی کا مکالمہ
کا جواب	67	حق خلافت
ردِ شرک کے بغیر توحید نامکمل ہے	68	دو جہاں کی سرداری کا راستہ
تمام درجاتِ شرک کی نفی	68	خیر و شر کا تصادم علامتِ بشریت ہے
انذارِ تفہیم	70	عجب، گناہ سے بھی زیادہ مہلک ہے

111	90	نور ایمان کا ظہور	رحمت حق سے مایوسی کی ممانعت ہے
112	91	پل صراط، شریعت کی صورت مثالی	حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے
113	92	عابد مظاہرنا آشنائے حقیقت رہے گا	بغاوت اور توبہ کے ثمرات
	92	دنیا کی ظلمت آخرت میں بھی حقیقت سے حجاب کا	مشرکین مکہ کو تنبیہ
113	93	باعث ہوگی	قلبی قساوت کا انجام بد
113	94	ساق تشابہات میں سے ہے	ظلم کا انجام
116	94	بلاد لیل اتباع میں نجات ہے	آفات آخرت کا تذکرہ بھی نہیں
117	95	عظمت خداوندی کا عالم	آفات دنیا کو کم کر سکتا ہے مگر آفات آخرت کو نہیں
117	95	مولانا اصغر کے نانا حضرت شاہ صاحب کی مادہ لوحی	مصیبت ٹالنے کے لئے حضرت علیؑ کی تدبیر
	96	محبوب اختر کا میاں جی کی خدمت میں گندستی کی	مصیبت پر حضرت عمرؓ کا قول
119	96	شکایت کرنا	مصیبت میں بھی نعمت کا پہلو ہے
	97	دارالعلوم دیوبند کی پہلی اینٹ رکھنے والے میاں جی اور	علم بن اور دنیوی بادشاہت کا تقابل
120		ان کے داماد کا حال	دولت ایمان اور دولت دنیا کی تقسیم میں عدل
121	98	معیار اتباع	خداوندی
121	100	اطاعت کا اخروی فائدہ	مطیع و باغی برابر نہیں ہو سکتے
122		ارشادات نبوت کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں	دنیا میں اجتماعی عذاب کے باوجود آخرت میں مومن
123	101	رسول سچا ہی ہوا کرتا ہے	و کافر کا فرق ہوگا
125	102	ثبات قلب کی ترغیب	اخذ نتائج میں غلطی
125	103	بنی اسرائیل میں نبوت و ملکیت کی ترتیب	ہرگز وہ کا تفر کسی جابر قوت کی نشاندہی کرتا ہے
126	105	یوشع علیہ السلام اور حذقیہ بادشاہ کا واقعہ	جواز شرک کی غلط تاویل
126	105	حضرت یونس علیہ السلام کا قوم کی آزادی کے لئے انتخاب	شرک کی تاریخ
	107	حضرت یونس علیہ السلام کی بنی اسرائیل کی آزادی	تصور اسباب شرک میں سے ہے
127		کے لئے روا لگی	مشرکین کی دلیل تسلیم کرنے سے عابد کا وجود ختم ہو جاتا ہے
	108	بادشاہ کا آزادی دینے سے انکار اور حضرت یونس علیہ	مظہر صفات معبود بننے کے لائق نہیں
127	108	السلام کی تنبیہ	مظہر محتاج ہے معبود نہیں
128	109	آثار عذاب اور قوم کی توبہ	روزِ حشر اکشاف حقائق کا دن
129	110	حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش	مراتب تحلیلی
129	110	حضرت یونس علیہ السلام پر آثار عذاب کا آغاز	روزِ امتیاز

152	کشتی میں سواری.....	130	ایمان کی دو بنیادیں.....
153	کشتی میں قرعہ اندازی.....	130	زمین خریدنے والے ایک صحابی کی زمین سے سونا نکلنا.....
	مچھلی کے پیٹ میں.....	131	حضرت جابرؓ اور ان کی بیویؓ کا ایک رات میں چھ لاکھ
154	القائد عاء.....	131	درہم خیرات کرنا.....
154	مچھلی کے پیٹ سے نجات، لباس اور غذا کا سامان.....	131	ذرائع رزق سے تعلق کی نوعیت.....
155	منصب رسالت کا اعزاز.....	132	عبدالرحمن بن عوف کی مالداری اور حسد خداوندی
156	آثار رضا.....	132	مقام تفویض میں مال رکاوٹ نہیں ہو سکتا.....
	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقصود تمثیل.....	134	اولیاء اللہ کا دُنیوی کردار اور مرزا مظہر جان جاناں اور
156	مقاصد شریعت.....	136	بادشاہ کا واقعہ.....
	تمہید.....	136	دنیا داروں پر مالدار انبیاء اور اولیاء کے ساتھ حجت
158	تعمین مقاصد.....	136	قائم ہوگی.....
159	تعلق مع اللہ کی بنیاد ”عبدیت“.....	137	اعلیٰ ترین عبادت.....
159	آثار عبدیت.....	138	تربیت نفس کے درجات.....
162	ایک غلط فہمی کا ازالہ.....	138	تعلیم و تربیت کے آثار.....
163	عبدیت کے رنگ.....	139	تعلیم بقاء مذہب کا ذریعہ ہے.....
164	عبدیت کا تقاضا.....	141	عبادت بلا علم.....
166	عبدیت کا اعلیٰ مقام ”تفویض“.....	141	دینی ذوق کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے
167	موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا واقعہ.....	142	تقویٰ کسے کہتے ہیں.....
169	عبدیت ہی عشق و معرفت کی راہیں دکھلاتی ہے.....	144	آثار صحبت اور اس کی ضرورت
169	قضاۃ الہی پر راضی رہنے سے تشویش ختم ہو جاتی ہے.....	145	تاثیر صحبت غیر اختیاری ہے.....
170	رضاء بر قضا ذریعہ سکون ہے.....	145	ذوق دین.....
171	حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی ثبات قدمی کا واقعہ.....	146	دین اور قانون کا باہمی فرق.....
171	حاجی امداد اللہ کے گھر چور.....	148	مقصد دین الفاظ محض نہیں ذوق نبوت پیدا کرنا ہے.....
171	منعم سے نگاہ ہٹانا ہی مصیبت ہے.....	148	صحبت کا اثر دل پر اور الفاظ کا دماغ پر ہوتا ہے.....
172	علامہ اکثمؒ اور ان کی حسین بیوی.....	149	مدار دین صحبت اہل اللہ ہے.....
172	حالت رضا کا غلبہ.....	150	علم نہیں بد صحبت بدلتی رہی.....
172	اسباب نہیں کرتے، مسبب الاسباب کرتا ہے.....	151	صاحب صحبت کے فقدان کے آثار.....
173	دُنیوی سطح پر تعلق مع اللہ کی ضرورت.....	152	عالم ربانی کی صحبت اور کیسٹ کے بول کا فرق.....

173	تأثیر محبت میں مواجہت کا اثر
174	صحبت سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب سے نہیں ہے؟
174	پیدا ہوتا
175	علمی خدمات کتابیاتی جائزہ
175	حیات طیب ایک مختصر خاکہ
175	تصنیفات و تالیفات
175	مقدمات و تقاریر
176	مکتوبات
176	محاسن و ملفوظات
177	کتابوں میں شامل تحریریں
177	رسائل میں مطبوعہ تحریریں
177	خطبات و تقاریر (کتابی شکل میں)
177	خطبات و تقاریر
178	کتابوں میں تذکرہ
178	رسائل میں ذکر
178	حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ کے چشم دید تین ماحول
178	گنگوہ کا ماحول
180	حضرت امام ربانی قدس سرہ کے وصال کے اثرات
181	تھانہ بھون کے ماحول کے آثار
181	دارالعلوم دیوبند کے ماحول کے آثار
182	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دین کی مضبوطی
182	نبوی ماحول کی وجہ سے تھی
182	حضرات متقدمین کے ہاں صحبت شیخ کا درجہ
182	صحبت سے قلبی کیفیات پیدا ہو کر محرک عمل بنتی ہیں
182	غیر صحبت یافتہ علماء ظہور فتن کا سبب بنتے ہیں
183	بلا صحبت علم زبان تک رہتا ہے
183	تکمیل علم کی سند بغیر صحبت نہیں ملتی تھی
183	ازالہ شبہات میں تاثیر صحبت، حضرت تھانوی کا واقعہ

تفسیر سورہ قلم

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ
وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿رَبِّ الْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝ مَا أَنْتَ بِمُحْجُونٍ ۝ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا
غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ فَتَسْبِّحُ وَتُنْصِرُ وَتُبْصِرُ ۝ بِأَيْكُمُ الْمُفْتُونُ ۝ إِنَّ رَبَّكَ
هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم دعوت..... بزرگان محترم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی
دعوت دینی شروع کی، قوم کو ابھارا اور للکارا۔ نیز جب آپ کو نبوت کی بشارت کی گئی اور فرمایا گیا کہ تبلیغ اور دعوت
شروع کرو۔ تو آپ نے دعوت الی اللہ شروع کی۔ انبیاء علیہم السلام کا عزم اور ان کی دعوت الی اللہ سے ایک لگن اور
دھن اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم کا تو کیا مقام ہو سکتا ہے وہ یہ تھا کہ آپ صبح و شام دعوت میں مصروف،
جہاں کوئی موقع ملا قوم کے کچھ افراد جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے تھے۔ عرب میں دو بازار لگتے
تھے سوق عکاظہ، اور سوق بجنہ بڑی مارکیٹ لگتی تھی دور دور کے قبائل خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ جہاں
کوئی میلہ منعقد ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے، جمعوں میں دعوت دیتے۔ لوگوں کے خیموں پہ جا کے
دعوت دیتے۔ غرض کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ آپ دعوت الی اللہ کے کام میں مصروف نہ ہوں۔ اس پر قوم نے آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ یہ مجنون ہو گئے ہیں انہیں تو ایک جنون سوار ہے کہ جب دیکھو ایک ہی چیز زبان پر اور ایک
ہی بات ہے کہ اللہ کی طرف آؤ۔ دیکھو انہیں جنون ہو گیا ہے اور معاذ اللہ عقل سلب ہو گئی ہے ہر وقت ایک ہی لگن
ہے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ زمانہ نہ وقت۔ جب دیکھو انہی میں لگے ہوئے ہیں۔

کفار کے الزام کی تردید..... حق تعالیٰ شانہ نے آپ کی بریت بیان فرمائی کہ آپ مجنون نہیں بلکہ کامل العقل

ہیں، اور اتنی عظیم عقل ہے کہ پوری امت میں جتنی عقل ہو سکتی ہے وہ تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں آگے تصریحات بھی آئیں گی، غرض حق تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کی تکذیب کی کہ وہ غلط کہتے ہیں کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں ہمارے رسول مجنوں نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل اور دانش کے حامل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال دانش مندی اور خدائی دعویٰ..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دانش مند اور جنون سے بری ہونے کا دعویٰ حق تعالیٰ شانہ نے قسم کھا کر فرمایا: اولاً اللہ کا دعویٰ اس کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ پھر اوپر سے قسم بھی کھائی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اور مؤکد ہو جاتا ہے، تو حق تعالیٰ نے قلم اور قلم سے لکھی ہوئی چیزوں کی قسم کھا کر دعویٰ فرمایا کہ ﴿مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ اے پیغمبر! آپ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور برکتوں سے بالکل مجنوں نہیں ہیں اور ان کے دعوے بالکل غلط ہیں۔ یہ جھوٹے ہیں تو تو اور قلم کی قسم کھائی اور قسم بمنزلہ گواہ کے ہوتی ہے، قسم کھا کر آدمی جو دعویٰ کیا کرتا ہے کہ خدا کی قسم یہ ہے بات تو وہ اللہ کو گواہ اور شاہد بناتا ہے اور کہتا ہے کہ جب خدا میرا گواہ اور شاہد ہے تو اس بات کے جھوٹا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو قسم بمنزلہ شاہد اور گواہ کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا اصول یہ ہے: ”الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدْعَى وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ“ ① مدعی جب کوئی دعویٰ کرے تو دو گواہ پیش کرے تاکہ وہ دعویٰ ثابت ہو اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعی علیہ سے قسم دلائی جاتی ہے کہ تو قسم کھا کر کہہ دے کہ مدعی جو کہہ رہا ہے وہ غلط کہہ رہا ہے۔ میں اس دعویٰ سے بری ہوں۔ تو مدعی علیہ پر یمن اور قسم کا رکھنا دراصل اس پر گواہ قائم کرنا ہے کہ مدعی کے دو گواہ ہیں اس کا ایک گواہ ہے مگر وہ اصل ہے تو قسم اٹھا کر دعویٰ کرے کہ مدعی کی بات غلط ہے تو اس کا دعویٰ متروک ہو جائے گا۔

ن اور قلم کی گواہی..... بہر حال جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس چیز کو گواہی میں پیش کرتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ نے گواہی میں ن اور قلم کو پیش کیا تو ان ایک حرف ہے اور اس کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس حرف میں اتنے عجائبات چھپے ہوئے ہیں کہ مرکب کلمات میں وہ عجائبات نہیں ہیں جو ان مقطعات حروف میں ہیں، باقی انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان حروف کے اندر کیا معانی چھپے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نون ایک حرف ہے کوئی اس کے معنی نہیں ہو سکتے۔ کوئی کلمہ ہو، کوئی مرکب ہو، کسی معنی پر دلالت کرے تو کہا جائے گا کہ اس کے کوئی معنی ہے۔ لیکن الف، نون، میم، اس کے کوئی معنی نہیں، تو کیسے سمجھا جائے کہ اس میں کوئی معنی ہے؟ اس لئے عام لوگ نہیں سمجھتے مگر انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان کے حقائق کیا ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علوم دینے آتے ہیں..... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جب پانچ برس کی عمر ہوئی تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں کتب میں بٹھلایا۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں آتے، بلکہ تعلیم دینے کے لئے آتے ہیں۔ ان کے صدقے سے دنیا عالم بنتی ہے تو وہ کسی سے کیا علم لیں؟

① السنن للدارقطنی، الحدود والدیات ج: ۷ ص: ۳۸۴ رقم: ۳۲۳۷. السنن الکبریٰ للبیہقی ج: ۸ ص: ۱۲۳.

لیکن والدہ ماجدہ کو کیا خبر تھی کہ یہ پیغمبر ہیں انہوں نے انہیں مکتب میں بٹھلایا جیسے بچوں کو بٹھلاتے ہیں۔ تو استاذ نے کہا کہو الف، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا الف کے کیا معنی ہیں۔ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ تو مہملات اور بے معنی چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے؟ تو کاہے کا استاذ ہے کہ تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ جس چیز کو تو سکھانا ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ مہمل چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے تجھے شرم کرنی چاہیے۔ اب وہ بے چارہ حیران ہوا کہ آج تک دنیا میں کسی نے الف کے معنی نہیں پوچھے، یہ بچہ الف کے معنی پوچھ رہا ہے۔ استاذ نے کہا مجھے تو الف کے معنی معلوم نہیں، کیا تجھے معلوم ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں مجھے معلوم ہیں۔ تو اس نے کہا بتاؤ فرمایا تب بتاؤں گا جب تو اپنی جگہ چھوڑ کر شاگردوں کی لائن میں بیٹھ اور میں تیری جگہ بیٹھوں گا پھر بیان کروں گا۔ آخر مجبور ہو کر استاذ کو گلدی چھوڑنی پڑی اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام استاذ کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی فطرتیں اس طرح سے بلند ہوتی ہیں، وہ پست ہو کر نہیں آتے، وہ عالی رتبہ ہوتے ہیں، تو یہ گوارا نہیں کیا کہ میں کسی کا شاگرد بنوں، حالانکہ پانچ برس کی عمر ہے اور یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ صورتہ بھی میں شاگرد رہوں اور شاگردوں کے لائن میں بیٹھوں خود جا کر مسند درس کے اوپر بیٹھوں اور اسے سامنے بٹھلایا۔ اس کے بعد الف کے معنی بیان کرنے شروع کئے۔ تو حرف کی خاصیتیں، ان کے معانی، عجائبات اور وہ علوم و دقیقہ بیان کئے کہ استاذ دنگ تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔ پانچ برس کا بچہ اور حقائق بیان کر رہا ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بلندی فطرت..... حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ یہ تو پانچ برس کی عمر میں نکات بیان کر رہے تھے، جب پیدا ہوئے ہیں اور یہود نے آکر حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ: ﴿يَمْرِيْمُ لَقَدْ جَنِّتَ شَيْئًا فَرِيًّا﴾ يَا خُتَّ هُرُونُ مَا كَانَ اَبُوكَ اَمْرًا سَوِيًّا وَمَا كَانَتْ اُمُّكَ بَغِيًّا ﴿١﴾ اے مریم! یہ تو نے کیا کیا، بلا باپ کا بچہ؟ معاذ اللہ! تو کوئی ناجائز کام کر کے آئی ہے؟ تیرا باپ بھی بُرا نہیں تھا۔ تیری ماں بھی بُری نہیں تھی۔ تو کس سے پیدا ہوئی کہ یہ حرکت کی کہ یہ بغیر باپ کے بچہ لے کر آئی؟ شادی تیری نہیں ہوئی؟ آج تک کسی مرد سے تو نہیں ملی۔ آخر یہ بچہ کہاں سے آگیا؟ مریم علیہا السلام جانتی تھیں کہ میں پاک ہوں اور یہ بچہ خدا کی دین ہے اور بطور معجزہ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، تو انہیں یقین تھا کہ یہی بچہ میری بریت بیان کرے گا۔ تو فرمایا کہ مجھ سے نہ پوچھو بلکہ بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھو: ﴿فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُنْكَلُ مِنْ حَتّٰى نَقُوْلَ فِيْ الْمُهْمِلَةِ صَبِيًّا﴾ ہم اس سے کیسے بات چیت کریں جو گود میں پڑا ہوا ہے، دودھ پیتا بچہ ہے کہ وہ ہماری سمجھ گمانہ سمجھا سکے گا۔ ہم کیسے بات کریں؟ تو اشارہ کیا کہ جو کچھ کہے گا یہی کہے گا، مگر بہر حال خود کچھ نہیں بولیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گود میں سے کہا:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اَنِیْ الْکِتٰبُ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَجَعَلَنِیْ مُبْرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصَنِیْ

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَنَسَرًا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَفِيًّا ۝ اِلٰى قَوْلِهِ..... وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿﴾ فرمایا: میں عبداللہ ہوں، اللہ کا بندہ، اللہ نے مجھے کتاب عطا کی ہے، وہ کتاب آنے والی تھی۔ جو چیز یقیناً آنے والی تھی، وہ بمنزلہ اس کے ہے کہ گویا وہ آگئی وہ کتاب انجیل مقدس ہے۔ مجھے پیغمبر بنایا۔ مجھے برکت والا بنایا میں جہاں بھی ہوں۔ ماں کے پیٹ میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں، گود میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں گود سے باہر جاؤں جب بھی بابرکت ہوں۔ زمین کے کسی حصے پر چلا جاؤں برکات میرے ساتھ ہیں۔ اور اللہ نے مجھے نماز پڑھنے کی وصیت کی ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں ان عبادات کے اندر ہوں اور میں اپنی والدہ کی بریت بیان کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میری والدہ ان الزامات سے پاک ہے جو تم لگا رہے ہو۔ اور مجھے اللہ نے شقی بنا کر نہیں بھیجا۔ بلکہ سعید اور مبارک بنا کر بھیجا ہے۔ اور مجھ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ جس دن پیدا ہوا، اس دن بھی، جس دن انتقال کروں اس دن بھی اور جس دن محشر میں اٹھوں اور پھر زندہ ہوں اس دن بھی، تو میرے لئے مرکزیت سلامتی ہی سلامتی ہے۔ جب میں بابرکت اور باسلامت ہوں۔ تمہارا کوئی الزام مجھ پر نہیں لگ سکتا۔ جب میں پاک بن کر اپنی پاک ماں کے پیٹ سے آیا ہوں تو میری ماں پر کوئی الزام نہیں آ سکتا میری ماں بھی اس الزام سے بری ہے جو تم اس پر لگا رہے ہو غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ ان کی عمر مکتب میں پانچ برس کی تھی۔ مگر گود میں جب عبادات کے حقائق، توحید، رسالت، نبوت اور عبادات کے سلسلے بیان کئے۔ تو اس وقت پانچ دن کی بھی عمر نہ تھی۔ اسی وقت پیدا ہی ہوئے تھے۔ تو اس استاذ کے سامنے مکتب میں استاذ کی مسند پر بیٹھ کر حروف کے معانی علوم اور عجائبات بیان کرنے شروع کر دیئے تو لوگ حیران تھے۔

علوم الہامیہ..... مطلب یہ ہے کہ یہ حروف بے معنی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر بڑے بڑے عجائبات اور علوم چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے لئے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان علوم تک پہنچنے کا حصہ دیا ہے۔ تو ان علوم کو یا انبیاء علیہم السلام جانتے ہیں یا اولیاء اللہ ان سے واقف ہیں، یہ پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتے ان پر ان کا انکشاف ہوتا ہے اور الہام ربانی سے یہ علوم آتے ہیں۔ میں نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہمارے جد امجد اور دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔ تو ان کے تمام تلامذہ نے جو دارالعلوم دیوبند کے مدرسین تھے۔ سب نے مل کر عرض کیا کہ! حضرت ایک تفسیر کی کتاب ہمیں پڑھادیجئے۔ حالانکہ ساری کتابیں پڑھ چکے تھے۔ مگر مزید علوم حاصل کرنے کے لئے درخواست کی، حضرت نے وہ قبول فرمائی اور ﴿اَلَمْ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اس پر پہلی تقریر کی، حروف مقطعات کے وہ علوم و عجائبات بیان کیے کہ یہ تمام بڑے بڑے علماء جو خود آئمہ فہون تھے۔ حیران تھے یہ علوم کہاں سے آرہے ہیں۔ غرض یہ علوم یا تو انبیاء علیہم السلام کو معلوم ہوتے ہیں یا حق تعالیٰ شانہ اپنے خزانہ غیب سے اپنے مخصوص اولیاء کرام کو دیتے ہیں۔

تاثراتِ حُرُوف..... شیخ محی الدین ابن عربی جو امام الصوفیاء اور امام المحققین ہیں انہوں نے اپنی کتاب

”فتوحات مکہ“ میں دعویٰ کیا ہے کہ عالم میں جتنی کارگزاریاں ہو رہی ہیں وہ سب حروف کے ثمرات ہیں، ہر حرف کی خاصیت ہے کہ کسی حرف سے مل کر اپنا کام کر رہے ہیں، کسی حرف کی خاصیت سے دنیا کی زمین کام کر رہی ہے۔ فضا کام کر رہی ہے، یہ سب حروف کی تاثیرات ہیں۔ اور یہ سارا عالم دو حروف سے ہی تو پیدا ہوا ہے اور وہ ہیں: بکن حق تعالیٰ نے فرمایا: بکن ہو جا، تو کاف اور نون دو حروف تھے اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ عالم بن کر کھڑا ہو گیا۔ تو عالم کی زندگی اور وجودنی الحقیقت ان دو حروفوں میں تھی۔

چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں حروف مقطعات ہیں جیسے اَلَمْ، یا طَسَمَ، یا حَمَّ عَسَقَ، یا حَمَّ اَن کے اندر دنیوی اقوام کی تاریخیں چھپی ہوئی ہیں اور اس کے کچھ قواعد بیان فرمائے ہیں کہ اگر ان قواعد سے تاریخیں نکالیں تو پورے عالم کی تاریخ نکل آئے گی۔ چنانچہ اس کی کچھ اصطلاحات ذکر کی ہیں مگر وہ فن اٹھ گیا۔ آج کسی کو پتہ نہیں کہ ان اصطلاحات کے کیا معنی ہیں وہ کس طرح سے معلوم ہوتی ہیں۔

لح اور قلم کی وجہ قسم..... بہر حال حروف کے اندر علوم اور عجائبات چھپے ہوئے ہیں تو حق تعالیٰ نے ن کی بلا وجہ قسم نہیں کھائی اور نہ ہی بے وجہ قلم کی قسم کھائی ہے بلکہ ان کے علوم کو شاہد بنایا ہے کہ ہمارا رسول مجنوں نہیں ہے بلکہ اعلیٰ ترین دانش اور اعلیٰ ترین عقل کا حامل ہے اس میں جنون کے کیا معنی ہیں۔ غرض دو چیزیں پیش فرمائی ہیں ایک حرف نون اور ایک قلم۔ یہ اس لئے کہ دونوں چیزوں کو انبیاء علیہم السلام سے مناسبت ہے نون (ن) کو نبوت سے مناسبت ہے اور قلم کو نبی کی ذات سے مناسبت ہے تو نبوت کی حقیقت بھی بیان ہو گئی اور ذات نبوی کی حقیقت بھی بیان ہو گئی تو ن کو نبوت سے مناسبت کاملہ ہے۔ مثلاً تین حروف ایسے ہیں کہ وہ اپنی ابتداء میں بھی خود ہیں اپنی انتہا میں بھی خود ہی ہیں۔ ان تین حروفوں کے سوا اور حروفوں میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ حروف یہ ہیں: نون، میم، اور واؤ (ن۔ م۔ و) نون جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی نون آخر میں بھی نون۔ میم جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی میم اور آخر میں بھی میم اس طرح واؤ جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی واؤ اور آخر میں واؤ۔ تو تین لفظ ایسے ہیں کہ اوّل و آخر میں وہ خود بولے جاتے ہیں، گویا اوّل بھی آخر بھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے کہ اوّل بھی ہے آخر بھی ہے۔ کائنات کا ایک ذرہ موجود نہیں تھا۔ اللہ موجود تھے جب کائنات کو پیدا کر دیا۔ ایک وقت آئے گا جب کوئی ذرہ کائنات کا باقی نہیں رہے گا اور اللہ موجود ہوگا۔ تو اللہ ہی اوّل ہے اور اللہ ہی آخر ہے۔ چیزیں آئیں گی، جائیں گی، پیدا ہوں گی، ختم ہوں گی، مگر جو جو حق ہر وقت موجود ہے، اوّل میں بھی اور آخر میں بھی۔

یہی شان جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلوقات میں ہے، کہ حق تعالیٰ شانہ کی اول ترین مخلوق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اوّل ما خلق اللہ نوری سب سے اول حق تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا۔ اور نور سے مراد حقیقت محمدیہ ہے۔ گویا سب سے پہلے میری حقیقت کو بنایا تو اولین مخلوق

میں ہوں۔ اس کے بعد اس کے آثار اور ظہور میں اور چیزیں بننا شروع ہوئیں، مگر اولین مخلوق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ کائنات نہیں بنی تھی اور آپ بنائے جا چکے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات میں اول ہیں۔ اسکے بعد خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) بنا کر آپ کا ظہور ہوا تو انبیاء علیہم السلام تمام منقلب ہو چکے تھے، کوئی نبوت دنیا میں باقی نہیں تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔ تو آپ ہی اخیر میں بھی نبی ہیں اور آپ ہی شروع میں بھی نبی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”كُنْتُ نَبِيًّا وَاَدُمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ“ میں اس وقت نبی تھا جس وقت آدم کا پتلا ہی بنایا جا چکا تھا۔ ابھی ان کی مٹی کا خمیر کیا جا رہا تھا۔ اور میں نبی بنایا جا رہا تھا۔ یعنی میری حقیقت میں علم ڈال دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ نبوت کی حقیقت وحی ہے۔ اس لئے نبی اس کو کہتے ہیں کہ جس پر اللہ کی وحی آئے، اور وحی کی حقیقت علم کے سوا اور کیا ہے؟ واقعات اور احکام کی وحی کی جاتی ہے۔ وحی کی حقیقت علم ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات سے پہلے نبی تھی۔ اور نبوت کی حقیقت وحی ہے اور وحی حقیقت علم ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اللہ نے میری حقیقت کو علم سے بنایا یعنی میری حقیقت کے اندر علم گوند دیا گیا تو جب تک میری حقیقت ہے میرے اندر علم ہے، تو آپ کے اول میں بھی علم اور آخر میں بھی علم ہے تو اول میں بھی آپ نبی کہ سب سے پہلے بنائے گئے اور جب سارے انبیاء علیہم السلام دنیا سے اٹھائے گئے تو آخر میں پھر آپ نبی ہیں۔ غرض اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے جیسے حق تعالیٰ کی الوہیت اول میں بھی ہے آخر میں بھی ہے، تو نون (ن) کے حرف کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت ہے کہ آپ اول میں بھی ہیں آخر میں بھی ہیں۔ اس طرح حرف نون ہے کہ نون اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے۔ واؤ کو بھی یہی مناسبت ہو سکتی ہے اور میم کو بھی۔ کیونکہ اول اور آخر میں نون والی کیفیت یہاں بھی ہے۔

کمال ”ن“ سے کمال نبوت پر استدلال لیکن علماء لکھتے ہیں کہ ان تینوں حروف میں نون افضل ترین ہے، اس واسطے کہ واؤ اگر ترقی کرے گی تو آواز اوپر کو اٹھ جائے گی۔ ایک خلاء پیدا ہو جائے گا۔ اور میم ترقی کرے تو نیچے کی طرف جائے گی۔ کیونکہ میم کی آواز نیچے کی طرف جھکتی ہے اور نون بیچ میں متوسط ہے کہ اس میں آواز اٹھتی ہے نہ جھکتی ہے۔ بالکل بیچ بیچ کا ایک حصہ ہے تو ”خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَطُهَا“ ”بہترین چیز وہ ہے جو متوسط اور معتدل ہو۔“ نہ اوپر نہ نیچے بلکہ اپنے موقف پر ہو۔ ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کمالات بھرپور ہیں۔ افراط و تفریط سے بری، کمال اعتدال کے مطابق ہیں۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شانِ جلال غالب ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں جمال کی شان غالب ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں کمال کی شان غالب ہے، اور کمال اعتدال کو کہتے ہیں نہ ادھر جھکا ہوا نہ ادھر، بلکہ اپنے موقع پر فٹ ہے اور سیدھا اپنے موقع پر چسپاں ہے۔ تو کمال اعتدال سے ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھرپور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت انتہائی عدل و اعتدال پر ہے جیسی تو

نبی بھی کمال اعتدال پر ہے غرض نون میں بھی یہی کمال اعتدال ہے۔

کمال نبوت سے کمال اعتدال پر استدلال..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بحۃ مبارک کو دیکھا جائے تو اس کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت طویل تھے نہ قصیر تھے۔ بلکہ معتدل قامت تھے ایسی معتدل اور میانہ قیامت کہ آدمی دیکھ کر یوں کہے کہ یہ اتنی ہی ہونی چاہیے تھی نہ اس سے زیادہ ہو سکتی تھی نہ اس سے کم ہو سکتی تھی۔

یہ آگے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ سب میں اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے تھے صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے طویل القامت لوگ بھی تھے۔ حضرت عباسؓ دو آدمی کے برابر ان کا تہاقد تھا۔ بیٹھتے تھے تو دو تین آدمی کی جگہ گھیرتے تھے یہ تو حۃ تھا۔ مجلس مبارک میں لمبے لمبے صحابہ کرامؓ بھی بیٹھے ہیں مگر اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آتے تھے، تو یہ بزرگی اور اعزاز تھا۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قد و قامت میں بھی اعتدال تھا نہ افراط ہے نہ تقریط۔

اسی طرح آپ کے علوم و کمالات میں بھی اعتدال ہے کہ ان میں نہ افراط ہے نہ تقریط ہے اور یہی شان لفظ نون کی ہے کہ اس میں بھی نہ افراط ہے نہ تقریط ہے، اس واسطے حق تعالیٰ شانہؑ نے لفظ نون کو شہادۃ میں پیش کیا کہ جیسے نون میں حد کمال ہے اسی طرح ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بابرکات میں بھی کمال ہے۔ اور جس کا کمال کمال اعتدال لئے ہوئے ہو اسے جنون سے کیا واسطہ؟ جنون تو اسے ہی کہتے ہیں کہ یا عقل بالکل نہ رہے کہے کہ میں مجنون ہو گیا یا اتنی بڑھ جائے کہ حد عقل میں نہ رہے اسے ہزار کہتے ہیں وہ بھی ایک قسم کا جنون ہے۔ لیکن کمال اعتدال جب ہوگا اس میں ظاہر بات ہے کہ جنون کا کوئی شائبہ نہیں آ سکتا۔ تو نون کو شاہد بنا کر پیش کیا۔

خصوصیت نون (ن) سے خصوصیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر استدلال..... اسی طرح سے نون (ن) کی کچھ اور بھی خصوصیات ہیں۔ جو لوگ عربیت سے واقف ہیں نیز صرف اور نحو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ نون جب فعل کے آخر میں آتا ہے تو تاکید کا کام دیتا ہے۔ اگر ہم یوں کہیں۔ لَفْعَلْ کَذَا میں ایسا کروں گا لیکن اگر نون ملا کر یوں کہیں لَفْعَلْنِ کَذَا جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا ضرور کروں گا۔ تو فعل کی تاکید کر دیتا ہے۔ غرض فعل پر داخل ہوتا ہے تو نون تاکید کا ذریعہ بنتا ہے اور جب حرف پر داخل ہو تو حرف کے اندر تخمین اور آواز کی خوبی پیدا کر دیتا ہے۔ آواز کو جب گناتے ہیں تو غنہ بچ میں آئے گا تو آواز کی خوبی پیدا ہوگی تو حسن صوت اس سے متعلق ہے اور جس کی آواز اچھی ہوتی ہے اس میں اس قسم کا غنا ہوتا ہے۔ غنا اور غنہ ایک چیز ہے۔ نون غنہ ہے۔ نون غنہ جب آئے گا تو آواز میں گونج ہوگی۔ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور سینہ کی نالیاں کچھ بند ہو جاتی ہیں۔ غنہ باقی نہیں رہتا اس لئے خوش آوازی نہیں رہتی۔ جیسے مجھ جیسا آدمی۔ کہ آواز بہت عمدہ تھی بوڑھے نے آکر نالیاں کچھ بند کر دیں، گونج باقی نہیں رہی اس لئے حسن صوت نہیں رہی۔ جیسے آپ نے باجے دیکھے ہوں گے مثلاً ہارمونیم ہے اس میں ایک سُر بہت اونچا ہوتا ہے۔ ایک اس سے کم اور معتدل اور ایک بالکل اخیر میں، ان تینوں کو ملائیں گے تو ایک ساز پیدا ہو جاتا ہے اس سے گانے بجانے میں خوش نمائی سی پیدا ہو جائے گی اگر ایک ہی آواز رہ جائے تو

ہارمونیم میں کوئی خوبی نہیں اور نیچے نیچے تینوں جمع ہو جائیں تو خوشنمائی پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض نون کے اندر خصوصیت سے یہ بات دیکھی گئی ہے کہ جس حرف میں اس کو ملا دواس میں غنہ پیدا ہوتا ہے اور غنہ سے غنہ پیدا ہوتا ہے تو حسن صوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اس کو اسم کے ساتھ ملا دیں اس کے اندر ایک خوبی پیدا ہو جاتی ہے، غرض فعل سے ملائیں تو اکید ہو جائے حرف سے ملائیں تو حسن صوت بن جائے گا۔ اور اسم کے ساتھ ملا دیں تو اس میں خوشنمائی اور نحر و مہابت پیدا ہو جائے گی۔ یہی شان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کے ہاں کچھ افعال ہیں کچھ حروف ہیں، کچھ اسماء ہیں حق تعالیٰ شانہ کے جو افعال ہیں وہ درحقیقت ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام بمنزلہ فعل حق کے ہیں، نہ جیسے دست و بازو ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا گیا ﴿فَالْمُؤْمِنُونَ آمَنُوا﴾ ① عالم کی تدبیریں ملائکہ کے ذریعے ہو رہی ہیں۔ بنانے والے حق تعالیٰ ہیں۔ لیکن اس فعل کا واسطہ ملائکہ ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہم نے لکھا۔ لکھا تو ہم نے لیکن لکھنے کا واسطہ ہمارا ہاتھ بنا۔ مگر ہاتھ ہمارے قلب کے خلاف نہیں کر سکتا جب لکھنے کا ارادہ کریں گے ہاتھ حرکت کرے گا۔ تو ہاتھ کو کہا جائے گا کہ یہ ہمارا آلہ فعل ہے۔ اسی طرح آنکھ ہمارا آلہ البصار ہے کہ اس کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں۔ دیکھنے والا قلب ہے مگر آنکھ اس کے لیے راستہ بنتی ہے۔ دل جب چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو پیر حرکت کرنے لگتے ہیں تو پیر گویا قلب کے چلنے کا آلہ ہے۔ وہ اس کے واسطے سے چلتا ہے۔ غرض ہاتھ پیر آنکھ ناک کان یہ تمام وسائل فعل ہیں اور افعال کا تعلق قلب سے ہے۔ فعل قلب کا ہوتا ہے، مگر اعضاء اس کے لئے واسطہ ہوتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں بھی یہی ہے کہ ماں کے رحم پر ملائکہ مقرر ہیں جو بچے کو بناتے ہیں، تو بنانے والے حق تعالیٰ ہیں مگر وہ ملائکہ بمنزلہ ہاتھ کے ہیں جن کے ذریعہ بنایا جا رہا ہے، جب زندگی چھینی جاتی ہے تو ملائکہ موت آتے ہیں موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں مگر حضرت ملک الموت اور ان کے اعوان و انصار اس کے لئے واسطہ بنتے ہیں۔ کھیتی اگتی ہے تو ملائکہ مقرر ہیں جو بیج میں سے کوئیل کو نکالتے ہیں کوئیل بڑھا کر اوپر لے جاتے ہیں، تو بڑھانے والے حق تعالیٰ ہیں لیکن ملائکہ علیہم السلام واسطہ بنے ہوئے ہیں، غرض ملائکہ بمنزلہ فعل حق کے ہیں۔ اس لئے جب وہ فعل تمام ہو جاتا ہے، اور ملائکہ اس کا ذریعہ بنتے ہیں تو پھر ان کو ترقی دی جاتی ہے اور عروج دیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ افعال خداوندی بواسطہ ملائکہ کے ہیں اور ملائکہ کا عروج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ آتا ہے تو وہ بڑھ جاتے ہیں اور ان کو ترقی ہوتی ہے، مثلاً حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا: ”إِنَّ لِلَّهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِينَ“ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی ایک جماعت بنائی ہے جو اربوں اور کھربوں میں ہے، اللہ ہی ان کی تعداد جانتا ہے، یہ اس لئے ہیں کہ وہ دنیا میں گھوم کر دیکھیں کہ ذکر اللہ کہاں ہو رہا ہے، اللہ کا نام کہاں لیا جا رہا ہے، اس کے احکام کہاں بیان کئے جا رہے ہیں، تو جب کوئی جلسہ یا مجلس

تعلیم دین کی، تعلیم قرآن کریم، تعلیم حدیث کی یا وعظ و پند کی منعقد ہوتی ہے، تو یہ اربوں کھربوں ملائکہ جو اسی نوہ میں رہتے ہیں یہ اس مجلس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اس مجلس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، پھر اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں کہ: ”هَلُمُّوْا اِلٰی مَقْصِدِ كُمْ“ دوڑو تمہارا مقصد اس مجلس میں ہو رہا ہے، وہ اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں اور وہ اپنے سے پچھلوں کو، تو اس مجلس کے ارد گرد ملائکہ کا اتنا ٹھٹ لگ جاتا ہے کہ آسمان تک ملائکہ ہی ملائکہ ہوتے ہیں، غرض مجلس کے ارد گرد اربوں کھربوں ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں، جب یہ مجلس ختم ہوتی ہے تو ان کو عروج ہوتا ہے اور وہ آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، اور حق تعالیٰ ان سے سوال کرتے ہیں کہ کہاں گئے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہاں گئے تھے، مگر سوال حکمت ہے، پوچھتے ہیں کہاں گئے تھے؟ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں میں گئے تھے، اور ان کی ایک مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ بندے کیا کر رہے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کیا کر رہے تھے، مگر ان کی زبان سے اقرار کرانا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بندے آپ کی یاد میں مشغول تھے، آپ کی جنت کے طالب تھے، آپ کی جہنم سے خائف تھے، رحمت مانگ رہے تھے، غضب سے ڈر رہے تھے؟ آپ کے پیغمبروں کی زبان سے سنا ہے اور ایمان لائے ہیں، فرماتے ہیں کیا انہوں نے جہنم کو دیکھا ہے جو اس سے ڈر رہے تھے، عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں ہے، آپ کے پیغمبروں کے کہنے پر ایمان لائے ہیں، گویا اشارہ اس طرف ہے کہ: اے ملائکہ! اگر تم ہم پر ایمان رکھتے ہو رات دن جنت اور جہنم کو آنکھ سے دیکھتے ہو، تو تمہارا ایمان عجیب نہیں ایمان ان کا ہے کہ دیکھا تو ہے نہیں، مگر یقین قطعی کے ساتھ مان رہے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: اے ملائکہ اللہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے موجود تھے، جو وہ مانگتے تھے میں نے ان کو دیا، اور جس چیز سے پناہ مانگتے تھے، پناہ دی، میں نے ان کی مغفرت کر دی، ملائکہ عرض کرتے ہیں، یا اللہ! اس مجلس میں بہت سے آدمی بیٹھے تھے مگر کچھ راستہ چلتے ایسے ہی کھڑے ہو گئے تھے ان کا مقصد مجلس میں آنا نہیں تھا مگر انہوں نے دیکھا کہ ایک اجتماع ہے ذرا دیکھیں کیا ہو رہا ہے، تماشہ دیکھنے کو ٹھہر گئے تھے تو وہ شرکاء مجلس نہیں تھے، محض مجلس دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے، کیا ان کی بھی مغفرت ہے؟ فرمایا: ”هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْفِيْ جَلِيْسُهُمْ“ ① (اِنَّ لِّلّٰهِ مَلٰئِكَةً سَّيّٰحِيْنَ فِي الْاَرْضِ) اس مجلس میں بیٹھنے والے ایسے ہیں کہ ان کے پاس کھڑے ہونے والے بھی محروم نہیں رہ سکتے۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ اس مجلس میں آنے کے سبب سے ملائکہ کو عروج ہوتا ہے اور اتنی قبولیت ہوتی ہے کہ عرش تک پہنچتے ہیں مجلس میں آنے سے پہلے عرش تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس مجلس خیر کی برکت سے انہیں عرش تک رسائی ہوتی ہے، اور اتنا عروج اور قریب ہونا نصیب ہوتا ہے جو اس سے پہلے نہیں تھا۔ یہ قرب اور عروج کس

① السنن للترمذی، کِتَابُ الدَّعَوَاتِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ بَابُ مَا جَاءَ اَبَابُ مَا جَاءَ اَنْ لِلّٰهِ مَلٰئِكَةٌ سَّيّٰحِيْنَ

چیز پر مرتب ہوا؟ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے، آپ کی توبہائی ہوئی باتیں مجلس میں بیان کی جارہی تھیں، ذکر اللہ کرے گا تو آپ کے تلقین فرمودہ کلمات ہیں، وعظ ہیں تو آپ کی تلقین کردہ ہے، احکام بیان کریں تو آپ کی تعلیم کردہ چیز ہے، عبرتیں بیان کریں تو آپ کی فرمودہ چیز ہے، تو ملائکہ یہی کچھ سننے کے لئے آئے ہیں، اس کے سننے سے وہ قبولیت اور عروج ہوا، تو معلوم ہوا کہ فرشتوں کو قرب خداوندی میں ثبات اور استقلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے نصیب ہوتا ہے۔ تو جیسے نون کے ملا دینے سے فعل کے اندر قوت پیدا ہو جاتی تھی تو ملائکہ بمنزلہ (قوت) افعال حق کے ہیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کا ذکر مل گیا تو ان کی قبولیت میں ثبات و استقلال کی تاکید پیدا ہو گئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر افعال الہیہ سے ملتے ہیں تو ان کی عبادت اور قرب کا تا کد ہو جاتا ہے، جیسے نون فعل سے ملا تو فعل موکد ہو گیا تھا۔ اسی طرح سے اسماء الہیہ تمام کائنات کے لئے ظن ہیں، اسماء الہیہ کے تصرف سے یہ تمام چیزیں بنی ہیں، فرمادیا: کُن، ہو گئیں، کسی کو زندہ ہونے کا فرمایا تو زندگی مل گئی، کسی کے لئے موت کا فرمایا تو موت آ گئی، غرض عالم میں جتنے تصرفات اور تغیرات ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اسماء سے ہو رہے ہیں، اور اسماء الہیہ کا مورد اور محل وہ بنی آدم، جنات، حیوانات، اور نباتات ہیں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی اسم الہی لگا ہوا ہے، جس کے ذریعہ وہ چل رہا ہے، اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو انسانوں اور جنوں نے قبول کیا وہ اللہ کے اسماء کا مظہر ہیں تو وہ اللہ کے اسماء کے تصرفات کا ذریعہ بن گئے، اور ظاہر ہے کہ یہ مقبولیت کی علامت ہے، تو افعال (ملائکہ) سے ملے تھے تو قرب مرتب ہو گیا تھا، ملائکہ عروج پر آ گئے تھے، اسماء سے ملے، تو ہمارے اندر خیر و برکت پیدا ہو گئی، اسی طرح سے کائنات کے اندر جتنی معدنیات ہیں، جتنے ذخیرے چھپے ہوئے ہیں سونا ہو، چاندی ہو، تیل ہو پٹرول ہو یہ درحقیقت حروف ہیں، حرف کے معنی کنارے کے ہوتے ہیں، اس عالم کے ہر کنارے میں کوئی نہ کوئی معدن رکھا ہوا ہے، کسی کنارے میں تیل ہے، کسی کنارے میں سونا ہے، تو یہ حروف ہیں، یہ حروف کب نمایاں ہوئے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہو گئی، اور آپ کو بنادیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں یہ حروف نمایاں ہوئے اور ان کو فخر کا موقع ملا، سونا کہے گا کہ میں ایسی فخر کی چیز ہوں کہ لوگ مجھے سر پر جگہ دیتے ہیں اور چاندی کہے کہ بازار مجھ سے آباد ہیں، یہ فخر کہاں سے نصیب ہوا، اس لئے کہ انہیں زندگی دی گئی، زندگی کہاں سے نصیب ہوئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طفیل ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ افعال خداوندی کے ساتھ ذات بابرکات نبوی لگی تو ان میں ثبات و استقلال پیدا ہوا، اسماء الہیہ کے ساتھ آپ ملے تو ان کا تصرف ہو گیا، حروف کائنات کے ساتھ آپ ملے تو ان کو فخر و مباہات کا موقع مل گیا، تو جیسے نون تھا کہ فعل سے ملے تو موکد بنادے، اسم سے ملے تو اس میں زینت پیدا کر دے، حرف سے ملے تو اس میں غنہ پیدا کر دے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ افعال الہیہ سے ملی تو ان میں ثبات ہوا، اسماء

الہیہ سے ملی تو ان میں تصرفات نمایاں ہوئے، حروف سے ملی جو اللہ کے حروف ہیں، تو ان میں زینت اور فخر و مہابات پیدا ہو گئی، غرض نون (ن) کو نبوت سے کمال درجہ مشابہت حاصل ہے اور نبوت کا کمال درحقیقت نبی کا کمال ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے کج ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بیان کرنے کے لئے کیا۔

”ن“ سے نفی جنون اور کمال عقل و علم پر استدلال اور سارے کمالات کی بنیاد علم ہے اور علم کی زمین عقل ہے، اگر عقل نہیں ہوتی تو علم کتنا ہی ڈال دیں وہ نمایاں نہیں ہو سکتا، چنانچہ سینکڑوں پوسٹر لکھ کر دیوار پر لگا دیں اس پر کوئی اثر نہیں، اس لئے کہ اس میں کوئی عقل و شعور ہی نہیں، ایک لکڑی کے اندر یا جزدان میں آپ پورا قرآن شریف رکھ دیں، جو علم کا خزانہ ہے، لیکن جزدان کو کوئی خبر نہیں، اس لئے کہ اس میں عقل تو ہے ہی نہیں، عقل ہوتی تو علم نمایاں ہو جاتا۔ یا ایک انسان ہے مگر وہ بے وقوف ہے اس پر اگر کوئی علم ڈال دے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے لکڑی کے اوپر ڈال دیا، کچھ بھی اثر نہیں ہوگا، لیکن اگر عقل موجود ہے تو وہ اس علم کو سمجھے گا، اور زیادہ عقل ہے تو اور زیادہ سمجھے گا گہری عقل ہے تو گہرائی سے سوچے گا تو علم کا دار و مدار عقل کے اوپر ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کو عقل بھی اعلیٰ دی جاتی ہے، کیونکہ ان کے اوپر علم اعلیٰ ڈالا جاتا ہے، اور علم کی زمین عقل ہے، وہ نہ ہو تو علم جتنا نہیں، اس لئے لازمی ہے کہ نبی کو عقل اتنی دی جائے کہ امتوں میں اتنی عقل نہ ہو، پوری امت کے برابر تنہا نبی کی عقل ہو، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس درجہ کا ہے کہ حروف سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں، افعال سے ملے تو وہ باکمال بن جائے اسماء سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں اتنا بڑا علم ہوا، تو اس کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ عقل بھی اتنی ہی بڑی دی گئی، تو جاہل اور مجنون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے کہتے ہیں؟ (نعوذ باللہ) اس سے تو خود یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل اتنی کامل ہے کہ جنون کا وہاں شائبہ بھی نہیں ہو سکتا، تو نون کو گواہی میں پیش کیا اس لئے کہ حرف نون کو نبوت سے مناسبت تھی۔

حرکات قلم سے علوم نبوت پر استدلال اس کے بعد قلم کی قسم کھائی، قلم کی قسم کھا کر کہا کہ آپ اپنے رب کی نعمت و فضل سے مجنون نہیں ہیں، اور ہم قلم کو گواہی میں پیش کرتے ہیں، اس واسطے کہ قلم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے مناسبت ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قلم کو جب دیکھا جائے تو کبھی تو کاغذ کے اوپر ہے کبھی دوات کے اندر ہے کبھی وہاں سے ہٹا کر اوپر کی طرف ہے، کبھی سیاہی کم ہو گئی تو اُسے جھکا دیتے ہیں، اگر کوئی بے عقل آدمی قلم کی یہ حرکتیں دیکھے گا، تو قلم کو مجنون ہی تو کہے گا کہ یہ کیا بے عقلی ہے کہ کبھی اوپر جا رہا ہے کبھی ادھر کبھی ادھر تو جاہل اگر قلم کو دیکھے گا تو وہ مجنون کہے گا، عقل مند دیکھے گا تو کہے گا کہ یہ تو کوئی علیٰ درجہ کی چیز ہے، اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے کہ کفار دیکھیں گے تو مجنون کہیں گے، اور دانش مند دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ان سے بڑا کوئی عاقل نہیں ہے، تو قلم نے یہ بات سمجھا دی کہ قلم کی حرکات ظاہر میں مجنونانہ ہیں، لیکن ان حرکات کے اندر علوم اور کمالات چھپے ہوئے ہیں۔

اعجازِ قلم سے اعجازِ نبوت پر استدلال..... قلم ایک لکڑی کی چیز ہے، ایک کلک ہے یا پلاسٹک ہے جس کی کوئی وقعت نہیں، لیکن علوم وہ لکھتا ہے کہ اگلوں اور پچھلوں کی خبر دیتا ہے، ظاہر بات ہے کہ قلم انتہادر ہے کی اعجازی چیز یعنی معجزہ ہوا، قلم کو کاٹ کر آپ نظر اُدیکھو کہیں بھی کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن جب حرکت کرتا ہے تو ہزاروں علوم لکھتا چلا جاتا ہے، آج ماضی کی لاکھوں چیزیں قلم کی بدولت ہی تو ہمارے علم میں آئی ہے، اور مستقبل کی چیزیں جو آج لکھ دی ہیں وہ قلم ہی کی بدولت تو ہوں گی، اور حال میں جو چیزیں حوادث و واقعات کے سلسلہ میں ہیں وہ قلم ہی تو لکھتا ہے، تو قلم کی ذات کو دیکھو تو وہ محض ایک لکڑی ہے یا پلاسٹک ہے اور آثار کو دیکھو تو کروڑوں علوم، اسی طرح سے اگر ہمارے نبی کو دیکھو تو ظاہر میں تو بشر ہی ہے، جیسے اور انسان ہوتے ہیں، لیکن ان کی حرکات سے جو علوم نمایاں ہیں تو اگلے اور پچھلوں کی سب چیزیں کھلتی چلی گئیں، تو قلم کو ہم گواہی میں پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنون نہیں ہے، ورنہ پھر قلم کو مجنون کہو اور قلم کو مجنون کہو گے تو یہ ہمارے پاس علم کہاں سے آیا.....؟ یہ قلم ہی کے تو طفیل سے آیا، تو دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہیں۔

قلم اربوں علوم کے ظہور کا ذریعہ ہے..... پھر تیسری ایک بات اور بھی ہے کہ قلم کو آپ الگ رکھ دیں نہ حرکت کرے گا نہ ہلے گا نہ لکھے گا نہ علم ظاہر کرے گا، لیکن کاتب اپنے ہاتھ میں لے لے، اس سے سینکڑوں علوم ظاہر ہوتے چلے جائیں گے، معلوم ہوتا ہے کہ قلم خود اپنے قبضے میں نہیں بلکہ کاتب کے قبضے میں ہے، جو وہ لکھتا ہے وہ لکھتا ہے اس کے ہاتھ سے چھین لیا جائے تو قلم میں کچھ بھی نہیں، اس سے حق تعالیٰ نے بتلادیا کہ ہمارا پیغمبر جو کچھ کہہ رہا ہے وہ قلم ہے ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہم لکھا رہے ہیں لکھتا چلا جا رہا ہے اس کا کیا ہوا ہمارا کیا ہوا ہے خود قلم کی ذات میں کچھ نہیں ہے اسی کو فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ ① ہمارا پیغمبر ہوا ہے نفسانی سے بات نہیں کرتا، وحی سے بات کرتا ہے، وحی بھیجنے والے ہم ہیں ہم چلا رہے ہیں، اس لئے قلم چل رہا ہے تو ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام بشر ہے، حقیقت میں دیکھو تو سارے بشر ایک طرف اور وہ تنہا ایک طرف، اس لئے کہ وہ بمنزلہ قلم حق تعالیٰ کے ہیں وہ چلاتے ہیں تو چلتا ہے مطلب یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ ہے کہ خواہشات نفسانی سے کوئی حرکت نہیں ہوتی، ہماری مرضیات کے مطابق حرکت ہوتی ہے، جدھر ہم چلاتے ہیں چلتے ہیں، ہم کہہ دیں کہ جان دے دو تو وہ میدانِ جہاد میں کود پڑیں گے، ہم کہہ دیں گے کہ گھر میں آرام کرو تو سونے کے لئے آجائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ بیویوں کے پاس جاؤ تو وہ وہاں چلے جائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ اولاد کی پرورش کرو تو اولاد کی پرورش کرنے لگیں گے، غرض وہ اپنی من مانی سے کچھ نہیں کرتے، جو ہم کراتے ہیں وہ کرتے ہیں۔

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفیِ جُنُون کے لئے قلم کی شہادت..... تو ہمارا پیغمبر قلم کی طرح ہمارے ہاتھ میں ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، جدھر کو چلائے چل پڑے، ایسا ہی ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے

ہاتھ میں ہے، ان کی ساری حرکات و سکنات ہماری مرضیات کے مطابق ہیں، اس کو اگر تم نے مجنوں کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمیں مجنوں کہہ رہے ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس علم نہیں، تو درحقیقت پیغمبر کو برا کہنا اللہ کی ذات میں گستاخی کرنا ہے، پیغمبر کی تعریف کرنا اللہ کی تعریف کرنا ہے۔ ﴿مَنْ أَطَاعَ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ تو ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اسی لئے ایک جگہ فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتْ إِذْ رَمَيْتْ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى﴾ ① غزوہ بدر میں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں ماری تھیں اور ایک کنکری جس کے سر پر بڑی توپاش پاش کرتی ہوئی ٹخنوں تک نکل گئی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں بشر کی طاقت نہیں کہ کنکری مارے اور جس کو لگے اس کو پاش پاش کرتی ہوئی جسم کے پار ہو جائے، یہ تو ہماری طاقت ہے، ہم کنکری مار رہے تھے، ہاتھ پیغمبر کا تھا طاقت ہماری تھی، جب پیغمبر بولتے ہیں تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے، کلام ہمارا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قلم کو پیغمبر کی ذات کے ساتھ بہت مناسبت ہے۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا: قلم کی قسم کھاتے ہیں اور قلم کو گواہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنوں نہیں ہے، اس لئے کہ قلم بھی ظاہر میں ایک لکڑی کی چیز ہے، مگر علوم وہ بیان کر رہا ہے جو مجنوں بیان نہیں کر سکتا، تو جیسے قلم کو مجنوں نہیں کہہ سکتے نبی کو بھی مجنوں نہیں کہہ سکتے۔

افعال و حرکات نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی علوم ہیں..... اسی کے ساتھ ساتھ قلم کی اور خصوصیت بھی ہے، قلم ایک دم روشنائی کے اندر جا کر غرق ہو جائے گا اور اس کے بعد لکھنا شروع کرے گا اور لکھنے میں کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کو حرکت کرے گا یہ مثال ایسی ہے کہ گویا دوات کی روشنائی سے قلم وضو کرتا ہے، وضو کرنے کے بعد کاغذ کے مصلے پر عبادت کرتا ہے، اور سجدے کرتا ہے، ہمارے پیغمبر ایک طرف وضو کرتے ہیں اس کے بعد کبھی اٹھتے ہیں، کبھی بیٹھتے ہیں یہ ہماری عبادت کے لئے کرتے ہیں اگر پیغمبر کو دیکھنا ہے تو قلم کو دیکھ لیں تو قلم جیسے روشنائی کے اندر جا کر غسل کرتا ہے اس میں غرق ہوتا ہے اور استغراق ہوتا ہے اس کے بعد آکر اس سے لکھتا ہے جس سے علوم پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے پیغمبر کامل الطہارت ہیں اور طہارت بھی اعلیٰ ہے اس طہارت کے بعد جو عبادت کرتے ہیں وہ عبادت طرح طرح کے علوم کا ذریعہ بنتی ہے۔

آج جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا ذکر کریں گے، روزہ کا ذکر کریں گے یا حج کا ذکر کریں گے، اسی سے تو مسائل نکلتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں علوم چھپے ہوئے ہیں، بظاہر تو حرکات ہی ہیں کہ سجدہ کیا، رکوع کیا، لیکن اس سجدے اور رکوع سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے اس رکوع سے اور سجدے سے کتنے حقائق پیدا ہوئے انبیاء میں بیٹھنے سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے، یہ جو فقہ کی ہزاروں کتابیں بھری پڑی ہیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال ہی کا مجموعہ ہے، اور آپ کا فعل اس لئے ہے کہ آپ حق تعالیٰ میں مستغرق ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم

علم الہی میں غرق ہوتے ہیں پھر وہاں سے تر ہو کر آتے ہیں تو افعال و اقوال بنتے ہیں جس سے علوم پھیلتے ہیں، جیسے قلم روشنائی میں جا کر سرنگوں ہوتا ہے سر کا غوطہ دے کر پھر جو آتا ہے تو طرح طرح کے علوم و عجائبات اس سے ظاہر ہوتے ہیں، تو اگر قلم کو دیکھ کر تم اسے مجنوں کہہ دو گے کہ کبھی اوندھا ہو کر روشنائی میں گر گیا، کبھی سیدھا ہو کر باہر آ گیا، یہ مجنوں نہیں ہے بلکہ یہ تو ہزاروں عقل مندوں کو بنانے والا ہے، تو ہمارا پیغمبر بھی ہزاروں عقل مندوں کو دنیا میں وجود دینے والا ہے، تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں جنوں ہو تو نہ علم کا پتہ رہے نہ عقل و شعور کا پتہ رہے تو عقلیں علم سے جلا پاتی ہیں، اور علم پیغمبر لے کر آتے ہیں۔

عقول کے لئے جلا بخش علوم لانے والے نبی مجنوں ہو سکتے ہیں؟..... دیہات کے اندر یہ نہیں کہ لوگ عقل مند نہیں ہوتے بلکہ دیہات میں بعض ایسے ذکی الطبع ہوتے ہیں کہ شہر والے بھی ایسے نہیں ہوتے، لیکن چونکہ تعلیم نہیں ہوتی اس لئے عقلیں کندہ جاتی ہیں جلا نہیں پاتیں، عقلوں کو چلنے کا راستہ نہیں ملتا، تعلیم کے ذریعہ عقل کو چلنے کا راستہ ملتا ہے تو علم حقیقت میں عقل کو چلانے والا ہے یہ سارے عقلاء جو ہیں، ان کی عقلیں کندہ تھیں، جب علم سامنے آیا تو گویا چلے، اور علم حضرات انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، لوگ جسے علم کہتے ہیں، وہ تخیلات اور اوہام کا مجموعہ ہے، دماغ میں کچھ پریشان خیالات آگئے، آپ نے سمجھا عالم ہو گئے، علم وہ ہے جو پیغمبر سے منقول ہو کر آئے، اس سے عقلوں کو جلا ملتی ہے، آج یورپ والے علم نہیں رکھتے، مگر عقلیں اتنی بڑی ہیں کہ دنیا کو جگمگا رکھا ہے، مگر عقل معاد نہیں ہے، کہ انجام بنی کریں یا انجام کو سوچیں، اس لئے کہ اس علم کو قبول نہیں کیا جس سے عقل معاد جلا پاتی تھی، اور آخرت منکشف ہوتی تھی، غرض عقل مندوں کی عقلیں علم سے روشن ہوتی ہیں، اور علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں تو ہزاروں مجنوں کو عقل مند بنادیں اسے تم مجنوں کہتے ہو.....؟ تمہاری عقل میں یہ بات نہیں آتی، تو پوری طرح سے رد کر دیا کہ تم جاہل ہو تم پہچاننے نہیں ہو کہ پیغمبر کیا ہوتے ہیں.....؟ کیا کسی مجنوں کا یہ کام تھا کہ اتنی عظیم الشان کتاب لا کر پیش کر دے، کہ دنیا کے عقل مند حیران ہو جائیں، صدیاں گزر جائیں جس میں ایک شوئے کی ترمیم و تسیخ کی گنجائش نہ ہو اتنے بڑے عجائبات اتنے بڑے علوم، اتنا بڑا دستور اور اتنا بڑا قانون پیش کر دینا کہ عقل مند مجبور ہو کر کہیں کہ اس سے زیادہ بہتر ممکن نہیں، یہ کسی مجنوں کا بنایا ہوا کلام ہے یا کسی مجنوں میں صلاحیت تھی کہ اتنا بڑا قانون دنیا کے آگے پیش کرے، اس واسطے آثار کو دیکھیں تب بھی تمہارا دعویٰ غلط ہے کہ مجنوں سے یہ آثار نمایاں نہیں ہو سکتے۔

جو خود مسلوب العقل ہیں وہ نبی کو مجنوں کہتے ہیں..... حدیث کا ذخیرہ دیکھو، اتنا عظیم عقل و دانش کا ذخیرہ ہے کہ عقلا نے سپرین ڈال دیں کہ اس سے زیادہ دانش کی باتیں نہیں ہو سکتیں اس سے زیادہ فصاحت اور بلاغت نہیں آسکتی، جو کلام کرنے والا انتہائی فصاحت و بلاغت سے کلام کرے اور فصیح و بلیغ کلام میں وہ اصول پیش کرے کہ دنیا جھکنے پر مجبور ہو، کیا یہ مجنوں کا کام ہے کہ اتنے بڑے اصول دنیا کو دے دے؟ کروڑوں انسان اس کی راہ پر

چل کر جنت میں پہنچ گئے تو حق تعالیٰ نے ان کی انتہا درجے کی تردید فرمادی کہ تم اتنے بیوقوف ہو کہ تمہیں اتنی مونی بات سمجھ میں نہیں آتی.....؟ اب اگر کوئی دن کے وقت نصف النہار پر سورج ہو اور یہ کہنے لگے کہ صاحب! اندھیرا پھیلا ہوا ہے، سورج میں روشنی کا نشان نہیں ہے تو دنیا اس کو کیا کہے گی، یہی کہے گی کہ تو اندھا ہے، ساری دنیا کو سورج نظر آرہا ہے، ہر طرف چاندنا پھیلا ہوا ہے اور تو کہتا ہے کہ نہیں ہے تو سوائے اس کے یا تو اندھا یا تو مجنوں ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں، جن کی نبوت کا آفتاب نصف النہار پر ہے، عرب و عجم میں پھیل گیا، اور تمہیں یہ توفیق نہ ہوئی کہ مان لو، بلکہ یہ کہا کہ آپ تو مجنوں ہو، ایسا ہی ہے جیسے کوئی آفتاب کے بارے میں کہہ دے کہ یہ ظلمت محض ہے اس میں روشنی کا کوئی نشان نہیں تو دنیا اسے مجنوں کہے گی، تو جنونی خود بن گئے ہو، اور ہمارے پیغمبر کو مجنوں کہتے ہو، عقل تم میں نہیں اور بے عقلی کا الزام ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے ہو.....؟

دوسرے کو مجنوں بتلانا خود کے مجنوں ہونے کی علامت ہے..... اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو زیادہ مجنوں اور بیوقوف ہو وہ یوں سمجھا کرتا ہے کہ ساری دنیا مجنوں ہے، میں ہی عقل مند ہوں، پاگل خانے میں کبھی جانے کی نوبت آئی ہو، خدا کرے نہ آئی ہو اور آئندہ بھی نہ آئے، مگر سیر و تفریح کے لئے بھی جانا پڑ جائے تو قسم قسم کے مجنوں دکھائی دیتے ہیں، بعض مجنوں نہایت سنجیدہ گفتگو کرتے ہیں، لوگ حیران ہوتے ہیں کہ انہیں کیوں پاگل خانے میں بھیج دیا یہ تو بڑی سنجیدہ باتیں کر رہے ہیں، ساری باتیں کر کے اخیر میں کہیں گے کہ دنیا ساری مجنوں ہو گئی جو مجھے مجنوں کہتی ہے حالانکہ ساری دنیا میں مجنوں ہیں، مگر میرے اندر کوئی جنون نہیں ہے، اسی میں قلعی کھول دی، مجنوں ساری دنیا کو مجنوں سمجھتا ہے اور اپنے کو عقل مند سمجھتا ہے۔ یہی کیفیت ان مجنوں کی ہے کہ اپنے کو عقل مند سمجھتے ہیں اور جو سید العاقلین ہے انہیں مجنوں بتلا رہے ہیں، یہ ان کی عقل کی بات ہے یا ان کے جنون کی بات ہے.....؟ اس لئے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ الْعِلْمُ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ ”اے“ کو دیکھ لو، اس سے نبوت کی حقیقت واضح ہوگی، اس کو نبوت سے مناسبت ہے، قلم کی اور وہ جو سطور لکھتا ہے ان کی بھی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ﴿مَا اَنْتَ بِنِعْمَةٍ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبر! اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ساتھ آپ کبھی مجنوں نہیں ہو سکتے یہ جھوٹے ہیں، جو تمہیں مجنوں کہہ رہے ہیں، کسی مجنوں پر یہ (وحی و علم) کی نعمتیں اترتی ہیں؟ سب سے بڑی نعمت علم کی ہے، مجنوں کبھی علم قبول ہی نہیں کر سکتا، اور اگر پہلے تھورا بہت اس میں علم ہو تو بے ترتیب بیان کرے گا، نہ سر نہ پیر اس واسطے کہ عقل تو ہے ہی نہیں جو کلام مرتب کرے، تو خداوندی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت علم کی ہے وہ اللہ کی صفت ہے وہ بندے کو دی، وہ انسان کو دی جاتی ہے، علم سے ہی دنیا اور آخرت کے بھی راستے کھلتے ہیں۔ آج دنیا میں تمدن اور معاشرت کی جو جگہ گھاٹ ہے یہ علم ہی کا طفیل ہے، یہ جاہلوں نے تھوڑا ہی کیا ہے، کسی گدھے گھوڑے نے تھوڑا ہی تمدن بنایا ہے۔؟ انسانوں نے بنایا اور انسانوں میں سے پاگلوں اور مجنوںوں نے تھوڑا ہی بنایا عقلمندوں

نے بنایا، اور عقل مندوں میں سے انہوں نے بنایا جن کی عقلوں کو علم نے جلادی تو یہ ساری جلوہ گری علم کی ہے، علم سے راستے نکلتے ہیں تو دنیا آپ کی بھی تو علم سے اور آخرت آپ کی بھی تو وہ بھی علم سے، تو ساری نعمتوں کا اور کمالات کا دار و مدار علم کے اوپر ہے، جہالت پر نہ کبھی کوئی اچھا شرہ مرتب ہوا نہ قیامت تک کبھی ہوگا، غرض سب سے بڑی نعمت علم ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ﴿مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ اللہ نے آپ کو نعمت علم دی ہے، آپ مجنون ہو سکتے ہیں؟ مجنوں سے یہ علم اترتا ہے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا، مجنوں وہ ہیں جو اس علم کے قابل نہیں ہیں اور جن میں اس علم کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، تو سب سے بڑی نعمت علم ہے۔

اخلاقِ عظیم کے حامل بھی مجنون نہیں ہو سکتے..... اور اس کے بعد دوسری بڑی نعمت اخلاق ہے وہ کامل ترین اخلاق اور اعلیٰ ترین اخلاق جن سے دنیا مسخر ہو جائے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے اخلاق دیئے گئے کہ دنیا قدموں کے اوپر جھک گئی، دنیا نے ہار مان لی، اسلام اخلاق کے زور سے پھیلا، وہ اخلاق نبوت ہی تو تھے، تو جس ذات میں اتنے اخلاق کی نعمت بھری جائے وہ مجنون ہو سکتا ہے؟

عملِ صالح اور دوام بھی نفی جنوں پر دال ہے..... اور تیسری نعمت عمل صالح ہے، تو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ عمل صالح کرنے والا کون ہے؟ ان کا کوئی وقت عمل صالح سے خالی نہیں ہوتا، حدیث میں آپ کی شان فرمائی گئی: ”كَانَ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ“ ① آپ کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے فارغ نہیں ہوتا تھا، ہر وقت کبھی عملی ذکر، کبھی زبان کا ذکر، کبھی قلب کا ذکر، کبھی دماغ کا ذکر، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل، فراست، قوتِ قلب اور قوتِ ید الغرض تمام قوتیں ذکر اللہ میں لگی رہتی ہیں اپنے اپنے مناسب عمل کرتے ہیں، دماغ سوچ بچار کا عمل کرتا ہے، قلب اخلاق کا عمل کرتا ہے، ہاتھ پیر حرکات کا عمل کرتے ہیں، نبی کا ہاتھ نبی کا قلب و دماغ سب اللہ کے عمل میں محو ہوتا ہے، ہر وقت ذکر اللہ میں مصروف، تو جس کو ذکر اللہ اور عمل صالح کی نعمت مل جائے، کیا وہ مجنون ہوتا ہے؟ یا وہ وحی اور ایسی چیزیں قبول کر سکتا ہے؟

مجنوں بھی اصلاحِ عالم کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے؟..... تو نعمتیں یہ ہیں، علم کی نعمت، عمل کی نعمت، اخلاق کی نعمت، اور اس کے بعد عظیم نعمت ”اصلاحِ عالم“ اور دعوتِ الی اللہ کی نعمت ہے، تو ایک ذات بابرکات نے کروڑوں کے اندر روح پھونک دی، کروڑوں کو صحیح راستہ پر لگا دیا، کروڑوں بچھڑے ہوؤں کو اللہ کی بارگاہ سے جاملایا، تو یہ اصلاحِ عالم کیا مجنوں کا کام ہے۔

اجتماعیتِ عالم کی نعمت مجنوں کے ذریعہ ممکن نہیں..... اس کے بعد پانچویں نعمت دیکھی جائے تو اجتماعیتِ عالم ہے، پورے عالم کو ایک نکتہ پر ڈال کر ساری دنیا کو ایک کنبہ بنادیا، اخوتِ اسلامیہ پھیلا دی کہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں جہاں جہاں مسلمان ہیں، اگر وہ صحیح معنی میں مسلمان ہیں، تو وہ سب ایک دوسرے سے ملے

① الصحيح لمسلم، کتاب الخیض، باب ذکر اللہ تعالیٰ فی خیال الخیاض و غیرہا ج: ۱۲ ص: ۲۹۷ رقم: ۵۵۸.

ہوئے ہیں، اخوۃ اسلامی اور اسلامی برادری کا رشتہ ان کے اندر قائم ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا: ”مَثَلُ الْمُسْلِمِينَ كَرَجُلٍ وَاحِدٍ إِذَا اشْتَكَى عَيْنُهُ اشْتَكَى كُلَّهُ وَإِذَا اشْتَكَى رَأْسُهُ اشْتَكَى كُلَّهُ“ ① سارے مسلمانوں کی مثال ایک بدن کی سی ہے، اگر اس ایک بدن میں سر میں درد ہوگا سارا بدن بے چین ہوگا، آنکھ میں کھٹک ہوگی تو سارے بدن میں بے چینی ہوگی، انگلی میں زخم ہو گیا، سارے بدن میں بے چینی ہوگی، نیند نہیں آئے گی، زخم انگلی میں لگا ہے اور نیند آنکھ کو ختم ہوگی، آنکھ کہہ سکتی تھی، مجھے کیا تعلق؟ زخم تو انگلی میں لگا ہے، مگر وہ بے چین ہے۔ اس لئے کہ سارے اعضا میں حیات کا رشتہ مشترک ہے، اوپر سے نیچے تک حیات پھیلی ہوئی ہے، تو ایک مادہ اشتراک کی وجہ سے بدن کا ایک جز دوسرے جز پر راحت کا ہو یا کلفت کا ہوا اثر ڈالتا ہے، اسی طرح سارے مسلمان ایک جسم واحد کی طرح سے ہیں، ان میں ایمان اور اسلام کا رشتہ پھیلا ہوا ہے اگر ایک مسلمان کو مغرب میں چوٹ لگے گی تو مشرق والا مسلمان بے چین ہوگا کہیں دعا کر رہا ہے، کہیں چندے دے رہا ہے، کہیں اعانت کی فکر کر رہا ہے۔ عربوں پر، ترکوں یا مصریوں پر مصیبت آتی ہے، اور ہندوستانی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، کہیں چندے کر رہے ہیں، کہیں انجمنیں بنا رہے ہیں، کوئی کہے کہ بھائی! تمہیں کیا تعلق؟ تم ہندوستان میں وہ مصر میں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وطنیت کوئی چیز نہیں، اصل چیز اسلامیت ہے، وہ رشتہ مشترک ہے کوئی کہیں کا مسلمان ہوا سے ایذا پہنچے ہمارے دل کو ٹھیس لگے گی، جہاں اسلامی رشتہ ہی کمزور پڑ جائے وہاں وطنیت غالب آتی ہے، پھر وہ دوسرے وطن کی رعایت نہیں کر سکتے، لیکن جہاں اسلامی اخوت غالب رہتی ہے اور وطنی جذبات مضحل ہو کر نیچے پڑ جاتے ہیں تو مسلمانوں میں مشرق و مغرب ایک ہو جاتا ہے، یہ نعمت کس ذات کی برکت سے آئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ ایسا دین لا کر دیا کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں کو ایک کر دیا، تو نعمتوں کی کوئی حد ہے؟ علم کی نعمت انتہائی، اخلاق کی نعمت دیکھیں تو انتہائی، اخلاق عمل صالح کی نعمت دیکھو تو انتہائی، عمل صالح، اصلاح عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، اصلاح اجتماعیت عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، غرض کون سی معنوی نعمت ہے جو انہیں نہیں دی گئی۔

عالمی سلطنت و خلافت کی عظمت نفی جنوں کی مستقل دلیل ہے..... اب ظاہری نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت سلطنت ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سلطنت دی گئی کہ عالم میں اتنی بڑی سلطنت کسی کی بھی نہیں ہوئی، جہاں جہاں مسلمان نظر آ رہے ہیں یہ آپ ہی کی سلطنت ہے، آپ کے زمانہ خیر و برکت میں پورا حجاز پورا نجد اور پورا بحرین اسلامی فتوحات میں شامل ہو چکا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں دائرہ اور وسیع ہوا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شام، مصر اور تمام دوسرے ممالک تک پہنچا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے

① الصحيح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تراحم المسلمین وتعاطفهم وتعاوضهم ج: ۱۲ ص: ۴۷۰

زمانے میں آدھی دنیا پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرانے لگا، یہ خلافت نبوت نے نبوت ہی کے کاموں کی تکمیل کی، تو یہ سلطنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، اگرچہ بتدریج ظاہر ہوئی، آپ حدیث میں فرماتے ہیں کہ: مجھ پر اللہ تعالیٰ نے مشرق اور مغرب سب روشن کر دیئے اور میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک میری نگاہوں نے دیکھ لیا ہے اور میں نے مشرق و مغرب کو دیکھ لیا ہے، وقت آئے گا کہ یہ امت پوری کائنات پر غالب ہوگی، اور پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا، تو سلطنت کی نعمت کو دیکھا جائے تو اتنی بڑی سلطنت کی حد تکمیل تک پہنچ جائے، باقی یہ سلطنت جب بھی بنتی ہے پہلے چھوٹی ہوتی ہے پھر بڑھتی ہے، پھر بڑھتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت کی ابتداء مدینہ منورہ سے ہوتی ہے اور مکہ مکرم فتح ہوا، اس کے بعد آگے کام چلا، اس کے بعد آپ کے خلفاء کی فتوحات ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں بارہ خلفاء ہوں گے۔ ① آخری خلیفہ مہدی علیہ السلام ہیں، اور مہدی علیہ السلام کے وقت میں پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا، تو میرے خلفاء پورے عالم میں اسلام کی حقیقت کو پھیلا دیں گے، تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی حکومت ہوگی، خلافت وہی کام کرتی ہے جو اصل کام کرتی ہے، تو آپ کے خلفاء کا پورے عالم میں پھیل جانا اور سلطنت قائم کر دینا یہ درحقیقت آپ ہی کی سلطنت ہے، تو علم کی جتنی بڑی نعمت تھی سلطنت کی بھی اتنی ہی بڑی نعمت آپ کو عطا کی گئی تو علم میں، عمل میں، ذکر میں اخلاق میں اجتماعیت میں اور سلطنت و خلافت میں غیر معمولی طور پر آپ کو نوازا گیا، ہر چیز میں شانِ غالبیت نمایاں ہے۔ تو اتنی نعمتوں پر فرمایا گیا کہ آپ مجنوں ہوں گے ایسی ایسی نعمتیں کیا مجنوں کو دی جاتی ہیں، سارے عالم کی اصلاح فرما دیں، سارے عالم میں علم پھیلائیں، عالم میں اخلاق پھیلائیں، کیا یہ مجنوں کا کام ہے؟ تو فرمایا: ﴿هَٰذَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ اے پیغمبر! اپنے رب کی نعمتوں کے ساتھ آپ مجنوں نہیں ہو سکتے یہ نعمتیں مجنوں کے لئے آہی نہیں سکتیں، مجنوں وہ ہیں جو ان نعمتوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں، نہ ان کے پاس علم ہے نہ ان کے پاس عمل ہے، نہ ذکر اللہ ان کے پاس نہ اجتماعیت ان کے پاس نہ حکومت و انصاف ان کے پاس وہ مجنوں ہیں نہ کہ وہ جس کے پاس یہ ساری نعمتیں ہوں۔

غرض ان شہادت میں پیش کیا، قلم کو شہادت میں پیش کیا اور جو قلم لکھے اس کو شہادت میں پیش کیا، پھر نعمتوں کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا کہ: آپ مجنوں نہیں ہیں۔ تو ان اور قلم کی تو حسی مثالیں پیش کر دیں جس سے نبی اور نبوت کو سمجھا جاسکے اور نبی کے لئے نعمتوں کی ایک جنس بتا دی جس میں ساری نعمتیں شامل ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے نبی مجنوں نہیں ہو سکتا، عیاذ باللہ اگر نبی مجنوں ہو تو پھر سارے عالم میں عقل کہیں نہیں ہو سکتی، عالم میں سارے بیوقوف ہوں گے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کی عقل ساری امتوں کے عقل کے برابر بلکہ برتر ہوتی ہے، تو حق تعالیٰ نے یہ دعویٰ فرمایا، اور ان کے دعویٰ کو رد فرمایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے الزامات کا دفعیہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا..... اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام پر ہتھیں لگائی گئیں۔ انہوں نے خود اپنا دفعیہ کیا چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو قوم نے کہا کہ تمہارے اندر تو ضلالت اور گمراہی ہے تو خود فرمایا: ﴿قَالَ يٰٓقَوْمُ لَیْسَ بَیْ ضَلٰلَتِیْ وَ لَکَیْنِیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① میرے اندر ضلالت نہیں، میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول بھی کبھی گمراہ ہوتا ہے رسول تو ہدایت لے کر آتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو قوم کی طرف سے کہا گیا کہ آپ میں سفاہت اور بد عقلی ہے، انہوں نے خود دفعیہ کیا۔ ﴿یَقُوْمُ لَیْسَ بَیْ سَفَاھَۃٍ وَّلَکَیْنِیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ② مجھ میں بد عقلی نہیں میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول تو کامل العقل ہی کو کہتے ہیں، میں بد عقل کہاں؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی ہتھیں لگائی گئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہیں فرمایا کہ آپ اپنی مدافعت خود کر لو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود مدافعت فرمائی، چنانچہ لوگوں نے کہا کہ آپ شاعر ہیں، تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ﴾ ③ ہم نے آپ کو شعر نہیں سکھائے اور نہ آپ کی شایان شان ہے کہ آپ شاعر بنیں یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں میں شاعر نہیں ہوں بلکہ خود دعویٰ فرمایا ہمارا نبی گمراہی پر نہیں ہو سکتا، ہمارا نبی صحیح راستہ پر ہے۔ لوگوں نے کہا یہ نبی مجنون ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿مَا اَنْتَ بِمَعْمُوْمٍ وَّ لَکَیْنِیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ آپ مجنون نہیں ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ جتنی ہتھیں قوم نے لگائیں، حق تعالیٰ نے آپ آگے بڑھ کر دفعیہ کیا کہ آپ پیچھے رہیں، ہم دفعیہ کریں گے آپ کو لڑنے کی ضرورت نہیں، ہم لڑنے کے واسطے کافی ہیں، آپ ہمارا نام اونچا کیے جائیے، دعوت الی اللہ کا کام کرتے جائیے، ہتھیں جو لگائے گا، وہ خود بھگت لے گا، ہم ان سے از خود نمٹ لیں گے، آپ کو آگے آنے کی ضرورت نہیں، یہ ایک انتہائی محبت اور انتہائی خصوصیت کی بات ہے جس سے آپ کی محبوبیت واضح ہوتی ہے کہ اس درجہ حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ وہ اس میں پھانسا ہی نہیں چاہتے کہ آپ اپنی مدافعت خود کریں یہ کام آپ ہم پر چھوڑ دیں، آپ تو ہمارا وہ کام کریں جو ہم نے آپ کو سونپا ہے، آپ ذکر اللہ میں لگیں، علم میں لگیں، عمل میں لگیں، اصلاح عالم کریں، اجتماعیت پیدا کریں، لوگ برا بھلا کہیں گے تو ہم بھگت لیں گے، چنانچہ ایک جگہ خود فرمایا: ﴿وَذَرْنِیْ وَ اَلْمُکَذِبِیْنَ اُولٰٓئِیْ النُّعْمَۃُ وَمَہْلٰہُمْ فَلِیْلًا﴾ ④ یہ جو جھٹلانے والے ہیں انہیں اور مجھے چھوڑ دیں، آپ اپنا کام کریں، ہم ان جھٹلانے والوں سے نمٹ لیں گے۔ ﴿وَذَرْنِیْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا﴾ ⑤ اے پیغمبر! آپ مجھے چھوڑ دیں اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا اس کو چھوڑ دیں، ہم یہ نمٹتے رہیں گے آپ اپنا

① پارہ: ۸، سورہ: الاعراف، الآیہ: ۶۱۔ ② پارہ: ۸، سورہ: الاعراف، الآیہ: ۶۷۔ ③ پارہ: ۲۳، سورہ: یس،

الآیہ: ۶۹۔ ④ پارہ: ۲۹، سورہ: المزمل، الآیہ: ۱۱۔ ⑤ پارہ: ۲۹، سورہ: المدثر، الآیہ: ۱۱۔

کام کریں اس درجہ گویا حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ کسی چیز میں آپ کو پھانسا نہیں چاہتے کوئی اعتراض کرے، تو خود اعتراض کا جواب دینے کے لئے آگے تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ اپنا کام کیجئے آپ ان قصوب میں نہ پڑیئے۔

محبوب حق اور مجنون؟..... اگر آپ کو اس سے گھٹن پیدا ہوگئی کہ لوگوں نے میری بات کو نہیں مانا تو خود تسلی دی فرمایا: ﴿لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُضْطَرٍ﴾ ① آپ کو ہم نے کو تو ال بنا کر تھوڑا بھی بھیجا تھا، ڈرانے والا بنا کر بھیجا تھا آپ ڈراتے رہیں، کوئی نہ مانے تو جھک مارے گا آپ غم مت کریں، ہدایت اور گمراہی ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم جس کو چاہیں گے دے دیں گے، آپ اپنا کام کریں، اور فرمایا ﴿قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ﴾ ② آپ کہہ دیجئے مجھے وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا، مجھے تو داعی الی اللہ بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ دعوت دیں وکالت نہ کریں، کو تو ال نہ کریں، تو جب حق تعالیٰ کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ذرہ برابر اعتراض و جواب کے اندر آپ کو پھانسیں، اس کی کفالت خود ذمہ لے لی، کہ اگر کوئی اعتراض کرے گا جواب ہم دیں گے، تو یہ انتہائی محبوبیت کی علامت ہے، اور حق تعالیٰ جسے محبوب بنائیں وہ مجنون ہو سکتا ہے؟ کیا اللہ کو مجنون ہی سے محبت ہو سکتی ہے، جبکہ وہ کمالات اور برکات و خیرات کا سرچشمہ ہے، تو اور کسی طرف جھکے گا جس کے اندر خود خیر اور برکت ہو، خیر کے اندر علم عقل اور کمال یہ ہے، جہاں عقل نہ ہو جنون ہو وہ سرچشمہ کمالات کا نہیں ہے، حق تعالیٰ اس سے محبت نہیں فرماتے اس واسطے دعویٰ دلائل کے ساتھ نہایت مبرہن ہو کر ثابت ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون نہیں ہیں۔ اب عقل مندی کے آثار کیا ہیں؟ وہ اگلی آیت میں ارشاد فرمائے گئے ہیں: ﴿وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝﴾ کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دو الزامات لگائے تھے، ایک یہ کہ آپ مجنون ہیں اور یہ کہ معاذ اللہ آپ کی عقل اور اخلاق ٹھکانے نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے ان دونوں کا رد کیا، دعویٰ ایک ہی تھا بعضوں کا خیال تھا کہ معاذ اللہ آپ کو جنون کی بیماری ہے جس کی وجہ سے آپ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، اور یہی الزام ہمیشہ کفار کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر لگایا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں تشریف لے گئے اور تو حید خداوندی اور نبوت کی دعوت دی اور آیتیں اور نشانیاں بھی بیان کیں، تو اس نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ آپ کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اس نے کہا تھا کہ ﴿إِنِّي لَا أَظُنُّكَ بِمُسْمُوعٍ﴾ ③ اے موسیٰ! میں سمجھتا ہوں تم پر سحر کر دیا گیا ہے، تم جادو زدہ ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہو، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿إِنِّي لَا أَظُنُّكَ بِمُفْسِرٍ عَوْنٍ مَّشْبُورٍ﴾ ④ اے فرعون! میں سمجھتا ہوں تو ہلاکت زدہ اور تباہ شدہ ہے جو ایسی بہکی بہکی اور بیہودہ باتیں کر رہا ہے کہ

① پارہ: ۳۰، سورۃ: الغاشیۃ، الآیۃ ۲۲۔ ② پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۶۶۔

③ پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۱۰۱۔ ④ پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۱۰۲۔

اللہ کے نبی پر سحر زدہ اور جادو زدہ ہونے کا الزام لگا رہا ہے، جب دلیل ہاتھ میں نہیں ہوتی تو معاندین اس وقت اسی قسم کے الزامات دیا کرتے ہیں کہ یہ گمراہ ہے یا ان کو جنون ہو گیا ہے، یا ان پر کسی نے سحر کر دیا ہے، اس لئے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جنون کا الزام لگایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے اس کا جواب دیا کہ آپ ہرگز مجنون نہیں، اور اس پر دلیل کے طور پر چند شواہد اور آثار پیش کئے جن کی طرف اللہ کے لفظ سے اشارہ کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دلیلیں پیش فرمائیں جن کی طرف قلم سے اشارہ کیا کہ قلم میں جو بات ہے وہی ہمارے پیغمبر میں ہے، اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ معاذ اللہ ان کو جنون ہو گیا ہے، جنونی وہ ہیں جو ایسے دانا اور دانش مند پیغمبر کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح دلائل کی طرف نعمت کے لفظ سے اشارہ کیا تھا کہ جب ہم نے نعمتِ علم دی، نعمتِ عمل دی، نعمتِ اخلاق دی، نعمتِ اصلاح دی، اور نعمتِ تربیت دی، تو یہ مجنون کا کام نہیں ہوتا کہ وہ عالم کو تربیت دیدے، عالم کے سامنے بہترین علم و کمال کے نمونے پیش کرے، گویا مختلف قسم کے دلائل سے ان کا دعویٰ رد کر دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عقل الانبیاء علیہم السلام ہیں..... اس کے ساتھ ساتھ محض اصول سے سمجھا دینا اس وقت تک دلوں میں نہیں بیٹھتا جب تک تاریخی طور پر کچھ مثالیں بھی نہ پیش کر دی جائیں، یہ کام جنوں کا نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل کا ہے، تو میں نے عرض کیا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں جہاں علم کامل ہوتا ہے، وہیں عقل کامل بھی ہوتی ہے، اور اتنی بڑی عقل کہ پوری امت کو وہ عقل میسر نہیں ہوتی، اور جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری نبوتوں اور کمالات کا منہی ہیں ان کی تو عقل بھی سارے انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہونی چاہئے۔ چنانچہ وہب بن منبہ جلیل القدر تابعین میں سے ہیں اور کتب سابقہ کے بہت بڑے عالم تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اے کتابیں سابقہ انبیاء علیہم السلام کی پڑھی ہیں اور ساری کتابیں پڑھ کر میں نے ایک نتیجہ نکالا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب عقل پیدا کی تو اس کے سو حصے کئے، ایک حصہ پورے عالم کو دیا اور ۹۹ حصے تنہا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے، تو جلیل القدر تابعی ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک سارے انبیاء اور اولیاء اگلے پچھلے ان سب سے زیادہ اکمل اور اعلیٰ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی فیصلے سے سردارانِ عرب کی تلواریں میان میں چلی گئیں..... چنانچہ حضور علیہ السلام کی عقل مبارک پر بھی مختلف کتابیں لکھی گئیں، ایک تو آپ کا وحی کا علم ہے، وہ تو اپنی جگہ مسلمہ ہے، اس کے لئے قرآن کریم اور حدیث پاک سب سے بڑی دلیل ہے، لیکن جہاں تک آپ کی عقل مبارک کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی کتابیں لکھی گئیں، اور ایسے واقعات درج کئے گئے ہیں کہ آپ نے کیسے کیسے فیصلے محض عقل مندی سے فرمائے، اور کتنے بڑے بڑے جھگڑوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹوں میں سلجھا دیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ سال کی تھی، جوانی کا زمانہ

تھا، اور نبوت ملنے میں بھی ابھی پندرہ برس باقی تھے، تو اس وقت مکہ مکرمہ (رَازَہَا اللہُ شَرَفًا وَکَرَامَۃً) میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، اور مکہ مکرمہ چونکہ نشیب میں ہے تو ادھر ادھر کا پانی جمع ہو کر حرم شریف میں جمع ہو گیا، جس کی وجہ سے بیت اللہ شریف کی دیواروں میں شق پڑ گئے، حجر اسود اپنی جگہ سے ہل گیا، اور قریب تھا کہ پوری عمارت گر جاتی، سیلاب جب ہٹ گیا اور قریش نے مشورہ کیا کہ بیت اللہ شریف کو از سر نو بنانا چاہئے اور ساتھ میں مشورہ میں یہ بھی طے پایا کہ یہ اللہ کے گھر کی عمارت ہے، اور ہم لوگ ڈکیتیاں بھی ڈالتے ہیں، غصب بھی کرتے ہیں، لوٹ مار بھی کرتے ہیں تو ناجائز مال اس پاک عمارت میں نہیں لگنا چاہئے، اس لئے ہر ایک اپنی دانست میں جو اس کی بہت ہی حلال کمائی ہو اس میں سے روپیہ دے، لوٹ مار یا ناجائز مال کا اس میں کوئی دخل نہ ہو، چنانچہ چندہ کیا گیا، وہ اتنا نہیں تھا کہ پورے بیت اللہ شریف کو بنائے ابراہیمی پر قائم کر دے، اس میں زیادہ مال لگتا تھا، اس لئے حکیم کا حصہ چھوڑ دیا گیا، وہ اگرچہ بیت اللہ کا جزو ہے، مگر تعمیر میں ہم اس کو نہیں لاسکتے، اتنا پیسہ ہمارے پاس نہیں ہے، بہر حال تعمیر شروع ہوئی، اس کا واقعہ تو طویل ہے کہ کس انداز سے تعمیر کرتے تھے، تعمیر جب قد آدم کے قریب پہنچی اور حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کا معاملہ پیش آیا تو یہ ایک بہت بڑی فضیلت تھی کہ حجر اسود کس کے ہاتھ سے رکھا جائے اس لئے کہ جو بھی اس کو وہاں رکھ دیتا، تاریخ میں قیامت تک اس کا نام رہتا، تو قریش کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ میں اس کا مستحق ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں مستحق ہوں، غرض اس میں تکرار شروع ہوئی، اور اس درجے تک بات پہنچی کہ تلواریں نکل آئیں اور بیت اللہ کی تعمیر رک گئی، اور اس پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ پر کون رکھے؟

جھگڑا کرنا اور لڑنا یہ اہل عرب کی سرشت میں تھا، بہادر لوگ تھے، کوئی تھوڑی سی رنجش ہوتی تھی، وہ باتوں میں آ کر ایک جنگ کی صورت اختیار کر جاتی تھی، چنانچہ یہاں تلواریں کھینچ گئیں اور قریب تھا کہ کشت و خون شروع ہو جائے، تو ایسے میں ابوسفیان نے کہا کہ: بھائی لڑومت اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہاتھ کو روک لو، اور کل صبح کو یہاں جمع ہو جاؤ سب سے پہلے جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو وہ جو فیصلہ کر دے اس پر راضی ہو جاؤ، خواہ کسی سردار کے حق میں بھی فیصلہ کر دے۔ اس پر سب آمادہ ہو گئے، چنانچہ جب جمع ہوئے تو انتظار شروع ہوا کہ جو داخل ہو وہ فیصلہ کر دے، تو سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے، سب ایک دم چلا پڑے کہ جَاءَ مُحَمَّدٌ ۙ الْاَمِیْنُ محمد امانت والے آ گئے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ وہ نوجوان ہے کہ ان کی عقل پر سب کو اطمینان اور اعتماد ہے اور قریش میں اتنا بڑا دانش مند کوئی پیدا نہیں ہوا، جتنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یہ حق فیصلہ کریں گے۔ جس سردار کو یہ کہیں گے وہ سردار حجر اسود رکھے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو سردار ان قریش نے آ کر معاملہ پیش کیا، اور کوئی سردار اس پر تیار نہیں کہ وہ اس فضیلت سے پیچھے ہٹے ہر ایک چاہتا ہے کہ میں حجر اسود رکھوں، اور اپنی اپنی وجوہ استحقاق بھی بیان کر رہا ہے۔

آپ نے معاملہ سن کر ایسا عجیب و غریب فیصلہ فرمایا کہ حجر اسود کو خدا اپنے دست مبارک سے رکھا، اور سب کو رمی شریک کر لیا، کسی کو لڑنے کا موقعہ نہیں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور حجر اسود اس کے اوپر رکھ دیا اور فرمایا سارے سردار مل کر اس چادر کو اٹھائیں، سب نے مل کر اٹھایا، گویا اٹھانے میں سب شریک ہو گئے، اس کے بعد فرمایا تم سب مل کر مجھے وکیل بنادو کہ میں تم سب کی طرف سے اٹھا کر رکھ دوں، سب نے وکیل بنادیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھا کر حجر اسود رکھ دیا، تو ان پاک ہاتھوں سے پتھر رکھا گیا جو حقیقتہً مستحق تھے، اور سب کی وکالت جو کی تو سب کے سب شریک ہو گئے، سب راضی ہو گئے لڑائی جھگڑا سب ختم ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ آپ نے دانش سے ہی فرمایا تھا، اس وقت وحی کا تو قصہ ہی نہیں تھا، نبوت ملنے میں پندرہ برس باقی تھے، تو یہ محض کمال عقل سے فیصلہ تھا، تو اتنے بڑے بڑے سرداران اور دانش مندوں کا مجمع تھا، سارے مل کر وہ مسئلہ نہ سلجھا سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں سلجھا دیا، اور سب کو شریک کر کے خود ان کے سردار بن گئے، اور ان کو اپنے تابع کر لیا، لڑائی کا موقع نہ آیا، محض عقل و دانش سے یہ فیصلہ فرمایا تو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و دانش کا اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بڑی عقل مبارک تھی کہ سب بڑے بڑے دانش مندوں کی لڑائی اور جھگڑے کو آپ نے سلجھا دیا، یہ ایک واقعہ ہے۔

دوسرا عقلی فیصلہ..... ایک واقعہ اور یہ پیش آیا کہ ایک شخص کے بھائی کو کسی نے قتل کر دیا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا کہ کسی نے میرے حقیقی بھائی کو قتل کر دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دیت لے لے، یعنی قاتل سے اتنا مال لے لے جتنا ایک نفس کا بدل ہوا کرتا ہے، تو اس زمانے میں سواوٹ ایک نفس کے بدلے میں دیئے جاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو دیت اور خون بہا لے لے اس نے کہا میں اس پر تیار نہیں، فرمایا پھر معاف کر دے اس نے کہا میں اس کے لئے بھی تیار نہیں، فرمایا پھر قاتل کو قتل کر دے، یہ تجھے حق حاصل ہے، وہ اس پر راضی ہو گیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ قتل ہو، مگر اس کا یہ قانونی حق تھا، کیونکہ وہ نہ دیت لینے پر آمادہ تھا نہ معاف کرنا چاہتا تھا، تو تیسری صورت یہی تھی کہ قاتل کو قصاصاً قتل کر دیا جائے تو وہ تلوار لے کر اس کو قتل کرنے چلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ یہ قتل کر کے ایسا ہی ہوگا جیسا قاتل ہے، قاتل کے اوپر یہ ناراض ہے اس لئے کہ اس نے قتل کیا، جب یہ قتل کرے گا یہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا، لوگوں نے اس کے کانوں میں ڈال دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ تو نے اگر قتل کیا تو تو بھی قاتل کے درجے میں ہو جائے گا، ایک فعل بد اس نے کیا ایک تو کرے گا۔ اس نے کہا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں، اور میں قتل کر کے قاتل کے زمرے میں شامل ہو جاؤں گا، اس نے کہا میں خدا کے واسطے معاف کرتا ہوں، چنانچہ معاف کر دیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، آپ نے فرمایا: میرا مطلب یہ تھا کہ قتل کرنے والا وہ قاتل ہی جیسا ہوگا، یہ مطلب نہیں تھا کہ جیسا وہ گناہ گار ہے ویسا تو

بھی ہو جائے گا، اس نے اگر قتل کیا تو گناہ کیا، تو جب قصاص میں قتل کرتا ہے تو گناہ گار نہیں، مگر قتل کرنے والے کے مشابہہ ہو جائے گا تو میری مراد صرف یہ تھی کہ تو مشابہہ ہو جائے گا، یہ نہیں تھی کہ تو گنہگار بھی ہوگا، مگر اب معاف کر چکا تھا، اس لئے قاتل بچ گیا، تو آپ نے ایک جملہ سے اس کو بچا لیا، اور بچایا بھی اس طرح کے اس کی رضامندی بھی شامل ہو گئی، اس لئے کہ وہ مقتول کا وارث تھا، اس لئے اگر وہ معاف نہ کرتا تو بچنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قتل نہ ہوتا، تو اُسے قتل سے بھی بچا دیا، اور دوسرے کو معافی بھی دلا دی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء بھی پورا ہو گیا کہ وہ قتل نہ ہو۔ تو ایک جملہ بول کر کتنی چیزیں فائدے کی حاصل کیں، کہ اس کو قتل ہونے سے بچا لیا، دوسرے کو معافی دلا دی، آپ کا منشاء مبارک بھی پورا ہو گیا، یہ گویا دوسرا واقعہ ہے۔

تیسرا عقلی فیصلہ..... تیسرا واقعہ یہ ہے کہ غزوہ بدر کے اندر کفار کا لشکر پہاڑی کے اس طرف تھا، اور مسلمانوں کا لشکر ادھر تھا، کفار کا لشکر ایک ہزار سے کچھ زائد افراد پر مشتمل تھا، اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے، کفار کے پاس سواریاں گھوڑے وغیرہ سب کچھ تھا اور مسلمانوں کی ابتدائی حالت تھی، نہ دولت پاس تھی نہ پیسہ تھا نہ کیل کا نئے سے لیس تھے، بس دین اور جہاد کا جوش تھا، تو یہاں سامان کچھ نہیں تھا، چند گھوڑے چند اونٹ، باقی سب پیدل، تلواریں بھی باقاعدہ نہ تھیں، کسی کے پاس تلوار اور کسی کے پاس خنجر اور کسی کے پاس نیزہ، باقاعدہ اگر کوئی چیز وہاں تھی وہ جوش ایمانی کی چیز تھی، سامان کوئی باقاعدہ نہیں تھا، اس بے سروسامانی میں اللہ والوں کا یہ مختصر قافلہ ایک طرف تھا، اور وہ دشمنانِ خدا پوری طرح کیل کا نئے سے لیس دوسری طرف تھے، مشرکین کی فوج کا کوئی آدمی راستہ بھول کر صحابہ کرام کی طرف انکلا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اسے پکڑ لیا اور اس کو پوچھنا شروع کیا کہ بتاؤ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں، تاکہ ہم اس کی طاقت کا اندازہ کر لیں، اس نے کہا وَاللّٰہ لَکَیْنِیْزُ بہت بھاری جمیعت اور اکثریت ہے یہ رعب ڈالنے کے لئے اس نے کہا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین عدد پوچھنا چاہتے تھے، وہ عدد بتانا نہیں تھا، اس پر دباؤ والا سختی کی کہ کسی طرح سے یہ بتا دے کہ کفار کے لشکر کی کتنی تعداد ہے مگر وہ بھی پکا آدمی تھا، بول کے نہیں دیا، اور یہ کہتا رہا۔ وَاللّٰہ لَکَیْنِیْزُ بہت بڑی جمیعت اور بڑا ساز و سامان ہے، تاکہ مسلمانوں کو مرعوب کر دے، اس میں جب ذرا آوازیں بلند ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا: کیا شور ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! دشمن کے کمپ کا ایک آدمی ادھر آچھنسا ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ دشمن کی تعداد معلوم کریں اور وہ بتاتا نہیں۔ ارشاد فرمایا چھوڑ دو، کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کیا ہے، اسے چھوڑ دیا، وہ بھی بے چارہ مومن ہوا، ورنہ اسے اندیشہ تھا کہ قتل کر دیتے اور جائز بھی تھا اس لئے کہ دشمن کا آدمی تھا اور مباح الدم تھا، اس کو جنگ میں قتل کرو یا ویسے قتل کرو، دونوں طرح جائز تھا اس لئے کہ وہ اسلام کا مد مقابل تھا تو چھوٹنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ادھر ادھر کی ایک دو بات کر کے فرمایا: تمہارے لشکر میں روز کتنے اونٹ ہیں ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا اوس اونٹ روز اندھ ذبح ہوتے ہیں، فرمایا معلوم ہو گیا ہزار آدمی ہیں اس لئے کہ ایک اونٹ

سو آدمی عاۃً کھانا کھا سکتے ہیں، تو نہ کوئی جھگڑا ہوا نہ کوئی قصہ ہوا، اسی سے کہلوادیا کہ ایک ہزار کی جمعیت ہے، صحابہ بھی خوش ہو گئے، تعداد بھی معلوم ہو گئی اور اسے چھوڑ دیا کہ اس پر احسان بھی ہوا کہ جا اپنے لشکر میں بھاگ جا اور یہ اثر لے کر گیا کہ مسلمان کریم انفس ہیں کہ دشمن آدمی قبضے میں آجائے پھر بھی اس کے ساتھ عنایت کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کریمانہ اثر مان کر وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا، اب اس نے وہاں جا کر جو کچھ بھی کہا ہوگا بہر حال اس کی جان بچ گئی، لشکر کی تعداد بھی معلوم ہو گئی، کوئی جھگڑا اور سختی بھی نہ ہوئی یہ محض دانش مندی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم فرمایا، وحی کے ذریعہ سے علم نہیں بھیجا گیا تھا، تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی دانش وری بڑی ہوتی ہے اور وہ منہوں میں اپنی دانش سے فیصلے کر لیتے ہیں۔

چوتھا عقلی فیصلہ..... چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا کہ دو عورتیں ایک بچے کو لے کر آئیں ایک بچے پر دو عورتوں کی لڑائی تھی، ایک کہتی تھی میرا بچہ ہے دوسری کہتی تھی میرا بچہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کچھ قرآن سے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا کہ بچہ اس کا ہے، جب وہ چلنے لگی تو چھوٹی عورت راضی نہ ہوئی جس کا واقعی میں بچہ تھا، اس نے کہا ہم سلیمان علیہ السلام سے فیصلہ کرائیں گے ان کے فیصلے زیادہ دانش مندانہ ہوتے ہیں، تو دونوں وہاں حاضر ہوئیں، اور وہی دعویٰ پیش کیا اور بڑی نے کہا کہ لکھے حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ بھی کر دیا کہ میرا بچہ ہے، مگر چھوٹی کا اصرار تھا کہ میرا بچہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقت میں کس کا بچہ ہے تو اس کی ایک تدبیر اختیار فرمائی، فرمایا ایک چھری منگو او بچے کو کاٹ کر آدھا آدھا تقسیم کر دو، چھری کا نام سنتے ہی تو بڑی عورت پر اس کا کوئی زیادہ اثر نہ ہوا اس لئے کہ اس کا بچہ نہیں تھا، مگر چھوٹی تلملا گئی اس نے کہا آپ اسے قتل نہ کریں، اسے ہی دے دیں، یہ زندہ رہے گا تو میں کبھی دیکھ تو لیا کروں گی، تو بڑی پر اثر نہ ہوا، اور چھوٹی کی اس کیفیت سے اندازہ ہو گیا کہ چھوٹی اس کی ماں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بچہ اسے دے دیا اور اس کے حق میں فیصلہ کر دیا، یہ محض دانش مندی سے فیصلہ کیا، ایک ایسی تدبیر فرمائی اور ایسا جملہ کہہ دیا کہ چہرے سے معلوم ہو گیا کہ یہ ماں ہے اور یہ ماں نہیں ہے، ماں کا چہرہ بتلا دیتا ہے کہ واقعی میں اس کی اولاد ہے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کو جیسے کمال علم دیا جاتا ہے ویسے ہی کمال عقل بھی دی جاتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، تو جتنی بڑی نبوت ہے، اتنی بڑی عقل بھی ہونی چاہئے۔

عقل علم کے لئے اور طبیعت عمل کے لئے محل نزول ہے..... اس لئے کہ انسان میں دو چیزیں ہوتی ہیں عقل اور طبیعت، یہ دو طبعی چیزیں ہیں جو انسان میں پیدا کئی ہیں، علم جتنا اترتا ہے انسان کی عقل پر اترتا ہے، وہ اسے قبول کرتی ہے، تو جتنی بڑی عقل ہوتی ہے، اتنا ہی علم بڑا ہو کر پھیل جاتا ہے، وہی علم اگر کسی بیوقوف کے اوپر پیش کیا جائے تو ذرہ برابر نہ وہ پھیلے گا نہ اس کے دل میں جے گا اس لئے کہ علم کے لینے والی طاقت وہ عقل ہے، وہ اس میں نہیں ہے غرض عقل پر تو علم اترتا ہے، اور طبیعت پر عمل اترتا ہے، اس لئے کہ طبیعت کے جذبات

ہیں، طبیعت میں سوجھ بوجھ نہیں ہے جذباتی چیز ہے، جذبے سے عمل کرتی ہے، نہ وہاں دلیل کا دخل ہوتا ہے نہ سوجھ بوجھ کا۔ آپ کو بھوک لگتی ہے تو کیا آپ دلیلوں سے بھوک لگاتے ہیں کہ کچھ دلائل قائم کریں کہ مجھے بھوک لگنی چاہئے اور بھوک لگ گئی، ہزار دلیلیں آپ قائم کریں کہ بھوک نہ لگے مگر وہ ایک طبعی جذبہ ہے وہ تو لگ کے رہے گی تو بھوک عقل سے نہیں آتی وہ طبعی جذبے سے آتی ہے، پیاس طبعی جذبے سے آتی ہے، آدمی استیجا کرنے طبعی جذبے سے جاتا ہے، یہ نہیں کہ پہلے دلائل قائم کرتا ہے کہ مجھے اب عقلاً استیجا کے لئے جانا چاہئے، اور اتنا وقت مجھے لگانا چاہئے، اور اگر دلیل میں کچھ خلل ہو گیا تو پیٹھ گئے کہ ابھی دلیل مکمل نہیں ہوئی اس لئے مجھے ٹھہر جانا چاہئے، تو استیجا کے لئے مجھے جانے پر آپ ہزار دلیلیں قائم کریں، مگر وہ طبعی جذبہ ہے، وہ تو اندر سے جذبہ اٹھے گا، تو طبیعت کے اندر عقل، شعور اور سمجھ نہیں ہے، اس کے اندر جذبات ہیں، اور عمل کے لئے جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، اگر جذبہ نہ ہو تو آدمی عمل نہیں کر سکتا، تو اللہ نے طبیعت کو عمل کی دلیل بنایا ہے اور عقل کو علم کی دلیل بنایا ہے، طبیعت پر عمل اترتا ہے اور عقل راستہ بتلاتی ہے کہ اس جذبے کو یوں استعمال کرو، تو دو چیزیں ہوتی ہیں ایک عقل اور ایک طبع تو نبی کی عقل بھی تمام امت کی عقل سے زیادہ کامل ہونی چاہئے تاکہ اتنا بڑا علم اس کے اوپر اتر سکے جس سے پوری امت کی تربیت ہو، اور طبیعت اتنی مضبوط ہونی چاہئے کہ بڑے سے بڑا عمل سامنے آئے تو کوئی رکاوٹ اور تامل نہ ہو، جذبہ اتنا صادق اور قوی ہو کہ بڑے سے بڑا عمل کر گذرے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی قوی بھی تمام امت کے قوی سے افضل اور اونچے تھے، اور عقلی قوی بھی تمام امت کے قوی سے افضل اور اونچے تھے، انہی قوی عقلیہ کے اوپر اتنا اونچا علم اتر جس سے پورے عالم کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت فرمائی۔

پڑوسی کی ایذا رسانی سے تحفظ کی عقلی تدبیر..... اسی میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ایک شخص کا پڑوسی تھا، اور وہ بہت تنگ کرتا تھا، تکلیفیں پہنچاتا تھا ایذا سیں دیتا تھا، اس شخص نے خوشامدی کیں، اور منتیں بھی کیں اور کہا خدا کے لئے مجھے مت ستا، میں نہ تجھے تکلیف دیتا ہوں نہ ستاتا ہوں اپنے گھر میں رہتا ہوں، مگر وہ باز نہیں آتا تھا، ہر قدم کے اوپر تکلیف کا سامان اور ایذا رسانی زبان سے عمل سے، غرض یہ شخص عاجز آ گیا اور شکایت لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ یا رسول اللہ! پڑوسی نے مجھے عاجز کر دیا ہے، میں نے منت سماجت اور خوشامدی میں کسر نہیں چھوڑی، لیکن وہ ایسی گندی طبیعت کا آدمی ہے کہ بس ستائے جاتا ہے باز نہیں آتا، میں کیا کروں؟ آپ نے تدبیر بتلائی، فرمایا سارا سامان نکال کر اور عورتوں بچوں کو نکال کر گھر کے سامنے بٹھلا دے، اور گھر خالی کر دے، اگر کوئی آکر پوچھے کہ بھائی! تمہارا گھر موجود ہے، یہ سڑک پہ سامان کیوں ڈالا؟ بیوی بچوں کو سڑک پہ کیوں بٹھایا؟ تو کہہ دینا کہ پڑوسی ستاتا تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی! گھر چھوڑ کر سڑک کے اوپر بیٹھ جا۔ اس نے جا کر یہی کیا، سارا سامان لے کر سڑک پہ رکھ دیا، بیوی بچوں کو لا کر بٹھا دیا، اب لوگ آئے کہ بھائی! تمہارا تو گھر موجود ہے سڑک پہ کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا کیا کروں پڑوسی

ستاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھر چھوڑ دے، سڑک کے اوپر بیٹھ جا، لوگوں نے کہا اس مردود کے اوپر لعنت ہے، اس کے بعد ایک دوسری جماعت آئی کہ بھائی کیوں باہر بیٹھے ہو؟ اس نے کہا پڑوسی ستاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باہر بیٹھ جا، انہوں نے کہا لعنت ہے اس مردود کے اوپر، اب جو جماعت آرہی ہے، صبح سے شام تک لعنت لعنت اور سارے مدینہ میں لعنت لعنت کا شور ہوا، اور ہر گھر میں اس پر لعنت چلی آرہی ہے، وہ پڑوسی بے چارہ عاجز آ گیا اس نے آکر ہاتھ جوڑے کہ اللہ کے واسطے تو گھر چل میں عہد کرتا ہوں کہ قیامت تک تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا، اس نے کہا نہیں بھائی! میں نہیں جانا چاہتا، مگر وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ اللہ کے واسطے چل، تو نے تو مجھے ملعون بنادیا، ساری دنیا کی زبان پر لعنت لعنت آ گیا، غرض زبردستی اس کا سامان لے جا کر رکھا، جگہ جگہ قرینے سے لگایا، اور عہد کیا کہ میں عمر بھر کبھی نہیں ستاؤں گا، چنانچہ پھر کبھی نہیں ستایا بلکہ خادم بن کے رہا، یہ تدبیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے نہیں فرمائی تھی بلکہ عقل و دانش سے تدبیر فرمائی پڑوسی بھی تاب ہو گیا، برائیوں سے بچ گیا گھر والا اپنے گھر میں آباد ہو گیا، اور اسے سزا بھی ایسی مل گئی کہ عمر بھر اس نے کبھی ایسی سزا نہ دیکھی ہوگی کہ ساری زبانوں پر ملعون بن گیا، یہ دانش کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا، کہ گھر مالک سے آباد ہو گیا، اور پڑوسی خادم بن گیا، اس کی بد عادتیں چھوٹ گئیں تو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ تدبیر ایسی فرماتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم سے بھی توبہ کرے اور ساتھ میں جو صاحب حق ہے اس کا کام بھی بن جائے۔ اسی طرح جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے زیادہ قریب ہوتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے علم و عقل اور عمل میں زیادہ رتبہ والے ہوتے ہیں، ان میں بھی یہی عقل کامل آتی ہے جس سے وہ فیصلے کرتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ”کتاب الاذکیا“ ہے یعنی جو بڑے بڑے اذکیاء گزرے ہیں ان کی ذکاوت اور ذہانت کے واقعات کہ عقل سے انہوں نے کیا کیا کام کئے اور ان کے مقولے لکھے ہیں۔

مجموعہ عالم کے لئے حماقت بھی نعمت ہے..... اسی طرح ایک ”کتاب الحمقاء“ لکھی ہے کتاب الاذکیاء میں دانش مندوں کے واقعات جمع کئے ہیں اور کتاب الحمقاء میں بے وقوفوں کے واقعات جمع کئے ہیں اس لئے کہ جب تک بے وقوفوں کی بے وقوفیاں نہ معلوم ہوں دانش مندوں کی دانشمندی نہیں کھلتی وَبَصِيْطَہَا تَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ ایک ضد سے ہی دوسری ضد پہچانی جاتی ہے۔ اگر دنیا میں بے وقوف نہ ہوتے تو عقل مندوں کی عقل کبھی نمایاں نہ ہوتی، تو حقیقت میں بے وقوفوں کا وجود بھی دنیا میں بہت غنیمت ہے، خدا انہیں سلامت رکھے اگر یہ بیوقوفی نہ کریں تو عقل نہیں کھل سکتی، تو جہاں مجموعہ عالم کے لئے عقل نعمت ہے، وہاں حماقت بھی نعمت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں پارٹیاں پیدا کیں، ذہینوں کی بھی اور بلیدوں کی بھی، ذکیوں کی بھی اور احمقوں کی بھی دونوں کا ٹکراؤ رہتا ہے اور دونوں کے ٹکراؤ سے حقیقت کھلتی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلندی عقل..... امام ابو حنیفہؒ ان کی دانش مشہور ہے، اور تمام علماء کرام ان کی

عقل و دانش کے قائل تھے، علم تو تھا ہی مگر عقل بھی بہت اونچی تھی، ایک دفعہ دمشق کی جامع مسجد میں امام ابی حنیفہؒ نے نماز پڑھی، سلام پھیرا تو ایک ہجوم ان کے ارد گرد آگیا، کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی مصافحہ کر رہا ہے، امام مالکؒ ایک طرف کھڑے ہوئے تھے، ساری مخلوق امام ابی حنیفہؒ پر جھک گئی، ایک شخص نے امام مالکؒ سے پوچھا یہ کون شخص ہے کہ ساری دنیا اس پر گر رہی ہے، اور اس پر جھکی جا رہی ہے، اور شاربونا چاہتی ہے، کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی پاؤں پڑ رہا ہے، امام صاحبؒ نکلنا چاہتے ہیں مگر لوگ نکلنے نہیں دیتے ہر طرف بے شمار آدمی ہیں؟

امام مالکؒ نے فرمایا تو نہیں جانتا یہ کون شخص ہے؟ اس نے کہا میں نو واقف نہیں، ارشاد فرمایا یہ وہ شخص ہے اگر جامع دمشق کے اس پتھر کے ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہے تو ثابت کر دے گا اور دنیا ماننے پر مجبور ہوگی کہ یہ واقعی سونے کا ہے، یہ ایسا شخص ہے۔ اس لئے امام صاحبؒ کے عجیب عجیب واقعات ہیں، جو دانش مندی سے انہوں نے طے فرمائے، جھگڑے یا مقدمات تھے، ان میں مسئلہ سے باہر نہیں نکلے مگر عقل و دانش سے معاملات کا فیصلہ فرمادیا۔ چنانچہ ایک شخص کی اپنی بیوی سے کچھ لڑائی رہتی تھی، آپس میں دونوں کی بنتی نہیں تھی، بیوی خاوند کو منہ لگانا نہیں چاہتی تھی خاوند اس پر سو جان سے عاشق تھا مگر کچھ مزاج سے بھی مجبور تھا، اس لئے کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی، تو ایک دن دونوں چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے، بات چیت ہو رہی تھی تو اس نے کوئی جملہ ایسا کہہ دیا جس سے عورت کا دل دکھا اور وہ صدمے کی وجہ سے چپکی ہو کے بیٹھ گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ہر چند کہا کہ بولتی کیوں نہیں؟ اب وہ بولتی نہیں، اس نے کہا اگر صبح کی اذان سے پہلے نہ بولی تو تیرے اوپر طلاق، وہ تو بولنا نہیں چاہتی تھی، خاوند بولنا چاہتا تھا، وہ چپ بیٹھی تھی، اس نے کہا اچھا چپ بیٹھی رہ، اگر تو صبح سے پہلے نہ بولی، اسی طرح ثابت رہی صبح کی اذان تک تو تیرے اوپر طلاق۔ عورت کے ہاتھ میں بات آگئی اس نے سوچ لیا کہ اب میں صبح کی اذان تک بولوں گی نہیں، تاکہ میں مطلقہ ہو جاؤں اور اس کے بچے سے چھوٹوں۔ اب یہ بے چارہ کہہ تو گذرا، مگر یہ اب اور زیادہ چپ ہو کر بیٹھ گئی، خاوند نے کہا اگر واقعی یہ نہ بولی اور اذان ہوگئی، تو یہ ہاتھ سے نکل جائے گی اس نے منٹیں کی اور ہاتھ جوڑے، مگر اس نے کہا اب تو بات قبضے میں آگئی، الغرض خاوند نے منٹیں کی کس خوشامدی کس جب کسی طرح راضی نہ ہوئی اور مایوس ہو گیا کہ صبح کی اذان ہوئی اور یہ میرے ہاتھ سے نکلی، تو علماء کا دروازہ جھانکنا شروع کیا اور آئمہ فتویٰ کے گھروں پہ آیا کہ یہ صورت ہوگئی ہے، انہوں نے کہا بہر حال اگر وہ بول پڑی تو تیرے قبضے میں رہے گی ورنہ تیرے قبضے سے نکل جائے گی، وہ بہت بے چارہ حیران ہوا اور اب اسے یقین ہو گیا کہ بیوی میرے ہاتھ سے گئی، آخر امام ابی حنیفہؒ کے پاس پہنچا، حضرت یہ قضہ ہے اور میں خود اپنے قول کی وجہ سے مبتلا ہو گیا، میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر تو صبح کی اذان تک چپ رہی تو تیرے اوپر طلاق ہے وہ تو چپ ہو کر بیٹھ گئی تو طلاق پڑ جائے گی، فرمایا کہ طلاق نہیں پڑے گی، جا اپنے گھر جا کے آرام کر، اور گھر والی کو بولنے پر آمادہ کر، لیکن اگر نہ بھی بولی تو بھی طلاق نہیں پڑے گی، اس نے کہا کیسے نہیں پڑے گی، فرمایا تو جا، جا کر بلوانے کی کوشش کر، وہ پھر گھر

آیا، اس نے ہر چند منٹیں کیں، مگد گدیاں اٹھائیں، ہنسی میں کہا، مگر وہ عزم کر کے بیٹھی ہوئی ہے کہ میں اب نہیں بولوں گی اور مجھے طلاق ہو جائے گی، اور فرمایا تھا کہ جاگتے رہنا، اور کوشش جاری رکھ شاید بول پڑے۔ امام ابو حنیفہؒ چلے رات کے تین بجے ہوں گے اور مسجد میں آکر اذان دے دی، وہ سمجھی کہ صبح کی اذان ہے، اس نے کہا دیکھ اذان ہو گئی ہے اب میں تجھ سے جدا ہو گئی ہوں، اب یہ بے چارہ حیران کہ طلاق تو ہو گئی، مگر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھی غلطی ہو گئی کہ یہ صبح کی اذان نہیں تھی یہ تہجد کی اذان تھی، اب یہ بے چاری بچھتاؤ تو امام صاحبؒ نے دانش مندی سے ان کی بیوی بچادی، یہ مسئلہ کی بات نہیں تھی، یہ دانش مندی اور عقل مندی کی بات تھی، اسی بات کو مسئلہ کے اندر لیا، مسئلہ سے باہر نہیں ہوئے مگر فضا ایسی پیدا کر دی کہ طلاق سے بچ جائے۔

حضرات اہل اللہ عقل میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں..... تو جیسے حضرات اہل اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں خلیفہ ہوتے ہیں ویسے ہی عقل و دانش میں بھی خلیفہ ہوتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ مجلس میں ایک شخص حاضر ہوا کرتا تھا، ایک روز مجلس میں رو رہا تھا، ایک دن وہ اپنے گھر جا کر سویا، مال دار آدمی تھا، تو رات کو گھر چور آ گئے، سارا مال و اسباب انہوں نے سمیٹنا شروع کیا، تو یہ پڑا ہوا دیکھتا رہا، چور بہت تھے، یہ تنہا تھا، لیکن جب سارا مال و اسباب سمیٹ کر جانے لگے تو اس نے کچھ ایسی حرکت کی وہ سمجھ گئے کہ یہ جاگ رہا ہے، چوروں نے مال و اسباب کو چھوڑا اور آکر اس کے گلے پر چھری رکھی، اور کہا خبردار جو بولا، اب یہ بے چارہ جان بچانے کی خاطر دب گیا، ورنہ چلا تا تو شور ہوتا، محلہ والے جمع ہو جاتے چور پکڑے جاتے، مگر چوروں نے زبردستی اس کو چپکا کر ادیا، اس کے منہ میں روٹی وغیرہ دے دی اور مال بٹورتے رہے، ہاتھ پیراس کے باندھ دیئے، جب یہ جانے لگے تو چوروں کو یہ فکر ہوئی کہ جب صبح ہوگی تو آکر اس کے منہ سے کوئی تو روٹی نکالے گا، یہ ہمیں پہچان چکا، ہیں تو ہم محلہ ہی کے، اور صبح یہ خبر دے گا بات وہیں کی وہیں رہی پھر پکڑے گئے، تو کسی نے کہا اسے قتل کر دو، تو کہا کہ چوری کا جرم تو کیا ہے قتل ناحق کا بھی جرم سرلو، یہ صحیح نہیں۔ اس زمانے کے چور بھی آدھے مولوی تھے، اس لئے کہ فقہاء کا دور تھا، تو انہوں نے آکر اسے یہ کہا کہ تو اس بات کا عہد کر کہ ہمارا پتہ نشان کسی کو نہیں بتلائے گا، اس نے جان بچانے کی خاطر عہد کیا، مگر چوروں کو یہ شبہ تھا کہ اس نے عہد تو کر لیا، لیکن اگر یہ عہد شکنی کرے پکڑے تو پھر بھی جائیں گے، کسی ایسے انداز سے باندھ دو کہ یہ ہمارا پتہ نہ دے سکے، تو چوروں نے یہ کہا کہ تو طلاق مغلطہ کی قسم کھا کہ: اگر میں نے تمہارا کسی کو پتہ دیا تو میری بیوی کو تین طلاق۔ اس نے جان بچانے کے لئے طلاق مغلطہ کا حلف اٹھا لیا، اب چور مطمئن ہو گئے، اس واسطے کہ وہ جانتے تھے دیانت کا زامانہ ہے جھوٹا حلف اٹھانا قتل ہو جانے سے اہم سمجھا جاتا ہے تو یہ جھوٹ نہیں بولے گا، اگر بولے گا تو بیوی ہاتھ سے جائے گی، سزا بھی بھگتے گا، حلف ہی ایسا تھا، اب چور مطمئن ہو کر مال لے کر چلے گئے، اور یہ بے چارہ بندھا ہوا بیٹھا ہے، چوروں کو جانتا ہے مگر بتا نہیں سکتا، اس لئے کہ اگر بتاتا ہے تو بیوی پر طلاق پڑتی ہے، عجیب کیفیت میں مبتلا ہے۔ فقہاء کے

دروازوں پہ گیا اور کہا یہ قصہ ہے، چوروں کو جانتا ہوں مگر بتلا نہیں سکتا، اس لئے کہ بتلاؤں گا تو بیوی پر طلاق پڑ جائے گی، تو سارے فقہاء نے یہ کہا کہ بھائی! یا مال رکھ لے یا بیوی رکھ لے، اگر تو پتہ بتلا دے گا تو بے شک بیوی ہاتھ سے نکل جائے گی مگر مال مل جائے گا، اور اگر نہیں بتلاتا تو مال نہیں ملے گا، مگر بیوی تو قبضہ میں ہے، دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں کہ مال بھی مل جائے اور بیوی بھی رہے ایک چیز پسند کر لے، غرض یا لاکھوں روپے کا مال جاتا ہے یا لاکھوں کی بیوی جاتی ہے۔

اخیر میں بے چارہ بہت پریشان اور دم بخود ہو کر امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ مجلس میں پریشان بیٹھا ہوا تھا، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی! تم آج بہت اداس ہو اور غمگین نظر آتے ہو۔ انہوں نے کہا، جی ہاں! کچھ واقعہ ایسا ہی ہے۔ فرمایا کیا واقعہ ہے؟ بولوں گا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا، آپ نے فرمایا بندہ خدا کچھ تو بتا کیا ہوا، عرض کیا: حضرت! یہ قصہ پیش آیا کہ چور آگئے مال لے گئے، اور مجھے طلاق مغلطہ کا حلف دے گئے، اور اب میں چوروں کو جانتا ہوں لیکن بتلاتا ہوں تو بیوی ہاتھ سے جاتی ہے، اور نہیں بتلاتا تو مال ہاتھ سے گیا۔

امام صاحبؒ سمجھ گئے فرمایا: تو اطمینان رکھ مال بھی نہیں جائے گا، بیوی بھی رہ جائے گی اور تو بتا بھی دے گا، اس نے کہا حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا: تو فکر نہ کر، ہو جائے گا۔ فرمایا: تو ایسا کر کہ اپنے محلہ میں اعلان کر دے کہ کل امام ابو حنیفہؒ میرے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھیں گے، اور چوروں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ اعلان ہوا، تو ہزاروں آدمی جمع ہوئے اس لئے کہ معاملہ ایسا سنگین تھا کہ دو چیزوں میں سے ایک چیز رکھ سکتا تھا، دور کھٹے کے کوئی معنی نہیں تھے، اور شہرت یہ ہو گئی کہ امام صاحبؒ نے مسئلہ کوئی ایسا بتا دیا ہے کہ مال بھی ہاتھ آجائے بیوی بھی نہ جائے اور پتہ بھی بتلا دے، تو تمام فقہاء نے غم و غصہ کا اظہار کیا، کیا ابو حنیفہؒ حرام کو حلال بنانا چاہتے ہیں؟ جب وہ بتائے گا تو یقیناً بیوی مطلقہ ہو جائے گی۔ امام صاحبؒ نے مقررہ وقت پر آ کر نماز پڑھی تو محلہ ہی کے چور تھے وہ بھی آئے، ہزاروں کا مجمع ہو گیا کہ امام صاحبؒ اجتماع ضدین کا مسئلہ کیسے حل کریں گے، امام صاحبؒ کھڑے ہو گئے، اور اس شخص کو بھی کھڑا کیا، اور فرمایا لوگ مجمع بن کر مسجد سے نہ نکلیں ایک ایک آدمی نکلے اور اس سے یہ کہا کہ جب آدمی گزرے تو یہ کہنا کہ یہ چور نہیں ہے، یہ چور نہیں ہے اور جب چور آجائے تو چپ کھڑے ہو جانا، تو آدمی جب گزرے تو یہ کہتا رہا کہ یہ چور نہیں، اور جب چور آئے تو یہ چپ کھڑا تو چور پکڑے گئے اور اس نے بتلا بھی دیا کہ یہ چور ہے مگر اس طرح نہیں بتلایا کہ یہ چور ہے اس طرح بتاتا تو بیوی پر طلاق پڑتی، مگر وہ چپ رہا تو چپ رہنے سے تو طلاق نہیں پڑتی وہ تو بولنے سے پڑتی ہے، تو امام صاحبؒ نے چپ رہنے سے چور کا پتہ چلا لیا، اور بیوی کو طلاق سے بچا لیا، تو یہ کمال دانش تھی کہ چور بھی پکڑے گئے، مال بھی مل گیا، بیوی بھی ہاتھ سے نہ گئی، اور مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا، مسئلہ میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا، تو یہ کمال دانش تھی یہ حقیقت میں اس کے اندر عقلیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

تھوڑے علم کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہے..... مثل مشہور ہے کہ ”یک من علم راہ من عقل می باید“ ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت ہے۔ علم من بھر ہوا اور عقل بیس سیر ہو تو علم اوندھا ہو جائے گا، الٹا ہوگا، تو محض عالم بننے سے کام نہیں چلتا، جب تک قلب کے اندر ذکاوت نہ ہو اور تمام چیزوں کو اپنی اپنی حد کے اندر رکھنے کا سلیقہ نہ ہو تو عالم مطلقاً علم سے کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس کے اندر عقل کا جوہر نہ ہو اور دماغ میں کوئی سلیقہ نہ ہو، اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نَصَرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي“ ﴿۱﴾ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو عادی، ہے جو آپ کی احادیث یاد کرے آپ کے کلام مبارک کو ذہن میں لے لے، تو فرمایا اللہ اس شخص کا چہرہ تر و تازہ رکھے چڑ میرے کلام کو اپنے دل میں جگہ دے رہا ہے، اور اسے محفوظ کر رہا ہے، اور اپنے اندر جگہ دے رہا ہے اور اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا، اور فرمایا بہت سے علم و فقہ کے اٹھانے والے غیر فقیہ ہوتے ہیں، ان میں سمجھ نہیں ہوتی، ان کا کام یہ ہے کہ کسی عالم کے سامنے اس کلام کو نقل کر دیں، اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں، اس لئے کہ ان میں اتنی ذکاوت نہیں ہے، کہ وہ مسئلہ نکالیں اور وہ صحیح بھی ہو، اس لئے وہ نقل پر قناعت کریں، مسئلہ نہ بیان کریں، ان میں چونکہ کلام سے مسئلہ استنباط کرنے کا مادہ نہیں ہے، اس واسطے مسائل نکالنے کی کوشش نہ کریں ورنہ لائے سیدھے مسائل نکالیں گے اور دنیا حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہوگی، تو نفس کلام نقل کر دیں مگر اس کے اندر سے مسائل کا استخراج نہ کریں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض علماء وہ ہوں گے کہ علم اور فقہ ان کے اندر ہے مگر سمجھ ان کے اندر نہیں ہے، اور بعض وہ ہوں گے کہ علم تھوڑا ہے، مگر سمجھ بہت ہے لیکن تھوڑے کو اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے زیادہ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے امام ابی حنیفہؒ پر الزام لگایا ہے کہ انہیں کل سترہ احادیث یاد تھیں، حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، امام ابی حنیفہؒ رواۃ حدیث میں سے ہیں اور روایات حدیث کی ایک مستقل کتاب مسند ابی حنیفہؒ کے نام سے مشہور ہے، اس میں اپنی روایت سے سینکڑوں حدیثیں نقل فرمائی ہیں تو تاریخی طور پر یہ دعویٰ غلط ہے، لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ اس دعوے کو مان لیا جائے تب بھی اس سے امام ابی حنیفہؒ کی ذکاوت ثابت ہوگی کہ کل سترہ احادیث سے اتنی بڑی فقہ کو مدون کر دیا کہ ہزار ہا مسائل آگئے، یہ تو کمال دانش کا ثبوت ہے، اور ایسے مسائل کہ حدیث و قرآن کے مخالف نہیں ہوئے، بلکہ حدیث و قرآن سے نکل رہے ہیں، تو ایسے شخص کی دانش کی کیا انتہا ہے بہر حال عالم کے لئے جیسے علم کمال ہے اس سے زیادہ ضرورت عقلی کمال کی ہے عقل کے بغیر علم چلتا نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام کی عقل سے زیادہ ہے..... تو چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام پورے عالم کے لئے مربی ہوتے ہیں، اور سید الانبیاء والمرسلین عالمین کے لئے مربی ہیں، اس لئے سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر آپ میں عقل بھی ہونی چاہئے، اس لئے کہ سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر

آپ کو علوم عطا کئے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود حدیث میں فرماتے ہیں: ”اُوتِيتْ عِلْمُ الْاَوَّلِينَ وَالْاٰخِرِينَ“ مجھے اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم عطا کر دیئے گئے، یہ تو اجمالی دعویٰ ہے احادیث میں تفصیلی دعویٰ بھی موجود ہیں، فرماتے ہیں، شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ ”اُوتِيتْ عِلْمُ الْاَسْمَاءِ كُلِّهَا كَمَا اُوتِيَ اٰدَمُ عِلْمُ الْاَسْمَاءِ كُلِّهَا“ قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَعَلَّمَهُ اَدَمُ الْاَسْمَاءَ كُلِّهَا﴾ ① حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھائے گئے، تو آپ فرماتے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھائے گئے مجھے بھی ساری چیزوں کے نام سکھائے گئے غرض آدم علیہ السلام کا جو علم ہے وہ مجھے عطا کیا گیا، حضرت نوح علیہ السلام کو جو صور و اشکال کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو عطا کیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو بھی عطا کیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تفصیلات احکام کا علم دیا گیا، وہ تفصیلات احکام آپ کو بھی عطا کی گئیں، اور اس سے بڑھ کر وہ علم عطا کیا گیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد آپ ہی کی خصوصیت ہے وہ یہ کہ بندہ اور خدا میں کیا ربط ہے، ان نسبتوں کے جو علوم عطا کئے گئے ہیں، وہ تمام علوم سے بڑھ کر علوم ہیں، تو تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم آپ کو دیئے گئے اور آپ کے مخصوص علم بھی آپ کو دیئے گئے، اس لئے قدرتی طور پر جتنی عقلیں سارے انبیاء علیہم السلام کو دی گئیں وہ ساری آپ کے اندر ہونی چاہئے، تبھی تو آپ ان علوم کا تحمل فرما سکیں گے غرض آپ کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام دانشوروں سے بالا ہے۔

اعتدال مزاج سے اعتدالی عقل، علم اور اخلاق ہوگا..... ابن سینا مسلمانوں کا بہت بڑا طبیب ہے، اور علم طب کا موجد سمجھا جاتا ہے، اس کو معلم ثانی کہتے ہیں، فارابی کو معلم اول کہا جاتا ہے اور ابن سینا کو معلم ثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے گویا طب کی تجدید اور اس کو از سر نو زندہ کیا، اور بہت سے مسائل اپنی طرف سے بڑھائے، وہ کہتا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عالم میں اتنا معتدل مزاج کسی کا نہیں جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، مزاج کے اندر کمال اعتدال، کمال عقل کی دلیل ہوتی ہے، اگر مزاج کے اندر اعتدال نہ ہو، بلکہ افراط اور تفریط ہو تو ہی مزاج میں کمی اور زیادتی ہو جاتی ہے، لیکن مزاج معتدل ہوگا تو عقل بھی معتدل ہوگی اس لئے اس کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل العقل ہیں۔ اور جس کی عقل کامل ہے اس کے اخلاق بھی کامل ہیں اس کا علم بھی کامل ہوگا، اس کے معاملات بھی کامل ہوں گے اس کی دیانت بھی کامل ہوگی، ابن سینا چونکہ عقلاء اور حکماء کی لائن کا آدمی ہے اس لئے عقل و حکمت کی لائن سے اس نے دعویٰ کیا کہ جب عقل کامل ہے کیونکہ مزاج کامل ہے اس لئے علم بھی آپ ہی کا کامل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ اعتدال مزاج سے اعتدال عقل پیدا ہوتا ہے۔

ارسطو کے اعتدالی مزاج اور سکندر رومی کی خرابی مزاج کا عجیب واقعہ..... اس پر مجھے ارسطو اور سکندر

رومی کا واقعہ یاد آگیا، سکندر رومی بہت بڑا بادشاہ گذرا ہے، اور اس کا وزیر اعظم ارسطو تھا، ارسطو یونان کا بہت بڑا حکیم ہے اور یوں کہنا چاہئے کہ طب کا بہت بڑا مجتہد ہے، سکندر رومی کو بارہ مہینے سر کے درد کا عارضہ رہتا تھا، اور سر میں ٹیس اٹھتی رہتی تھی، ارسطو نے ہر چند علاج کئے، ہر قسم کی دوائیں استعمال کرائیں مگر فائدہ نہیں ہوتا تھا، تو سکندر تنگ آگیا اور اس نے کہا مجھ جیسا بادشاہ اور تجھ جیسا طبیب اور پھر مجھے شفا نہ ہو، یہ تو حیف اور افسوس کی بات ہے، اب اگر تجھے علاج کرنا ہے تو کر، مگر دوا ایسی ہو کہ نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو نہ لگانے کی ہو، نہ سونگھنے کی ہو، اور میرا درد جاتا رہے، ارسطو نے کہا، یا اللہ! یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے کہ نہ کھانے نہ پینے نہ لگانے نہ سونگھنے کے دائرہ کی دوا ہو، یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے، میں جادو گر تھوڑا ہی ہوں، میں تو طبیب ہوں اب ایسی دوا کہاں سے لاؤں، تو سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے سکندر سے کہا کہ مجھے تین مہینے کی مہلت دوتا کہ ایسی دوا سوچوں، اس نے کہا ہم نے تجھے تین مہینے کی مدت دے دی، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا، اس لئے کہ اس زمانے میں طب کا سب سے زیادہ زور ہندوستان میں تھا اور مؤرخین کہتے ہیں فن طب ہندوستان سے ہی شروع ہوا ہے، اس لئے کہ فن طب حضرت ادریس علیہ السلام کے اوپر نازل ہوا ہے وہ اس علم کے موجد تھے اور وحی کے ذریعہ ان پر نازل ہوا ہے اور ہندوستان میں ہی علم طب کو فروغ ہوا ہے تو علم طب یونان وہ درحقیقت علم طب ہندوستان ہے یونانی ہندوستانیوں کے شاگرد ہیں، اور ہندوستان سے یونان کے اندر طب کو لے کر گئے ہیں، پھر اسلام آنے کے بعد یونان سے عربوں کے اندر آئی ہے تو ابتداء ہندوستان سے ہوئی ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کا ایک بہت بڑا نابینا طبیب تھا، تمام اطباء پر اس کو سبقت حاصل تھی پورے ملک میں اُسے حاذق شمار کیا جاتا تھا، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا کہ ایسی دوا تو نابینا طبیب ہی بتا سکے گا کہ نہ لگانے کی ہو، نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی، نہ سونگھنے کی، اور درد جاتا رہے، میری عقل تو کام کرتی نہیں، ممکن ہے یہ نابینا طبیب کچھ بتا دے۔

اس نابینا طبیب کا قاعدہ تھا کہ مریضوں کی لائن لگا کر کھڑی کر دی جاتی تھی اور وہ ایک طرف سے چلتا تھا، اور مریض کی نبض پر ہاتھ رکھا، حال پوچھا اور ساتھ کے لوگوں سے کہہ دیا کہ یہ نسخہ مرتب کر دیں، غرض نبض دیکھتا ہوا ایک طرف سے ترتیب وار چلتا تھا، اس میں بڑے چھوٹے، امیر فقیر کا فرق نہیں تھا، ابتداء میں جو آجائے فقیر آجائے تو وہی سہی، تو ارسطو کا اس نابینا طبیب سے کوئی تعارف تو تھا نہیں تو مریضوں کی لائن میں سب سے آخر میں جا کے کھڑا ہو گیا کہ اس وقت میں اپنا عرض حال کر دوں گا، ویسے تو ارسطو معروف تھا، دنیا جانتی تھی مگر اس طبیب سے خصوصی تعارف نہیں تھا، تو مریضوں کی لائن میں جا کے بیٹھ گیا، نابینا طبیب مریضوں کو دیکھتا اور نسخے بتاتا ہوا جب آخر میں پہنچا تو ارسطو کا ہاتھ لیا، اور نبض دیکھی، نبض دیکھتے ہی کہا ہے کہ ارسطو؟ ارسطو اسی وقت بول پڑا کہ جی

ہاں ارسطو..... تو معافۃ کیا اور بغل گیر ہوا، اور کہا کہ آپ جیسا اتنا بڑا طبیب مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا!! اس نے کہا چونکہ آپ سے ملنا تھا تو میں کہاں اطلاع کراتا اس لئے مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا، تو بہت ہی مدارات کے ساتھ وہ نائینا طبیب ارسطو کو اپنے مکان پر لے آیا اور کہا کہ یونان سے ہندوستان کا اتنا بڑا سفر کیسے کیا.....؟

ارسطو نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلا سوال یہ ہے کہ اس طب میں کون سا اصول ہے کہ نبض دیکھ کر نام بھی معلوم کر لو، نبض دیکھ کر مزاج معلوم ہوتا ہے، اس کا اتار چڑھاؤ معلوم ہوتا ہے، بیماری معلوم ہوتی ہے، نبض دیکھ کر نام معلوم ہو جائے میں نے تو یہ اصول کہیں پڑھا نہیں، اس نے کہا ہاں یہ اصول طب کا نہیں مگر اس وقت ایک اصول میں نے طب کا لیا اور ایک اپنی عقل سے سمجھا، دونوں ملا کر میں نے نام معلوم کر لیا، وہ یہ کہ جب میں نے آپ کی نبض پہ ہاتھ رکھا اتنی کامل اعتدال کے ساتھ نبض چل رہی تھی کہ میں نے اتنی معتدل نبض دنیا میں کسی کی نہیں دیکھی، ہزاروں مریض آئے، ہزاروں لوگ آئے مگر اتنا صحیح المزاج اور قوی الاعتدال مزاج میں نے نہیں دیکھا، یہ تو میں نے نباضی کے اصول سے معلوم کیا، آگے میرے دل نے شہادت دی کہ ایسا کامل المزاج اس دور میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو ارسطو ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اس لئے میں نے ذہن سے حکم لگایا دیا کہ یہ ارسطو ہے۔

اب اس نے پوچھا کہ آپ کیسے آئے.....؟ ارسطو نے کہا کہ یہ قصہ ہے کہ میں سکندر رومی کا معالج ہوں بارہ مہینے اسے سر کا درد رہتا ہے ساری دوائیں دیتا دیتا تھک گیا ہوں اب اس نے یہ شرط لگائی کہ دو انہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو، نہ لگانے کی ہو، نہ سو گھنٹے کی اور مجھے فائدہ ہو جائے، تو میرے پاس ایسی کوئی دوا نہیں ہے، اور نہ میں نے طب میں پڑھی ہے۔ اس نائینا طبیب نے کہا کہ میرے پاس ایسی دوائی ہے جو نہ کھائی جائے گی، نہ پی جائے گی، نہ سو گھنٹے جائے گی، نہ مالش کی جائے گی اور فائدہ ہو جائے گا، اور میں وہ دوا بنوا کے دیتا ہوں چنانچہ اس نے دوا بنوائی، اور دوا کا کئی سیر کا مجموعہ تیار ہوا اسے پھلایا اور پھلایا کر اتنا بار یک کر دیا جیسے سرمہ ہوتا ہے۔

اس نائینا طبیب نے کہا اس کی شکل یہ ہوگی کہ چھوٹی چھوٹی ڈھولکیاں اور طبلے بنائے جائیں اور ان میں یہ تھوڑی تھوڑی دوا بھردی جائے اور سکندر رومی کے سامنے ناچ رنگ اور گانے بجانے کی محفل منعقد کی جائے، اور یہ طبلے اور ڈھولکیاں بجائی جائیں ان کے بجتنے سے دوائی کا ایک ذرہ بھی فضا سے اڑ کر سکندر کے ناک میں چلا گیا تو اس کے سر کا درد جاتا رہے گا، اور اسے پتہ بھی نہ چلے گا، یہ دوا نہ کھانے کی، نہ لگانے کی، نہ پینے کی، نہ سو گھنٹے کی، بس ایک ذرہ ناک میں پہنچ گیا تو درد جاتا رہے گا۔

چنانچہ ارسطو نے آکر اس دوا کے استعمال کے لئے طبلے اور ڈھولکیاں بنوائیں، اور ان میں دوائی بھری، اور اس کے بعد وہ محفل ناچ رنگ اور گانے بجانے کی منعقد کی اور طبیبوں پر تھاپ پڑنی شروع ہوئی لکڑی اور کانے سے ان طبیبوں اور ڈھولکیوں کو بجانا شروع کیا، اور ان کے بجانے سے ان کے اندر تموج ہوا، اس کی وجہ سے وہ ذرات خارج ہوئے اور مجلس میں معمولی سا خوشبودار غبار خارج ہوا، مجلس میں عام خوشبو مئیں تھیں، اگر بتیاں جل رہی تھیں، اور بھی

خوشبو تھی تو ان خوشبوؤں میں شامل ہو کر یہ خوشبو بھی اس کے ناک میں پہنچی اور کچھ اس دوائی کے اجزاء سکندر کے ناک میں پہنچ گئے، اسی وقت درد بند ہو گیا، صبح دیکھتا ہے تو بالکل تندرست ہے اور برہا برس کا درد جاتا رہا۔

تو ارسطو سے کہا آج تو میرا درد بالکل جاتا رہا، اس نے کہا میں نے علاج کیا ہے، یوں ہی تھوڑا جاتا رہا۔ سکندر نے کہا تو نے کیا علاج کیا؟ کوئی دوائی تو تو نے پلائی نہیں، وہ تو آپ نے کہا تھا کہ دوائی ایسی ہو جو نہ کھانے کی ہو نہ پینے کی ہو نہ سونگھنے کی ہو نہ لگانے کی ہو، بادشاہ نے کہا وہ کیا تھی؟ اس سے آپ کو کیا غرض؟ باقی درد تو نہیں رہا؟ اس نے کہا درد تو نہیں رہا، بہر حال بہت خوش ہوا، اور یہ کہا کہ ایک ترازو منگو کر ایک پلڑے میں ارسطو کو بٹھایا اور ایک پلڑے میں سونا رکھوایا، سونا اس کے برابر ٹکوا کر اس کو انعام دیا۔

چنانچہ پانچ برس گزر گئے ذرہ برابر درد نہیں ہوا، چھ برس کے بعد پھر سر میں کچھ چبک محسوس ہوئی، تو ارسطو کو بلوایا اور کہا کہ سر میں دوبارہ چبک محسوس ہوئی، اس وقت جو تم نے علاج کیا تو اب دوبارہ کرو، اب وہ دوا ختم ہو چکی تھی، اور دوسرے اس کا نسخہ معلوم نہیں تھا، اس نے حیلے بہانے کئے کہ وہ دوائی تو تین چار ماہ سے کم میں تیار نہیں ہوتی، اس نے کہا کوئی مضائقہ نہیں تین مہینے کی آپ کو رخصت ہے آپ دوائی بنائیں۔

اب ارسطو کا کمال ہے کہ اس کے پاس نسخہ تو نہیں تھا جو اس کے پاس تھوڑی سی دوا باقی رہ گئی تھی تو اسے کچھ کچھ کر سارے اجزاء معلوم کر لئے اور نسخہ لکھ لیا، نسخہ لکھ کر پھر وہ دوائیں بنائیں اور نسخہ مکمل تیار ہو گیا۔ پھر اسی طرح ناچ رنگ کی محفل منعقد کی، اگلے دن درد پھر غائب ہو گیا، ارسطو نے کچھ کر نسخہ کے تمام اجزاء معلوم کر لئے اور اس کا اثر بھی ہو گیا، مگر اس درجے کا فائدہ نہیں ہوا جو پہلی مرتبہ ہوا تھا، ارسطو نے کہا چونکہ دوائی پرانی تھی اس لئے اثر کم ہوا، اور تین ماہ کی مہلت دیں، نئی دوائی بنے گی تو پھر اثر زیادہ ہوگا، سکندر نے کہا آپ نئی دوائی بنائیں، تین ماہ کی مہلت ہے۔ پھر ارسطو سفر کر کے ہندوستان پہنچا، اور اب بھی طبیب کے گھر نہیں گیا، اور مریضوں کی لائن میں حسب سابق بیٹھ گیا، اور وہ ناپینا طبیب آیا اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معافہ کیا اور کہا کہ ارسطو تو پھر آ گیا؟ اب کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا آپ نے دوا دی تھی اور واقعی وہ کارگر ہوئی اور چار پانچ برس تک بالکل درد نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد پھر سکندر نے درد محسوس کیا ہے، اب میرے پاس وہ دوا چند تو لے رہی تھی، اس سے کام نہیں چلتا تھا، تو میں نے کچھ کچھ کر اجزاء معلوم کئے اور یہ نسخہ لکھا۔

اس نایاب طبیب نے ارسطو کی پیشانی چوم لی کہ تو نے ساری دوائیں لکھ دیں ایک بھی تو نے نہیں چھوڑی، یہ تیرا کمال ہے کہ تو نے کچھ کچھ کر سارا نسخہ معلوم کر لیا، اس نے کہا میں نے وہ نسخہ بنایا، اور حسب سابق سکندر کو استعمال بھی کرایا فائدہ مکمل نہیں ہوا۔ اس نایاب طبیب نے کہا آپ دواؤں کی کاشت کس طرح سے کرتے ہو، اس نے کہا جیسے اور حکمت ہوتے ہیں، اسی طرح دوائیں بھی بوتے ہیں۔ اس نے کہا بس یہی غلطی ہوئی ہے۔

سمجھئے ہر دوا میں کسی نہ کسی سیارے کا اثر ہے جب اس سیارے کے طلوع کا وقت ہو اس وقت وہ دوا کاشت

کی جانی چاہئے یہ فن نجوم کا اصول ہے آپ نے موقع بموقع کاشت کی، ستاروں کے عمل کے مطابق نہیں کی، اس نے کہا جیسے چنے گیہوں بوتے ہیں اسی طرح دوائیں بھی بوئیں، اس نے کہا بس یہی فرق ہے۔

میں ہر دو کو جس میں اس سیارے کا عمل ہے اس سیارے کے طلوع کے وقت اس کو پوتا ہوں تو کامل اثر ہوتا ہے، کسی دوا میں مشتری کا اثر ہے، کسی میں زحل کا اثر ہے، کسی میں مریخ کا اثر ہے جس وقت جو سیارہ طلوع ہوتا ہے تو اس وقت میں تخم ریزی کرتا ہوں، گویا فن طب اور فن نجوم میں چولی اور دامن کا ساتھ ہے، جب تک فن نجوم سے واقف نہ ہو، اس دور میں طبیب ماہر نہیں سمجھا جاتا تھا، اور اب فن نجوم تو بجائے خود ہے طب ہی پوری طرح نہیں پڑھتے، اردو میں کتابیں آگئیں بس کچھ مطالعہ دیکھا طبیب بن گئے، اور سند لے لی، اسی واسطے نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جو مرض آجاتا ہے، جانے کا نام نہیں لیتا، عمر بھر مرض بھی قائم دوا بھی قائم، غذا کی طرح دوا کھانی پڑتی ہے، اور عطاروں نے رہی سہی بھی کسر نکال دی۔

ہمارے ہاں ایک عطار طبیب تھے، نور الدین ان کا نام تھا، نور دبہرہ کے نام سے پکارے جاتے تھے، بہرے بھی تھے، مگر بے بہرہ نہیں تھے، لیکن چوں کہ بہرے تھے اس لیے ”نور دبہرہ“ کہا کرتے تھے، انہوں نے ایک بڑا بھاری منکار کھا ہوا تھا اس میں پانی بھرا ہوا تھا، سونف کے اس میں کچھ دانے ڈالے ہوئے تھے، کوئی عرق مکھ لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق گاؤزبان لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق سونف لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، ساری دنیا کو وہی پانی دے کر نمٹا دیتے تھے، ایک موقع پر راز کھل گیا تو لوگوں نے کہا خدا کے بندے! یہ کیا کر رکھا ہے یہ تو بالکل ناجائز اور حرام ہے تو لوگوں کی جان کے درپے ہے، اس نے کہا بھی! طبیب تو اصل اللہ میاں ہے پانی میں شفا تھوڑا ہی ہے، میں نے بھی اس کے نام پر چند دانے سونف کے ڈال دیئے ہیں کہ طبیب خود دیکھ لے گا، شفا دینے والا تو وہ ہے لوگ اپنے اعتقاد سے شفا پاتے ہیں، میرے پیسے بن جاتے ہیں، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟ تو جب عطار ایسے رہ جائیں اور طبیب ایسے رہ جائیں تو پھر مریضوں کا ناس نہیں مارا جائے گا تو اور کیا ہوگا؟ کہاں تو یہ کہ فن نجوم سے واقفیت ہو، اور ان نجوم کے طلوع کے وقت کی مناسبت سے دواؤں کی کاشت ہو، اور کہاں یہ کہ دواؤں کی شناخت نہ ہو، بہت سے اناڑی طبیبوں کو دیکھا کہ عتاب کی جگہ پیراٹھا کے دے دیئے، اس لئے کہ شکل ایک ہی ہوتی ہے، اسی طرح آپ زعفران خریدنے جائیں گے تو اس کی جگہ بھٹوں کا ریشاٹھا کے دے دیتے ہیں، اب زعفران کی جگہ جب یہ ریشہ کھایا جائے گا تو کہاں سے فائدہ ہوگا اور شفا ہوگی، اور اچھے خاصے مریں گے، سیاہ مریج لینے جاؤ تو پیتے کے بیچ اس میں ملے ہوئے ہوں گے تو پیستے کے بیچ کھا کے سیاہ مریج کا فائدہ تھوڑا ہی ہوگا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ طب تو رہی ہی نہیں تھی، اور اوپر سے یہ ملاوٹ بھی ہوگئی تو مریض بیچارے اچھے ہوں بھی تو کہاں سے؟ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹروں کی تعداد مریضوں سے زیادہ ہے اور جتنے ڈاکٹر بڑھتے جاتے ہیں اتنے ہی امراض بڑھتے جاتے ہیں، جتنے ہسپتال کھل رہے ہیں اتنی ہی بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، میں تو عرض کر رہا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ کے واقعات کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کا جتنا علم کامل ہوتا ہے، اتنی ہی عقل بھی کامل ہوتی ہے، اسی طرح جتنے اہل اللہ ہیں ان کی بھی اتنی ہی عقل کامل ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل گویا اس درجے کی ہے کہ اولین و آخرین میں ایسی عقل کسی کو نہیں دی گئی، بلکہ سارے اولین و آخرین کو جتنی عقل دی گئی ہے وہ تھا ایک ذات واحد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے، اسی واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء علیہم السلام بنایا گیا، تو اس کامل عقل کے ہوتے ہوئے بھی کفار کہیں کہ آپ مجنون ہیں، یہ ان کے مجنون ہونے کی علامت ہے کہ ان کے اندر عقل نہیں ہے کہ آپ کی عقل کو پہچانتے تو قرآن قرآن کریم نے کفار کے اس قول کو رد کیا، اور اس ذیل میں میں نے کچھ تاریخی واقعات بیان کئے، کل تو اصولی بحث تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل ہے، دلیل کی رو سے اور فلاں دلیل کی وجہ سے اور آج اس کمال عقل کے آثار میں چند واقعات بیان کئے اور ایسے ہزاروں واقعات ہیں، تو حق تعالیٰ شانہ نے آپ سے جنون کی نفی کی کہ: ﴿مَا أَنتَ بِمَجْنُونٍ﴾ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ہوتے ہوئے آپ مجنون نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ خود مجنون ہیں، جس کو اتنا بڑا علم دیا گیا جس کو ایسی عظیم الشان تربیت دی گئی جس کو اتنا بڑا اصلاح عالم کا جذبہ دیا گیا جس کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا، کیا معاذ اللہ وہ مجنون ہوگا؟ مجنون بھی ایسی تربیت کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک تیسری دلیل پیش فرمائی: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ اور سب چیزوں کو چھوڑ دو، آپ کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ لو، کیا مجنون ایسے اخلاق برتا کرتے ہیں؟ تو اخلاق کو ثابت کر کے آپ کے لئے خلق عظیم ثابت کیا، اب خلق عظیم کی بحث انشاء اللہ کل ہوگی۔

یہاں صرف یہ بحث تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنون سے بری ہیں، یہ لوگ جو ایسے دعوے کرتے ہیں وہ خود مجنون ہیں، اخلاق کا عظیم ہونا، جنون کی نفی کی دلیل ہے اس کا بیان انشاء اللہ کل ہوگا، اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم بھی دے، اور اخلاق صحیح بھی دے۔

اللَّهُمَّ اهْدِنِي لَاحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِينِي إِلَّا أَحْسَنُهَا إِلَّا أَنْتَ وَأَصْرِفْ عَنَّا سَيِّئَ الْأَخْلَاقِ لَا يَصْرِفُ عَنَّا سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبُّنَا وَنَحْنُ عِبَادُكَ فَاعْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَاسْرِافَنَا فِي أَمْرِنَا وَتَبَسَّ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
 إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ
 اللّٰهُ إِلَى كَمَا قُفَّةٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى
 آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ
 الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿فَلَا تَطْعَمُ الْمَكِيدِينَ﴾ وَذُوقُوا لَوْتُهُنَّ فَيَذْهَبْنَ ﴿وَلَا تَطْعَمُ كُلَّ خَلَافٍ مَّهِينٍ﴾
 هَمَّازٍ مُشَاءٍ بِنَمِيمٍ ﴿مُنَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَيْمٍ﴾ غُلَّتْ بَعْدَ ذَلِكَ رَنِيمٌ ﴿أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ﴾ إِذَا
 تَنَلَّى عَلَيْهِ إِيشًا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿سَنَسِمْهُ عَلَى الْخُرُطُومِ﴾

کمال اخلاق سے نفی جنون..... بزرگان محترم! حق تعالیٰ شانہ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون
 کی نفی کرتے ہوئے جو دلائل ارشاد فرمائے ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کو اخلاق عظیم دیئے گئے ہیں، یعنی
 اخلاق کی جو انتہائی حد ہے کہ بشریت میں اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی، وہ آخری حد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی
 گئی آپ نے اخلاق کا وہ آخری حد کا نمونہ پیش فرمایا کہ عالم بشریت میں اس سے زیادہ نمونہ ممکن نہیں۔ تو اس سے
 دلیل پکڑتے ہوئے فرمایا: جس کے ایسے پاکیزہ اخلاق ہوں کہ دنیا کو مسخر کر لے، ان اخلاق کے ہوتے ہوئے کیا
 انہیں مجنون کہا جاسکتا ہے، کیا دنیا میں کبھی کسی مجنون نے بھی ایسے اخلاق پیش کئے، تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی
 عظیم شان بیان فرمائی گئی۔ ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلق عظیم پر ہیں، اور اللہ
 تعالیٰ نے آپ کو خلق عظیم عطا فرمائے ہیں خلق عظیم کے کیا معنی ہیں؟ خلق عظیم کسے کہتے ہیں؟

مراتب اخلاق اور آثار اخلاق..... یہ اس وقت تک صحیح سمجھ میں نہیں آئے گا، جب تک اخلاق کے مراتب
 بیان نہ کئے جائیں کہ اخلاق کے درجے کیا ہیں؟ اور ان میں سے وہ کون سا آخری درجہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ
 وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان اخلاق کے آثار کیا ہیں؟ کہ ان اخلاق عظیمہ سے آپ سے کس قسم کے افعال
 سرزد ہوئے کہ جس سے دنیا آپ کے قدموں پر جھک گئی، اور دنیا میں عرب کا خطہ جو حد سے زیادہ سرکش
 تھا اور انہوں نے کسی کی اطاعت قبول نہیں کی، وہ بھی اگر پانی پانی ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

ہوئے، تو وہ کیا آثار ہیں جن کی بناء پر ایک قوم کی قوم مسخر ہو گئی، اور پھر اس قوم نے ان اخلاق کو دنیا کی طرف پھیلا یا تو پوری دنیا مسخر ہو گئی، اور اب صدیاں گزر گئیں، آج بھی کوئی ان اخلاق کا ذکر سنتا ہے تو وہ ہیں گردن جھکا دیتا ہے تو مراتب اخلاق میں سے وہ کون سا آخری مرتبہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ تو ہم نے جہاں تک غور کیا، اور ہمارا غور ہی کیا، بہر حال اساتذہ کرام اور شیوخ کی دی ہوئی روشنی میں جہاں تک دیکھا اور غور کیا تو اس میں اخلاق کے تین مرتبے محسوس ہوئے۔

اخلاق حسنہ پہلے درجہ کا نام اخلاقی حسنہ ہے، حسن اخلاق یعنی اچھے اخلاق سے دنیا سے پیش آؤ، دوسرا درجہ اخلاق کریمہ کا ہے، کہ کریم النفس، بنو کریم الاخلاق، بنو اپنے اندر کریمانہ اخلاق پیدا کرو، اور تیسرا مرتبہ اخلاقی عظیمہ کا ہے کہ برتر اور سب سے جو اونچے اخلاق ہیں ان کو دنیا کے سامنے پیش کرو، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ”بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ“ ① میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا کے سامنے اخلاق اعلیٰ کے نمونے پیش کروں، آپ نے اپنے مبعوث ہونے کی دو غرضیں ظاہر فرمائیں، ایک فرمایا: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ ② میں دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی حسنہ، اعمال صالحہ، احوال صادقہ اور آخرت حسنہ کی تعلیم پیش کر دی۔ تو پہلا درجہ اخلاقی حسنہ کا ہے، جسے حسن اخلاق کہتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”يَا خَلِيلِي حَسِّنْ خُلُقَكَ وَلَوْ مَعَ الْكُفَّارِ“ ③ اے میرے خلیل! اخلاق حسنہ سے پیش آؤ، چاہے کفار ہی تمہارے سامنے پیش آئیں، اس وقت بھی اخلاق کو امت چھوڑو، پاکیزہ اخلاق کے ساتھ ان سے بات چیت کرو اور معاملہ کرو، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اخلاق کا ایک درجہ ”خلق حسن“ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور ان کی تفصیل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو اخلاقی حسنہ کی تربیت دی، یعنی یہود بنی اسرائیل کو اخلاقی حسنہ پر تربیت دی، جو اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ حسن اخلاق کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں: اَلْوَفَاءُ بِالْعَدْلِ یعنی حقوق کے اندر دوسرے کو پورا پورا حق دو جو اس کا حق ہے، اپنا بھی پورا پورا حق لو جو تمہارا حق ہے، اس میں نہ کمی کرو نہ بیشی کرو، بھلائی ہو یا برائی ہو، حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھو، کہ دوسرے کا ایک رتی بھی حق مارا نہ جائے اور تم بھی بے شک ایک رتی بھی اپنا حق نہ چھوڑو، مثلاً اگر کوئی شخص تمہیں ایک پیسہ بھرنے پہنچائے تو تمہارا فرض ہے کہ ایک پیسہ بھرتم بھی نفع پہنچا دو اگر تم نے اس ایک پیسے میں کمی کی تو یہ بداخلاقی ہوگی، پورے پورے اخلاق سے پیش آؤ۔

اسی طرح سے برائی کے اندر اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ برائی کی تو اس درجے کی برائی تم بھی اس کے

① السنن الکبریٰ للبیہقی، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیہا ج: ۱۰ ص: ۱۹۲۔

② السنن لابن ماجہ، المقدمة، فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج: ۱ ص: ۲۶۵۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمہ: محمد ج: ۱۲ ص: ۲۷۲ رقم: ۱۱۱۵۔

ساتھ کر سکتے ہو، تاکہ دوسرے کو معلوم ہو کہ بداخلاقی سے پیش آنا کیا نتیجہ رکھتا ہے، دوسرے کو بداخلاقی سے تکلیف پہنچانا جب کہ اتنی ہی تکلیف اسے پہنچائی جائے گی تو وہ سمجھے گا کہ میں نے کیا تکلیف پہنچائی تھی، اور اگر آپ نے تکلیف نہ پہنچائی وہ یہ سمجھے گا کہ جو بھی کسی کے ساتھ کچھ کر لو، اس کا ثمرہ تو کچھ نکلتا نہیں اس واسطے بداخلاقی سے پیش آتے رہو، نیکی ہو یا بدی، بھلائی یا برائی مگر حقوق کی رعایت رکھو نہ لینے میں کمی کرو نہ دینے میں کمی کرو، اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر کوئی ذرہ برابر برائی سے پیش آئے تو تم پر واجب ہے کہ اتنی ہی ذرہ برابر برائی سے پیش آؤ، شریعت موسوی میں معاف کرنا جائز نہیں تھا، شریعت موسوی جلال کی شریعت تھی اور سخت شریعت تھی، بدلہ لینا اور بدلہ دینا یہ واجب تھا، برائی کے اندر معاف کرنا یہ جائز نہیں تھا، بلکہ انتقام لینا واجب تھا، چنانچہ قرآن کریم میں تو رات کی تعلیم بیان فرمائی گئی۔

﴿وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنْ النَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنُ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفُ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنُ بِالْأُذُنِ وَالسِّنُّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحُ قِصَاصٌ﴾ ہم نے بنی اسرائیل پر واجب کر دیا تھا اور ان کے اوپر لکھ دیا تھا کہ اگر کوئی نفس کو قتل کرے تو فرض ہے کہ تم بھی قتل کرو، معاف کرنا جائز نہیں، اگر کوئی تمہاری آنکھ پھوڑ دے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اس کی آنکھ پھوڑو، غنودہ رگزر ہرگز جائز نہیں، انتقام ضروری ہے، اگر کوئی تمہاری ناک کاٹ دے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کی ناک کاٹ دو کوئی تمہارا کان پھوڑ دے تو تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا کان پھوڑ دو، کوئی دانت توڑے تم پر واجب ہے کہ تم بھی اس کے دانت توڑ دو، اور اگر کوئی زخم لگائے تو اتنا ہی برا زخم تم بھی لگاؤ، شریعت موسوی کے اندر یہ جائز نہیں تھا کہ درگزر کرو یا معافی دو، بلکہ واجب تھا کہ انتقام لیا جائے، تو یہ خلق حسن ہے کہ اپنے حق میں کمی نہ کرو، دوسرے کے حق میں بھی کمی نہ کرو، کوئی بھلائی کرے تو تم پر واجب ہے کہ تم بھی بھلائی کرو اور اتنی ہی کرو، اس سے کم کی تو بداخلاقی شمار ہوگی، یا بدلے میں کچھ زیادہ بدلہ لے لیا تو یہ بداخلاقی ہوگی۔ اگر کسی نے تھپڑ مارا تمہارا فرض ہے تم بھی تھپڑ مارو، اگر تم نے مکار دیا تو یہ بداخلاقی ہوگی، دنیا کہے گی بڑی زیادتی ہوئی اس نے ایک تھپڑ مارا، تھا اس نے مکار دیا، ایک شخص نے لاشی ماری تمہارا فرض ہے کہ تم بھی لاشی مارو، اگر تلوار اٹھائی تو یہ بداخلاقی ہوگی اور حدود سے گزرنا ہوگا ﴿فَمَنْ اِغْتَدٰى عَلٰیكُمْ فَاِغْتَدُواْ عَلٰیهِ بِمِثْلِ مَا اِغْتَدٰى عَلٰیكُمْ﴾ ① کوئی تمہارے اوپر زیادتی کرے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کرو، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تعلیم تھی اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی سخت اور تندہ قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جس کی جبلت کے اندر سختی اور تشدد گھسا ہوا تھا تو انہیں اگر نرمی کی تعلیم دی جاتی تو وہ دین پر نہ آتے، وہ سمجھتے کہ یہ دین تو بزدلی کا دین ہے، اس لئے واجب قرار دیا گیا کہ بدلہ پورا پورا لو، اور تمہارے لئے معاف کرنا جائز نہیں بہر حال یہ خلق حسن ہے اس کے معنی وفا بالعدل کے ہوں گے کہ اپنا بھی پورا پورا حق لو اور پورا پورا دوسرے کو بھی حق دو، اگر اس میں کمی زیادتی کی تو یہ خلق

حسن کے خلاف ہوگا، غرض اخلاقِ حسنہ کے اندر عدل اور اعتدال پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی نَبِیِّ اِسْرَآءَیْلَ﴾ ① اللہ تعالیٰ نے اپنا کلمہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا کر دیا کہ انہیں کمالِ عدل کی تعلیم دی اور انصاف پسندی کی تعلیم دی، یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے جسے خلقِ حسن کہتے ہیں۔

خلقِ کریم..... اس سے آگے دوسرا درجہ خلقِ کریم کا ہے جس کے معنی ایثار کے ہیں کہ دوسرے کا حق پورا پورا دو، اور اپنا حق چھوڑ دو، اس میں ایثار اور قربانی کرو، ایک شخص نے تمہارے تھپڑ مارا ہے تمہیں حق تھا کہ تم بھی تھپڑ مارو، مگر ایثار کا تقاضا ہے کہ تم مت مارو، بلکہ معاف کرو اور درگزر کرو، یہ پہلے مرتبہ سے اونچا مرتبہ ہے، وہاں بدلہ لینا واجب تھا، یہاں معاف کرنا واجب ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہے، ان کے یہاں ایثار کی تعلیم دی گئی ہے، انجیل کا ایک اصول ہے کہ اگر تمہارے کوئی بائیس گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کر دو کہ بھئی! ایک اور مارتا چل خدا تیرا بھلا کرے، میں تو بدلہ نہیں لوں گا، باقی تو یہ بُری حرکت کر رہا ہے یہ تیرے لئے ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِذْفَعْ بِالْاِیْمٰنِ هٰی اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ یُبْغِیْکَ وَبَیْنَهُ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ ② فرمایا: دوسرے کی برائی کو اپنی بھلائی سے دفع کرو، تمہاری بھلائی کا نتیجہ یہ ہوگا اگر باہم عداوت بھی ہوگی تو دوسرا فریق عداوت کو چھوڑ دے گا کہ میں برائی کر رہا ہوں، اور یہ شخص میرے ساتھ بھلائی کر رہا ہے، اس نے اپنا حق (بدلے کا) چھوڑ دیا، اسے حق تھا کہ یہ بھی اتنا ہی بدلہ لیتا، مگر اس نے بدلہ نہیں لیا، درگزر کیا اور معاف کر دیا، غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں معاف کرنا واجب تھا، انتقام لینا جائز نہیں تھا، اور یہ بالکل شریعتِ موسوی کے برعکس ہے، وہاں انتقام واجب تھا یہاں معاف کرنا واجب ہے، وہاں معاف کرنا جائز نہیں تھا، یہاں انتقام لینا جائز نہیں ہے، بلکہ اپنے حق کو ترجیح نہ دینا اور اپنے کو گرا دینا، اس سے یہ ہوتا ہے کہ عداوتیں ختم ہو جاتیں ہیں، بدلہ لینے میں بے شک یہ ضرور ہوگا کہ عام لوگ یہ کہیں گے کہ بھائی بدلہ لے لیا، اس کا حق تھا لیکن قدرتی اثر یہ ہے کہ دلوں کے اندر اس سے لوچ نہیں پیدا ہوگا، دلوں میں نرمی نہیں آئے گی، بلکہ اگر قلوب ایسے ہیں کہ حدود پر نظر نہیں ہے تو عداوت اور زیادہ بڑھ جائے گی، مگر بہر حال خلقِ کریم خلقِ حسن سے اونچا مقام ہے جس کا معنی ہیں کہ اپنا حق چھوڑ دو اور ایثار دکھلاؤ تو اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تعلیم دی کہ ایثار پیشہ بنو، اپنے حقوق کی رعایت مت کرو، ہمیشہ دوسرے کے حق کو سامنے رکھو۔

خلقِ عظیم..... تیسرا درجہ خلقِ عظیم کا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسرا جب برائی کرے تو نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لو، نہ صرف یہ کہ معاف کر دو، بلکہ اس کے اوپر الٹا احسان کرو کہ وہ برائیاں کرے تم احسان کرو جیسا کہ حدیث شریف میں آپ نے فرمایا: ”جِلَّ مَنْ قَطَعَتْکَ وَاغْفَ عَمَّنْ ظَلَمَکَ وَ اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاءَ اِلَیْکَ“ ”جو تم سے قطع تعلق کرنا چاہے تم اس سے جوڑ لگاؤ، جو تم پر ظلم کرے تم معافی اور درگزر کی صورت اختیار کرو اور جو تم سے برائی کرے تم اس

کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ۔“ تو ایک درجہ انتقام کا ہے ایک درجہ اثار کا ہے، مگر ایک درجہ احسان کا ہے کہ دوسرا برائی کرے تو تم اس کے ساتھ بھلائی کرو، یہ بہت ہی اعلیٰ مرتبہ ہے چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا يُلْقِهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِهَا إِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ﴾ ① ”یہ وہی کر سکتا ہے جو صابر ہو، جو صبر اور ضبط سے کام لے، آپ سے باہر نکل جانے کی خون ہو، دوسرے نے گالی دی، آپ سے باہر نہیں نکلا، اسے دعائیں دینی شروع کیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق تھا، کہ دوسرے گالیاں دے کر ہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ یہ کہ صرف معاف فرما رہے ہیں بلکہ ان کے لئے ہدایت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ غزوہ احد کے اندر آپ کے بہت ہی چہیتے اور پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، شہید کرنے کے بعد غیظ و غضب کے اظہار کے لئے کفار نے ان کی ناک کاٹ لی، کان کاٹ دیئے، ان کی ہیبت کو بے ہیبت بنایا، پھر ہندہ ثقیفہ نے ان کا جگر کاٹ کر نکالا اور غیظ و غضب میں اس کو چبایا اور خون پیا، گویا اس قدر غیظ کا اظہار کیا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے گئے، سر مبارک پر چوٹ آئی، خون سر سے بہہ کر منہ پر آیا، دندان مبارک شہید ہو گئے، ایسی حالتوں کو دیکھ کر صحابہؓ بے چین ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ان کفار کے حق میں بددعا فرمائیے، اس درجہ یہ حدود سے گذر گئے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہ برتاؤ کہ پتھروں سے الگ مارا، خون الگ بہایا، چہیتے چچا کو الگ شہید کیا، اب کون سا موقعہ باقی ہے جو آپ بددعا فرمائیں، اس لئے بددعا فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”إِنِّي بُعِثْتُ رَحْمَةً وَلَمْ أُبْعَثْ لِعَاقِبَةٍ“ ② ”میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں ہدایتیں دینے کے لئے آیا ہوں بددعا نہیں دینے کے لئے نہیں آیا“ اور فرمایا: ”اللَّهُمَّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ“ ③ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، یہ جاہل ہے، نبی کے رتبہ کو نہیں پہچانتے اس لئے جاہلانہ حرکتیں کر رہے ہیں، تو ان کے حق میں دعائیں دینا شروع کیں، یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن کریم میں آپ کی شان کے بارے میں فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ ④

فرماتے ہیں اے پیغمبر! اللہ نے جو رحمت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھردی ہے، تمہیں رحمۃ اللعالمین بنایا ہے اس کی وجہ سے تمہارا دل نرم ہے، پکھل جاتے ہو، دوسرے کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی، اگر سخت دل ہوتے غیظ القلب ہوتے یہ سب لوگ ارد گرد سے اٹھ کر بھاگ جاتے، آپ کے اخلاق نے انہیں مسخر کر رکھا ہے، آپ کے اخلاق کی کشش نے انہیں آپ کی ذات سے جوڑ رکھا ہے، کہ یہ جاہلانہ حرکتیں کرتے ہیں اور آپ پھر بھی دعائیں

① سورۃ فصلت: ۳۵۔ ② الصحيح لمسلم، کتاب البر والصلة والاداب، باب النهی عن لعن الدواب وغیرھا ج: ۱۲ ص: ۴۹۳ رقم: ۴۷۰۳۔ ③ شعب الایمان للبیہقی، فصل فی حذب النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی امتہ ورافتہ ج: ۳ ص: ۴۸۴ رقم: ۱۳۲۸۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ: آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

دیتے ہیں، یہ اس رحمت کا اثر ہے جو ہم نے آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر رکھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا فرض ہونا چاہئے، پہلا فرض یہ ہے کہ آپ معاف کریں یعنی دوسرے جاہلانہ حرکتیں کریں، سختیاں کریں، گالم گلوچ کریں، اور کیا کچھ نہیں کیا، ساحر آپ کو کہا، کذاب آپ کو کہا، مجنون آپ کو کہا، اشرار آپ کو کہا، پتھر آپ کو مارے گئے، پھر آپ پر کرایا گیا، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، نماز پڑھتے ہوئے اونٹ کا اوچھ آپ پر ڈال دیا گیا، تو کون سی حرکت ہے جو نہیں کی، تو کیا کچھ نہیں کیا، مگر اس کے باوجود یہ نہیں فرمایا: ”فَانْتَقِمْ مِنْهُمْ“ ”آپ ان سے بدلہ لیں“ بلکہ ابتدائی درجہ یہ فرمایا فَاغْفُ عَنْهُمْ آپ ان کو معاف فرمادیں، ان جاہلوں کی باتوں کا کوئی خیال نہ کریں، اور ایک موقع پر فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ ان کی بے ہودہ حرکتوں سے آپ کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، گھٹن آتی ہے، مگر آپ کی شان بہت بلند ہے، آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تقدیس میں لگیے، کافروں کی بات کا خیال نہ کیجئے رکوع و سجود اور عبادت میں لگیے، ان کی بے ہودگیوں کی طرف دھیان بھی مت دیجئے اور یہی نہیں کہ یہ کام اسی وقت کیجئے عبادت کرتے رہئے، یہاں تک کہ موت کا وقت آپہنچے مسلسل اس پر آپ قائم رہیے، تو یہ وہ خلق عظیم ہے کہ دوسرے برائی کریں اور آپ نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لیں نہ صرف یہ کہ آپ معاف کر دیں بلکہ انہیں دعائیں دیں ان کے ساتھ خوش خلقی کا معاملہ کریں، ابتداء یہاں سے فرمائی گئی کہ آپ انہیں معاف کر دیں، آپ معافی کی خوشدلیس، آپ کے اندر انتقامی جذبات نہ ہوں اور یہ بھی آپ کے رتبہ سے کم ہے، ایک درجہ اور اوپر بڑھئے آپ سے جو زیادتی کرتے ہیں ان کے لئے مغفرت کی دعائیں بھی کیجئے، اب ظاہر بات ہے کہ ایک شخص تو گالیاں دے رہا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، وہ بے ہودگیاں کر رہا ہے آپ اس کے لئے مغفرت کی دعائیں کر رہے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ یہ بھی کم درجہ ہے، آپ ایک درجہ اور اس سے آگے بڑھیں، انہی لوگوں کو بلا کر کبھی کبھی مشورہ بھی کر لیا کیجئے، تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ ہمیں اپنا جانتے ہیں، تو وہ لوگ غیروں کو غیر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور آپ انہوں کی اپنائیت پر آرہے ہیں، آپ انہیں بلاتے ہیں۔

مشاہدہ و آثار کی عظمت..... سردارانِ قریش جو گالیاں دینے میں کسر نہیں چھوڑتے تھے، اور آپ کی قتل و غارت کی فکر میں تھے، لیکن چند قریش کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے اپنی ردِ مبارک اتار دی، اور اس پر ان لوگوں کو بٹھایا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی ردِ مبارک بچھا کر ان کو اس پر بٹھایا، یہ چادر مبارک ہمارے عقیدے کے لحاظ سے عرش و کرسی سے بھی بہتر ہے، اس واسطے کہ عرش و کرسی حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے بری ہیں، اور چادر مبارک وہ ہے جو جسم مبارک سے لگی ہوتی ہے تو اس میں جو برکات کے آثار ہیں، وہ دوسری چیز میں نہیں ہو سکتے۔ اسی واسطے اسلام میں مشاہدہ

اور آثار کی عظمت کی گئی ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے بدن مبارک سے کوئی چیز لگی ہوئی ہو اس کی عظمت اور توقیر کرو، اس واسطے کہ بدن مبارک سے لگی ہوئی چیز آثار اور برکت سے محروم نہیں رہ سکتی۔ اور اس سے علماء نے اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے بدن سے چھوئی ہوئی چیزوں سے برکت حاصل کرو، لوگ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا پہنا ہوا کپڑا دے دیں، اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس بدن میں جو عبادت کی جا رہی ہے اس کو کپڑا لگے گا اس میں بھی اس عبادت کی برکت کے آثار آئیں گے، نبی زمین کے جس حصے پر بیٹھ گئے ہیں، اس میں بھی برکت کے آثار پیدا ہوں گے، اہل اللہ کے اندر آثار ہیں ان چیزوں پر آثار آجاتے ہیں جہاں ان کے بدن لگتے ہیں، اس واسطے کہ اصل چیز ان حضرات کی روح ہے، جو اصل برکتوں کا خزانہ ہے چونکہ یہ روح اس بدن میں گذارہ کر رہی ہے، تو اس بدن میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، اس بدن کو کپڑا لگ گیا تو اس میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، وہ کپڑا کسی بدن کو لگ جائے گا تو اس میں برکت کے آثار پیدا ہو جائیں گے، تو اثر در اثر پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

وجوہ عظمت آپ آج بیت اللہ کی تعظیم کرتے ہیں، تو بیت اللہ کوئی شاندار عمارت نہیں، آپ کے ہاں بمبئی میں کروڑوں روپوں کی عمارتیں ہیں، بیت اللہ تو سیاہ پتھروں کا ایک کوٹھ بنا ہوا ہے، پھر اس کی عظمت کیوں ہے؟ اس لئے کہ تجلیات ربانی اس کے اندر سائی ہوئی ہیں، انوار خداوندی اس میں آئے ہوئے ہیں، ان انوار کے اثرات سے وہ پتھر بھی متبرک بن گئے کہ کروڑوں روپوں کی عمارتیں چاہے یا قوت اور جواہرات سے بنا دی جائیں، ان میں وہ برکت کا اثر نہیں جو ان کا لئے پتھروں میں ہے، اس لئے کہ تجلیات ربانی نے ان کو اپنا مورد بنا رکھا ہے، ان پر تجلیات وارد ہوتی ہیں، تو ان میں برکت آگئی اس لئے آپ بیت اللہ کے پتھروں کو چومتے ہیں، برکت حاصل کرتے ہیں، نیز بیت اللہ کو جو غلاف مٹھو جاتا ہے، اس کی تعظیم کرتے ہیں، ہزاروں روپوں میں ملے تو اس کا ٹکڑا خرید کر لاتے ہیں، لوگ وصیت کرتے ہیں کہ میرے کفن میں رکھ دیا جائے، کوئی وصیت کرتا ہے کہ میری آنکھوں پر رکھ دیا جائے، نیز غلاف شریف کا کوئی ٹکڑا آجاتا ہے تو لوگ سر پر رکھتے ہیں آنکھوں پر لگاتے ہیں حالانکہ سب خود ہی تو اس کو بیٹھ کر بنا رہے ہیں ہم ہی نے تو اس کو بنا تھا، اور آج اُسے ہم سر پر رکھ رہے ہیں، اس لئے کہ جب ہم اسے بن رہے تھے، وہ ہماری چیز تھی، جب بیت اللہ پر ٹانگ دی، اب اس میں وہ اثرات آگئے، جو تجلیات خداوندی کے تھے، اس لئے وہ مبارک اور متبرک بن گئی، تو ہم آنکھوں پر لگاتے ہیں، سر پر لگاتے ہیں۔ بلکہ جو حاجی حج کرنے جاتا ہے اور وہ اس غلاف اور بیت اللہ کو مٹھو کر آتا ہے لوگ اس سے توقیر سے مصافحہ کرتے ہیں کہ یہ ہاتھ غلاف شریف سے لگے ہوئے ہیں، ان ہاتھوں کو چوم لیں، غرض آثار واسطہ در واسطہ ہو، ہو کر چلے آتے ہیں۔

حدیث مسلسل بالمصافحہ سے استدلال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اپنی جگہ ہے، اگر آپ سے کسی نے مصافحہ کر لیا، ہم سمجھتے ہیں کہ اس ہاتھ کو چھونا دارین کی سعادت ہے، اور اس ہاتھ کو جس ہاتھ نے چھوا اس کو ہم سعادت مند سمجھتے ہیں اور یہ کہ اس سے سعادت حاصل کرو، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

”صَافَحْتُ بِكَفِّيْ هَذِهِ كَفَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّم“ میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہتھیلی سے مصافحہ کیا ہے، اور میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی گئی، تو آپ کے تابعی شاگرد کہتے ہیں کہ میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ دیجئے اور مجھ سے بھی مصافحہ کیجئے، اس کے بعد اس تابعی نے اپنے شاگرد کو حدیث سنائی تو اس نے کہا میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھتا ہوں آپ اپنی ہتھیلی میری ہتھیلی پر رکھ دیجئے، اور آگے شاگردوں کا سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے یہاں تک یہ حدیث مسلسل بالمصافحہ کے نام سے آج تک محدثین کرام میں چلی آرہی ہے۔

سندِ عالی کی فضیلت و برکات حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ ہمارے اساتذہ اور اکابر میں سے ہیں، حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا فیض، ان کا علم بلکہ مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور انڈیا) انہی کی برکات کا خزانہ ہے، اور خزانہ ماشاء اللہ چل رہا ہے، جب میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ سے حدیث پڑھ لی، تو اتفاق سے میرٹھ کا ایک سفر پیش آیا جس میں سہارن پور کے بزرگوں کو بھی اور دیوبند کے اکابر کو ایک تقریب میں مدعو کیا گیا تھا، تو سہارن پور سے ان بزرگوں کے ساتھ ہم دیوبند والے بھی اسی گاڑی میں سوار ہوئے، اس میں میں بھی ساتھ تھا، تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ ہوا۔

حضرت رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ: آپ حدیث پڑھ چکے ہو، اس وقت پوری جماعت میں میری سند سب سے زیادہ عالی ہے، میری احادیث کم واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی ہوئی ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی اجازت دوں، تاکہ تیری سند بھی عالی ہو جائے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے لئے آپ کو سہارن پور آنا پڑے گا۔ میں نے کہا، حضرت میں اس کے لئے حاضر ہوں گا، انشاء اللہ دل میں تو یہ بات رہی مگر لڑکپن کا زمانہ تھا، بھول بھال گیا اور ایک برس گزر گیا اتفاق سے پھر حضرت سے سفر کا ساتھ ہوا، فرمایا: آپ حدیث کی اجازت لینے آئے نہیں؟ میں شرمندہ ہوا، میں نے عرض کیا حضرت میں حاضر ہوں گا۔ اس کے بعد پھر بھول بھال گیا، اور ایک برس پھر گزر گیا، اس کے بعد پھر ایک سفر میں ساتھ ہوا، تو پھر حضرت نے یاد دلایا کہ آپ اب تک نہیں آئے پھر یہ چیز نہیں ملے گی۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حضرت سہارن پوری ہجرت کے ارادہ سے مدینہ منورہ جارہے ہیں، اب مجھے فکر ہوئی، کہ اب اجازت حدیث لے لینی چاہئے، ورنہ اس سعادت سے محرومی ہو جائے گی تو میں پہلی گاڑی سے سہارن پور پہنچ گیا بہت خوش ہوئے ویسے بھی اپنے بزرگ تھے نیز عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی، رشتہ میں میرے تایا ہوتے تھے، بہر حال بڑی شفقت سے پیش آئے اور مولانا زکریا رحمۃ اللہ صاحب شیخ الحدیث مدظلہ کو فرمایا کہ مظاہر العلوم کے کتب خانے میں حدیث کی جتنی کتابیں رکھی ہیں سب اٹھالو، چنانچہ ساری منگوائیں بعض کتابوں کی اول حدیث خود پڑھی اور بعض کی مجھ سے پڑھوائیں اور اس میں حدیث کی اجازت دی اور یہ فرمایا کہ: اس وقت عام طور سے حدیث کی جو سند ہے وہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی ہے۔

یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرت شاہ عبدالغنی کے شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اس طرح ان بزرگوں اور شاہ اسحاق صاحبؒ کے درمیان ایک واسطہ ہے، اور میری حدیث کی سند یہ تھی کہ میں نے حضرت انور شاہ صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، انہوں نے حضرت مولانا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے حدیث پڑھی، حضرت مولانا قاسم صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے شاہ اسحاق صاحبؒ سے حدیث پڑھی تو شاہ اسحاق صاحب اور ہم تک بیچ میں چار واسطے ہیں، اور چار واسطوں سے گذر کر گویا ہم شاہ اسحاق صاحب تک پہنچتے ہیں، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے حدیث کی اجازت مولانا عبدالقیوم صاحب بڑھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، انہوں نے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، تو چونکہ ایک واسطہ بیچ میں رہ جاتا ہے، تو سند بہت زیادہ بلند ہو جاتی ہے، اس سند سے حضرت سہارن پوریؒ نے مجھے تمام احادیث کی اجازت دی۔ اس کے بعد مسلسل کتاب منکوائی، یعنی وہ احادیث جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً مسلسل چلی آرہی ہیں، اس میں دو حدیثوں کی عملاً اجازت دی، ایک حدیث مسلسل بالمصافحہ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ اوپر سے ہر شاگرد مصافحہ کرتا ہوا چلا آ رہا ہے، تو حضرت سہارن پوریؒ نے حدیث سنا کر مجھ سے مصافحہ کیا کہ میں نے اس ہتھیلی سے مصافحہ کیا مولانا عبدالقیوم صاحب بڑھانویؒ سے اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے مصافحہ کیا اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے مصافحہ کیا، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے مصافحہ کیا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کیا شیخ ابو طاہر مدنی سے اور انہوں نے اپنے استاذ سے، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی تو صرف حدیث کی سند نہیں پہنچی بلکہ مصافحہ کی سند بھی پہنچی۔

حدیث مسلسل بالماء والتمر سے استدلال اسی طرح سے حدیث مسلسل بالماء والتمر کی اجازت دی، وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی مہمان نوازی اور ضیافت کی، اس طرح سے کہ کھجور کھا کے بقیہ بچی ہوئی کھجور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھلائی، اور پانی پی کر بچا ہوا پانی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پلایا، پھر فضیلت بیان کی کہ جو پانی اور کھجور کی دعوت کرے اس کے لئے یہ مراتب اور درجات ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی طرح اپنے شاگرد کو کھجور کھلا کر اور پانی پلا کر فضیلت بیان فرمائی، انہوں نے اپنے شاگرد کو آگے سلسلہ در سلسلہ یہاں تک کہ سند حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ تک پہنچ گئی، انہوں نے اسی طرح مجھے کھجور کھلا کر اور زمزم کا پانی منگوا کر پی کر پلایا اور فرمایا: میں تجھے اس حدیث کی بیان کرنے کی اجازت دیتا ہوں اور اس عمل کو مسلسل چلانے کی۔ تو یہ کیا چیز تھی؟ ایک بدن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک کو مس کیا تھا، یعنی حضرت انس رضی اللہ

عنہ کی ہتھیلی نے، اور وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھا تو فرمایا کہ: میں نے ریشم میں وہ ملاہیت نہیں دیکھی اور کسی چیز میں نہیں دیکھی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک میں تھی، ریشم سے بھی زیادہ صاف ملائم ستھری اور چکنی تھی، اور اس کے بعد اپنے شاگرد سے مصافحہ کیا، تو جو برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی کی حضرت انسؓ کی ہتھیلی میں آئی تھی، وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی، ان کے شاگرد سے وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی، ان کے شاگرد سے ان کے شاگرد میں یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچ گئی۔ تو یہ آثار کو کیوں محفوظ رکھتے ہیں، کہ جسم سے جسم مل جائے تو روحانیت کے آثار آتے ہیں، تو بیت اللہ کے اندر جو تجلیات ربانی ہیں وہ پتھروں میں آئیں۔ اور پتھروں سے غلاف میں آئیں، اور غلاف سے غلاف چھونے والوں میں آئیں، یقیناً وہ متبرک ہیں اور وہ برکات ان میں آئی ہیں چاہے انہیں احساس ہو یا نہ ہو، شعور ہو یا نہ ہو، مگر وہ برکات میں متبرک ہو چکے ہیں، وہ برکات یقیناً ان کے اندر راسخ ہو گئی ہیں، جنہوں نے غلاف شریف کو عقیدت و محبت سے چھوا ہے، یقیناً وہ آثار سے متاثر ہیں اور وہ بلاشبہ اس قابل ہیں کہ اگر ان کا ہاتھ اس نیت سے چوماجائے تو بے شک برکت پیدا ہوگی، الغرض اس طرح علماء اسلام نے برکات و آثار کی حفاظت کی ہے۔ بہر حال میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار خیر و برکت وہ صحابہؓ میں آئے، صحابہؓ سے تابعین میں آئے، تابعین سے تبع تابعین میں آئے، سلسلہ بسلسلہ ہوتے ہوئے وہ عالم میں اور اس عالم سے جو متعلق ہیں، ان لوگوں میں پہنچے اس طرح سے پوری امت کے اندر آثار خیر و برکت پھیلے ہوئے ہیں۔

خلق عظیم کے آثار..... تو خلق عظیم کے معنی یہ نکلے کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی حدود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائیں، اور اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایثار سے بھی اونچا درجہ احسان کا ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو، کوئی ظالم ہے تو تم اس کو دعا دو۔ ظاہر بات ہے کہ اس خلق کے استعمال کے بعد لڑائی جھگڑا نہیں پیدا ہو سکتا، کوئی بہت ہی ناانجبار ہوگا اور بہت بدطینت ہوگا کہ اس کے بعد بھی لڑائی پر آمادہ ہو وہ گالیاں دے رہا ہے آپ بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اگر وہ واقعی بھیڑ یا نہیں ہے انسان ہے تو یقیناً اس کے قلب میں نرمی پیدا ہوگی کہ میں تو گالیاں دے رہا ہوں اور یہ مجھے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اور دعائیں دے رہے ہیں تو جھگڑے قطع ہو جائیں گے جھگڑا ہمیشہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آدمی انتقامی جذبات سے دوسرے کے مد مقابل آئے وہ ایک گالی دے تو یہ دو گالیاں دے اور وہ دو دے تو یہ تین دے، تو گالی مٹی نہیں بلکہ ڈبل ہو جاتی ہے، لیکن اگر گالی کا جواب گالی سے نہ دیا جائے بلکہ دعا سے دیا جائے تو اس کی گالی مٹ گئی، اور دعا کی برکت سے تم بھی صحیح ہو گئے، وہ بھی صحیح ہو گئے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلق عظیم پر عمل اور اس کے آثار..... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے واقعات میں ہے کہ کسی نے برسر بازار ان کو برا بھلا کہا، اور ایسی تہمتیں ان کی طرف منسوب کیں جو ان کے اندر نہیں تھیں، ہر زمانے میں

ایسے ناہنجار پیدا ہوئے ہیں جو اہل اللہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، نہ ان کے علم و فضل کی قدر کرتے ہیں بلکہ بد زبانی بد کلامی اور بد گمانی کرتے ہیں، ہر دور میں ایسے کچھ لوگ رہتے ہیں، تو امام صاحبؒ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے، غرض اس شخص نے برسر بازار امام صاحب کو بہت برا بھلا کہا، گالیاں دیں، جھوٹی تہمتیں آپ پر تھوپ دیں جو حضرت امامؑ میں نہ تھیں۔ اب امام صاحب کو حق تھا کہ وہ بھی ایک آدھ گالی دے دیتے لیکن امام صاحبؒ کی ایمانی کیفیت، ایسے حضرات تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہوتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خلق عظیم دیا گیا، وہ خلق عظیم سے کیسے ہٹ سکتے تھے، تو امام صاحب کو جب معلوم ہوا کہ مجھے برا کہا، جب یہ سنا کہ فلاں شخص نے مجھے گالیاں دیں تو ایک جگہ ریشم کے بہت سارے قیمتی تھان رکھے تھے تھانوں کی ڈھیریاں لگائیں، درہم و دنانیر کی بھری ڈھیریاں لگائیں کچھ کوزے کی مسری اسی طرح اس زمانے کے جو تحائف تھے وہ بھی جمع کئے، ان تمام چیزوں کو اپنے کندھے پر ڈال کر اس شخص کے گھر پہنچ گئے، یہ اس کو گالیوں کا بدلہ دینے تشریف لے گئے، اس کے گھر پہنچ کر آواز دی، وہ باہر آیا دیکھا کہ امام ابو حنیفہؒ اور سر پر خوان، وہ شخص گھبرا گیا کہ حضرت! آپ اور میرے گھر پر؟ فرمایا: میں نے سنا کہ آپ نے میرے اوپر کچھ احسانات کئے ہیں؟ اس نے کہا حضرت! احسانات میں نے تو گالیاں دی تھیں اور تہمتیں آپ کی طرف منسوب کی تھیں جو جھوٹی بھی تھیں۔ فرمایا: یہی تو احسانات تھے، اس واسطے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب کوئی شخص کسی پر جھوٹی تہمت دھرتا ہے کہ وہ عیب اس کے اندر نہیں مگر برائی اس پر تھوپ دی تو قیامت کے دن اس تہمتیں لگانے والے کی جتنی نیکیاں ہیں وہ اسے دیدی جائیں گے جس پر تہمتیں لگائیں، جس پر تہمت لگی ہے اس کے جو واقعی عیب تھے وہ اس تہمت لگانے والے پر لا دیئے جائیں گے، وہ تو جنت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گا اور یہ جہنم میں پہنچ جائے گا، تو فرمایا: اس سے بڑا احسان کیا ہوگا کہ مجھے جنت دینے کے لئے آپ نے جہنم مول لے لی، اپنی عاقبت خراب کر لی اس سے بڑا ایثار کیا ہوگا کہ محض میری بھلائی کے لئے اپنی عاقبت اور آخرت بگاڑ لی کہ مجھے جنت مل جائے، اس احسان کا میں کوئی بدلہ نہیں دے سکتا، یہ چند ہزار روپے کے کوئی معمولی تھان ہیں اور کچھ درہم اور دینار ہیں آپ کے احسان کا یہ حقیر سا بدلہ لے کر آیا ہوں، اس کی حالت یہ تھی کہ جیسے اس کو الٹی چھری سے ذبح کر دیا گیا ہو، کبھی نیچے دیکھتا ہے کبھی قدم پکڑتا ہے اور کہتا ہے کہ: حضرت! آپ نے تو مجھے بغیر چھری کے ذبح کر دیا۔ فرمایا: اس کی ضرورت نہیں بس یہ ہدیہ قبول کر لو، یہی سب سے بڑا احسان ہوگا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے توبہ کی ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا کہ آج سے میں کسی کو بھی گالی نہیں دوں گا، تو امام صاحبؒ کے خلق نے اس شخص کو بدی کو نہیں مٹایا بلکہ دنیا سے ایک بہت بڑی بدی کا خاتمہ کر دیا کہ کم از کم اس کی نسل تو اس بدی پر نہیں چلے گی جس کے اوپر اس کے اثرات ہیں وہ تو کبھی گالم گلوچ نہیں کرے گا۔ گالی مٹانے کی صورت یہ نہیں ہے کہ ایک گالی کے بدلے میں دو گالیاں دے، یہ تو تین گالیاں جمع ہو گئیں گالی مٹی کہاں؟ گالی کے بدلے میں جب دعوایں گے اور احسان کریں گے تو گالی بھی مٹ گئی اور احسان غالب آ گیا اس واسطے فرمایا: ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

فَإِذَا الدُّنْيَ بَيْنَكَ وَيَسْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿١﴾ دوسروں کی برائیوں کو اپنی بھلائیوں سے دفع کرو، عداوت بھی ہوگی وہ دوستی میں تبدیل ہو جائے گی، عداوت ختم ہو جائے گی محبت پیدا ہو جائے گی مگر آگے یہ فرمایا: ﴿وَمَا يُلْقِهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا﴾ ﴿٢﴾ یہ وہی کر سکتا ہے جس میں صبر و ضبط کا مادہ ہو، اور اگر کسی کے اندر صبر نہ ہو، کسی نے ایک گالی دی اور وہ باہر نکل کر دس گالیاں دے، وہ یہ کام نہیں کر سکتا، یہ بڑے صابر اور ضابط انسان کا کام ہے کہ بیس گالیاں بھی دی جائیں تو وہ پی جائے اور یہ پینا لعنہ اللہ ہو کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ میں اس کی اصلاح کروں اور اپنی بھی اصلاح کروں، تو یقیناً وہ گالی اور برائی مٹ جائے گی، غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خلق دیا گیا تھا۔

علمی و عملی قرآن کریم..... بعض لوگوں نے صدیقہ عائشہؓ سے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیا تھا؟ فرمایا: ”كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ“ ﴿٣﴾ آپ کے اخلاق یہ قرآن کریم ہے قرآن کریم اوّل سے لے کر آخر تک پڑھ لو، جس چیز کو قرآن نے اچھا کہا وہ تمام اچھائیاں آپ کے اندر ہیں جن چیزوں کو بُرا کہا آپ کی ذات بابرکات اس سے بری الذمہ ہے، تو پورا قرآن کریم آپ کے خلق کا نمونہ ہے، قرآن جو کہتا ہے وہی آپ کر کے دکھلاتے ہیں، جو آپ کر کے دکھلاتے ہیں، قرآن کریم اس کی تائید کرتا ہے، تو قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مطابق ہیں اللہ کا ایک قرآن علمی ہے جو کاغذوں میں ہے اور ایک قرآن عملی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے جو چیزیں قرآن کریم میں قال کی صورت میں ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں حال کی صورت میں ہیں۔

وہاں کلام کی صورت میں ہیں یہاں اعمال کی صورت میں ہیں، یہ دونوں قرآن ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہیں، ایک اللہ کا کلام ہے اور ایک اللہ کا کام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کے مورد بنے ہوئے ہیں وہ گویا اخلاقی خداوندی کا نمونہ ہے حق تعالیٰ کے بھی تو یہی اخلاق ہیں کتنے لوگ ہیں جو اللہ کو برا کہتے ہیں کتنے ہیں جو گالیاں دیتے ہیں، کتنے ہیں جو حق تعالیٰ کے صریح مد مقابل آئے ہوئے ہیں حتیٰ کہ یہی بدکردار انسان ڈھٹائی کے ساتھ ”اینٹی خدا اور اینٹی رسول“ انجمنیں قائم کرتا ہے، یعنی خدا اور رسول کے مقابلے کے لئے انجمنیں قائم کرتے ہیں، مالک الملک کی شان میں اتنی گستاخیاں مگر اس کے باوجود حلم کا یہ حال ہے کہ نہ بارشیں بند ہوتی ہیں نہ آفتاب کا طلوع و غروب ہونا بند ہوتا ہے، نہ موسم آنے بند ہوتے ہیں، نہ موسموں کے غلے پھل بند ہوتے ہیں دوست بھی کھارے دشمن بھی کھارے ہیں، گالیاں بھی دے رہے ہیں اور مالک کا دیا ہوا کھا بھی رہے ہیں ایسے ناہنجار ہیں کہ محسن کا احسان تو کیا مانتے، الٹا برا بھلا کہہ رہے ہیں وفاقہ اسی کی نعمتوں سے اٹھا رہے ہیں یہ حق تعالیٰ کا حکم ہے جس کو عارفِ روی نے کہا: شو مغرور بر حلم خدا..... یہ جو تم گالیاں بک رہے ہو، یہ جو برا بھلا کہہ رہے ہو، اور عذاب نہیں آتا تو اللہ کے حلم پر مت مغرور ہو، معلوم نہیں اخیر میں کیا نتیجہ نکلے گا؟ کیا بدکہ دیا جائے گا؟ یہ تو حلم خداوندی

① سورة فصلت: ۳۴۔ ② سورة فصلت: ۳۵۔

③ مسند احمد، حدیث السیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا ج: ۵۰ ص: ۱۱۶ رقم: ۲۳۲۶۰۔

ہے کہ صبر کیا جا رہا ہے، لیکن جہاں وہ صابر ہیں اور صبوران کا نام ہے غفوران کا نام ہے وہیں جبار اور قہار بھی ان کا نام ہے، ان کا قہر جب آتا ہے تو پھر کوئی چیز اس کو روکنے والی نہیں ہوتی، تو: ”اعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ الْحَلِيْمِ“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں حلیم کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں، وہ حلم کرتا ہے مگر جب غضب ناک ہوتا ہے تو پھر غضب کی کوئی حد نہیں رہتی، بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کے اخلاق کا نمونہ تھے، جیسے دشمنوں کی دشمنی دیکھ کر پھر بھی اپنا رزق بند نہیں کرتے، وہی شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ دشمن گالیاں بھی دے رہے ہیں، برا بھلا کہہ رہے ہیں، قتل و غارت بھی کر رہے ہیں، پتھر بھی مار رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، تو صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق دیکھنے ہیں تو اول سے لے کر اخیر تک قرآن کریم پڑھ لو جتنی چیزیں اس میں بھلائیوں کی بیان کی ہیں، وہ سب ایک ایک کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں موجود ہیں، اور جن جن برائیوں سے روکا ہے، حضور علیہ السلام ان برائیوں سے پاک ہیں غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کا نمونہ ہیں۔

تمسخر پر اہل حق کی خاموشی کا نتیجہ..... اور بعض صحابہؓ نے کہا اگر آپ کے اخلاق عظیمہ دیکھنے ہیں تو اس آیت کو پڑھ لیں۔ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ ① اے پیغمبر! معافی کی خواہش کر، اور امر بالمعروف کرتے رہو، لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلائے رہو، ان کی ناہنجاریوں پر مت جاؤ، اگر یہ جاہلانہ حرکت بھی کریں تو درگزر کیجئے بالکل خیال ہی نہ لائیے، ان کی جاہلانہ حرکات خود بخود بند ہو جائیں گی۔ جیسا کہ متقی حضرات کی شان قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی: ﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ ② ایک صالح، نیک بندہ عارف باللہ گزر رہا ہے، اور مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ تمسخر کر رہے ہیں نام لے کر پھبتیاں کس رہے ہیں، لیکن اولیاء کرام کی شان کیا ہے؟ ایسی لغو مجلسوں سے نظر نیچی کر کے گزر جاتے ہیں، دھیان بھی نہیں لاتے کہ یہ کیا بک رہے ہیں، یہ نہیں کہ متاثر ہوں اور خرم ٹھونک کے کھڑے ہو جائیں کہ تم نے مجھے برا بھلا کیوں کہا؟ صبر و ضبط اور درگزر کو اختیار کرتے ہیں اور آنکھ نیچی کر کے گزر جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بدر کردار کے مقابلہ میں حق تعالیٰ آجاتے ہیں، آپ کو مقابلہ پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے کہ: ”مَنْ اَذَى لِنَفْسِهِ وَلَيْلًا فَقَدْ اَذْنَتْهُ بِالْحَرْبِ“ ③ جس نے میرے ولی اور دوست کو ستایا میں اس کو الٹی میٹم دیتا ہوں وہ مجھ سے نمٹے، میں اس سے مقابلہ کروں گا، اس ولی کی طرف نہ جائے، تو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو چھوڑ دیتے ہیں کہ تم اپنے کام میں لگے رہو ہم تمہارے دشمنوں سے ہم خود ہی ٹھٹھیں گے۔ پھر اس جنگ کا نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اس کی آل اولاد اور مال پر آفت پڑتی ہے۔

① پارہ: ۹، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۱۹۹۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ: الفرقان، الآیۃ: ۷۲۔

③ الصحيح للبخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع ج: ۲۰ ص: ۱۵۸ رقم: ۶۰۲۱۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَأَفَّةٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ!

نفی جنون کے دو طریقے..... بزرگان محترم حق تعالیٰ شانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی تہمت
اٹھاتے ہوئے اور اس کی نفی کرتے ہوئے دو طریقے اختیار فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو
کمالات حق تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں ان کمالات کا ذکر فرمایا اور نعمت کے لفظ سے ان کی طرف اشارہ فرمایا بتلانا یہ
تھا کہ جس ذات بابرکات میں یہ کمالات موجود ہوں اس کو مجنون کہنا بہت زیادہ نادانی اور حماقت کی بات ہے اس
طرح جنون کی نفی ہوگئی، اور کفار کی تہمت سے بریت ثابت ہوگئی۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ جنون کی تہمت رکھنے والے کے آثار بیان کئے کہ ان کے احوال پر ذرا غور کیا
جائے پیغمبر کو مجنون کہنے والے کون ہیں؟ اس واسطے کہ تہمت لگانے والی شخصیت اگر با وقعت ہو اور بڑے درجہ کا
آدمی ہو تو وہ تہمت قابل التفات بھی ہے اگرچہ تہمت بڑا لگائے چھوٹا لگائے حماقت ہے، لیکن بہر حال اگر کوئی
سنجیدہ اور متین شخص اور مخلوق میں مقبول ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اس پر غور کر لیا جائے کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، لیکن اگر
کہنے والا ایسا ہے کہ انسانیت کی جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں وہ ساری اس کے اندر موجود ہوں تو اس کی تہمت بہت ہی
بے وقعت ہے، جو قابل توجہ بھی نہیں ہے تو جن پر تہمت لگائی گئی ان کے آثار کمال دیکھو اور ایک طرف تہمت لگانے
والے کی برائیوں پر نظر ڈالو، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تہمت محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، تو
یہ تہمت سب سے پہلے جس نے لگائی اور اسے لے کر کھڑا ہوا، وہ ولید بن مغیرہ ہے، یہ سردار ان قریش میں سے
ایک سردار ہے اس نے اپنی دشمنی اور عناد میں آکر کہا کہ:

محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں، معاذ اللہ ان کی بات کا تو کوئی اعتبار نہیں، سوال یہ ہے کہ اس تہمت لگانے
والے کے کیا اوصاف ہیں۔

تہمت جنون لگانے والے کی عرفی حیثیت..... تو حق تعالیٰ نے دس اوصاف اس کے بیان کئے کہ یہ دس برائیاں اس کے اندر ہیں جو ایک انسان کے ذلیل و خوار ہونے کے لئے کافی ہیں مزید کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، تو اس نے صرف ایک برائی بلکہ تہمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی تھی، کہ معاذ اللہ آپ مجنون ہیں، تو حق تعالیٰ نے دس برائیاں ثابت کیں اور فرمایا: جس کے اندر یہ حرکتیں موجود ہیں، اس کی بات بھی کوئی قابل اعتبار ہو سکتی ہے؟ اور یہ عجیب نہیں کہ اس بناء پر ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مداح اور ستائش کرنے والے آپ پر جو درود شریف بھیجتے ہیں تو درود بھیجنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو اس درجہ محبت کے مقام پر مانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوة و سلام پڑھتے ہیں، چنانچہ فرمایا گیا:

”مَنْ صَلَّى عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاحِدَةً صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ عَشْرًا“ ① جو شخص ایک دفعہ ہمارے نبی پر درود بھیجے گا تو اللہ اس پر دس دفعہ رحمت بھیجے گا، تو اس کا مطلب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رحمت کی دعا کرنے والا دس مرتبہ اللہ کی رحمت کا مستحق بنے گا، تو اللہ جس بندے کو دس خوبیاں اور نیکیاں دے ظاہر بات ہے کہ اس سے بڑھ کرامت میں اور کون ہوگا جس کو حق تعالیٰ سرائیں اور اس پر رحمت نازل فرمائیں ٹھیک اس کے بالمقابل جو ایک دفعہ برائی کرے گا حق تعالیٰ اس کی دس دفعہ برائی بیان کریں گے وہ ایک تہمت عائد کرے گا تو حق تعالیٰ نے اس کی تہمتیں اس پر عائد کیں اس نے ایک جھوٹی تہمت لگائی تھی حق تعالیٰ نے اس کی سچی دس تہمتیں بیان فرمادیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو ایسا ہو تو کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کی بات سنی جائے؟

دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس بری خصالتیں..... فرمایا: ﴿وَلَا تُطِيعُ كُلَّ خَلَافٍ مِّمَّيْ﴾ پہلی بات یہ ہے کہ وہ خلاف ہے، یعنی کثرت سے قسمیں کھانے والا ہے اور تجربہ یہ ہے کہ جو زیادہ قسمیں کھاتا ہے بار بار قسمیں کھاتا ہے وہ جھوٹا ہوتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اُسے خود بھی اپنی بات پر اعتماد نہیں ہے، اس لئے قسمیں کھا کھا کر زبردستی اپنی بات کو مخلوق کے دل میں ٹھوننا چاہتا ہے، بات میری قابل اعتبار تو نہیں ہے، قسمیں کھانے سے ممکن ہے کوئی اعتبار کرے تو اس کو خلاف کہا گیا ہے تو یہ خود ایک برائی ہے کہ آدمی بات بات پر قسم اٹھائے شریعت نے اس کو مکروہ سمجھا ہے قسم کسی ضرورت کے لئے ہوتی ہے، کوئی دعویٰ ثابت کرنا ہو یا کوئی معاملہ ہو اور معاملہ پکا نہیں ہو رہا ہے تو اس کے لئے آدمی قسم کھائے، لیکن جس شخص کا قسم تکیہ کلام بن جائے، بات بات پر حلف اٹھائے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوتی ہے، اس لئے مسئلہ شرعی یہ ہے کہ: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ﴾ ② اللہ کے نام کو کھلونا مت بناؤ، تھوڑی تھوڑی بات کے لئے اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی بڑا اہم معاملہ ہو تو اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی وقف کا معاملہ ہو کوئی اور کار خیر سرانجام دے رہا ہو اس کا حلف اٹھائے، اللہ کو بیچ میں لائے جھوٹی جھوٹی

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلاة، باب الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم بعد التشهد ج: ۲ ص: ۳۷۶ رقم:

۶۱۶ ② پاره: ۴، سورة: البقرة، الآية: ۲۲۳.

اور خسیس خسیس باتیں اور بار بار اللہ کے نام کو بچ میں لارہا ہے تو یہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کے نام کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی ہے اس واسطے شریعت نے روکا ہے کہ بار بار قسم مت کھاؤ، کوئی بڑا معاملہ آجائے، عدالت میں کوئی معاملہ آجائے یا لاکھوں روپوں کا معاملہ ہو، یا کوئی دین کا معاملہ ہو تو آدمی کہے کہ میں حلف کرتا ہوں، میں نے آج کھانا کھایا تھا، مجھے خدا کی قسم ہے قسم ہے اللہ کی میں نے کپڑے پہنے تھے، یہ کوئی قسم کھانے کی بات ہے، بھائی تو نہ پہنتا تو کیا تھا اور پہن لئے تو کیا ہو گیا، غرض اللہ کے نام کو کھلوانا نہ بنائے شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے، تو وہ (ولید) بار بار قسم کھاتا ہے، تو اسے اپنی بات پر بھی اعتماد نہیں ہے تو جو شخص خود بھی اپنے کو جھوٹا سمجھتا ہو اس کی بات کیا قابل اعتبار ہے؟ اور اس ذات اقدس پر تہمت لگائے جو پورے عالم سے بڑھ کر مقدس ہے۔

تو خود جھوٹا، قسم کھانا اس کی علامت ہے اور اس عظیم شخصیت کے اوپر تہمت لگائے تو دو وجہوں سے یہ بات اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اوپر اعتماد کیا جاسکے، غرض پہلی بات خلاف سے بیان کی۔ دوسری بات، مہین..... یہ بے وقعت آدمی ہے، یعنی ملک میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں، بار بار قسمیں اٹھانے سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹا اور معاند ہے اور اپنی بات پورا کرنے کے لئے قسمیں کھاتا ہے تو..... خلاف، مہین..... یعنی ذلیل اور بے وقعت ہے لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت و عظمت نہیں ہے، پھر ساتھ میں ہمتا ز بھی ہے، یعنی عیب چینی اس کی عادت ہے، عرب والے اس سے تنگ ہیں، یعنی واقعی ناواقعی کسی میں کوئی برائی ہو اس کی زبان پر آ جاتی ہے کہ فلاں میں یہ عیب ہے تو ساتھ میں ہما ز بھی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿مُشَاءً بِسْمِیْہِ﴾ چغل خو بھی ہے، اس کی بات اس کو لگا دی اس کی بات اس کو لگا دی، اور دونوں میں لڑائی کرادی، تفریق ڈلوادی، یہ گویا اس کا بڑا کمال ہے۔

مدعی جنون کے اوصاف اہل جہنم جیسے ہیں..... انسانوں میں کمال یہ سمجھا گیا ہے کہ دوڑتے ہوؤں کو آپس میں جوڑ دے عناد کرنے والوں میں محبت پیدا کر دے یہ کوئی کمال ہے کہ دو محبت کرنے والوں کو توڑ دے یہ شیطانی وصف ہے، شیطان دنیا میں اسی لئے آیا ہے کہ جڑے ہوئے دلوں کو توڑ دے، محبت والوں میں تفریق پیدا کر دے، جبکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں مقصد یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، پھڑے ہوئے دلوں کو ملائیں۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں وصل کرنے کے لئے آئے ہیں، جو بندے آپس میں ٹوٹ گئے ہیں، انہیں آپس میں ملائیں، جو بندے خدا سے ٹوٹ گئے ہیں، انہیں خدا سے جوڑ دیں، جن خاندانیہ یوں میں جھگڑا ہے ان کو آپس میں جوڑ دیں جن کے کہنوں میں تفریق ہے ان کو ملا دیں اگر قوم میں لڑائی ہے تو اس میں اتحاد پیدا کر دیں۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کا دعویٰ فرماتے ہی پہلا کام یہ کیا ہے کہ عربوں میں جو صدیوں سے لڑائی چلی آرہی تھی اور باہم رقیب تھے اور ایک ایک لڑائی پر سو سو برس گزر چکے تھے، ان کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا جس کو

قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا﴾ ① اے عربو! تم لڑکر جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ذلیل و رسوا بن گئے تھے، دنیا کی قوموں میں تمہارا کوئی وقار باقی نہیں تھا، کوئی عربوں کو اونٹوں کے چرانے والے کہتا تھا کوئی مینگنیوں میں کھیلنے والے کہتا تھا، کوئی ذلیل لوگ کہتا تھا، غرض دنیا کی قوموں اور حکومتوں میں عربوں کی بے وقعتی تھی ذرا ذرا سی بات پر جنگیں ہوتی تھیں، پانی پینے پلانے پر جھگڑا تھا، فلاں نے کنویں میں پہلے کیوں ڈول ڈال دیا، میرا ڈول پہلے کیوں نہ گرا، لڑائی شروع ہوئی اور تلواریں کھینچ گئیں۔

حدیث میں ایک واقعہ میں فرمایا گیا کہ ایک شخص کے کھیت میں کسی کی اونٹنی جا گھسی اس نے تیر مارا تو اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ کھیت کی رکھوالی کرنیوالی عورت تھی، اونٹنی والے کو غصہ آیا، اس نے آکر عورت کا پستان کاٹ دیا، بس یہاں سے جنگ شروع ہوئی اور سو برس تک جنگ جاری رہی، مرنے والے وصیت کر کے جاتے تھے کہ صلح مت کرنا، ورنہ خاندان کی ناک کٹ جائے گی، ہزاروں آدمی قتل ہو گئے محض اس لئے کہ اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اور اس میں ایک صدی گزر گئی حرب بن اوس و غیرہ پچاس برس تک چلتی رہی، اسی طرح کوئی دس برس چلتی رہی۔

اہل جنت اور اہل جہنم کے اخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر سب کو ایسا شیر و شکر کر دیا کہ حقیقی بھائیوں میں وہ محبت نہ ہوگی جو صحابہؓ کے اندر محبت پیدا ہوئی ان کی شان یہ بیان کی گئی: ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ ② وہ کفار پر شدید تھے اور آپس میں رحیم تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے پانی پانی پانی تھے: ﴿يُجِبُّهُمْ وَيُجِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ ③ باہم محبتیں اللہ کے لئے کرتے تھے غرض کی محبت نہ تھی، اغراض کی خاطر نہ تھیں اللہ کے لئے تھیں۔ تو وہ کفار کے اوپر عزیز اور غالب تھے لیکن باہم پست اور چھوٹے بن جاتے تھے، ایمان والوں میں سے جسے دیکھو تو وضع کر رہے تھے، یہ کیفیت ہے جیسے شاگرد استاذ کے سامنے ہوتا ہے، یا مرید اپنے پیر کے سامنے، گویا سب خادم تھے جو کمال تو وضع کی دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں، اور جلیل القدر صحابی ہیں، یہ حضرت زید بن ثابتؓ کے شاگرد ہیں، علم فرائض اور دوسرے علوم حضرت ابن عباسؓ نے انہی سے حاصل کئے ہیں، زید بن ثابتؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خصوصی وصف ارشاد فرمایا کہ: ”أَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ“ ④ یعنی فرائض کے سب سے زیادہ عالم حضرت زید بن ثابتؓ ہیں، تو ابن عباسؓ حضرت زید بن ثابتؓ سے فتاویٰ اور مسائل پوچھتے تھے، ایک دن حضر زید بن ثابتؓ نکلے، گھوڑا تیار تھا اس پر سوار ہوئے تو ابن عباسؓ نے رکاب تھام لی، انہوں

① پارہ ۳، سورۃ آل عمران، الآیہ: ۱۰۳۔ ② پارہ ۲۶، سورۃ الفتح، الآیہ: ۲۹۔ ③ پارہ ۶، سورۃ المائدہ،

الآیہ: ۵۳۔ ④ السنن للترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب معاذ بن جبل وزید

بن ثابت رضی اللہ عنہما ج: ۱۲ ص: ۲۶۲۔

نے کہا: اے ابن عم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا غلط کام کر رہے ہو، میری رکاب کیوں تھام رہے ہو؟ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی ہو، تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت حاصل ہے تم واجبِ تعظیم ہو، ایسا کیوں کرتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے استاذوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جائے جو میں کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ابن عباسؓ کسی گھوڑے پر سوار ہونے لگے تو حضرت زید ابن ثابتؓ نے جا کر ان کے پاؤں پکڑ لئے اور رکاب پر ہاتھ رکھ دیا، وہ گھبرائے اور عرض کیا: اے زید! یہ آپ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا: ہمیں ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے کہ اہل بیت رسول اللہ کے ساتھ یہی ادب کا معاملہ کریں، اہل بیت رسول اس قابل ہیں کہ ان سے محبت کی جائے ان کی عظمت کی جائے، اور ان کی محبت کو جزو ایمان سمجھا جائے۔

تو زید ابن ثابتؓ استاذ ہیں مگر ابن عباسؓ کے پاؤں تھام رہے ہیں اور ابن عباسؓ اہل بیت میں سے ہیں مگر زید ابن ثابتؓ کے پیر تھام رہے ہیں غرض اسلام نے اس درجہ محبت پیدا کر دی تھی کہ بڑے چھوٹے کا امتیاز معاملات کے اندر نہیں رہا تھا، ہر ایک یوں سمجھتا تھا کہ یہی سب سے زیادہ بڑے ہیں اور دوسرا یوں سمجھتا تھا کہ زیادہ بڑے یہ ہیں، تو یہ کمالِ تواضع محبت باہمی کا منشاء بنا، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے تشریف لائے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، بچھڑے ہوئے کو ملا دیں، تفریق شدہ لوگوں کو باہم میل ملاپ کرا دیں، اس لئے نہیں آئے تھے کہ آپ دلوں کو توڑیں، باہم تفریق پیدا کریں اور گرہ بندی پیدا کر دیں، مگر وہوں کو مٹانے کے لئے آپ تشریف لائے تھے، اور جو تہمت لگانے والا ہے وہ چغل خور ہے کہ رات دن اس کا کام باہم تفریق ہے یہ تفریق کرانا حقیقت میں اہل جہنم کے اخلاق میں سے ہے، ملانا اور قلب میں یکسانی پیدا کرنا یہ اہل جنت کے اخلاق میں سے ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں اہل جہنم کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہاں فرمایا گیا: ﴿كُلَّمَا دَخَلْتَ أُمَّةً لَعَنْتَ أُخْتَهَا﴾ ① جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی تو جو پہلے سے وہاں موجود ہوگی وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے وہ کہیں گے تمہارے اوپر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے، تو لعن طعن کا شور ہوگا کہ جہنم کا عذاب تو ایک طرف یہ مستقل ایک عذاب ہوگا کہ وہ اسے گالی دے رہا ہے وہ اسے گالی دے رہا ہے، وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے، تو لعنتیں درحقیقت اہل جہنم کے اوصاف میں سے ہیں۔ اور اہل جنت کے اوصاف میں فرمایا گیا: ﴿إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ ② بڑی بڑی مسندوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں گے اور دل ایسے ہوں گے جیسے حقیقی بھائیوں کے، ایک کی محبت دوسرے کے اندر جا گزریں ہوگی، تو بڑے بڑے شاہانہ تخت پر بیٹھے ہوں گے۔ اس جگہ پر قید لگا لی ﴿مُتَقَابِلِينَ﴾ یعنی بڑے سے بڑا بھی مجمع ہوگا تو ایک دوسرے کو پشت نہیں دے گا، بالکل آمنے سامنے ہوں گے۔ اس لئے کہ جنت میں جگہ کی تو

① پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیہ: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ: الحجرات، الآیہ: ۴۔

کوئی کمی نہیں، یہ جو ہم ایک دوسرے کو پشت دیتے ہیں یہ جگہ کی کمی ہے، اگر ایک دائرہ بنا کے بیٹھیں اور آٹھ سائے ہوں اور فرض کیجئے ایک ہزار یا دس ہزار آدمی ہوں تو گھر کے لئے اتنا بڑا میدان کہاں سے لائیں کہ دس ہزار آدمی ہوں اور کسی کی کسی کو پشت نہ ہو، پھر یہ کہ آواز نہیں پہنچ سکتی بات نہیں ہو سکتی اگر چار پانچ میل کا ایک دائرہ بن گیا تو آواز تو بجائے خود ہے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکیں گے، لیکن جنت میں یہ چیزیں نہیں ہیں، آواز پچاس ہزار میں سنو تو ایسی ہوگی جیسے پاس بیٹھے ہوں اور وہاں آٹھ سائے چروں کی روشنی ایسی مصطفیٰ ہوگی کہ پچاس ہزار میل کا فاصلہ، وجہ بھی ایسا ہی نظر آئے گا جیسے آدمی پاس بیٹھا ہو۔

احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمین سے بڑی ہے، اوپر کی جنت والے نیچے والوں کو ایسے نظر آئیں گے جیسے ستارے چمک رہے ہیں، نگاہیں اتنی تیز کر دی جائیں گی کہ زمین و آسمان جسے بھی زیادہ فاصلہ ہوگا اور وہاں کی چیزیں ایسے نظر آئیں گی جیسے پاس پڑی ہوئی ہیں تو جنت کے اندر جگہ کی بھی کمی نہیں اور یہ جو مسافروں کی وجہ سے دیکھنے یا آواز کے سننے میں دشواری ہوتی ہے یہ بھی نہیں ہوگی اس واسطے فرمایا گیا ﴿اِخْوَانَا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ﴾ ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے، پشت کا وہاں سوال نہیں ہوگا کہ کسی کو پیٹھ دے کر بیٹھے، نہ دیکھنے میں کوئی چیز حارج ہوگی نہ بات کرنے میں اور نہ سنانے میں حارج ہوگی، تو تعظیم یہ بتلائی گئی کہ دلوں میں محبت جاگزیں ہوگی اور بیٹھنے میں ایک دوسرے کے پشت نہیں دیں گے تو تواضع بھی ہوگی، محبت بھی ہوگی ایک دوسرے کی توقیر اور تعظیم بھی ہوگی، یہ اہل جنت کے اوصاف ہیں۔

اور اہل جہنم کے بارے میں فرمایا گیا جو جماعت جائے گی وہ ان پر لعنت کرے گی اور پہلے والے ان پر لعنت بھیجیں گے، تو لعن طعن کا بازو گویا گرم ہوگا، تو فرمایا گیا کہ رسول کی شان تو یہ ہے کہ اس نے گویا پتھرے ہوئے کو ملا دیا اور اس کی شان جو جنون کی تہمت لگا رہا ہے یہ ہٹا کر بھی اور مشاء غنیم بھی ہے، یعنی عیب چین بھی ہے اور ساتھ میں چغل خور بھی ہے اس کی اس سے اور اس کی اس سے لگا دی باہم ٹوٹ اور تفریق پیدا کر دی، اور ساتھ میں ﴿مُصْنَعٍ لِلْخَبْرِ﴾ بھی ہے خیر کے ہر کام میں روڑے اٹکانے والا بھی ہے، کوئی اچھی سے اچھی چیز لے کے کھڑے ہوں، اس پر اعتراض کرنا اس کو چلنے نہ دینا اس کو روک دینا یہ اس ولید بن مغیرہ کی شان تھی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مومن کی شان کیا ہونی چاہئے؟ ”مُفْتَاحًا لِلْخَبْرِ وَمَقْلَافًا لِلشَّيْرِ“ ① ہر خبر کی کنجی ہے، جیسے کنجی سے تالا کھل کر اندر رکھی ساری چیزیں نمایاں ہو جاتی ہیں، گویا خیر کو ایک محل فرض کیا گیا اس پہ تالا پڑا ہوا ہے مومن اس کی چابی ہے، تالا کو کھول دیا تو ہر خیر نمایاں ہو گئی اور ہر بھلائی سامنے آ گئی اور جہاں شر نطقی ہو اس کا تالا بند کر دے وہاں تالا ڈال دے کہ یہ شر نہ مجھے لگے نہ دوسرے کو لگے، تو مومن کی شان یہ ہے اور یہ ﴿مُصْنَعٍ لِلْخَبْرِ﴾ ہو کہ نبی کے اوپر تہمت دھرتے ہیں، جن کی ذات ایسی بدناما ہو تو کیا ان کی بات قابل اعتبار ہوگی؟ پھر یہ کہ ساتھ میں ﴿مُفْتَاحٍ﴾ بھی ہے یعنی حد و دسے تجاوز

کرنے والا بھی ہے، کسی حد پر قائم نہیں ہے کوئی اچھی حد قائم کر دو، اس سے آگے گزر جائے گا نیکی کی ایک حد قائم کی، اس سے گزر کر آگے پہنچے گا حتیٰ کہ شر کے اندر پہنچ جائے گا، خیر کی کسی چیز کی حد باقی نہیں رکھتا، ہر چیز کی حدود سے تجاوز کرتا ہے، ظلم و تعدی اور زیادتی میں گزر جانے والا ہے، اور اوپر سے گناہ گار۔ ﴿اِنَّهُمْ﴾ رات دن فسق و فجور میں مبتلا چنانچہ ولید ابن مغیرہ کی شان بتلائی گئی کہ زنا کا یہ تھا، بدکاری یہ تھا، مَنَاعُ لِلْخَيْرِ یہ تھا، مُعْتَبِدُ اور اُنہیں یہ تھا، اور پھر غَسَلُ اُجْد بھی تھا یعنی کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، بات کی گویا لالچی ماری، یعنی کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، کوئی اچھی بات بھی کہے گا تو لالچی ماری بات کہے گا کہ خواہ مخواہ اس سے دل ٹوٹ جائیں گے، تو بالکل اُجْد گنوار جنگلی قسم کا آدمی ہے کہ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، کوئی سلیقہ نہیں اعلیٰ درجہ کا بدتمیز ہے، پھر فرمایا ﴿بَعْدَ ذٰلِكَ رَبَّنِمْ﴾ پھر یہ کہ ولد الزنا بھی ہے، یعنی حلال کا نطفہ نہیں ہے، تیس چالیس برس تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس کا باپ کون ہے، تیس برس گزرنے کے بعد مغیرہ نے کہا کہ میں نے اس کی ماں کے ساتھ بدکاری کی تھی اس سے یہ پیدا ہوا، اس وقت کھلا کہ مغیرہ اس کا باپ ہے، تو ان تمام عیبوں کے ساتھ اوپر سے والد الزنا بھی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جس کا خون ہی ناپاک ہو، جس کی ابتداء ہی ناپاک ہو اس میں اچھے اخلاق کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اس میں بھلائی کہاں سے پیدا ہو جائے گی؟ اس کی تو بنیاد ہی خراب ہے۔

بعض اوقات بدکردار لوگوں کو اولاد و اموال کی کثرت دی جاتی ہے..... ان تمام خرابیوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ﴿اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ﴾ اوپر سے کچھ اولاد اللہ نے زیادہ دے دی اور دولت بھی زیادہ دے دی تو کریلا اور نیم چڑھا بن گیا، تو یہ ساری بد عملیاں اور بد اخلاقیات تھیں، دولت کی وجہ سے لوگ اس سے دبتے تھے، اور وہ لوگوں کے سر پر سوار ہوتا تھا کہ کسی میں لڑائی کرا دی کسی کو گالی دیدی، کسی کو برا کہہ دیا، تو چوبیس کھٹے اس شخص کا مشغلہ ہی یہ ہے کوئی خیر کی بات کہتا ہے نہ کرتا ہے۔ اور ایسوں کو اللہ میاں ڈھیل دینے کے لئے زیادہ دے بھی دیتے ہیں، تاکہ اچھی طرح حجت قائم ہو جائے۔

قرآن کریم میں جب یہ آیت اُتری: ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ ① کہ جہنم میں انیس داروغہ ہیں، اور وہ اتنے سخت ہیں کہ ان کے دل میں رحم نہیں ڈالا گیا، وہ جہنمیوں پر ہر وقت عذاب ہی دینے کے لئے تیار رہیں گے، تو یہ آیا اور کہنے لگا کوئی پرواہ کی بات نہیں، میرے انیس بیٹے ہیں ہر داروغہ کے مقابلہ میں ایک کو پیش کر دوں گا، یہ جہالت کی حالت ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں اللہ سے لڑنے کو تیار ہے، اور اللہ کے بنائے ہوئے داروغہ ملائکہ کے مقابلہ میں اپنے بیٹوں کو لارہا ہے کہ جو ملائکہ اس کے بیٹوں کی آکر روح قبض کریں گے ان کے مقابلہ کے لئے پیش کر رہا ہے، تو جہالت کی بھی انتہا ہے اور گنوار پن کی بھی انتہا ہے، غرض یہ دس چیزیں بیان فرمائیں، ان دس بد عملیوں اور بد اخلاقیوں کے بعد اس کی حالت بیان فرمائی کہ: ﴿اِذَا تَنَاسَلْنَا عَلَيْهِ اٰیُّنَا قَالَ اَسَاطِيرُ

اَلَا وَلَيْسَ ﴿﴾ جب اس کے سامنے کوئی اللہ کی آیت پڑھو تو کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں پچھلی باتیں ہیں، وہ پچھلے کہتے چلے گئے انہوں نے بھی نقل کر دیں، تو کسی خیر کی توقع نہیں، اور کوئی شر نہیں جسے اس نے چھوڑ دیا ہو، تو خیر کے پیچھے تو لاشی لئے پھرتا ہے اور شر جہاں ملتی ہے اسے سینے سے لگاتا ہے، یہ ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوپر تہمت لگانے والے کہ نہ ان کی اپنی قوم میں وقعت نہ ذاتی اوصاف اچھے، مگر چونکہ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں مشترک تھے، اس واسطے جو یہ کہتا تھا اسے لوگ لے اڑتے تھے اور گھر میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ جھوٹا مکار ہے، بدی کر رہا ہے اور بے ہودگی کر رہا ہے، مگر آواز میں آواز ملا دیتے تھے کیونکہ ان سب کی غرض اس طرف ہو گئی تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی جائے تو جو اس کے ساتھی تھے، وہ بھی اس کی وقعت نہیں کرتے تھے، یہ لوگ گویا کفار بھی تھے اور منافق بھی تھے۔

ابو جہل نے چند روزہ دنیا کی خاطر آخرت برباد کر لی..... ابو جہل جو ان کا ساتھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا تھا، سب دشمن کرتا تھا اور برا بھلا کہتا تھا، ایک دفعہ اس ولید نے تنہائی میں ابو جہل سے پوچھا کہ: کیا واقعی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی جانتا ہے، جیسا ظاہر میں کہتا ہے، اس نے کہا واللہ واللہ! میں جانتا ہوں دنیا میں سب سے زیادہ سچے یہی ہیں۔ اس نے کہا کہ بخت علی الاعلان کیوں برائی کرتا ہے، بات مانتا کیوں نہیں؟ اس نے کہا سرداری جاتی رہے گی، قوم مخالف ہو جائے گی، جائیداد چھن جائے گی گھر بار چھن جائے گا، اسلئے میں برائی کرنے پر مجبور ہوں، ورنہ میں دل سے جانتا ہوں کہ دنیا میں ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں، یہ کیفیت تھی تو جاہ و مال اور سرداری کے لئے اور چند روزہ زندگی کے لئے ایمان دین دینت سب چھوڑنے کو گوارہ۔ تو فرمایا گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تو یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی کمالات دیئے، اخلاقی کمالات دیئے، اصلاح عالم کے کمالات دیئے، تربیت عالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمائی، حضرات انبیاء علیہم السلام کا سردار بنایا، اور ان کو مجنون کہنے والا کون؟ حماز، حلاف، مشاء، غنیم، زینم وغیرہ ذالک دو ہی طریق سے ایک بات کو رد کیا جاتا ہے، جب کسی عظیم شخص کی برائی بیان کی جائے تو اس کے فضائل بیان کر دیئے جائیں، دفعیہ ہو جاتا ہے کہ وہ تہمت ان پر ثابت نہیں، یا یہ ہے کہ تہمت رکھنے والے کی حقیقت کھول دی جائے، حق تعالیٰ شانہ نے دونوں راستے اختیار فرمائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب جامع بیان فرمائے اور تہمت لگانے والوں کی حقیقت کھول دی۔

سردارانِ قریش کا مشورہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب..... ﴿وَقَدْ اَلَوْتْنَاهُمْ فَيْدُ هُنُو﴾ اس آیت کا شانِ نزول اور اس کے نازل ہونے کا سبب یہ پیش آیا کہ سردارانِ قریش میں سے چار بڑے بڑے سردار ایک ولید بن مغیرہ، ایک ابو جہل ابن ہشام، ایک افس بن شریق ایک اسود ابن عبد یغوث یہ بڑے سردار تھے اور دولت مند بھی تھے، اور ان کی بات بھی مانی جاتی تھی، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے دیتے تھک گئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشن برابر چل رہا ہے، لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کی عظمت دنیا میں پھیلتی جا رہی ہے جب کوئی صورت نہ دیکھی تو اب یہ ایک تجویز اختیار کی کہ چاروں مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے پیار اور محبت سے کہا: ”اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ جو یہ باتیں کر رہے ہو، اگر معاذ اللہ تمہارے دماغ میں واقعی کوئی خلل ہے کوئی بیماری ہے تو بہر حال ہم تمہارے عزیز قریب ہیں رشتہ دار ہیں علاج کرائیں گے، چاہے لاکھوں روپیہ خرچ ہو جائے، مگر تمہارا علاج کرائیں گے، اور اگر آپ کو عورت مقصود ہے اور تعیش مقصود ہے، تو عرب کی بہتر سے بہتر لڑکیاں لاکر ہم تمہارے سامنے پیش کر دیں گے، اور اگر تمہیں دولت مقصود ہے تو ہم سب خزانوں کے منہ کھول دیں گے جتنی ہماری دولت ہے سب آپ قبضہ کر لو، اور اگر سرداری مقصود ہے تو آج سے ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں، آپ حسب و نسب میں یقیناً ہم سب سے بڑھے ہوئے ہو، اس کے ساتھ حسن و جمال اور سیرۃ و کمال میں یقیناً اعلیٰ ہو، ہم بادشاہ ماننے کو تیار ہیں ہمیں کوئی عار نہیں کہ ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کر لیں، مگر اتنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ان بتوں کو برا مت کہو اور جو ہم ان کی عبادت کرتے ہیں اس میں طعنہ مت دو، اب زیادہ سے زیادہ آپ اپنے معبود کی عبادت کرو گے، ہم وعدہ کرتے ہیں ہم بھی آپ کے معبود کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کریں گے، نہ تمہاری عبادت پر کوئی طعن کریں گے تم اپنا کام کئے جاؤ ہم اپنا کام کئے جاتے ہیں، آپ ہمارے بادشاہ دولت بھی تمہارے لئے حسن و جمال بھی تمہارے لئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ان میں سے کوئی چیز درکار نہیں، نہ مجھے حسن و جمال چاہئے نہ دولت چاہئے نہ عورت چاہئے نہ مجھے بادشاہت چاہئے، میں تو اللہ کی بندگی کو دنیا میں پھیلانے کے لئے آیا ہوں، کہ سب کو اللہ کا بندہ بنا دوں۔“ اس پر انہوں نے کہا، بہت اچھا ہم اسے بھی مانتے ہیں آپ یہ جاری رکھیے بس اتنا سمجھئے کہ ہم جن بتوں کی پرستش کرتے ہیں آپ ان کو برا نہ کہئے، ان کی تکذیب نہ کریں۔

ردِ شرک کے بغیر تو حید نامکمل ہے..... مگر انبیاء علیہم السلام شرک کی برائی نہ بیان کریں تو لوگ تو حید کی طرف کیسے آئیں گے؟ اگر اللہ کے ساتھ دشمنی کرنے کی برائی نہ بیان نہ کریں، تو اللہ کی دوستی لوگ کیسے پیدا کریں گے۔ اس لئے دو چیزیں ہیں، ایک مثبت اور ایک منفی، ایک لا الہ ہے کہ کوئی معبود نہیں، ایک الا اللہ ہے کہ اللہ ایک ہے، تو اللہ کی وحدانیت ثابت نہیں ہو سکتی جب تک لا الہ سامنے نہ ہو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں کسی کو بھی معبود بنا نہیں اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ اس کی پوجا کی جائے، اس کی عبادت کی جائے تو سب کی معبودیت کی نفی کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اثبات ہوگا تو کلمہ طیبہ جس پر دین کا مدار ہے اس میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں ایک نفی اور ایک اثبات ہر غیر حق اور فرضی معبود کی نفی اور جو واقعی معبود واحد اور حقیقی معبود ہے اس کا اثبات غرض جب تک ردِ شرک نہ کیا جائے تو حید مکمل نہیں ہوتی، اگر ردِ شرک نہیں ہوگا اور تو حید مان لی تو تو حید میں سو قسم کے شرک ملا دیں گے، اور دعویٰ کریں گے کہ یہ بھی تو حید ہے تو وہ ہر نگ شرک بن جائے گی، اس لئے شرک کی نفی کی جائے۔

تمام درجات شرک کی نفی..... اور شرک کی نفی ایسی کہ شرک جلی، شرک خفی شرک وہی اور شرک ابہامی سب کی

نفی کی جائے، تب جا کر توحید کا کمال ثابت ہوگا، شرک جلی تو یہ ہے کہ کوئی دو معبود مان لے اس کی نفی کرنی پڑے گی کہ معبود دو نہیں، معبود ایک ہی ہوتا ہے، ایک معبود مان کر صفات میں شریک کرے کہ عبادت کے لائق تو ایک ہی ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ نیچے اس کے بہت سے معبود ہوں کوئی بیٹا دینے والا کوئی رزق دینے والا کوئی صحت دینے والا، کوئی نعمت کا اوتار کوئی مصیبت کا اوتار اس طرح سے مختلف اوتار ہوں جن میں اللہ حلول کئے ہوئے ہوں، اور اس نے اپنے اوتار اور پیکر بنادیئے ہوں، تو ذاتِ باریکات ایک ہی ہے مگر اس کے جو مختلف کمالات ہیں ان کے جلوں نے دوسروں کو معبود بنادیا، یہ شرک جلی نہیں بلکہ شرک خفی ہوگا۔ اور ایک یہ ہے کہ ذات میں بھی آدمی شرک نہ کرے، صفات میں بھی شرک نہ کرے، عبادت میں شرک کر دے، اگرچہ یوں کہے کہ اللہ ایک اور یکتا ہے، مگر جب عبادت کرنے بیٹھے تو کسی بت کو سامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ تک پہنچانے والی چیز ہے، کسی تصویر کو سامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرنے والی ہے تو یہاں ذات و صفات میں شریک نہیں کیا مگر عبادت میں شریک کر دیا، اس کا بھی رد کیا جائے گا یہ شرک خفی ہے۔ اور ایک شرک صوری ہے کہ حقیقۃً شرک نہیں مگر صورتاً شرک ہے اس سے بھی بچنا پڑے گا، جیسے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہ کسی میدان میں نماز پڑھتے تھے، چونکہ مسئلہ ہے کہ سترہ رکھ لیا جائے تاکہ لوگ اس سے باہر کو گزریں اندر سے نہ گزریں تو وہ ایک پتھر رکھ لیتے تھے، مگر پتھر کو ناک کی سیدھ پر نہیں رکھتے تھے کبھی دائیں مونڈھے کے مقابلے میں کبھی بائیں مونڈھے کے بالمقابل رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے بیچوں بیچ کیوں نہیں پتھر رکھ لیا، فرمایا ناک کے مقابل رکھوں گا تو صورت ایسی بن جائے گی، جیسے میں اس پتھر کی پوجا کر رہا ہوں میں صورت شرک سے بھی بچتا ہوں، اگرچہ میرا قلب شرک سے پاک ہے مگر میں صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہتا کہ شرک پیدا ہو تو یہ شرک صوری ہے شریعت نے اس کو بھی دفع کیا ہے، اور ایک شرک ابہامی ہے کہ وہموں میں گزر جائے کہ فلاں آدمی شرک کر رہا ہے اس سے بھی روکا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے، اور نیت یہ ہے کہ میں مخلوق کو دکھلاؤں کہ میں بہت بڑا نمازی ہوں اور عبادت گزار ہوں یہ بھی فی الحقیقت شرک ہے کہ یہ اللہ کی عبادت نہیں ہے بندوں کی عبادت ہے، حالانکہ ظاہر میں کوئی شرک نہیں ہے اس کے دل میں ہے، شریعت نے اس کو بھی روکا ہے کہ تو حید میں اس سے بھی خلل پڑے گا۔

اور ایک اس سے بھی زیادہ دقیق شرک ہے وہ یہ کہ نہ ذات میں شرک مانتا ہے نہ صفات میں مانتا ہے نہ عبادت میں مانتا ہے نہ شرک کی صورت پیدا کرتا ہے نہ دل کے اندر وہم ہے کہ دوسروں کو دکھلانے کیلئے عبادت کرے مگر پھر بھی شرک کا اندیشہ ہے، اور وہ یہ کہ آدمی نماز پڑھ رہا ہے کوئی آدمی سامنے نہیں کہ یوں کہا جائے کہ دکھلانے کے لئے پڑھ رہا ہے، لیکن دل میں یہ خیال ہے کہ ایسی نماز پڑھ رہا ہوں کہ شاید ہی کسی نے پڑھی ہو مجھ سے بڑا کون عبادت گزار ہے، یہ عجیب ہے، یعنی اپنے نفس کو دکھلانا ہے کہ میں بڑا عابد ہوں زاہد ہوں فرمایا: یہ بھی شرک میں داخل ہے، عبادت کرتے وقت یہ وہم نہ آنا چاہئے، کہ میں کوئی بڑی عبادت کر رہا ہوں، تو ناز و تفاخر

اور تراہٹ اس کے اوپر نہ ہو، اگر تراہٹ پیدا ہوئی اور آدمی یہ سمجھا کہ میری عبادت بڑی ہے اور دوسرے کی حقیر ہے تو یہ کبر پیدا ہو گیا اور تو حید کے ساتھ کبر جمع نہیں ہوتا، تو حید کے معنی یہ ہیں کہ کبریائی اور عظمت صرف ایک ذات کے لئے مان رہا ہے، اپنے اندر کوئی کبر اور خودی نہیں ہے، غرض تو حید کا کمال حاصل نہیں ہو سکتا جب تک شرک کی تمام اقسام نہ رد کر دی جائیں، تو حق تعالیٰ نے روکا کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بتوں کو کچھ نہ کہو، اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ، تو انبیاء علیہم السلام جیسے اپنے رب کی عبادت کے لئے آتے ہیں، ویسے غیر اللہ کی عبادت کو روکنے کے لئے بھی تو آتے ہیں، اگر وہ نہیں روکیں گے تو تبلیغ آدھی رہ جائے گی، تو ممکن تھا کہ آپ کے دل میں یہ خیال گذر جائے کہ بس اتنی سی تو بات ہے میں ان کے بتوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا، میں اپنے معبود کی تبلیغ کئے جاؤں گا، چلو فتنہ ختم ہو جائے گا، حق تعالیٰ شانہ نے روکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اثبات وحدانیت کے ساتھ ساتھ نفی شرک کے لئے بھی آئے ہیں، یہ تو کرنا پڑے گا، اور آپ ان سے ذرا بھی نہ دیں، یہ اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں ماننے والے مانیں گے اگر یہ دس نہیں مانتے تو ہزار پیدا ہوں گے جو آپ کی بات کو مانیں گے، آپ گویا یہ سمجھتے ہیں اگر انہوں نے مان لیا تو گویا مشن کامیاب ہو گیا اور اگر انہوں نے میری بات کو نہ مانا تو گویا ناکامی ہوئی، آپ کسی حالت میں ناکام نہیں ہیں، اگر یہ چند ناہنجار نہیں مانتے تو ان کی نسلوں میں ایسے لوگ آئیں گے جو آپ کے کلمہ کو مانیں گے، آپ اسی قوت سے شرک کا رد بھی کریں اور تو حید کا اثبات بھی کریں اور فرمایا: ﴿فَلَا تُطِيعُ الْمُكْذِبِينَ﴾ آپ اس بارے میں ان کی قطعاً اطاعت نہ کریں کہ آپ ذرا دھیمے ہو کر چلیں، آپ اسی طرح قوت سے رد شرک کریں جس قوت سے آپ اثبات وحدانیت کرتے ہیں، تو آپ ہرگز ان تکذیب کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں، یہ ان کی ایک چال ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے رد شرک سے روک دیں اور جب رک گئے تو ان کا مقصد پورا ہو گیا، اور یہ کہ آپ کو مان لیں یہ کبھی نہیں ہوگا، تو آپ اپنے مشن میں ناکام رہ جائیں گے، یہ کامیاب ہو جائیں گے ان کو کامیاب نہ ہونے دیں آپ اپنے مشن کو کامیاب بنائیں اور قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں کہ یہ ماننے ہیں یا نہیں۔

اندازِ تفہیم..... مگر ہاں جو کچھ بھی آپ فرمائیں وہ رحمۃ للعالمین کی شان سے فرمائیں یعنی کوئی سخت کلامی درشت کلامی نہ ہو، پیارا اور محبت سے برائی کو برائی اور بھلائی کو بھلائی واضح کر دیں اور شفقت کے ساتھ انہیں سمجھائیں، مگر شفقت کے ساتھ سمجھانے میں دونوں چیزیں آنی چاہئیں، جن خرافات میں یہ پڑے ہوئے ان کی برائی بھی آپ سمجھا دیں اور جس نیکی کی طرف یہ نہیں آرہے اس کی بھلائی بھی آپ سمجھا دیں، جب دونوں چیزیں سمجھائیں تب یہ آئیں گے اور اگر آج یہ نہیں آتے تو کل کو آئیں گے کل کو نہیں آئیں گے تو پرسوں کو آئیں گے نہیں آئیں گے تو ان کی نسلیں آئیں گی، آپ ہر صورت میں کامیاب ہیں اس لئے آپ اپنے مقصد کو مضبوطی کے ساتھ آگے چلائیں، قطعاً ان کی اطاعت نہ کریں، یہ تو ایک چال سے آپ کو اپنے مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں اور ڈھیلا بنانا

چاہتے ہیں تاکہ اپنے لئے نہ ہو لیکن ایک آڑل جائے گی کسی کی پرواہ نہ کریں۔ ﴿وَدُّواْ لَوْ تَذٰهِنْ فِیْذِ
هٰنُوْنَ﴾ یہ تو یوں چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑ جائیں تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں اور وہ ظاہری رواداری کر رہے کہ
میل ملاپ قائم رکھو، حق و باطل کے امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تو انبیاء علیہم السلام اس لئے نہیں آتے کہ
ظاہر داری کا میل میلاپ کر لیں وہ تو حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔ اس کے بعد خصوصیت
سے فرمایا کہ کسی خلاف کی ہرگز اطاعت نہ کریں، جو غلط قسمیں کھا کھا کر اپنے دعوے کو ثابت کرے، اور مہین و بے
وقت ہو، خود قوم کے اندر بھی اس کی کوئی حیثیت نہ ہو، ہماز و عیب چین ہو اور نکتہ چین ہو، چغل خور ہو ہر خیر کا دروازہ
بند کرنے والا بھی ہو، بہت اُجڑ اور گنوار بھی ہو اور زہیم بھی ہو اور اوپر سے اولاد اور دولت کی کثرت سے اس کے
اندر کبر و عنوت بھی آچکا ہو، اس کی تو آپ بالکل اطاعت نہ کریں، وہ تو محض ظاہر داری کے لئے اور آپ کو آپ
کے راستے سے ہٹانے کے لئے ایک چال چل رہا ہے تو آپ کو کسی چال میں آنے کی ضرورت نہیں، آپ تو اللہ کے
صریح حکم کو پہنچاتے رہیں۔

رسول خدا کو بچنوں کہنے والے کی جنگ بدر میں حذیفہؓ کی تلوار سے ناک کٹ گئی..... اور یہ اس کی
حالت ہے کہ: ﴿اِذَا تَلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ جب اللہ کی کوئی آیت پڑھی جاتی ہے تو کہتا ہے
کہ یہ تو وہی لکیر کے فقیر ہیں، جو پچھلی غلط باتیں آگئی ہیں جو سارے نبی کہتے چلے گئے ہیں یہ بھی وہی کہنے والے
ہیں نہ انہیں عقل سے کوئی سروکار ہے نہ دنیا کی ترقی کو دیکھتے ہیں، نہ تمدن کو دیکھتے ہیں، بس انہیں تو ایک رٹ لگی
ہوئی ہے کہ ایک اللہ کو ایک مانو اور اللہ کی ہی عبادت کرو، نہ تمدن کا خیال ہے نہ دنیا کی ترقیات کا خیال ہے یہ تو
باتیں کیا کرتے ہیں، پہلے بھی کرتے آرہے ہیں، یہ بھی کر رہے ہیں، یہ سب عیاذ باللہ بھولی بھولی سی باتیں
ہیں۔ اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَنَسِیْہُمْ عَلٰی الْخُرٰطُوْمِ﴾ خرطوم سوئڈہ کو کہتے ہیں، ہاتھی اور خنزیر کی
ناک کو خرطوم کہتے ہیں ہر جانور کی ناک کچھ نہ کچھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی ہے، انسان کی ناک بھی نہایت خوشنمائی کے
ساتھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہے، لیکن ہاتھی کی ناک سب سے زیادہ نیچے کو لگی ہوئی ہوتی ہے، گویا بالکل زمین پر ہی ہوتی
ہے، اور ایسے ہی خنزیر کی ناک بھی پچکی ہوئی ہوتی ہے، ابھری ہوئی نہیں ہوتی ناک ہی عزت کی جگہ ہے تو ہاتھی
چونکہ متکبر ہوتا ہے تو اللہ نے اس کی ناک نیچی کر دی، اور خنزیر چونکہ بد جانور ہے اس لئے اس کی ناک نیچی کر دی، تو
ناک نیچے ہونا ذلت کی طرف کنایہ ہوتا ہے، تو فرمایا اس کا جو خرطوم ہے، بڑی اونچی ناک لئے پھرتا ہے، اسی پر ہم
ضرب لگائیں گے اور اس کی ہم نے ناک نیچی کرنی ہے۔

چنانچہ جب بدر کے اندر حضرت حذیفہؓ کی تلوار اس ولید ابن مغیرہ کے ناک کے اوپر لگی اور اس کی ناک کٹ
گئی، پھر اس نے سینکڑوں علاج کروائے کہ کسی طرح اچھی ہو جائے، مگر اس کے اندر کیڑے پڑے اور بدبو
ہو گئی، اور اسی میں مر گیا، تو حق تعالیٰ نے فرمایا اس کی تو ناک پر ہم نے ضرب لگائی ہے اس واسطے کہ یہ ناک ہی

اسے لئے پھر رہی ہے، یہ ظاہری عزت کا دعویٰ یہی اسے بے چین کئے ہوئے ہے، تو اسی عزت کو پامال کرنا ہے اور وہ یہ کہ اس منکبر کی ناک نیچی کرنی ہے، چنانچہ ناک پر ہی بنی اور ناک ہی کے مرض سے دنیا سے گیا۔

انبیاء علیہم السلام کی اتباع میں دنیا و آخرت میں عزت اور نافرمانی میں ذلت اس سے گویا معلوم ہو گیا کہ متبعین انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی بلند ہوتے ہیں، اور آخرت میں بھی اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی ختم کر دیئے جاتے ہیں، اور آخرت میں بھی ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی، آج نہ ابوجہل کا نشان ہے نہ ولید ابن مغیرہ کا نشان ہے، نہ اخنس بن شریق کا نشان ہے نہ اسود بن یغوث کا نشان ہے، تو دنیا سے بے نشان ہو کر مٹ گئے، اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک زبانوں پر الگ، قلوب میں الگ دماغوں میں الگ، اور عرش پر الگ، فرش پر الگ، تو انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے جیسے خلفاء اربعہ ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ ہیں، آج ان کا نام نامی آجاتا ہے تو رضی اللہ عنہ کہتے کہتے زبانیں تھک جاتی ہیں، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو لوگ ان پر لعنت بھیجتے ہیں، تو متبعین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی باعزت تھے اور آخرت میں بھی، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی پامال اور آخرت میں بھی پامال، کسی جگہ بھی کوئی ان کی وقعت و عزت نہیں ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر مسلمان دنیا میں ابوجہل کی وقعت نہیں کرتے تو کیا کفار میں کوئی اس کی وقعت کرنے والا؟ کوئی ولید ابن مغیرہ کو سراہنے والا یہود و نصاریٰ میں کسی اور مذہب میں؟ کہیں موجود نہیں، جو بھی کہے گا یہی کہے گا انہوں نے بڑی غلط حرکت کی، مسلمان ان پر لعنت بھیج دیں گے، دوسرے کہیں گے بڑی غلط حرکت کی، غرض انبیاء علیہم السلام کی اطاعت میں عزت ہے اور ان کی تکذیب میں ذلت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود نے مقابلہ کیا تو چھمر سے ختم کر دیا گیا، آج اس کا نشان موجود نہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام امام للناس ہیں، ہر دل میں وقعت اور ہر دل میں عظمت ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر فرعون ہے، آج اس کا نشان موجود نہیں، اور اگر کہیں تذکرہ ہے تو لعنت سے یاد کیا جاتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام پاک زبانوں پر آتا ہے تو علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑھا جاتا ہے، الغرض اوپر سے نیچے تک یہی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین صحابہ کرامؓ اس کے بعد تابعین کرام ہیں، اس کے بعد تبع تابعین کرام ہیں اس کے بعد اہل اللہ، حضرات صوفیاء کرام، حضرات علماء کرام، حضرات فقہاء کرام، حضرات مجتہدین عظام ایک ایک شخصیت کا نام آتا ہے تو رحمۃ اللہ علیہ کہتے کہتے زبانیں تھکتی ہیں، اور مکذبین میں سے کسی کا نام آتا ہے تو لعنۃ اللہ علیہ کہنے کے لئے زبانیں سوکھتی ہیں، تو یہ فرق ہے۔

عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے الغرض عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات پاک ہے، اس کے بعد عزت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو بنایا ہے، اور اس کے بعد ایمان والوں کو سرچشمہ بنایا، جو تصدیق کرنے والے ہیں، جس کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلِلّٰهِ الْبَعْرُۃُ وَلِلّٰہِ سُبُوۡلُہٗ﴾

وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُتَّقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١﴾ ”عزت اللہ کی ہے اور اس کے رسول کی ہے اور ایمان والوں کی ہے اور منافقین اس عزت کو نہیں جانتے۔“ اور ایک جگہ انتہائی اصلیت کو بھی فرمایا کہ: ﴿فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ ﴿٢﴾ ”عزت صرف ایک اللہ کی ہے“ جو اس سے وابستہ ہو گیا اسی میں عزت آگئی سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام وابستہ ہیں تو سب سے زیادہ ان کی عزت کی ہے، ان کے بعد ان کے اصحاب وابستہ ہیں ان کی عزت ہے۔

اب صحابہ کرامؓ میں ایک ایک نام لیں، صدیق کا نام لیں، فاروق اعظم کا نام لیں، عثمان غنی کا نام لیں، علی المرتضیٰ کا نام لیں، ایک ایک کا نام آنے پر دل عقیدت و عظمت سے جھک جائیں گے، جس کو نسبت نبوی علیہ السلام مل گئی، عقیدت و عظمت قائم ہو گئی، اہل بیت کرام ہیں انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے اس کی وجہ سے ان کی محبت دل میں ایمان کا درجہ رکھتی ہے، آج اگر کوئی انہیں خدا نخواستہ برا کہے تو یقیناً اس کے ایمان میں خلل ہے، اس شخص کو اپنے ایمان کی اصلاح کرنی چاہئے جو اپنے دل میں اہل بیت سے محبت نہیں رکھتا، یا عظمت نہیں رکھتا، تو یہ نسبت ہی تو ہے۔

جتنی نسبت قائم ہوگی اسی نسبت سے عظمت قائم ہوگی، نسبی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، روحانی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، بہر حال اس آیت نے بتلادیا کہ مکذبین کی کوئی وقعت نہیں، نہ عند اللہ نہ عند الناس، اور مصدقین کی وقعت عند اللہ بھی ہے، اور عند الناس بھی ہے، اس واسطے ہر ایک اپنے دل کو ٹٹولے کہ میں اپنے دل میں اللہ و رسول کی عزت رکھتا ہوں یا نہیں اگر رکھتا ہے تو وہ خوش ہو، اگر نہیں رکھتا یا کی ہے تو اس کی کو دور کر دے، اپنے قلب کے اندر عزت و عظمت بڑھائے، اور اپنے ایمان کو تازہ کرے تاکہ دنیا و آخرت میں اس کو درجات ملیں۔

① پارہ ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ ۸. ② پارہ ۵، سورۃ النساء، الآیۃ ۱۳۹.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَا
 اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَوَسَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
 وَرَسُولُهُ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلَى كَافَّةٍ لِلنَّاسِ بَشِيْرًا وَنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاَذْنِهِ وَبِرَاجَا مُبِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ
 تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِمًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ اَفَاعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ
 الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اِنَّا بَلَوْنَهُمْ كَمَا بَلَوْنَا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ
 اَقْسَمُوا لِيَصْرِفْنَهَا مُصْبِحِيْنَ ۝ وَلَا يَسْتَشْنُوْنَ ۝ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ
 نَائِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۝ اَنْ اَعْدَوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝
 فَاَنْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُوْنَ ۝ اَنْ لَا يَدْخُلْنَهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِيْنَ ۝ وَعَدُوا عَلٰى حَرَدٍ قَادِرِيْنَ ۝
 فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْا اِنَّا لَنَصَّالُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُوْنَ ۝ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ
 لَوْ لَا تَسْبَحُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَلَوْمُوْنَ
 ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝ عَسٰى رَبُّنَا اَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ
 الْعَذَابُ وَالْعَذَابُ الْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ ۝ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿ ①

بزرگان محترم! کفار مکہ کی سرکشیوں اور کاذب چل رہا ہے اور ادھر سے حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر
 و تحمل کا ذکر ہے، تو ان مشرکین کو عبرت دلانے کے لئے پچھلی امتوں کا ایک واقعہ حق تعالیٰ شانہ نے بیان فرمایا، گویا
 اس واقعہ کو سامنے رکھ کر یہ عبرت پکڑیں، اور اس کا تجزیہ کریں اس کے اجزاء الگ الگ کر کے اپنے واقعات پر
 منطبق کریں، پھر اندازہ کریں کہ یہ اسی بری راہ پر چل رہے ہیں جس بری راہ پر یہ لوگ چلے اور عذاب میں مبتلا
 ہوئے، تو تمہارے اوپر بھی عذاب آئے گا اور اسے پھر روکنے والا کون ہوگا؟

اس دنیوی عذاب سے قیاس کرو کہ آخرت کا عذاب کتنا شدید ہوگا اور اسے کون روکنے والا ہے تو اس کی
 ایک مثال وہ واقعہ سا کر بیان فرمائی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں جو جو واقعات پچھلی امتوں کے بیان کئے گئے

ہیں وہ محض قصہ اور کہانی نہیں ہیں، یا محض تاریخ بیانی نہیں ہے، بلکہ وہ عبرت دلانے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں، جیسا کہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى﴾ ① یہ جو کچھ ہم واقعات بیان کرتے ہیں یہ عبرت کے لئے ہیں تاکہ اپنے کو ان پر قیاس کر کے وہی نتیجہ اپنے لئے نکالو جو ان کے حق میں نکل چکا ہے۔

فوائد تمثیل و واقعہ..... اور یہی انسان کی فطرت ہے کہ وہ اصول سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا واقعات سے متاثر ہوتا ہے، مثال سے آدمی کو جتنا جلد سمجھ میں آتا ہے، بہت سی معنوی اور باریک چیزیں جو دلائل سے سمجھنے میں نہیں آتیں، وہ مثال سے بہت جلد سمجھ میں آ جاتی ہیں اور معنوی امور کو جب آدمی محسوس چیزوں پر قیاس کرتا ہے چونکہ محسوسات آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں تو معنویات کو بھی جلد سمجھ جاتا ہے۔

مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے ہاں تمثیل بہت زیادہ تھی، اور بڑے بڑے دقیق امور کو معمولی مثالوں سے ایک جاہل سے جاہل کے ذہن میں اتار دیتے تھے، تو حضرتؒ کی مجلس نشینوں میں ایک شخص اللہ دین تھا، قصائیوں میں سے تھا، مگر آدمی نہیم تھا اور اسے دین کی سمجھ تھی۔ ایک دن حضرتؒ کی مجلس تھی، گرمی کا زمانہ تھا ایک شخص پنکھا جھل رہا تھا اور یہ خود پنکھا جھلنے والوں میں ہے، اس نے سوال کیا۔ حضرت! یہ جو بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ میت کو اہل اللہ کے قریب دفن کرنا چاہئے اس سے کیا فائدہ؟ اس لئے کہ اگر اس دفن ہونے والے کے پاس نیکیاں ہیں چاہے میدان میں دفن کر دو وہاں بھی اس کی نیکیاں کام آئیں گی، اگر اس کے پلے عمل صالح نہیں ہے تو کہیں بھی دفن کر دیں اس کی بد عملی اس کے سامنے آئے گی، تو اس کا کیا فائدہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس دفن کیا جائے؟ اس سے کوئی اعمال بدل جاتے ہیں؟

یہ اس نے ایک سوال کیا، اب سوال کرنے والا محض ایک جاہل اور عامی آدمی ہے، اور عالم برزخ کا سوال کر رہا ہے، اور عالم برزخ کے ایک بڑے دقیق مسئلہ کا اب اگر دلائل سے سمجھایا جاتا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا، حضرت نے خاموشی اختیار فرمائی، اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پنکھا تو جھل ہی رہا تھا فرمایا: میاں اللہ دین! آپ پنکھا کسے جھل رہے ہو، اس نے کہا حضرت آپ کو، فرمایا ان مجلس والوں کو تو نہیں جھل رہے عرض کیا، نہیں صاحب! میں انہیں کیوں جھلتا نہ یہ میرے پیر نہ میرے استاذ؟ میں تو آپ کو جھل رہا ہوں ارشاد فرمایا انہیں بھی ہوا لگ رہی ہے یا نہیں؟ کہا جی ہاں ہوا تو لگ رہی ہے فرمایا: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے اس لئے اہل اللہ کے پاس دفن کرتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں تو مقصود وہ ہوتے ہیں مگر آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے تو رحمت کے نیچے سب آ جاتے ہیں، برکات سے وہ بھی مستفیض ہوتے ہیں۔

تو مسئلہ بہت دقیق تھا مگر ایک معمولی مثال سے اس کے ذہن میں بات بیٹھ گئی، اور اگر دلائل سے سمجھاتے تو

اسے خاک سمجھ میں نہ آتی اس کا ذہن ہی اس قابل نہیں تھا، تو بعض دفعہ مثال کے ذریعہ سے مسئلہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے اور جب مثال اپنے معاملہ پر منطبق ہو جاتی ہے تو آدمی عبرت بھی پکڑتا ہے۔

اصحاب الجحیم کا واقعہ..... اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے ایک مثال بیان فرمائی اور مثال بھی محض فرضی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے، تو واقعہ پر جو ثمرہ مرتب ہوا چونکہ تمہارا واقعہ بھی ویسا ہی ہے تو وہی ثمرہ تمہارے اوپر بھی مرتب ہوگا اور وہ واقعہ اصحاب الجحیم کا ہے، یعنی باغ والوں کا۔ یمن کے دار السلطنت صنعاء سے تین میل کے فاصلہ پر یہ باغ تھا، یہ ایک شخص کا باغ تھا جو نیک اور صالح آدمی تھا، اور بہت ہی بہترین باغ تھا اس کا ”باغ ذردان“ نام تھا، قسم قسم کے پھل فروٹ اور جگہ جگہ انگوروں کی پیلیں پھیلی ہوئی، اور بڑے میدان میں وہ کھیتی بھی کرتا تھا، یوں غلہ بھی ہوتا تھا تو ہزار ہا روپے کا فائدہ تھا، اس باغ کی وجہ سے بہت مالدار آدمی تھا۔

اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب پھل توڑتا تو دسواں حصہ اسی وقت غرباء پر تقسیم کر دیتا تھا، اس کے بعد جب کھیتی کا ثمار تو کاٹنے میں جتنا غلہ وصول ہوتا دھرا دھرا بکھر بکھرا ہوا وہ سب غریبوں کا تھا وہ خود نہیں اٹھاتا تھا، کھلیان میں جتنا جمع ہو گیا وہ لے لیتا تھا، اور جو کھیتوں میں بکھر گیا اس کی غرباء کو عام اجازت تھی کہ وہ لے جائیں، چنانچہ وہ اٹھا کے لے جاتے تھے، پھر جب غلے کو گھرا لاتا تھا تو پھر اس میں سے دسواں حصہ غرباء کے لئے نکالتا تھا، اس سے ہزاروں غریب پلتے تھے، پھر گھر میں جب کھانا پکتا تو جتنی روٹیاں پکتیں اس میں سے دسواں حصہ پھر غریبوں کو تقسیم کرتا، غرض ہر جگہ اس نے عشر اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا، میوے کو توڑتے وقت، کھلیان میں پہنچتے وقت، جمع کرتے وقت گھرا لاتے وقت، اس کو پکاتے وقت، ہر ایک موقع پر وہ غریبوں کا دسواں حصہ نکالتا تھا، جس سے ہزاروں غریب پلتے تھے اس وجہ سے ہزاروں فقراء اس کے باغ کے ارد گرد جمع رہتے تھے، اور جانتے تھے کہ بس یہ ہمارا مائی باپ ہے اور ہمیں اس کے ذریعہ سے ہزاروں روپے کا فائدہ ہے منوں غلہ اور منوں پھل کا فائدہ ہے، تو جو پھل وہ کبھی بھی خرید کر نہیں کھا سکتے تھے وہ ہر قسم کے پھل انہیں مفت میں مل جاتے تھے، بہر حال یہ اس شخص کا طریقہ تھا۔

غرباء کا حصہ نہ دینے کا فیصلہ اور بچھلے بھائی کا مشورہ..... اس شخص کا انتقال ہو گیا، اس کے پانچ بیٹے تھے، انہوں نے باہم یہ سوچا کہ بہت سا ہمارا مال یہ غریب کھا جاتے ہیں، اگر سارا مال گھر میں جمع رہے تو کتنا مال زیادہ ہوگا، لاکھوں روپے مسافر مسکین لے جاتے ہیں اسے کسی طرح سے بند کرنا چاہئے یہ مسکین گویا ہمارے گلے پڑ گئے تو بھائیوں میں باہم بات چیت ہوئی تو بچھلے بھائی نے کہا کہ بھائی! یہ مت کرو، خیرات سے نفع ہی نفع ہوتا ہے، اول تو یہ کہ غرباء کا مال میں حق بھی ہے، ایک تو حق واجب ہے جیسا آپ نے زکوٰۃ دی یا صدقہ واجبہ دیا یا صدقہ فطر دیا یا قربانی کی، یہ تو حق واجب ہے، لیکن حدیث میں فرمایا گیا: ”إِنْ لَمْ يَسَالِ الْمَسْرُءُ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ“ ① آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی غریبوں کے حقوق ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے ایک مال کے اندر

① السنن للترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء ان فی المال حقاً سِوَى الزکوٰۃ ج: ۳ ص: ۶۷۔

ہزاروں غرباء کو شریک کیا ہے یہ ان کا فضل ہے کہ اس آدمی کو غریبوں کو دینے کا ذریعہ بنادیا ہے، اگر ابتدا ہی حق تعالیٰ برابر تقسیم فرماتے اور کوئی امیر نہ ہوتا، تو حق تو سب کو پہنچ جاتا، مگر امراء کو جو اجر و ثواب کا فائدہ پہنچتا تھا اس سے وہ محروم ہو جاتے اس لئے ایک ایک امیر کو سینکڑوں غریبوں میں مال تقسیم کرنے کا ذریعہ بنادیا گیا، تاکہ حصہ بھی برابر ہو جائے اور ساتھ میں اجر و ثواب بھی مل جائے۔

اور اس کے ساتھ ایک شخص کو ہزاروں دعا گو بھی مہیا ہو جائیں گے اس لئے کہ جتنے غرباء کو فائدہ پہنچے گا وہ دعائیں مانگیں گے، ان کی دعاؤں سے اس کے مال میں اور برکت ہوگی، تو دنیا بھی اس کی بڑھے گی اور آخرت بھی بڑھے گی، تو غریب کے لئے امیر کو ذریعہ بنا کر امیر کے فائدے بہت کئے کہ بہت دعا گو مہیا کئے، دنیا میں اس کو رزق کی وسعت دی، آخرت میں اجر کا سامان کیا فرض کی ادائیگی کی توفیق دی تو اس ایک طریقہ سے سینکڑوں فرائض ادا ہوئے سینکڑوں برکات ہوئیں، اس واسطے حق تعالیٰ نے اوپر سے ہی برابر حصے نہیں بانٹ دیئے بلکہ امراء کو حکم دیا کہ تم برابری اور توازن کے ساتھ تقسیم کرو تاکہ تمہارے لئے اجر ہو، اور تمہارا فرض ادا ہو۔

تو ان بھائیوں نے ادھر خیال نہ کیا کہ اللہ نے ہمیں خیر کا ذریعہ بنایا ہے ہمیں مفتاح الخیر مل رہا ہے ہم خیر کی کنجی بنے ہوئے ہیں، ہم ذریعہ بنے ہوئے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ہمارا واسطہ ڈالے بغیر دے دیتے، تو ان کو تو حق مل جاتا، ہم محروم رہ جاتے۔ تو کہا کہ ایسی صورت کرو کہ غریبوں کا ایک جتھہ اور جمع ہو جاتا ہے اور ہمارا بہت سا مال چلا جاتا ہے تو یہ نہیں ہونا چاہئے اس کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ جب پھل کاٹنے کا وقت آئے تو بالکل سویرے سویرے فقیروں کا مجمع ہونے سے پہلے پہلے جا کر پھل کاٹ کر گھر لے آؤ، اس لئے کہ اگر وہاں جمع ہو گئے تو پھر شرماشرمائی میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، جب پچاسوں آدمی مانگیں گے تو آدمی شرمائے گا، تو وہی کی وہی بات پھر ہوگی، اس لئے سویرے جا کر پھل کاٹ لو اور وہ تمام پھل دانے وغیرہ لا کر اپنے گھر لے آؤ، یہاں گھر میں رکھ لیں گے یہاں کوئی آئے گا نہیں۔

اور اگر کوئی آئے گا بھی تو دروازے پر کوئی آدمی بھٹلا دیں گے اسے کہہ دیں گے کہ اگر کوئی فقیر آئے تو اسے دھکے دے دو، اور کہہ دیں گے تمہارا حق اس میں کچھ نہیں ہے اس طرح سے ہمارا مال بچ جائے گا، تو مچھلے بھائی نے کہا یہ مناسب نہیں ہے تم اللہ کی تسبیح کرو، تسبیح کا مطلب یہ کہ اس کی پاکی ثابت کرو یعنی اس پر بے اعتمادی کا اظہار مت کرو اس لئے کہ اگر تم نے غریبوں کا حق مار دیا تو اس کا منشا اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ تمہارا لیا اور وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا، یہ حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس پر بے اعتمادی کا اظہار کرے، ہر صورت وہی اعتماد اور بھروسہ کے لائق ہے، اس واسطے یہ منصوبہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے، تو تم تسبیح و تہلیل میں لگو اور اللہ پر بے اعتمادی نہ کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صدقہ دینے سے مال میں کمی نہ آنے کی قسم..... حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین باتیں بیان فرمائیں اور حلف اٹھا کے بیان فرمائیں، اور قسم اس لئے کھائی کہ

ظاہری طور پر وہ چیز عقل میں نہیں آتی جو آپ نے بیان فرمائی اس لئے قسم کھا کے فرمایا کہ تمہاری عقل میں آئے نہ آئے مگر یہی ہوگا اس لئے اطمینان کر لیں قسم کھاتا ہوں ایک یہ کہ: **نَحْنَا نَقْصُصُ صِدْقَةً مِّنْ مَّالٍ** ① صدقہ دینے سے مال میں کبھی نقصان نہیں ہوگا، مال میں کبھی کمی نہیں آئے گی، ظاہر میں تو اس کے خلاف ہے، اس لئے کہ جب آپ نکال دیں گے تو وہ کم تو ہو گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کمی نہیں آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾ ② جس مال میں سے جتنا خرچ کرو گے جبکہ خالی ہوگی، اللہ اس کو بھریں گے، ضرور بھر کر رہے گی یہ نہیں ہو سکتا کہ بندہ محروم کر دیا جائے، تو ظاہر میں تو مال کم ہو رہا ہے، مگر حقیقت میں بڑھ رہا ہے، نہ صرف اسلئے بڑھ رہا ہے کہ اجر و ثواب ملے گا وہ تو آخرت کا بڑھتا ہے، مگر دنیا میں بھی خالی شدہ جبکہ پر مال آئے گا اور جبکہ پُر ہوگی، یہ وعدہ خداوندی ہے کہ خرچ شدہ مال کا خلف آئے گا، ہمارے وعدے پر اطمینان رکھو اور یقین رکھو، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا۔

صدقہ دینے سے کمی بیشی کا مفہوم آدمی جب صدقہ نہیں دیتا یا خرچ نہیں کرتا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے کہ کسی کو نہیں دیا، گھر بنی میں آ رہا ہے، لیکن وہ بڑھنا بالکل ایسا ہے جیسے آدمی کے بدن پر ورم چڑھ جائے، تو ظاہر میں تو وہ پہلوان بن رہا ہے بہت جلد موٹا تازہ ہو رہا ہے مگر حقیقت میں یہی موت کا پیغام ہے، چند دن کے بعد یہ ریت کی دیوار اس طرح پیٹھے گی کہ نہ وہ رہے گا بلکہ اس کی ہڈیاں تک ختم ہو جائیں گی، اس لئے کہ وہ جو موٹا پا رہا ہے ورم اور بیماری کا ہے، اصلی صحت کا موٹا نہیں ہے، تو صدقہ نہ دینے سے جو مال بڑھتا ہے، وہ ورم رسیدہ ہے، اس کو مت یہ سمجھو کہ یہ بڑھ رہا ہے وہ ایک دن اتنا گھٹے گا کہ اس المال کو بھی لے ڈوبے گا اور صدقہ دینے سے جو مال گھٹتا ہے، اس گھٹنے کی مثال ایسی ہے جیسے آدمی بیماری کے بعد مُسْهَل لے لے، تو مُسْهَل لینے سے اندر کا تمام ملبہ اور فاسدہ چیزیں نکل جاتی ہیں اور آدمی ضعیف ہو جاتا ہے، مگر یہ ضعیف صحت کا پیش خیمہ ہے، ساری الاملا نکل گئی، بادی بلغم چھٹ گیا، تو ظاہر میں ضعیف ہو گیا مگر حقیقت میں وہ قوی ہے، چند دن کے بعد صحت ترقی کرے گی، تو اصل قوت بڑھے گی تو مال نکالنا صدقہ دینا ایسا ہے جیسے مُسْهَل دے دینا کہ ظاہر میں آدمی ضعیف ہوتا ہے حقیقت میں وہ قوت کا پیش خیمہ ہے اس میں سے نہ دینا حقوق نہ نکالنا گو مال بڑھتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے جیسا ورم آ گیا، تو ورم آنے سے بڑھتا نہیں ہے بلکہ اس سے اصل بھی گھٹ جاتا ہے۔

تو واضح سے رفعت پر حلفِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **”مَا تَوَاضَعَ عَبْدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ“** ③ آدمی کسی کے سامنے اللہ کے لئے جھکتا ہے، تو اللہ اسے ضرور سر بلند کرتا ہے، ظاہر میں تو یہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ذلت اختیار کر رہا ہوں، دوسرے کے آگے جھک رہا ہوں، اسکی

① الصحيح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع ج: ۱۲ ص: ۳۷۹ رقم: ۴۶۸۹۔

② سورة السباء: ۳۹۔ ③ شعب الایمان للبيهقي، فصل في ترك الغضب وفي كظم الغيظ والعفو... ج: ۶ ص: ۳۱۹۔

توقیر کر رہا ہوں حالانکہ میرا تہہ ایسا تھا اور ویسا تھا، اور میں جھک گیا تو ظاہر میں تو ذلت قبول کی اور حقیقت میں یہ عزت ہے جتنا لوجہ اللہ یہ جھکے گا اتنا ہی حق تعالیٰ اسے بلند فرمائیں گے، اور جو جتنا لوجہ النفس سرابھارتا ہے اتنا ہی اس کو زمین پر ہیچ دیتے ہیں اور اسے ذلیل کر دیتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

کوئی اکڑتا ہے تو اسے پست کر دیتے ہیں اور کوئی جھکتا ہے تو اسے اونچا کر دیتے ہیں، میں تو مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ پہاڑ پر کبھی چڑھے ہوں تو جب چڑھتے ہیں تو جھک کر چڑھتے ہیں، اکڑ کر چڑھے تو آدمی پیچھے کو جا پڑے گا اور جب اترتے ہیں تو اکڑ کر اترتے ہیں اس لئے کہ اگر جھک کر اترے گا، تو آدمی اونڈھے منہ گرے گا۔

تو یہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اونچائی پر چڑھنا چاہتے ہو تو جھک کر چلو، اونچا پہنچتے چلے جاؤ گے اور اگر اکڑ کر چلو گے تو نیچے کی طرف آتے چلے جاؤ گے تو پستی کی طرف جاؤ گے، تو آدمی اکڑتا ہے تو گرتا ہے اور اگر جھکتا ہے، تو اسے اونچا کر دیتے ہیں۔

بہر حال یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، ظاہر میں چونکہ سمجھ میں نہیں آتی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا کہ واللہ! یہ چیز ہونے والی ہے اس کا یقین کرو، غرض مجھلے بھائی نے ادھر توجہ دلائی اور کہا کہ تم جو فقیروں کا حق مار رہے ہو تو یہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ پر یہ بے اعتمادی کا اظہار ہو، پھر اس کا ثمرہ تمہارے حق میں برائے۔

فقراء سے مال بچانے کے لئے اندھیرے میں تیز رفتاری..... مگر بھائیوں نے ڈرا دھمکا کے اسے دبا دیا کہ اچھی بات ہے تو بھی فقرائے کی ہاں میں ہاں ملائے لگا، غرض یہ بات پختہ ہو گئی کہ صبح کو سویرے سویرے چلیں گے اور جا کے ایک دم پھل وغیرہ کاٹ کر جمع کریں گے اور سارا کچھ لے کر ایک دم گھر میں لے آئیں گے، فقیروں کے لئے دروازوں پر آدمی بھٹا دیئے تاکہ کوئی آدمی نہ آنے پائے جب صبح ہوئی تو: ﴿وَعَدُوا عَلٰی حَزْبٍ قَادِرِينَ﴾ تو انہوں نے اس حالت میں صبح کی کہ اپنی ضد کے اوپر بالکل اڑے ہوئے تھے، اور یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم بالکل قادر ہیں جو چاہیں کر گذریں گے، باغ ہمارا اور ہماری ملک جو ہم کریں گے کوئی اس میں رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔

چنانچہ صبح اٹھے تو ایک دوسرے کو جلدی اٹھایا کہ چلو جلدی چلو، کہیں چاند نہ ہو جائے اور فقیر مسکین جمع نہ ہو جائیں، جو کرنا ہے وہ جلدی کرو، چنانچہ سویرے سویرے چلے، اور کس چال سے چلے؟ کہ صبح ایک دوسرے کو پکارتے تھے کہ جلدی چلو، ایسا نہ ہو دیر ہو جائے، اور سورج طلوع ہو جائے۔ ﴿فَتَنَادُوا مُضَبِّحِينَ﴾ اِنْ اَعْدُوا عَلٰی حَزْبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿اگر تمہیں پھل کاٹنے ہیں تو سویرے سویرے پہنچ جاؤ، ورنہ پھر ہجوم ہو جائے گا اور شر مائیں میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، دیر ہو جائے گی، اس لئے جلدی کرو۔

حق تعالیٰ شانہ پر بے اعتمادی کا نتیجہ..... ﴿فَانِطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ﴾ اِنْ لَا يَدْخُلْنَهَا الْيَوْمَ عَلٰیكُمْ مُسْكِنِينَ ﴿تو وہ چلے جا رہے تھے اور آپس میں گھس گھس کر رہے ہوئے کہ دیکھ بھائی جلدی چلو، ادھر سے

فقیر آتے ہیں، یہاں سے جلدی نکل جاؤ، ادھر سے فقیر آتے ہیں، جلدی نکل جاؤ، تو آپس میں ایک دوسرے کو چپکے چپکے سمجھا بھی رہے تھے، تو ایک ضد اور ہٹ دھرمی تھی، گویا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہماری تدبیر کامیاب ہے، اور ہم اس تدبیر پر قادر ہیں کوئی ہمیں روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے، گویا حق تعالیٰ پر انتہائی بے اعتمادی ظاہر کی، ایک تو یہ کہ اتفاقاً کوئی بات ہو جائے کہ آدمی کسی مسکین سے بچنے کے لئے جلدی چھپ کر پہنچ جائے، کہ واجب تو ادا کرتا ہی ہوں کیا ضروری ہے کہ نفل بھی ادا کروں، اتفاقاً ہو جائے تو یہ بات کمزوری کی ہوتی ہے، یا تھوڑے بہت گناہ کی ہوتی ہے، لیکن عزم باندھ کر مشورے کر کے چلنا یہ گویا حق تعالیٰ شانہ کا معارضہ اور مقابلہ ہے، اپنی قدرت کی داد دینا ہے کہ ہم ہی ہر طرح سے قادر ہیں جو چاہیں کر گزریں گے، تو یہاں حق تعالیٰ سے مقابلہ کی صورت پیدا ہو گئی تھی، گویا طے یہ کیا تھا کہ اللہ کی نہ چلنے دو جس طرح سے ہوا اپنی چلاؤ۔ ﴿وَلَا يَسْتَسْنُونَ﴾ پھل کاٹ کر لائیں گے اور ساتھ میں انشاء اللہ بھی نہ کہا، گویا اپنی تدبیر پر اتنا یقین تھا کہ یہ تک نہ کہا کہ اگر اللہ چاہے گا تو ہم کر لیں گے، تو سمجھتے تھے کہ انشاء اللہ کی بھی ضرورت نہ تھی، ہمیں پوری قدرت حاصل ہے، گویا اس میں پورا حق تعالیٰ کا مقابلہ تھا، فقط ایک گناہ ہی نہیں کر رہے تھے، گناہ کا ملزم اور اس میں حق تعالیٰ کو مانع بھی سمجھ رہے تھے، اس لئے انشاء اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ نہ باغ ہے نہ کچھ ہے، جلی ہوئی چیز کا ڈھیر لگا ہوا ہے، تو سمجھے کہ شاید ہم راستہ بھول گئے، یہ ہمارے باغ کا راستہ نہیں یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ ایک ہر ابھر باغ اور پھلا پھولا باغ اور وہ بالکل مٹ جائے، تو وہاں جا کے دیکھا تو سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ ﴿فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُونَ﴾ جب باغ کو دیکھا تو وہاں نہ باغ نہ درخت نہ پھل، بلکہ تمام کھیتی کچھوہ مرنی ہوئی پڑی ہے، جیسے کھلیان میں بیلوں سے روند کر چکنا چور کر دیا جاتا ہے، تو سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہمارا باغ ہے، تو یہ سمجھے کہ ہم راستہ بھول گئے، لیکن جب آگے چلے تو کہا: ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْضُومُونَ﴾ باغ تو یہ ہمارا ہی ہے، اس کا تو وجود ہی نہیں رہا، اس کا تو نشان ہی باقی نہیں رہا، یہ کیا قصہ ہوا؟ ﴿قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ﴾ اب بات سمجھ میں آئی، اسی مچھلے بھائی نے کہا میں نے کہا نہیں تھا کہ تم اللہ کی پاکی کے خلاف کر رہے ہو، تم نے بے اعتمادی کا اظہار کیا، کہ فقیر کو دے کر اللہ تعالیٰ تمہارا مال گھا دیں گے، حالانکہ فقیر کو دینے سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے، تو میں نے تمہیں سمجھایا تھا اور تم نے نہیں مانا، میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہ پر بے اعتمادی کا اظہار یہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے۔ ﴿قَالُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ﴾ اب سمجھ میں آیا کہ حقیقت ہم نے بہت بڑا جرم کیا، اور حقیقت ہم نے غلطی کی کہ اپنی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پیچک دی، ذرا سی بے اعتمادی کی اور حق تعالیٰ کا مقابلہ کیا تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ چھوٹا موٹا نقصان نہیں بلکہ باغ کا باغ ہی اجڑ گیا، رات کو بجلی گری یا آگ برسی کہ تمام باغ چکنا چور ہو گیا، نہ درخت رہے نہ کھیتی رہی نہ دانہ رہا، کچھ بھی باقی نہیں رہا، تو ابتدا ابتدا میں تو چو نکے جب مچھلے نے کہا کہ اسی دن کے لئے میں

نے تمہیں کہا تھا مگر تم نے مجھے درغلا دیا، اور مجھے تمہاری تائید کرنی پڑی، مگر بات وہی تھی جو میں کہہ رہا تھا۔
 باغ کے اجڑنے کے بعد ایک دوسرے کو ملامت..... ﴿فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَوْنَ مَوْعِدًا﴾
 اب ایک دوسرے کو ملامت کرنی شروع کی کہ ہم نے کہا نہیں تھا؟ ایک نے کہا میں نے یہ نہیں کہا تھا، غرض اب
 سب ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگے اور ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اس لئے کہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ
 لوگ جب مل کر جرم کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بد سامنے آتا ہے پھر ایک دوسرے کو ملامت کرتا ہے کہ پہلا مشورہ اس
 کم بخت نے دیا تھا، دوسرے نے کہا میں نے دیا تھا تم نے مانا کیوں؟ تیسرے نے کہا میں تو نہیں مانا تھا مگر اس
 نے یہ کہا غرض ایک دوسرے پر وہ اس طرح ڈال رہے تھے مگر آخر میں سمجھ میں آیا کہ حقیقت میں ہم نے گناہ کیا ہے
 اور برا کیا ہے، تو اقرار کیا: ﴿قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طُغْيَانٌ﴾ کہنے لگے بے شک سرکشی اور غلٹی ہم سے ہی ہوئی، ہم
 نے ہی اللہ پر بے اعتمادی کا اظہار کیا، اس کا نتیجہ آنا ہی تھا، اب متنبہ ہوئے، ندامت ہوئی اور کہا: ﴿عَسَىٰ رَبُّنَا أَن
 يُبَدِّلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ﴾ اب ہم نادم ہیں تصور کا اعتراف کرتے ہیں اے اللہ! ہم سے غلٹی
 ہوئی آپ معاف فرمادیں، اور جب آپ معاف فرمادیں گے تو ہمیں توقع ہے کہ ہمیں اس سے بھی اچھا باغ عطا
 ہوگا، اور اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خیر ہوگی۔

ندامت و توبہ کے بعد رحمت حق کی توجہ..... حق تعالیٰ شانہ کی یہ رحمت ہے کہ کتنا ہی بڑے سے بڑا جرم کر
 کے جب اخیر میں ندامت کا اظہار کرے پھر رحمت متوجہ ہو جاتی ہے، کبھی یہ نہیں ہوتا کہ اس پر الزام قائم کریں کہ
 ابھی اس کو اچھی طرح بھگت، جب ندامت ہوگئی تو گویا توبہ ہوگئی، حدیث میں فرمایا گیا: ”الْإِسْلَامُ تَوْبَةٌ“ ①
 پشیمانی آجانا بس یہی توبہ ہے منفعل ہو جائے کہ مجھ سے غلٹی ہوگئی ابھی زبان سے بھی نہیں کہا، فرماتے ہیں بس توبہ
 ہوگئی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی بڑا جرم کیا اور اس کے بعد اسے ندامت ہوئی اور مغفرت کی دعا
 مانگنے کے لئے بیٹھا اور کہا: يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! تو فرماتے ہیں: ”أَيَعْلَمُ أَنَّ لَهُ رَبًّا“ اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی
 رب ہے جو اس کی پکڑ کر سکتا ہے اور جب جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے ہم پہلے ہی مغفرت کئے دیتے
 ہیں اس لئے کہ یہ بارگاہِ کربی ہے، فقط ندامت درکار ہے آدمی منفعل ہو جائے توبہ و اقرار کر لے، تو ہمارے ہاں
 کی نہیں ہے ہم جو روکتے ہیں تمہاری مصلحت سے روکتے ہیں نہ اس لئے کہ ہمارے خزانے میں کوئی کمی ہے، جب
 معترف ہو گئے اور مان گئے مقصد پورا ہو گیا، تو پھر مانگنے سے پہلے ہم تمہیں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اس شخص کی مغفرت فرمادی، مگر اس نے جا کر پھر وہی گناہ کیا، مگر پھر ندامت ہوئی
 اور معافی مانگنے کی نیت سے بیٹھا اور عرض کیا یا رب۔ اے رب پھر وہی فرماتے ہیں: ”أَيَعْلَمُ أَنَّ لَهُ رَبًّا“ ② اچھا

① المجمل الاوسط للطبرانی، من اسمہ احمد، ج: ۱ ص: ۱۰۳.

② الصحيح لمسلم، کتاب التوبۃ، باب قبول التوبۃ من الذنوب وان تکورت ج: ۱۳ ص: ۳۲۱.

یہ جان گیا اس کا کوئی رب ہے تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے، پہلے ہی مغفرت فرمادیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ بخشنے بخشنے نہیں تھکے گا، اس لئے کہ تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے، تم محدود ہو، مگر رحمت کی کوئی حد نہیں، مانگنے والا ہونا چاہئے۔ صداقت کے ساتھ پورا عالم مانگے وہ بھی مل کے رہتا ہے، کوئی مانگنے والا نہیں ہے، مانگ کر پھر دیکھو نہ ملے تو پھر شکایت کرو، مگر اخلاص ہو اضطراب اور بے چینی ہو، اپنے گناہ پر ندامت اور اعتراف ہو۔ پھر مانگتا ہے تو ضرور ملتا ہے، یا وہی چیز ملتی ہے یا اس سے بڑھ کر مل جاتی ہے، یا کوئی دوائی نعمت مل جاتی ہے، یہ نہیں ہے کہ آدمی محروم رہ جائے۔ ایک انسان جو ذرا اچھا سمجھا جاتا ہے کریم النفس ہے اس سے اگر کوئی مانگتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ سرائل کو خالی ہاتھ واپس کرے تو جو کریم الکرم ہے جو کریم کا بخشنے والا اور رحم و کرم کا سرچشمہ ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس سے کوئی صداقت سے مانگے والا محروم چلا آئے ضرور ملے کر آتا ہے۔ ﴿اَمِنْ تُجِيبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَا﴾ مانگنے میں اضطراب اور بے چینی ہونی چاہئے، خلوص کامل ہونا چاہئے، پھر انسان کبھی محروم نہیں ہوتا۔

ندامت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے باغ حیوان کا عطیہ..... ان پانچوں بھائیوں نے بھی پوری ندامت کے ساتھ گناہ کا اعتراف کیا اور کہا: ﴿قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا اَنَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾ بلاشبہ ہم نے سرکشی کی، ہم نے بہت بڑی غلطی کی۔ ﴿عَسٰى رَبَّنَا اَنْ يَّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ ممکن ہے کہ اللہ اس کے بعد کوئی اس سے بھی بڑا باغ دے دے، اب تو ہم اسی کی طرف جھکتے ہیں اور غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ نے اس کا صلہ یہ دیا کہ جب یہ محروم ہو کر ہاتھ پاؤں شکستہ ہو کر اور دل ٹوٹا ہوا روتے ہوئے واپس ہوئے تو لوگوں میں چہ چاہا ہوا، اور لوگوں کو پتہ چل گیا، کہ یہ تو عجیب حادثہ پیش آیا، باغ کا باغ ان لوگوں کا اجڑ گیا، کوئی آگ برسی بجلی گری، صفیر ہستی پر باغ کا نشان باقی نہیں رہا، صبح سے صبح بادشاہ وقت کو خبر پہنچی، معلوم ہوا کہ یہ بڑے رئیس تھے، اور آج ایک دم فلاں بن گئے، کہ ان کی روزیوں کا بھی گھانا، بادشاہ کو رحم آیا کہ یہ لوگ قابل توجہ ہیں، بن کر جو بگڑتا ہے وہ زیادہ قابل رحم ہوتا ہے، جو شروع سے ہی گرا ہوا ہو اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، عزت دار ہو کر ذلت میں گرفتار ہو جائے، مالدار ہو کر ایک دم مفلس بن جائے، سب کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے، تو بادشاہ وقت کی توجہ منعطف ہوئی تو کہا کہ: شاہی باغوں میں ایک پورے کا پورا باغ انہیں دے دو، جو ان کے باغ سے کہیں بڑھ کر تھا اور اس کا نام ”باغ حیوان“ یعنی زندگی کا باغ تھا، وہ ان کے باغ سے چوگنا زیادہ تھا بے حد بے شمار اس میں پھلوں کے درخت تھے، اور اس کی آمدنی اس سے کہیں زیادہ تھی تو ایک دم بادشاہ نے حکم دیا کہ ان پانچوں بھائیوں کو باغ دے دیا جائے، تو انہوں نے حق تعالیٰ شانہ کے سامنے سرکشی کی تو باغ کو سرے سے اجاڑ دیا، جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور جب ایک دم ندامت کے ساتھ متوجہ ہوئے تو اتنا بڑا باغ بنا دیا کہ دے دیا، یہ بھی نہیں کوئی دس بیس برس ان سے کوئی محنت لی ہو، پھر باغ دیا ہو، اس سے زیادہ بہتر دے دیا، وہ باغ ذرا دن تھا، یہ باغ

حیوان ہے، تو زندگی کا باغ عطا کیا، اب پھر نہایت ہی راحت سے فراغت حالی و فراغت بالی سے زندگی گزاری۔ اے اہل مکہ! باغ دین کے اجاڑنے سے ڈرو..... یہ حق تعالیٰ نے مثالی دی فرمایا: اے اہل مکہ! تمہارے سامنے بھی اللہ کا رسول آیا، اور اس نے ایک بہترین جنت کا باغ تمہارے سامنے پیش کیا، اور دین کا باغ پیش کیا، تم نے نافرمانی کی، ناقدری کی اور حق کے مقابلے پر آ گئے، وہ فقیروں کو روکتے تھے کہ باغ میں نہ آئیں میوہ نہ کھانے پائیں، تم اس باغ دین سے غرباء کو روک رہے ہو کہ کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے پائے، ہر ایک کو بہکاتے ہو کوئی راہ راست پر آ جاتا ہے تو اس کے دل میں شکوک و شبہات ڈالتے ہو، کہ کہیں یہ دل سے دین حق کو قبول نہ کرے، تو جیسے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں کے فقیروں کے اوپر دروازے بند کر دیئے تھے، انہوں نے باغ دین کے دروازے بند کر رکھے ہیں کہ جگہ جگہ لوگوں کے دلوں میں شک ڈالتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مبارک یہ تھی کہ جہاں کوئی مجمع دیکھا، کوئی میلہ دیکھا، آپ دعوت الی اللہ کرنے کے لئے پہنچ جاتے تھے آپ جارہے ہیں اور فرما رہے ہیں: اے لوگو! قیامت سے ڈرو، اللہ کے دین کو اختیار کرو شرک اور بت پرستی چھوڑو۔

اور پیچھے پیچھے ابو جہل جارہا ہے اور کہتا جاتا ہے لوگو! اس کی بات مت مانو، (معاذ اللہ) یہ مجنون آدمی ہے، ان کی عقل بہک چکی ہے، باپ دادا کے دین میں یہ شخص رخنہ ڈالنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے، اس نے برادری میں تفریق ڈال دی، اس کی بات مت سنو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جارہے ہیں کہ لوگوں کو باغ دین میں داخل کر دیں، اور ابو جہل ولید ابن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث اور اخنس بن شریق یہ سرداران قریش پیچھے پیچھے ہیں کہ لوگوں کو روک رہے ہیں کہ کسی کے دل میں حق نہ آ جائے، کوئی معترف نہ ہو جائے، تو جس طرح سے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں سے فقراء کو محروم کرنا چاہا اسی طرح سے اے مشرکین مکہ! تم لوگوں کو باغ دین سے محروم کرنا چاہ رہے ہو، تو اپنے انجام کو سوچو، ان بھائیوں کے حق میں نتیجہ یہ ہوا کہ باغ سرے سے اجڑ گیا تمہارے حق میں نتیجہ آنے والا ہے، غزوہ بدر کا سال آرہا ہے، فتح مکہ کا سال آرہا ہے جس میں مشرکین کی کمریں توڑ دی جائیں گی، جس میں ان کی طاقتیں گھٹ جائیں گی، اور ان کی پیش نہیں چل سکے گی، تمہارا ایسا بیچ مارا جائے گا کہ بعد میں تمہارا کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہوگا، یہ تمہاری جائیدادیں یہ تمہارے باغات یہ تمہاری تجارتیں یہ سب منٹوں میں ملیا میٹ ہو جائیں گی اگر تم نے اسی طرح حق کا مقابلہ جاری رکھا یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

باغ ایمان قبول کرنے کی دعوت..... لیکن اگر باغ زردان کے مالکوں کی طرح اخیر میں ندامت کا اظہار کیا، اخیر میں سرکشی کا اعتراف کیا تو اللہ نے کتنا زیادہ بہتر پہلے سے بھی زیادہ بہتر دے دیا، تم بھی اگر اعتراف کرو کہ ہم سے جو بھی غلطی ہوئی ہم اس پر دل سے نادم ہیں اب ہم دین حق کو قبول کرتے ہیں تو دنیا میں تمہاری

سرداریاں قائم رہیں گی اور آخرت میں بھی تم ہی تم ہو۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے دین حق کو قبول کیا، فاروق اعظمؓ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ باندھ کر چلے تھے، اور حق کا مقابلہ کرنے چلے تھے، لیکن اخیر میں قلب کے اندر نرمائی آئی ندامت ہوئی اور جا کر اسلام قبول کیا تو کیا ہوا؟ فاروق اعظمؓ کی سرداری دنیا میں قائم رہی آج ابو جہل کا نام لینے والا کوئی نہیں اور فاروق اعظمؓ کا نام لے کر رضی اللہ عنہ کہتے ہوئے زبانیں تھک جاتی ہیں، دلوں کے اندر عظمت بڑھتی ہے، آج عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولیدؓ جنہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو قتل اور شہید کیا، اخیر میں اللہ کی طرف رجوع ہوئے تو خطاب ملا: سیف من سیوف اللہ ”خالد بن ولیدؓ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے“ تو خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ پر بڑے بڑے ممالک فتح ہوئے تو جنہوں نے اعتراف کیا، کیا ان کی سرداری ختم ہو گئی؟ یا اتنی بڑی سرداری ملی کہ قیامت تک ان کا نام روشن ہے، اور ان کے نام نامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے یہ تو دنیا میں ملا، اور آخرت یہ ہے کہ بہت سے حضرات عشرہ مبشرہ میں داخل ہوئے کہ انہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دیدی گئی، تو دنیا ہی میں جس نے جنتیوں کو دیکھا ہو وہ ان حضرات کو دیکھ لے کہ یہ جنتی پھر رہے ہیں تو دنیا میں بشارتیں ملیں، خلافت ایسی ملی کہ بڑے بڑے بادشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے، ان کی اتنی ہیبت اور دبدبہ ہوتا تھا۔

تو اگر ان کے ایک باغ کی سرداری جس کو وہ اپنے زعم میں اپنا باغ سمجھتے تھے، وہ مٹا دی گئی، اس کے بعد ایک عظیم سرداری اللہ کی طرف سے دی گئی یہاں باغ ذردان کے بعد باغ حیوان دیا گیا تھا اور وہاں باغ جنان دے کر باغ ایمان عطا کیا گیا جس باغ ایمان کی وجہ سے دنیا بھی درست ہو گئی اور آخرت بھی درست ہو گئی، مگر کب؟ جب اعتراف کر لیا اور نادم ہو گئے کہ اب تک ہم نے غلطیاں کیں، یہ مثال دے کر مشرکین مکہ کو عبرت دلائی گئی کہ باغ والوں سے عبرت پکڑو، کہ ان کی ابتداء کیسی ہوئی؟ اور اعتراف قصور کے بعد ان کی انتہا کیسی ہوئی کہ دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی بن گئی، اسی طرح سے تم بھی اعتراف کرو، اعتراف کرنے کے بعد پھر سب کچھ تمہارے لئے ہے، لیکن انہوں نے نہیں مانا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے باغ وغیرہ سب مٹ گئے، آج ان کا نام لینے والا کوئی نہیں۔

﴿هَلْ تُحِشُّ مِنْهُمْ مَنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ ①

کوئی بات بھی ان کی شنوائی نہیں دیتی، کوئی ان کا نام لینے والا موجود نہیں اگر نام ہے بھی تو وہ بھی قرآن و حدیث کی بدولت ہے، اس میں ان کا ذکر ہے تو نام چل رہا ہے مگر لعنت کے ساتھ چل رہا ہے رحمت کے ساتھ نہیں چل رہا، تو ساری چیزیں مٹ مٹا کر ختم ہوئیں۔

اعتراف ندامت کے بعد باغ اسلام کی عظیم الشان سرداری دی گئی..... جنہوں نے ندامت اور اعتراف کے ساتھ اسلام میں داخلہ لیا ان کو عظیم الشان سلطنتیں دی گئیں، عربوں کی شوکت قائم ہوئی تو اتنی بڑی

شوکت قائم ہوئی کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، سلطنت بھی شوکت بھی اور ساتھ میں دیانت بھی ہے، سرداری بھی ہے عبدیت بھی ہے اور عبادت بھی ہے کہ تختِ سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن دین و دیانت کا پلہ ہاتھ میں ہے۔ فاروقِ اعظمؓ سلطنت پر ہیں، صدیق اکبرؓ تختِ سلطنت پر ہیں اور عبادت کا یہ حال ہے کہ عام آدمی میں اور ان میں فرق معلوم نہیں ہوتا، ایک ایسی دیانت اور مساوات کی حکومت ہے کہ امیر المومنین اور ایک عام مسلمان حقوق میں برابر ہیں۔

فاروقِ اعظمؓ سے ایک اعرابی کا مکالمہ..... مالِ غنیمت کی چادریں آئیں ایک ایک چادر بانٹ دی گئیں، فاروقِ اعظمؓ کے حصہ میں بھی ایک ہی چادر آئی، آپ خطبہ دینے کے لئے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کھڑے ہوئے تو دو چادریں بدن پر تھیں اس میں وعظ فرما رہے تھے۔ تو فرمایا: اَسْمَعُوا وَأَطِيعُوا میں امیر المومنین ہوں میری بات سنو اور میری اطاعت کرو، ایک اعرابی کھڑا ہوا اور کہا۔ لَا نَسْمَعُ وَلَا نَطِيعُ نہ ہم تمہاری بات سنیں گے نہ ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔

تو یہ نہیں تھا کہ اسی وقت گرفتار کر لیا جاتا کہ اس نے حکومت کے خلاف کہا اور برسرِ منبر امیر المومنین سے گستاخی کی۔ فاروقِ اعظمؓ فوراً ڈھیلے ہو گئے، فرمایا بھائی کیوں؟ جب مجھے امیر المومنین بنادیا پھر کیوں اطاعت نہیں کرتے، اس نے کہا تم نے خیانت کی ہے؟ اس لئے کہ مالِ غنیمت میں سے ایک ایک چادر ایک شخص کا حق تھا، تمہارے بدن پر دو چادریں ہیں، تو تم نے ایک چادر زیادہ لے لی تو تم نے مسلمان کے مال میں خیانت کی اس لئے تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری بات سنی جائے اور تمہاری اطاعت کی جائے۔

فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا عبد اللہ بن عمرؓ دے گا، عبد اللہ ابن عمرؓ کھڑے ہوئے، اور فرمایا: والد صاحب کے حصہ میں ایک ہی چادر آئی تھی اور ایک میرے حصہ کی چادر تھی، فاروقِ اعظمؓ ڈیل ڈول کے آدمی تھے، تو ایک چادر میں نے اپنے حصہ کی انہیں دے دی تو اس طرح دو چادریں تھیں، فاروقِ اعظمؓ نے از خود دو چادریں نہیں لیں۔ تو وہ اعرابی پھر کھڑا ہوا اور کہا: نَسْمَعُ وَنَطِيعُ ہم سنیں گے بھی اور ہم اطاعت بھی کریں گے۔ تو سلطنت تھی مگر ایسی سلطنت جس میں لوٹ لوٹ کر دینداری و دیانتداری اور خوفِ خدا بھرا ہوا ہے، مساوات کے ساتھ حکومت ہے امیر المومنین کا وہی حصہ ہے جو ایک غریب عامی کا حصہ ہے، ان کا کوئی زیادہ حصہ نہیں ہے۔

حقِ خلافت..... پھر یہ کیفیت کہ اگر اپنی غلطی پر کوئی عامی آدمی متنبہ کرے تو اسی وقت ڈھیلے پڑ جاتے تھے، اس کے سامنے معافی چاہتے تھے، یہ امیر المومنین کی حالت تھی۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، فاروقِ اعظمؓ رات کو گھوم رہے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، گویا مسلمانوں کا امیر محض ٹیکس وصول کرنے کا امیر نہیں یا محض خزانے بھرنے کا امیر نہیں، بلکہ اخلاقی حالتیں درست کرنے کا بھی ذمہ دار بنایا گیا اس لئے فاروقِ اعظمؓ راتوں کو گھومتے تھے کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، منظر عام پر آکر یہ لوگ بے شک گناہ نہیں کرتے لیکن

ممکن ہے گھروں میں چھپ چھپا کر یہ لوگ کچھ کرتے ہوں، تو رات کو نگاہ ڈالتے تھے کہ لوگوں کے گھر میں اخلاق کیا ہیں، چنانچہ ایک گھر کے قریب سے گزرے تو ایک عورت کی آواز سننے میں آئی کہ گنگنا کر کچھ اشعار پڑھ رہی ہے اور بڑے درد آمیز آواز کے ساتھ کچھ عاشقانہ مضامین کے اشعار ہیں، چونکہ عورت کی آواز تھی تو فاروق اعظمؓ چونکے کہ یہ کون گھر میں اس طرح عاشقانہ اشعار پڑھ رہی ہے اور آواز باہر بھی آرہی ہے، تو خطرہ اور خدشہ پیدا ہوا کہ کوئی اندر برائی تو نہیں ہو رہی، نور اور دوازے پر دستک دی یہ عورت کون ہے جو اس طرح کا کر اشعار پڑھ رہی ہے، وہ جو لڑکی گاری تھی امیر المومنین کی آواز پہچان کر سہم گئی، اس میں جرأت نہ رہی کہ بتلا سکے کہ اندر کون ہے، کوئی جواب اندر سے نہ آیا۔ اب ان کا شبہ اور قوی ہوا کہ اگر کوئی برائی نہیں تھی تو وہ عورت کہہ دیتی کہ کوئی برائی نہیں، آپ اطمینان رکھیں، مگر یہ چپ ہو جانا اس کی دلیل ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہے۔ پھر زور سے دروازے کو کھٹکھٹایا، اب وہ اور ڈر گئی، چنانچہ پھر بھی دروازہ نہیں کھولا چنانچہ فاروق اعظمؓ چھلانگ مار کے اندر پہنچے اور بحیثیت امیر المومنین یہ ان کا حق تھا جیسے پولیس چھاپہ مارتی ہے، اسی طرح امیر المومنین کا حق ہے کہ اگر وہ کوئی خدشہ یا خطرہ محسوس کریں تو وہ چھاپہ ماریں دیکھیں کہ کوئی بداخلاقی تو نہیں ہے چھلانگ مار کے اندر پہنچے فرمایا کون ہے جو اس طرح سے عاشقانہ اشعار پڑھ رہی تھی، ایک عورت کو کیا تعلق ہے کہ وہ عاشقانہ اشعار پڑھے۔

اب اس لڑکی کو جرأت پیدا ہوئی، اس نے کہا امیر المومنین! مجھے آپ کیوں عاشقانہ اشعار سے روکتے ہیں؟ فرمایا ایسے اشعار گناہ ہیں اور عورت کی آواز بھی گناہ ہے تو ایک گناہ میں مبتلا ہوئی، اس نے کہا میں نے تو ایک گناہ کیا آپ نے تو تین گناہ کئے اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی۔ بس فاروق اعظمؓ وہی ڈھیلے پڑ گئے اور وہ جوش و خروش ختم ہو گیا، فرمایا: بہن میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اگر تو مجھے مطلع کر دے کہ میں نے کیا گناہ کئے ہیں تو میں ممنون ہوں گا، اس نے کہا ایک نہیں تین صریح گناہ کئے ہیں اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی، اسی وقت فاروق اعظمؓ سہم گئے اور خوف زدہ ہو گئے اور کہا کہ مجھے مطلع کرو۔ اس نے کہا قرآن کریم میں صاف ارشاد موجود ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلٰى أَهْلِهَا﴾ ① اہل ایمان کسی غیر کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ تم اس سے اجازت نہ لے لو، اور سلام کر کے داخل ہو۔ آپ بغیر میری اجازت کے میرے گھر میں داخل ہوئے، بلا اجازت اور بلا سلام آپ داخل ہوئے آپ کو ایسا کرنے کا کیا حق تھا؟ فرمایا میرے سے یہ غلطی ہوئی کہا ایک غلطی نہیں دوسری اور بھی ہوئی۔ قرآن کریم میں صاف حکم موجود ہے: ﴿وَأْتُوا النِّسَاءَ مِنْ أَبْوَابِهِنَّ﴾ ② گھروں میں دروازوں سے داخل ہو، آپ دروازے کی بجائے دیوار چھلانگ کے داخل ہوئے، آپ کو کیا حق تھا؟ یہ قرآن کریم کی خلاف ورزی ہے، اب اور زیادہ ڈر گئے کہ واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اس کے بعد اس نے کہا تیسری غلطی یہ ہے کہ صریح حدیث

① پارہ ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۲۷۔ ② پارہ ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹۔

میں حکم دیا گیا ہے کہ اجنبیہ کے خلوت کدے میں مت داخل ہوں، کسی اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ جائز نہیں ہے، میں یہاں اپنے گھر میں تنہا ہوں، آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے خلوت کدے میں آکودے۔ اب ایک دم فاروق اعظمؓ پکپکانے لگے، اللہ کا ڈر غالب آیا۔ فرمایا: بہن مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف فرمادیں۔ اس نے کہا میں کون ہوں معاف کرنے والی جس کا گناہ کیا ہے اس سے معافی چاہو، قرآن کریم کا گناہ کیا، حدیث کا گناہ کیا، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی چاہو، میں کون ہوں معافی دینے والی۔ چنانچہ آکر بقیہ رات نوافل و توبہ استغفار میں گذاری، رات بھر روتے رہے، حالانکہ یہ گناہ نہیں تھا امیر المومنین کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر کسی گھر پر شبہ ہو تو اس میں چھاپہ مارے، پولیس کو بھیجے کہ کوئی بدکاری تو نہیں ہو رہی، یہ امیر کے حق میں جائز ہے، مگر اس سب جائز کو بھول گئے، صرف ذہن میں یہ رہ گیا کہ واقعی تین حکموں کی خلاف ورزی کی میں دیوار پھلانگ کر داخل ہوا، بلا اذن داخل ہوا اور ایک عورت کے خلوت کدے میں داخل ہوا، غرض تمام رات روئے استغفار کیا، صبح کو قلب میں انشراح پیدا ہوا کہ میری غلطیاں معاف ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ نے میری معافی کو قبول فرمایا بہت منتشر ہوئے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اس عورت کو دربار خلافت میں حاضر کیا جائے چنانچہ وہ حاضر ہو گئی۔ فرمایا بہن! میں تیرا ممنون ہوں تو نے مجھے میرے گناہوں پر مطلع کیا، میں نے رات بھر توبہ استغفار کیا، اب مجھے اخیر میں انشراح اور اطمینان قلب حاصل ہو گیا کہ اللہ نے میرے گناہوں کو معاف کر دیا میں مطمئن ہوں کہ مجھے معافی مل گئی۔

اب بحیثیت امیر المومنین یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ گانا بجانا کیسا تھا؟ اس طرح کے تجھے اشعار پڑھنے کا کیا حق تھا، وہ کیا واقعہ تھا؟ اس نے کہا امیر المومنین! میں زانیہ عورت ہوں نہ بدکار ہوں، میں ایک عقیفہ عورت ہوں، صورت واقعہ یہ ہے کہ میری شادی کو پندرہ دن ہوئے ہیں، میں بھی بھرپور جوانی رکھتی ہوں، میرا خاوند بھی بھرپور جوان ہے شادی کو پندرہ دن ہوئے تھے فلاں جنگ میں آپ نے میرے خاوند کو بھیج دیا، اور اس کو روانہ کر دیا، اس کے فراق اور جوش جوانی میں کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔

فرمایا تو سچ کہتی ہے بیشک یہی واقعہ ہے اور توبہ بدکار نہیں ہے اس کے بعد اس کو عزت کے ساتھ واپس کیا اور شکر یہ ادا کیا۔ اس کے بعد گھر میں جا کر اہلیہ محترمہ سے پوچھا! اگر عورت بھی بھرپور جوان ہو اور مرد بھی بھرپور جوان ہو اور ان میں جدائی کر دی جائے، تو وہ کتنے دن جدائی کا تحمل کر سکتے ہیں اگر اس سے زیادہ دن ہو جائیں تو وہ زنا یا بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے اور صبر نہ کر سکیں گے، کتنی مدت ہو سکتی ہے۔ اہلیہ محترمہ نے جواب دیا اگر مرد و عورت میں بھرپور جوانی ہو تو تین مہینوں سے زیادہ ان کو جدانہ کیا جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے اور صبر نہ کر سکیں گے۔

یہ الگ بات ہے کہ اللہ کے ڈر سے عفت و پاکیزگی طبع سے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، لیکن دنیا ہے تو عالم اسباب میں بھرپور جوانی مرد و عورت تین مہینے سے زیادہ صبر نہیں کر سکتے، اسی وقت آکر سرکاری طور پر آرڈر جاری کیا کہ جس

شادی شدہ شخص کو جنگ کے لئے بھرتی کیا جائے، تین مہینے کے اندر اندر اسے پھر واپس گھر لایا جائے، اس کی جگہ دوسرا جوان بھیجا جائے تین مہینے سے زیادہ صرف نہ کئے جائیں، تو ان حضرات کی یہ بادشاہت نہ تھی بلکہ خلافت تھی کہ اقتدار بھی پورا اور ایسا کہ سلاطین دنیا کا نہیں، اور خوف خدا بھی پورا اور دیانت بھی پوری، اور اپنے نفس کا مراقبہ بھی پورا، اور یہ بھی خطرہ کہ ہم کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، تو حقیقت میں خلافت کا حق انہیں حضرات اکابر نے ادا کیا۔ تو پہلے فاروق اعظم کفر میں مبتلا تھے، لیکن جب توبہ کی تو بھلی سرداری کیا چیز تھی، جو بعد میں اللہ نے دنیا میں سرداری دی، اور آخرت کی یہ سرداری کہ دنیا ہی میں ان حضرات کو جنت کی بشارت دے دی، تو ان سے زیادہ کون خوش نصیب تھا کہ دنیا میں بھی سرداری پائی اور آخرت میں بھی سرداری پائی۔

دو جہاں کی سرداری کا راستہ..... تو اسی طرح سے مشرکین مکہ کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ باغ والوں کے قصے سے عبرت پکڑو، انہوں نے اگر حق تعالیٰ سے بغاوت کی تو کیا نتیجہ نکلا کہ باغ کی جڑ بنیاد ختم ہو گئی، اس کے بعد اطاعت کی اور ندامت کا اظہار کیا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس سے بہتر باغ مل گیا، تم بھی آج بغاوت حق پر آمادہ ہو، اللہ کے دین پر خود بھی نہیں آتے اور دوسرے کو بھی آنے سے روکتے ہو اس باغ دین سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتے، اگر تم توبہ کر لو تو اس سے بڑھ کر باغ دیا جائے گا اور سرداری دی جائے گی، تو جن کی قسمت میں تھا، انہیں سرداری مل گئی اور جن کی قسمت میں نہیں تھا ان سے یہاں سے بھی چھن گئی وہاں سے بھی چھن گئی دونوں جہاں سے محروم ہو گئے گویا عبرت کے لئے قصہ بیان فرما دیا گیا کہ اس طرح سے اگر چلو گے کہ اگر گناہ ہو جائے تو آدمی فوراً نادم ہو جائے، فوراً توبہ کرے استغفار کرے آدمی اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرے، اللہ کے ہاں یہی چیز قبول ہوتی ہے۔

یہ مقصود نہیں ہے کہ کوئی گناہ کسی طرح سے نہ کرے، آدمی جب ہی بخشا جائے گا کہ بالکل گناہوں کا استیصال کر دیا، اسلئے کہ یہ تو ممکن نہیں انسان اور بشر جسے کہتے ہیں وہ تو خطا اور نسیان کا پتلا ہے، بشریت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے، غلطی بھی ہوگی کوتاہی بھی ہوگی گناہ بھی ہوگا گناہوں کا استیصال مقصود نہیں ہے، اس لئے کہ انسان میں جب گناہ کا مادہ رکھا ہے تو پھر تو کچھ نہ کچھ تو کرے گا مقصد یہ ہے کہ گناہ کر کے اس پر اصرار نہ کرو، نادم ہو کر اس سے ہٹ جاؤ، پھر گناہ ہو پھر توبہ کر لو، توبہ نہیں کہا جا رہا کہ گناہ کا مادہ اپنے اندر سے نکال دیں، یہ انسان کے بس میں ہی نہیں جیسے خیر کا مادہ انسان میں رکھا گیا ہے، شر کا بھی ہے۔

خیر و شر کا تصادم علامت بشریت ہے..... حدیث میں ہے کہ ہر انسان کے دل میں ایک داعیہ خیر کا پیدا کیا گیا ہے ایک داعیہ شر کا پیدا کیا گیا ہے، ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور قلب کی بائیں جانب شیطان بٹھلایا گیا ہے، فرشتہ خیر کے خطرے ڈالتا ہے اور شیطان شر کے دوسوے ڈالتا ہے، انسان دو پہلو انوکھے رخ میں ہے، ادھر سے فرشتہ چاہ رہا ہے کہ نیکی کرے شیطان چاہ رہا ہے کہ بدی کرے یہ جو آپ کسی وقت دیکھتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ فلاں برائی کر لوں پھر طبیعت ذرا رکتی ہے کہ بھائی دیکھ اللہ کے خلاف ہوگا، پھر

اس کے بعد آمادگی ہوتی ہے کہ توبہ کر لیں گے اس وقت تو کرلو، پھر اس کے بعد آدمی رکتا ہے کہ بھائی خدا تو دیکھ رہا ہے یہ ترزدنی الحقیقت شیطان اور فرشتے کے مقابلے سے ہوتا ہے، فرشتہ خیر کا خطرہ ڈال رہا ہے تو آدمی خیر کی طرف چلتا ہے اور شیطان شر کا وسوسہ ڈال رہا ہے تو آدمی شر کی طرف چل رہا ہے، ان دو پہلوؤں میں جو غالب آجائے، اسی راہ پر انسان چل پڑتا ہے مادے خیر کے بھی موجود ہیں شر کے بھی موجود ہیں، نیکی بھی کرے گا اور کبھی نہ کبھی بدی بھی کرے گا، بہتر سے بہتر آدمی صالح ہونا چاہئے۔ لیکن کبھی نہ کبھی بدی سرزد ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اس کا مادہ رکھا ہوا ہے، تو حق تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ جنت اس وقت دیں گے جب تم سے ایک گناہ بھی نہ ہو، بالکل پاک بن جاؤ، یہ شان حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہے وہ معصوم ہوتے ہیں یا اولیاء اللہ کی ہے کہ وہ محفوظ ہوتے ہیں، عام بشر چاہے کتنی ہی نیکیاں کرے مگر کسی نہ کسی وقت کمزوری سرزد ہو ہی جائے گی، بشریت موجود ہے اس لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ گناہوں کی جڑ بنیاد کاٹ دو، اور بالکل مقدس ہو کر آؤ، یہ فرمایا گناہ تو ہوں گے، مگر اصرار مت کریں توبہ بھی کر لیں، نادم بھی ہو جائیں، ہزار دفعہ گناہ کرلو، پھر توبہ کرلو، معاف کرنے کو موجود ہیں۔

”مَا أَصْرَ مَنْ اسْتَغْفَرَ“ ①

جس نے توبہ کر لی وہ اپنے گناہ کے اوپر مُصر نہیں سمجھا جائے گا، مُصر وہ ہے کہ گناہ کرتا جائے اور توبہ نہ کرے اور اس کے دل میں ندامت نہ آئے معلوم ہوا نفس گناہ مُصر نہیں ہے، گناہ پر اصرار کرنا، نادم نہ ہونا یہ مُصر ہے۔ بلکہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا کہ:-

”لَوْ لَمْ تُذْنِبُوا لَجَاءَ اللَّهُ قَوْمًا يُذْنِبُونَ“ ② اگر تم بالکل گناہ کرنا چھوڑ دو، تو اللہ تعالیٰ ایک قوم پیدا

کریں گے کہ وہ گناہ کرے، تا کہ اس کی شانِ غفاری ظاہر ہو۔

دوزخ کر ابسوزد گر بولہب نباشد

جیسے دوزخ کے لئے ابولہب کی ضرورت ہے کہ اگر ابولہب نہ ہو تو جہنم کہاں سے بھرا جائے، اسی طرح جنت کے لئے نیکوں کی ضرورت ہے، اب اہل جنت میں نیک بھی ہیں گناہ گار بھی ہیں نیکو کا فضل سے جائیں گے اور گناہ گار مغفرت سے جائیں گے، اگر گناہ کرنا ہی چھوڑ دیں تو شانِ غفاری کیسے ظاہر ہوگی؟ تو مغفرت کے لئے ضرورت ہے کہ گناہ کا کام ہو۔

عجب، گناہ سے بھی زیادہ مہلک ہے..... اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوراً گناہ کرنا شروع کر دیں کہ بھائی ہم تو اللہ کی مغفرت چاہ رہے ہیں، مطلب یہ ہے کہ گناہ کا مادہ ہے خواہی غواہی کبھی نہ کبھی گناہ کر گذرے گا، لیکن گناہ کر کے مایوس نہ ہو جائے کہ اب رحمت کی کوئی صورت میرے لئے نہیں، رحمت کی صورت ہے اور وہ

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۱ ص: ۳۷۱۔

② الصحيح لمسلم، کتاب التوبۃ، باب سقوط الذنوب بالاستغفار توبۃ ج: ۱۳ ص: ۳۰۱ رقم: ۳۹۳۶۔

توبہ ہے، فرماتے ہیں کہ گناہ اتنا مضر نہیں ہے، جتنا گناہ کر کے توبہ نہ کرنا اور اس پر جتنا مضر ہے، اگر تم سب گناہ چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ گار ہوتا کہ اس کی شان مغفرت ظاہر ہو، بلکہ ایک روایت میں ہے: خَيْرُ الْعِبَادِ الْخَطَاۃُ وَنَ السَّوْاۡبُوْنَ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جو گناہ گار ہیں، مگر توبہ کرنے والے ہیں، اس وسطے کہ ایک شخص توبہ ہے جو کبھی گناہ نہیں کرتا، اس کا احتمال ہے کہ اس کے دل میں غرور پیدا ہو جائے کہ میں بڑا متقی ہوں کبھی گناہ ہی نہیں کیا، تو یہ خیال آنا اس کے لئے مہلک ہے، یہ بھی اللہ کی رحمت سے بعید کرنے والا ہے، اگر تازہ پیدا ہو گیا اتراہٹ پیدا ہو گئی کہ میں بڑا نیک ہوں کبھی گناہ نہیں کرتا، یہ اللہ کی رحمت سے بعید ہو جائے گا، لیکن گناہ کرتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے، پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، اس کے دل میں کبھی خطرہ نہیں آئے گا کہ میں بڑا مقدس آدمی ہوں اس لئے کہ گناہ سامنے ہے، اس کا دل ٹوٹا ہوا رہے گا کہ میں تو گناہ گار ہوں اور دل شکستہ ہونا یہی رحمت خداوندی کو جذب کرتا ہے، اس سے زیادہ رحمت متوجہ ہوتی ہے، اس لئے فرمایا: ”خَيْرُ الْعِبَادِ الْخَطَاۃُ وَنَ السَّوْاۡبُوْنَ“ ① بہترین بندے وہ ہیں جو گناہ گار ہیں مگر توبہ کرتے ہیں توبہ سے غافل نہیں ہیں، تو جو کبھی گناہ نہیں کرتے ان کے اندر کبر اور غرور کا احتمال ہے لیکن جو گناہوں کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں مگر توبہ کرتے ہیں ان کے اندر کبھی کبر نہیں ہو سکتا کہ ہم تو بہت گناہ گار آدمی ہیں ہر دم گناہ ان کے پیش نظر رہیں گے، قلبی شکستگی گناہ سے ہوتی ہے، اور وہی شکستگی بارگاہ حق میں مطلوب ہے جو رحمت کو کھینچتی ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ احیانا گناہ مرزد ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے، یہ مطلب نہیں ہے کہ جری ہو کر گناہ شروع کر دو کہ اللہ کے بہترین بندے تو وہی ہیں جو گناہ گار ہیں لہذا خوب گناہ کرو۔

رحمت حق سے مایوسی کی ممانعت ہے..... خوب گناہ کرنے کے باوجود بھی فرماتے ہیں کہ مایوس مت ہو یہ نہیں فرماتے کہ خوب گناہ کیا کرو، تو یہاں یاس کی نفی کی جا رہی ہے، کہ کتنے ہی گناہ کرو مایوس مت ہوؤ، وہاں توبہ ہے۔

بازا باز آ ہر آنچہ ہستی بازآ
گر کافر و گمراہ و بت پرستی بازآ
این در کہ مادر گمراہی نیست
صد بار گر تو بہ شکستی بازآ

فرماتے ہیں، باز آ باز آ، نادام بن جاؤ، اگر کافر گمراہ اور بت پرست بھی ہو تب بھی مایوس نہ ہو باز آ جاؤ، پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں اس لئے کہ ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے سو مرتبہ بھی اگر گناہ کرو گے اور پھر آؤ گے پھر بھی توبہ قبول کرنے کو تیار ہیں، پھر بھی رحمت کرنے کو تیار ہیں ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا ہے ﴿لَا تَآيِسُوا مِن رُّوحِ اللّٰهِ﴾ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو، کتنی بھی برائیوں کے اندر مبتلا ہو، یاس لے کر مت آؤ، مومن کا کام ہی مایوسی نہیں ہے، پھر متوجہ ہو جائے پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں۔ اور سچی

① السنن للترمذی، کتاب صفة القيامة والرقاق والورع، باب منه ج: ۹ ص: ۳۰ رقم: ۲۴۲۳۔

توبہ ایسی چیز ہے کہ ستر برس کا کفر بھی اگر سچے دل سے توبہ کر لی جائے تو مٹا دیتی ہے، گناہ تو کفر سے ہلکی چیز ہے، جب سو برس کا ایک کافر آ کر توبہ کرے تو کفر مٹ جاتا ہے اور ایسا مٹتا ہے کہ: ”إِنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ“ ① اسلام سے پہلے جو کچھ بھی کیا تھا وہ سب ختم ہو جاتا ہے، آج وہ ایسا بن گیا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ بچہ گناہ سے پاک ہوتا ہے تو گناہ سے توبہ کرنے کے بعد کیوں نہیں پاک بنے گا۔

اس لئے فرمایا: ”الْتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ“ ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں تھا، اس کو پاک بنا دیا جاتا ہے۔

حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے..... الا یہ کہ حقوق العباد ہوں تو وہ توبہ سے معاف نہیں ہوتے، کسی کو گالی دے دی، کسی کی آبرو گرائی، کسی کا خون ناحق کیا، کسی کا مال جھپٹ لیا، چر الیا، قرض لے کر نہیں دیا، امانت میں خیانت کی، کتنی ہی توبہ کرے یہ معاف نہیں ہوں گے جب تک کہ صاحبِ حق معاف نہ کر دے، یہ حق تعالیٰ کی بارگاہ کا عدل و انصاف ہے، حالانکہ مالک الکُل وہ ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ یہ ہمارا گناہ نہیں، اس نے اپنے بھائی کا گناہ کیا ہے وہی معاف کرے گا تو معاف ہوگا، ہمیں معاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہم معاف نہیں کریں گے، حالانکہ اگر وہ معاف کر دیں تو بندے کیا کر سکتے ہیں، لیکن یہ عدلِ کامل ہے کہ ہم معاف نہیں کریں گے، جس کا قصور کیا اس سے معافی چاہو۔

اگر کسی کی غیبت کی ہے کسی کو برا بھلا کہا ہے، پشت پیچھے اس کے عیب بیان کئے ہیں آدمی اس کے پاس تنہائی میں جا کر کہے، بھائی! میں نے تیرے ساتھ برائی کی ہے، میں نے غلطی کی تیرے عیب بیان کئے، اللہ کے لئے مجھے معاف کر دے، وہ معاف کر دے گا معاملہ صاف ہو جائے گا، کسی کا قرض دبا لیا ہے آدمی وہ جا کر دیدے کہ اب تک مجھ سے غلطی ہوئی اب میں ادا کروں گا، اگر بالفرض دینے کو نہیں رہا لیکن اقرار کر لیا کہ بے شک آپ کا پیسہ مجھ سے کھایا گیا میں نے خطا کی لیکن اب میں معترف ہوں کہ جب میرے پاس ہوگا پہلے میں تجھے دوں گا، اب اس مستعد ہونے پر آدمی قائم رہے، اگر پانچ روپے ہیں تو ایک حصہ اس کو جا کر دیدے، کہ بہر حال مجھے یہ ادا کرنا ہے صرف کھانے کے لئے اتنا رکھ لے کہ فاقہ نہ ہو، بقیہ سب اس کو دے دے جب اس طرح سے کوئی ادائے قرض میں ہمت باندھے گا تو پھر اللہ کی طرف سے بھی مدد ہوتی ہے، ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ اسے جلدی سبکدوش کر دیتے ہیں، غرض کسی کی غیبت کی ہو آبروریزی کی ہو، مال چھینا ہو تو مومن کا کام یہ ہے کہ بے تکلف جا کے کہہ دے کہ بھائی! مجھے معاف کر دے بس معاملہ صاف ہو گیا، اسی طرح اللہ کا حق مارا تو اللہ سے توبہ کر لے، وہ تو کریم ہیں معاف کر دیں گے، بہر حال یہ ندامت اور توبہ ایسی چیز ہے کہ اس سے کفر تک مٹ جاتا ہے، اس واسطے

① الصحيح لمسلم، کتاب الایمان، باب کون الاسلام یهدم ما قبله و کذا الهجره والهجج ج: ۱ ص: ۳۰۴
رقم: ۱۷۳۔ ② السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر التوبه ج: ۱۲ ص: ۳۰۱ رقم: ۴۲۴۰۔

فرمایا گیا کہ باغ والوں کی مثال سامنے رکھو کہ انہوں نے جب سرکشی کی تو اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ باغ جڑ بنیاد سے ختم ہو گیا، اور جب کہا ﴿إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ﴾ ہم اللہ کی طرف جھک رہے ہیں، ہم نے سرکشی کی ہم اس سے توبہ کرتے ہیں اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ انہیں باغ حیوان دے دیا گیا۔

بغاوت اور توبہ کے ثمرات تو اے مشرکین مکہ! آج تک تم بغاوت کر رہے ہو اس کا ثمرہ بھی تمہارے سامنے آ گیا کہ غزوہ بدر کے اندر تمہارے بڑے بڑے سردار قتل ہو گئے، فتح مکہ کے اندر سب کے گھروں پر تالے پڑ گئے، یعنی ان کی ریاستیں ختم ہو گئیں اور جنہوں نے توبہ کر لی اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کوئی امیر المومنین بنا، کوئی خالد سیف اللہ بنا، کوئی ابوتراب بنا، کوئی ذی النورین بنا، حق تعالیٰ کی حکومت سے خطابات دیئے گئے۔ اس کا بھی ثمرہ سامنے آیا، تو دونوں چیزیں سامنے رکھو اور اس واقعہ سے عبرت پکڑو اور اس سرکشی کو ترک کرو، اس واقعہ پر جن کی قسمت میں سعادت تھی وہ تابہ ہو گئے، جن کی قسمت میں نہیں تھی، وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے دعا کیجئے حق تعالیٰ توفیق عمل عطا فرمائے۔

مشرکین مکہ کو تنبیہ..... ﴿كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ أَكْبَرُ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ لِّلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِيمِ ۝ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بِاللَّغَةِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَمَةِ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝ سَلِّمُوا إِلَيْهِمْ بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ۝ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ ۝ إِنْ كَانُوا اصْدَاقِينَ ۝ يَوْمَ يَكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهُقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ﴾

بزرگان محترم! جیسا کہ آپ معلوم کر چکے ہیں حق تعالیٰ شانہ نے مشرکین مکہ کو عبرت دلانے کے لئے باغ والوں کی ایک مثال بیان فرمائی اور جو کچھ سانحہ گذرا تھا وہ ارشاد فرمایا کہ اس طرح سے ان پر آ کر آفت پڑی، اور پھر یہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے، تو انہیں نعم البدل دے دیا گیا، تو یہ مثال عبرت کے لئے ان کے سامنے پیش کی گئی کہ تم بھی اسی حالت میں ہو جیسے اصحاب الجحیم تھے، تم پر ایک مصیبت آنے والی ہے، یعنی یوم بدر آنے والا ہے، اس میں تمہارے سردار قتل ہو گئے تمہاری طاقت ٹوٹ جائے گی، قحط سالی آنے والی ہے جس کے اندر تم کئی برس تک بتلا رہو گے یہ ساری آفتیں آئیں گی، اگر تم نے ان آفات سے عبرت پکڑ لی اور اللہ کی طرف رجوع کیا پھر اس کے بعد بہترین ثمرہ بھی اسی طرح آئے گا جس طرح باغ والوں کے لئے آیا۔

اس واقعہ کو بیان فرما کر بطور نتیجہ کے حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: ﴿كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ کہ آفت یا مصیبت اسی طرح آیا کرتی ہے کہ اچانک آپڑتی ہے، آفت یا مصیبت دستک دے کر نہیں آیا کرتی کہ وہ پہلے دروازے پر آ کر اطلاع دے اور دو چار دن پہلے سے تیار کرے، وہ عذاب ہی کیا ہو جس کی استعداد پہلے سے تیار

کی جائے، اس طرح تو آدمی سنبھل جاتا ہے کہ مجھے مصیبت کے لئے تیار ہونا ہے، تو مصیبت حقیقت میں وہی ہوتی ہے جو اچانک آتی ہے، اور آفات کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اچانک ہی آتی ہیں، چنانچہ سب آفتوں کی جڑ بنیاد موت ہے تو وہ بھی اچانک آتی ہے، پہلے سے کسی کو کوئی اطلاع نہیں ہوتی، بالفرض اگر کوئی بیمار بھی ہو، بہت شدید بیمار ہو جائے اور مایوس بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہوتا ہے کہ موت قریب ہے مجھ سے کوئی دور نہیں ہے، لیکن یہ کہ کب آجائے گی؟ جب آئے گی تو اچانک ہی آئے گی بغتہ ہی آتی ہے۔

قلبی قساوت کا انجام بد..... اور دنیوی مصائب تو اچانک ہی آتے ہیں، جب اقوام اور افراد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تمام وسائل دنیا ہمارے ہاتھ میں آگئے ہیں اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم پر آفت آئے، انہی پر زیادہ آتی ہے اور اچانک آتی ہے، اس وقت حیرت زدہ ہوتے ہیں کہ یہ کدھر سے آگئی، جس کا نقشہ بھی قرآن کریم نے ایک جگہ کھینچا ہے، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاتَّخَذْتَهُم بِالْبُحْبُوحَةِ وَالضَّرَآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ﴾ آپ سے پہلے ہم نے دنیا کی اقوام کو جانچا، ان میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھیجے، اپنا قانون بھیجا تا کہ وہ اس پر چلیں، جب وہ نہ چلے، خلاف ورزیاں کیں اور فطرت کے خلاف چلے مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو پھر ہم نے ڈرانے والے بھیجے کچھ آفات بھیجیں، تا کہ وہ سنبھلیں، کبھی مصیبتیں اور کبھی خوفناک چیزیں بھیج کر ان کو متنبہ کرنا چاہا، تا کہ وہ ہماری طرف رجوع کر لیں تضرع زاری، اللہ کی طرف جھکنا اور عجز و انکسار پیدا کریں لیکن ایسا نہ ہوا ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ﴾ آگے بطور شکایت فرماتے ہیں ﴿فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا﴾ آخر ایسا کیوں نہ ہوا؟ جب ہم نے آفت بھیجی تو وہ سمجھ جاتے؟ آفت کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ آدمی کے اندر رجوع الی اللہ پیدا کرتی ہے، بہت ہی کوئی قساوتِ قلب رکھتا ہو کہ اس پر آفتوں پر آفتیں آئیں پھر بھی اس میں رجوع الی اللہ پیدا نہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کا قلب دنیوی مسائل اور اسباب کے ساتھ انک چکا ہے، مستبب الاسباب کی طرف رجوع رہا ہی نہیں، مصائب اور خوفناک مسائل پیش آنے کے باوجود یہ لوگ کیوں نہ جھکے؟ ﴿وَلَكِنَّ قُلُوبَهُمْ﴾ ان کے دلوں میں سختی پیدا ہو گئی تھی، یہ جودل میں نرمائی اور دل میں رقت ہوتی ہے جس سے آدمی اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے وہ مادہ ہی ان میں باقی نہیں رہا وہ استعداد ہی انہوں نے فنا کر دی۔ ﴿وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ اور جو کچھ ان کی خرافات اور اعمال تھے، وہ شیطان نے کچھ ایسے مژین کر دیئے کہ اسی میں الجھ کر رہ گئے کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یہی اسباب ہیں تو یہ بھی ہمارے قبضے میں ہیں اور ہمارے پاس سارے جمع ہیں۔ لیکن فرماتے ہیں ﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ جو کچھ انہیں نصیحتیں کی گئیں عبرتیں دلائی گئیں، وہ سب کچھ وہ بھلا چکے تو ہم نے بھی پھر راحتوں اور آسائشوں کے دروازے کھول دیئے، کہ اچھا چلو کہاں تک چلتے ہو، اور جب دروازے کھل گئے تو انہوں نے دنیا اور اسباب دنیا پر مزید اطمینان کر لیا کہ اب تو ساری چیزیں ہمارے قبضے میں آگئیں، وسائلِ رزق

ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائلِ نقل و حمل بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائلِ علم و خبر بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں جس کو جو چاہیں ہم اطلاع پہنچائیں، دوسری کوئی اطلاع دی نہیں جاسکتی کہ پبلک میں بدگمانیاں پیدا ہوں، اسی طرح وسائلِ حمل و نقل بھی کہ ہم ہی سوار یوں پر لے جاسکتے ہیں، ہمارے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے حتیٰ کہ پبلک کی روشنی اور پانی بھی ہمارے قبضے میں ہے، جب چاہیں اندھیرا کر دیں اور جب چاہیں پانی بند کر دیں، تو ہم تمام وسائلِ دنیا پہ قابض ہیں، اب آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟ آفتوں کے دروازے تو ہم نے بند کر دیئے ہیں تو فرمایا:

﴿حَتَّىٰ إِذَا فَرَخُوا بِمَدًى أُولُواْ تُرَابًا مَّضًى﴾ جب وہ مطمئن ہو جاتے ہیں، اتراہٹ میں آ جاتے ہیں کہ اب سب کچھ قبضہ میں آ گیا۔ ﴿أَخَذْنَاهُم بِغَفْطَةٍ﴾ اچانک ہماری مصیبت کا بچہ ان کے سروں پر گر جاتا ہے۔ ﴿فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ﴾ اب حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آن پڑی؟ ہم نے تو چار طرف سے راستے بند کر دیئے تھے اور پوری طرح ناکہ بندی کر دی تھی پھر آفت کہاں سے آئی۔ اب حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

ظلم کا انجام..... اب کمیشن بیٹھے ہیں کہ اسباب پر غور کیا جائے کہ کہاں سے یہ صورت پیدا ہوئی، اگر عیاذِ اہل اللہ کوئی ہوائی جہاز گر گیا تو بجائے اس کے رجوع الی اللہ کر کے کمیشن بیٹھتا ہے کہ اسباب پر غور کرے کہ مشین میں کیا خرابی تھی، تو مشینوں ہی میں دل الجھا ہوا ہے اس طرف ذہن جاتا ہی نہیں کہ مشینوں سے بالاتر بھی کوئی طاقت ہے، قلوب میں سکت باقی نہیں ہے، اب بھی انہیں اسباب کے جھروکے میں گھر کر اسی پر غور کرتے ہیں، ہم اچانک مصیبت بھیجتے ہیں اور اسباب سمجھ میں نہیں آتے تو حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ①

پھر ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے، ان کا بیج باقی نہیں رہتا، نہ وہ رہتے ہیں نہ ان کی حیرت باقی رہتی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ مصیبت جب آتی ہے تو وہ اطمینان دلا کر نہیں آتی، اچانک آتی ہے لوگ مطمئن ہوتے ہیں کہ اب کوئی چیز آنے والی نہیں ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمار یوں پر ہم نے قبضہ پالیا، دوائیں ایجاد کر لیں سوار یوں پر ہم نے قبضہ پالیا، مشینیں ہمارے قبضہ میں ہیں، رزق دانے اور پھل پھول سب ہمارے قبضے میں ہیں، اب آخر آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

آفاتِ آخرت کا تذکرہ بھی نہیں..... یہ ان کے علم میں نہیں کہ آفات کا پیدا کرنے والا تمہارے سے زیادہ عالم ہے وہ تمہارے سے زیادہ راستے جانتا ہے، جیسے اس کو نعمت کا دینا آتا ہے اس کا چھیننا بھی آتا ہے، سب اسی کے قبضے میں ہے تم تھوڑے سے قبضہ پر آ کر اتراہٹ میں آ کر اپنی اصلیت کو بھی بھول گئے کہ ہم کیا تھے، اور ہماری طاقت کیا تھی ایسی قوموں کے لئے جب اچانک مصیبت آتی ہے تو جڑ کاٹ جاتی ہے، اگر اس میں کوئی سعادت مند ہے اور وہ رجوع الی اللہ کر گیا تو اس کے لئے نیک نتیجہ آ جاتا ہے، ورنہ قوم کی قوم کا اقتدار اور اس کی زندگی ختم کر دی

جاتی ہے، اسی کو فرماتے ہیں: ﴿كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ اسی طرح آفت آیا کرتی ہے، اور دنیا کی آفت جب آتی ہے تو کوئی اس کا ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو ﴿وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ﴾ پھر آخرت کا عذاب جو ہوگا تو اس کو کون ٹال سکتا ہے؟ دنیا میں انسان سوچ بچار تو کرتا ہے کہ کیا وجہ پیش آئی جو یہ مصیبت پیش آئی آخرت میں سوچ بچار کا بھی راستہ نہیں ہے وہاں براہ راست مسبب الاسباب سے واسطہ ہے وہاں اسباب نہیں ہیں، اس لئے وہاں سوچ اور فکر کا دخل نہیں ہے۔ اس واسطے عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی آفت آئے تو اس سے عبرت پکڑو اور آخرت کی آفت کو پیش نظر رکھو کہ اس کا تو کوئی تذکر بھی نہیں۔

آفات دنیا کو کم کر سکتا ہے مگر آفات آخرت کو نہیں..... یہاں کم سے کم یہ تو ہے کہ جب آفت آئے تو توبہ کا دروازہ تو بند نہیں ہے، آدمی توبہ کر کے آفت کو ٹال سکتا ہے، مگر آخرت میں تو توبہ بھی قبول نہیں وہاں نہ توبہ کا وقت ہے نہ عذاب کم کرنے کا وقت ہے اور نہ انفعال و ندامت کا وقت ہے یہ سب چیزیں یہاں کام آتی ہیں، تو کوئی سبب اس کو ٹالنے کا باقی نہیں ہوگا، اس واسطے فرمایا: ﴿وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ﴾ جب دنیا کی آفت کو کوئی ٹالنے والا نہیں باوجودیکہ رجوع کے اسباب موجود ہیں، وہاں تو یہ بھی نہیں ہوگا، عذاب بہت سخت ہوگا، یہ وقتی ہے وہ دوامی ہے، یہ تھوڑے وقت کے لئے آتا ہے، وہ ابد تک کے لئے آتا ہے، اس لئے وہ زیادہ ڈر کی چیز ہے تو دنیا کی مصیبتوں کو مٹانے کے طور پر پیش کیا گیا کہ ان سے عذاب آخرت کو سمجھو۔

دنیا کے مصائب میں بہر حال کچھ نہ کچھ اسباب موجود ہیں کہ آدمی مصیبت کو ہلکی کر سکتا ہے، اور ارباب باطن نے ادھر توجہ دلائی ہے کہ اگر آدمی غور کرے تو مصیبتوں کو ہلکا کرنے کی صورتیں ہیں۔ مصیبت ٹالنے کے لئے حضرت علیؑ کی تدبیر..... چنانچہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ایک جملہ فرمایا جس سے مصیبت بڑی ہلکی ہو سکتی ہے، فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے، تدبیر کئے جاؤ مگر اتنی جدوجہد نہ کرو کہ آج ہی اسے ٹال دیں، وہ تو اپنے وقت پر ہی جا کے ٹلے گی، تسلی کے لئے کچھ تدبیر کرنا اسباب فراہم کرنا درست ہے، مگر اتنی جلدی کرنا کہ آج ہی ٹل جائے، اس طرح مصیبت میں الجھ کر بعض اوقات مصیبت کی عمر دراز ہو جاتی ہے اگر آدمی پر بیماری آئی ہے تو طبعی طور پر جو تدبیر ہے آدمی کر لے، لیکن بعض لوگ گھبرا کر صبح کو ایک ڈاکٹر دو پہر کو دوسرا اور شام کو تیسرا، ایک طوفان باندھ دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرض الجھ کر دو دن کی بجائے ہفتہ بھر میں جاتا ہے۔ اس واسطے کہ گویا وہ تقدیر خداوندی کا مقابلہ ہوتا ہے، اگر طے شدہ ہے کہ مصیبت ہفتہ بھر کی ہے تو جو دو دن ٹلنا چاہے تو وہ ہفتہ کی بجائے چودہ دن کی ہو جائے گی، اس واسطے طبعی تدابیر اختیار کر کے اللہ پر بھروسہ کرے اور اسی کی طرف رجوع کرے، تو مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

”اجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوا عَلَيْهِ“ ①

① السنن لابن ماجہ، کتاب التجارات، باب الاقتصاد فی طلب المعیشتہ ج: ۵ ص: ۳۷۸ رقم: ۲۱۳۵۔

طلب کے اندر جمال پیدا کرو، اسباب فراہم کرو مگر جمال کے ساتھ اتنا گلو اور انہماک کہ بس اسباب ہی کے بندے بن جاؤ، یہ نہیں ہونا چاہئے حکم خداوندی سمجھ کر تدبیر کے درجے میں اسباب اختیار کرو مگر ہر وسعہ حق تعالیٰ کے اوپر کرو کہ دراصل وہی ٹالنے والا ہے، اسباب ٹالنے والے نہیں ہیں، طبیب مرض کو دفع نہیں کر سکتا، اللہ ہی دفع کرے گا۔ اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا: ”الطَّبِيبُ هُوَ اللّٰهُ وَالطَّبِيبُ هُوَ الرَّفِيقُ“ طبیب محض ایک رفیق ہے، مگر حقیقت میں طبیب وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو مرض کو دور فرماتے ہیں۔ دافع امراض، حل مشکلات اور دافع مشکلات صرف حق تعالیٰ ہیں، طبیب صرف رفاقت کرتا ہے، کچھ تسلی دے دیتا ہے اور کچھ اسباب کی طرف توجہ دلا دی، لیکن وہ اسباب مرض کو دفع نہیں کرتے اس لئے کہ ان میں تاثیر رکھنے والے حق تعالیٰ شانہ ہیں، اگر وہ تاثیر کھینچ لیں تو وہ سب ہی کیا کر لے گا؟ اس لئے موثر حقیقی موثر بالذات وہ ذات باریکات حق ہے اس لئے اسباب اختیار کرو، مگر مسبب الاسباب کو مت بھولو، اطمینان ان پر نہ کرو، اطمینان اللہ کی ذات پر کرو، اس کی صورت یہی ہے کہ اسباب میں غلو اور مبالغہ کر کے مصیبت کی مدت مت بڑھاؤ!

تو حضرت علیؑ نے کیسی حکمت کی بات بتلائی کہ ہر مصیبت ایک وقت لے کر آتی ہے اور اسی وقت پہ وہ ٹلے گی، اس لئے طبعی طور پر اسباب اختیار کرو، مگر غلومت کرو، اللہ پر چھوڑ دو، تھوڑے بہت اسباب اختیار کرو، اور اللہ پر توکل کرو۔

مصیبت پر حضرت عمرؓ کا قول..... اس کے علاوہ ایک دوسری عجیب و غریب تدبیر حضرت عمر فاروقؓ نے بیان فرمائی۔ فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو پہلے یہ سوچو کہ یہ مصیبت میری دنیا پر آئی ہے یا میرے دین کے اوپر آئی ہے، آیا کوئی میرا عقیدہ بگڑا یا میرا عمل خراب ہوا، یا خدا نہ کرے میرا قلب اللہ سے منحرف ہو گیا، کوئی ایسی صورت تو نہیں ہوئی بلکہ دنیا پر مصیبت آئی فرمایا اگر یہ بات یقین میں آگئی کہ مصیبت دنیا پر آئی ہے اور دین محفوظ ہے تو اطمینان حاصل کرو کہ ایسی چیز پر مصیبت آئی کہ جو زائل ہونے والی ہی تھی بس دو دن پہلے زائل ہو گئی مال ہو فقیر ہو، غنا ہو فقیر ہو، ایک دن سب ختم ہو جانے والا ہے یہ دوائی چیز نہیں ہے۔ نہ ایک لکھ پتی کی دولت دو امانا باقی رہے گی نہ ایک فقیر کا فقر و فاقہ باقی رہے گا، یہ چند روزہ بہار ہے، اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں، تو اگر دولت پر یا جائیداد پر بنی، فرمایا اطمینان حاصل کرو، دین محفوظ ہے جو کچھ بنادینا کے اوپر بنا، اس سے ایک تسلی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

مصیبت میں بھی نعمت کا پہلو ہے..... لیکن بہر حال دین محفوظ ہے مگر دنیا تو گئی، تو اس کے بعد اس پر غور کرو کہ اگر یہ دنیا گئی تو تو نے ضرور کوئی حرکت کی ہوگی، اس کی پاداش میں یہ ایک مصیبت پڑی، تو یہ مصیبت تمہارے لئے کفارے کا ذریعہ بن رہی ہے، کہ جو پچھلے گناہ تھے اس کو مٹا رہی ہے پھر یہ مصیبت مصیبت نہ رہی یہ تو نعمت بن گئی کہ جس نے گناہوں کو مٹانا شروع کیا، روح کے اندر کا میل کچیل ختم کرنا شروع کیا، مصائب کے اندر یہی ہوتا ہے کہ جوں جوں آدمی صبر کرتا ہے ویسے ویسے اس کی روح کے اندر اخلاق کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، اور مصیبت و غفلت کا میل کچیل ٹوٹتا

ہے اور کتنا ہے پھر روح کے اندر پاکی آتی ہے تو دین تو محفوظ رہا کہ دنیا پہ مصیبت آئی اور وہ مصیبت گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ بنی تو وہ مصیبت کیا وہ تو بڑی عمدہ نعمت بن گئی جس سے میل کچیل ڈھل گیا تو یہ مصیبت نہ ہوئی بلکہ اللہ نے دھوبی لگا دیا کہ روح کو بھگو بھگو کر مار کر میل کچیل سے پاک اور صاف کر دیا تو یہ دوسری وجہ تسلی کی ہوئی۔ غرض جو مصیبت آئی تو یہ غور کرو کہ دین پر تو نہیں آئی، دنیا پہ آئی تو ایک تسلی ہوئی کہ الحمد للہ دین محفوظ ہے، اب اگر دنیا پہ آئی تو غور کرو کہ اگر آئی ہے تو گناہوں کا کفارہ بن گئی، تو یہ دوسری تسلی حاصل ہوئی، اگر چند پیسے اور چند سامان چلے بھی گئے تو جو کچھ روح کے اندر آتا ہے وہ کتنی بڑی دولت ہے کہ ایمان تازہ ہو گیا اور معصیتوں سے پاک ہو گیا۔

علم دین اور دنیوی بادشاہت کا تقابل کہتے ہیں کہ ایک بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کے پاس نہ سامان نہ کچھ زیادہ اسباب و وسائل بس پھٹے پرانے کپڑے، مگر بہر حال یہ لوگ قلوب کے بادشاہ ہوتے ہیں اور ظاہر سے مسکین نظر آتے ہیں، اس معمولی حالت میں ایک بڑے شہر سے گذر ہوا، اس زمانے میں شہر کے ارد گرد دیوار ہوتی تھی، جسے شہر پناہ کہتے تھے تو ایک بہت بھاری قلعہ تھا اور اندر شہر تھا، تو دیکھا کہ قلعے کے سارے دروازے بند ہیں، نہ اندر کی گاڑیاں باہر آرہی ہیں اور باہر ہزاروں گاڑیاں مال و اسباب سے لدی کھڑی ہیں، جو شہر میں جانے والی تھیں وہ سب رُکی کھڑی ہیں اور شہر کے دروازے چاروں طرف سے بند ہیں۔

انہوں نے پوچھا کہ اتنا بڑا شہر دن میں دروازے بند کر دیئے، تو معلوم ہوا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا بازگم ہو گیا یہ ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے شکار کرتے ہیں، اس نے کہا شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ نکل جائے، انہوں نے کہا لا حول ولاقوۃ عجیب قسم کا بادشاہ ہے کہ باز کو روکنے کے لئے دروازے بند کر رہا ہے حالانکہ وہ اڑنے والی چیز ہے اگر جال ڈلوادیتا تو خیر ایک امید بھی تھی کہ وہ اڑ نہ سکے رک جائے دروزوں پر تالے ڈلوادیئے بھلا باز کیسے رکے گا۔؟ ان کو بڑی ہنسی آئی اور عرض کیا۔

یا اللہ! آپ کے عجیب حکمت کے کارخانے ہیں اس کندہ ناتراش کو تو بادشاہ بنا دیا جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ پرندے کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے، یا دروازے بند کرنے چاہئیں، اور مجھ جیسے فاضل کو جس میں علم اور معرفت ہے، جوتیاں مچھاتے پھر رہے ہیں نہ سواری ہاتھ میں نہ وسائل ہاتھ میں نہ کوئی پوچھنے والا ہے تو آپ کی عجیب شان ہے کہ اس کندہ ناتراش کو بادشاہ بنا دیا اور مجھ جیسے فاضل کو محروم رکھا۔
جیسے وہ تلخیص والے نے کہا۔

کَمْ عَاقِلٍ عَاقِلٍ اَغَيَتْ مَذْهَبُهُ وَكَمْ جَاهِلٍ جَاهِلٍ تَلَقَّاهُ مَرْزُوقًا
هَذَا الَّذِي تَرَكَ الْاَوْهَامَ حَائِرَةً وَجَعَلَ الْعَالِمَ الْيَحْزَنُ رِزْدِيْنًا

جس کا مفہوم یہ ہے کہ بہت سے عقل مند اور دانش مند ان کو تم دیکھو گے کہ وہ بالکل مفلس قلاش اور بے وسیلہ پھر رہے ہیں جوتیاں مچھا رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، اور بہت سے جاہل جنہیں بات کرنے کی تمیز

نہیں، کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں تو دنیا کا عجیب کارخانہ ہے کہ فضلا جو تیاں چٹختے پھر رہے ہیں اور جہلاء اس طرح کمائیں اور کروڑ پتی بن جائیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ وہ چیز ہے جس نے عقلموں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ یا اللہ! تیری قدرت کہ ان عقل والوں کو کہاں پہنچا دیا اور کہاں یہ جاہل ان کو کہاں تک پہنچا دیا۔

غرض اسی طرح سے اس بزرگ کے دل میں بھی گویا ایک گونہ شکایت کا پہلو آیا، اگر چہ وہ وسوسہ کے درجے میں تھا، اس لئے کہ اہل اللہ کبھی اللہ کی شکایت نہیں کرتے تو تحیّر کا اظہار کیا کہ یا اللہ یہ کیا بات ہے؟ کہ مجھ جیسے فاضل کی تو یہ حالت اور یہ کندہ ناتراش بادشاہ، تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ: کیا آپ اس کے لئے تیار ہو کہ اس بادشاہ کی ساری دولت ملک و مال سب چھین کر تمہیں دے دیں، اور تمہارا ایمان اور علم و معرفت چھین کر بادشاہ کو دے دیں، کیا اس سودے پر تیار ہو؟ تھڑا گئے کہ یا اللہ! نہیں، فرمایا تمہیں اتنی بڑی دولت دی ہے کہ اس دولت کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی، اور تم اس چند روزہ دولت پر حرص کرنے لگے تمہیں ایمان، علم معرفت تو کل مبر دیا، حضرات انبیاء علیہم السلام کے اخلاق دیئے، اب بھی آپ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں مفلس ہوں، مفلس وہ ہے جس کے پاس ایمان نہ ہو، یہ چند روزہ مفلس ہے دوامی مفلس وہ ہے جس کا قلب ایمان اور علم سے خالی ہو، اس لئے جس کو علم اور معرفت کی دولت دی گئی، وہ اتنی بڑی دولت ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے عفت اقلیم کی سلطنت بھی آجائے تو اس دولت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

دولتِ ایمان اور دولتِ دنیا کی تقسیم میں عدلِ خداوندی..... حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، یہ تین بزرگ ایک ہی زمانے میں گزرے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مرزا مظہر جان جانا، اور حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ تینوں بڑے پائے کے بزرگ ہیں، رنگ تینوں کے الگ الگ ہیں، تو شاہ غلام علیؒ سے ٹوک کے نواب میر خاں بیعت تھے، شاہ غلام علیؒ کے ہاں مہمان داری اتنی تھی کہ چار چار سو مہمان ایک ایک وقت میں ہوتے اور ظاہر میں نہ کوئی تجارت نہ ملازمت تھی نہ کوئی آمدنی کا ذریعہ تو نواب میر خاں نے سوچا کہ شیخ کو بڑی مصیبت پیش آتی ہوگی، مہمان داری کی کثرت ہے اور گھر میں کچھ ہے نہیں، کوئی جائیداد نہیں کوئی تجارت نہیں، گویا شیخ صاحب پر بڑا رحم آیا، تو انہوں نے اپنی ریاست کا ایک پورا ضلع اس کے بارے میں ایک پیتل کے پتے کے اوپر لکھ کر بھیجا کہ آج سے اس کو آپ کے نام کرتا ہوں یہ پورا ضلع آپ کی ملک ہے اس کی لاکھوں روپے سال کی آمدنی ہے تو آپ کے لئے مہمانداری اور ضیافت میں آسانی ہوگی، اور وہ بھی کاغذ پہ نہیں لکھ کر بلکہ پیتل کے پتے کے اوپر چٹنگی کے ساتھ کہ آج سے یہ پورا ضلع میں نے آپ کے حوالے کر دیا، حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس یہ پتہ پہنچا، تو نواب صاحب تو یہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے بہت بڑی چیز پیش کی ہے اور حضرت شاہ غلام علیؒ کے تو گویا جان میں جان آجائے گی کہ اس نے بڑے وقت پہ خبر گیری کی کہ میرے مہمان تھے یہ مصیبت پڑتی تھی ایک ضلع دے دیا تو اب آسانی سے مہمانوں کی مدارات کروں گا، تو یہ اپنے ذہن میں سوچ رہے تھے۔ لیکن جب یہ

پیتل کا پتہ پہنچا تو اسی وقت اسی پیتل کے پتے کی پشت پر جواب لکھا اور شعر لکھ کر بھیج دیا، نہ القاب و آداب نہ محبت و کثریہ کہ آپ نے لاکھوں روپے کی مالیت کا ضلع دیا، کچھ نہیں صرف ایک شعر لکھ کر بھیج دیا وہ شعر کیا تھا؟

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے، میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقرر ہے جو آسمان سے آرہی ہے، تیرے ضلع کے ہم محتاج نہیں ہیں یہ قناعت ہے، تو یہ دولت اتنی ہے کہ اتنی بڑی مالیت کا ضلع وہ قوت نہیں رکھتا تھا جو صبر و توکل توجہ الی اللہ اور اللہ پر بھروسہ میں ہے، سارے اعتماد کی جڑ بنیاد تو ہاتھ میں ہے اور کیا نعمت چاہئے؟

بہر حال حق تعالیٰ کے ہاتھ عدل ہے کسی کو دولت ایمان اور دولت علم دیتے ہیں، وہاں دولت دنیا کم دیتے ہیں اور جہاں دولت دنیا زیادہ ہوتی ہے وہاں ان دولتوں کی کمی ہوتی ہے، ایک تو کفار ہیں ان کی بات نہیں ایمان والوں میں ہی جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے تو طبعی طور پر ہی ایمانی اور علمی قوت کم ہوتی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ساری توجہ تو اسی کے بڑھانے کی طرف رہتی ہے ایمان و علم کی طرف توجہ کم ہوتی ہے تو طبعاً یہ چیز گھٹ جاتی ہے اور وہ بڑھ جاتی ہے اور جن کو علم دیا جاتا ہے ان کی ساری توجہ علم کے بڑھانے کی طرف ہوتی ہے، انہیں دنیا بڑھانے کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔؟ تو صورت یہ کہ ان کی دنیا کے لئے تو حق تعالیٰ دلوں میں ڈالتے ہیں کہ لوگ ان کی خدمت کریں اور ان کے دلوں میں غیرت ایمانی کی کمی ہے تو اہل علم کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ اپنے علم سے ان کی خدمت کریں، تو دونوں کے لئے کچھ سہارے لگا دیئے ہیں، مگر یہ طبعی چیز ہے، کہ اگر ادھر کی دولت زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے، ادھر کی زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے جامع ہستیاں کم ہیں کہ علم بھی پورے کا پورا اور دولت بھی پوری کی پوری مالدار بھی بہت اور عالم بھی بہت ایسے افراد گئے چنے ہیں ورنہ عام طور پر یہی ہے کہ دولت دین زیادہ تو دولت دنیا کم ہے، اور دولت دنیا زیادہ تو دولت دین کم، دونوں چیزیں ترازو کے پلے کی طرح سے ہیں، ایک جھکتا ہے تو دوسرا اونچا ہو جاتا ہے، دوسرا جھکا تو ادھر کا اٹھ گیا، حاصل یہ نکلا دولت ایمان بہت بڑی دولت ہے، توکل صبر و قناعت حق تعالیٰ جس کو دے دیں یہ عظیم نعمت ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسری دولت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حق تعالیٰ پر بھروسہ کر لیتا ہے تو: ”اَتَتْ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ“ ① دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی ذلیل بن کر اس کے قدموں میں آکر گر جاتی ہے، خود بخود آتی ہے وہ دھکے بھی دے تب بھی وہ آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے کام بھی پورے کر دیتا ہے، چنانچہ وعدہ خداوندی ہے: ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ ② جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، تو اللہ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے وہ اس کا کام بنادیتا ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے ”مَنْ أَصْلَحَ فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللَّهِ أَصْلَحَ اللَّهُ فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْخَلْقِ“ ③ جو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا معاملہ صاف اور سچا کرے، تو

① السنن لابن ماجہ، کتاب الزہد، باب الہم بالدنیا ج: ۱۲ ص: ۱۲۸ رقم: ۴۰۹۵۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ: الطلاق،

الآیۃ: ۳۔ ③ کنز العمال، الدلیلی، عن قدامۃ بن عبد اللہ بن عمار رجل له صحبۃ ج: ۱۵ ص: ۹۸ رقم: ۴۳۱۶۶۔

اللہ اس کے اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ سچا کر دیتا ہے، اس کے معاملات صحیح ہوتے ہیں، اگر کہیں پھنس جاتا ہے تو غیب سے اس کے لئے مخرج پیدا ہو جاتا ہے اور راہیں نکل آتی ہیں، حاصل یہ نکلا کہ اصل تو دولت دین کو سمجھا جائے، اس کو مقصود زندگی بنائے اور دنیا کو بھی کمایا جائے اس لئے کہ حکم ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھو، بس اولیت اور ثانویت کے درجے کا فرق ہو، اولیت دولت دین کو حاصل ہو اور ثانوی درجہ دولت دنیا کو ہو، دونوں چیزیں رہیں گی کسی وقت بھی آدمی محروم نہیں رہے گا، اب جتنا جس کی قسمت میں ہے اس کا مقدار اس کو مل جائے گا، تو خلاصہ یہ نکلا کہ آفت یا مصیبت اچانک آتی ہے، وہ اطلاع دے کر نہیں آتی، اس وقت کوئی ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی مصیبت کا ٹالنے والا کوئی نہیں، اللہ ہی ٹالے تو ٹال سکتا ہے، تو آخرت کی مصیبت کو تو کوئی ٹالنے والا ہے ہی نہیں، صرف اللہ کی ذات ہے وہی ٹالے تو ٹال سکتی ہے، اس لئے اس سے عبرت پکڑیں، مگر فرماتے ہیں ﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ کاش کہ یہ جاہل جانتے، مگر یہ تو ادرہ دل لگاتے ہی نہیں کہ یہ کوئی اصول کی بات سمجھیں، یہ تو عناد، تعصب، برائی اور نبی کے مقابلے میں ہیں کہ کسی طرح انہیں نچا دکھاؤ، نہ انہیں عقل سے تعلق نہ علم سے تعلق نہ بات کو سمجھیں۔ ﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ کاش کہ یہ جانتے۔

مطیع و باغی برابر نہیں ہو سکتے..... اور اگر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو اوندھی سمجھتے ہیں، ہر سیدھی بات کو الٹا کر کے سمجھیں گے ایسا سمجھا تو کیا سمجھا؟ گویا عجیب و غریب نتیجہ نکالا چنانچہ کہتے ہیں۔ آپ کے خدا نے باغ والوں کی مثال بیان کی ہے، اور وہ پانچ بھائی تھے، ایک نے کہا کہ دیکھو ایسا مت کرو، فقیروں کا راستہ مت بند کرو، خیرات جاری رکھو، برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے اس کی نہیں سنی، لیکن جب مصیبت آئی تو نیک مشورہ دینے والا بھی اس میں مبتلا ہوا، یہ نہیں ہوا کہ اس کا حصہ بچ گیا ہو اور باقی بھائیوں کا تلف ہوا ہو، تو نتیجہ یہ نکالا کہ ہم بھی تمہارے نبی کو نہیں مانتے تمہارے دین کو نہیں مانتے، لیکن اگر کوئی قحط وغیرہ کی مصیبت آئی تو تم بھی مبتلا ہو گے ہم بھی مبتلا ہوں گے، کوئی ہمارے دروازے کو دیکھ کر تھوڑا سی قحط آئے گا، تم بھی اس میں شریک ہو گے، تو جب ہم تم یہاں مصیبت میں شریک ہیں تو کیا فائدہ کہ ہم تمہارے رسول کے اوپر ایمان لائیں، یہاں بھی برابر وہاں بھی برابر، یہاں کی برابری آنکھ سے دیکھ لی وہاں کی برابری قیاس سے سمجھ لیں، جیسے خدا نے یہاں برابر کیا، وہاں بھی برابر ہو جائیں گے، گویا طبعی مصیبت میں اور انتقام خداوندی میں فرق کرنے کی ان کے اندر سکت ہے ہی نہیں۔

اس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تو ہدایت عقل کے خلاف ہے جو تم سوچ رہے ہو۔ اس لئے کہ مثلاً دنیا میں ایک شخص کے دو غلام ہیں، ایک سرکش ہو اور ایک مطیع ہو، تو کیا آقا ان دونوں کو برابر سمجھتا ہے، مطیع غلام کو ہمیشہ انعام دے گا اور سرکش کو ہمیشہ نچا دکھائے گا، ایک گورنمنٹ کے دو ملازم ہیں، ایک کام چور ہے اور ایک نہایت محنت سے کام کرتا ہے، ایک بغاوت کرتا ہے ایک اطاعت کرتا ہے تو کیا گورنمنٹ دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھے گی؟ جو باغی ہے اس کو سزا دیں گے، جو مطیع ہے اس کو انعامات دے گی اور ترتیبات دے گی، دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو انتقامی طور

پر مصیبت آتی ہے وہ باغی کے اوپر آتی ہے، مطیع کے اوپر نہیں آتی، زیادہ تر باغی کے اوپر آتی ہے، تو عقل اس کے اوپر شاہد ہے کہ اگر کوئی بغاوت کر رہے ہوں تو قحط اگر ان پر آئے گا تو وہ سزا ہوگی جس سے بچنا مشکل ہوگا، مطیع اگر قحط میں آئیں گے تو چونکہ اللہ پر بھروسہ ہوگا تو ہمارے دلوں میں کوئی پراگندگی یا تشویش نہیں ہوگی، چند دن کے بعد وہ رفع ہو جائے گا اور جب تک رہے گا ہمارے دلوں میں کوئی تشویش نہیں ہوگی اور تم مرنے سے پہلے ہی مر جاؤ گے، جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے اس پر اگر مصیبت آتی بھی ہے تو اس کے دل میں پراگندگی نہیں ہوتی حق تعالیٰ پر مطمئن رہتا ہے کہ یہ چند روزہ ہے، فاسق اور طرد مرنے سے پہلے مر جاتا ہے اسلئے کہ اس کا بھروسہ ہی اسباب کے اوپر ہوتا ہے، اور اسباب کے درجے میں راحت کی کوئی چیز نہیں ہے، غرض یہ فرق رہتا ہے کہ ایک چیز آفت کی مطیع پر بھی آتی ہے، اور باغی پر بھی مطیع اپنی اطاعت کی وجہ سے مطمئن القلب ہوتا ہے اور باغی اپنی بغاوت کی وجہ سے ہر وقت پراگندہ قلب رہتا ہے، اور مصیبت نام دل کی پراگندگی کا ہے اسباب مصیبت کا نام مصیبت نہیں ہے دل میں پریشانی کا اثر ہو یہ مصیبت ہے، کوئی آفت آجائے تو مومن کے دل میں کبھی پریشانی نہیں ہوگی، اس کی نگاہ اللہ پر ہوگی، اور طرد کا دل کبھی مطمئن نہیں ہوگا اس کی نگاہ اسباب پر ہے اور اسباب کے درجہ میں مصیبت آگئی ہے، فرمایا کہ یہ ہدایت عقل کے خلاف ہے جو تم نے نتیجہ نکالا مطیع اور باغی برابر نہیں ہو سکتے اسی کو فرمایا: ﴿وَأَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ﴾ کیا ہم مسلمین کو مجرمین کے برابر کر دیں گے، جو ہمارے ماننے والے ہیں اور جو ہمارے باغی ہیں کیا ان کو ایک درجہ میں رکھیں گے؟ ﴿مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ تمہیں ہوا کیا ہے تم کیسا حکم لگا رہے ہو عقل کے خلاف، فراست کے خلاف اور فطرت کے بھی خلاف، تو ایک جواب تو عقلی دے دیا۔

دنیا میں اجتماعی عذاب کے باوجود آخرت میں مومن و کافر کا فرق ہوگا..... اس کے بعد ممکن تھا وہ یہ کہتے کہ صاحب! عقلاً تو چاہے یہی جواب ہے مگر نقل تو یہی بتاتی ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مصیبت آتی ہے تو سب پر یکساں ہی آتی ہے اور جب یہاں یکساں ہے تو آخرت میں بھی جب مصیبت آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی؟ وہاں بھی برابر ہو گئے۔ اس کا جواب آگے دیا کہ یہ جو تم عقل کو چھوڑ کر نقل لے رہے ہو تو فرمایا ﴿وَأَمَّا لَكُمْ كَيْفَ تَقْدِرُونَ﴾ یہ تم نے جو نقلی روایت بیان کی کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے یا پچھلے ادیان کا کوئی نوشتہ تمہارے پاس رکھا ہوا ہے؟ جس میں دیکھ کر تم نے دعویٰ کیا کہ قیامت میں مسلم اور مجرم برابر ہو جائیں گے، عقلاً تو برابر نہیں ہوتے، اب تم نقل کا دعویٰ پیش کرتے ہو؟ تو کوئی کتاب دکھاؤ کوئی آسمانی نوشتہ دکھاؤ، جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ اللہ کے ہاں مطیع اور باغی دونوں برابر ہوتے ہیں، دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈال جاؤ، کیا حضرت موسیٰ اور فرعون کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجے میں رکھا، موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور فرعون کو غرق کیا، کیا حضرت ابراہیم اور نمرود کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجہ میں رکھا، نمرود کو گھجر سے پٹوا دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام بنادیا، غرض حق تعالیٰ نے ہر زمانے میں مطیع اور مجرم دونوں کو یکساں نہیں رکھا، مطیعوں کو سر بلند کیا اور مجرموں کو سزائیں

دیں، لیکن اگر تم کہتے ہو کہ مطیع و باغی کو اللہ نے یکساں کیا تو یہ تمہارے پاس کہاں سے خبر آئی؟ کوئی وحی آئی، کوئی کتاب آئی؟ ﴿إِنَّمَا لَكُمْ فِيهِ نَذْرٌ مِّنْكُمْ﴾ کوئی کتاب ہے جس کا تم درس دے رہے ہو؟ اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر کوئی الہام آ گیا ہے۔ ﴿إِن لَّكُمْ فِيهِ لَمَّا تَخَيَّرُون﴾ اس کتاب میں لکھا ہوگا کہ جو تم چاہتے رہو گے وہی ہوتا رہے گا، جو تم اٹھے سیدھے اصول بیان کر دو گے وہی کتاب میں نکلتا رہے گا کیا ہے ایسی کوئی کتاب؟ نہیں ہے تو نہ تمہاری بات کو عقل تسلیم کرتی ہے نہ نقل تسلیم کرتی ہے۔ ﴿إِنَّمَا لَكُمْ آيْمَانٌ عَلَيْنَا بِالْعَقَّةِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ اچھا اگر نوشتہ نہیں ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تمہیں آخرت میں مصیبت کے اندر برابر کر دے گا، تو کیا اللہ نے کوئی قسم کھا رکھی ہے کہ اگر دنیا میں تم پر قسط بھیجے تو آخرت میں بھی سب پر یکساں مصیبت بھیجے گا؟ کیا ہم نے کوئی حلف اٹھایا ہے کہ قیامت تک اور اس کے بعد تک یہ حالت رکھیں گے، دنیا کے اندر جب ہم نے قسط اتارا تو مصلحتاً مسلم اور مجرم دونوں کو برابر کیا، طاعون آیا تو سب کے اوپر آیا، لیکن کیا اللہ نے یہ عہد کیا ہے کہ قیامت میں بھی یہی صورت رہے گی، صاف صاف فرمادیا کہ اگر وہابی امراض میں برابر سراسر مریں تو ظاہر میں سب مر رہے ہیں، مگر آخرت میں سب کے درجات الگ الگ ہیں، ایک مقبول ہے اور ایک غیر مقبول ہے ایک پر طاعون آتا ہے وہ شہید ہوتا ہے اور ایک پر طاعون آتا ہے تو وہ معذب ہوتا ہے، تو کفار کے حق میں طاعون عذاب ہے، اور مومن کے حق میں شہادت اور ترقی درجات کا ذریعہ ہے، تو یہ اندازہ تم نے کہاں سے لگایا کہ اگر ہم نے انہیں دنیا میں بیماری میں برابر کر دیا تو نتائج میں بھی برابر کر دیں گے آخرت میں مطیع اور مجرم میں کوئی فرق نہیں رہے گا، کوئی حلف اور کوئی نوشتہ دکھلاؤ یا ہم نے تمہارے سامنے کوئی قسم کھائی ہو تو اسے دکھلاؤ۔

اخذ نتائج میں غلطی..... اچھا اگر یہ نہیں (یعنی حلف اور نوشتہ نہیں) یہ جو تمہارے شرکاء ہیں جن کو تم اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک کرتے ہو، یہ جو تم نے بت رکھے ہوئے ہیں جن کو تم نے کرتا دھرتا مان رکھا ہے اور سارے عالم کی باگ دوڑ انہیں دے رکھی ہے، ذرا ان سے پوچھ لیں یہی جواب دے دیں کہ انہوں نے تمہارے کان میں کوئی بات کہہ دی، ان میں بولنے کی طاقت نہیں ان میں سننے کی طاقت نہیں، کل یہ پتھر پڑے ہوئے تھے، تم نے خود ہی آج ان کو گھڑ گھڑا کے رکھ لیا، آج خدا بنالیا، تو کیا خدا بن گئے؟ اور سارے جہاں کی باگ دوڑ کے مالک ہو گئے؟ اگرچہ ایسا نہیں ہے، لیکن بہر حال تم نے انہیں خدا کا شریک ٹھہرایا ہے تو چلو انہیں سے پوچھ لو، کیا انہوں نے تمہارے دماغ میں ٹھونس دیا ہے کہ قیامت میں جا کے دونوں (مسلم، مجرم) برابر رہیں گے؟ اگر دنیا کی مصیبت یا دواء میں مومن و کافر مشترک ہو گئے تو آخرت میں بھی برابر ہوں گے؟ اسی کو فرمایا: اپنے ان شریکوں کو ہمارے سامنے لے آؤ، خدا کے مقابلے میں لاکھ پیش کر دیا اپنا دعویٰ ثابت کریں۔ ﴿سَلِّمُوا إِلَيْهِمْ بِذَلِكَ﴾ تم میں سے جو اس کا لیڈر بننا چاہے اسے بنا کے ساتھ لے آئے، لات ہو یا غزنی ہو یا کوئی بڑے سے بڑا ہو، اگر سب نہ آئیں تو ایک وکیل بن جائے اور آکر اپنا دعویٰ ثابت کرے۔

الغرض یہ کہ جو تم دعویٰ کر رہے ہو اس باغ والے قصے سے تم نے انسا سمجھا تو نہ تو عقل اس کا ساتھ دیتی ہے نہ نقل اس کا ساتھ دیتی ہے، نہ یہ شر کا ہی زعم بن کے آگے آتے ہیں، نہ ہم نے تمہارے سامنے کوئی حلف ہی اٹھایا ہے، پھر آخر حجت کیا ہے؟

قرآن کریم اصولی کتاب ہے وہ نہ کسی چیز کو بلا حجت منوانا چاہتا ہے نہ خود بلا حجت کچھ ماننا ہے اس لئے جو دعویٰ کیا اس کے لئے دلائل پیش کئے، اور اگر کوئی دوسرا دعویٰ کرے تو فرماتے ہیں: ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ ① کوئی حجت اور دلیل عقل سے نقل سے، تاریخ سے لاؤ، کسی دلیل سے آپ نے کوئی معقول دعویٰ ثابت کیا تو ہم مان لیں گے، دعوے کی پشت پر نہ تو عقل ہو تاریخ ہو نہ کوئی زعم اور لیڈر ہو جو دعوے کی ذمہ داری لے کہ میں دعوے کو ثابت کروں گا، آخر اس دعوے کو کیوں مانا جائے؟ دعوے کے لئے ماننے کی چیز دلیل ہوتی ہے جو دعوے کو منواتی ہے نہ نقل نہ عقل بلا دلیل دعویٰ ماننے کو کوئی تیار نہیں کوئی آدمی دعویٰ کر دے کہ ساری بمبئی کا میں مالک ہوں، اس سے پوچھا جائے گا کہ بھائی کیا وجہ ہے کوئی دلیل بھی ہے؟ کوئی پرچہ اور دستاویز لکھی ہوئی ہے کہ پچھلے لوگ کہہ گئے ہیں کہ تم بمبئی کے مالک بنادیئے جاؤ گے تو کہتا ہے کہ نہیں ان میں سے تو کوئی بات نہیں بس میں کہتا ہوں تو کہا جائے گا کہ تو کیا چیز ہے جو تو کہتا ہے تیرے تخیل میں اگر آگیا کہ میں ساری دنیا کا مالک ہوں بس ہو گیا مالک، نہیں بلکہ حجت اور دلیل مانگی جائے گی جب دلیل نہیں تو دعویٰ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔

تو یہاں تک گویا یہ واضح فرمایا گیا کہ ان کفار میں تو عقل ہے نہیں، کہ واقعات اور حوادث کو دیکھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں، اگر ان پر غور کرنے کو کہا تو اٹلے نتائج نکالنے شروع کر دیئے اور وہ بھی اپنی ہی من مانی کی اور بات آگے چلا دی کہ صاحب جب باغ والے واقعہ میں سب برابر ہو گئے وہ بھی برابر ہو گیا جس نے کہا تھا کہ فقیروں کے راستے مت روکو، اس کا بھی حصہ گیا ورنہ ان کا بھی جو فقیروں کے راستے بند کرتے تھے، تو ایسے ہی اگر دنیا کا ہمارا حصہ قحط میں جائے گا تو تمہارا بھی جائے گا، جب دنیا میں یہ ہوا تو آخرت میں بھی ہم تم برابر ہیں، اگر مصیبت آئی تو نتائج میں سب شریک رہیں گے، اس کا اللہ تبارک و تعالیٰ نے رد کر دیا کہ اگر دنیا میں کبھی مصائب میں سب یکساں نہیں ہوتے، مومن کے قلب کو ایمان اور توکل کی وجہ سے ایک ڈھارس رہتی ہے مصیبتیں آ جاتی ہیں تو وہ اثر نہیں لیتا، جبکہ ملحد کے قلب کے اندر ہر وقت تشویش اور پراگندگی رہتی ہے تو مصیبت کے اندر یہاں بھی برابر نہیں بھلا آخرت کے اندر تو کیا برابر ہوں گے، اور اگر کوئی دعویٰ کرتے ہو تو دلیل لاؤ، دلیل ہے نہیں، لہذا تمہارا دعویٰ نامعقول ہے، اس لئے بات وہی رہی کہ حوادث سے عبرت پکرو، اس سے اپنے حالات درست کرو، ان کو دیکھ کر سمجھو کہ یہ منجانب اللہ واعظ ہیں اور نصیحتیں ہیں جو منجانب اللہ کی جارہی ہیں تاکہ اپنا مستقبل درست کریں۔

ہرگز ہ کا تغیر کسی جا بر قوت کی نشاندہی کرتا ہے..... حق تعالیٰ شانہ نے جیسے وہ واعظ مقرر کئے ہیں جو زبان

سے وعظ کہتے ہیں، اسی طرح سے کائنات کے ذرے ذرے کو واعظ بنا دیا ہے، ہر چیز میں انقلاب اور تغیر ہے وہ زبان حال سے پکار رہی ہے کہ کوئی چیز یہاں برقرار نہیں ہے، کسی چیز کو ثبات نہیں آفتاب جیسی بڑی چیز جس کو لوگوں نے خدا تک کہہ دیا ہے، ایک دم چمکا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ عروج والا کوئی نہیں ہے اور زوال کے بعد جب بجھنا شروع ہوتا ہے تو مغرب تک اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے، تو تہلا دیا جاتا ہے کہ اتنا عظیم کرہ بھی اپنے آپ میں نہیں اس کے اوپر کوئی جابر طاقت ہے جس نے مجبور کی طرح اسے نچا رکھا ہے یہی حالت چاند اور ستاروں کی ہے یہی زمین کی کہ کبھی دن ہے کبھی رات ہے کبھی دکھ ہے کبھی سکھ ہے کبھی بیماری کبھی صحت ہے، کبھی غربت ہے کبھی امارت ہے تو عالم یکساں نہیں رہتا کوئی چیز برقرار نہیں ہے تو نہ کوئی دولت والا اس گھمنڈ میں رہے کہ بس یہ تو برقرار ہی رہے گی نہ غربت والا اس مایوسی میں رہے کہ اس کے جانے کی کوئی صورت نہیں ایک ہی صورت ہے کہ رجوع الی اللہ کرے، اللہ کی طرف سے یہ تغیرات آرہے ہیں، اس کی طرف رجوع کرے وہی راستے صحیح کرنے والا ہے یہ گویا نصیحت اور عبرت اس مضمون کے مقام سے نکلی اس کے بعد ان شاء اللہ کل بیان ہوگا، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
 إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ
 اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَذَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى
 آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ
 الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿يَوْمَ يَكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ
 تَرْهَقُهُمْ ذُلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ﴿فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهِذَا الْحَدِيثِ
 سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿

جواز شرک کی غلط تاویل بزرگان محترم! جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کو فرمایا کہ ان بتوں
 کی پرستش مت کرو، صرف ایک خدائے واحد کی پوجا کرو، اسی میں تمہاری دنیا کا بھی بھلا ہے اور آخرت میں بھی
 نجات ہے ورنہ دنیا میں بھی مصائب اور فتن ہوں گے اور آخرت میں بھی عذاب اور ہلاکت واقع ہوگی۔

اس پر انہوں نے اپنے شرک کی ایک تاویل کی، اور کہا کہ ہم تو حید کے تو قائل ہیں، باقی یہ جو ہم شرک کرتے
 ہیں اس لئے کہ یہ بت جو ہیں ان کے ذریعہ حق تعالیٰ کے کمالات کا ظہور ہو رہا ہے اس لئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو براہ
 راست دیکھ نہیں سکتے اس واسطے ہم ان محسوس خداؤں کو سامنے رکھتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے ہم اس تک پہنچ
 جائیں۔ ﴿لِيَقْرَبُوْنَا إِلَى اللّٰهِ ذُلْفَى﴾ ① کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے، تو قرب حاصل کرنے کے
 لئے ہم ان کی پوجا کرتے ہیں، اصل مقصود حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے، گویا مذہب کی بنیاد تو حید ہے، تو حید کا کسی
 درجے میں انہیں انکار نہیں تھا، تو حید کو مان کر پھر شرک کرتے تھے، مجھض اس لئے کہ یہ قرب کا ذریعہ ہے۔

شرک کی تاریخ یہ شرک سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں شروع ہوا ہے، نوح علیہ السلام کی
 قوم میں جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا، اس وقت شرک کے شروع ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ قوم نوح میں
 پانچ بزرگ اولیائے کاملین میں سے تھے، جن کے نام قرآن کریم میں ذکر کئے گئے ہیں۔

دو، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ ان بزرگوں کے پانچ نام تھے، ان کی مجالس میں لوگ بیٹھتے تھے تو اللہ یاد
 آتا تھا، وہ تو حید کی بات کرتے تھے، اللہ کی صفات اور اس کے کمالات بیان کرتے تھے، تو ان کی باتیں سن کر ان کی

مجلس سے فیضِ محبت حاصل کر کے توجہ الی اللہ پیدا ہوئی تھی، جب ان پانچوں بزرگوں کی وفات ہو گئی، تو قوم سوچ میں پڑ گئی کہ اب کس کی مجلس میں بیٹھا کریں کہ اللہ کو یاد کریں اور ذکر اللہ کے لئے کہا جائے اور اللہ کی پہچان کے لئے کہا جائے، اس فکر میں وہ مستغرق تھے، تو شیطان ایسے موقعوں کو تاکتا ہے کہ اس وقت یہ ان بزرگوں اور کابر کو یاد کر رہے ہیں کہ ان کی مجلسِ قربِ خداوندی کا ذریعہ بنتی تھی۔

اس وقت اس قوم کے جو رئیس تھے، اور بڑے تھے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ صورتِ تو اب بھی ممکن ہے اگر وہ بزرگ موجود نہیں تو ان کی تصویریں اور بت بنا کر عبادت گاہوں میں رکھ لو، وہ شکلیں دیکھ دیکھ کر تمہیں وہ بزرگ یاد آئیں گے، اور یہ اس یادداشت کا ذریعہ بن جائیں گے، اس واسطے ان کی پوجا تو نہ کریں گے مگر انہیں قرب اور توجہ کا ذریعہ بنائیں گے، اس طرح ان کی صورتیں دیکھ کر وہ مجلسیں یاد آ جائیں گی اور وہ باتیں یاد آ جائیں گی، چونکہ کوئی راہنما نہیں تھا اور ایسے موقعوں پر وساوس بہت دفعہ حالات کو خراب کر دیتے ہیں، حقیقی معنی میں جو راہِ خدا کا سالک ہو بعض اوقات اس کے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ اگر راہنما نہ ہو تو وہ شرک میں فسق اور فجور اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا، ان کے دل نے اس وسوسہ کو راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے قبول کر لیا، تو انہوں نے ان بزرگوں کی تصویریں بنالیں، اور ان کی صورتیں پتھروں پر کندا کر کے بلکہ پتھروں کو تراش کر ان کی شکلوں کے قریب کر لیا اور عبادت گاہوں میں رکھ لیا، یہ لوگ چونکہ نیک نیت تھے، اور حقیقت میں توجہ الی اللہ ہی چاہتے تھے، اس لئے ان کی موجودگی میں وہ بت توجہ کا محض ذریعہ اور واسطہ رہے، جیسے کسی تصویر کو سامنے رکھ کر آدمی اصل کو یاد کر لے، تو تصویر کی طرف توجہ نہیں ہوتی، وہ محض اصل کی طرف توجہ کا ذریعہ بنتی ہے، جب تک اس قوم کے افراد موجود رہے تو انہوں نے ان بتوں اور تصاویر کو محض توجہ الی اللہ اور توجہ الی الاکابر کا ذریعہ بنائے رکھا، لیکن جب وہ نسل گزر گئی اور اس کے بعد دوسری نسل آئی، اس کے دل میں وہ معرفت نہیں تھی، اس لئے کہ پہلی نسل تو پھر بھی بزرگوں کو دیکھی ہوئی تھی، تو ان کے دلوں میں ایک پہچان، یاد، معرفت اور عرفان کا مادہ موجود تھا اور نئی نسل میں یہ چیز تھی نہیں اس لئے ان کے دلوں میں کچھ بتوں کی عظمت بیٹھ گئی کچھ وہ اللہ کو بھی یاد کرتے تھے، لیکن بہر حال ایک مخفی سا شرک رہا، کھلا ہوا شرک نہ ہوا۔

پھر جب یہ نسل بھی گزر گئی اور تیسری نسل آئی اس میں سرے سے علم کا نشان نہیں رہا تھا، وہ صورتیں صرف سامنے رہ گئیں، اور حقیقت دلوں سے اوجھل ہو گئی تو انہوں نے انہی بتوں ہی کی پرستش شروع کر دی، کہ بس کرتا دھرتا یہی ہیں، اور انہی کے ذریعے سے ساری مرادیں پوری ہوں گی، تو انہی بتوں کے سامنے انہوں نے متیں بھی ماننا شروع کیں، نذر و نیاز بھی پیش کرنا شروع کیں، قربانیاں بھی انہی بتوں کے نام پر دینے لگے، خدا کی ذات تو بالکل اوجھل ہو گئی اور محسوس خدا سامنے رکھ لئے اور انہیں کے ہو کر رہ گئے، یہاں سے کھلا شرک شروع ہو گیا۔

اس شرک کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام بھیجے گئے، اور انہوں نے

کہا: تمہارے بزرگوں نے تو ذریعہ بنایا تھا، اس کے بعد کی نسل نے کچھ غلط ملط کر دیا، اور تیسری نسل بالکل شرک میں مبتلا ہو گئی، پھر اللہ سے دور پڑ گئے، یہی بت اللہ سے دور ہٹانے کا ذریعہ بن گئے، اب تمہاری ساری توجہ انہیں میں الجھ کر رہ گئی، اس واسطے انہیں ختم کرو، اور اصل خدا کی طرف توجہ کرو جو نفع و ضرر کا مالک ہے۔

لیکن چونکہ ایک صدی گزر گئی تھی وہ اس بت پرستی سے مانوس ہو گئے تھے، اور باپ دادا کا دین یہی بتوں کی پوجا ٹھہر گیا تھا اس لئے حضرت نوح علیہ السلام کی بات نہ مانی، ساڑھے نو سو برس تک حضرت نوح علیہ السلام نصیحت کرتے رہے، مگر قوم نے مان کر نہیں دیا، اور وہ انہیں محسوس خداؤں میں الجھ کر رہ گئے، تو یہاں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے تصویر اور بت شرک کا ذریعہ بنے ہیں۔

تصویر اسباب شرک میں سے ہے..... اس لئے شریعت اسلام نے جہاں شرک کو رد کیا وہاں اسباب شرک کو بھی ختم کیا، قوم کو سرے سے تصویر کی ممانعت کر دی اور تصویر حرام قرار دے دی، کیونکہ یہ شرک کا ذریعہ بنی ہے، تو اس کی جڑ کاٹنی چاہئے تاکہ آئندہ شرک کا ذریعہ نہ بنے، تو ممانعت فرمادی کہ تصویر نہ رکھی جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جس مکان کو ٹھہرے میں تصویر ہوگی اس میں ملائکہ رحمت داخل نہیں ہوں گے، گویا اس طرح شرک اور اسباب شرک کی جڑ کاٹی تو مشرکین مکہ کی تاویل یہی تھی جو قوم نوح کی پرانی بات تھی کہ یہ تقریب کا ذریعہ ہیں، حالانکہ یہ محض لفظوں میں بات تھی، وہ ذریعہ نہیں رہے تھے بلکہ بتوں کی ہی پوجا ہو رہی تھی اور انہی کو اصل مان لیا تھا زبان سے یہ کہتے تھے کہ یہ مظاہر ہیں کمالات الہیہ کے ظہور کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اس لئے ہم ان کو پوجتے ہیں۔

مشرکین کی دلیل تسلیم کرنے سے عابد کا وجود ختم ہو جاتا ہے..... لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ حجت بہت ہی بودی اور بہت ہی کمزور قسم کی حجت تھی، اس لئے کہ دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جو مظہر صفات خداوندی نہیں ہے، ہر چیز میں کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی وصف ظاہر ہو رہا ہے، آسمانوں کو دیکھو تو ان سے رفعت خداوندی نمایاں ہے اللہ رفیع ہے بلند و برتر ہے، اس کی بلندی کی نمائش آسمانوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے تو پھر آسمانوں کو بھی پوجنا چاہئے۔

اسی طرح سے ملائکہ علیہم السلام مظہر قدرت ہیں، حق تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ پل بھر میں جو چاہیں فرمادیں، فرشتوں میں اس قدرت کا ظہور ہو رہا ہے کہ پل بھر میں آسمان سے زمین پر زمین سے آسمان پر، پلوں میں وہ لاکھوں میل کی مسافت طے کر لیتے ہیں، تو قدرت الہیہ کا ظہور ہو رہا ہے، وہ مظاہر قدرت ہیں پھر ملائکہ کی بھی پوجا ہونی چاہئے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت ذی المعارج ہے یعنی وہ تمام چیزوں کو بتدریج چلاتے ہیں، نطفہ کو نو مہینوں میں تربیت دے کر وہ انسان بناتے ہیں، انسان کو چودہ برس میں تربیت دے کر عاقل بالغ بناتے ہیں، تو آہستہ آہستہ تدریجی طور پر کمالات کا ظہور ہے، یہ نشو و نما درختوں میں ظاہر ہوئی، غرض اللہ تعالیٰ کی تدریجی قدرت درختوں

کے ذریعے ظاہر ہو رہی ہے پھر درختوں کی بھی پوجا ہونی چاہیے۔

رحمت کو اگر دیکھا جائے تو اس کا مظہر پانی ہے کہ پانی کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی نرمی اور رحمت نمایاں ہے، تو پانی مظہر رحمت ہے، اس واسطے پانی کو بھی پوجنا چاہئے، تو دنیا کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی جو معبود نہ بن جائے، اس لئے محققین یہی لکھتے ہیں کہ یہ سارا عالم مظہر صفات ہے کسی میں کوئی صفت ظاہر ہو رہی ہے کسی میں کوئی صفت پھر تو ہر چیز قابل عبادت ہونی چاہئے، اور سب سے زیادہ قابل عبادت انسان ہونا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے جامع کمالات انسان کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہیں علم کو دیکھو تو انسان کے ذریعے ظاہر ہوا، تو انسان مظہر علم ہے، قدرت کو دیکھو تو انسان کے ذریعے قدرت بھی ظاہر ہوتی ہے، اس میں وہ قدرت نمایاں ہے کہ پتھروں اور جامد چیزوں کو اس نے مشینوں کے ذریعے سے چلتا اور پھرتا کر دیا، اس طرح سے اعلیٰ درجہ کی قدرت نمایاں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی شان مصوری بھی ہے، تو انسان تصویر بناتا ہے، تو صفت تصویر کا مظہر ہوا، غرض انسان کمالات خداوندی کا جامع ہے، علم قدرت حیات ارادہ اور مشیت وغیرہ، یہ سب انسان کے ذریعے ظاہر ہو رہا ہے اس لئے سب سے زیادہ معبود بننے کے لائق تو انسان ہی ہوا، اور جب انسان کی جنس معبود بن گئی تو عابد کون بنے گا؟ ظاہر ہے کہ درخت تو عبادت نہیں کر سکتے، پتھر عبادت نہیں کر سکتے، جنات میں اتنی عقل نہیں ہے تو معبود ہی معبود رہ گیا، دنیا میں عابد کوئی بھی نہ رہا غرض یہ ایسی غلط تاویل ہے کہ اس کے تسلیم کرنے سے عبادت اتنے نہیں رہیں گے جتنے معبود بن جائیں گے اربوں کھربوں اور ہر مخلوق گویا معبود بنے گی، تو عقلی طور پر یہ انتہائی کمزور تاویل اور دلیل ہے جو وہ دیا کرتے تھے کہ ہم تو حید کے تو قائل ہیں، مگر یہ بت مظاہر ہیں، اس لئے انہیں پوج رہے ہیں۔

مظہر صفات معبود بننے کے لائق نہیں..... دوسری بات یہ ہے کہ ظاہر تو کمال ہوتا ہے وہ تو کامل ہے، مگر مظہر ہمیشہ ناقص ہوتا ہے، جیسے انسان کی روح بدن کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، مگر بدن ناقص ہے بدن کے اندر کمزوری بھی ہے، تعمیرات بھی ہیں، تبدل بھی ہے، بیماری صحت مرض نجاست طہارت سب اس بدن میں واقع ہیں تو بدن مظہر ہے اور روح ظاہر ہے، تو روح پاکیزہ ہے مگر مظہر ناقص ہے، اس لئے اگر مظاہر کی عبادت کی گئی تو ناقص کو پکارا جائے گا جن میں عیب بھی ہوں گے، جن کے اندر برائیاں بھی ہوں گی، جو کھانے پینے کے محتاج ہوں گے اور طرح طرح کی حاجت مندیاں بدن کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، تو خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، بدن والی چیز محتاج در محتاج ہوگی، اس واسطے وہ معبود بننے کے لائق نہیں، تو مظہر معبود بن ہی نہیں سکتا۔

مظہر محتاج ہے معبود نہیں..... عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کی، یہی کہہ کر کہ وہ مظہر کمالات خداوندی ہیں، حق تعالیٰ نے ایسا لفظ کہہ کر رد فرمایا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معبودیت کا رد ہو گیا فرمایا: ﴿كَانَا يَأْكُلْنَ الطَّعَامَ﴾ ① حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ صاحبہ کھانا کھایا کرتی

تھیں، ظاہر بات ہے کہ جو کھانا کھائے گا وہ اتنا محتاج ہوگا کہ وہ صرف کھانے کا نہیں بلکہ لاکھوں چیزوں کا محتاج ہوگا، اس لئے کہ دانا پانی پیدا نہیں ہو سکتا جب تک زمین نہ ہو تو آدمی زمین کا محتاج ہوا، دانہ نہیں بن سکتا جب تک بادل بارش نہ برسائیں، تو بادلوں کا محتاج ہوا، کھیتی نہیں پک سکتی جب تک سورج اپنی گرمی نہ ڈالے تو جو کھانے کا محتاج وہ سورج کا بھی محتاج ہوا، اسی طرح سے کھانے میں رطوبت نہیں پیدا ہو سکتی جب تک ہوا نہ ہو، تو کھانے کا محتاج ہو، ہوا کا محتاج ہوا، تو آگ، مٹی، ہوا، پانی، سب کا وہ محتاج ہوگا جو کھانے کا محتاج ہوگا۔

پھر کھانے کے بعد بول و براز ہے، نجاست ہے، گندگی ہے، یہ سب چیزیں نکلیں گی، ان کا بھی محتاج ہوا، ظاہر بات ہے کہ جو اتنی چیزوں کا محتاج ہو وہ خدا بن سکتا ہے! خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، ہر چیز سے بالاتر ہو، ہر چیز کا بنانے والا ہو، اور ظاہر بات ہے کہ انسان اپنا کھانا بھی بناتا ہے نہ اسے کسی چیز پر قدرت ہے، نہ اس کے اندر علم ہے یہ محتاج ہی محتاج ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے معبود بن سکتے ہیں جو کھانے پینے کے محتاج ہوں، جب کھانے کے محتاج ہوئے تو آسمان کے، زمین کے، پانی کے ان سب چیزوں کے محتاج ہوئے، غرض جو اتنا محتاج ہو وہ معبود بننے کے لائق ہے! تو ایک ہی دلیل پیش فرمائی تو مظاہر جنہیں کہا جاتا ہے وہ محتاج در محتاج ہیں، اس لئے کہ ظہور کسی بدن میں ہوگا، اور بدن کھانے کا محتاج اور جو کھانے کا محتاج وہ ہر چیز کا محتاج ہے، تو مطلب یہ کہ تمہاری یہ دلیل نہایت ناقص اور بودی دلیل ہے۔ یہ تم تو حید کا نام لے کر شرک کے اوپر پردہ ڈالتے ہو، یہ شرک تو حید بن نہیں سکتا، اس لئے تمہاری یہ دلیل غلط ہے۔

روزِ حشر انکشافِ حقائق کا دن..... آج اگر تمہاری یہ دلیل کسی جاہل کے آگے چل بھی جائے، تو قیامت کا دن آنے والا ہے جس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ سب پردے ہٹ جائیں گے، اس دن تم پھر میدان میں کھڑے رہ جاؤ گے اور واضح ہو جائے گا کہ جنہیں معبود سمجھا تھا، وہ معبودیت اور عبادت کے لائق نہ تھے وہ تو خود محتاج تھے۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ﴾ اس دن جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی، اس دن ساری حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی، قیامت کا دن وہ ہے کہ جس دن چھپی ہوئی حقیقتیں کھل جائیں گی، جو چھپے ہوئے بھید تھے اس روز وہ سامنے آجائیں گے، ہر عمل نمایاں ہو جائے گا، جو سات پردوں میں چھپا کر بھی آئے وہ سامنے آجائے گا۔ ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ﴿١﴾ ذرہ برابر خیر بھی ہے وہ بھی کھل جائے گی، ذرہ برابر شر ہے کتنے ہی اچھے پردے ڈالے ہوں وہ کھل کر سامنے آجائے گا، تو قیامت کا دن وہ ہے کہ ساری چیزیں کھل جائیں گی، بہر حال اس آیت کریمہ میں ساق کا لفظ لایا گیا۔ ساق کا لفظ یا تو حق تعالیٰ کی کوئی اصطلاح ہے، گویا اس سے ارادہ کیا گیا ہے کہ قیامت کا دن حقائق کے کھلنے کا دن ہے، پنڈلی کھول دی جائے گی تو پنڈلی سے مراد حقائق کا کھلنا ہے، ایک ساق کے یہ معنی لئے گئے ہیں۔

مراتب کجی..... دوسرے معنی ساق کے یہ ہیں کہ اس کے معنی پنڈلی کے لئے جائیں، جیسے انسان کی پنڈلی ہو اور وہ حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی کہ جب وہ اپنی پنڈلی کھول دیں گے تو اس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ واضح نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی تفسیر نہ بیان کی جائے کہ پنڈلی کھولنے کا کیا مطلب ہے۔

تو پنڈلی کھولنے کا یہ مطلب ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: آدمی جب نماز پڑھتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ درحقیقت اللہ پر ہوتی ہے گو ظاہر میں چٹائی پر ہو، تو اس کی نگاہ حق تعالیٰ کی پنڈلی پر ہوتی ہے، گو ظاہر میں چٹائی پر پڑ رہی ہو، گویا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی جو تجلیات ہیں ان میں مراتب ہیں ایک اوپر کی تجلی اور ایک نیچے کی، تو سب سے مخفی تجلی کہلاتی ہے پنڈلی کی، تجلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جب عبادت کرتا ہے تو ابتدائی تجلی اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوتی ہے، آج وہ پنڈلی نمایاں نہیں، قیامت کے دن وہ واضح ہو جائے گی۔

روز امتیاز..... اور قیامت کے دن وہ کس طرح سے واضح ہوگی، قیامت کا دن اصل میں ہر چیز میں امتیاز کر دے گا، اچھائی برائی سب کھل کے الگ الگ ہو جائے گی، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے اولین و آخرین جب میدان محشر میں جمع ہوں گے تو ایک فرشتہ ندا کرے گا: اے لوگو! دنیا میں جو جس کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے چلا جائے، یہ ایک اعلان عام کر دیا جائے گا جو جس کی عبادت کرتا تھا اس کے پیچھے چلا جائے تو جو لوگ بتوں کی عبادت کرتے تھے تو بتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے تو وہ لوگ اپنی قلبی کشش سے ادھر متوجہ ہو جائیں گے، جو چاند اور سورج کی عبادت کرتے تھے تو حدیث میں ہے کہ چاند اور سورج سامنے ہوں گے ان کا نور تو چھین لیا جائے گا، لیکن ان کے اجسام سامنے ہوں گے چونکہ عمر بھران کی طرف جھکتے رہے ہیں اس لئے اپنے قلب کی کشش سے ادھر جھک جائیں گے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے وہ اپنی قلبی کشش سے ادھر چلے جائیں گے، اور کوئی حضرت عزیر علیہ السلام کی صورت میں فرشتہ نمایاں ہوگا کچھ اس کی طرف چلیں گے، اس طرح تمام لوگ اپنے اپنے معبودوں کی طرف چلے جائیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو اللہ کو پوجتے تھے، نہ سورج کی پرستش کرتے تھے، نہ بتوں کی، نہ درختوں کی، نہ پانی کی، ایک خدائے واحد کی پوجا کرتے تھے اور اسی کے آگے جھکتے تھے وہ رہ جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کیوں اپنے معبود کے پیچھے نہیں جاتے،؟ وہ عرض کریں گے کہ جب ہمارا معبود سامنے آئے گا تو ہم اس کی طرف جائیں گے تو حق تعالیٰ نمایاں ہوں گے تجلی ڈالی جائے گی، ایک عکس نمایاں ہوگا، تو اللہ فرمائیں گے: اَنَارُ حُمْنُ میں رحمان ہوں یہ سب کہیں گے ”نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ“ عرض کریں گے تو ہمارا معبود کیوں ہو؟ ہم پناہ مانگتے ہیں۔ فرمائیں گے: تمہارے معبود کی کوئی علامت ہے؟ عرض کریں گے، ایک علامت ہے، وہ یہ کہ جب ہم سجدے کرتے تھے تو ہمارا سر اللہ تعالیٰ کے قدموں میں پڑتا تھا، اور پنڈلی سامنے ہوتی تھی، اس پنڈلی کی جب تجلی کھلے گی تب ہم سمجھیں گے کہ ہمارا معبود سامنے ہے کیونکہ عمر بھر سجدے کر کے اسی سے مناسبت پیدا کی تھی۔ وہی چیز اندر چھپی ہوئی تھی، جب وہ نمایاں ہوگی تو ہم اس کے

سامنے بھکیں گے، اس وقت حق تعالیٰ اس پنڈلی کی تجلی کو نمایاں فرمائیں گے، تو یہ سب کے سب لوگ ایک دم سجدے میں جا پڑیں گے کہ بے شک ہمارا معبود یہ ہے لیکن بہت سے وہ لوگ جو منافق تھے اور ان مسلمانوں میں شامل تھے کیونکہ وہ بھی ظاہر میں اللہ ہی کو پوجتے تھے اور سجدے کرتے تھے، لیکن چونکہ دلوں میں ایمان نہیں تھا اس لئے دنیا میں تو وہ جھک گئے لیکن وہاں ان کی کمریں تختے کی طرح سخت کر دی جائیں گی، تو وہ بجائے سجدے میں جانے کے پشت کی طرف الٹے جا پڑیں گے، تو ملائکہ علیہم السلام ان کو یہاں سے نکال دیں گے، تو مشرکین پہلے الگ ہو گئے تھے، منافقین شامل تھے، وہ اب جدا کر دیئے جائیں گے صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو واقعہ حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے تھے، اسی کو سجدہ کرتے تھے، اب صورت یہ بنے گی کہ یہ پنڈلی والی تجلی آگے آگے ہے اور یہ اربوں کھربوں مخلوق اس کے پیچھے ہے، وہ آگے آگے جا رہی ہے اور یہ مخلوق پیچھے جا رہی ہے ان کو ایسے میدان میں پہنچایا جائے گا جہاں اتنا اندھیرا ہوگا کہ وہاں چاندنی اور نورانیت کا نشان نہیں رہے گا اس وقت وہاں ایک بل قائم کیا جائے گا جس کو پل صراط کہتے ہیں، اور کہا جائے گا کہ تم جنت میں جاؤ، مگر اس پل کے اوپر سے گزرنا پڑے گا، یہ پل جہنم کے اوپر تانا ہوا ہے۔

نور ایمان کا ظہور..... اس وقت اندھیرے میں ایمانوں کا نور ظاہر ہوگا، جتنا جس درجے کا جس کا ایمان ہے وہ کھل کر سامنے آئے گا، اس کی روشنی میں لوگ راستہ طے کریں گے جس کو ایک موقع پر قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتَجَمَّعُ لَنَا نُورٌ وَلَا وَاعْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ① لوگ اپنے نور ایمان کی روشنی میں چلیں گے، گویا نور ایمان ظاہر ہوگا، دائیں بائیں آگے پیچھے وہ نور احاطہ کئے ہوئے ہوگا، اس کی روشنی میں وہ راستہ طے کریں گے، بعض کا نور اتنا شدید ہوگا جیسے عظیم پہاڑ ہوتا ہے وہ اس پل سے اس طرح گزریں گے جس طرح بجلی لمحہ بھر میں ادھر سے ادھر کوندتی ہے، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، یعنی پل بھر میں اس پل کو طے کریں گے اور یہ پل چھوٹا موٹا نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ اس پل کی مسافت پندرہ ہزار برس کی ہے، پانچ ہزار برس چڑھائی اور پانچ ہزار برس اتار اور پانچ ہزار برس برابری ہے، تو حضرات انبیاء علیہم السلام اس پل کو اس روشنی میں اتنی قوت سے طے کریں گے جیسے بجلی کوندتی ہے، اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مضبوط ایمان کس کا ہو سکتا ہے۔

اور بعض کا ایمان ایسا ہوگا جیسے عظیم الشان درخت ہوتا ہے کہ دور تک اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، یہ مخصوص اولیاء اللہ ہوں گے کہ انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں ان کا نور ایمان اتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہوگا کہ وہ اس پل کو اس طرح سے طے کریں گے جیسے ہوا کا جھونکا گزر جاتا ہے جہنم کا کوئی اثر ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بعض کا اس سے کم، بعض کا اس سے کم، حتیٰ کہ بعض کا ایسا ہوگا جیسے ناخن کے اوپر جو زراستارہ سفیدی آجاتا ہے تو اس میں وہ

ٹٹول ٹٹول کر چلیں گے، رستہ پورا دکھائی نہیں دے گا۔

پل صراط، شریعت کی صورتِ مثالی..... اور پل صراط ایسا ہوگا کہ بال سے باریک ہے اور نازک جگہ ہے اور اس کے نیچے ہوں گے کلاہ، یعنی لوہے کے آنکڑے، وہ اچھل اچھل کر پیروں میں ڈالنے کی کوشش کریں گے، جن کے پاس نور کم ہوگا نوکیلے شکنجے کی وجہ سے وہ زخمی ہوں گے اور بجائے چلنے کے وہ گھسٹتے ہوئے چلیں گے، اور ست چلیں گے، ہزار ہا ہزار برس میں جا کر راستہ طے ہوگا اور بعض کا نور اتنا کم ہوگا کہ وہ اتنے آنکڑوں کے ذریعے سے زخمی ہو جائیں گے اور راستہ طے نہیں کر سکیں گے، کٹ کر کے جہنم میں جا پڑیں گے جب تک حق تعالیٰ کو منظور ہوگا وہ اندر رہیں گے، یہ پل صراط حقیقت میں شریعت کی صورتِ مثالی ہوگی، شریعت کو ایک شکل دی جائے گی، جو یہاں شریعت پر تیز چلے ہیں وہ وہاں بھی پل صراط پر تیز چلیں گے جو یہاں ست چلے ہیں وہاں بھی ست چلیں گے اور یہ جو نیچے آنکڑے ہوں گے پیروں میں شکنجے ڈالیں گے یہ فتنوں اور خواہشاتِ نفس کی صورتِ مثالی ہوگی، نفس کی راحت کے لئے جس پر چلتے رہے تھے کسی کی نماز نہیں ہے، کسی کا روزہ نہیں ہے، کوئی زکوٰۃ نہیں دے رہا، کوئی اعتقادی وسوسہ میں گرفتار ہے کوئی مال کی زیادتی اور اضافے کے مرض میں مبتلا ہے، کوئی زکوٰۃ و صدقات سے قاصر ہے کوئی نماز نہیں پڑھتا، کوئی حج نہیں کرتا اور زکوٰۃ نہیں دیتا ہے، قلبی وسوسہ سے جاہ کی کوشش مال کی خواہش کے فتنے آنکڑوں کی صورت میں نمایاں ہوں گے تو جو یہاں ان فتنوں میں گر گئے وہ وہاں ان فتنوں میں گر جائیں گے، جنہوں نے یہاں راستہ صحیح طے نہیں کیا وہاں بھی راستہ طے نہیں کر سکیں گے، یہ تو جہنم میں شریک تھے ادھر جھکا تو جہنم، ادھر جھکا تو جہنم، تو سامنے جنت کا راستہ ہے، بہر حال اس طرح سے مشرک پہلے الگ کر دیئے جائیں گے، منافق بعد میں الگ کر دیئے جائیں گے، اب مومن رہ جائیں گے ان کے درجات الگ الگ ہو جائیں گے، کامل الایمان جو ہیں، وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو ضعیف الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو بالکل ناقص الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے تو ہر چیز الگ الگ ہو جائے گی، ہر ایک کا رتبہ و درجہ اس پر واضح کر دیا جائے گا تو یہ آیت کی تفسیر ہے کہ میدانِ محشر میں لوگ درجہ بدرجہ کھل کر نمایاں ہوں گے۔

تو اس میں وہ پنڈلی والی تجلی نمایاں ہوگی کہ جس کی عمر بھر عبادت کرتے رہے یعنی جس کے سامنے جھکتے رہے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب آدمی سجدہ کرتا ہے تو ظاہر میں اس کی پیشانی پڑتی ہے چٹائی پر حقیقت میں اللہ کے قدموں میں پڑی ہوئی ہے اور جب سجدہ گاہ کی طرف دیکھتا ہے تو پنڈلی سامنے ہوتی ہے، اور جب فاتحہ پڑھنے کے لئے اور سورت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ اللہ کے چہرے پر ہوتی ہے، تو درجہ بدرجہ تجلیاتِ ربانی اس کے سامنے آتی ہیں، بحالتِ قیام اونچی تجلی سامنے ہوتی ہے، بحالتِ رکوع اونچی تجلی سامنے ہوتی ہے، اور سجدے میں جا کر مہرب سے اونچی تجلی قدموں کی نمایاں ہوتی ہے، تو تمام تجلیاتِ ربانی سے وہ نماز اور عبادت کے اندر مستفیض ہوتا ہے، لیکن نمایاں جو تجلی ہے جس پر زیادہ نظر پڑے گی وہ پنڈلی والی تجلی ہے، جو نیچے کی تجلی ہے اس سے آدمی

مانوس ہوگا جب وہ کھل جائے گی تو اللہ کی محبوبیت نمایاں ہو جائے گی۔

عابد مظاہرنا آشنائے حقیقت رہے گا..... تو فرمایا گیا کہ تم مظاہر کو پوجتے ہو تو جو موجد تھے مظاہر ان کے سامنے بھی تھے مگر وہ دھیان بھی کرتے تھے تو حق تعالیٰ شانہ کی طرف جاتے تھے، اور تم ان صورتوں میں ہی الجھ کر رہ گئے تو وہاں بھی تم صورت ہی میں الجھ کر رہ جاؤ گے حقیقت کا تمہیں وہاں بھی پتہ نہیں چل سکے گا، تو فرمایا کہ آج تم تاویل کر کے پردے ڈال لو، اپنی مشرکانہ عبادت کو تم موجدانہ کہہ لو، لیکن یہ حقیقت میں عبادت نہیں ہے، یہ دھوکہ ہے جس میں تمہیں شیطان نے ڈال رکھا ہے۔ اور وہاں جا کر کھلے گا کہ ایک مومن عبادت کرتا ہے اگرچہ نظر اس کی پنڈلی پر ہے مگر وہ حقیقت میں تجلی ربانی کے سامنے ہے، تو جیسی حقیقت یہاں اس پر واضح ہے قیامت کے دن بھی اس پر حقیقت واضح ہوگی، وہ یہاں بھی نور میں ہے وہاں بھی نور میں ہوگا، جو یہاں ظلمت میں ہے وہاں بھی ظلمت میں ہوگا، حقیقت ان پر منکشف نہیں ہوگی، تو: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ نَاقٍ وَيُذْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ﴾ جب پنڈلی والی تجلی کھولی جائے گی اور دعوت دی جائے گی کہ سجدہ کرو تو سب سجدے میں جا پڑیں گے، لیکن یہ لوگ جو شرک میں مبتلا تھے یہ اتنی استطاعت نہیں رکھیں گے کہ وہاں جھک سکیں، اس لئے کہ یہاں بھی نہیں جھکے ہوں گے، جب یہاں نہیں جھکے تو وہاں بھی نہیں جھکیں گے۔

دنیا کی ظلمت آخرت میں بھی حقیقت سے حجاب کا باعث ہوگی..... ﴿حَاشَیْعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرَهِفُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی ندامت اور ذلت کے سبب سے، ذلت اور رسوائی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہوگی ان کے چہروں سے ظاہر ہوگا کہ یہ خائب و خاسر ہیں اور نامراد ہیں تو نامرادی کی سیاہی ان کے چہروں پر ہوگی، اور ذلت و رسوائی چھائی ہوئی ہوگی ﴿فَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ وہ جھکنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔

﴿وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ﴾ دنیا میں انہیں بلایا جا رہا تھا سجدے کی طرف جبکہ ان کی فطرت بھی صحیح تھی، جبکہ ان کا ضمیر بھی صحیح تھا، لیکن انہوں نے لبیک نہیں کہا، یہاں تک کہ اپنی فطرت شرک اور بد عملی کی بدولت مسخ کر دی۔

جب فطرت ہی خراب ہوگئی، استعداد ہی باقی نہ رہی ایمان کی، تو ظاہر ہے کہ پھر عمل کہاں سے ہوگا، پھر عبادت کہاں سے ہوگی، اور جب وہ نہ ہوئی اور وہاں اس پنڈلی کے آگے نہ جھکے تو آج یہاں اس پنڈلی کے آگے کیا جھکیں گے، تو حقیقت میں دنیا اس لئے ہے کہ آدمی مشق کر لے اپنی اطاعت و عبادت کی۔ آج غائب جو چیزیں ہیں کل کو وہی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی اور کھل جائیں گی، تو اس وقت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ نَاقٍ﴾ پنڈلی کھول دی جائے گی۔ تو پنڈلی سے مراد حقائق کا عالم ہے کہ حقیقتیں کھل جائیں گی، عامل شریعت اور تارک شریعت نمایاں ہو جائیں گے۔

ساق مشابہات میں سے ہے..... پنڈلی سے مراد مشابہات میں سے ایک صفت ہے کہ اللہ کی پنڈلی اسی

طرح فرمایا گیا، جیسے حق تعالیٰ کی طرف ہاتھ منسوب کیا گیا ہے ﴿يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ ① اللہ کا ہاتھ سب کے ہاتھوں کے اوپر ہے یا جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ ② لوگ ارادہ کر رہے ہیں اللہ کے چہرے کا۔ تو چہرہ بھی اللہ کی طرف منسوب ہوا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ”الْقُلُوبُ بَيْنَ إصْبَعِي الرَّحْمَنِ“ ③ تمام دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، تو انگلیاں ثابت کی گئیں۔ حدیث میں فرمایا کہ: جب اللہ نے رحم اور امانت کو پیدا کیا تو رحم اور امانت اللہ کی کوکھ سے لپٹ گئے اور بولے کہ: ”أَلَا مَنْ وَصَلْنَا وَصَلَهُ اللَّهُ وَمَنْ قَطَعْنَا قَطَعَهُ اللَّهُ“ ④ آپ یہ چیز واضح کر دیجئے کہ جو میں ملائے یعنی صلہ رکھی کرے اور امانت داری کرے آپ کے لئے تو آپ اسے اپنے ساتھ کر دیجیے اور اگر رحم قطع کر دیا، امانت قطع کر دی تو آپ بھی اسے اپنے سے قطع کر دیں، تو حق تعالیٰ نے یہ درخواست قبول فرمائی، تو اس سے کوکھ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”رَأَيْتُ رَبِّي فِي أَحْسَنِ صُورَتِهِ“ میں نے خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا، بڑی پاکیزہ صورت تھی۔ حق تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ: ”فِيمَ يَسْتَخْتَصِمُ مَلَأُ الْأَعْلَى“ ملاء اعلیٰ کے لوگ یعنی ملائکہ مقربین کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا، میں تو واقف نہیں ہوں اس چیز سے، پھر فرمایا حق تعالیٰ نے دوبارہ کہ ”فِيمَ يَسْتَخْتَصِمُ مَلَأُ الْأَعْلَى“ ملاء اعلیٰ کے ملائکہ کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ میں تو نہیں جانتا نہیں پہچانتا۔ تین دفعہ جب فرمایا اور میں نے اقرار کیا کہ میں نہیں جانتا تو حق تعالیٰ نے میری پشت پر ہاتھ رکھا حشری بردت ⑤ میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک اپنے قلب کے اندر محسوس کی اور اس طور پر شرح صدر ہوا کہ ساری چیزیں منکشف ہو گئیں جن کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا کہ کس بارے میں جھگڑتے ہیں، ملاء اعلیٰ والی ساری چیزیں مجھ پر کھل گئیں، تو پورے بھی ثابت کئے گئے، بہر حال یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئیں، ہاتھ بھی پورے بھی انگلیاں بھی، قدم بھی پٹلی بھی، کوکھ بھی، لیکن اہل حق اس میں یہی لکھتے ہیں کہ ان تمام چیزوں پر ایمان لاؤ مگر ساتھ یہ کہو کہ ہم ان کی کیفیت نہیں جانتے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا وہ راز ہے کیا کیفیت ہے! ہم کیفیت نہیں جانتے، جیسے اللہ کی ذات بے چوں بے چگوں ہے، کوئی اس کی مثال نہیں، ایسے ہی اس کا ہاتھ ہے، مگر ہاتھ اس کیفیت کی بنی ہوئی شکل نہیں ہے، وہ شکل و صورت سے پاک ہے، حقیقت کو ہم نہیں جانتے تو اس طرح کے تمام تشابہات پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ کہ وہ اپنی حقیقت پر ہیں، لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے جیسے ذات اس کی بے چوں و بے چگوں ہے ایسے ہی

① ہمارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیہ: ۱۰۔ ② ہمارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیہ: ۵۲۔ ③ الصحيح لمسلم، کتاب القدر، باب تصريف الله القلوب كيف شاء ج: ۱۳ ص: ۱۱۹۔ ④ الصحيح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب صلة الرحم وتحريم قطعها ج: ۱۲ ص: ۳۰۷ رقم: ۴۶۳۵۔

⑤ السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، ومن سورة ص ج: ۱۱ ص: ۲۷ رقم: ۳۱۵۷۔

اس کی صفات بھی بے چوں و بے جگوں ہیں، اس طرح سے پنڈلی بھی مشابہات میں سے ایک متشابہ ہے کہ ظاہر میں لفظ پنڈلی کا ہے، جیسے ہماری پنڈلی مگر کیفیت اس کی مجہول ہے ہم نہیں جانتے، حق تعالیٰ جسم سے بری ہیں حق تعالیٰ حدود سے بری ہیں، اس لئے اس کی پنڈلی ویسے ہوگی جیسے اس کی شان ہے جیسے اس کی ذات ہے اس کا ہاتھ ویسا ہوگا جیسی اس کی ذات ہے اس کی کوکھ ویسی ہوگی، جیسی اس کی ذات ہے ہم اپنی کوکھ پر اور ہاتھ پر قیاس نہیں کر سکتے، ہم محدود ہیں وہ لاحدود ہے، ہم جسمانی ہیں وہ جسم و روح سے بری و بالا ہے، اس لئے ہم کوئی کیفیت نہیں بیان کر سکتے تو مراد یہاں ساق سے اشارہ اس طرف ہے کہ آج تم چھپا لو چیزوں کو آج پردے ڈال لو دیلوں پر تاویلوں کے پردے ڈال لو، لیکن حقیقتیں کھلنے والی ہیں، اہل معرفت پر یہیں کھل جاتی ہیں عوام پر وہاں جا کر کھل جائیں گی، تو یہ محض بناوٹی دلیلیں تھیں، اور تمہارا ضمیر بھی شاہد ہوگا کہ ہم نے اپنے نفس کو دھوکہ ہی دیا تھا اور مخلوق کی حقیقت کچھ نہیں تو فرمایا کہ ان چیزوں میں مت پڑو، پیغمبر جس چیز کو لاکر پیش کر رہے ہیں اس پر ایمان لاؤ، جو راستہ دکھا رہے ہیں اس پر چلو، حقیقت اسی کے اندر رہے، بے جا تاویلات اور آبائی تقلید پر نیز رسم و رواج پر نہ چلو، یہ چیزیں نجات دلانے والی نہیں ہیں، انبیاء علیہم السلام کی سنتیں نجات دلائیں گی، جو طریقہ انبیاء علیہم السلام نے بتلایا ہے، وہ ہدایت ہے اسی سے نجات کا تعلق ہے، نہ رواج کا نام شریعت ہے نہ پچھلوں کی ریت پر چمے رہنے کا نام شریعت، شریعت تو نگھری ہوئی چیز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی اور صحیح سند سے آئی اور وراثت سے آئی واسطہ درواسطہ سند صحیح کے ساتھ پہنچ گئی، اسی کو مانیں اسی کے اندر نجات ہے، تو فرمایا: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ﴾ وہاں اطاعت کی طرف بلائی گئی مخلوق جو ایمان والے تھے، وہ جھک گئے جو یہاں نہیں جھکے وہاں بھی نہیں جھکیں گے، جو یہاں جھکے ہیں وہاں بھی جھک جائیں گے، جن کی یہاں نجات ہوئی وہاں بھی نجات ہوگی، وہاں وہ استطاعت نہیں رکھیں گے جھکنے کی جو یہاں نہیں جھکے، اور ان کے چہروں پر ذلت اور پھٹکا رو رسوائی برستی ہوگی۔ ﴿وَقَدْ كَانُوا يَدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ﴾ اس وقت انہیں دعوت دی گئی سجدوں کی جب ان کی فطرت صحیح سالم تھی، صحیح سالم تھے لیکن دعوت پر لبیک نہیں کہا تو فطرت کو مسخ کر دیا ان کے اندر استعداد صلاحیت سب فوت ہو گئیں، تو اب کیا ہو سکتا ہے، آخرت تو دنیا کے کئے دھرے کا ثمرہ ہے، جب دنیا میں ہی کوئی چیز نہیں ہوئی تو ثمرہ بھی مرتب نہیں ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: دنیا آخرت کی بھتی ہے، آخرت میں آدمی پھل کا لے گا، دنیا میں بھتی بوئے گا، محنت کرے گا تو جو یہیں نہیں ہوتا، یہیں بیج نہیں ڈال رہا ہے، یہیں بھتی کو پانی نہیں دے رہا ہے، تو وہ ثمرہ اسے کیسے ملے گا، وہاں جا کر محروم ہو جائے گا، اس واسطے ان کی محرومی فرمایا حق تعالیٰ نے: ﴿فَلْذُرْنِي وَفَسَنْ يُكْذِبَ﴾ **بِهَذَا الْحَدِيثِ** اے پیغمبر! ان کی فکر میں آپ نہ پڑیں، آپ دعوت دیتے رہیں باقی ان کی ہدایت کی فکر نہ کریں انہیں مجھ پر چھوڑ دیں یہ تکذیب میری کر رہے ہیں، میں ان سے خود نمٹ لوں گا، اور ظاہر میں اس تکذیب پہ تاویلوں کے

پر دے ڈال رکھے ہیں، یہ ہم نے ان کی دلوں کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے یہ اسی اندھیرے میں چلتے رہیں گے۔
خود وہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑے اچھے راستے پر ہیں، جب نتیجہ نکلے گا تو معلوم ہوگا کہ گمراہی کے اوپر تھے، تو یہ ہماری ایک خفیہ تدبیر ہے جس سے ہم ہلاکت والوں کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں اور آنکھیں ان کی بند کر دی گئیں ہیں ظاہری بھی باطنی بھی، نہ وہ حق کو دیکھتے ہیں نہ وہ سمجھتے ہیں، جب فطرت ضائع کر دی تو اب سمجھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ہم ڈھیل دے رہے ہیں انہیں اور یہ پہنچ گئے ہیں اس ہلاکت کی طرف گوان کو سمجھ میں نہ آئے۔

بلا دلیل اتباع میں نجات ہے..... تو اس میں عبرت دلائی گئی ہے ایمان والوں کو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو کھلا ہوا راستہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ فرائض ہیں، یہ واجبات ہیں یہ عبادت کا طریقہ ہے، یہ توحید کا طرز ہے، یہ نبوت کے ماننے کا طرز ہے۔ اسی میں نجات کا تعلق ہے جہاں آدمی خود درائی کو اور عقل پسندی کو دخل دے گا وہیں دین کے اندر دخل پڑ جائے گا، دین کی بنیاد اتباع کے اوپر ہے کہ آدمی ہر چیز سے کٹ کر اتباعاً پیروی کی طرف جائے اسی کے اندر نجات ہے، صحابہ کرامؓ اس درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے تھے کہ اس اتباع کے مقابلے میں اپنی عقل کو بھی جھٹلانے کے لئے تیار تھے، اپنے مشاہدے کو بھی رد کرنے کے لئے تیار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مقابلے میں نہ اپنی آنکھ کا اعتبار کرتے تھے نہ اپنی عقل کا نہ اپنے مشاہدے کا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا صحابہؓ سے کہ: اَيُّ يَوْمٍ هَذَا يَكُونُ سَادَنَ؟ سب جانتے تھے کہ عرفہ کا دن ہے نویں تاریخ ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ نویں تاریخ ہے مگر صحابہ کرامؓ نے کیا جواب دیا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سادن ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اَيُّ شَهْرٍ هَذَا؟“ مہینہ کون سا ہے؟ سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، حج ہو رہا ہے مگر جواب دیتے ہیں۔ ”اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ۔“ ① اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے کون سا مہینہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اَيُّ بَلَدٍ هَذَا؟ سب کو معلوم تھا کہ مکہ ہے وہیں سے آئے تھے مگر جواب میں کہتے ہیں کہ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ جواب دیا گیا تو ان صحابی سے ان کے شاگرد نے پوچھا کہ آپ تو جانتے تھے کہ مہینہ ذی الحجہ کا ہے، نویں تاریخ ہے، عرفہ کا دن ہے شہر مکہ کا ہے، تو سیدھا جواب یہ ہے کہ مکہ ہے ذی الحجہ کا مہینہ ہے نویں تاریخ ہے عرفہ کا دن ہے یہ آپ نے کیا جواب دیا ہے: ”اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ“ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

تو صحابہؓ کہتے ہیں اس کے جواب میں ہم نے یہ اس لئے کہا کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ نویں تاریخ نہیں بارہویں تاریخ ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہمارا علم غلط تھا

حق یہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمادیں کہ مکہ نہیں مدینہ ہے تو ہم کہیں گے کہ بلاشبہ مدینہ ہے ہماری آنکھیں غلط دیکھ رہی تھیں کہ یہ مکہ ہے، اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ مہینہ ذوالحجہ کا نہیں محرم کا ہے، تو ہم کہیں گے کہ بے شک محرم کا ہے، ہمارا علم غلط ہے، تو یہ درجہ تھا اتباع کا کہ اپنی آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنے علم کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی تاریخ کو غلط کرنے کے لئے تیار قول رسول کے مقابلے میں تو جب تک اتنا اتباع نہ ہو کہ آدمی اپنی عقل، مشاہدہ، نگاہ سب کو چھوڑ کر قول رسول کی طرف نہ جائے، حقیقت میں اس وقت تک ایمان کا کمال نصیب نہیں ہو سکتا۔

عظمتِ خداوندی کا عالم..... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا ایک شخص کو کہ دن دیہاڑے چوری کر رہا ہے تو اس سے فرمایا کہ ارے کم بخت دن دیہاڑے چوری کرتا ہے؟ اس نے کہا: ”وَاللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَا اَسْرِفُهُ“ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے چوری نہیں کی۔ حالانکہ آنکھوں کے سامنے تو چوری کر رہا تھا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ”صَدَّقْتُ رَبِّیْ وَكَذَّبْتُ عَیْنِیْ“ اس نے اللہ کا نام لے کر قسم کھائی تو میں اللہ کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں بے شک تو نے چوری نہیں کی اللہ کا نام سچا ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ اللہ کا نام جب آجائے تو اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی عقلوں کو جھٹلانے کو تیار خدا کے مقابلے میں، اسی عظمت کی وجہ سے تو حضرت آدم علیہ السلام بتلا ہو گئے، حق تعالیٰ نے جب جنت میں بھیج دیا اور فرمایا کہ دیکھو اس درخت کو مت کھانا، ابلیس نے آکر دھوکہ دیا، جانتے تھے کہ ابلیس ہے مگر: ﴿وَقَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَکُمَا لَیْمَنِ النَّصِیْحِیْنَ﴾ ① شیطان نے قسم کھائی خدا کی قسم! میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آدم علیہ السلام کے دل میں فریب نہیں، سچا قلب ہے آدم علیہ السلام کا اور جنت مقامِ کریم ہے، وہاں ایک شخص قسم کھائے اللہ کا نام لے کر انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے، بھلا اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے گا اس درجہ عظمت تھی کہ ذہن میں نہیں آیا کہ یہ کم بخت شیطان ہے، جھوٹی قسم کھا رہا ہے، کیونکہ قلب اتنا سچا تھا کہ ان کے دل میں آیا ہی نہیں کہ خدا کا نام لے کے بھی کوئی جھوٹا حلف کر سکتا ہے، تو یقین آ گیا اور اس عظمت کے سبب سے آدم علیہ السلام بتلا ہو گئے، اس واسطے کہ جب آدمی خود پاک اور سچا ہوتا ہے تو دوسرا بھی ویسے ہی نظر آتا ہے، اس کے دل میں برائی بیٹھتی ہی نہیں سچے آدمی کے سامنے اگر آپ جا کے بات کریں تو وہ اپنے جیسا سمجھے گا کہ بھلا اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

مولانا اصغر کے نانا حضرت شاہ صاحب کی مادہ لوحی..... ہمارے بزرگوں میں سے آپ نے حضرت مولانا اصغر حسین صاحب کو تو دیکھا ہی ہوگا سب جانتے ہیں، میاں صاحب کے نانا تھے حضرت شاہ صاحب بہت ہی بزرگ لوگوں میں سے تھے اور اس درجہ کے بزرگ کہ ان کی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا مقولہ یہ تھا

کہ انہیں عمر بھر کبھی صغیرہ گناہ کا تو تصور بھی نہیں آیا، کرنا تو کیا؟ تصور بھی نہیں آیا بالکل سادہ سچی طبیعت اور معصوم صفت، تصور بھی کبھی گناہ کا نہیں آیا، کرنا تو کیا، ہر وقت حق تعالیٰ میں مستغرق رہتے تھے، انہیں اپنا نام تک یاد نہیں رہتا تھا، اولاد کے نام یاد نہیں رہتے تھے، بچوں کو قرآن شریف پڑھانے کا شغل رکھتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے نہیں ایک کھوٹی ڈال رکھی تھی جب دھوپ وہاں تک پہنچ گئی تو بچوں نے کہہ دیا کہ حضرت وقت ہو گیا تو فرمادیتے بھی چھٹی، تو بعض دفعہ لڑکوں نے شرارت کر دی کہ کھوٹی آدھ گز دور گاڑ دی تو دھوپ جلدی پہنچ گئی اور بچوں نے کہہ دیا کہ اجی میاں صاحب وقت ہو گیا، اچھا بھائی جاؤ چھٹی ہو گئی۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ جھوٹ بول رہے ہیں انہوں نے شرارت کی ہے، کھوٹی آگے ڈال دی ہے، فرماتے ہیں مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا اس درجہ معصوم صفت تھے، بالکل سیدھی اور سچی طبیعت کہ بچے جھوٹ نہیں بول سکتے کیونکہ سوائے سچائی کے ان کے قلب میں اس کا تصور ہی نہیں تھا، کہ کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، شاہ صاحب کا دوسرا واقعہ ایک دفعہ بیمار ہوئے آنکھوں میں بیماری ہوئی اور پڑ گئے تو کسی نے آکر کہہ دیا کہ اس مرض میں آنکھ جاتی رہتی ہے، نگاہ باقی نہیں رہتی تو یقین آ گیا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے تو آنکھ باندھ کے بیٹھ گئے، جو آیا پوچھنے کہ میاں صاحب کیسی طبیعت ہے کہ جی میری آنکھیں جاتی رہیں کہ فلاں صاحب آئے تھے وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں بینائی رہا نہیں کرتی تو اس کا یقین آ گیا ایک مہینہ گزر گیا اور بیٹھے ہوئے ہیں آنکھ باندھ کے کہ میری آنکھ جاتی رہی۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس تھے، فقط عالم نہیں بلکہ عارف باللہ اور صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، تو مولانا کے علم میں آیا سمجھ گئے کہ کسی نے جا کر کہہ دیا اور یقین آ گیا ہے، کہ آنکھوں میں بینائی نہیں رہی تو مولانا خود پہنچے اور جا کر پوچھا، میاں جی صاحب کیا حال ہے؟ فرمایا حضرت جی میری آنکھیں جاتی رہیں، وہ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں آنکھیں رہا نہیں کرتیں تو میری بینائی جاتی رہی، مولانا نے فرمایا کہ میاں صاحب میں پانی پڑھ کے دیتا ہوں اس کی خاصیت یہ ہے کہ جب آنکھ کو چھینٹا دیا جائے تو بینائی فوراً آ جاتی ہے کہا اللہ آپ کو جزائے خیر دے، مجھے ضرور پانی پڑھ کے دیجئے، مولانا نے وہیں الحمد وغیرہ کچھ پڑھ کے چھینٹا دیا کہ میاں صاحب بینائی آ گئی ہے آنکھ کھول دیں انہوں نے آنکھ کھول دی، بینائی تو تھی ہی، کوئی گئی تھوڑا ہی تھی؟ سینکڑوں دعائیں دیں اللہ آپ کو جزائے خیر دے، دیکھو میری بینائی آ گئی ہے۔

اور اس سے بڑا الطیفہ یہ ہوا کہ اگلے دن مولانا جو کہ چھتے کی مسجد میں رہتے تھے، بہت سے اندھے مسجد میں دوڑتے دوڑتے چلے آ رہے ہیں، گاڑیوں میں بیٹھ کر آ رہے ہیں کہ مولانا ایسا پانی پڑھتے ہیں کہ بینائی آ جاتی ہے، تب مولانا نے کہا بھائی میرے پاس نہ کوئی پانی پڑھ کے دینا آتا ہے اور نہ اور کچھ، وہ تو میاں صاحب سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہی ہے انہیں اس کا یقین ہو گیا تو میں نے بھی یقین دلادیا، یہ نہیں میں کہہ سکتا تھا کہ

اس نے جھوٹ بولا یہ ان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی جھوٹا ہو سکتا ہے اس لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی میں جانتا تھا کہ بینائی تو موجود ہے، ایک حیلے کی ضرورت ہے آٹکھ کھلوانے کے لئے تو میں نے یہ حیلہ کیا، مجھے کوئی پانی دانی پڑھنا نہیں آتا، تو وہ بیچارے اندھے رخصت ہوئے، ورنہ سینکڑوں اندھے موجود جو ٹھیلوں میں گاڑیوں میں چلے آ رہے ہیں، تو نہایت معصوم صفت بزرگ تھے۔

محبوب اختر کامیاں جی کی خدمت میں گندستی کی شکایت کرنا..... ہمارے عزیزوں میں سے ایک صاحب تھے، محبوب اختر ان کا نام تھا، بیچارے بہت غریب تھے، اور ان پر فاقے ہونے لگے تو وہ میاں جی کی خدمت میں آئے کہ حضرت جی دعاء کرو میرے واسطے کہ فاقوں کی نوبت آگئی ہے، کچھ بھی گھر میں باقی نہیں رہا، میاں صاحب نے فرمایا گھر بیٹھ کر روٹی؟ سفر کرو، کہا کہ کہاں کا سفر کروں؟ کہا جہاں کا جی چاہے کر لو ملے گا سفر ہی میں، اب وہ بیچارے حیران ہوئے اعتقاد پختہ تھا وہ میاں صاحب کے ہاں سے اٹھے تو سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے، اب کچھ خبر نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں کون سی منزل ہے، وہ اسٹیشن پہنچ گئے، مظفر نگر کی ریل تیار تھی، دو آنے کا ٹکٹ ملتا تھا، تو دو آنے کا ٹکٹ لیا اور ریل میں بیٹھ گئے، اب ریل میں بیٹھ کے سوچ رہے ہیں کہ کل چار آنے میرے پاس تھے، دو آنے کا تو ٹکٹ لے لیا اور وہاں کوئی میری جان پہچان نہیں، کس کے ہاں اتروں گا؟ کہاں کھانا کھاؤں گا؟ اور اگر دو آنے کا کھانا کھا لیا تو پھر واپسی کا ٹکٹ نہیں گھر کیسے آؤں گا؟ اب بیچارے پریشان ادھر میاں صاحب نے کہہ دیا تھا اعتقاد پورا تھا صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے کہ اللہ مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا اسٹیشن پر جا کر اترے تو ابھی باہر نہیں نکلے تھے کہ ایک سپاہی نے آکے ہاتھ پکڑا کہ چلو صاحب بلا رہا ہے، پولیس کا انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، وہ تمہیں بلا رہے ہیں، اب یہ بیچارے بہت گھبرائے کہ جیل تیار ہے، خیر وہ سپاہی لایا تو اسٹیشن پر وہ انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، میز لگی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا، یہ جا کے پیش کئے گئے اس نے کہا کہ بھائی تو ملازمت کرے گا؟ جی ہاں کروں گا، انہوں نے کہ میں تو سمجھا تھا کہ جیل بھجوائے گا مگر یہاں تو معاملہ دوسرا ہو رہا ہے۔ اسے ضرورت تھی کہ سپاہیوں میں بھرتی کرے تو اس نے کہا مسافروں میں جس کو طلب دیکھو بلا کر اسے لے آؤ، تاکہ ہم بھرتی کریں انگریزوں کا نیا نیا زمانہ تھا، بھرتی ہو رہی تھی تو ان کو کہا گیا ملازمت کرو گے؟ کہا جی ہاں کروں گا، اس نے سینہ تاپا جو اس زمانے کا دستور تھا اور کہا کہ آج سے تم ملازم ہو گئے اور تمہاری تنخواہ اٹھارہ روپے ہوگی اس زمانے کے ۸ روپے ایسے تھے جس طرح آج کے ہزار روپے ہیں۔

اس کے بعد ان سے کہا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا میں دیوبند کا رہنے والا ہوں اور میں تو گھر سے آیا ہوں گھر والوں کو ملازمت کی اطلاع نہیں ہے، اس نے حکم دیا کہ آدھی تنخواہ نو روپے انہیں دے دو، اور کہا تم گھر والوں کو اطلاع کر کے پرسوں یہاں آ کر حاضری دو یہ نو روپے لے کر اب دوسری ریل پر واپس ہوئے، پھر نو روپے اس زمانے میں ایسے تھے جیسے ۹۰۰ روپے ہاتھ آگئے اس قدر ہشاش بشاش اور منفرح اور خوش کہ انہوں نے

برسہا برس ۹ روپے نہیں دیکھے تھے فاقوں کی نوبت تھی، دیوبند پہنچے تو چار آنے کی جلیبیاں خریدیں، اور میاں صاحب کے پاس ہدیہ کے طور پر لے گئے اور کہا، اجی میاں صاحب! ملازم ہو گیا، ۱۸ روپے مہینے پر! فرمانے لگے میاں دیکھو ہم کہتے نہیں تھے کہ گھر بیٹھ کے نہیں روٹی ملتی، باہر جا کے ملے گی تو ایسے معصوم صفت بزرگ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی پہلی اینٹ رکھنے والے میاں جی اور ان کے داماد کا حال..... دارالعلوم دیوبند کی جب بنیاد رکھی گئی ہے تو سب سے پہلی اینٹ انہی سے رکھوائی ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور یہ فرمایا کہ ایسے شخص سے اینٹ رکھو رہا ہوں کہ جسے عمر بھر صغیرہ گناہ کا تصور تک کبھی نہیں آیا کبیرہ گناہ تو دور کی بات ہے، تو ایسے لوگوں نے بنیاد رکھی جو بالکل معصوم صفت ہیں، تو ان کی سچائی کی کیفیت ان کی پاکیزگی قلب یہ تھی کہ ہر وقت مستغرق رہتے تھے۔

چنانچہ ان کے داماد تھے ان کا نام تھا ”اللہ بندہ“ جب داماد آتے فرماتے کون ہو تم؟ فوری پہچانتے نہیں تھے، اس درجہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ تھی کہ ادھر کی طرف دھیان نہیں تھا پوچھتے کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی میں ہوں اللہ بندہ فرماتے ارے بھائی نام بتاؤ، اللہ بندے تو سارے ہی ہیں، ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، اجی اس نے کہا کہ میرا نام یہی ہے، فرماتے بھلے یہ کیا نام ہوا؟ ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، انہوں نے کہا جی میں ہوں آپ کا داماد، اچھا اچھا اب سمجھے، بات چیت کر کے واپس چلے گئے۔

اگر دس منٹ کے بعد آگئے پھر وہی سوال بھائی کون ہو تم؟ اب پھر اللہ بندے یہ بحث ہو رہی ہے تو نہ اپنا نام یاد رہتا تھا نہ اولاد کا نام یاد رہتا تھا، ہر وقت استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی، تو اس درجہ معصوم صفت تھے تو ان کے سامنے جا کر کوئی بات کہتا تو ان کے دھیان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، جیسے سچے خود ہیں ایسے ہی دوسرے کو سچا سمجھتے تھے، اور اگر کوئی قسم کھا کے کہتا تب تو یقین کرنے میں کوئی مانع نہ تھا، تو جب انبیاء علیہم السلام کے امتیوں میں ایسے سچے ہیں جو نبی نہیں ہیں، مگر قلوب میں سچائی ہے تو انبیاء کے قلوب کی سچائی کا کیا عالم ہوگا؟

تو آدم علیہ السلام بچوں سے بڑھ کر سچے پیغمبر اور ہیں جنت میں، ابھی دنیا کی ہوا بھی نہیں کھائی، تو جہاں فریب کا تصور تک نہیں وہاں کم بخت شیطان نے قسم کھائی جا کے کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں، اور اس درخت کے کھالینے میں آپ کے لئے بڑی برکات اور فوائد ہیں تو یقین آ گیا کہ بھلا اللہ کا نام لے کر کون جھوٹ بول سکتا ہے، تو عظمت خداوندی بتلا ہونے کا باعث ہوئی، تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ قلوب کے اندر جب سچائی ہوتی ہے تو دوسرے کے جھوٹ کو بھی آدمی نہیں سمجھتا، اور بتلا ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات بھلے لوگ زیادہ اسی میں مارے جاتے ہیں کہ دوسرے نے قسم کھائی چڑی چڑی باتیں کیں بتلا ہو گئے لیکن اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ نیک لوگ اگر بتلا بھی ہو جائیں عظمت الہی کے سبب سے کسی کو جھوٹا نہ سمجھیں اور وہ جھوٹا آدمی پھانس لے تو اخیر میں پھر نتیجہ اسی کے حق میں برانکلتا ہے یہ بری کر دیئے جاتے ہیں، اللہ کے ہاں سے ان کی مضرت نہیں پہنچتی نیت کی سچائی کی وجہ سے تو نبی علیہ السلام کے سامنے صحابہ کرام کی یہ حالت تھی

کہ اتباع اور پیروی میں اس درجہ آگے تھے کہ اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اور آنکھوں دیکھی چیزیں جھٹلانے کو تیار مگر پیغمبر کا قول جھٹلانے کو تیار نہیں تو اصل حقیقت یہی ہے۔

معیار اتباع..... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جمعہ پڑھنے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور کچھ دیر ہو گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر پہنچ گئے خطبہ شروع ہو گیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ جب خطیب ممبر پر پہنچ جائے ”إِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ فَلَا صَلَوةَ وَلَا كَلَامَ“ جب امام اٹھ کر چلنے لگے ممبر کی طرف تو اب نہ نماز پڑھنی جائز ہے، اور نہ بات چیت کرنی جائز ہے بلکہ سکوت کے ساتھ خطبہ سننے کے لئے تیار ہو جائے، اگر کسی نے پہلے سے نماز شروع کر دی تھی اور امام کھڑا ہو گیا تو فرمایا گیا کہ اگر چار رکعت کی نیت کی تو دو پر سلام پھیر دے، لمبی نہ کرے، نماز جلد مکمل کرے بعد میں پھر قضا کر لے، مگر اس وقت سلام پھیر دے، اس وقت کی بڑی عبادت یہی ہے کہ خطبہ سنا جائے، تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے اور خطبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف لائے تھے، جب یہ دروازے میں داخل ہوئے تو ارادہ کر رہے تھے کہ نماز کے لئے کھڑے ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممبر پر فرمایا اجلس بیٹھ جاؤ، مطلب یہ تھا کہ جا کر نماز نہ پڑھو خطبہ شروع ہو گیا ہے بیٹھ جاؤ تو مسجد میں نہیں پہنچے مسجد کے دروازے سے باہر تھے، آواز کانوں میں پڑی وہیں (سڑک) کے اوپر بیٹھ گئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آ گیا تو اب تاخیر اطاعت میں جائز نہیں، حالانکہ ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ مسجد میں آ کر نماز نہ پڑھو خطبہ سنو مگر لفظ تھا اجلس کا کہ بیٹھ جاؤ تو جہاں کان میں آواز پڑی وہیں بیٹھ گئے، سڑک کے اوپر بیٹھ گئے کہ اب اطاعت میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اطاعت کا اخروی فائدہ..... جب تک یہ درجہ اطاعت کا نہ آجائے کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام خداوندی کے بارے میں کہ ہر چیز سے قطع نظر کر کے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کے جھک جائے، اس وقت تک آدمی کی نجات کی صورت نہیں ہوتی، تو کہاں وہ صحابہ کرامؓ کہ اپنے مشاہدے کو اطاعت نبوی میں جھٹلانے کے لئے تیار اور کہاں مشرکین کہ خدا اور رسول کے کلام کو اپنے وسوسوں کے مقابلے میں جھٹلانے کے لئے تیار ہیں، وہاں نجات کا کیا کام تھا، تو یہی تقابل دکھلایا گیا ہے کہ آج وہ لوگ اطاعت نہیں کرتے اور فرضی چیزوں میں پڑے ہوئے ہیں، وہ قیامت کے دن بھی اطاعت نہیں کریں گے انہیں چیزوں کے اندر مبتلا ہوں گے اور ہلاکت کی طرف جائیں گے، اور جو یہاں مان گئے ہیں وہ وہاں بھی مانیں گے جو یہاں پنڈلی کے آگے جھک گئے وہ وہاں بھی سجدے میں گریں گے، اور ان کے لئے وہاں نجات ہوگی۔

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
 إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ
 وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
 تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
 الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿أَمَّ تَسْلُطُهُمْ أَجْرًا فَهَمَّ مِنْ مُّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ۝ أَمَّ عَنْدَهُمُ
 الْغَيْبُ فَهَمَّ يَكْتُبُونَ ۝ لَمَّا صَبَرَ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَى وَهُوَ مَكْظُومٌ
 ۝ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ۝ فَاجْتَنِبْ رُءُوسَهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ
 ۝ وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ الْكَافِرُونَ لَيَقُولُنَّكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝ وَمَا
 هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾

بزرگانِ محترم! کفار کہہ کر دعوت دینے کے سلسلے میں کیونکہ ان کی طرف سے انکار اور غفلت کا اظہار ہوتا تھا تو
 اندیشہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بمقتضیٰ بشریت غم و غصہ پیدا ہو، اور اس میں ممکن ہے کہ آپ
 کوئی بد دعا کر دیں کہ دعوت و ارشاد تو اس قوم کو پہنچ گئی ہے اس واسطے تسلی دینے کے لئے آپ کے قلب مبارک کو
 ثابت رکھنے کے لئے یہاں سے کچھ چیزیں ارشاد فرمائیں۔

ارشاداتِ نبوت کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں..... حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ ایک سچی بات کو جب ایک
 سچے انسان کے کہنے پر نہ مانا جائے، تو اس کی عالم اسباب میں دو وجہیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ سچ بات کہنے والے پر
 خود غرضی کا شبہ ہو کہ اس کی اپنی کوئی غرض پوشیدہ ہے تو خود غرض آدمی اگر کوئی سچی بات بھی کہتا ہے تو اس کا اثر نہیں
 ہوتا نہ ماننے کو جی چاہتا ہے، جیسے عموماً کوئی پیشہ ور واعظ ہو باتیں سچی کہے اور اخیر میں پیسے مانگنے شروع
 کر دے، تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ ساری سچی باتیں اس پیسے کے لئے کہی جا رہی تھیں، اس سے لوگوں کی طبیعت
 ہٹ جائے گی اور کہیں گے کہ ایسی باتیں پیسے مانگنے کے لئے ہیں خدا کے لئے نہیں۔ بات صحیح تھی واقعات بھی صحیح
 بیان کئے مگر چونکہ اپنی غرض آگئی اس واسطے بات بھی بے اثر بن گئی، جیسے عارفِ رومیؒ نے کہا کہ:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

جب غرض آجاتی ہے تو ہنر چھپ جاتا ہے! سب کمال بے کمالی ہو کر رہ جاتی ہے، کبھی تو اس وجہ سے آدمی سچی بات نہیں مانتا کہ کہنے والے میں خود غرضی کا شبہ ہوتا ہے، اور کبھی اس لئے نہیں مانتا کہ بات گو سچی ہو مگر اس کے خلاف قطعی علم سے آدمی جانتا ہے کہ اصل تو وہ ہے یہ خودخواہ کہہ رہا ہے، اور اس پہلی بات پر مطمئن ہے کہ وہ واقعی من جانب اللہ ہے اور صحیح ہے اور معقول دلائل پر مبنی ہے، جب میرے پاس دلیل و حجت ایک چیز کی موجود ہے تو کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کی بات مان لوں میرے پاس خود بات موجود ہے مدلل، مثبت، برہان، جمہیں تو یہی دو وجہیں ہوتی ہیں کہ یا آدمی مطمئن ہو کسی دلیل سے، یا یہ کہ اپنی بات صحیح نہیں دوسرے کی صحیح ہے، مگر معاذ اللہ وہ خود غرض ہے تو اثر نہیں ہوگا، اس لئے فرمایا کہ: جب یہ دو وجہیں نہیں ہوں گی تو نہ تو کہنے والا خود غرض ہے نہ اس کے پاس کوئی حجت ہے اب جو انکار ہے وہ محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس واسطے اس عناد کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے کہ ہٹ دھرمی ہے۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔ تو اس کو فرمایا گیا کہ آپ جو نصیحت فرما رہے ہیں اور رات دن دعوت دے رہے ہیں اور پھر بھی نہیں مانتے تو: ﴿أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَّغْرَمٍ مُثْقَلُونَ﴾ کیا آپ کوئی اجرت چاہتے ہیں ان سے یا آپ کی کوئی وابستہ ہے کہ آپ اسکی وجہ سے یہ ڈر رہے ہیں کہ اگر بات سن لی تو پھر آپ کی غرض پوری کرنی پڑے گی اور ان کو خواہ مخواہ ڈنڈ بھرنا پڑ جائے گا جو جھل ہو جائینگے۔

اس واسطے نہیں سنتے کہ اخیر میں ان کی غرض سامنے آئے گی ہم اس کے اندر جو جھل پڑ جائیں گے۔ آپ کوئی ان سے اجرت چاہتے ہیں کہ جس کے تاوان میں یہ دبے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بات ہی نہ سنو اگر بات مان لی تو پھر یہ سوال کریں گے وہ پورا کرنا پڑیگا پیسے کا دولت کا اس واسطے اچھا ہے کہ مانو ہی نہ سنو ہی نہ تو کیا یہ بات ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے آپ سے زیادہ سچا کون، اللہ سے زیادہ سچا کون، اللہ کے رسول سے زیادہ سچا کون، رسول کا معنی ہی یہی ہے کہ جو کہے وہ سچ کہے وہاں غلط بول کا نشان ہی نہیں ہے۔

رسول سچا ہی ہوا کرتا ہے..... حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے اپنے مرید کو جو حد کمال کو پہنچ گیا تھا اجازت اور خلافت عطا کی، جاتے ہوئے خلیفہ نے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمائیے! فرمایا: دو باتوں کا خیال رکھنا ایک تو خدائی کا دعویٰ مت کرنا، ایک نبی ہونے کا دعویٰ مت کرنا، بے چارے کو بڑی حیرت ہوئی اس نے کہا حضرت آپ کو مجھ سے یہ خطرہ تھا کیا میں خدائی کا دعویٰ کرونگا؟..... صلاح و تقویٰ بھی ثابت ہے فرمایا: ایسا ہو جاتا کہ خدائی کا دعویٰ کرونگا اور اس سے بڑھ کر نبوت کا دعویٰ کرونگا یہ تو کسی مسلمان کا بھی کام نہیں چہ جائیکہ ایک صالح مرشد راشد کا کام ہو..... فرمایا پہلے اس کے معنی سمجھ لو کہ خدائی کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں اور نبوت کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں؟

اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو، یہ درحقیقت خدائی کا دعویٰ ہے، اس لئے کہ خدا ہی وہ ذات ہے جو وہ چاہے وہی ہو کر رہے گا، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، اگر کوئی انسان اس درجہ میں آجائے کہ جو میں کہوں وہی

پورا ہواس کا مطلب یہ ہے کہ وہ درپردہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ بشریت اور انسانیت کی حد سے نکل گیا ہے۔ بشر کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو چاہے کبھی پورا ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، وہ تو محتاج ہے عاجز اور بے چارہ ہے۔ اگر ہر چیز ہماری مرضی کی پوری ہونے لگے کبھی خلاف نہ ہو تو بشر میں اور خدا میں فرق کیا رہے گا؟ خدا کے یہ معنی کہ جو وہ چاہے وہ اٹل ہو، بشر کے معنی کہ جو چاہے اگر اللہ چاہے تو پورا کر دے نہ چاہے تو نہ پورا کرے، اس کے قبضے میں کچھ نہیں، تو جو بشر بشر ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ جو میں چاہوں وہ ہو وہ لفظوں میں نہیں کہہ رہا مگر دعویٰ خدائی کا کر رہا ہے۔ تو مطلب یہ تھا حضرت سید جیلانی قدس اللہ سرہ کا کہ کبھی اپنی بات پر اتنی ضد اور اصرار مت کرنا کہ جو میری مرضی ہے وہی ہو، جب چار آدمی بیٹھے ہوئے ہیں تو تم بھی اپنی کہہ دو دوسرے بھی کہیں کہ جو صورت بھی ہوگی اسے مان لینا، کسی کا یہ کہنا کہ جو میں چاہوں وہی ہو یہ اصرار اور دعویٰ خدائی ہے، چاہے لفظ نہ ہو اس میں، اور فرمایا کہ جو شخص یوں کہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اسکے سوا سب باطل، وہ درپردہ نبی ہونے کا مدعی ہے، کیونکہ نبی کی ذات ہوتی ہے جو کہہ دے وہ حق ہو، وہ کبھی غلط نہیں کہہ سکتا۔ تو نبی کے معنی ہی یہی ہیں کہ جو وہ فرمائیں زبان سے وہ عین سچ ہو اور حق ہو، اس میں غلطی کا شائبہ بھی نہ ہو، کذب اور جھوٹ کا خطرہ ہی نہ ہو، اس کے اندر وہی معنی نبوت کے ہیں کہ نبی صادق اور مصدوق ہوتے ہیں کہ خود بھی سچے اور ان کے سچے ہونے کی تصدیق اللہ سچے کی طرف سے کی جاتی ہے۔ تو بہر حال جب اس میں استفہام انکاری ہے: ﴿هَآءِ اَمْ نَسْنِ اَلْهٰمْ اَجْرًا فَاَنۡهٰمْ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ﴾ کیا آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہیں؟ نہیں اجرت نہیں مانگتے، جب آپ نہیں مانگتے اور پھر بات سچی فرما رہے ہیں اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے تو یہ معلوم ہوتا ہے ان میں ہٹ دھرمی ہے ضد پراڑے ہوئے ہیں، کوئی حجت نہیں ہے ان کے پاس، اچھا دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی انکار کی کہ کہنے والا بیشک سچائی سے کہہ رہا ہے، اخلاص سے کہہ رہا ہے، مگر اس کے خلاف حجت ہمارے پاس موجود ہے خدا کی طرف سے کوئی دلیل آگئی ہمارے ہاتھ میں، غرض اس کو کیوں مانیں؟ گو کہنے والا سچا ہے، بے غرض ہے، مخلص ہے، مگر ہماری ایک حجت سامنے ہے اسے کیوں مانیں؟ ظاہر بات ہے کہ حجت تو کوئی تھی نہیں ان کے پاس اس واسطے کہ حجت میں جو چیز ہوتی ہے وہ تو وہ ہے جو نبی کے ذریعے آئی ہو، وہ حجت ہی ہوتی ہے تو وہاں دین ابراہیمی علیہ السلام کو ختم کر چکے تھے مشرکین مکہ، وہ دین آسمانی ہی پر باقی نہیں تھے، یہودیت، نصرانیت کی طرف وہ بھی مائل تھے، اور ان میں بھی تحریف ہو چکی تھی، اور دین ابراہیمی باقی نہیں رہا تھا تو سوائے ادہام اور خیالات کے اور تھا کیا ان کے پاس؟ حجت دلیل کہاں تھی؟ کیا حجت، دلیل انھیں بتلاتی تھی کہ پتھر کی مورٹیوں کے آگے جھکا کرو؟ کیا حجت اور دلیل کا کام تھا کہ وہ ننگے اور برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے، یہ کس دلیل سے سمجھا تھا انھوں نے، کیا یہ حجت اور دلیل کی بات تھی کہ نکاحوں کی چار قسمیں بنا رکھی تھیں، ایک تو اصلی نکاح جو:۔۔۔ یہ کہ اگر کسی کے ہاں اولاد بد صورت ہوتی ہو تو کسی خوب صورت آدمی کے ہاں بیوی بھیج دیتا وہاں سے اولاد حاصل کرے وہ میری اولاد کہلائے گی، یہ ان کے ہاں جائز تھا۔ وہ

عقد نکاح کر لیتے تھوڑی دیر کے لئے اس کو کر لیا اور پھر اس کو الگ کر دیا، یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک نے نکاح کر لیا اور کئی بھائیوں کے لئے ایک بیوی ہی کافی ہو گئی یہ حجت اور دلیل کی بات تھی؟

اس کا نہ عقل ساتھ دے اور نہ نقل ساتھ دے، تو مطلب یہ کہ اللہ کے رسول نے جو حکم دیا ہے اگر اس لئے نہیں مانتے کہ ہمارے پاس پہلے سے کوئی سچی بات موجود ہے تو وہ کیا ہے لاؤ؟ وہ سچائی پیغمبر سے آئی ہوتی تو تمہارے ہاں دین ابراہیمی ختم ہو چکا، پیغمبر کا واسطہ ہی نہیں رہا، وہ ہے کہاں سچی بات؟ تو جب نہ کہنے والے میں خود غرضی کا تشائبہ ہے اور نہ تمہارے پاس کوئی حجت ہے، اور پھر بھی نہیں مانتے سچی بات کو، تو سوائے ہٹ دھرمی عناد اور ضد کے علاوہ کیا چیز ہے؟ اور جب ثابت ہو گیا کہ یہ محض عناد سے انکار کر رہے ہیں، تو دل میں غیض پیدا ہوتا ہے یا تو ان کم بختوں کے لئے بدعا کرو یا یہ کہ ان سے بات کرنی چھوڑ دو ممکن تھا کہ قلب مبارک میں خیال آ جاتا کہ میاں چھوڑ وانھیں، یا یہ کہ بدعا کر دیتے کہ نہیں مانتے کم بخت یہ آپ کے بلند مرتبے سے مناسب نہیں تھا، اس لئے تسلی کا مضمون ارشاد فرماتے ہوئے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔

ثبات قلب کی ترغیب..... اس مقام پر آ کر آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیے گا، یہ ارشاد ہے حضرت یونس بن متی علیہ السلام کی طرف جن کو مچھلی کے پیٹ میں قید کیا گیا تھا کہ انھوں نے قوم کے حق میں غصہ میں آ کر بدعا کر دی اور عذاب کا وعدہ دے دیا تھا آپ ایسا نہ کیجئے گا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی بڑی اعلیٰ بستیاں جو تھیں وہ اردن اور فلسطین میں آباد تھیں زرخیز خطہ تھا، آج بھی ہے، اس زمانے میں شام کا ملک عام تھا، اس میں فلسطین، اردن یہ سب شامل تھے، آج وہ حصے (بخرے) ہو گئے، اردن الگ ہو گیا، شام کا حصہ الگ ہو گیا، سینا کا حصہ کٹ گیا، لیکن اصل جغرافیہ میں شام کا ملک عام تھا، جس میں اردن، فلسطین صحرائے سینا شامل تھے، یہی بنی اسرائیل کا مسکن تھا، تو بنی اسرائیل آباد تھے، اس زمانے میں اولوالعزم پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے، اور اس زمانے کا بادشاہ تھا حزقیاہ اور وہ تابع تھا حضرت یوشع علیہ السلام کے، ان کا نام حضرت یوشع یا یاشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔

بنی اسرائیل میں نبوت و ملوکیت کی ترتیب..... بنی اسرائیل میں حق تعالیٰ کی سنت کریمہ یہ تھی کہ ایک خاندان میں نبوت چل رہی تھی اور ایک خاندان میں بادشاہت چل رہی تھی، نبی احکام بھیجتے تھے، اور بادشاہ ان احکام کو نافذ کرتا تھا، بادشاہ اپنی طرف سے حکم نہیں بھیجتا تھا بس قوت نافذہ اس کے ہاتھ میں تھی اور قوت آمرہ پیغمبروں کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے کہا کہ اللہ کا یہ حکم ہے انھوں نے ملک میں قوت سے نافذ کر دیا، یا کوئی مشکل پیش آئی تو انبیاء کے آگے شکایت کر دی، انھوں نے تدبیر بتلائی بادشاہوں نے نافذ کر دی، تو شرافت کا یہ طریق تھا بنی اسرائیل میں کہ ایک سلسلہ نبوت کا تھا اور ایک سلسلہ بادشاہت کا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ احسان بتایا گیا بنی اسرائیل پر: ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ بِقَوْمِ أَذْكَرُوا نِعْمَةً اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ

وَجَعَلَكُمْ مَلُوكًا ﴿١﴾ موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو کہا کہ اے قوم احسان مانو اللہ کا اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ ﴿ادْجَعَلْ فِیْكُمْ اَنْبِیَاءَ﴾ تم میں نبی بھی پیدا کئے، ملوک اور سلاطین بھی پیدا کئے، ایک مستقل خاندان کے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام آرہے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل میں پیغمبر آئے ہیں، اور ایک شاخ بادشاہت کی طرف چل رہی ہے اور پے درپے سلاطین اور بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ آرہے ہیں تو بادشاہ تابع ہوتے تھے انبیاء کے، انبیاء احکام شریعت دیتے تھے، وہ اس کو نافذ کرتے تھے۔

یوشع علیہ السلام اور حذقیہ بادشاہ کا واقعہ..... تو اس زمانے کے اولوالامر پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے، اور حذقیہ بادشاہ تھا، اس طرح سے سلطنت چل رہی تھی، اور نبوت بھی تھی تو شام اور عراق کے درمیان میں چند بستیاں تھیں موصل اور نینوا، اس میں کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی آباد تھے اور ان کی اپنی حکومت تھی، وہ موقع پا کر چڑھ دوڑے بنی اسرائیل کے اوپر اور اردن کے اوپر انھوں نے حملہ کیا سرحدیں ملی ہوئی تھیں اس حملے میں بنی اسرائیل کا نقصان ہوا، وہ بہت زیادہ مال، اسباب لے گئے، ہزاروں آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گئے، عورتوں اور بچوں کو بھی اور شکست دے دی حذقیہ جو بادشاہ تھے وہ پریشان ہوئے اس لئے کہ ملک ویران ہو گیا، ہزاروں آدمی قیدی بن کر چلے گئے، بنی اسرائیل میں انھوں نے آ کر شکایت کی حضرت یوشع علیہ السلام سے کہ یہ صورت حال پیش آئی، ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اس قوم پر حملہ کریں اور چھڑا لائیں اپنی قوم اور بستی کو، مگر ایک ڈر یہ ہے کہ ہمارے ہزاروں آدمی قید ہیں، جب ہم حملہ کریں گے وہ ان سب کو ذبح کر دیں گے، تو کسی کا باپ مارا جائیگا کسی کا بیٹا، کسی کا بھتیجا، ہزاروں کے رشتہ دار ختم ہو جائیں گے، یہ مصیبت ہمیں پیش آ رہی ہے ورنہ ہم حملہ کر دیں، اس کی کیا صورت ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قوم کی آزادی کے لئے انتخاب..... حضرت یوشع علیہ السلام نے فرمایا کہ: ایک دم حملہ مت کرو، حجت تمام کرو اور وہ یہ ہے کہ اپنے میں سے کسی پیغمبر کو بھیجو کہ وہ جا کر ہدایت کرے اور نصیحت کرے، اور یہ کہے کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ دو کہ تم نے ظلم ان کو قیدی کیا اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم پر عذاب خداوندی آئے گا، اگر وہ مان گئے اور بنی اسرائیل کو حوالے کر دیا تب تو ہمارا مقصد حاصل، پھر لڑنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ مانے تو حجت تمام ہو گئی، اس کے بعد اگر جنگ ہوگی تو مرحل ہوگی، انھیں کوئی الزام دینے کا موقع نہیں رہے گا تو بادشاہ کی سمجھ میں آ گیا عرض کیا کہ کسے بھیجیں فرمایا کہ اس وقت پانچ پیغمبر ہیں اور پیغمبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ سچے ہیں صادق اور کامل الاخلاص ہیں ان میں سے ایک کو مامور کر دو کہا کہ حضرت آپ ہی کسی کا انتخاب فرمادیں، محض بادشاہ کا حکم پیغمبروں میں چلے یہ بے ادبی کی بات ہے کہ جرأت کروں کہ میں پیغمبروں سے کہوں کہ آپ جائیے، آپ اولی الامر پیغمبر ہیں اسلئے آپ فرمادیں، تو انھوں نے انتخاب کر لیا کہ میری رائے میں مناسب یہ ہے کہ یونس بن متی علیہ السلام کو بھیجیں وہ بہت بڑے امانت دار قوی الحوصلہ اور صاحب عزم ہیں وہ صاحب عزم

ہیں وہ جا کر نصیحت کریں گے، اور یہ بھی ان میں قوت ہے کہ اگر نصیحت نہ مانے تو وہ کوئی معجزہ دکھائیں کوئی کرامت دکھلائیں، اس سے متاثر نہ کریں، پھر بھی نہ مانے تو تمہیں حق ہوگا کہ فوج کشی کریں۔

میرے نزدیک یہی بہتر ہے کہ یونس بن متی کو بھیجو، تو حزیقہ نے گھر کا آدمی بھیجا حضرت یونس علیہ السلام تشریف لائے، حزیقہ بادشاہ نے کہا کہ حضرت اس طرح آپ کا انتخاب ہوا ہے اور حضرت یوشع نے انتخاب کیا ہے میں تو واسطہ ہوں، میری عرض یہ ہے کہ آپ تشریف لے جائیں اور جا کے نصیحت کریں، اس قوم کو جو ہمارے بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے لے گئی ہے، فرمایا کہ یہ وحی کے ذریعے ہے؟ فرمایا انھوں نے امر خداوندی ہے، فرمایا اگر یہ امر الہی ہے تب تو ہر صورت میں جاؤنگا، تعمیل مجھ پر فرض ہے، اور اگر محض رائے کی بات ہے تو میرے اوقات میں خلل پڑے گا، معمولات بگڑ جائیں گے، صبح شام عبادت کے میرے معمولات ہیں تو میرا سا نظام بگڑ جائے گا، اس لئے کسی اور کا انتخاب کیا جائے، حزیقہ نے کہا کہ یہ وحی سے تو نہیں کیا مشورہ ہے (یونس علیہ السلام) نے کہا پھر مجھے چھوڑ دو، اس نے کہا کہ آپ کے سوا کسی اور کا انتخاب نہیں ہوا، جانا آپ کو پڑے گا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی بنی اسرائیل کی آزادی کے لئے روانگی..... جب مجبور کیا تو رنجیدہ ہوئے مگر کہا کہ بہت اچھا میں تعمیل حکم کرتا ہوں، اس لئے کہ تم بادشاہت میں امر کر رہے ہو پیغمبر کی طرف سے وہ اولوالامر پیغمبر ہیں، لہذا مجھ پر اطاعت واجب ہے چاہے وہ رائے و مشورہ ہی ہو حکم اور وحی نہ ہو لیکن بہر حال عظمت تو ہے ہی انبیاء کرام کی مشورہ بھی دیں تو وہ سو حکم سے بڑھ کر ہے ہمارے لئے، اس لئے بہر حال میں جا رہا ہوں۔ بادل نخواستہ سفر کی تیاری کی اور چونکہ عرصہ لگتا طویل اس لئے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا اور روانہ ہو گئے، اس قوم کا جو دار السلطنت تھا وہاں پہنچے اور وہاں جا کر دربار شاہی سے اجازت چاہی تو اجازت مل گئی، جا کر حضرت یونس علیہ السلام نے نصیحت کی اور کہا کہ: ”بے وجہ تم نے ہماری قوم پر حملہ کیا، چلو حملہ ہو گیا تھا، مگر قیدی بنا کر لائے، یہ پیغمبر زادے ہیں واجب الاحترام ہیں تم نے انھیں قیدی بنا لیا تو کچھ تو شرم کرنی چاہئے، اول تو مجرم بنایا، بے وجہ جرم عائد کیا اور بے وجہ جو صاحب احترام تھے انھیں گرفتار کیا، یہ ہرگز مناسب نہیں چھوڑ دو بنی اسرائیل کو“ بادشاہ نے اور دربار والوں نے مذاق اڑایا کہ ایک بزرگ سفید پوش آگیا، اس نے مجنونانہ آ کر کہہ دیا کہ ان کو چھوڑ دو اتنی محنت سے ہم نے جنگ کی اتنے آدمی ہمارے مارے گئے لاکھوں روپیہ خرچ ہوا اور جب قیدی بنا کر لائے گئے تو ان کے کہنے سے چھوڑ دیں یہ حکومت ہے کھیل تھوڑا ہی ہے کہ کسی نے آ کر کہہ دیا: چھوڑ دو اور چھوڑ دیا۔ تو مذاق اڑایا اور تمسخر کیا، اگلے دن آپ پھر تشریف لے گئے یونس بن متی علیہ السلام، پھر نصیحت کی، انھوں نے پھر تمسخر کیا، استہزاء کیا بات نہیں مانتے تھے، تیسرے دن پھر نصیحت کے لئے گئے اور پھر جا کر کہا انھوں نے نہیں مانا فرمایا: کہ نہیں مانتے تو اب میں کہتا ہوں کہ تمہارے اوپر عذاب خداوندی آئے گا۔

بادشاہ کا آزادی دینے سے انکار اور حضرت یونس علیہ السلام کی تنبیہ..... فرمایا: تم میں سے ایک بھی

زندہ نہیں بچے گا سب ہلاک ہو جائیں گے، یہ ملک بھی ویران ہو جائیگا، اس دن یہ کہہ کر چلے گئے، وہاں لوگوں میں جو ذمہ دار تھے حکومت کے، انھوں نے کہا کہ صاحب اس عذاب کی کوئی میعاد ہے؟ فرمایا: ہاں! چالیس دن کے اندر اندر آجائیگا..... یہ کہہ دیا، انھوں نے مذاق اڑایا، تمسخر کیا اب حضرت یونس علیہ السلام نے دعاء کی کہ: اے اللہ! میں چالیس دن کہہ چکا ہوں میری لاج رکھ لیجئے، ورنہ میں ذلیل ہو جاؤنگا، اور اگر چالیس دن میں عذاب نہ آیا تو اس قوم کا قاعدہ یہ ہے کہ جھوٹے کو قتل کر دیتے ہیں، تو میں جان سے بھی جاؤنگا، آبرو بھی جائیگی اس واسطے چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیجئے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ کس نے کہا تم سے چالیس دن کی میعاد دے دو، تم نے محض اپنی رائے سے (مدت) رکھی گویا لازم کر دی، یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے، تم نے غلط حرکت کی اب نادم اور شرمندہ مگر دعایہ مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! عذاب بھیجے اس قوم پر ورنہ میں رسوا ہو جاؤنگا جب پچیس دن گزر گئے اور عذاب کے آثار نہ نمایاں ہوئے تو مایوس ہو کر بستی سے کافی دور جا کر ٹھہرے کہ عذاب تو آ نہیں رہا اور میں جھوٹا ہوں گا اور میری خفت ہوگی۔ ممکن ہے میری جان بھی جاتی رہے اور پھر یہی درخواست کہ یا اللہ عذاب بھیجے، فرمایا: کہ کیسے بھیج دوں کیوں تم نے کہا ہم چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیں جب ہم نے تم پر مشکف نہیں کیا وجہ نہیں سمجھی از خود تم نے کیسے چالیس دن کا وعدہ دے دیا؟ اب بہت پریشان ہوئے لیکن بہر حال پیغمبر کا قول تھا بچوں کی بات اللہ سچی بھی کرتا ہے۔

آثار عذاب اور قوم کی توبہ..... اس کے بعد جب ۳۵ دن گزرے اور تو حضرت یونس علیہ السلام مایوس ہو گئے کہ عذاب نہیں آئے گا اور میں جھوٹا ہوں گا، تو اس ملک کو چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور ادھر حق تعالیٰ نے عذاب کے آثار بھیجے اور قوم نے دیکھا کہ آسمان سے سیاہ قسم کے بادل تہہ در تہہ ہو کر آ رہے ہیں اور اسٹیں سے دھواں نکل رہا ہے اور وہ دھواں قریب ہوتا جا رہا ہے اب لوگوں کو یقین ہوا کہ بیشک پیغمبر تھے جو بات کہی وہ سچی کہی یہ تو عذاب آیا اور یہ کہ آگیا تو ایک نہیں بچے گا اب فکر پڑی بادشاہ کو بھی وزراء کو بھی امراء دولت کو بھی اور قوم کو بھی، تو بادشاہ کی طرف سے اعلان ہوا کہ نکل کر میدان میں جائیں اور اپنے گریبان کھول کر کے اللہ کے سامنے فریاد کرنی شروع کر دو اور روؤ پیو حق تعالیٰ کے سامنے کہ یہ تو آ گیا عذاب۔ چنانچہ ساری قوم شہر سے باہر نکلی ننگے سر، ننگے پیر، بادشاہ بھی ساتھ، وزراء بھی ساتھ، ننگے سر، ننگے پیر، گریبان کھلے ہوئے، بال بکھرے ہوئے، روتے ہوئے آ کے سجدے میں گرے، اور کہا کہ: اے اللہ! ہم سے غلطی ہو گئی، تیرے نبی نے جو وعدہ دیا تھا، وہ سچا تھا، اور آپ اس عذاب کو اتھا دیں تو ہم بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، اور جو علاقہ لیا وہ بھی چھوڑ دیں گے، دو تین دن تک مسلسل اسی طرح شہر سے باہر آ کے روتے رہے، حق تعالیٰ کو یہ عجز و انکسار پسند آیا اور وہاں تو عجز و انکسار ہی پسند ہے کبر و نخوت پسند نہیں ہے، کبر اور کبریائی یہ اسی کا خاصہ ہے کسی بندے کو حق نہیں ہے تکبر کرنے کا، بندے کا حق یہی ہے کہ وہ عجز اور فروتنی اور خاکساری اور جھکتا ہی اختیار کرے، حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور تین دن رہ گئے تھے

چالیس دن ہونے میں کہ وہ دھواں اوپر اٹھنا شروع ہوا اور چند گھنٹے میں پورا آسمان صاف ہو گیا، جو کئی دن سے سیاہی پھیلی ہوئی تھی آسمان پر اور دھواں پھیل رہا تھا وہ سب صاف ہو گیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش..... اب یہ مطمئن ہوئے تو بادشاہ نے آدمی دوڑائے کہ اس گدڑی پوش فقیر کو پکڑ کر لاؤ کہ اس کے آگے بھی ہاتھ جوڑیں اور ان سے کہیں کہ تم بھی دعاء کرو اور بنی اسرائیل کو ان کے حوالے کریں اور جو جوانھوں نے کہا تھا اس کی تعمیل کریں، اور ان پر ایمان لائیں انہی کے مطابق سب چلیں۔ یونس علیہ السلام ملک چھوڑ کر جا چکے تھے کہ جب عذاب نہیں آ رہا تو میری خفت ہوگی، تو میں اس ملک میں نہیں رہ سکتا، ادھر بادشاہ نے اعلان کیا کہ ڈھونڈو اس فقیر کو جہاں بھی ہو، حتیٰ کہ یہ اعلان کیا کہ جو لے آئے گا انھیں تو ایک دن کے لئے پوری سلطنت کا مالک بنا دوں گا، اس ایک دن میں وہ جو چاہے خرچ کرے، جو چاہے اپنے لئے لے لے اس کارخانے میں سے جو چاہے لے، جاگیریں، املاک ایک دن کے لئے ملک اس کا۔ تو سینکڑوں آدمی نکل گئے ڈھونڈنے مگر پورے ملک میں ڈھونڈ لیا لیکن یونس علیہ السلام کا پتہ نہ چلا، یونس علیہ السلام نے سوچا اور کچھ دیہاتیوں سے معلوم ہوا کہ کچھ آثار عذاب کے آئے تھے اور وہ رفع ہو گیا، اور آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں یہ یوں سمجھے کہ عذاب نہیں آیا تو میرے قتل کرنے کے لئے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام پر آثار عتاب کا آغاز..... تو میں وہاں جا کر جان خواہ خواہ جو کھوں میں ڈالوں، میری بات تو ہوئی نہیں اور سخت مغموم اور رنجیدہ کہ میری بات تو رہی نہیں، اللہ نے مجھے وہاں کر دیا حالانکہ وہاں تو ان کی انتہائی عزت ہو رہی ہے اور انھیں پتہ نہیں، اور یہ سوچ رہے ہیں کہ میں وہاں گیا تو اور ذلت ہوگی میری، اور ادھر شام کی طرف بھی نہیں لوٹے کہ اپنوں میں جب جاؤں گا تو وہ الگ مجھے ذلیل سمجھیں گے کہ تجھے بھیجا تھا اصلاح کے لئے وہ تو نہ ہو سکی وعدے دیئے وہ پورے نہ ہوئے اور اللہ کے ہاں بھی تم ملزم قرار پائے، تو تمھاری کوئی وقعت نہیں تو نہ وہاں وقعت ہوگی اور نہ یہاں تو میں کسی تیسری جگہ جاؤں اور یہ کہہ کے قدم بڑھایا اور دل میں آ گیا کہ میں حق تعالیٰ کی نظر سے گر گیا ہوں اور میرے سے غلطی ہوئی اور میں نے بلامرضی حق چالیس دن کا وعدہ دے دیا جو مجھے حق نہیں تھا، غلطی کا احساس ہوا اور وہ وجہ عتاب بنی، جب روانہ ہوئے تو صورت حال یہ ہوئی کہ تشریف لے جا رہے تھے بیوی بچے پیدل ساتھ، ایک درخت کے نیچے بیوی کو بھی بٹھلادیا اور بچوں کو بھی، اور خود کھانا تلاش کرنے گئے وہاں کوئی شہزادہ نکل رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین و جمیل عورت دو بچوں کو لئے بیٹھی ہے اس نے حکم دیا کہ اس عورت کو گرفتار کر کے ہمارے محل میں داخل کر دو اس کی طبیعت مائل ہو گئی، عورت بیوی حضرت یونس علیہ السلام کی وہ تو گرفتار ہو کر شہزادے کے ساتھ چلی گئی، اب جو آئے تو دیکھا کہ بیوی نہیں ہے تو دیہات والوں نے بیان کیا کہ اس طرح ایک بادشاہ زادہ آیا اور وہ آپ کی بیوی کو لے گیا، سمجھ گئے کہ یہ عتاب کے آثار شروع ہو گئے صبر و شکر کیا دو بچوں میں سے ایک کو کندھے پر لیا اور ایک کا ہاتھ پکڑا اور دریا کے

پار ہونا چاہا اور یا ایسا تھا کہ کشتی کی ضرورت نہیں تھی، دریا میں اترے تو ایک بچے کو چھوڑ دیا کنارے پہ کہ ایک کو اس کنارے چھوڑ کر پھر اس کو لے جاؤں گا جب بچہ منجھدار پہنچے تو بھیریا آ کر اس بچے کو اٹھالے گیا اس کی پریشانی میں جب دوڑے بچانے کو تو جو کندھے پر تھا وہ پانی میں گر پڑا وہ بہہ گیا بیوی بھی گئی، بچے بھی گئے اب سمجھ گئے کہ میں اس وقت زیر عتاب ہوں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ چیزیں بطور عتاب کے بطور سزا کے مجھ پر مسلط ہیں استغفار کر رہے ہیں رو رہے ہیں اسی طرح روانہ ہوئے۔

کشتی میں سواری..... اب بلا خرابی بڑا اور یا آ گیا تو کشتی میں بیٹھے اور اس سے کہا کہ بھائی کرایہ تو میرے پاس ہے نہیں میں مفلس ہوں، تم لودہ اللہ مجھے بٹھالو، تو کشتی والے نے کہا کہ آپ کو ضرور بٹھلائیں گے آپ کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ آپ کوئی بہت بڑے صالح اور نہایت ہی عابد اور زاہد لوگوں میں ہیں، تو ہماری کشتی میں برکت ہو جائے گی، میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا، آپ تشریف رکھیں بڑے احترام سے بٹھلایا، جب بچہ منجھدار کے کشتی پہنچی تو ایک دم طوفان نے آ کر کشتی کو گھیرا اور کشتی کا ملاح پریشان ہوا کہ کیا صورت ہوگی، تو اس زمانے میں چونکہ لوگ نیک دل ہوتے تھے، اور محض پیسے کے پجاری نہیں تھے، بلکہ کچھ تعلق مع اللہ بھی ہوتا تھا، تو کہتا تھا کہ آ کر کہا کہ صاحب! تجربہ یہ ہے کہ جس قسم کا طوفان ہے یہ جب آتا ہے کہ جب میری کشتی میں کوئی ایسا شخص ہو کہ جو اپنے مالک کا نافرمان اور آقا سے بھاگا ہو غلام ہو، یہ اس قسم کا طوفان آ رہا ہے تو اس وقت کشتی میں کوئی ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جو آقا کا نافرمان ہے اور اپنے مالک کا نافرمان غلام ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ یہ خاص نوعیت کا طوفان ہے اور یہ جیسی آتا ہے جب کوئی عبدِ آبق بھاگا ہو غلام آجائے جس سے آقا راضی نہ ہو، تو اس نے کہا کہ جو ہودیانہ وہ اپنے کو ہمارے حوالے کر دے ہم اسے دریا میں ڈبو دیں گے ایک کی جان چلی جائے آسان ہے نسبت اس کے کہ ایک کی وجہ سے ساری کشتی تباہ ہو جائے اور کئی آدمی ضائع ہوں تو ایک اپنے کو حوالے کر دے، اس کے بغیر یہ طوفان ٹٹنے والا نہیں، میرا تجربہ یہ ہے۔ یونس علیہ السلام اٹھے اور کہا کہ میں وہ غلام ہوں جو آقا سے بھاگ گیا ہے اور نافرمانی کی ہے میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں بھائی مجھے غرق کر دو تا کہ سب کشتی والوں کی جان بچ جائے وہ عبدِ آبق میں ہوں بھاگا ہو غلام، لوگوں نے کہا کہ معاذ اللہ آپ ایسے نہیں ہو سکتے آپ کے چہرے پر بزرگی کے آثار ہیں اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں تو اضعاف کہہ رہے ہیں آپ جیسا نافرمان ہو گا تو پھر فاماں بردار کہاں رہے گا دنیا میں؟ آپ تو اضعاف کہہ رہے ہیں۔

کشتی میں قرعہ اندازی..... ہم قرعہ ڈالتے ہیں پوری کشتی میں جو نکل آئے تو قرعہ ڈالا تو قرعہ میں جب دانہ اٹھایا تو نام یونس علیہ السلام کا نکلا، اب کشتی والے حیران ہوئے سمجھے کہ ہمارا قرعہ غلط ہو گیا، یونس علیہ السلام ایسی مقدس صورت والا آدمی عبدِ آبق بھاگا ہو غلام کیسے ہو سکتا ہے، دوبارہ قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام آیا، پھر یقین نہ آیا کشتی والوں کو، تیسری دفعہ پھر قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام نکلا تب عاجز ہو کر بیٹھ گئے یونس علیہ السلام نے فرمایا: کہ میں

حقیقتاً اپنے مالک کا بھاگا ہوا غلام ہوں میں زیر عتاب ہوں۔

مچھلی کے پیٹ میں..... میں اپنی وجہ سے تمہاری جانیں ختم کرنا نہیں چاہتا میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں، تم مجھے ڈبو دو، تاکہ کشتی والوں کی جان بچ جائے، مجبور ہو کر ڈبو دیا اور ڈال دیا دریا میں، ایک دم طوفان مٹ گیا اور کشتی آگے روانہ ہو گئی، وہاں ایک مچھلی منہ کھولے ہوئے کھڑی تھی، ایک بڑی مچھلی وہ بھوکی تھی، اسے غذا کی ضرورت تھی، اس نے لپک کے یونس علیہ السلام کو پکڑا اور اپنے پیٹ میں لے لیا، حق تعالیٰ نے اس کے قلب میں القاء فرمایا کہ یہ ہمارے پیغمبر ہیں ان کو کوئی اذیت نہ پہنچے، ہم نے تیرے پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کے لئے یہ غذا کے لئے اور غذا کے طور پر نہیں ڈال رہے تیرے پیٹ میں، بلکہ اس لئے ڈال رہے ہیں کہ کچھ سزا دینی ہے، بس پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کو اسی میں رکھ، بچاری نے بے چبائے نگل لیا اسے من جانب اللہ حکم تھا، اور اس کی ساخت اس وقت اللہ نے ایسی کر دی کہ وہ جیل بن گئی، وہ انتڑیاں و منتڑیاں جو تھیں وہ فراخ ہو گئیں، اور یہ بہت بڑی مچھلی تھی باطمینان یونس علیہ السلام اس کے پیٹ میں گئے، اب بہر حال وہاں بند ہیں حق تعالیٰ نے سانس کا سامان سب کچھ کیا مگر نہ غذا، نہ روٹی۔

القاء دعاء..... چالیس دن گزر گئے مچھلی کے پیٹ میں اخیر میں حضرت یونس علیہ السلام کے قلب میں حق تعالیٰ نے وہ دعاء القاء فرمائی جو نجات کا ذریعہ بنی، وہ دعاء یہ تھی: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَنَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ ① جسکو ہم آیت کریمہ کہتے ہیں یہ دعاء ہے یونس علیہ السلام کی، یہ بڑھی یونس علیہ السلام نے اس کی برکت سے اس مچھلی کو ایک امتلاء اور غشایان پیدا ہوا، جیسے مٹی ہوتی ہے اور اس نے ایک کنارے پر آ کر قے کی تو یونس علیہ السلام باہر نکل آئے اور وہ روانہ ہو گئی۔

مچھلی کے پیٹ سے نجات، لباس اور غذا کا سامان..... یونس علیہ السلام چونکہ چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں رہے ہو، ابھی بند تھی، غذا ابھی نہیں تھی، اس لئے کمزور بھی ہو گئے تھے اور بدن اتنا زما گیا تھا کہ اگر چیونٹی بھی بیٹھتی تھی تو یوں معلوم ہوتا جیسے تیر لگا ہو، کبھی بھی بیٹھتی تو یہ معلوم ہوتا جیسے بر جھا لگ گیا، بہت اذیت ہوتی تھی، حق تعالیٰ نے وہیں ایک کدو کی بیل لگائی چوڑے چوڑے پتے اتنے ان کے ارد گرد پھیل گئے کہ وہ بمنزلہ لباس کے بن گئے، اور اس کے قریب نہ کبھی آتی تھی نہ چھمڑا تا تھا اس نے مثل لباس کے پورے بدن کو ڈھانپ لیا تو بدن کی حفاظت حق تعالیٰ نے اس طرح سے فرمائی کہ یقیناً کدو کی بیل لگا دی، اب بھوک کی وجہ سے بے تاب تھے، چالیس دن کچھ بھی نہ ملا تھا، اور خود ملنے کی سکت نہ تھی اور کچھ کرتے بھی تو وہ بیل کدو کی لپٹ گئی چاروں طرف سے حفاظت کے لئے حق تعالیٰ نے ایک ہرنی کے قلب میں القاء کیا، اس نے آ کر ان کے منہ کے قریب اس طرح اپنے تھن کئے کہ تھن منہ میں پہنچ گئے، چوسا تو دودھ آنا شروع ہو گیا، وہ روز آتی اور روز آ کر کے دودھ پلا جاتی، تو میں پچیس دن جتنے اللہ کے علم میں ہیں وہ ہرنی دودھ پلا جاتی اور کدو کے پتے سے بدن تنھا گیا۔ پچیس، تیس دن

میں اب اس قابل ہو گئے کہ اٹھ سکیں اس وقت حق تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑا کے دعا کی کہ اے اللہ! بیشک مجھ سے غلطی ہوئی مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ وعدہ دوں چالیس دن کا، بغیر آپ کی منشا اور فرمان کے مجھ سے غلطی سرزد ہوئی آپ ہی معاف فرمانے والے ہیں اور بہت روئے اور استغفار کیا حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور معاف فرمایا۔

منصب رسالت کا اعزاز..... اور اب تک نبوت تھی اب رسالت اور اصلاح کا عہدہ بھی دیا کہ تمہیں ہی مبعوث کیا جا رہا ہے اس قوم کی طرف کہ جس کی طرف تم گئے تھے اور تم جاؤ اس کی طرف، اب اطمینان سے انشراح کے ساتھ چلے تو ایک درخت کے نیچے جب پہنچے تو دیکھا کہ کچھ دیہاتی کھڑے ہیں ایک عورت کو لئے ہوئے، یونس علیہ السلام نے دیکھ کر پوچھا کہ بھائی یہ کون ہے تو دیہاتیوں نے کہا کہ یہ ایک عورت ہے جس کو شہزادہ لے گیا تھا پکڑ کے یہ کسی بزرگ کی بیوی تھی لیکن لے جاتے ہی جب اس نے بری نیت کا اظہار کیا تو وہ اس دن سے آج تک اتنا مریض ہے کہ چار پائی سے اٹھنے کے قابل نہیں پیٹ میں اس کے درد ہے، اس وجہ سے اس نے با احترام اس عورت کو رکھا اور اس کا احترام کیا عزت کی وہ اپنی عبادت میں لگی رہی۔

آثارِ رضا..... اب وہ شہزادہ اس ٹوہ میں ہے کہ وہ بزرگ کہیں سے مل جائیں جن کی بیوی کو میں لے گیا تھا، میں ان سے دعا کروں گا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی یہ میری ہی بیوی ہے اور میں وہی شخص ہوں کہ جس کی بیوی کو لے گیا تھا انہوں نے کہا حضور وہ شہزادہ مر رہا ہے وہ تو آپ کی تلاش میں ہے، یونس علیہ السلام گئے اور اس کے لئے دعا کی اس کو اللہ نے اچھا کیا تو بیوی مل گئی، اس کے بعد کشتی میں بیٹھے ایک کنارے پر پہنچے تو کچھ لوگ ایک بچے کو لئے ہوئے کھڑے ہیں، اور انہوں نے کہا کہ صاحب یہ ایک بچہ تھا جس کو ایک بھیڑیا لے گیا تھا، ہم نے بمشکل بھیڑیے کو مار مار کے بچے کو حاصل کیا، یہ زخمی ہو گیا تھا تو ہم نے علاج کیا دو کی اب یہ بالکل تندرست ہے، یہ یوں کہتا ہے کہ میرا ایک بوڑھا باپ میرے ساتھ تھا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ باپ میں ہی ہوں یہ بچہ میرا ہے، بچہ حق تعالیٰ نے دے دیا کچھ آگے چلے تو چند دیہاتی اور ملے کہ جی یہ بچہ دریا میں بہتا ہوا جا رہا تھا موجوں میں، ہم نے اسے پکڑا، پکڑ کے اس کا پیٹ ویٹ صاف کیا، پانی نکالا یہ کسی لاوارث کا بچہ معلوم ہوتا ہے لاوارث ہے، فرمایا کہ نہیں یہ بچہ میرا ہے تو انہوں نے کہا کہ آپ کو مبارک ہو بچہ بھی مل گیا۔ اب اس کے بعد یونس علیہ السلام آگے بڑھے اور حق تعالیٰ کی رضا کے آثار آنا شروع ہوئے تو آزمائش بھی بہت ہوئی ہے کہ جب کوئی عہد دیتے ہیں تو پھر جانچ بھی خوب کی جاتی ہے، دوستی کو بھی پرکھا جاتا ہے جب جا کر فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو یہ سامنے گاؤں آ رہا ہے، فلاں کہہ رہا ہے جو برتن پکاتا ہے، اس نے آج ہی اپنا آوا نکالا ہے، سینکڑوں قسم قسم کے برتن رکھے ہیں اس سے جا کے یوں کہو کہ لاٹھی لے کر سارے برتنوں کو پھوڑ دو یہ اس سے کہو، اگر وہ پھوڑ دے تب تو ٹھیک اور نہ پھوڑے تو جو جواب دے وہ آکر ہماری جناب میں عرض کرو یونس علیہ السلام گئے اور وہ آوا کھول کر کے اس نے برتن نکائے، گھڑے اور مکے، طرح طرح کی صراحیاں پیالے نکا کر

رکھے ہوئے تھے، اسے امید بندھ گئی تھی کہ اب یہ بکس گے تو گزر چلے گا، یونس علیہ السلام پہنچے کہ لالچی لے کر پھوڑ کیوں نہیں دیتے انہیں، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے اتنی محنت سے میں نے بنائے چالیس دن تک آگ میں رہے پکا کے اب امیدیں برلانے کا وقت آیا تو کہتا ہے کہ پھوڑ دے، دنیا میں کہیں ایسا ہوا، واپس آئے نماز پڑھی سجدے میں عرض کیا یا اللہ یہ جواب دیا، فرمایا کہ ایک کبھار چالیس دن میں چند برتن بناتا ہے، اس کا دل اتنا انکا ہوا ہے کہ پھوڑ ناگوار نہیں تم نے جو ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے حق میں چالیس دن کا وعدہ دے دیا کہ ہم عذاب نازل کر دیں تو کیا ہمیں تم نے یہ سمجھا تھا کہ بیکار بنایا ہے ہم نے اس مخلوق کو اور ہم اپنے ہاتھ سے پھوڑ دیں، جبکہ ہمارے علم میں تھا کہ ایمان لاسکتی ہے وہ قوم اور اس کے دل میں نرمی آنے والی ہے، ہم کیسے ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دیں۔

پھر توبہ اور استغفار کی کہ بے شک اے اللہ مجھ سے غلطی ہوئی اس کے بعد آگے چلے تو ایک شہر میں گزرے تو بڑی بھاری بلند نگ بنائی تھی کسی تاجر نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بڑا عالی شان محل بنایا، کہا کہ اس سے جا کے یوں کہو کہ سارے محل کو کدال لے کر ڈھا دے، اور جو جواب دے وہ ہمیں آکر کہنا تو جا کر اس تاجر سے کہا کہ کتنے میں بنایا تو اس نے کہا کہ اتنے لاکھ روپے لگے ہیں اتنے ہزار کا فرنیچر ہے، یہ سامان ہے، بولے: دیا سلائی لگا کر جلا کیوں نہیں دیتا اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، کہا کہ تو پاگل آدمی ہے اتنے برسوں میں میں نے محل بنایا لاکھوں روپیہ خرچ کیا محنت کی مزدوری کر کے بنایا اور میں اپنے ہاتھ سے ضائع کر دوں، آکر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ اینٹ گارے کا ایک محل ایک مالک اپنے ہاتھ سے برباد کرنا نہیں چاہتا اور ہم نے یہ اشرف المخلوقات ڈیڑھ لاکھ بنائی تم نے کیسے وعدہ دے دیا کہ ہم اپنے ہاتھ سے ضائع کر دیں پھر شرمندہ ہوئے پھر دعا پھر استغفار پھر توبہ کی۔

پھر ایک باغ سے گزر رہا تو بڑا عالی شان ہرا بھرا فرمایا اس کے مالک سے یوں کہو کہ ابھی دیا سلائی لگا کے سارے باغ کو پھونک دے جتنے مویشی ہیں سب ختم کر دے، اور جو وہ جواب دے ہمیں آکر سناؤ پھر گئے اور مالک باغ کو جا کر کہا، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے، برہنہ بر سر محنت کرنے سے میرا باغ پلا درخت پھل دینے کے قابل ہوئے اور اب میں تیرے کہنے سے دیا سلائی دکھا دوں کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے آکر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ باغ والا تو چار تنکے ضائع نہیں کر سکتا، اور تم نے چالیس دن یہ دعا مانگی کہ میں ان ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دوں جب کہ ان کے اندر استعداد تھی ایمان قبول کرنے کی وہ عذاب کے قابل بھی نہیں تھے، غرض پھر توبہ اور استغفار کی۔

اسی طرح جا رہے تھے ادھر سے وہ لوگ ملے موصل اور نینوا کے اور وہ دیکھ کر لپکے یونس علیہ السلام کی طرف تو پہلے تو ڈرے کہ مجھے قتل کرنے تو نہیں آرہے اس لئے کہ میں نے وعدہ دیا تھا عذاب کا وہ تو آیا نہیں عذاب مجھے جھوٹا سمجھنے لگے مگر معلوم ہوا کہ وہ تو اعزاز و اکرام کے ساتھ، مروت کے ساتھ آرہے ہیں، غرض انہوں نے آکر یونس علیہ السلام کو پہچانا تعظیم و تکریم کی، کہا کہ آپ نے جو وعدہ دیا تھا تو چالیس دن کے اندر اندر عذاب کے آثار نمایاں

ہو گئے تھے لیکن ہم نے توبہ کی استغفار کی اللہ نے وہ عذاب رفع کیا، اس دن سے آج تک آپ کی فکر میں ہیں کہ آپ کہاں ملیں آج آپ ملے تو پھر بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو وہ پورے اہتمام کے ساتھ استقبال کے لئے لے گیا اور ساری قوم نے ایمان قبول کیا، یونس بن مثنیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر اور یقین دلایا اطاعت کا حق تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ منصب رسالت بخشا کہ اب اس قوم کی اصلاح کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقصود تمثیل..... تو اس کو فرمایا جا رہا ہے کہ: ﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْخُوْتِ﴾ اے پیغمبر! مچھلی والے کی طرح مت ہو جانا کہ انہوں نے غصہ میں آ کر تین دن کے بعد عذاب کی دھمکی دی، اور ساتھ میں وعدہ دے دیا چالیس دن کی میعاد مقرر کر دی، اور یہ سب غصہ ہو کر کہا جذبات میں آ کر جس سے کتنے معتب ہوئے، کتنی ان کی آزمائش ہوئی، کتنی تکلیفیں اٹھائیں لیکن وہ آزمائش میں پورے اترے پھر ہم نے انہیں رتبہ دیا، منصب رسالت سے نواز اگر بہر حال ابتدا وہ جذبات دکھا گئے غصہ سے مغلوب ہو گئے بددعا کی، قوم کے لئے عذاب مانگا، آپ کو ہم نے رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا ہے آپ بددعا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، اگر یہ نہیں مانتے باوجود یہ کہ جانتے ہیں کہ آپ خود غرض نہیں کوئی غرض متعلق نہیں، کوئی اجرت نہیں چاہتے، بکمال اخلاص سے انہی کی خیر خواہی کے لئے آپ ہدایت فرما رہے ہیں، اور ساتھ ہی ان کے پاس کوئی حجت بھی نہیں تو ممکن تھا کہ آپ کی طبیعت میں ضیق پیدا ہو، مگر آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں آپ تو ہدایت کئے جائیں، اور مچھلی والے کی طرح غصہ میں آ کر کبھی بددعا نہ کریں آپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔

تو اپنے نبی کے دین کو تھا مود لائل کی رو سے بھی اصول کی رو سے بھی اور تاریخ کی وجہ سے بھی تاریخ کی رو سے واقعہ سنایا یونس بن مثنیٰ علیہ السلام کا اور دلائل کی رو سے دو چیزیں پیش کیں کہ سچی بات سے انکار کی وجہ ہو سکتی ہیں یا کہنے والے کی خود غرضی محسوس ہو یا اپنے پاس حجت ہو تو فرمایا کہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں کہ ﴿اَمْ تَسْتَلْهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ کیا آپ ان سے سوال کریں گے اجرت کا کہ اس میں یہ دے جا رہے ہیں کہ اجرت ادا نہ کرنی پڑے۔ ﴿اَمْ عَنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ یا کوئی غیب سے خبر آگئی ہے ان کے پاس یا کوئی حجت آئی ہے جسے لکھ رکھا ہے اس لئے آپ کی بات نہیں مانتے، جب یہ بات (کھل گئی) تو محض ہٹ دھرمی اور عناد ہے اس میں ممکن ہے کہ آپ کے دل میں جوش اور جذبہ آجائے تو فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْخُوْتِ﴾ اپنے رب کے حکم پر آپ جبرے صبر کیجئے اور مچھلی والے کی طرح سے نہ ہو جائیے کہ غصہ میں آ کر بددعا کر دیں آپ کی شان بہت بالا ہے۔ ﴿اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ﴾ جبکہ انہوں نے نداء کی تھی کہ اے اللہ! عذاب بھیج دے اور غصہ میں وہ مغلوب ہو گئے تھے۔ جوش آ رہا تھا قوم کے اوپر کہ یہ کم بخت مان نہیں رہے تھے۔ اور تین دن میں یا تین مہینے میں یا تین برس میں آپ ان کی باتیں ہٹ دھرمی میں سن سن کر (گھبرا گئے) گویا کہ آپ کی یہی شان تھی کہ دوسروں نے فرمائش کی غزوہ احد کے موقع پہ کہ یا رسول اللہ بددعاء

کیجئے فرمایا کہ: ”إِنِّي بُعِثْتُ رَحْمَةً وَلَمْ أُبْعَثْ لَعْنًا“ ① میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں عذاب بنا کے نہیں بھیجا گیا، بددعائیں کرنے والا بنا کے نہیں بھیجا گیا۔

آگے فرمایا: ﴿لَوْ لَا أَنْ تَذَارَكَ نِعْمَةً مِنْ رَبِّهِ لُنَبِّذَ بِالْعُرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ﴾ اگر اللہ کی نعمت اور اس کا لطف و کرم تدارک نہ کرتا یونس علیہ السلام پر تو وہ ضائع ہو چکے ہوتے پھلی کے پیٹ میں یا ریگستان میں یا دریا میں سینکڑوں آفتیں آئیں ہمارے ہی لطف و کرم نے تو نکالا مصیبتوں سے تو تدارک کیا اگر حق تعالیٰ تدارک نہ فرماتے تو غضب میں مغلوب ہو کر وہ اپنے کو ضائع کر چکے ہوتے مگر ہم نے قہام لیا، ادھر ان کی بات قوم میں بھی رکھی کہ عذاب کے آثار بھی نمایاں کر دیئے کہ اس کے دل میں جو سچائی رہی اور انجام کتنا ہم نے بہتر کیا ﴿فَاجْتَنِبْهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ پھر اللہ نے انہیں منتخب کیا اور صالحین میں سے بنایا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گویا تسلی دی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو ثبات و استقلال دینے کے لئے اصول اور تاریخ دونوں چیزیں پیش کر دی گئیں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ علم نافع عمل صالح اخلاق فاضلہ اور انجام صحیح عطا فرمائے۔

وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ.

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن لعن الدواب وغيرها ج: ۱۲ ص: ۴۹۴

مقاصد شریعت

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
 أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
 إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ
 وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَافَّةِ النَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
 تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ
 الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ
 قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
 فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ صدق اللہ العظیم ①

تمہید..... بزرگان محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اس وقت مجھے
 اس آیت کی تفسیر کرنا یا اس آیت کے مضامین پر گفتگو کرنا مقصود نہیں بلکہ اس آیت سے تین مقاصد مستنبط کرنے ہیں
 جو دین کے مقاصد ہیں انہیں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، یہ مقاصد الگ الگ بھی آیات میں بیان کئے گئے
 ہیں اور واضح طریقے پر بیان کئے گئے ہیں، لیکن عربیت کا ایک قاعدہ ہے: الکناية ابلغ من التصريح جو چیز
 کنایہ یا اشارہ سے ادا ہوتی ہے بہ نسبت صراحت وہ زیادہ بلیغ ہوتی ہے، اس واسطے خیال ہوا کہ ان تینوں مقاصد کو
 اس آیت کی روشنی میں عرض کیا جائے اور ساتھ ہی اس بناء پر کہ ان تینوں مقاصد کی طرف اس آیت میں اشارہ بھی
 ہو رہا ہے اس طرح ایک جگہ مجتمع ہو کر وہ تینوں مقاصد آجاتے ہیں، تو بجائے تین آیتیں الگ الگ پڑھنے کے اسی
 ایک آیت کی تلاوت کو کافی سمجھا گیا کہ وہ تینوں مقاصد اس آیت میں آجائیں گے۔

تعیین مقاصد..... وہ شریعت کے تین مقاصد کیا ہیں! تو اصل یہ ہے کہ شریعت اسلام تین تعلقات کو درست
 کرنے کے لئے آئی ہے، وہ تین تعلقات اگر درست ہو جائیں تو وہی آدمی شریعت کی اتباع میں کامل سمجھا جائے
 گا، ایک تعلق میں بھی اگر کمی رہ گئی تو اتنا ہی اس کے دین میں اور اس کے اسلام میں کمی رہ جائے گی تو وہ تین تعلقات
 جن کی تکمیل کے لئے جن کی اصلاح کے لئے شریعت اسلام دنیا میں بھیجی گئی، کیا ہیں؟

ایک تعلق مع اللہ کہ بندہ کا اپنے خدا سے کیا تعلق ہے؟ اس کی کیا نوعیت ہے، دوسرا تعلق مع المخلوق کہ بندوں کا اپنے بھائیوں سے اور مخلوق سے کیا تعلق ہے، تیسرا تعلق مع النفس کہ خود اپنے نفس سے اس کا کیا تعلق ہے؟ یہ تین تعلقات ہیں جن کو صحیح کرنا مقصود ہے اور اسی پر شریعت کے تمام احکام پھیلے ہوئے ہیں، بندہ خدا تعالیٰ سے کس طرح سے رابطہ پیدا کرے، بندہ بندوں سے کس طرح معاملہ کرے؟ اور بندے کو اپنے نفس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے، اگر یہ تین معاملے درست ہو گئے تو وہ کامل انسان سمجھا جاتا ہے، ان میں اگر خلل رہ گیا تو اتنا ہی خلل اس کے دین و دیانت میں رہ جائے گا اور کہا جائیگا کہ مسلمان ہے مگر ناقص مسلمان، اس لئے کہ تینوں تعلقات اس کے صحیح ہونے چاہئیں تھے۔

تعلق مع اللہ کی بنیاد ”عبدیت“..... تعلق مع اللہ کی بنیاد عبدیت پر ہے کہ بندہ اپنی عبدیت کو پہچان لے اور اللہ کی معبودیت کو پہچان لے، یہ نسبت درست ہو جائے کہ وہ معبود ہے، میں عابد اور عبدیت کی شان اس میں آجائے، اس وقت کہا جائے گا کہ اللہ سے تعلق صحیح ہو گیا، عبدیت ہو یعنی جتنی بھی بڑائی اور عظمت ہے وہ اللہ کے لئے مخصوص سمجھے۔ ﴿وَلِلَّهِ الْكِبَرُ بَاءَ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ساری بڑائیاں آسمانوں میں اور زمینوں میں اللہ ہی کے لئے ہیں، وہی ہے عزیز و حکیم، عزت والا بھی وہی ہے حکمت والا بھی وہی ہے، تو عزت کا کوئی شائبہ بمقابلہ حق اپنے اندر نہ ہونا چاہئے، بلکہ عزت کے مقابلہ میں پوری ذلت اپنے نفس کی ہونی چاہئے اور کمال عزت حق تعالیٰ کی ذہن میں ہو، تب وہ نسبت عبدیت درست ہوگی، اگر کبر ذرا سا بھی باقی رہ گیا تو نسبت عبدیت میں فرق آجائے گا۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ: ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ“ ① جنت میں وہ داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر باقی رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نے حق تعالیٰ کی کبریائی کو نہیں سمجھا اور جب اس کی کبریائی اور عظمت کو نہ جانا تو اپنی ذلت کو نہ سمجھا اور اپنے اندر تکبر کیا تو کبریائی اور عظمت یہ ذات باریکات کے ساتھ مخصوص ہے، دنیا میں بندہ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے خدا کی خدمت کرنے کے لئے نہیں آیا، تو اس کی چال میں ڈھال میں قال میں، حال میں ہر چیز میں عبدیت ہونی چاہئے، جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنْ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتَ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ ② چال میں اپنی میانہ روی اور نرمی پیدا کرو، اکثر کر چلو گے تو چال میں کبر آجائے گا جو بندگی کی شان کے خلاف ہے، یعنی ایسی چال سے چلو جس میں تواضع بھی ہو، کبر نہ ہو اور ساتھ میں ضعف بھی نہ ہو، یعنی نہ تو بیماروں کی چال چلو، کہ آدمی بالکل جھک کے چلے جیسے معلوم ہو کہ مریض ہے یہ بھی چال پسند نہیں کی گئی، حدیث

① الصحيح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحريم الکبر وبيانہ ج: ۱ ص: ۲۴۷ رقم: ۱۳۱. ② سورة لقمان: ۱۹.

میں فرمایا گیا: ”الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنَ الضَّعِيفِ“ ① قوی مسلمان بہتر ہے ضعیف مسلمان سے، تو چال میں قوت ہونی چاہئے، ضعف نہ ہونا چاہئے، تو نہ تو اس طرح سے چلے، جیسے کوئی بیمار اور مریض قوت کا آدمی آ رہا ہو اور نہ اکڑ کر چلے کہ جس سے معلوم ہو کہ کوئی متکبر آ رہا ہے، تو چال کے اندر فرمایا کہ قصد واقتصاد اور میانہ روی اختیار کرو کہ چال میں کبر بھی نہ ہو چال میں ضعف بھی نہ ہو۔

آثارِ عبدیت حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ ”كَانَ يَمْشِي تَقَلُّعًا“ آپ زمین پر اس طرح قوت سے چلتے تھے جیسے زمین کو کھود ڈالیں گے۔ اس قوت سے پیر پڑتا تھا، اور ساتھ میں تواضع اور انتہائی خاکستاری اور نرمی بھی چال میں ہوتی تھی، تو قوت بھی ملی ہوئی ہو اور قوت کے ساتھ تواضع بھی ملی ہوئی ہو، قوت میں اگر کبر آ گیا تو تکبر کی چال ہے اور اگر کمزوری آ گئی تو ضعیفوں کی چال ہے اور دونوں چالوں سے روکا گیا۔ ﴿وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ ② تو چال کے اندر بھی میانہ روی بتلائی گئی۔ اسی طرح سے قال کے اندر، بولے آدمی تو تحکمانہ لب و لہجہ نہ ہو، جیسے کوئی حاکم بول رہا ہے، بلکہ مصالحانہ رویہ برادرانہ رویہ، بھائی بندی اور ملنساری کی آواز نکلتی چاہئے، اس میں حاکمانہ، متکبرانہ شان نہ ہونی چاہئے تو جیسے حال میں تکبر برا سمجھا گیا ہے قال میں اور بولنے میں بھی تکبر برا سمجھا گیا ہے، اسی طرح سے آدمی کے حال میں اور تمام چیزوں میں کبر نہ ہونا چاہئے، تبھی آدمی کی بندگی صحیح ہوگی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ یہاں ایک طالب علمانہ شبہ ممکن ہے کسی کو پیدا ہوا کہ قرآن کریم سے اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی صفات اختیار کرو اور اس کے کمالات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرو، چنانچہ فرمایا گیا: ”تَخَلَّفُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ“ اللہ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو رحمت اور کرم دوسرے کے اوپر عطا اور جو دوا حسن اور علم یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی صفات ہیں، یہ اپنے اندر پیدا کرو، اسی طرح اللہ کی صفت تکبر بھی ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ ③ تو یہ تکبر بھی اختیار کرنا چاہئے اس لئے کہ جب اللہ کے اخلاق اختیار کرو گے رحم اور کرم اور کریمی تو پھر متکبر بننے میں کیا حرج ہے، بلکہ متکبر بننا چاہئے تو یہاں جو فرمایا جا رہا ہے کہ تکبر ذرہ برابر ہوگا تو وہ شخص جنتی نہیں، اور یہاں ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی متکبر بنے، تکبر اللہ کی شان ہے بڑا بول بولنا اس ہی کا مقام ہے تو ہم بھی خوب بڑے بول بولیں اور خوب تحکمانہ کلام کیا کریں، اس حدیث کی رو سے یہ ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر بری چیز نہیں ہے، تکبر تو اعلیٰ ترین صفت ہے، جو اللہ کی شان ہے، کون تکبر کو برا کہہ سکتا ہے؟ پھر تکبر سے کیوں روکا گیا ہے؟ اس لئے نہیں روکا گیا کہ تکبر بری چیز ہے، تکبر بہترین چیز ہے مگر

① الصحيح لمسلم، كتاب القدر، باب في الامر بالقوة وترك العجز والاستعانة بالله ج: ١٣ ص: ١٢٢

رقم: ٣٨١٦. ② بارہ: ٢١، سورۃ: لقمان، الآیۃ: ١٩.

جھوٹ بولنا بری چیز ہے، جھوٹ سے روکا گیا ہے اس لئے کہ اللہ کے سوا جو یوں کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹا ہے، سچا اللہ ہی ہے جو کہے کہ میں بڑا ہوں، مجھ سے بڑا کوئی نہیں، جو انسان یہ کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹ بول رہا ہے تو جھوٹ بولنا بری بات ہے، تکبر کرنا تو بری بات نہیں خدا کے سوا جو تکبر بنے گا جھوٹا ہوگا۔

تو جھوٹ بولنا انسان کی شان کے خلاف ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ تکبر مت اختیار کرو، جھوٹے مت بنو، تکبر اسی کے لئے زیبا ہے، اور بڑائی اسی کے واسطے ہے۔ ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ①

تو عبدیت اختیار کرو، اب ہر چیز میں عبدیت آئے گی، جب دل میں ایک چیز بیٹھ گئی تو دل تو سلطان الاعضاء ہے، تو تمام اعضاء کا بادشاہ ہے تو ساری رعایا اسی کی پیروی کرے گی، جب دل میں تواضع، انکساری اور خاکساری بیٹھ گئی تو انکساری پیروں میں بھی آئے گی، ہاتھ میں بھی آئے گی، زبان میں بھی آئے گی، ہر چیز میں وہی کسر و انکسار تواضع و خاکساری پیدا ہو جائے گی، صحت میں بھی انکساری، بیماری میں بھی انکساری۔

عبدیت کے رنگ مجھے واقعہ یاد آیا، میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت یہ تھی کہ تھوڑا بھی بیمار ہوں تو بہت زیادہ کھولتے کراہتے اور ہائے کرتے جیسے کوئی بڑی چیز آگئی، مکان کو سر پر اٹھالیا، چھوٹی سی بیماری بالکل معمولی اور ہائے زیادہ تو میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے ان سے عرض کیا، رُعب ان کا غالب تھا کہ آپ جو یوں زیادہ ہائے کرتے ہیں، یہ تو رضا اور توکل کے خلاف ہے بندہ ہو کر ذرا سی بیماری آئی اور زیادہ کھولنا اور کراہنا یہ تو رضا کے خلاف ہے بندہ پر جو کیفیت آئے اسے راضی ہونا چاہیے، زیادہ ہائے کرنے کا کیا مطلب؟ جیسے بیماری ٹالنا چاہتے ہیں، یہ تو رضا کے خلاف ہے توکل کے خلاف ہے، ہنس کے فرمایا کہ نالائق! نصیحت کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کے بعد فرمایا بیٹھ جا میں بیٹھ گیا۔ فرمایا میں نے اپنے تین بزرگوں کی زیارت کی ہے اور زیارت ہی نہیں کی بلکہ ان کو برتا ہے اور ان کی پوری زندگی پائی ہے۔ سب سے پہلے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ ان سے خلافت بھی حاصل کی تھی، فرمایا میں نے ان کی زندگی دیکھی ہی نہیں بلکہ برتی ہے اور ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ دوسرے فرمایا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وہ میرے استاذ حدیث ہیں، تو ان کی خدمت میں بھی حاضر رہا ہوں۔ اور تیسرے فرمایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، وہ تو میرے والد ہیں، ان کی زندگی بھی میں نے دیکھی اور ان کی صحبت اٹھائی، ان تینوں بزرگوں کے میں نے تین رنگ پائے۔ فرمایا حاجی صاحب پیر و مرشد کا تو یہ عالم تھا کہ ذرا سی بیماری آتی تو ہائے کرتے کرتے مکان کو سر پر اٹھا لیتے۔ ایک صاحب نے عرض کیا حضرت! یہ تو بندگی، رضا اور توکل کے خلاف ہے، ذرا سی بیماری آئی اور ہائے پائے شروع کی۔ فرمایا کیا میں اپنے اللہ کے مقابلے میں بہادر بنوں اور یہ دعویٰ کروں زبان حال سے کہ آپ جو کچھ بھیجیں گے میرے اندر طاقت ہے میں اُسے برداشت کروں گا، میں

تھوڑی سی بیماری میں ہائے کر کے عرض کر دیتا ہوں کہ میں اتنا کمزور ہوں مجھے آزمائے نہیں، فضل سے بخش دیجئے، میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ بخار کا تحمل کروں، بندہ ہوں اور ضعیف ہوں تو میں ہائے کر کے اپنے ضعف کو ظاہر کر دیتا ہوں، اپنے عجز کو ظاہر کرتا ہوں، فرمایا یہی ہے عبدیت اور بندگی کی شان کہ اپنا عجز اور اپنی بے طاقتی، عاجزی ہر طرح سے ظاہر کر دو۔

فرمایا حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہائے وائے تو نہیں کرتے تھے مگر علاج کا اہتمام (بہت کرتے تھے) ذرا بیماری آئی طبیب کو بلاؤ اور ڈاکٹر کو بلاؤ اور دوا دار اور پرہیز، تو بعض نے عرض کیا حضرت اسباب میں اتنا غلو کرنا تو بندگی کے خلاف ہے، اس کے معنی ہیں کہ مسبب الاسباب یہ نظر نہیں، بس دواؤں پہ نظر ہے ڈاکٹر پہ نظر ہے، علاج پہ نظر ہے۔

فرمایا علاج کرنا مسنون ہے اور اتباع سنت ہی سب سے بڑی عبدیت ہے، ان کے یہاں بھی عبدیت تھی، مگر عبدیت کا یہ روپ تھا ہر چیز میں سنت کی پیروی کی جائے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ ہم کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علاج فرمایا، تو علاج مطلوب ہو گیا تو سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ تو صحت کی سنتیں اور ہیں بیماری کی سنتیں اور ہیں، بیماری میں یہی سنت ہے آدمی معالجہ کی طرف متوجہ ہو اپنی حیثیت کے مطابق کوئی بڑا آدمی ہے وہ علاج کرانے بھی جرمی جائے گا اور چھوٹا ہے وہ مقامی ڈاکٹر کو دکھلا دے۔

مگر بہر حال علاج کی طرف توجہ کرنا یہ سنت کی پیروی ہے اس لئے کہ یہ ہمارا بدن یہ سرکاری ملک ہے اور اللہ کی ملک ہے، ہم اس کے امین بنائے گئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں، بیمار ہوں تو دوا کریں، ایسے موقعوں پر نہ جائیں جہاں ہلاکت یقینی ہو، یہ سواری ضائع نہ ہو جائے، اسی سواری پر سوار ہو کر روح مقامات طے کرتی ہے اور عرش عظیم تک پہنچتی ہے، جب سواری ٹکی ہو جائے گی تو سفر کیسے طے ہوگا؟

اس واسطے اس کو گھاس دانہ بھی دینا چاہئے، اسے غذا بھی دینی چاہئے یہ بیمار ہو تو اس کا علاج بھی کرنا چاہئے، تو فرمایا بیماری میں علاج کرنا سنت کی پیروی ہے اور سنت کی پیروی کی یہی عبدیت ہے اسی کو بندگی کہتے ہیں تو حضرت (حاجی صاحب) کے یہاں بھی بندگی تھی اور ان کے یہاں بھی عبدیت تھی اس کا روپ اور تھا اس کا رنگ اور۔ فرمایا میرے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کیفیت یہ تھی، بڑی سے بڑی بیماری آجائے تو آف نہیں کہتے تھے، کسی پہ ظاہر نہیں ہوتا تھا بیمار ہیں، مہینوں، برسوں کے بعد اتفاق سے زبان سے نکل گیا تو پتہ چلتا تھا کہ اتنی بڑی بیماری آئی ہے، اور بالکل دم بخود لوگوں نے عرض کیا حضرت بیماری آئی ہے آپ کسی سے فرماتے بھی نہیں، کچھ ظاہر بھی نہیں کرتے کہ کوئی دوا دار و یا علاج کرتے فرمایا:

”ہر چیز از دوست می رسد نیکوست“

مالک کی طرف سے جو آئے گردن جھکانی چاہئے تو وہی میرے لئے خیر ہے وہی میرے لئے برکت

ہے، اگر وہ بیماری دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے تندرست ہونا چاہئے، اور اگر وہ تندرستی دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے بیمار ہونا چاہئے۔

”ہر چیز از دوست می رسد نیکوست“

دوست اور محبوب کی طرف سے جو آئے سرہ جھکا دینا چاہئے۔ فرمایا یہی عبدیت ہے اور یہی بندگی کی شان ہے کہ دوست کی ہر منشاء کے اوپر آدمی راضی برضا ہو جائے۔

عبدیت کا تقاضا..... جیسے حدیث میں ارشاد ہے کہ ”عَجَبًا لِّأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَصَابَتْهُ سَرَّاءٌ شَكَرَ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءٌ صَبَرَ“ ① مومن کی کوئی کل بری نہیں، ایمان کے ساتھ کوئی حالت بری نہیں اگر بیماری آتی ہے تو صبر کرتا ہے، صبر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اگر نعمت آتی ہے تو شکر کرتا ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے، تو بیماری بھی اس کے لئے خیر ہے اور تندرستی بھی اس کے لئے خیر ہے، تندرستی کے اور لوازم ہیں، بیماری کے اور لوازم ہیں سب پر ایمان کا قانون لاگو ہے، اسی راستے سے آدمی اللہ تک جا پہنچتا ہے۔ تو فرمایا حق تعالیٰ شانہ جو بھی کیفیت بھیجیں نعمت کی ہو یا مصیبت کی، تنگی کی ہو یا راحت کی، تمول کی ہو یا تنگ دستی اور محتاجگی کی، جس حالت میں ہو بندہ راضی اور شاکر رہے کہ میرے لئے یہی خیر ہے جو میرے مالک نے تجویز کیا ہے میں کون ہوں اس کے خلاف کرنے والا یا خلاف بولنے والا! کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ وہ اسی مقام کے تھے یعنی راضی برضا کے مقام کے، کہا کیا حال پوچھتے ہو اس شخص کا جس کی مرضی پر دو جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ اس درجہ کے ہیں کہ آپ کی مرضی پر زمین و آسمان کے سارے کارخانے جاری ہیں؟ کہا الحمد للہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہا، یہ اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ دونوں جہاں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں، اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فناء کر دیا ہے، جو اس کی مرضی وہ میری مرضی، اس لئے جو بھی عالم میں پیش آتا ہے میں اس پر راضی ہوں کہ ٹھیک ہے، کوئی پیدا ہوتا ہے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی ہونا چاہئے تھا کوئی مرتا ہے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی ہونا چاہئے تھا، مجھے کیا حق ہے کہ بیٹھ کر ماتم کروں اور بیٹھ کر واویلا کروں، اس کے معنی ہیں کہ اللہ کے حکم میں میں مداخلت کر رہا ہوں اور من مٹخ نکال رہا ہوں کہ آپ نے کیوں موت بھیج دی فلاں کے لئے، تو کیا میں اس لئے آیا ہوں کہ اللہ سے لڑوں اور مقابلہ کروں؟ وہ موت دے دے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی مناسب وہ زندگی دے دے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی مناسب ہے وہ بیماری دے دے، میں کہتا ہوں بے شک یہی مناسب ہے، اس لئے جہاں میں کوئی چیز بھی میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتی، یہ سب میری مرضی پر چل رہے ہیں۔

عبدیت کا اعلیٰ مقام ”تقویٰ“..... تو حقیقت میں رضا بہ قضاء کے یہی معنی ہیں کہ اس مقام پر آجائے کہ جو

① الصحيح لمسلم، کتاب الزهد والرفائق، باب المؤمن امره كله خير ج: ۱۴، ص: ۲۸۰، رقم: ۵۳۱۸.

بھی ہو آدمی اس پر راضی ہو، اور ظاہر ہے کہ جب اس مقام پر آجائے گا تشویشات ساری ختم ہو جائیں گی، یہ جو تشویش اور الجھن پیدا ہوتی ہے، یہ اپنی تجویز سے پیدا ہوتی ہے ہم نے یہ تجویز کر لیا کہ ہمیں الما در بننا چاہئے، اب اگر الما در نہ بنے یا مال چھن گیا تو اب بیٹھ کے رو رہے ہیں۔

یہ کیوں رو رہے ہیں؟ پریشانی کیوں ہوئی کہ خود ہم نے تجویز کیا تھا کہ الما در ہونا چاہیے یا بتنا چاہیے، بیماری آئی تو پریشانی میں گھٹ رہے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ تجویز یہ تھی کہ ہونا چاہئے ہمیں تندرست تو کیوں بیمار بنے۔ ان ساری مصیبتوں کی جزا اپنی تجویز ہے، لیکن اگر تفویض ہو جائے کہ میں نے اپنے آپ کو سوئپ دیا اللہ کے جو بھی کیفیت پیش آئے وہ خیر ہے، اب ظاہر ہے کہ نفس کے خلاف کوئی چیز ہوگی نہیں تشویش اسی کو کہتے ہیں کہ طبیعت کے خلاف ہو، جب ہر چیز کو طبیعت کے موافق بنالے تو اب پریشانی باقی نہیں رہے گی، تو تشویشات بھی ختم، ساری پراگندگیاں بھی ختم، پریشانیاں بھی ختم، تو اہل اللہ درحقیقت تفویض کے مقام پر ہوتے ہیں، اس لئے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، کسی حالت میں ہوں مطمئن اور مگن اور اہل دنیا جو خود مچوڑ ہیں اپنے لئے کہ ہمیں یوں ہونا چاہیے وہ ہر وقت پریشان رہیں گے، اس لئے کہ نفس کا ہر منصوبہ پورا ہونا ضروری نہیں اور جب کسی تجویز کے خلاف ہوگا تو روئیں گے بیٹھ کے بہکیں گے، تو ہر وقت پریشانی میں اس لئے اعلیٰ ترین مقام کہ جس میں سکون کامل ہو، پریشانی رفع ہو، وہ یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرے، اپنے کو بدل دے جو پیش آئے کہے یہی میرے حال کے مناسب تھا۔

اسی پر راضی ہو جائے تشویش ختم ہو جائے گی، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا داری بہترین چیز ہے اور اسی میں سکون ہے، یا سمجھتے ہیں کہ مصیبت سب سے بڑی چیز ہے یا نعمت سب سے بڑی چیز ہے، حالانکہ بیماری ہو یا تندرستی، مال داری ہو یا دست نگری وہی سکون کا ذریعہ ہے تو اللہ کی تجویزوں پر، اس کی تقذیرات پر راضی ہو جانا یہ سکون کا ذریعہ ہے۔ ﴿لَا يَذْكُرُ اللَّهُ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ ① اللہ کے ذکر ہی سے دل چین پاتے ہیں۔ تو ذکر کا فقط یہ مطلب نہیں کہ مسجد میں بیٹھ کر اللہ، اللہ کر لے، ذکر اور یادداشت کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی من جانب اللہ پیش آئے اس پر رضا کا اظہار کرے، بیمار ہے تب راضی، تندرست ہے جب راضی، الما در ہے جب راضی، اور نا دار ہے تب راضی۔ موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا واقعہ..... یہ معنی ہیں ملکہ یادداشت کے کہ ہر تقدیر پر آدمی راضی ہو جائے، مجھے اس پر افلاطون کا ایک واقعہ یاد آ گیا، ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ افلاطون یونان کے حکماء میں سے ایک حکیم اور فلسفی ہے، لیکن شیخ عبدالحکیم بہت بڑے عالم اور بہت بڑے محقق گزرے ہیں، انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے ”الإنسانُ الكامل“ کہ انسان کامل کسے کہتے ہیں، اس میں اصول و قواعد شرعی بیان کئے ہیں۔

اس میں لکھتے ہیں کہ میں افلاطون کی قبر پر گیا تو انوار و برکات سے میں نے اس کی قبر کو ڈھکا ہوا پایا، اس سے

ہم یہ سمجھے کہ یہ مقبولانِ الہی میں سے تھا محض فلسفی اور بندگانِ عقل میں سے نہیں تھا جیسا کہ شہرت ہے بلکہ مقبول خداوندی شخص ہے محض فلسفی اور بندگانِ عقل میں سے نہیں انہوں نے لکھا ہے یا کسی دوسرے نے یہ یاد نہیں رہا بس اتنا ضرور لکھا ہے کہ افلاطون مقبولانِ الہی میں سے ہے، افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے، تعارف نہیں تھا، ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں تھے نام سنا تھا، افلاطون بھی جانتا تھا کہ ایک اسرائیلی اولوالعزم پیغمبر ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جانتے تھے کہ افلاطون ایک شخصیت ہے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا تھا، کبھی تعارف نہیں ہوا تھا، اتفاق سے ایک سڑک پر آنا سا ملنا ہوا، پہچان تو تھی نہیں، لیکن افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کے چہرے پر انوارِ برکات اور جلالتِ نبوت کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم اور عارف باللہ ہیں۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور وہ جو قلب کے اندر اشراق اور چمک ہوتی ہے، اس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں تو چہرہ چغلی کھا لیتا ہے کہ اندر کیا کیفیت موجود ہیں، تو موسیٰ علیہ السلام کے چہرہ مبارک پر جلال اور جمالِ نبوت چمک رہا تھا، تو اس نے سمجھا کہ کوئی بڑی عظیم شخصیت ہیں، آ کے مصافحہ کیا اور یہ کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کوئی بہت بڑے حکیم ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم ربانی اور عارف باللہ ہیں، ایک میرا سوال ہے جس کو اب تک کوئی حل نہیں کر سکا، بڑے بڑے عقلاء کے سامنے پیش کیا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا، گمان یہ ہے کہ آپ وہ سوال حل کر دیں گے، آپ کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ نورانیت آپ کے قلب میں ہے۔

فرمایا: کیا سوال ہے؟ کہا، سوال یہ ہے کہ ”اگر آسمان کو کمان فرض کر لیا جائے اور جو یہ مصیبتیں برس رہی ہیں انہیں تیر فرض کیا جائے اور اللہ میاں کو تیر چلانے والا فرض کیا جائے اور صورت ایسی بنے کہ اللہ میاں آسمان کی کمان سے مصیبتوں کے تیر بر سار ہے ہیں تو بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

”ظاہر بات ہے کہ بچاؤ کی صورت عقل میں نہیں آتی اس لئے کہ اس زمین کو چھوڑ کر آدمی کہیں نہیں جاسکتا اور اگر فرض کیجئے: چلا بھی جائے تو یہ جو آسمان کا گھیرا پڑا ہوا ہے اس کے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتا اور مان لو کہ اس سے بھی نکل جائے تو اللہ میاں جب تیر مارنا چاہیں تو ان کی گرفت سے نکل کر کہاں جائے گا، وہ تو زمینوں اور آسمانوں سے ماوراء بھی ان کی حکومت ہے، تو عقل اس کو سمجھتی نہیں۔“

عقل یہی کہے گی کہ کوئی صورت بچنے کی نہیں، اسی واسطے کوئی عالم جواب نہیں دے سکا کہ زمین چھوڑ کر جانا مشکل گروں کے محاذات سے نکلنا مشکل، آسمان کے نیچے سے نکل جانا مشکل اور مالک الملک کی گرفت سے نکلنا مشکل اور ناممکن، تو کوئی صورت بچاؤ کی نہیں، جب مصیبتوں کے تیر برسیں گے تو وہ بھگتنے پڑیں گے، مصیبت اٹھانی ہی پڑے گی، تو یہ سوال کیا جو واقعی مشکل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہت آسان بات ہے، اس میں کوئی اشکال ہی نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا، معمولی بات ہے اب یہ بھی متوجہ ہوا کہ جس کو کوئی حل نہیں کر سکا یہ کہہ رہے ہیں معمولی بات ہے، فرمایا کہ بچاؤ کی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تیر مارنے والا جب تیر مارنے کا ارادہ کرے اس کی محاذات سے ہٹ کر اس کے پہلو میں آکھڑا ہو تو تیر لگے گا ہی نہیں، بس یہ اس کا طریقہ ہے کہ تیر پھینکنے والے کے بغل میں آجائے گا، وہ کتنی زور سے تیر مارے گا، تیر نہیں لگے گا، کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اس نے ہاتھ چومے، کہا معلوم ہوتا ہے آپ پیغمبر ہیں، اس کو صاحب معرفت کے سوا دوسرا نہیں بتا سکتا تھا، محض عالم کا کام نہیں ہے کہ اس کا جواب دے یہ تو عاشق کا کام ہے، عارف باللہ کا کام ہے جو اپنے دل میں معرفت رکھتا ہو۔

عبدیت ہی عشق و معرفت کی راہیں دکھلاتی ہے..... اس لئے کہ عشق جو راہیں کھولتا ہے علم نہیں کھول سکتا اور وہ راہیں، وہ کہتا ہے ناں ایک شاعر کہ ۔

عقل گوید شش جہت را ہے، حدے بیش نیست

عقل کہتی ہے کہ چھ ہی جہتیں ہیں، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سامنے پیچھے، اور کوئی جہت نہیں، تو

عقل گوید شش جہت را ہے حد بیش نیست

اس کے سوا کوئی جہت نہیں

عشق گوید ہست را ہے بارہا من رفتہ ام

عشق نے کہا کہ نہیں اور بھی رستہ ہے میں بارہا گیاں ہوں۔ عشق چھ جہات میں محدود تھوڑا ہی ہے، یہ تو عقل کی حد بندی ہے عشق اس سے بالاتر ہے وہ دور دور پہنچتا ہے تو عشق جب مالک سے ملا دیتا ہے اور سرچشمہ کمالات سے ملا دیتا ہے تو عقل تو ایک اس بارگاہ کی باندی ہے، عقل بے چاری کیا کرے گی، عقل کا دائرہ محسوسات کے اندر محدود ہے، اور عشق مادرائے محسوسات کی باتیں پاتا ہے، وہ عرش کی باتیں لاتا ہے، تو اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسرائیلی پیغمبر ہیں، اس وقت بات کھلی کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہاتھ چومے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی جانا کہ یہ کوئی حکیم معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ: السُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ گہرا سوال کرنا بھی علم کے بغیر نہیں، جاہل محض سوال بھی نہیں کر سکتا، مطلق جاہل ہو وہ سوال کر نہیں سکتا، کرے گا تو بے ڈھنگا کرے گا، جواب دینے والے کو بھی الجھا دے گا، اس لئے سوال کرنا بھی علم والے کا کام ہے، جاہل کا کام نہیں ہے جو ڈھنگ کا سوال کرے۔ السُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سوال کرنے والا بھی آدھا عالم ہوتا ہے، بغیر اس کے سوال نہیں کر سکتا، تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بھی حکیم معلوم ہوتے ہو، سوال ایسا گہرا کیا کہ وہ بے علم کے سوال نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس وقت تعارف ہوا افلاطون کو اور موسیٰ

علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب اللہ کو فرض کیا جائے کہ وہ تیر چلا رہے ہیں اور آسمان کی کمان سے تیر برسا رہے ہیں تو بچنے کی کیا صورت ہے؟ تو بچنے کی صورت یہ ہے کہ تیر چلانے والے کے پہلو میں آکھڑا ہو، تیر نہیں لگے گا۔
قضائے الہی پر راضی رہنے سے تشویش ختم ہو جاتی ہے..... اللہ کا پہلو کیا ہے؟ وہ تو جسم سے بری ہے، وہاں کوئی پہلو نہیں کوئی آگ اچھا نہیں وہ تو ہر جہت سے اونچے اور بالاتر ہیں، پہلوئے خداوندی درحقیقت ذکر اللہ ہے کہ یاد خداوندی قلب کے اندر آجائے، حق تعالیٰ کا پہلو یہ ہے کہ اس کی یاد نفل میں موجود ہو، جب اس کی یاد موجود ہے تو گویا آدمی ان کے پہلو میں ہے اس لئے کہ پہلو کے معنی یہی تو ہوتے ہیں کہ بچاؤ کر لے، کوئی حملہ کرے تو آپ بچے کو پہلو میں لے لیتے ہیں کہ حملہ آور حملہ نہ کر سکے، عورت جا رہی ہو اس کو پہلو میں لے لیتے ہیں تاکہ اس پر کوئی حملہ آور نہ ہو، تو پہلو کے معنی بچاؤ کے اور ذریعے کے لینے کے ہیں۔

حرز میں آجائے تحفظ میں آجائے، تو اللہ کے تحفظ میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد قلب کے اندر آجائے وہی ذکر اللہ ذریعہ حرز بنتا ہے تو پہلوئے خداوندی ذکر ہے، تو حاصل یہ نکلا کہ اگر قلب کے اندر ذکر الہی موجود ہے تو تیر بے شک آئیں گے، لیکن اثر نہیں کریں گے، اس لئے کہ اطمینان ہے اپنے مالک کے اوپر مگن اور مطمئن ہے، نہ بیماری کی پرواہ ہے نہ تندرستی کی جو وہ دے رہے ہیں حکمت سے دے رہے ہیں، اور میرے لئے مصلحت اور مناسب ہے جب یہ رضا پیدا ہوگئی تو تشویش کہاں رہی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر کرنے والا کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوگا، ذکر کرنے والے بلکہ اہل اللہ پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں، فساد و فجار پر کم آتی ہیں، کفار پر ان سے بھی کم آتی ہیں، مومن اور جتنا مخلص ہوگا زیادہ مصیبت آئے گی، جانچ اسی کی کی جائے گی۔ تو یہ مطلب نہیں کہ مصیبت نہ آئے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا: ”أَشَدُّ بَلَاءًا لِلْأَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَلَا مَثَلُ“ ① سب سے زیادہ شدید بلاؤں میں انبیاء گرفتار کئے جاتے ہیں، حد سے زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں پھر جو ان سے زیادہ قریب یا مشابہ ہے وہ اتنا ہی زیادہ مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، یہ نہیں ہے کہ اہل اللہ پر مصیبتیں نہیں آتیں، فقر و فاقہ نہیں ہوتا، وہ نادار نہیں بننے، گھر میں کوئی آگ نہیں لگ جاتی، بیمار نہیں پڑتے، ساری مصیبتیں آتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا کہ محبت ہے، فرمایا دیکھو سمجھ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! واقعی مجھے محبت ہے، آپ نے فرمایا: اگر محبت ہے تو فقر و فاقہ کے لئے تیار ہو جاؤ، مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تو اللہ والوں پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں۔

رضاء برقضاء ذریعہ سکون ہے..... مگر فرق کیا ہے؟ کہ مصیبتیں آتی ہیں مگر اعضاء رفتہ و بے کار نہیں ہوتے، ان کے دل میں پریشانی نہیں ہوتی، دل مگن اور مطمئن رہتا ہے کہ یہ مصیبت مالک الملک نے بھیجی ہے

① السنن للترمذی، کتاب الزہد باب ماجاء فی الصبر علی البلاء ج: ۸ ص: ۴۱۷ رقم: ۲۳۲۲۔

ہمارے لئے یہی مصلحت ہے تو ہم اس میں راضی ہیں۔ تو مصیبت درحقیقت آدمی کے قلب کی صفت کا نام ہوا، کہ وہ تشویش میں مبتلا ہو یہ مصیبت ہے، اور تشویش دل سے نکل جائے تو وہ مصیبت ختم ہے تو مصیبت نام بیماری کا نہیں، مصیبت نام تنگدستی کا نہیں یہ تو اسباب مصیبت ہیں خود مصیبت نہیں۔ مصیبت قلب کی صفت ہے کہ تنگدستی سے پریشان ہو جائے اور اگر کوئی تنگدستی پر راضی اور مطمئن ہو جائے تو اس پر کیا مصیبت آئے۔ بہت سے اہل اللہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جتنی چیزیں ہمارے پاس ہیں یہ چلی جائیں تو اچھا ہے تاکہ ہم یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوں تو ساری چیزیں چھین لو اور زیادہ ان کا اطمینان بڑھ جاتا ہے، حالانکہ نادار ہو گئے تو ناداری مصیبت نہیں بلکہ ناداری سے پریشانی کا اثر لینا یہ قلب کی صفت ہے، تو مصیبت قلب کی شان نہیں بیماری مصیبت نہیں، یہ تو سب مصیبت ہے، ناداری مصیبت نہیں یہ سب مصیبت ہے۔ تو راحت اور مصیبت قلب کی صفت ہے، اگر قلب کو آدمی درست کر لے اور قلب کو اپنے مرکز سے وابستہ کر دے تو پھر مصیبت کا کوئی اثر نہیں، چاہے بیمار ہو، چاہے نادار ہو چاہے تنگدست ہو، تو اصل چیز ہے قلب کی توجہ اور راضی بہ رضا ہو جانا کہ اسی میں ساری راحتیں ہیں۔

یہی شریعت اسلام کہتی ہے کہ اگر تم مصیبت سے بچنا چاہتے ہو، اگر تم سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو سکون نہ تمہیں کوٹھیوں میں ملے گا، نہ تجویروں میں ملے گا، سکون تمہیں ملے گا تعلق مع اللہ میں، جب اس کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ گے، سکون تام حاصل ہو جائے گا، پریشانی ختم، جڑ ختم ہو جائے گی، یہ چیزیں سکون کا ذریعہ نہیں ہیں یہ ہے بنیادی چیز۔ ذکر اللہ ہی سے قلوب چین پاتے ہیں، اس میں اگر بادشاہ بھی بن جائے تب بھی راضی اور فقیر بن جائے جب بھی راضی۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ثبات قدمی کا واقعہ..... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مکہ معظمہ میں ہجرت فرما گئے، تو انہوں نے خود یہ واقعہ میرے والد مرحوم کو سنایا، انہیں پیار میں بیٹا کہا کرتے تھے، عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی اور بیٹا فرماتے تھے۔ تو اپنا واقعہ خود سنایا کہ: بیٹا! جب میں مکہ مکرمہ میں ہجرت کر کے چلا ہوں ۱۸۵۷ء میں اور جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا نانوتویؒ سب کے وارنٹ جاری ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی۔ فرمایا جب میں نے کراچی کی بندرگاہ سے جہاز میں قدم رکھا تو میں نے اللہ سے ایک عہد کر لیا کہ آپ کے گھر جا رہا ہوں میں کسی کے دروازے پر نہیں جاؤں گا، کسی سے مانگوں گا نہیں، آپ کھلائیں گے کھالوں گا ماریں گے مر جاؤں گا، جان میری نہیں ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تو اگر آپ جان لیں گے تو وہ میری جان کب ہے، وہ بھی آپ کی ہے میں کسی گھر کو نہیں دیکھوں گا، میں تو آپ کے گھر جا رہا ہوں، یہ ایک عہد کیا (والد صاحب) فرماتے تھے جب حاجی صاحب مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو ان کے پاس کوئی رقم نہیں تھی، کوئی سرمایہ نہ نہیں تھا معمولی کچھ پیسے اور ناشتہ داشتہ تھا، وہ دو تین دن میں ختم

ہو گئے، اب فاتے شروع ہوئے اور یہ عہد باندھ لیا تھا کہ نہ مانگوں گانہ کسی کے در پہ جاؤں گا بیٹھ گئے، ایک وقت کا فاقہ دو وقت کا فاقہ، تین وقت کا فاقہ۔

فائقوں پہ فاقہ ہو رہا اور کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، اور کسی سے تعارف نہیں ہے، فرماتے تھے کہ جب چار پانچ وقت کا فاقہ ہوا تو کچھ ضعف بڑھنا شروع ہوا، اب حرم شریف میں حاضری ذرا مشکل ہو گئی، بہت آہستہ چل کر آنا پڑتا تھا، فرماتے ہیں: مگر میں ہمت کر کے حرم شریف میں حاضر ہوتا تھا، طواف بھی کرتا تھا، نماز بھی پڑھتا تھا، پھر فرماتے ہیں کہ جب پانچ چھ وقت کا فاقہ ہو گیا اور ضعف زیادہ طاری ہوا تو ایک مزید چیز اور پیش آگئی کہ میں طواف کر رہا تھا، اتفاق سے کسی بدوی کی لنگی پر میرا پیر پڑ گیا اور وہ کھلتے کھلتے رہ گئی اس نے جذبہ میں آ کر ایک دھول مارا۔ تو حضرت حاجی صاحبؒ کی بڑھاپے کی کمزوری، اور چھ وقت کا فاقہ، تو گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے، اسی میں فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا گویا نیم بیداری ہے۔ کشف کی سی کیفیت کہ بیت اللہ کے ایک طرف حضرت جبریل علیہ السلام کھڑے ہوئے ہیں اور ایک طرف حضرت میکائیل علیہ السلام جبریل کہتے ہیں میکائیل سے کہ: بندہ تو بڑا صابر نکلا، میکائیل کہتے ہیں ابھی تھوڑی سی کسر اور ہے۔ جب آنکھ کھلی تو میں سمجھا کہ مجھے تسلی دی گئی ہے، میں نے پھر عہد کی تجدید کی یا اللہ! کچھ بھی گزر جائے میں کسی غیر سے مانگنے والا نہیں ہوں، آپ زیادہ سے زیادہ جان لے لیں گے تو جان تو آپ ہی کی ہے میری کب ہے۔

اب یہ کہتے تھے کہ جب دس وقت کا اور گیارہ وقت کا فاقہ ہو گیا، اب چلنا پھرنا دشوار ہو گیا حتیٰ کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنی دشوار ہو گئی بیٹھ کر نماز پڑھنے لگا، مگر ہر نماز کے بعد عہد کی تجدید کر دیتا تھا کہ پکا ہوں اس سے ہٹوں گا نہیں، آپ دیں گے کھالوں گا، نہیں دیں گے نہیں کھاؤں گا۔

فرماتے تھے، جب گیارہ وقت کا فاقہ ہو گیا تو کسی نے دروازے پر دستک دی، میں نے کہا کہ بھائی آ جاؤ! وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں چینی کا ایک قاب تھا، وہ میرے سامنے رکھ دیا میں نے کھولا تو مرغ کا پلاؤ اس میں پکا ہوا تھا، دل میں یہ خیال گزرا کہ میں نے تو عہد کیا تھا کہ غیر اللہ سے نہیں مانگوں گا اور یہ غیر اللہ ہی تو لے کر آیا ہے، اللہ نے تو بھیجا نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے عہد میں اس غیر سے لے کر فرق آ جائے۔

یہ دل میں خطرہ گزرا تھا تو وہ لانے والا کہتا ہے جو چیز بلا طلب آتی ہے وہ من جانب اللہ آتی ہے، کھائیے شوق سے میں نے کھانا شروع کر دیا خوب شکم سیر ہو کر کھایا، نصف کے قریب باقی رہ گیا تو خطرہ یہ گزرا کہ رات کے لئے رکھ لوں، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ جس نے گیارہ وقت میں مجھے فراموش نہیں کیا، کیا وہ رات کو بھول جائے گا، یہ بھی ایک قسم کی اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ رات کے لئے رکھوں، قاب ڈھک دی۔

وہ شخص اٹھا اور قاب اٹھاتے ہوئے بولا کہ بہت اچھا ہوا جو رات کے لئے نہیں رکھا، اگر رات کے لئے رکھتے تو ساری عمر فاتے میں مارے جاتے، فرماتے ہیں کہ مجھے خبر نہیں کہ وہ کون تھا، کوئی آدمی تھا، کوئی جن تھا، کوئی

فرشتہ تھا مگر پھر میں نے اسے نہیں دیکھا وہ چلا گیا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ بیٹا! وہ دن ہے اور آج کا دن ہے دنیا کثرت سے میرے گھر میں آرہی ہے کہ بانٹتے بانٹتے تنگ آ گیا ہوں لیکن دنیا ہے کہ آرہی ہے، نقد میں نقد، کپڑے میں کپڑا، کھانے میں کھانا، اور فرمایا کہ یہ گھر ہے اس میں ہزار درہم اور دینار تو پڑے ہوئے ہیں صندوقچی کے اندر اور اتنے تھان کپڑوں کے رکھے ہوئے ہیں، اتنے برتن ہیں بانٹا بانٹا تنگ آ گیا ہوں، پھر آ جاتے ہیں۔ یہ حضرت کی کیفیت تھی، خیر تو مجھے سنا یہ تھا کہ بہر حال حضرت کا پھر سلسلہ چلا، ہزاروں بیعت ہوئے اور گھر میں بہت کچھ اللہ نے دیا۔

حاجی امداد اللہ کے گھر چور..... چنانچہ چوروں نے دیکھ لیا کہ بھی ایک مولانا حاجی صاحب ہیں ان کے گھر میں بہت کچھ ہے، یہاں اگر چوری کی تو بہت کچھ ملے گا، رات چور آ گئے اور حضرت حاجی صاحب تہجد پڑھ رہے تھے، چوروں کو پتہ نہیں تھا کہ نماز میں مصروف ہیں، حاجی صاحب نے دیکھ لیا انہوں نے سارے گھر کا سامان بٹورا، کپڑے اور برتن وغیرہ ان کی گٹھڑیاں باندھیں جب لے جانے لگے تو حضرت نے فرمایا: احمق! بے وقوف! اتھیں چوری بھی کرنی نہیں آئی، جو چرانے کی چیز ہے وہ تو نہیں لی، نقد تو وہاں کئی ہزار روپیہ رکھا ہوا ہے، وہ چور بھی شرمندہ اور نادام کہ کس کے گھر میں چوری کرنے آ گئے، خود ہی دینے کو تیار ہے وہاں جا کر اس کو ٹھہری کو دیکھا تو کئی ہزار روپیہ نقد ملا، بہر حال وہ روپیہ اور نقد چیزیں لے کر چور چل دیئے۔ حضرت حاجی صاحب نے کیا کیا جب سارا گھر خالی کر کے وہ چلے گئے تو مصلے پر دو رکعت نماز نفل پڑھی اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ اس دباں کو تو نے بٹا دیا اب میں تیرے لئے فارغ ہوں، رات دن عبادت میں مصروف رہوں گا، بڑا شکر ادا کیا کہ مال چلا گیا۔

چونکہ حضرت کا تعارف حکومت میں بھی ہو چکا تھا، پبلک میں بھی ہو چکا تھا لہذا یہ شہرت ہوئی کہ چوری ہو گئی! تو چوروں نے جب مال نیلام گاہ پر لے جا کر رکھا تو سینکڑوں مریدین نے پہچان لیا کہ یہ تو حضرت کا مال ہے وہ سارے چور پکڑے گئے اور گرفتار ہوئے اور ایک ایک پائی حکومت نے چوروں سے وصول کر لی، اور پھر سارا مال لا کر حضرت کو دیا، وہی تھان، وہی کپڑے، وہی نقدی، جب وہ ساری آگئی تو مصلیٰ بچھا کر دو رکعت نفل پڑھی کہا ”یا اللہ! تیرا شکر ہے میری چیز میرے پاس آ گئی۔“

یہ ان حضرات کا مقام ہے کہ چیز چلی جائے جب شکر گزار اور آ جائے جب شکر گزار، یہ علامت اس کی ہے کہ ان کی نگاہ نعمت اور مصیبت پر نہیں ہوتی، مصیبت بھیجنے والے پہ ہوتی ہے نعمت دینے والے پہ ہوتی ہے کہ دینے والا کون ہے؟ وہ وہ ہے جو ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہے تو اس نے اگر مصیبت بھیجی تو یقیناً ہماری خیر خواہی کے لئے بھیجی ہے، نعمت بھیجی ہے، یقیناً ہماری مصلحت کے لئے بھیجی ہے، تو ان لوگوں کی نگاہ نہ نعمت پر ہے نہ مصیبت پر ہے، نعمت دینے والے پر ہے، منعم پر ہے مصیبت بھیجنے والے پر ہے مصیبت پر نہیں۔

منعم سے نگاہ ہٹنا ہی مصیبت ہے۔..... اس سے اندازہ ہوا کہ ساری مصیبتوں کی جز نعمت اور مصیبت کے

اور پر نگاہ ہے، اہل اللہ اسے چھوڑ کر مصیبت بھیجنے والے پر نگاہ رکھتے ہیں، اس لئے ان کے قلب میں نہ کوئی پریشانی ہے، نہ کوئی پراگندگی ہے، وہ منعم سے تعلق قائم کرتے ہیں، نعمت سے نہیں، نعمت چلی جائے جب بھی نماز پڑھیں گے، شکر ادا کریں گے کہ الحمد للہ فارغ ہو گئے، آجائے پھر نماز پڑھیں گے شکر ادا کریں گے کہ اللہ نے پھر ہمارا گھر بھر دیا، وہ ہر حالت میں راضی یہی ہے وہ چیز جسے میں نے عرض کیا تھا، حدیث میں ہے کہ: ”عَجَبًا لِّأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَصَابَتْهُ سَرَّاءٌ شَكَرَ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءٌ صَبَرَ“ مومن کی کوئی کل بری نہیں، عجیب شان ہے کہ نعمت آتی ہے تو شکر گزار ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے، مصیبت آتی ہے تو صبر کر رہا ہے اور صبر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے۔

غرض اس کے یہاں روکنے والی چیز نعمت ہے نہ مصیبت، جس پر اس کی نگاہ ہے وہ نعمت کے راستے سے بھی پہنچ جاتا ہے اور مصیبت کے راستے سے بھی وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

علامہ اٹمؒ اور ان کی حسین بیوی..... ہمارے علماء سلف میں ایک عالم گزرے ہیں اٹمؒ یہ فن نحو کے امام تھے، نحو اور صرف ایک فن ہے جس سے عربی کے قواعد سمجھے جاتے ہیں اسکے بہت بڑے عالم اور امام تھے، تو وہ اس قدر بد صورت تھے کہ جتنی بد صورتی کی علامتیں تھیں ساری ان کے بدن میں موجود، رنگ بھی انتہائی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھیں بھی کرنچی، دانتوں پہ زردی۔

غرض یہ بد صورتی کی ساری چیزیں جمع تھیں، بس علم اللہ نے دے دیا تھا، اور بیوی جوتلی تو صوبوں میں اس کی مثال نہیں تھی، حسن و جمال میں وہ اس قدر حسین و جمیل، جب دونوں آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے دھوپ اور چھاؤں آمنے سامنے ہے ایک طرف دھوپ کھل رہی ہے اور ایک طرف ظلمانی سایہ۔ تو اپنی بیوی سے کہا کرتے کہ ”میں یقیناً جنتی تو بھی یقیناً جنتی“ اس نے کہا آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ فرماتے: اس لئے کہتا ہوں کہ مجھے تو تجھ جیسی بیوی ملی اس کی مثال صوبوں میں موجود نہیں، تو میں شکر کرتا ہوں اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچوں گا اور تجھے مجھ جیسا خاوند ملا کہ جس سے زیادہ بد صورت کوئی نہیں تو تو صبر کرتی ہے کہ میری قسمت میں یہی تھا، تو صابر ہے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی، تو میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔ تو خیر وہ تو حسی طور پر جنتی ہے، مگر اہل اللہ معنوی طور پر جنتی بنتے ہیں، نہ نعمت پہ ان کی نظر ہے نہ مصیبت پہ، بھیجنے والے پر نظر ہے تو نعمت آجائے جب بھی مطمئن، چلی جائے تب بھی مطمئن، یہی وجہ ہے کہ کفار سے اگر ان کا سامان چھین لیا جائے تو مرنے سے پہلے مر جاتے ہیں، اس لئے کہ جن چیزوں سے ان کا سکون متعلق تھا جب وہ چھین گئیں تو وہ پریشان ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سلب ہو گئی، بے آرام ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے سکون قائم کیا تھا سامانوں سے اور اللہ والوں کے پاس سے سارا سامان نکل جائے ان کے سکون میں فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ ان کے سکون کا تعلق ان چیزوں سے تھا ہی نہیں، وہ تو بھیجنے والے سے تعلق تھا اور وہ بدستور موجود ہے۔

حالت رضا کا غلبہ..... جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہؓ پریشان تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، مغلوب الحال ہو گئے اور تلوار لے کر کھڑے ہو گئے کہ اگر کسی نے یوں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا، یہ غلبہ حال میں ایک کیفیت پیدا ہوئی گویا غم کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ ہر چیز فراموش ہو گئی۔ اور یہ ہوتا ہے کہ جب کسی حال کا غلبہ ہوتا ہے، تو قطعی اور یقینی چیزیں بھی دل میں رہتی تو ہیں مگر دب جاتی ہیں اور نہیں آتیں حالانکہ ان پر یقین ہے یقین ہے فاروق اعظم رضی اللہ کو کہ انبیاء علیہم السلام بھی وفات پانے والے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی ہوگی۔ قرآن کریم میں صراحت فرمایا گیا کہ: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ ① دب کر رہ گیا یقین تو غلبہ حال جب ہوتا ہے تو بہت سی یقینی چیزیں مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، دب جاتی ہیں۔

تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر ایک حال طاری ہوا اور وہ حال تھا شدت تعلق کا کہ انبیاء علیہم السلام بھلا کہاں مرتے ہیں، اتنا قدیم اور مضبوط تعلق تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں شک ہو گیا کہ وفات ہوئی یا نہیں، یہ غلبہ حال تھا یہ نہیں کہ معاذ اللہ۔ ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ پر یقین نہیں تھا۔ اس وقت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، اور فرمایا کہ بھلے مانس بیٹھ جائیں، وہ (فاروق اعظمؓ) تو جوش میں تلوار لئے کھڑے تھے اور لوگ ڈر رہے تھے کہ اگر ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کیا تو یہ گردن اڑا دیں گے، صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھلے مانس! میرے پاس بیٹھ جا، بیٹھ گئے، اب صدیق اکبرؓ نے فرمایا: ”مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، قَالَ اللَّهُ تَعَالَى ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنَّ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ﴾“ ②

فرمایا: اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے تو وہ وفات پا گئے غلبہ جب حالت کا ہوتا ہے محبت کے غلبہ میں بعض دفعہ ایسی کیفیت ہوتی ہے جس سے ہمیں زیادہ محبت ہے اور وہ گزر جائے تو ہفتوں، دنوں یقین نہیں آتا کہ کیا واقعی گزر گیا، برسہا برس کی محبت کے بعد جب گزر جائے تو ذل میں ایک قسم کا ریب اور اریاب پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو گویا میرے والی چیز ہی نہیں تھی، کہاں سے مر گیا یہ شخص؟

تو ہفتوں اس میں گزرتے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جیسے کہتے ہیں یقین نہیں آتا، یقین بھی ہے مگر اس کے باوجود ایک شک سار ہوتا ہے، شدت تعلق کی بناء پر تو صحابہؓ سے زیادہ کس کو شدید تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، فاروق اعظمؓ کے ذہن میں شدت تعلق کی بناء پر جتنا ہی نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو

① پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیہ: ۳۰۔

② (الصحيح للبخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاته ج: ۱۳ ص: ۳۶۲ رقم: ۴۰۹۷۔)

تلوار لے کر کھڑے ہو گئے۔

علماء یہی لکھتے ہیں کہ غلبہ حال تھا اور غلبہ حال میں یقینی چیزیں ڈھک جاتی ہیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اس کی حسی نظیر یہ ہے کہ آپ چڑیا گھر میں تو گئے ہوں گے، یہاں لندن میں بھی ایک باغ ہے جس کے اندر جانور، درندے، شیر، بھیڑیے پلے ہوئے ہیں، آپ شیر دیکھنے کے لئے گئے، موٹی موٹی سلاخوں میں آپ نے دیکھا کہ شیر بند ہے، قطعی یقین ہے آپ کو کہ یہ باہر نہیں آ سکتا نہ مجھ پر حملہ کر سکتا ہے اسلئے آپ سلاخ کے قریب کھڑے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ دھاڑ کر آئے تو آپ ڈر کے مارے ڈیڑھ گز پیچھے جاتے ہیں، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ آپ کا یقین ختم ہو گیا اور شیر سلاخیں توڑ کر نکل آئے گا؟ نہیں خوف کی وجہ سے خوف کا حال اتنا غالب ہوا کہ وہ جو یقین تھا کہ نہیں آ سکتا وہ خوف کے غلبہ سے دب گیا، زائل نہیں ہوا، بعینہ یہی غلبہ محبت تھا فاروق اعظمؓ پر، موت کا یقین تھا، غلبہ محبت ہوا کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ آپ کی وفات ہوگئی، مگر صدیق اکبرؓ نے فرمایا اگر تم اللہ کی عبادت کرتے تھے تو اللہ آج بھی زندہ ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین آگے باقی نہ رہے، دین چلے گا اور صدیوں چلے گا اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت پڑھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو تھے اللہ کے اور ہزاروں رسول گزر چکے ہیں اگر یہ بھی گزر جائیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فاروق اعظمؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہوا جیسے آج اتری ہے یہ آیت اور میں نے کبھی یہ آیت پڑھی ہی نہیں تھی۔ یہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے قلب کا تصرف تھا، ایک ایسی کیفیت فاروق اعظمؓ کے قلب پر طاری ہوئی کہ یہ معلوم ہوا، گویا یہ آیت آج اتر رہی ہے، اور آج میرا عقیدہ بن رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو وفات ہونے والی ہے۔ تو غلبہ حال میں بعض دفعہ یقینی چیزیں بھی مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح سے آدمی کے اوپر اگر حالت رضا کا غلبہ ہو جائے کہ جو کچھ ہے وہ سب من اللہ ہے کوئی سبب کچھ نہیں کر سکتا، کرنے والا مسبب الاسباب ہے تو پھر اسباب کی طرف سے نظر اٹھ جاتی ہے، باوجودیکہ اسباب کا ہی مشاہدہ ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود نگاہ مسبب الاسباب کے اوپر ہو جاتی ہے اسباب نگاہ میں کا لعدم سے ہو جاتے ہیں۔

اسباب نہیں کرتے، مسبب الاسباب کرتا ہے..... حقیقت یہی ہے کہ اسباب کچھ نہیں کرتے، یہ آلات ہیں، کرنے والی چیز قدرت خداوندی ہے، اور مشیت الہی ہے، پانی نہیں ڈبوتا، مشیت ڈبوتی ہے، اگر مشیت نہ چاہے، پانی ہو، موجیں آسمان کے برابر چلی جائیں آدمی نہیں ڈوب سکتا، اور مشیت چاہے گی تو ڈوب جائے گا۔ دریائے قلزم کے اندر بنی اسرائیل بھی کودے اور فرعون بھی کودا، بنی اسرائیل پار نکل گئے، پانی نے کوئی اثر نہیں کیا بلکہ راستے بن گئے اور فرعون اور فرعونین کو ڈوب دیا، تو پانی ڈوبنے والا نہیں تھا، مشیت ڈوبنے والی تھی، مشیت متعلق ہوئی کہ یہ ڈوبیں تو ڈوب گئے، اور ان سے مشیت متعلق تھی کہ یہ پار ہو جائیں تو یہ پار ہو، تو یہ تر گئے۔ آگ نہیں جلاتی بلکہ مشیت جلاتی ہے، مشیت نہ ہو آگ کچھ نہیں کر سکتی، آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، مشیت نہیں تھی

کہ آگ جلانے وہی باغ و بہار بن گئی، کچھ نہیں کر سکی۔ چھری نہیں کاٹتی، اس کی دھار نہیں کاٹتی بلکہ مشیت خداوندی کاٹتی ہے، اگر مشیت نہ ہو دھار دار چھری ہو کام نہیں کرے گی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری پھیری، چھری پھر رہی ہے، چھری کاٹ نہیں رہی، اس لئے کہ مشیت خداوندی نہیں تھی، تو کاٹنے والی چھری نہیں تھی، ڈبونے والا پانی نہیں تھا یہ ڈبونے کے اسباب ہیں یہ ذبح ہونے کے اسباب ہیں۔ اصل میں ان میں مسبب کی طرف سے تاثیر آتی ہے، تو اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو تا کہ بندگی واضح ہو، مگر انہیں موثر بالذات مت سمجھو کہ انہی میں سب کچھ رکھا ہوا ہے، موثر حقیقی ذات خداوندی ہے وہ اسباب میں سے تاثیر نکال دے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

آدمی اولاد چاہتا ہے، بیوی کے پاس جاتا ہے، پچاسیوں دفعہ گیا نہیں ہوئی، تمنا ہے بچوں کی، بقول فحشے کہ چڑیا کا بچہ بھی ہو جائے مگر نہیں ہوا اور بعض وہ ہیں کہ نہیں چاہتے کہ اولاد ہو ہر سال ایک بچہ، ہر سال ایک بچہ، تنگ آ جاتے ہیں کہ کہاں تک انہیں پالوں اور پرورش کروں، تو تمنا کیوں نہیں پوری ہوتی، حالانکہ اسباب سارے پورے ہو رہے ہیں، اس واسطے کہ مشیت نہیں ہے، مشیت کیوں نہیں؟ اس لئے کہ حکمت کے خلاف ہے یہی مصلحت ہے اس بندے کے لئے کہ اولاد نہ ہو، اس کے لئے یہی مصلحت ہے کہ اولاد ہو۔

تو اہل اللہ کی مشیت اور مرضی الہی پر نظر ہو جاتی ہے، جب اس پر نظر ہوئی تو اسباب نہیں ہیں، مگر دھیان دوسری طرف ہوتا ہے، تو جب اس پر دھیان ہو جائے گا اور تعلق مع اللہ مضبوط ہو جائے گا، پھر تشویش بھی ختم پریشانیاں بھی ختم، دل کی بے سکونی بھی ختم، قلب کے اندر ٹھنڈک پیدا ہو جائیگی۔

دنیوی سطح پر تعلق مع اللہ کی ضرورت اس سے معلوم ہوا کہ تعلق مع اللہ صرف آخرت ہی کے لئے ضروری نہیں ہے دنیا کے لئے بھی ضروری ہے، دنیا کا سکون بھی چاہتے ہو تو تعلق مع اللہ ہونا چاہئے جو لوگ صاحب وسائل ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلوں میں قطعاً وہ سکون نہیں جو اہل اللہ کے دل میں ہے، باوجودیکہ سامان نہیں ہے ان کے پاس وہ ہر وقت گن اور مطمئن ہیں، اصل یہ ہے کہ اللہ سے تعلق صحیح ہو اور قلب کا مرکز صحیح بن جائے، ظاہر بات ہے کہ جب قلب کا مرکز صحیح ہو جائے گا، تعلق حق تعالیٰ سے قائم ہو جائے گا تو ادھر کے کمالات بھی آنا شروع ہوں گے ادھر سے اوصاف کمال بھی اس کے اندر آئیں گے، آخرت کی زندگی کے لحاظ سے بھی ضروری؟ ایک ہی سرچشمہ ہے، کہ جس سے لگ کر آدمی پریشانیوں سے اور گھٹن سے بچ سکتا ہے اور اگر ہر وقت آپ اس فکر میں ہیں کہ یہ مرے یا جیے میرا فائدہ ہو جائے یہ تو خود مطلبی خود غرضی ہے اس کا نام خدمت نہیں، خدمت کرنے والا اپنے نفس کو بھلا کر اپنے بھائی کی خدمت کرے گا کہ اس کا نفع ہو میرا چاہے نفع ہو یا نہ ہو تو اسلام نے خود غرضی کو مٹا کر ایثار پیدا کیا ہے کہ خدمت خلق اللہ اپنے اندر پیدا کرو، اس کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو۔

ایمان کی دو بنیادیں ایمان کی جو تعریف کی ہے علماء نے وہ دو ہی چیزوں سے کی ہے کہ ایمان کے کہتے

ہیں؟ اَلْعَظِيمُ لَا مِرَّ لِلّٰهِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰهِ اللہ کے اوامر کی عظمت دل میں ہو اور مخلوق خدا کی خدمت کا جذبہ دل میں ہو، ان دو چیزوں کا نام ایمان ہے۔ یعنی ان کے مجموعہ کا، اگر ایک شخص خادم شخص ہے مگر اللہ کے قانون کی عظمت نہیں کرتا، وہ بھی درحقیقت ایمان دار نہیں ہے، اللہ پر بھروسہ بھی ہے مگر خدمت خلق کے بجائے خلق کو ایذا رسانیاں کر رہا ہے تکلیفیں پہنچا رہا ہے تو درحقیقت اس کے ایمان میں خلل ہے، ایمان کی دو بنیادیں ہیں کہ تعظیم ہو اور امر الہیہ کی اور جذبہ خدمت ہو خلق اللہ کے لئے ان دو چیزوں سے ایمان مضبوط ہوتا ہے تو مخلوق کے ساتھ تعلق جب قائم ہو سکتا ہے جب احسان اور ایثار اور خدمت کے جذبات ہوں اور مساوات کا جذبہ ہو کہ یہ میرا بھائی ہے اسے بھی نفع پہنچنا چاہئے اگر میرے پاس ایک روٹی ہے دوسرے کے پاس نہیں تو میں آدھی آدھی بانٹ لوں گا تا کہ دونوں کے پیٹ میں کچھ نہ کچھ پہنچ جائے، تنہا کھالینا خود غرضی ہوگی، جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے اگر کسی کی دیوار کے نیچے پڑوسی پر فاقے گزر رہے ہیں اور وہ پیٹ بھر کر کھا رہا ہے اس کی نمازیں بھی قبول نہیں ہوں گی جب تک کہ وہ پڑوسی کی رعایت نہ کرے اور اس کا پیٹ بھرنے کی کوشش نہ کرے، تو آدمی یہ سمجھے کہ میں اتنی تلاوت کرتا ہوں اتنی نمازیں پڑھتا ہوں اور خدمت خلق کا یہ عالم کہ دیوار کے نیچے لوگ فاقہ بھر رہے ہیں تو کہا جائے گا کہ اس نے ایمانداری کا کافی الحقیقت ثبوت نہیں دیا اور یہ نماز و ذکر و عبادت کا رآمد نہیں ہوں گی جب تک اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ پیدا نہیں ہو جائے گا، کہ میرا بھائی بھی بھوکا نہیں رہنا چاہئے، بہر حال یہ جذبہ پیدا کیا جائے۔ اصول فرمادیا گیا کہ: ”اَحَبُّ لَاحِبِّكَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ“ ① (اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو) اور جو چیز اپنے لئے بری جانتے ہو اپنے بھائی کے لئے بھی بری جانو جب تک مساوات معاملے کی نہیں ہوگی ایمانداری مضبوط نہیں ہو سکتی گی، اگر آپ یہ چاہتے ہیں اور آپ کو برا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کوئی گالی دے تو آپ بھی کبھی کسی کو گالی نہ دیں جو اپنے لیے برا سمجھتے ہیں وہ اپنے بھائی کے لئے برا سمجھیں، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو آپ بھی کسی کی بہو بیٹی پر بری نگاہ نہ ڈالیں جب تک یہ نہیں کریں گے آپ کی ایمانداری مضبوط نہیں ہوگی۔

زمین خریدنے والے ایک صحابی کی زمین سے سونا نکلتا..... فرق یہی ہے کہ ہم لوگ لڑتے ہیں اپنی اغراض کی خاطر کہ مجھے یہ مل جائے چاہے دوسرا فاقے سے مر جائے حضرات صحابہؓ میں ایثار وہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ لڑتے تھے اس پر کہ دوسرے کو مل جائے مجھے نہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے زمین خریدی دوسرے صحابیؓ نے اس کو جو کھدوایا تو اس کے اندر سے ایک بہت بڑا پتیل نکلا پتیل یا تانبے کا جس میں سونا بھرا ہوا تھا، لاکھوں روپے کا سونا، انہوں نے کہا یہ بند کا بند رہنے دو اور وہ پتیل کا پتیل لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی کہ یہ آپ کی چیز ہے آپ رکھیں، انہوں نے کہا

① مسند احمد، حدیث اسد بن کرز جلد خالد القسری رضی اللہ عنہ ج: ۳۳ ص: ۳۸۶ رقم: ۱۶۰۵۷۔

کیا مطلب ہے؟ کہا میں نے جو زمین خریدی ہے اس میں سے نکلا ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین بیچ دی تو زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ ہے وہ بھی بیچ دیا یہ تو آپ کا ہے میرا کب ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین خریدی تو اس میں اس کا ذکر نہیں تھا، اب وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، اس پر لڑائی ہو رہی ہے۔ ہم تو اس پر لڑتے ہیں کہ ہمارا ہے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں ثابت کرتے ہیں کہ یہ زمین ہماری ہے، وہ ثابت کرنے کی فکر میں تھے کہ میری نہیں میرے بھائی کی ہے، جب جھگڑا ختم نہ ہو سکا تو مقدمہ پہنچا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک، جب دیکھا کہ یہ نہیں سمجھتے تو فرمایا تمہارے کوئی اولاد بھی ہے؟ ایک نے کہا لڑکا ہے، ایک نے کہا میرے ہاں لڑکی ہے، فرمایا دونوں کی شادی کر دو اس میں اس مال کو خرچ کر دو، تو خوش ہو کر چلے گئے، گویا اس پر کوئی تیار نہیں ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرے، وہ راضی ہوئے نہ یہ راضی ہوئے تو اولاد پر خرچ کر دیا اس پر راضی ہو گئے، یہ وہی جذبہ خدمت اور جذبہ ایثار تھا کہ دینے کے اوپر لڑائی ہوتی تھی۔ ہماری لڑائی لینے پر ہوتی ہے اس لیے کہ دنیا کی محبت تھکی ہوئی ہے، ان کے دلوں میں اللہ اور رسول کی محبت ہوتی تھی، دنیا ان کے تابع تھی تو وہ لینے پر نہیں جھگڑتے تھے دینے پر جھگڑتے تھے، ہمارے دل میں تو گھٹن جب ہوتی ہے جب پیسہ پاس نہ رہے، ان کے دل میں گھٹن جب ہوتی تھی جب پیسہ بڑھ جائے۔

حضرت جابرؓ اور ان کی بیویؓ کا ایک رات میں چھ لاکھ درہم خیرات کرنا..... حضرت جابر رضی اللہ عنہ لکھ پتی صحابہ میں ہیں ایک دن آئے تو چہرہ ادا اس تھا، بیوی بھی صحابیہ تھی انہوں نے کہا کہ آج آپ غمگین کیوں ہیں؟ کہا خزانہ میں روپیہ بہت جمع ہو گیا دل پہ بوجھ ہو رہا ہے، انہوں نے کہا بوجھ ہو رہا ہے تو غریبوں میں تقسیم کر دو اس بوجھ کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے، کہا واقعی بات تو ٹھیک کہی میرے ذہن ہی میں نہیں آئی، اسی وقت خزانچی کو حکم دیا کہ غریبوں میں تقسیم کر دو، رات بھر مدینہ کی گلیوں میں پیسوں کو بیواؤں کو مفلسوں کو مال تقسیم ہوتا رہا، صبح کو جب حساب لگایا تو چھ لاکھ درہم تقسیم ہوئے رات بھر میں، صبح کو بیوی کا شکریہ ادا کیا کہا ”اللہ تجھے جزائے خیر دے میرا دل ہلکا ہو گیا، سارا بوجھ ختم ہو گیا“ تو ہم پہ تو بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی کمی آجائے، وہاں بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی زیادتی ہو جائے، فرق یہی تھا کہ ہم میں تعلق مع اللہ کمزور ہے، ان کا تعلق مع اللہ مضبوط ہے اس لیے ان کی نگاہ ان چیزوں کی طرف نہیں تھی، ہمارا تعلق انہی چیزوں سے ہے یہ گھٹ جائیں تو دل میں پریشانی بڑھ جاتے تو دل میں سکون کی بجائے اس کے کہ تو کل علی اللہ کریں، کسی نے تو کل علی اللہ دولت کر رکھا ہے، کسی نے تو کل علی العورت کر رکھا ہے، کسی نے تو کل علی البلد نگ کر رکھا ہے، مختلف تو کلمات ہیں اور نہیں تو کل تو اللہ کے اوپر نہیں ان کا تو کل بھروسہ اور اعتماد حق تعالیٰ کے اوپر تھا اس لیے ان چیزوں کی اہمیت کوئی نہیں تھی، یہ ضروریات زندگی تھیں۔

ذرائع رزق سے تعلق کی نوعیت..... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی آج سے کمانا چھوڑ دے، ملازمت بھی چھوڑ دے، جائیداد تجارت بھی چھوڑ دے کہ صاحب میں تو ان پر نظر نہیں رکھتا یہ بھی غلط ہے یہ افراط ہے وہ تفریط، کمانا

بھی ضروری ہے، لازم قرار دیا ہے اسلام نے۔ ”كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ“ ① (پاک اور حلال کمائی کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح سے نماز پڑھنا فرض ہے) اپنی قوت بازو سے کماؤ بھک مگے مت بنو کہ دوسرے سے مانگ کر کھاؤ، ایسے بنو کہ دس کو کھلا کر کھاؤ، قوت بازو سے کماؤ، تو کسب حلال کو فرض قرار دیا گیا ہے، کیوں کماؤ؟ تاکہ زندگی آسودگی سے گزرے، کیوں زندگی آسودگی سے گزرے؟ تاکہ اللہ کی عبادت کر سکو، بندگی کے فرائض انجام دے سکے تو مقصود اصلی کمانا نہ ہوا، بلکہ بندگی اور عبدیت ہوئی، اس کے وسائل میں سے ہے کمانا تو اسے لازم قرار دے دیا گیا، کہ کماؤ تو حاصل یہ کہ میرے پاس اتنا ہو جائے کہ میں دوسرے سے مانگنے کے لائق نہ بنوں، لیکن اس میں اگر حق تعالیٰ برکت دے اور سو سے تم ہزار پتی ہو جاؤ اور ہزار سے لکھ پتی تو یہ نہیں کہ اس دولت کو سمندر میں بہا دو، جا کر اس کی حفاظت کرو اور اس میں سے حقوق ادا کرو، اولاد کا حق، بیوی کا حق، رشتہ داروں کا حق، غریبوں کا حق۔ یہ ادا کرو تو کمانا برا نہیں ہے، حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے، جب وہ کمائی پاک بنے گی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ پر توکل کر کے ان چیزوں کو آدمی ترک کر دے، ملازمت، زراعت سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ دے بلکہ سب چیزیں اختیار کر لے اور اللہ ہی کے کہے کے مطابق انہیں خرچ کرے، پھر یہ ساری چیزیں اطاعت و عبادت میں داخل ہو جائیں گی، تو صحابہ کرامؓ میں لکھ پتی بھی ہیں، کروڑ پتی بھی ہیں، اگر دنیا کمانا مضرب ہو تا تو صحابہ ملازمت کرتے نہ تجارت کرتے نہ صنعت و حرفت میں پڑتے لکھ پتی ہونا تو بعد کی چیز ہے، لیکن وہ لکھ پتی بھی تھے۔ عبد الرحمنؓ بن عوف کی مال داری اور خشیت خداوندی..... حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ لکھ پتی صحابہؓ ہیں ان کی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعادی تو کیفیت برکت کی یہ تھی کہ ان کا مال غیر ممالک میں بھی سپلائی ہوتا تھا، نفع کا روپیہ جب آتا تھا تو یہ نہیں کہ کوئی ایک دو آدمی جیب میں ڈال کر چلے آئیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کے لیے کوئی صندوق کوئی پٹارہ نہیں رہتا تو تنگ آ کر کہتے گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دو، روپے اشرفی کا ڈھیر اس طرح لگ جاتا تھا، جیسے کاشتکار کے گھر میں غلہ کا ڈھیر لگ جاتا ہے کہ زمین سے غلہ آیا انہوں نے کہا گھر میں ڈھیر کر دو، یہ کیفیت تو دولت کی تھی۔

لیکن اس دولت کے ساتھ قلب کی کیفیت کیا تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمان داری تھی چار چار سو مہمان ایک وقت میں ہوتے تھے، دسترخوان بچھتا کئی کئی کھانے اس پہ چنے جاتے جب دسترخوان چن دیا گیا مہمان کئی سو بیٹھے اور عبد الرحمن بن عوفؓ بیٹھے، اب بیٹھ کر روٹنا شروع کیا بے اختیار گریہ طاری ہوا اور کہا اے اللہ! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر تو کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبد الرحمنؓ کے دسترخوان پر اتنے کھانے کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو ختم نہیں کی جا رہیں، یہ کہہ کر آبدیدہ ہوتے سارے مہمان روتے اور بے کھائے چپے دسترخوان اٹھ جاتا۔

کسی کے اندر یہ ذوق نہ رہتا کہ کھانا کھائیں، غم آخرت میں مبتلا ہو گئے، شام کو دسترخوان بچھا بیٹھے اور عبد الرحمنؓ

① السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الاجارہ، باب کسب الرجل وعمله بیدہ ج: ۶ ص: ۱۲۸۔

بن عوفؓ کو نعمتیں دیکھ کر پھر گریہ طاری ہوا اور کہا کہ: اے اللہ! تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ نے اس حالت میں انتقال فرمایا کہ کفن کے لیے چادر پاس نہیں تھی، چھوٹی چادر تھی سر ڈھانپتے تھے تو پیر کھل جاتے تھے، پیر ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا آخر کار سر ڈھانپ دیا گیا پیروں پر گھاس ڈال دی گئی اور قبر میں دفن کر دیا گیا تو عم رسولؐ، رسول کے چچا تو اس ناداری میں اور عبدالرحمنؓ کے دسترخوان پر اتنی نعمتیں، کہیں میری جنت دنیا میں تو ختم نہیں کی جا رہی کہ وہاں میں محروم رہ جاؤں اور مجھے کہہ دیا جائے ﴿اذْهَبْهُمْ طَيِّبَتْ كُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ ① (کہ تم دنیا میں نعمتیں ختم کر چکے ہو اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟) کہیں ایسا تو نہیں ہوگا؟ تو دسترخوان سے بے کھائے اٹھ جاتے، تین تین وقت کے فاقے تھے تو لکھ پتی بھی ہیں اور قلب کا یہ حال ہے۔

مقام تقویض میں مال رکاوٹ نہیں ہو سکتا..... تو اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کماؤ مت، یہ کہتا ہے کہ اسے معبود مت بناؤ اس مال کو محروم مت بناؤ، گویا قلب کا تعلق قائم کر دیا تمہاری شان یہ ہونی چاہئے کہ:

دل بیار دست بکار

”ہاتھ پیر کا رو بار میں لگے ہوں، دل یار کے اندر لگا ہوا ہو۔“ ہاتھ پیر دولت میں مصروف اور دل اللہ میں مصروف، مسلمان کی یہ شان ہونی چاہئے، بھک مٹکا اور مفلس ہونا مسلمان کی شان نہیں ہے، غنی ہونا مومن کی شان ہے، غنی وہی ہو کہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہو اور پھر وہ بے پروا ہو۔

”تَحْيِيرُ الْغَنِيِّ غِنَى النَّفْسِ“ ② بہترین غنائیہ ہے کہ نفس غنی بن جائے۔ خزانہ بھرا ہوا ہے مگر نفس غنی ہے، ایسے غنی بن کر جو صرف کرے گا تو اس سے ہزاروں کے منافع ہوں گے، تو مفلس بنانا اسلام کا مقصد نہیں ہے غنی بنانا اسلام کا مقصد ہے اور غنی بنانے کے یہ معنی ہیں کہ ساری دولت دنیا کو خادم سمجھو ضرورت ہے، ضرورت کے لئے آدمی کرتا ہے سب کچھ کراہت بھی رکھو مگر اس کے باوجود اس سے خدمت بھی لو آخر آدمی پاخانہ میں بھی جاتا ہے، تو کوئی رغبت سے جاتا ہے کہ اسے بڑا شوق ہے پاخانہ جانے کا کراہت سے بیٹھتا ہے، مگر جانا بھی ضروری ہے، یہ بھی نہیں کر سکتا کہ نہ جائے تو ضرور جائے گا بیٹھے گا، مگر کراہت بھی رہے گی اسی طرح سے ہاتھ پیر سے کما بھی رہا ہے، سب کچھ ہے مگر کراہت یوں ہے کہ کہیں یہ حارج نہ ہو جائے میری آخرت میں، تو چوکنار ہنا ہے کہ یہ دشمن بھی ہے کہیں دشمنی پر آمادہ نہ ہو اس کی تکمیل میرے ہاتھ میں ڈنی چاہئے، تو صحابہ اور حضرات اہل اللہ کی یہی شان تھی کہ اہل اللہ میں بڑے بڑے مال دار بھی گزرے ہیں لیکن بزرگی میں کوئی فرق نہیں، ٹھاٹ دار بھی گزرے ہیں کہ بادشاہوں کے وہ ٹھاٹ نہیں تھے، جو بعض اولیاء کرام کے تھے۔

اولیاء اللہ کا ڈیوی کروفر اور مرزا مظہر جان جاناں اور بادشاہ کا واقعہ..... خوب عید اللہ احرار مسندیں لگی ہوئی ہیں، خدام کھڑے ہوئے ہیں دروازوں پر نقیب ہیں۔ بادشاہ وقت بھی آنا چاہے تو پہلے وقت لے گا مٹ

① سورة الاحقاف: ۲۰. ② الصحيح للبخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس ج: ۲۰ ص: ۹۷ رقم: ۵۹۶۵.

مقرر ہوں گے تب آپس میں گئے، حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اولیاء میں سے ہیں اور اکابر اولیاء میں سے ہیں، لیکن مزاج میں لطافت و نزاکت تھی تو مسندیں جو سلتی تھیں چھ مہینے میں تیار ہوتی تھیں، کہیں اونچ نیچ نہ ہو جائے، طبیعت میں کوئی تکدر نہ پیدا ہو، مسند لگی ہوئی ہے، خدام ہیں، بادشاہ وقت جو مغل ایمپائر کا بادشاہ تھا اس نے اجازت چاہی تو اجازت نہیں ملتی تھی آخر بادشاہ نے خدام کو ہموار کیا کہ خادم ذرا دل میں گھر کیے ہوئے ہوتے ہیں، اس کی خوشامد کی کہ مجھے پانچ منٹ کی اجازت دلادے۔ خادم نے جب عرض کیا تو اجازت ہوئی کہ بادشاہ سلامت پانچ منٹ کے لیے آجائیں، تو مغل بادشاہ آیا بڑے ادب سے سلام کر کے مؤدب بیٹھ گیا، چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے، حضرت مرزا صاحب کو کچھ پیاس معلوم ہوئی تو خادم کھڑا ہوا تھا فرمایا کہ پانی لاؤ، بادشاہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں پانی پیش کروں، وہ خادم بیٹھ گیا، بادشاہ سلامت پانی لینے کے لئے گئے، گھڑو نیچے پر گھڑا رکھا ہوا تھا، پانی انڈیل کر اس کے اوپر جوڑھا نکلنے کا ڈھکنا تھا، وہ میڑھا رکھا گیا، بس تکدر پیدا ہو گیا مزاج میں، جب بادشاہ آیا، فرمایا تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں بادشاہت کیا کرتے ہو گے؟ وہ بے چارہ بادشاہ بھی نادم ہوا، تو بادشاہوں کے وہ کز و فر نہیں تھے جو ان اہل اللہ کے تھے اور بزرگی پھر بھی قائم ہے۔ تو بزرگی نام کپڑوں کا نہیں ہے کہ پھٹے پرانے کپڑے والے بزرگ ہوتے ہیں اور جو فخر و لباس پہن لیا بزرگی ختم ہو گئی، بزرگی قلب کی صفت ہے بعض دفعہ وہ ریاست کے چولے میں نمایاں ہوتی ہے، بعض دفعہ فقر و فاقہ کے چولے میں آتی ہے، حضرت عیسیٰ کا زہد اور یوسف و سلیمان علیہم السلام کی بادشاہت نبوت سے زیادہ بزرگی تو نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ جن کے زہد کا یہ عالم ہے کہ کل دنیا کی دو چیزیں ان کے ہاتھ میں تھیں ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک چمڑے کا تکیہ جہاں موقع ملا تکیہ رکھا سو گئے، جہاں ضرورت پڑی وہ پیالہ ہاتھ میں ہے، اسی سے وضو کر لیا اسی سے کھانا کھالیا۔

ایک دفعہ دیکھا کہ ایک شخص کہنی سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے تو کہا اللہ اکبر! معلوم ہوتا ہے دنیا ضرورت سے زائد ہے، بلا تکیہ بھی کام چل سکتا ہے تو وہ تکیہ بھی اسی وقت پھینک دیا، کہنی رکھ کر سونے لگے، پھر ایک شخص کو دیکھا کہ ایک تالاب پر کھڑا ہوا چلو سے پانی پی رہا ہے تو کہا افسوس یہ پیالہ بھی زائد لے رکھا ہے بغیر اس کے بھی کام چل سکتا ہے، وہ پیالہ بھی اٹھا کر پھینک دیا تو یہ کیفیت زہد کی ہے، اور ترک دنیا کی ہے ایک طرف تو یہ ہے نبوت کی شان اور ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں کہ شاہانہ محلات ہیں، تخت شاہی بچھا ہوا ہے اور جن و انس حاضر ہیں بڑا بھاری دربار ہے اور کز و فر اور نبوت موجود ہے، تو نبوت کا تعلق کپڑوں سے نہیں قلب سے ہے، شاہانہ ٹھاٹھ میں بھی نبوت رہ سکتی ہے، اور فقیرانہ لباس میں بھی اسی طرح ولایت شاہانہ لباس میں بھی رہ سکتی ہے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی رہ سکتی ہے، تو ولایت اور بزرگی نام کپڑے کا نہیں ہے، قلب کے تعلق مع اللہ کا نام بزرگی ہے، کہیں چولے میں ہوتی ہے ریاست کے اور کہیں چولے میں ہوتی

ہے فقر و فاقہ کے، عوام یوں سمجھتے ہیں کہ بزرگ وہ ہے جو فاقہ مست ہو، نہ لباس پاس، کپڑے پھٹے ہوئے اور پرانے وہ بزرگ ہے، لیکن خواص سمجھتے ہیں کہ بزرگی کپڑوں کا نام نہیں، قلب کا تعلق اگر اللہ سے صحیح ہے مضبوط ہے نسبت مضبوط ہے وہ بزرگ ہے، لباس کچھ ہی پہن لے، غرض انبیاء علیہم السلام کی شانیں بھی الگ الگ ہیں کہ ٹھاٹھ بھی ہیں اور فقر و فاقہ بھی ہے، اولیاء کی بھی یہی شانیں ہیں۔

دنیا داروں پر مالدار انبیاء اور اولیاء کے ساتھ حجت قائم ہوگی..... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل دولت حاضر ہوں گے اور ان کی غفلتیں پیش کی جائیں گی کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا؟ وہ عذر پیش کریں گے کہ آپ نے ہمیں دولت دی تھی کاروبار دیا تھا، اب اس میں لگتے یا ہم مسجد میں بیٹھتے، اس میں لگتے یا ہم نمازیں پڑھتے اور فرائض ادا کرتے، آپ کی دی ہوئی نعمت تھی اس میں لگ گئے، اس میں لگنے سے فرائض رہ گئے تو نظیر میں ایسے اہل اللہ کو اور انبیاء علیہم السلام کو پیش کیا جائے گا جن کو سلطنتیں دی گئی تھیں، فرمائیں گے کہ سلطنت کے کاروبار میں رہ کر بھی ان کی عبادت میں فرق نہیں آیا اور چند ہزار روپے لے کر تنہا عبادت میں فرق آ گیا، ان میں فرق کیوں نہیں آیا؟ یہ بھی تو انسان تھے تو ان لوگوں پہ حجت تمام کی جائے گی، بہر حال حاصل یہ ہے کہ بزرگی نام قلب کی صفت کا ہے، بزرگی نام لباس کا نہیں ہے، پیسہ کا نہیں، پیسہ کمانے کا نہیں۔

اس لیے شریعت یہ نہیں کہتی کہ تم کمانا چھوڑ دو، پیسہ تمہارے ہاتھ میں نہ رہے یہ نہیں کہتی، سب کچھ کرو، تم تجارت بھی کرو زراعت بھی کرو اور اللہ تمہیں لکھ پتی بنائے تو لکھ پتی بھی بنو اور کروڑ پتی بنائے تو کروڑ پتی بھی بنو، مگر قلب کا ناس مت مارو اس کا تعلق اپنے مالک کے ساتھ قائم رکھو، اور یہ سمجھو کہ ہم اس دولت کے حق میں امین ہیں، ہم خزانچی ہیں، تو خزانچی اتنا ہی خرچ کرے گا جتنا مالک آرڈر دے گا، خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر جتنا چاہے خزانے کو لٹا دے، یا دبا کر بیٹھ جائے، ایک پائی نہ دے، وہ انتظار کرے گا، مالک کس کے لیے کہتا ہے۔

مالک نے کہا دس ہزار اسے دے دو، خزانچی کا فرض ہے دے دے، مالک کہے گا فلاں کو مت دو تو روک لے گا، اس لیے کہ خزانچی مالک نہیں ہے وہ تو امانت دار ہے مالک وہ ہے جس کی رقم ہے، اس لیے جتنی بھی دولت ہمارے ہاتھ میں ہے حقیقتاً مالک حق تعالیٰ ہیں، ہم امین ہیں، وہ یوں کہیں کہ اس طرح خرچ کرو اسی طرح خرچ کرنا پڑے گا۔

ایک غریب بیوہ آئی آرڈر دیا گیا کہ خرچ کرو، اور سینما تھیٹر سامنے آ گیا تو آرڈر یہ ہے کہ ہرگز ایک پائی خرچ نہ کرو، ورنہ تمہارا حرام خرچ ہوگا، لہو و لعب میں مت خرچ کرو، طاعت و عبادت میں خرچ کرو، مالک کو حق حاصل ہے جہاں چاہے خرچ کرائے ہم کون ہیں کہ اپنے ارادے سے خرچ کریں! اپنی مرضی سے خرچ کریں! مرضی مالک کی چلے گی، تو اہل اللہ باوجود مالدار ہونے کے ان کی نگاہ اصل مالک پر رہتی ہے کہ ان کا حکم کیا ہے! اس کے مطابق ہم چلیں، بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کمائیں بھی، آپ لکھ پتی بھی بنیں مگر اپنے غریب بھائیوں کو

نہ بھلائیں، خدمتِ خلق آپ کا شیوہ ہونا چاہئے، اگر کوئی نادار ہے تو آپ اس کو سہارا دیں، کوئی پریشان حال ہے تو آپ قال سے حال سے اس کو سہارا دیں، کہ اس کی پریشانی رفع ہو، اگر دو کلمہ کہہ کر آپ تسلی دے سکتے ہیں تو آپ درلغ نہ کریں، چار پیسے خرچ کر کے تسلی دے سکتے ہیں تو خرچ میں درلغ نہ کریں، غرض داسے درے قدمے سنبھالنے کی طرح سے آپ تسلی دیں وہ آپ کے فرائض میں داخل ہے۔

اعلیٰ ترین عبادت..... حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اعلیٰ ترین عبادت انسان کی کیا ہے؟ ”أَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللَّهِ“ سب سے زیادہ محبوب اللہ کو کیا ہے۔ ”الْقَاءُ السُّرُورِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُسْلِمٍ“ کسی مسلمان کے دل میں خوشی پیدا کر دینا یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ انسان کے لئے کوئی کلمہ ایسا کہہ دیا کہ دل خوش ہو گیا، کوئی خدمت ایسی کر دی کہ آدمی مطمئن ہو گیا، کوئی بات کی اور ڈھنگ ایسا اختیار کیا کہ فرحت پیدا ہو گئی، فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی طاعت و عبادت یہ ہے، تو طاعت و عبادت محض مسجد ہی میں نہیں، یہ بھی طاعت و عبادت ہے: ”الْقَاءُ السُّرُورِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُسْلِمٍ“ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی فضیلت بیان کی کہ صدقہ دینے میں یہ فضیلت ہے، یہ برکت ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر پیسہ پاس نہ ہو؟ فرمایا پیسہ پاس نہیں ہے تو چند کلمے ہی خیر کے کہہ دو وہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہوگا تو عرض کیا کہ اگر کہنا بھی نہ آتا ہو؟ فرمایا کم سے کم تکلیف مت پہنچاؤ، یہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہے غرض خدمتِ مسلم خدمتِ خلق اللہ یہ بڑا اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے مسلمان کا، یہ ایمان کا ایک بڑے دو ہے، آدھا حصہ ایمان کا خدمتِ خلق ہے اور آدھا حصہ تعظیم الامر اللہ ہے اس لیے میں نے عرض کیا کہ سب سے بڑی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ اس کے بغیر قلبی سکون نہیں مل سکتا اور دوسری چیز کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ بغیر ایثار کے بغیر خدمت کے یہ چیز نہیں بن سکتی۔

تربیتِ نفس کے درجات..... اب تیسری چیز یہ ہے کہ اپنے نفس سے کیا تعلق ہے! تو بھی نفس جو ہے یہ شرور کا منبع ہے یعنی ہر برائی نفس سے ابھرتی ہے، ہر بد اخلاقی نفس سے ابھرتی ہے تو نفس درحقیقت آدمی کا دشمن ٹھہرا، اور یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے، فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے: ”إِنْ أَعْدَى عَدُوَّكَ الَّذِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ“ ① تمہارا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، یعنی تمہارا نفس ہے، مثل مشہور ہے ہمارے یہاں، اپنا آپا دشمن ہوتا ہے کوئی کسی کا دشمن نہیں تو نفس درحقیقت دشمن ہے اس لیے کہ جنسی ذلت اور رسوائی متعلق ہے وہ نفس کی خواہشات سے متعلق ہے نفس کی خواہشات کو روک دیں، ذلت نہیں ہوگی، آپ بازار میں گئے اور دیکھا کہ دکان پر بڑی عمدہ مٹھائیوں کی لگن لگی ہوئی ہے، کھانے کا جی چاہا نفس نے چاہا کہ مٹھائیاں کھاؤں اب ظاہری بات ہے کہ پیسہ تو ہاتھ پہلے تھا نہیں آپ نے جلدی سے چھینا مارا اور بھاگے

① کنز العمال، باب الجہاد الاکبر من الاکمال ج: ۴ ص: ۳۳۱ رقم: ۱۱۲۶۳۔ علامہ عجلی فرماتے ہیں: رواہ البیہقی فی الزہد باسناد ضعیف ولہ شاهد من حدیث انس.... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۲۳۔

اور دکاندار اٹھ کر آپ کے پیچھے، آپ نے جلدی سے کچھ منہ میں رکھا اور کچھ جیب میں رکھا یہاں تک کہ اس نے آکے پکڑا اور جوتیاں مارنی شروع کیں اور پولیس آگئی معلوم ہوا کہ یہ تو جھپٹا مار کر غصب کر کے لے گئے تھے تو مقدمہ چلا جیل گئے، مار پٹائی ہوئی جیل گئے اور ذلیل ہوئے۔

کس نے ذلیل کیا؟ اس نفس کی خواہش ہی نے تو کیا، اور اگر اللہ کی مرضی پر اور عقل پر چلتے تو عقل یہ کہتی تھی کہ غیر کے مال پر بلا اس کی مرضی کے ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے، دیکھنا بھی مناسب نہیں تھا، نگاہ نیچی کر کے جاتے وقار کا تقاضا یہ تھا، یہ کر کے جاتے تو دکاندار کے دل میں بھی عزت ہوتی، گورنمنٹ کے دل میں بھی عزت ہوتی کہ باوقار آدمی ہے۔ معلوم ہوا کہ نفس کی پیروی کرنے میں ذلت ہے اور نفس کے خلاف کرنے میں عزت ہے، نفس نے خواہش کی جذبہ آگیا کہ مار کھاؤ پٹائی ہو لہذا مار کٹائی شروع ہوگئی اور عقل یہ کہتی تھی صبر و تحمل سے کام لو یہ موقع نہیں ہے عقل کی سنتے تو وقار بڑھ جاتا، مار پٹائی شروع ہوئی تو بلوہ قائم ہو گیا اور مقدمہ بازی، ذلت اور رسوائی شروع ہوئی، تو جتنا آدمی نفس کی پیروی کرے گا اتنا ہی ذلت میں پڑے گا، ہاں البتہ اس نفس کو اگر آپ نے سدھا کر تربیت سے مزکیں اور مصفیٰ بنا لیا اب اس نفس کے اشاروں پر چلیں کوئی مضائقہ نہیں تو نفس ابتدا میں نفسِ امارہ ہوتا ہے، ہر برائی کا حکم دیتا ہے اور اخیر میں جا کر بنتا ہے نفس مطمئنہ، جب وہ مطمئن ہو جائے اللہ کی تقدیرات پر، تو ابتدائی حالت میں نفس کی پیروی ذلت اور رسوائی ہے اور نفس کو مطمئن بنا کر اس کی پیروی کرنا وہ حق کی پیروی ہوگی، کیونکہ نفس مطمئن وہی چاہے گا جو اللہ چاہتا ہے، اس میں ذلت نہیں بلکہ عزت ہوگی اس کا انجام یہ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۖ﴾ اے نفس مطمئنہ! یَا ایتھنا النفس المطمئنة لوٹ اپنے پروردگار کی طرف، تو ادھر سے گیا تھا پیدا ہو کر لوٹ اپنے رب کی طرف ﴿ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ﴾ کس حالت میں؟ ﴿رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ تو اللہ سے راضی اللہ تجھ سے راضی ﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ ① میرے خاص بندوں میں داخل ہو، میری جنت میں جا داخل ہو۔ تو ایک نفس مطمئنہ ہے جو تابع حق بن جاتا ہے اس کی مرضی پر چلنا حق کی مرضی پر چلنا ہے اور ایک نفسِ امارہ ہے جس کے اندر برائی ہے ابھی تربیت نہیں ہوئی، اس کی مرضی پر چلنا ذلت اور رسوائی کی راہ پر چلنا ہے، تو نفس کو مزکیں کیا جائے محنت سے عبادت سے ریاضت سے، اور وہ پاک صاف بن جائے، اولیاء کا نفس ہو جائے، انبیاء علیہم السلام کے نفس کے نقش قدم پر چلنے لگے، وہ فی الحقیقت حق پر راضی ہوتا ہے، بلکہ حق کی مرضی اس میں ہوتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ذَارَ الْحَقُّ مَعَهُ حَيْثُ ذَارَ“ حضرت عمرؓ کی شان فرمائی کہ جدھر عمر جھکتے ہیں حق بھی ادھر جھک جاتا ہے، بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا تھا کہ جدھر حق چلتا ہے حضرت

عمرؓ ادھر بھٹکتے ہیں اور کہا جا رہا ہے جدھر کو حضرت عمرؓ چلتے ہیں ادھر کو حق چلتا ہے تو ایک مقام ہے مبتدی کا اور ایک مقام ہے منتہی کا، مبتدی کا مقام تو یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر کو یہ چلے تابع بنے اور جب کمال کی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر حق ادھر کو چلے گا جدھر کو یہ چلے گا، اس لیے کہ اتنا پاک بن جائے گا کہ اس کے اندر جو مرضی آئے گی وہ مرضی حق ہوگی، نفس کی ہر خواہش حق کے مطابق ہوگی، خلاف ہو نہیں سکتی جدھر یہ چلے گا حق ادھر کو جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی شان عجیب ہے ”إِنَّ رَبَّكَ يَسْرُغُكَ فِيْ هَؤُلَاءِ“ ①

آپ کا پروردگار آپ کے نفس کی خواہش پوری کرنے میں اتنی جلدی کرتا ہے کہ ادھر دل میں آیا کہ یہ ہوا ادھر ہوگئی وہ چیز۔ تو یہ وہی مقام ہے انتہائی کہ جدھر نفس چلے گا حق ادھر چلے گا اس لیے کہ نفس فنا ہو گیا ہے حق کے اندر تو اس میں کوئی خواہش ابھرے گی ہی نہیں خلاف حق اور جب حق کے مطابق خواہش ابھری تو حق ہی چلا ادھر ہی شان حضرت عمرؓ کی فرمائی گئی۔ ”ذَا رَأَى الْحَقُّ مَعَهُ حَيْثُ ذَا“ حق بھی ادھر کو ہی گھوم جاتا ہے جدھر کو عمرؓ گھومتے ہیں، یہ انتہائی مقام ذکر کیا گیا ہے جو سالک کا انتہائی مقام ہے، نفس اتار دے اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر کو حق چلے جی چاہے یا نہ چاہے اس کی پیروی کرے تب جا کر اس کے اندر صفائی پیدا ہوگی، تب جا کر اس کے اندر جلا پیدا ہوگی تو نفس بہر حال اپنی ابتدائی حالت میں آدمی کا دشمن ہے ”إِنَّ أَعْلَىٰ عَدُوَّكَ الْذِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ“ تمہارے دو پہلوؤں میں جو بیٹھا ہے وہ ہے تمہارا دشمن، تو جتنی مصیبتیں آتی ہیں وہ اس نفسِ امارہ کی خواہشات پوری کرنے پر آتی ہیں حقیقت میں یہ بنیاد ہوتا ہے، ظاہر میں آپ کچھ عذر پیش کریں کہ فلا نے مجھے مارا فلاں نے ظلم کیا، حقیقت میں ظلم آپ نے خود کیا دوسرا ذریعہ بنا اس ظلم کا قرآن کریم میں بھی یہی ہے کہ قیامت کے دن یہی کہا جائے گا ﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ ② اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا یہ تو آدمی نے خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔

تو آدمی ظالم اپنے نفس کے لئے خود بنتا ہے دوسروں پر وبال خواہ مخواہ وہ ڈالتا ہے، اور اس کی مثال بالکل ایسی واضح ہے کہ ایک شخص کو مثلاً پھانسی دی گئی اس کی لاش ٹنگی ہوئی تھی تو چند عقلاء جمع ہوئے کہ ابھی اس کی موت کا سبب کیا ہوا؟ ایک نے کہا کہ کھلا سبب موجود ہے گلے میں پھندا پڑا ہوا ہے، پھندا پڑنے سے سانس گھٹ گیا، موت واقع ہوگئی، دوسرے نے کہا تم نہیں سمجھے اصلیت، پھندا خود بخود تھوڑا ہی پڑ گیا اصل میں اس کی موت کا سبب وہ تختہ ہے جو پاؤں کے نیچے تھا، وہ بھنگی نے کھینچ لیا تو پھندا پھنسا اور پھندا پھنسا تو جان نکل گئی، تو موت کا سبب پھندا نہیں بلکہ تختہ ہے، تیسرے نے کہا کہ تو بھی بے وقوف احمق ہے، تو بھی نہیں سمجھا تختہ کیسے مٹ گیا وہ تو بھنگی نے سر کا یا ہے، جب

① الصحيح لمسلم، کتاب الرضاع، باب جواز هبتها وبناتها لغيرها ج: ٤ ص: ٣٨٥ رقم: ٢٦٥٩.

② بارہ: ١٣، سورة: النحل، الآية: ٣٣.

بھٹکی نے تختہ کھینچا تو پھندا لگا اور پھندا لگنے سے سانس گھٹا اور موت واقع ہوئی، تو موت کا سبب نہ پھندا ہے نہ تختہ ہے بلکہ بھٹکی ہے، جو تختے نے کہا تو بھی بے وقوف ہے بھٹکی کو کوئی ذاتی عداوت تھی کہ خواہ مخواہ اس نے تختہ کھینچ لیا مجسٹریٹ کا حکم اسے ملا تھا اس آرڈر کے سبب سے بھٹکی نے تختہ کھینچا اور تختہ کھینچنے سے پھندا پڑا پھندا پڑنے سے جان نکلی تو موت کا سبب، مجسٹریٹ کا حکم ہے، پانچویں نے کہا تم بھی اصلیت کو نہیں پہنچے، مجسٹریٹ کو کوئی ذاتی عداوت تھی، کوئی عداوت تھوڑی ہی تھی، اس کو اصل میں مجسٹریٹ نے اس لیے حکم دیا کہ اس نے قتل ناحق کیا تھا، اور پشیمانی ثابت ہو گیا کہ یہ قاتل ہے، مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ اسے بھی پھانسی دے دو تو موت کا سبب یہ خود ہے، نہ مجسٹریٹ ہے نہ بھٹکی ہے نہ تختہ ہے، نہ پھندا ہے اصل میں یہ خود ہے موت کا سبب، تو جتنا بھی آدمی کے اوپر وبال آتا ہے وہ کسی کو بھی سبب بنائے کسی پر بھی اس کا وبال ڈالے حقیقت میں انجام کار نکلے گا کہ وہ خود ظالم ہے اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

تعلیم وتر بیت کے آثار..... تو اس نفس ظالم کو اگر آپ عادل بنادیں اور بے رُخ ہو کر عدل پیدا کر دیں وہی نفس کامل ہو جائے گا، اسی کو کامل بنانے کے لیے شریعتیں آئیں کہ نفس کا ظلم ہٹا کر اس میں عدل پیدا کیا جائے، نفس کا جہل مٹا کر اس میں علم پیدا کیا جائے، ایک طرف تعلیم کا سلسلہ جاری ہو جس سے علم آئے ایک طرف تربیت کا سلسلہ جاری ہو جس سے اعتدال عمل اور اخلاق میں پیدا ہو، دنیا کی چیزیں تعلیم اور تربیت نکل آئیں جس قوم میں تعلیم نہیں ہے یقیناً تنزل اور پستی میں گرے گی، دنیا کی کوئی قوم کبھی عروج نہیں پاسکتی جب تک کہ اس کے اندر تعلیم اور تربیت نہ ہو، کوئی دنیا کو مقصد بنا لے تو دنیاوی تعلیم لے گا، دنیوی طور پر تربیت کرے گا، کوئی دین کو مقصد بنا لے تو دینی تعلیم لے گا، دینی تربیت حاصل کرے گا، بہر حال جو قوم تعلیم میں نہیں پڑتی وہ ذلت اور رسوائی کی طرف جاتی ہے۔

اس لیے کہ دل و دماغ بنانے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے، تعلیم سے جس طرح چاہو ڈھال دو دل و دماغ کو اچھی تعلیم دو گے اچھے بن جائیں گے دل و دماغ کو بری تعلیم دو گے برے بن جائیں گے، جب انگریزوں کا ابتدائی تسلط ہوا ہندوستان میں تو مسلمانوں کو عام طور سے تحفہ تھا اور نفرت کی بناء بھی ظاہر تھی کہ ان کے ہاتھ سے حکومت چھیننے والے تو انگریز ہی تھے، تو ان کے دل میں کب گنجائش ہو سکتی تھی، ایک تحفہ قائم تھا اس کے لاکھ جتن کیے کہ نکل جائے نفرت نہیں نکلی، میکا لے نے تدبیر بنائی کہ میں تعلیم سکیم لے کر چلتا ہوں، اس تعلیم سے ان کے دل و دماغ بدل دو تو نفرت آپ ہی نکل جائے گی، پھر تو تمہارا کلمہ پڑھیں گے تو تعلیم سکول اور کالج کی شروع ہوئی، اب اس نے اعلان کیا کہ ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل و دماغ کے لحاظ سے فرگستانی ہوں“ تو تعلیم کامیاب ہوئی دل و دماغ بدل گئے اور اس درجہ بدلے کہ نظریات ہی بدل گئے، قلوب کا رخ ہی بدل گیا پھر وہ ہر چیز انگریز ہی کی پسند کرنے لگے، تو غلط طریق ہوا کہ انگریزوں کی جو صنعت و حرفت تھی، ترقیات تھیں ٹیکنیکل ترقیات اور ملکیکل ترقیات وہ عملی چیزیں حاصل کرتے مگر نظریات اسلامی قائم رکھتے، الٹا کر دیا کہ نظریات تو ان کے لیے اور عملیات ان کے ترک کر دیے تو پستی میں پڑ گئے، دین کے لحاظ

سے بھی دنیا کے لحاظ سے بھی، دنیوی ترقیات میں ان کے طریق عمل کو لیتے اور نظریات و اعتقادات دین کے مطابق رکھتے الناقصہ کر دیا کہ تعلیم پاکر نظریات تو وہ ہو گئے جو ان کے تھے اور عمل اپنا ختم ہو گیا کہ ان کے عمل سے کوئی عبرت نہ پکڑی بہر حال میکا لے نے یہ ایک اعلان کیا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔

اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ یہ بزرگ کھڑے ہوئے انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت میں ہزار ہا مدارس ملک میں قائم کئے اور انہوں نے بھی اعلان کیا کہ ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل و دماغ کے اعتبار سے عربستانی اور اسلامی ہوں۔“ تو ایک کنبہ کو بچالے گئے ورنہ بہہ پڑا تھا یہ سیلاب اور پورا ہندوستان بہہ جاتا، مگر ایک بڑا کنبہ بچ گیا ان لوگوں کے اعلان سے۔

تعلیم بقاء مذہب کا ذریعہ ہے..... انہوں نے دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جس سے آج ہم اور آپ اسلامی صورت لیے ہوئے ہیں، اسلام کا نام لیتے ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہندوستان میں مدارس دینیہ نہ ہوتے تو شرک و بدعت کے سوا ہندوستان میں کچھ نہ ہوتا کوئی مسئلہ بتانے والا نظر نہ آتا، یہ ان مدارس اور ان علماء کے طفیل ہے کہ آج مسئلہ بتلانے والے موجود ہیں، تو دین کا تحفظ مذہب کا تحفظ اس کی تعلیم کے تحفظ سے ہوتا ہے جس مذہب کی تعلیم گم ہو جاتی ہے وہ مذہب گم ہو جاتا ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضروری ہمارے انگلستانی بھائیوں کے لیے یہ ہے کہ اگر وہ اپنے دین کو سنبھالنا چاہتے ہیں تو اپنا تعلیمی نظام درست کریں ایسے مدارس قائم کریں کہ جن میں اللہ اور رسول کا قانون ان کے ذہنوں میں جمے وہ دوسری تعلیم بھی پائیں اس سے کوئی انکار نہیں ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ سائنس حاصل نہ کریں آپ فلسفہ حاصل نہ کریں سب کچھ حاصل کیجئے، مگر اپنی بنیاد تو قائم کر لیجئے، بنیاد آپ اپنی قائم نہ کریں اور دوسرے کی بنیاد پر آپ تعمیر کریں تو کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ زمین میری ہے ملبہ اٹھاؤ یہاں سے، آپ کے ہاتھ میں نہ زمین رہے گی نہ ملبہ رہے گا، لیکن اگر آپ کی بنیاد اپنی ہے اور تعمیر کر رہے ہیں تو دوسرے کی مجال نہیں ہے کہ کہنے کی کہ ملبہ اٹھاؤ زمین میری ہے، آپ کہیں گے زمین ہماری ہے، اپنی بنیاد پر قائم ہو جائے پھر دوسرے کی ترقیات سے چیزیں لیجئے، کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسلام کوئی مانع نہیں ہے، وہ بنیاد تو قائم کیجئے، اور بنیاد بلاشبہ قائم ہوتی ہے تعلیم سے، نہ پروپیگنڈہ سے قائم ہوتی ہے نہ کسی اور سلسلہ سے دل و دماغ کی تعمیر ہمیشہ تعلیم نے کی ہے، تو تعلیم کا نظام مضبوط کیجئے، مدارس قائم کیجئے علماء پیدا کیجئے جب تک پیدا نہ ہوں بلائے علماء کو ان کو رکھیئے، ان کے ذریعے سے علماء بنائیئے، یہاں سے بچے بھیجئے کہ وہ عالم بن کر آئیں اور دین کی تعلیم دیں جب تک یہ سلسلہ نہیں کریں گے تعمیر ممکن نہیں ہے آپ کے دل و دماغ اور ذہن نہیں بنے گا آپ کا ذہن تو بنتا ہے تعلیم سے، آج میں تقریر کر رہا ہوں، تقریر کرنے سے فائدہ ہے، ضرور ہے کچھ بھولا ہوا سبق یاد آجائے گا، لیکن

ذہن بن جائے وہ تو تربیت سے بنے گا، تقریریں ذہن نہیں بناتیں وہ تو بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہیں، لیکن سبق پڑھانا یہ مقرر کا کام نہیں یہ معلم کا کام ہے کہ سبق پڑھا کر دل میں جمائے ایک چیز کو اور تربیت کر کے اس کو ابھارے، یہ مربی کا اور معلم کا کام ہے۔

عبادت بلا علم..... تو جب تک آپ اپنا تعلیمی نظام درست نہیں کریں گے نہ تعلق مع اللہ صحیح ہوگا نہ تعلق مع الخلق صحیح ہوگا نہ تعلق مع انفس صحیح ہوگا تینوں تعلقات کی استواری جہی ہوگی جب قرآن و حدیث کی تعلیم آپ کے اندر عام ہو مگر قرآن سے مسائل بھی آپ حاصل کریں، دلائل بھی آپ حاصل کریں، فضائل بھی آپ حاصل کریں، حدیث کے مضامین لیں، فقہ سے استفادہ کریں، سلف کا اتباع کریں دل بن جائے گا، ذہن بن جائے گا، اس واسطے تعلیم و تربیت انتہائی ضروری ہے اور اسی پر مبنی ہے، ان تینوں تعلقات کا درست ہونا خواہ تعلق مع اللہ ہو یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع انفس ہو، یہ نفس دشمن قابو میں نہیں آسکتا، جب تک کہ اس کی چالوں اور داؤ سے واقف نہ ہوں آپ اس کی مکاریوں سے کیسے واقف ہوں، وہ شریعت اسلام سکھائے گی، حدیث میں فرمایا ہے کہ: **فَقِيْهَةٌ وَّاحِدَةٌ اَشَدُّ عَلٰى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** ① ایک عالم دین سمجھ دار شیطان پر بھاری ہے ہزار عابدوں سے۔

ہزار عابد عبادت کر رہے ہیں مگر دینی علم یا بصیرت نہیں تو ان پر شیطان بے ڈھانتی سوار ہو جائے گا، اس لیے کہ اس کے داؤ بھات سے واقف نہیں ہے، لیکن ایک عالم کے سر پر سوار ہوگا تو وہ ایک راستے سے آئے گا، وہ دس رستوں سے اس کی کاٹ کر دے گا، اس لیے کہ علم رکھتا ہے، نفس ہی کسی عالم کا مغلوب ہو جائے اور خود نفسی میں جتلا ہو وہ تو الگ بات ہے لیکن راستہ بند نہیں ہوگا، عابد نیک نیتی سے شیطان کے راستوں پر چلے گا، اس لیے کہ اس کے مکر و فریب سے واقف نہیں، عالم اگر چلے گا نفسانیت سے چلے گا، مگر راز سے واقف ہے، کاٹ کا راستہ جانتا ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ **فَقِيْهَةٌ وَّاحِدَةٌ اَشَدُّ عَلٰى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** ایک فقیہ، ایک دین کا عالم ہزاروں عابدوں سے بھاری ہے شیطان پر۔ اور وہ اس لیے بھاری ہے کہ ایک عالم اپنے علم اور تعلیم سے دل و دماغ کو بنا دیتا ہے، واقف کر دیتا ہے شیطان کے مکر سے اور اس کے راستوں سے کہ یہ مداخل ہیں جن سے داخل ہوتا ہے، اور یہ مخارج ہیں جن سے دھکیلا جاتا ہے شیطان کو اگر وہ قادر ہو جائیں اور عابد پر وہ بے ڈھانتی سوار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ بے چارہ عبادت میں لگا ہوا ہے، مگر مکر و فریب کے راز سے اور اس کی کاٹ سے واقف نہیں، تو نیک نیتی کے راستے اسے تباہ کر دیتا ہے۔

احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے، سیر کی کتابوں میں ہے، حدیث کی متداول کتب میں تو نہیں ہے، سیر کا کہو تاریخ کا کہو کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، زاہد تھا اور بہت بڑا عابد اور رہبان تھا، مگر نہایت عبادت گزار، رات دن مصروف اور اس کی جھاڑ پھونک میں بھی اثر تھا، ہزاروں آدمی اس کے پاس آتے اور کوئی پانی پڑھوا کر کوئی تعویذ لکھوا کر

لے جاتا اور لوگوں کو فائدہ ہوتا، دو جھپٹی بھائی تھے جن کو ایک تجارتی سفر پیش آیا اور ان کی ایک بہن بھی جوان، انہوں نے کہا کہ اس جوان بہن کو کس کی نگرانی میں دیں، رائے یہ ہوئی کہ اس عابد اور رہبان کی نگرانی میں دے جاؤ وہ دونوں بھائی حاضر ہوئے، اور ادب سے عرض کیا کہ ہماری بہن جوان ہے اسے آپ نگرانی میں لے لیں۔

فرمایا یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا کسی اور کے سپرد کرو میں خانقاہ کا بیٹھنے والا ہوں، میں عورت کی نگرانی کیسے کروں گا، مجھ سے نہیں ہوگا، انہوں نے منت کی، کہا یہ ممکن نہیں میں نہیں رکھوں گا وہ چار پانچ دن لگے رہے غرض منت خوشامد کر کے راضی کر لیا کہا اچھا میں اس طرح سے راضی ہوں کہ اس خانقاہ میں جو سب سے کنارے کا حجرہ ہے، اس میں اپنی بہن کو چھوڑ کر تالی باہر ڈال دو، اندر سے بند کر لے، میرا کام اتنا ہوگا کہ میں سیڑھیوں پر کھانا رکھ آؤں گا وہ اٹھا لے جایا کرے گی، برتن وہاں رکھ دے گی میں برتن اٹھا لوں گا، اس سے زیادہ میرا کوئی واسطہ نہیں، انہوں نے کہا بس اتنا کافی ہے، بس آپ کی نگرانی میں ہے، چنانچہ یہ ہوا وہ اس حجرے میں چھوڑ گئے، یہ عابد کھانا لے کر جاتا اور سیڑھیوں پر رکھ آتا وہ کھاپی کر برتن سیڑھیوں پر رکھ دیتی، یہ اٹھا لاتا، یہ روز کا معمول ہو گیا، برس دو برس اس میں گزرے تو شیطان نے یہ دوسو سو ڈالا کہ یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہے کہ وہ تیری مہمان ہے تو اچھوتوں کی طرح سے کھانا رکھ آیا اور برتن اٹھا لیے اور لے آیا یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے اچھوت اقوام میں سے ہو کہ اس کے سائے سے بھی پچنا اس مہمان کے دل پر کیا گزرے گی، یہ بری بات ہے کم سے کم کھانا اسے خود پکڑا دینا چاہئے، یہ نہیں کہ سیڑھیوں پر رکھ آتا وہ بے چاری لے گئی، نیک نیتی سے یہ خیال جمایا۔ اب یہ کیا اس نے کہ بجائے سیڑھی پر رکھنے کے دستک دی وہ عورت آئی اس کے سپرد کر دینا وہ لے جاتی برتن لینے آتا وہ عورت برتن دے دیتی ایک آدھ سال اس میں گزرا، اس کے بعد شیطان نے پھر دوسو سو ڈالا، یہ بھی احترام پورا نہیں ہے، مہمان کی بات تو جب ہے کہ کم سے کم میزبان ساتھ تو کھاوے، اگر ساتھ نہ کھاوے تو کم سے کم اس وقت تک پاس تو بیٹھا رہے جب تک وہ کھانا کھائے تاکہ اسے معلوم ہو کہ میری کچھ آؤ بھگت میری کچھ مدارت ہوئی، اب یہ خیال جما تو بجائے اس کے کھانا پکڑا دے کھانے کا دسترخوان بچھا تا اور وہ کھاتی رہتی اور اس کے بعد یہ برتن لے کر آتا، اس کے بعد ایک دوسرا دوسو سو یہ پیدا ہوا کہ میزبان کا حق تو یہ ہے کہ ساتھ کھائے بیٹھ کر یہ تو یہ معنی ہو گئے کہ گویا مہمان کوئی اچھوت ذات ہے کہ اس کے پاس کے کھانے کو بھی ہاتھ نہ لگائے، یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے کم سے کم مل کر کھانا تو کھا لینا چاہئے۔ عرب میں تو عام دستور ہے کہ اگر دسترخوان بچھ جائے تو پہلے میزبان ابتدا کرتا ہے، مہمان ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک پہلا لقمہ میزبان نہ کھائے، احترام اسی کو کہتے ہیں، اب اس نے ساتھ مل کر کھانا شروع کیا، اب ظاہر ہے کہ ساتھ مل کر کھانا کھانے میں وقت خلوت بھی میسر ہوئی اور جب کچھ عرصہ بڑھا تو تعلقات بڑھے روابط بڑھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عابد اس عورت کے ساتھ بدکاری میں مبتلا ہو گیا جب بدکاری میں مبتلا ہوا تو اب سوچا کہ اگر باہر آ کر اس نے کہہ دیا تو میری تو ساری زندگی رکر کر رہ جائے گی یہ لوگ جو عقیدت مند ہیں کہیں گے کہ یہ تو بڑا بدکار ہے تو

اس نے چھری سے قتل کیا اس عورت کو اور اپنی خانقاہ کے قریب دفن کیا اس کے بعد چند دن کے بعد اس کے بھائی آپہنچے وہ آئے بہن کو لینے، کہا بہن کہاں ہے، اس نے کہا اس کا تو انتقال ہو گیا اور میں نے دفن کر دیا۔

بھائی بے چارے بہت روئے پریشان ہوئے مگر جہاں شیطان نے یہ وسوسہ ڈال کر اسے مبتلا کیا تھا، وہاں ان بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال ڈالا کہ اگر وہ مرتی تو دو چار دس آدمی اس کے لیے دعا کرتے کوئی نماز پڑھتا کوئی چرچا ہوتا فلاں کی بہن مری، یہ کیسی موت ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں وہ مر بھی گئی دفن بھی ہو گئی۔ خانقاہ کے جس آدمی سے پوچھتے ہیں اسے کچھ پتہ نہیں ان کے دل میں کھڑکا گزرا، انہوں نے کہا کہ قبر کھود کر دیکھنی چاہئے، قبر جو کھودی تو کئی ہوئی لاش نکلی، اب ثابت ہوا کہ اس عابد نے مارا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو اطلاع دی گئی، اس عابد کے پیروں میں رسی باندھ کر سارے شہر میں اسے گھمایا اور اس کے بعد اس کو قتل کیا گیا، انتہائی رسوائی اور ذلت ہوئی تو عابد زاہد تھا، مگر علم نہیں رکھتا تھا تو اسی کے رستے سے شیطان نے ورغلا یا نیک نیتی کے رستے سے، آج یہ نیک نیتی پیدا ہوئی کہ ساتھ کھائے، پھر نیک نیتی پیدا ہوئی کہ اس کے پاس بیٹھے اور وہ بد نیتی نہیں تھی، مگر نتیجہ نکلا کہ وہ مبتلا ہو گیا، لیکن اگر عالم ہے اور جانتا ہے کہ خلوتِ اجنبیہ حرام ہے صورت دیکھنا بھی نامحرم کی ناجائز ہے اس کے حق میں، اسے نہیں آنا چاہیے پاس تو بہر صورت اس کا علم اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ نیک نیتی کے لاکھ خیال آتے وہ کہتا کہ نیک نیتی صحیح مگر قواعد شرعیہ کے خلاف ہے نبوت کی تعلیم کے خلاف ہے، یقیناً میں خطا میں مبتلا ہوں گا اور پھر بچ جاتا، لیکن اس بے چارے کو علم تھا نہیں، نیک نیتی تھی عبادت کا جذبہ تھا، اسی جذبہ عبادت میں حسن نیت کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تو تعلیم اور علم ہی ہے جو انسان کے دل و دماغ کو بناتا ہے، یہ نہ ہوگا تو مذہب کی جو حدود ہیں، اب اخلاق کے ہر خلق کی ایک حد ہے ہر عمل کی ایک حد ہے، حدود کا پتہ نہیں چل سکتا ان کی وجوہات سامنے نہیں آسکتیں، وہ ذوق پیدا نہیں ہو سکتا اس واسطے تعلق مع اللہ ہو، یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع انفس ہو ان تینوں کے لیے تعلیم اور تربیت ضروری ہے اور اس کا نظام قائم کرنا ضروری ہے اور امید یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان کر لیں گے، ہم جب ارادہ کر رہے تھے یہاں آنے کا تو یہ تصور بھی نہیں تھا ہمارے ذہن میں کہ اتنے مسلمان ہوں گے ہم سمجھتے تھے کہ سو دو سو میں کوئی ایک آدھ زلا مل جائے گا، ماشاء اللہ یہاں بستیاں کی بستیاں ہیں، ہزاروں کی تعداد اور مدارس بھی الحمد للہ قائم کر رکھے ہیں اور سلسلہ جاری ہے اس سلسلہ کو بڑھایا جائے تعلیم مکمل کی جائے۔

دینی ذوق کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے..... آج ابتدائی تعلیم ہے اس کو بڑھا کر اتنی کیجئے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم شروع ہو جائے اور دلوں کے اندر وہ نورانیت اور وہ ذوق پیدا ہو اور اس کے ساتھ آپ دنیوی عصری تعلیم کچھ بھی پائیں اسلام اس میں حارج نہیں ہے، وہ تو اس وقت حارج ہوگا جس وقت کوئی چیز دین کے اندر حارج بننے لگے وہ روکے گا، لیکن جب تک حارج نہیں آپ کوئی بھی فن حاصل کریں مگر بنیاد اپنی قائم کر لیں، تو یہ تین مقصد مجھے عرض کرنے تھے، تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق، تعلق مع انفس، اور یہ آیت اس لیے اختیار

کی کہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں تینوں مقاصد، فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ اے لوگوں عبادت اپنے رب کی کرو۔ معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ تعلق بغیر عبادت کے نہیں جز سکتا اور عبادت جب تک کہ نسبت عبودیت نہ ہو کہ بندہ اپنے کو سمجھے عابد اور اپنے خالق کو سمجھے معبود اور عابد اور معبود کے درمیان کے راستے کے راز کو سمجھے اس وقت تک نسبت عبودیت قائم نہیں ہوگی تو ﴿اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ سے اور ﴿الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ سے تو نسبت عبودیت نکلتی ہے، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾

تقویٰ کسے کہتے ہیں..... تقویٰ کہتے ہیں نفس کو بچا دینا اس کی خواہشات سے، اگر نفس کی خواہشات پر چل پڑے یہی فجور کہلاتا ہے، اس سے بچ گیا تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اِنْهِيَءُ النَّفْسُ عَنْ مَرَاغِبِهَا نَفْسُ كُورُوك دینا اس کے مالوفات سے اس کے مرغوبات یہ ہے تقویٰ تو ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ سے تعلق مع النفس کا پتہ چلا اور بیچ میں ہے ﴿وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ تم عبادت کرو اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہارے آباء و اجداد کو تمہارے بھائی بندوں کو، تو معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ بندگی کرنے میں ہم سب کے سب برابر کے شریک ہیں اور جب کسی ایک مرکز سے سب جڑ جاتے ہیں تو ان کے ساتھ تعلق اور ربط خود بخود قائم ہوگا اور شفقت کا تعلق قائم ہوگا تو ﴿اتَّقُوا رَبَّكُمُ﴾ سے تقویٰ نکلا اور وہ ہے بنیاد نفس کی اصلاح کی اور ﴿اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ سے نسبت عبودیت نکلی جو بنیاد ہے، بندے اور خدا کے درمیان تعلق کی اور ﴿وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ساری مخلوق کو ملا کر ایک سے مربوط کرنے کا باہمی ربط نکلا تو تعلق مع الخلق کی طرف بھی اشارہ ہو گیا، اس لیے میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ یہ سارے مضامین صراحتاً الگ الگ آیتوں میں بھی موجود ہیں، لیکن ایک جگہ جڑے ہوئے ہوں بلاغت کے ساتھ کنایہ اور اشارہ سے ہوں وہ زیادہ بلیغ سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہ آیت میں نے تلاوت کی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ آیت کی بقدر ضرورت کچھ تشریح ہو گئی اس لیے کہ کما حقہ، اس کے علوم کو ادا کرنا یہ تو کسی بڑے عالم کا کام ہے ہم جیسے طالب علم کا کام نہیں ہے، جن کے اندر علم سے زیادہ جہل غالب ہو وہ کیا قرآن کی تشریح کریں گے، لیکن بالا جمال اپنی بساط اور اپنی استطاعت کے مطابق جتنی تفسیر ہو سکتی تھی وہ ایک درجہ میں تفسیر بھی ہو گئی تو حق تو ادا نہیں ہوا قرآن کا اور کون کر سکتا ہے، مگر اپنا حق تو ادا ہو گیا کہ جتنا ہمارا فرض تھا سامعین کا تھا انہوں نے سنا تو ہم نے بھی بول کر حق ادا کر دیا، آپ نے بھی حق ادا کر دیا، اور اس پر عمل نصیب ہو جائے تو ہمارے لیے سعادت ہے اور خوش قسمتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو علم اور عمل اور حال اور کمال اخلاق کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے سارے تعلقات حق تعالیٰ درست فرمائے اور شرعی اصول کی ہمیں رہنمائی فرمائے اور علوم الہیہ سے ہمیں بیگانہ نہ رکھے، آشنا بنائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخَوْرِ بَعْدَ الْكُوْرِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَتَبَّتْ اَقْدَامُنَا
وَاَنْصُرْنَا عَلٰى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرِ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ
وَصَلِّ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ
بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

آثارِ صحبت اور اس کی ضرورت

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهُ.. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدَهُ
وَرَسُولَهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كَلَّةٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَذَاعِيَا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجَا مُنِيرًا. صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالٰی عَلَيْهِ وَعَلَىٰ آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَتَسْلِيمًا كَثِيرًا أَمَّا بَعْدُ

تاثيرِ صحبت غير اختياري ہے..... ایک حضراتِ انبياء علیہم السلام کا ذوق اور رنگ ہے کہ وہ کس طریقے سے
زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی طبائع کا کیا رنگ ہے، اصل میں مسلمان کو وہ رنگ حاصل کرنا مقصود ہے وہ بغیر صحبت
کے حاصل نہیں ہوتا، مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پڑتا ہے۔ انسان کو دیکھ کر انسان رنگ پیدا کرتا
اور قبول کرتا ہے، پھر یہ چیز انسان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے میں صحبت کا اثر قدرتی بات ہے
آپ کپڑے میں گلاب کے پھول ڈال کر رکھ دیں تین دن کے بعد نکالیں گے تو پورے کپڑے سے خوشبو آئے
گی، محض گلاب کے پھول کی صحبت سے کپڑے نے بھی وہ رنگ و بوی قبول کر لیا جو گلاب کے پھول میں تھی، سردیوں
میں آپ اون کے کپڑوں میں تمباکو بھر کے رکھ دیتے ہیں کہ کپڑا نہ لگے جب آپ اگلی سردیوں میں نکالتے ہیں تو
پورے کپڑوں میں تمباکو کی بھک سی آتی ہے، تو کپڑے نے تمباکو کا اثر قبول کر لیا، لوہار کی بھٹی میں آپ لوہا ڈال
دیں، بیس منٹ بعد آپ نکالیں گے تو لوہا بھی آگ بنا ہوا ہوگا، حتیٰ کہ آگ کی صورت بھی قبول کر لے گا، اس میں
اور آگ کے انگارے میں کوئی فرق نہیں ہوگا، کام بھی وہی کرے گا جو انگارہ کرتا ہے، محض اس لئے کہ اسے آگ کی
صحبت میسر آگئی اور اس نے اس کا اثر قبول کر لیا۔ آپ کسی ایسی بستی میں رہتے ہوں جس کے چاروں طرف پانی ہی
پانی ہو تو قدرتی طور پر مزاج میں رطوبت آجائے گی، ایسے ریگستان میں رہتے ہوں جہاں میل و میل پانی نہ ہو تو مزاج
میں ایک قسم کی خشکی اور گرمی ہوگی، کوہستان میں آپ رہتے ہوں جہاں پتھر ہی پتھر ہوں تو مزاج میں ایک قسم کی
خشونت اور سختی ہوگی جیسے پہاڑی لوگوں میں ہوتی ہے، الغرض ہر چیز کا قدرتی طور پر اثر ہے، تو حجرات بھی اثر قبول
کرتے ہیں، نباتات بھی اثر قبول کرتے ہیں، حیوانات بھی اثر قبول کرتے ہیں ایک طوطے کو آپ اپنے پاس رکھ لیں
چند دن کے بعد وہ ویسے ہی بولیاں بولنے لگے گا، جیسے آپ بولتے ہیں، چاہے سمجھے نہ سمجھے اثر قبول کر لے گا، جو

جانور انسانوں کے پاس مکانوں میں رہتے ہیں، ان میں وہ وحشت باقی نہیں رہتی جو جنگلی جانوروں میں ہوتی ہے، یہ تبدیلی محض صحبت کے اثر سے ہوتی ہے، انس جو انسانیت کا خاصہ ہے اگر کسی انسان کو آپ جنگل میں پرندوں کے پاس چھوڑ دیں، وحشت پیدا ہو جائے گی، انسانوں سے انس باقی نہیں رہے گا، وہ حیوانات کی صحبت کا اثر قبول کر لے گا۔

ذوقِ دین..... الغرض ہر چیز کی صحبت کا ایک اثر ہے، تو دین بھی بہر حال فقط ایک راستے کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک کیفیت ہے ایک ذائقہ ہے ایک مزہ ہے، جب تک اسے استعمال نہ کیا جائے اس کا مزہ نہیں آئے گا، اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُولًا وَنَبِيًّا ① اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ سے بحیثیت رب ہونے کے راضی ہو گیا، اسلام سے بحیثیت رسول اور پیغمبر ہونے کے راضی ہو گیا، یعنی ان تمام حیثیتوں سے وہ راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ سے راضی تو ہوا لیکن رب ہونے کی حیثیت ہونے سے نہیں بلکہ فلاسفہ کی طرح علت تامہ ہونے کی حیثیت سے راضی ہوا، اس لئے کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت تامہ ہیں جیسے سورج دن کے نکلنے کے لئے علت تامہ ہے، علت کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے، وہ شی اس علت پر مرتب ہوگی، چنانچہ جب سورج نکلے گا تو سورج ارادہ کرے یا نہ کرے دن کا نکلنا لازمی ہے تو سورج کو دن کی علت کہیں گے، وہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ ہیں اسی وقت سے عالم چل رہا ہے، جب تک رہیں گے جب تک عالم چلے گا، ان کے ارادہ سے عالم کی پیدائش کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان کی ذات سے عالم سرزد ہو رہا ہے وہ ارادہ کریں یا نہ کریں، حتیٰ کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میں صفات نہیں ہیں، نہ ارادہ ہے نہ مشیت ہے نہ قدرت ہے، بلکہ وہ سورج کی طرح سے ہیں کہ ان کے لئے مخلوقات لازم ہیں وہ ارادہ نہیں کرتے مخلوقات ان سے سرزد ہوتی ہیں جیسے دھوپ آفتاب سے سرزد ہوتی رہتی ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی بلحاظ علت ہونے کے راضی ہوا تو وہ مسلم نہیں ہو سکتا، وہ مسلم ہوگا جو اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب ہونے کے بحیثیت خالق ہونے کے، بحیثیت رحمن ہونے کے بحیثیت صاحب ارادہ ہونے کے راضی ہو یعنی صفات کو بھی مانے، وہ اللہ تعالیٰ کا ماننے والا سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اسلام سے کوئی شخص بلحاظ ایک لاء اور قانون ہونے کے راضی ہو، جیسے آج دنیا میں ہزاروں قانون ہیں، اسلام بھی ایک قانون ہے، چنانچہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ اسلام ایک لاء اور قانون ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنا کر دیا ہے، جیسے چند قانون دانوں نے بیٹھ کر تعزیرات ہند وضع کر لی ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع کر کے قانون مسلمانوں کو دیا ہے تو کوئی شخص اسلام سے بلحاظ قانون ہونے کے راضی ہوا، مگر بلحاظ دین ہونے کے راضی نہیں۔

① الصحيح لمسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی من رضی باللہ رباً وبالاسلام دیناً وبمحمد نبیاً ج: ۱

دین اور قانون کا باہمی فرق..... اس لئے کہ دین اور قانون میں فرق یہ ہے کہ دین وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ بھیجے اور قانون فقط افعال پر بریک لگاتا ہے، کوئی چوری کرے گا قانون کی دفعہ لگ جائے گی چوری کا فعل بند کر دیں گے، کوئی زنا کرے گا قانون کی دفعہ لگے گی اور جیل بھیج دیں گے تا کہ یہ فعل رک جائے، لیکن قانون سے جذبات پر اثر نہیں پڑتا کہ دل میں بھی زنا و چوری سے نفرت پیدا ہو جائے، دین وہ ہے جو افعال کو بھی روکتا ہے اور دل میں بھی گناہوں اور معصیت سے نفرت بھی پیدا کر دیتا ہے، تو دین ظاہر و باطن دونوں پر لاگو ہوتا ہے، اور قانون فقط ظاہری افعال پر لاگو ہوتا ہے قلب سے اسے کوئی تعلق نہیں، گھر میں بیٹھ کر کوئی جتنے بھی جرائم کرے حکومت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اگر گھر میں بیٹھ کر تنہائی میں کوئی جرم کرے گا، دین اسے ٹوکے گا کہ یہ کیا حرکت کی؟ کوئی دیکھنے والا نہیں اللہ تو دیکھ رہا ہے، تو خدا کا قانون انسان کے ظاہر و باطن دونوں پر عائد ہوتا ہے اور دنیوی بادشاہوں کے قوانین فقط ظاہر پر لاگو ہوتے ہیں، افعال کو تو روکتے ہیں مگر اخلاق سے ان کا کوئی تعلق نہیں، تو آدمی میں جب دین آئے گا تو قلب اس کا رنگ قبول کرے گا، اخلاق بھی بدل جائیں گے اعمال بھی بدل جائیں گے۔

مقصد دین الفاظ محض نہیں ذوقِ نبوت پیدا کرنا ہے..... تو دین اسے کہتے ہیں کہ رنگ پیدا کرے اور رنگ بلا صحبت کے پیدا نہیں ہوتا بغیر معیت کے پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نیک لوگوں میں رہیں گے کوئی علم نہ ہو پھر بھی قدرۃ نیکی کے راستے پر چل پڑیں گے، نیک لوگوں کی صحبت کا یہی اثر ہے، بری سوسائٹی میں رہیں گے آپ کو ان کی معلومات حاصل ہوں یا نہ ہوں برے افعال خود بخود سرزد ہوں گے، بری سوسائٹی اور صحبت بدکا اثر ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک صحبت کو عطار کی دکان سے تشبیہ دی ہے کہ عطر فروش کی دکان پر کوئی جائے اور عطر نہ بھی خریدے کم از کم دماغ میں خوشبو آ ہی جائے گی آدمی کچھ نہ کچھ معطر ہو کہ ہی اٹھے گا، اور بری صحبت کی مثال لوہار کی بھٹی سے دی ہے کہ اگر آدمی اس کی دکان پر چلا جائے تو کپڑوں کو کچھ نہ کچھ سیاہی لگ ہی جائے گی، پتنگا ہی لگ جائے گا، ناک کو کچھ بد بو ہی آ جائے گی، الغرض کوئی نہ کوئی مضرت ہی لے کر آئے گا، جیسے عطار کی دکان سے تھوڑی بہت قلبی راحت ہی لے کر آئے گا، نیک کی صحبت میں بیٹھ کر اگرچہ علم بھی نہ ہو، کم از کم دین کا نفع لے کر ہی اٹھتا ہے، اس صحبت کا قدرتی اثر ہے، الغرض دین کا مقصد علم کے الفاظ یاد کرنا نہیں بلکہ وہ رنگ قبول کرنا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا رنگ ہے اور سلسلہ بسلسلہ چلا آ رہا ہے، اس لئے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔

صحبت کا اثر دل پر اور الفاظ کا دماغ پر ہوتا ہے..... ایک بات یہ بھی ہے کہ صحبت سے عمل کی امنگ پیدا ہوتی ہے، آپ ہزار نصیحتیں کر لیں آدمی اسے عقلاً اچھا سمجھ گا کہ واقعی بڑی اچھی بات ہے، لیکن دل قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جائے، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن نیک عالم یا کسی باخدا کی صحبت میں بیٹھے وہ کچھ بھی نہ کہے، خواہ خواہ دل چاہے گا کہ وہ ایسا ہی کرے دل پر دباؤ پڑے گا تو صحبت کا اثر براہ راست جا کر دل پر ہوتا ہے، علم کا اثر دماغ پر ہوتا ہے کہ ایک اچھی چیز سامنے آگئی، عقلی طور پر اچھی معلوم ہونے لگی، آدمی کرے نہ کرے لیکن صحبت میں عقلاً کچھ سمجھ نہ

سمجھے عمل کرنے کو دل چاہے گا کہ یہ کام کرنے کا ہے، یہ صحبت سے اثر پڑتا ہے اس واسطے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔
 مدارِ دین صحبتِ اہل اللہ ہے..... اور دین کا دار و مدار ہی صحبت ہے، آپ کو معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ کی زندگی سب سے زیادہ اونچی تھی، اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ امت میں کتنا ہی بڑا کوئی غوث، قطب بن جائے، ولایت کے مقامات طے کرے، مگر صحابیت کی گردنوں میں پہنچ سکتا، کیوں؟ اس لئے کہ صحابی صحبت یافتہ کو کہتے ہیں جس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، اپنی ان آنکھوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کا دیدار کیا ہو، اپنے ان کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام سنا ہو اور تاثیر کلام نبوت کی اس کے قلب میں ہے اس درجہ میں بعد والوں کے قلب میں نہیں ہو سکتی، جتنا اس کے قلب میں نبوت کی عظمت ہے اتنی دوسرے میں نہیں ہو سکتی، کیونکہ نبوت کو آنکھوں سے دیکھا معجزات کو دیکھا اور سن کر ایمان لائے ہیں دیکھ کر ایمان لائے ہیں، غرض دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہے تو صحبت کا اثر ہے کہ صحابہ کرامؓ کا دین اتنا مضبوط ہو گیا کہ عالم میں کسی بھی جماعت میں خواہ کتنی بڑی سے بڑی ہو، وہ مضبوطی دین میں نہیں ہوگی جو حضرات صحابہ کرامؓ کو نصیب ہے یہ محض صحبت کا اثر ہے۔

علم نہیں بدلا صحبت بدلتی رہی..... علم آج بھی وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وحدیث کا صحابہ کرامؓ کو سکھلایا، لیکن صحبت محفوظ نہیں، راہِ راست وہی مگر وہ رنگ محفوظ نہیں آخر کوئی تو فرق ہے۔؟ چنانچہ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور ہم تدفین میں مشغول تھے۔ ابھی ہم نے پوری طرح مٹی بھی نہیں دی تھی کہ اَنْكِرْنَا قُلُوبًا مِّنْ دِينِ وَاِيْمَانٍ کی وہ کیفیت باقی نہ رہی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں ہوتی تھی۔ تو علم تو وہی تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا، اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی، مگر صحبت میں کمی آئی تھی جس کو قلب نے محسوس کیا کہ کوئی چیز تھی جو کم یا کم ہو گئی؟

صاحبِ صحبت کے فقدان کے آثار..... مجھے یاد ہے کہ جب حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی وفات ہوئی ایک دم یہ محسوس ہوا کہ وہ جو آثارِ صحبت تھے، ان میں نمایاں کمی ہوئی جو جماعت اہل حق کی اہل اللہ کی، دارالعلوم دیوبند یا مظاہر العلوم سہارنپور کے حضرات پر مشتمل تھی عام طور پر ان سب بزرگوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک خاص کیفیت جو نور ایمان کی تھی، اس میں کوئی پھیکا پن پیدا ہو گیا ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جب کوئی ربانی عالم دنیا سے اٹھتا ہے تو عام قلوب دین کی کمی اور رنگ کا پھیکا پن محسوس کرتے ہیں جو قلوب میں قوتِ ایمانی ہوتی ہے اس میں قدرے ضعف محسوس ہونے لگتا ہے، اسی کو صحابہ کرامؓ فرما رہے ہیں کہ ابھی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی بھی پوری نہیں دی تھی کہ اَنْكِرْنَا قُلُوبًا کہ قلوب متغیر ہو گئے اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تھی، یہ وہی صحبت کی قلت کا اثر تھا یا صحبت کے گم ہو جانے کا اثر تھا۔ بعینہ یہی بات حضرات تابعینؒ فرماتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صحبت یافتہ

ہیں کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اٹھ گئے تو ہم نے اس عالم کی وہ نبض نہیں دیکھی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں تھی! حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ جب چودھویں صدی شروع ہوئی، حضرت مولانا کی وفات ۱۳۱۷ھ میں ہے، مولانا مزاجاً کچھ مجذوب تھے، تو صدی کے آغاز میں آسمان کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا: اس وقت پوری دنیا میں انوارِ صحابیت گم ہو گئے۔

یعنی اب تک صحابہؓ کا وہ محفوظ تھا، خواہ وہ صحابی جنات میں موجود ہوں مگر صحابی دنیا میں موجود تھا، فرمایا اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صحابیت کی نورانیت ختم ہو گئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو جنات سے بہت سابقہ پڑتا تھا کہ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی جنات میں موجود ہو اس کی برکات و انوار پورے عالم میں چھائے ہوئے تھے فرمایا آج وہ نوعیت مجھے معلوم نہیں ہوتی جو صحابیت کے انوار کی تھی۔

عالم ربانی کی صحبت اور کیسٹ کے بول کا فرق..... صحبت کا اثر ایک ایسی بدیہی بات ہے جس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اب یہی ریڈیو ہے، آپ ریڈیو سے دینی تقریریں جو ایک عالم ربانی نے کی ہے، قلب پر وہ اثر نہیں پڑے گا جو آپ براہ راست اس کی زبان سے سنیں، مشین بولے گی مگر اس میں وہ رنگ اور کیفیت نہیں ہوگی، یہ تو صرف الفاظ نقل ہوں گے جب متکلم بولے گا اس کے الفاظ میں اثر ہوگا، کیونکہ زبان قلب کی ترجمانی کرتی ہے قلبی کیفیات بھی زبان سے ادا ہو رہی ہیں، الفاظ کے اندر لپٹ کر آرہی ہیں اور قلب میں پہنچ رہی ہیں، تو یہ کیفیت لفظوں کے ذریعہ پہنچی، تو وہ برکت اور نورانیت مشین کے بول میں نہیں ہوتی بس کانوں کو حظ حاصل ہو جاتا ہے کہ بہر حال کلمات تو خیر ہی کے ہیں، کوئی اہل دل ہو تو اسے اپنی کیفیات کا استحضار ہو جاتا ہے، ریڈیو کے اندر سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آتی، بلکہ ان الفاظ سے اپنی کیفیات یاد آ جاتی ہیں، اور تازگی دل میں پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ہم قرآن کریم اس سے سنیں تو اس سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آئے گی، الفاظ قرآن سن کر اپنی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اجاگر ہو جائے گی، بخلاف ایک عالم اور ایک درویش ربانی کے کہ وہ جب کلام کرے گا تو اس کے اندر سے نکل کر ہمارے قلب میں پیوست ہوگا وہ اس کی قلبی کیفیات ہوں گی جو لفظوں کے واسطے اور زبان کے واسطے سے ہمارے دلوں میں پہنچیں گی، یہ چیز سوائے صحبت کے نہیں آ سکتی، مشین کی صحبت سے وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی جو متکلم کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔

تاثیرِ محبت میں مواجہت کا اثر..... حتیٰ کہ یہاں تک فرق ہے کہ ایک مجلس میں سو آدمی بیٹھے ہوئے ایک عالم کا کلام سن رہے ہیں جو سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس کے قلب پر جو تاثیر ہوگی پشت پر بیٹھے ہوئے کی نہیں ہوگی، یہ قدرتی چیز ہے، اس لئے کہ قلب کا قلب سے مواجہ ہوتا ہے جب کیفیت براہ راست لگ رہی ہے، وہ زیادہ متاثر ہوتا ہے اوچھلا آدمی ریڈیو کی طرح الفاظ سن رہا ہے، پوری طرح کیفیات منتقل نہیں ہو رہی ہیں اس لئے اس پر وہ اثر نہیں ہوتا۔ امام ابو حنیفہؒ کے واقعات میں ہے کہ جو ذہین طلباء کرام ہوتے تھے، انہیں فرماتے کہ وہ سامنے بیٹھیں، جو غبی

اور کند ذہن ہوتے، انہیں پیچھے بھیج دیتے تھے خدا نخواستہ اگر وہ نہ بھی قبول کریں تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، اس سلسلہ میں دلیل یہ بیان فرمائی کہ زبان جس چیز کو ادا کرے گی وہ قلبی کیفیات ہوں گی اور قلب کا قلب سے مولجہ ہوگا تو کیفیات نکر کھائیں گی، تو وہ براہ راست جا کر قلب میں اتر جائیں گی، پشت پیچھے بیٹھنے سے کیفیت نہیں نکراتی صرف آواز نکراتی ہے تو کان میں معمولی سی کیفیت پیدا ہوگی، یہ بھی صحبت کی بات ہے۔

صحبت سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب سے نہیں پیدا ہوتا..... اس واسطے قرآن کریم نے تاکید فرمائی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ** ﴿۱﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیت اختیار کرو، معلوم ہوا سب سے بڑی موثر چیز معیت و صحبت ہے، ماحول سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب و کاغذ سے پیدا نہیں ہوتا، اسلام نے جہاں عظیم الشان قانون پیش کیا ہے وہاں ایک ماحول بھی بنایا اس لئے کہ ماحول کے دائرے میں جو آجاتا ہے وہ دین کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔

حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ کے چشم دید تین ماحول

اور ان کے آثار میں نے اپنی زندگی میں تین ماحول دیکھے اور تینوں کے مختلف اثرات دیکھے

گنگوہ کا ماحول..... سب سے پہلے حضرت اقدس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کا ماحول، اس وقت میری عمر سات آٹھ برس تھی، کوئی زیادہ شعور نہیں تھا بچپن کی بات تھی کوئی زیادہ تمیز نہیں تھی لیکن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اینٹ اینٹ سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے، یہ کیفیت طاری ہوتی تھی، خانقاہ کے سامنے ایک تالاب تھا اب بھی ہے، اور بڑا تالاب ہے، شہر بھر کے کپڑے دھوبی اسی تالاب میں دھوتے تھے کوئی پچاس ساٹھ دھوبی ہوتے، اور ہر دھوبی کا ایک لکڑی کا پٹڑا لگا ہوا ہوتا جس پر وہ کپڑوں کو دے دے کر مارتے ہیں اور دھوتے ہیں تو روزانہ پچاس ساٹھ دھوبی کپڑے دھوتے ہیں، تو میں نے یہ خود سنا دھوبی ان پڑھ جاہل، کوئی شعور انہیں نہیں، بس سیدھے سادھے مسلمان تھے، لیکن کپڑے پڑے پر دے کر مارتے ہیں، اور لا اللہ الا اللہ کی ضربیں زبان سے نکل رہی ہیں اور اللہ کے ذکر سے تالاب گونج رہا ہے، ہر کپڑے کی ضرب کے ساتھ ایک ضرب لا اللہ کی بھی ہے تو دور تک آواز آتی تھی کہ ذکر اللہ ہو رہا ہے، لوگ یہ سمجھے کہ یہ ذکر خانقاہ میں ہو رہا ہے، حالانکہ وہ خانقاہ سے باہر دھوبی ہیں، مگر خانقاہ کے ماحول کا اثر ان دھوبیوں پر بھی ہے، اس لئے کہ خانقاہ میں ہر وقت چونکہ ذکر اللہ ہوتا تھا ذکرین وشاعلیں جمع ہوتے اور اللہ اللہ کر رہے ہوتے، تلاوت میں مشغول ہوتے، ان کے اثرات ان پر بھی پڑتے تو ان کی زبان سے بھی اللہ اللہ نکل رہا ہے اور لا اللہ کی ضربیں لگا رہے ہوتے۔ بہر حال یہ ماحول کا اثر ہے غرض ایک ماحول میں نے اپنی زندگی میں ابتدائی دور بچپن میں یہ دیکھا۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ کے وصال کے اثرات..... جب حضرت امام ربانی گنگوہی قدس اللہ سرہ کا وصال ہو گیا تو حضرت شیخ الہند میرے والد مرحوم، مولانا حبیب الرحمن اور مولانا میاں اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہم، یہ سب حضرات گنگوہ روانہ ہوئے اور ایک ٹوکرایہ کالے لیا کہ باری باری سے اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، سادہ زندگی تھی، گنگوہ دیوبند سے بائیس کوس ہے، غرض یہ بڑے بزرگوں کا قافلہ چلا کہ میل بھر یہ سوار ہوں گے پھر یہ اتر جائیں گے میل بھر فلاں سوار ہوں گے، مجھے بھی ساتھ لیا اور یہ طے پایا کہ اس بچے کو اپنے آگے بٹھا دیا جائے، میری عمر نو برس ہوگی، اور اس وقت زیادہ بچہ بھی نہیں تھا، مگر بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بائیس کوس تک میں ہی بیٹھا رہا، سارے اکابر پیدل ہی چلتے رہے، کوئی بیٹھا ہی نہیں، خیر گنگوہ پہنچے، خانقاہ میں جب قدم رکھا تو میرے بچپن کی

بات تھی، مگر میں نے پریشان ہو کر کہا کہ: ابا جان! خانقاہ کو کیا ہو گیا؟ فرمایا: ہاں ہاں کیا ہوا بھائی؟ میں نے کہا کہ اس میں یوں معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی روکھا پن ہو، کوئی رونق ہی نہیں رہی، کہ برکت ہی معلوم نہیں ہوتی؟ ان بزرگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا دیکھو حضرت کے وصال کا اثر اس بچے نے بھی محسوس کیا کہ کسی چیز کی خانقاہ میں کمی ہو گئی، اینٹیں وہی ہیں حجرے وہی ہیں، مدرسہ بھی ہے مگر اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز کم ہو گئی، تو یہ اس بچے تک کا احساس ہے تو بڑے کتنا محسوس کرتے ہوں گے، صاحب دل کتنا احساس کرتے ہوں گے وہی الحقیقت اسی ماحول کا اثر تھا جسے میں پہلے دیکھ چکا تھا، برس دن کے بعد آ کر دیکھا تو رنگ پھیکا پڑ چکا تھا، تو اس عمر میں مجھے بھی احساس ہوا کہ یہاں سے کوئی چیز کم ہو گئی ہے، یہ تو تھا وہاں کے ماحول کا اثر کہ ذکر اللہ کی توفیق خود بخود ہوتی۔

تھانہ بھون کے ماحول کے آثار..... دوسرا ماحول تھا نہ بھون کا دیکھا کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے یہاں معاملات کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا کہ دیانت کو ملحوظ رکھا جائے، تنہائی ہو مجمع ہو، اصول شریعت کے مطابق جو معاملات کی روش ہو وہ ہونی چاہئے، ہر شخص یہ چاہتا کہ میرے سے کسی کو اذیت نہ ہو، ہر معاملہ میں سچائی ہو، مجھے یاد ہے کہ ایک شخص اپنا رومال مسجد کے صحن میں بھول گیا تین دن رومال وہیں پڑا رہا، اس کی اجازت بھی نہیں تھی کہ اٹھا کر حفاظت سے رکھو، ممکن ہے مالک آئے اسے یاد آئے کہ وہاں چھوڑا تھا اور نہ ملے تو اسے چیز کے نہ ملنے سے اذیت ہو، تو تین دن تک وہیں پڑا رہا، یہ قلب کی دیانت کا اثر تھا کہ کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر کہیں رکھ دے، خانقاہ میں جتنے حجرے تھے کبھی کسی حجرے میں تالہ نہیں لگتا تھا، زنجیر نہیں لگتی تھی سامان رکھا ہے، صندوق کھلے پڑے ہیں، زنجیریں کھلی پڑی ہیں، طلبہ باہر گئے ہوئے ہیں، مریدین موجود نہیں ہیں، کسی چوری چکاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، ماحول کے اثرات سے اتنی دیانت قلوب میں تھی کہ نہ کسی کی کوئی چیز کم ہوتی تھی اور نہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا باعث بنتا تھا غرض یہ ماحول تھا نہ بھون کا دیکھا۔

دارالعلوم دیوبند کے ماحول کے آثار..... تیسرا ماحول دارالعلوم دیوبند کا دیکھا، وہاں اعمال پر زیادہ توجہ ہے اخلاق پر توجہ بالواسطہ ہے، بلا واسطہ جیسے خانقاہوں میں تربیت اخلاق ہے وہ رنگ نہیں، مگر اعمال کے واسطے سے اصلاح اخلاق کی تربیت کرتے ہیں بہر حال اعمال کا زور ہے، اس ماحول میں رہ کر کوئی چاہے نہ چاہے مگر اسے نماز پڑھنی پڑے گی، جب ڈیڑھ ہزار آدمی اذان ہوتے ہی حجروں سے نکل کر ایک دم مسجد میں پہنچیں گے تو ایک آدمی کیسے بیٹھا رہے گا، اسے بھی مسجد میں جانا ہی پڑے گا، بقول مولانا سعید احمد صاحب مرحوم جب مجلس شوریٰ میں آئے تو ٹھنڈی جگہ تہ خانہ قیام تھا، ظہر کی اذان ہوئی تو میں نے کہا حضرت! چلے نماز کے لئے، نماز کو آ گئے دو گھنٹہ بعد عصر کی اذان ہوئی، تو میں نے کہا چلے نماز کے لئے، پھر مغرب نماز کا وقت آیا، میں نے کہا چلے نماز کے لئے کہنے لگے!

بھائی! تمہارے ہاں جو پچاس نمازیں معراج میں فرض ہوئی تھیں، ساری کی ساری یہاں باقی ہیں، جب دیکھو نماز کو کہو، غرض ایک ماحول کا اثر ہے کہ نماز کے لئے طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی ہے، وہ اس ایریا اور ماحول کا

اثر ہے، بہر حال تین قسم کے ماحول دیکھے اور تینوں کے اثرات جدا تھے، اور وہ اثرات طبیعت پر پڑتے تھے، دیوبند آکر نمازی بننے کا شوق ہوتا تھا، تھانہ بھون جا کر صفائی معاملات کا شوق ہوتا تھا، گنگوہہ پہنچ کر ذکر اللہ کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اس لئے تینوں جگہوں کے ماحول کے یہی اثرات ہیں اور وہی قلوب پر پڑتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دین کی مضبوطی نبوی ماحول کی وجہ سے تھی..... اس لئے قرآن کریم نے جہاں تقویٰ و طہارت کی تعلیم دی ہے وہاں یہ بھی فرمایا کہ ﴿كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ چوں کی معیت اور صحبت اختیار کرو اور ماحول ایسا بناؤ کہ خواہ مخواہ دین تمہارے اندر رچ جائے، دین کی طرف تمہاری توجہ ہو جائے، بہر حال سب سے بڑی چیز اسلام میں ماحول ہے، حضرات صحابہ کرامؓ کا دین اسی لئے مضبوط تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماحول میں رہے ہوئے ہیں اور رنگ اٹھائے ہوئے ہیں، دیکھے ہوئے ہیں۔

حضرات متقدمین کے ہاں صحبت شیخ کا درجہ..... اسی واسطے سلف کے زمانے میں یہ اصطلاح نہیں تھی جو ہمارے دور میں ہے کہ فلاں استاذ ہیں اور یہ ان کے شاگرد ہیں، بلکہ شاگردوں کو صاحب کہتے تھے اصحاب ابی حنیفہؒ، اصحاب شافعیؒ، اصحاب عبد اللہ بن مسعودؓ، اصحاب ابن عباسؓ اصحاب عبد اللہ بن مسعودؓ کہ جو شاگرد صحبت نہیں اٹھائے ہوئے تھے، ان کے علم کا بھی سلف میں اعتبار نہیں کیا جاتا تھا کہ معلوم نہیں صحیح سمجھا ہے کہ نہیں؟ اس نے صحبت تو اٹھائی نہیں، محدثین کے ہاں جو سند بیان کی جاتی ہے اور سند میں افراد کے نام آتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے روایت کی اس نے مجھ سے کی، اس نے مجھ سے، تو امام بخاریؒ کے ہاں شرط یہ ہے کہ جس کو اپنے استاذ اور شیخ سے صحبت زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس کی حدیث زیادہ قابل اعتبار اور قابل قبول ہوگی، اور جس نے محض کانوں سے سنا اور صحبت نہیں اٹھائی اس کی روایات کم درجے کی سمجھتے ہیں، امام بخاریؒ قبول نہیں کرتے، تو صحبت یافتہ ہونے سے وہ جو قلبی کیفیات ہیں وہ قلب کے اندر منتقل ہو جاتی ہیں اور دور سے آدمی نے تو علم کے الفاظ منتقل ہوتے ہیں، قلب کی کیفیات منتقل نہیں ہوتیں۔

صحبت سے قلبی کیفیات پیدا ہو کر محرک عمل بنتی ہیں..... اور عمل کا تعلق انہی قلبی کیفیات سے ہے جن سے جذبات عمل پیدا ہوتے ہیں، اس واسطے ضرورت سمجھی گئی کہ صحبت اختیار کی جائے ملازمت اور معیت کو اپنایا جائے جو زیادہ صحبت یافتہ ہوگا اس کا دین زیادہ پکا ہوگا، جو کم صحبت یافتہ ہوگا اس کے دین میں کمی آئے گی اور اگر صحبت بالکل نہیں تو اور زیادہ کمی رہے گی۔

غیر صحبت یافتہ علماء ظہور فتن کا سبب بنتے ہیں..... تجربہ ہے کہ دنیا میں جتنے فتنے پھیلے ہیں جس سے مذاہب اور پارٹیاں بن جاتی ہیں یہ زیادہ تر ان علماء سے پھیلتے ہیں جو صحبت یافتہ نہیں ہوتے، فقط قرآن وحدیث کے الفاظ ان کے سامنے ہوتے ہیں اسلاف کا وہ رنگ ان کے قلوب میں نہیں ہوتا جو بزرگوں میں ہوا کرتا ہے اس لئے ان

سے فتنہ زیادہ پھیلتا ہے، اور جو عالم زیادہ صحبت یافتہ ہوگا، زیادہ دیانت قائم کئے ہوئے ہوگا اس سے فتنہ نہیں پھیلے گا، زیادہ فتنہ پر داندہ ہوتے ہیں کہ ان کے پاس علم موجود ہے۔ صحبت میسر نہیں ہوتی، اخلاق درست نہیں ہوتے، اخلاق کے اندر چٹکنی نہیں پیدا ہوتی، تو ان کے کلمات سے زیادہ تر بے ادبی اور گستاخی کا فتنہ پھیلتا چلا جاتا ہے، یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مصر، شام یا عراق ہو اؤل تو وہاں علم کی ہی کمی ہے لیکن اگر علم بھی ہے تو چونکہ صلحاء اور اہل اللہ کی صحبت میسر نہیں وہ علم اور وبال جان اور مآستین ان کے حق میں بنا ہوا ہے، بقول حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ۔

علم را برتن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

علم کو نوک زبان پر رکھو گے تو سانپ اور بچھو ہے، یہ ڈسے گا اور علم کو دل میں اتارو گے تو یار اور دوست بن جائے گا جو آخرت تک پہنچائے گا۔

بلا صحبت علم زبان تک رہتا ہے..... اس لئے کہ دل میں علم ہوتا تو دل کی کیفیات دل کے اخلاق تک کو درست کر دے گا، اور اگر علم کا دل پر اثر نہیں زبان پر ہے تو وہ علم کی نمائش ہے، جیسے آدمی لباس سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، یہ اپنے کلمات سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، تو وہ علم تحمل کے لئے ہے نمائش کے لئے ہے دل کی اصلاح کے لئے نہیں ہے، اصلاح جب ہوگی جب علم کو دل کے اندر اتار لیا جائے، اخلاق درست کئے جائیں، وہ بلا صحبت اور بلا معیت کے نہیں ہوتے۔

تکمیل علم کی سند بغیر صحبت نہیں ملتی تھی..... ہمارے طالب علمی اور بچپن کے زمانے میں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ نو دس سال رہ کر ایک طالب علم نے علم حاصل کر لیا، لیکن اکابر اس کو سند نہیں دیتے تھے، جب تک جماعت کے بزرگوں میں سے کسی کے پاس چھ مہینے رہ کر اپنی اصلاح نہ کرائے، اور صحبت یافتہ ہو کر اس کا رنگ نہ قبول کر لے، اس کے بغیر وہ سند نہیں دیتے تھے، کیونکہ صحبت کے بغیر محض ایک نمائش اور گرمی بازار اور گرمی محفل کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔

ازالہ شبہات میں تاثیر صحبت، حضرت تھانویؒ کا واقعہ..... ایک دفعہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ کے یہاں ایک شخص کا خط پہنچا، اس نے لکھا کہ میں ایم، اے ہوں اور لندن میں رہا ہوں، کیمبرج یونیورسٹی میں میں نے پڑھا ہے، مجھے اسلام کے بعض مسائل میں شبہ ہے، یا تو آپ انہیں حل کر دیں ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں گا۔ حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ایسی باتوں کے تفصیلی جوابات تحریر میں نہیں آسکتے، اگر کبھی اس لائن سے گذر ہو تو آپ چند گھنٹوں کے لئے تھانہ آجائیں تو زبانی بات چیت ہوگی، اس میں کچھ عرض کروں گا، حضرتؒ نے یہ جواب دے دیا، ہفتہ بھر نہیں گذرا تھا کہ ایک شخص آپ سے ملنے سوٹ بوٹ میں ہیٹ لگائے ہوئے بالکل انگریز صورت اچانک تھانہ بھون آگیا، حضرتؒ کو اطلاع کرائی گئی، کسی نے کہا حضرت! کوئی گریجوئیٹ ہے بالکل انگریز کی صورت ہے فرمایا، بلا لوالو اور مجلس میں وہ حاضر ہوئے، اس نے آکر سلام علیکم کہا، اور سلام کرتے ہی کہا کہ میں وہی ہوں جس نے خط لکھا تھا کہ میں نے ایم اے کیا ہوا ہے یا تو میرے سوالات کا جواب دیا جائے ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں

گا، حضرتؑ نے فرمایا اچھا بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا حضرتؑ کے ہاں مختلف علمی مسائل کا تذکرہ ہو رہا تھا وہ سنتا رہا، جب وہ مجلس ختم ہوئی تو حضرتؑ نے فرمایا: ہاں اب آپ فرمائیے کیا کہنا ہے؟ تو بجائے اس کے وہ کوئی شبہ ذکر کرتا پھر وہی جملہ کہا کہ صاحب! مجھے اسلام پر شبہات ہیں یا تو آپ انہیں حل کر دیں، ورنہ میں عیسائی ہوتا ہوں، اور کچھ زور سے کہا، حضرتؑ کو غصہ آیا، اس زور سے کہ طمانچہ رسید کیا کہ اس کا منہ پھر گیا، فرمایا: مردود! اگر تو عیسائی ہو گیا تو تیرے عیسائی ہونے سے اسلام میں کمی آجائے گی، دور ہو جا، چاہے یہودی بن چاہے عیسائی! اسلام کو تیری کوئی پرواہ نہیں، تو اسلام پر دباؤ ڈالتا ہے۔

بہر حال اس زور سے مارا کہ اس کا منہ پھر گیا، حالانکہ حضرتؑ کی عمر بڑھ چکی تھی اور وہ جوان آدمی، بہر حال اس زور سے مارا اس نے سوائے اس کے کہ رونا شروع کیا اور کچھ نہیں بولا، اور حضرتؑ نے فرمایا اس کو نکال دو یہاں سے خدام نے نکال دیا اب وہ خانقاہ کی سیڑھیوں میں بیٹھا رو رہا ہے، صبح کا وقت تھا گیارہ بجے حضرتؑ مجلس سے اٹھے، اور وہاں سے گزرے تو وہ وہاں رونے میں مشغول، حضرتؑ دیکھ کر چلے گئے حضرتؑ نے کچھ نہیں فرمایا، مکان چلے گئے، گرمی کی دوپہر تھی، ظہر کے وقت جب حضرتؑ آئے تو وہ وہیں سیڑھیوں کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، خیر ظہر کی نماز ہوئی پھر مجلس شروع ہوئی تو فرمایا کہ اسے بلاؤ۔ اب وہ آئے، بٹھلا کے فرمایا، کیا شبہات ہیں؟ اس نے کہا ایک بھی شبہ نہیں اسلام حق ہے، بالکل میرے دل میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اسلام ہی حق ہے، اس کے سوا کوئی چیز حق نہیں ہے اور اب مجھے کوئی شبہ نہیں ہے، بس وہ ایک ہی تھپڑ میں سارا کام ہو گیا، پھر حضرتؑ نے نصیحت فرمائی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض تھپڑ نہیں مارا، بلکہ روحانی لحاظ سے کوئی توجہ فرمائی جس میں کوئی باطنی تصرف بھی شامل تھا، ورنہ اگر نفسانی جذبے سے مارتے تو اسے جوش اٹھتا کہ صاحب! آپ کو کیا حق تھا، یہ کون سی تہذیب کی بات ہے کہ ایک آدمی مفتی کے پاس سوال کرنے آئے، فتویٰ پوچھنے آئے وہ تھپڑ مارے، اگر نفسانی جذبہ سے ہوتا تو وہ دس جتھیں نکالتا، چونکہ روحانی جذبہ تھا اور مقصود اس کی تربیت تھی ایذا نہیں تھی، تو اس تصرف کا اس پر یہ اثر پڑا کہ اس نے رونا شروع کیا، ورنہ ایک تھپڑ کھا کے آدمی چھ گھنٹے بیٹھ کے روئے، اور اس درجہ میں اس کا باطن پاک ہو جائے کہ اسے کوئی شبہ ہی باقی نہ رہے، نفسانی جذبے سے یہ تاثیر ممکن نہیں۔ اس کے بعد پھر حضرتؑ نے اس کو نہایت شفقت سے نصیحت فرمائی، اور فرمایا کہ انسان کو شبہ طبعی طور پر پیش آتا ہے لیکن یہ صورت اختیار نہیں کرنی چاہیے کہ یا شبہ حل ہو ورنہ میں اسلام سے پھر جاؤں گا، بسا اوقات شبہ اتنا قوی ہوتا ہے، یا شیطان کا اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ جواب بن نہیں پڑتا، مگر دل مطمئن ہوتا ہے، کہ بہر حال دین حق یہی ہے گوشبہ بھی اپنی جگہ قائم ہے شبہ اوپر اوپر ہوتا ہے دین دل کے اندر گھسا ہوا ہوتا ہے ہزاروں وسوسے پیش آتے ہیں، ان کو آدمی اس طرح پیش کرے کہ یا تو جس طرح میں چاہوں حل ہوں ورنہ میں دین سے پھر جاؤں گا یہ بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے، پھر وہ صاحب وہاں سے ایسے دیندار بن کے واپس ہوئے کہ نہ ان کی وہ کرد و فر رہی

خطبات حکیم الاسلام — حکیم الاسلام کے چشم دید تین ماحول

، نہ گرجو بیٹری رہی، نہ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے آثار رہے، ایک سچے دیندار بن گئے۔ پھر انہوں نے حضرتؒ کے ہاں وقتاً فوقتاً آنا شروع کیا، خاصاً اس کا دین مضبوط ہو گیا، تو یہ آثار کتاب کے پڑھنے سے نہیں ہوتے، محبت سے ہوئے، اور محبت میں تھپڑ کھانے سے ہوئے، وہ بھی دراصل محبت ہی تھی، الغرض سب سے بڑی چیز دین کی چٹنگی ہے وہ محبت سے ہی آتی ہے۔

سو برس کی عبادت سے چند لحظات کی محبت کیوں افضل ہے؟..... اس وجہ سے حضرت مولانا رومی نے کہا کہ ۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

سو برس تک بلا ریا کاری عبادت کرے، اس سے ایک گھنٹہ کی اہل اللہ کی صحبت بہتر ہے، تو اس کی بناء یہی ہے کہ اس ایک گھنٹے کی صحبت میں قلب کا راستہ اتنا صحیح ہو جاتا ہے کہ سو برس کی عبادت کی لائن بچھ جاتی ہے، اس لئے اس کو افضل کہا گیا۔

ہمارے بھائی اور لیس، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہیں، مولانا اور لیس کا ندھلویؒ میرے بے تکلف ساتھیوں میں سے ہیں، ہم ایک ہی ساتھ میں مولوی بدر عالمؒ، مولوی اور لیسؒ اور مفتی شفیعؒ ہم چار آدمیوں کی بہت دوستی تھی، ایک ہی ساتھ پڑھتے تھے، تو مولوی اور لیسؒ نے ایک رسالہ مسئلہ تقدیر پر لکھا، اور بڑے عالمانہ انداز سے لکھا، حضرت اقدس تھانویؒ کی خدمت میں دکھانے کے لئے لے گئے، اور یہ سمجھ کے لے گئے کہ یہ نہیں کہ فقط حضرت والا تائید فرمائیں گے، بلکہ کہیں گے کہ بھائی ایسا لکھا کہ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا، اب جا کے حضرت اقدسؒ کی خدمت میں لکھا ہوا پیش کیا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی فرصت میں دیکھوں گا، دوپہر کو جب آؤں گا تو مطالعہ کروں گا، پھر کچھ لکھ دوں گا، حضرتؒ نے دوپہر کو مطالعہ فرمایا، ظہر کے بعد سب لوگ جمع ہوئے اور مولوی اور لیسؒ بھی موجود تھے، حضرتؒ نے فرمایا مولوی اور لیسؒ! یہ رسالہ تم نے لکھا ہے؟ کہا حضرت! میں نے لکھا ہے فرمایا اتنا غلط کہ اوّل سے لے کر آخر تک سر تا پا غلط، اہلسنت کا یہ مسلک ہی نہیں، تم جیسا فاضل آدمی اتنا غلط لکھے؟ اس کے بعد حضرتؒ نے اغلاط سمجھائیں، تو واقعی ان پر منکشف ہوا کہ یہ یہ اغلاط ہیں، اس پر حضرتؒ نے فرمایا اس کو یوں بدلو، پھر مجھے دکھاؤ، پھر انہوں نے صحیح کیا، اس پر حضرت اقدسؒ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ بھائی! نظر تہہاری وسیع ہے، ہماری نظر اتنی وسیع نہیں، مگر تم بڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے، فرمایا جو تم میں برس میں کتابیں کھنگال کرائے قائم کرو گے، بڑھوں کے ہاں وہ تجربہ شدہ ممنوں میں مل جائیں گی، تم بڑھوں سے مستغنی نہیں بن سکتے کتنے ہی بڑے عالم بن جاؤ۔ اس میں اشارہ ہی صحبت کی طرف تھا کہ کتاب سے علم کے الفاظ حاصل ہوں گے، اور صحبت سے حقائق حاصل ہوں گے علم کی کیفیات قلب میں پیدا ہوں گی۔

تو دین کی بنیاد صحبت سے پیدا ہوتی ہے، اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو قرآن کریم اتار دیا جاتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں نہ بھیجا جاتا، کیا اہل عرب قرآن کریم نہیں سمجھ سکتے تھے؟ پیغمبروں کو ہر کتاب کے ساتھ بھیجا کہ وہ صحبت کے ذریعے ان کیفیات کو دل کے اندر اتار کر دین پیدا کریں، بہر حال صحبتِ اہل اللہ جڑ اور بنیاد ہے دین کی، بلا صحبت دین کی بنیاد نہیں ہوتی، وہ کسی وقت بھی متزلزل ہو سکتا ہے، اس میں پائیداری ناممکن ہے اس لئے الفاظِ علم سے بھی زیادہ ضروری صحبتِ اہل حق ہے۔

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ
کی علمی خدمات کتابیاتی جائزہ

مرتبہ
حافظ قاری بشیر حسین حامد صاحب
(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان، ایبٹ آباد کے شکریہ کے ساتھ

محترم المقام بھائی بلال صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے، ”خطبات حکیم الاسلام“ (گیارہ جلدوں میں) بلاشبہ آپ کے ادارے کا عظیم کارنامہ ہے، واقعی علوم قاسمیہ کی اشاعت میں آپ کا بہت حصہ ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائیں، حضرت قاری صاحب کے علوم بحر ذخار کی مانند ہیں، جن کا احاطہ ہم جیسے بے مایہ انسانوں کے بس سے باہر ہے، ان خدمات کا احاطہ (جن میں آپ کی تصنیفات/تقاریر و خطبات، تقاریظ و مقدمات، مکتوبات و ملفوظات شامل ہیں) ایک مستقل کام ہے، اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے چند سالوں کی کوشش و سعی سے یہ کام انجام کو پہنچا، میں اگرچہ اس کی جامعیت و مانعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا، مگر میں نے اپنی بساط کے مطابق بہت تلاش و جستجو کے بعد یہ مواد اکٹھا کیا تاکہ کم از کم حضرت قاری صاحب پر کام کرنے والوں کے سامنے ان کی خدمات کا ایک خاکہ موجود ہو، اللہ تعالیٰ اس حقیر کی کوشش کو قبول فرما کر آخرت کا ذخیرہ بنادیں۔ اگر آپ حضرات کا مشورہ اس مسودہ کی طباعت کے بارے میں ہو جائے تو یہ یقیناً بندہ ضعیف پر احسان عظیم ہوگا۔ اس کے علاوہ حضرت قاری صاحب کے مختلف کتابوں پر جو مقدمات/تقاریظ/پیش لفظ/تصدیقات تحریر فرمائے ہیں وہ بھی اکٹھے کئے گئے ہیں ۲۵/۳۰ کے لگ بھگ ہوں گے، ان کی فہرست اسی مسودہ کے ص: ۸ پر موجود ہے، ان کی اشاعت بھی یقیناً حضرت قاری صاحب کی روح کی ٹھنڈک کا سامان ہوگی۔ دعاؤں کا متنتی

والسلام..... بشیر حسین حامد

حافظ قاری بشیر حسین حامد

(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان (ایبٹ آباد)

تاریخ..... ۲۱/۲/۹۸ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى آمَنَّا بِهَا

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وجود مسعود اس امت کیلئے باعث رافت و رحمت تھا وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک جماعت تھے، اکیلے آپ نے اپنی زندگی میں جتنا کام کیا وہ مستقل ایک ادارے کے بس کا بھی نہیں تھا وہ ایک عہد آفرین اور عہد ساز شخصیت تھے، جنہوں نے نہ صرف پورے عالم میں دارالعلوم کا تعارف کرایا بلکہ علمائے دیوبند کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی علمیت و ثقاہت کا لوہا منوایا، پورے عالم اسلام میں فکر و الہی اور حکمت قاسمیہ کے ترجمان کی حیثیت سے پہچانے گئے، انہوں نے ہر لائن میں چاہے وہ تصنیف و تالیف کا شعبہ ہو، درس و تدریس کا فن ہو، تقریر و خطابت کا میدان ہو یا اہتمام و انصرام کا دائرہ ہو، اپنی خدا و صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عزم و ہمت، بصیرت و دانائی، طبعی حلاوت، مٹھاس اور شخصی کشش و جاذبیت، قدرتی فہم و ذکا اور آرائی نسبت کی بدولت ایسے جوہر دکھائے کہ صدیوں ان کا مثل پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

حضرت قاری صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں علمی دنیا میں ان کا نام نہ ذہنوں سے بھلایا جاسکتا ہے، نہ زبانوں سے مٹایا جاسکتا ہے، وہ تو عالم اسلام کے علمی حلقوں میں اپنا مقام منوا چکے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ اتنی عظیم شخصیت پر حلقہ علماء اور خصوصاً حلقہ دیوبند میں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا اس وقت میرے سامنے آپ کی شخصیت و سوانح پر چند کتب و رسائل میں شامل چھوٹے بڑے مضامین کے علاوہ صرف دو کتب ہیں۔ 1 تذکرہ طیب، مرتبہ محمد ابوبکر غازی پوری، المکتبہ الاثریہ، قاسمی منزل سید واڑہ غازی پور (انڈیا) 2 ذکر طیب مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور (پاکستان) میری اس حقیر سی کوشش و کاوش کا مقصد یہ تھا کہ تحریر و تقریر کے میدان میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمات کا ایک ایسا خاکہ (جسے کتابیات کا نام بھی دیا جاسکتا ہے) سامنے لایا جائے جس میں حضرت قاری صاحبؒ کی تصانیف کی فہرست، آپ کے مقدمات، تصدیقات و تقاریر، آپ کے مطبوعہ خطوط، آپ کے خطبات و تقاریر (چاہے وہ کتابی شکل میں طبع ہو چکی ہوں یا رسائل میں) نیز وہ مختلف مضامین و تحریریں جو مختلف کتب و رسائل میں شامل ہوں وہ سب یکجا ہو جائیں تاکہ آپ پر کام کرنے والوں کے لیے سہولت کا سبب ہو۔ میں اپنی کوتاہی و وسائل کے پیش نظر ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا (وہ اگرچہ کئی سالوں کی جستجو و تلاش کا ثمرہ ہے) حضرت قاری صاحب کی تحریری و علمی خدمات کی تمام

جہتوں پر حاوی ہے، کیونکہ ہندوستان کے پریس سے حضرت قاری صاحب سے متعلق جو کچھ طبع ہوا یا وہاں کے ماہناموں اور مفت روزوں میں آپ کے مضامین و خطبات طبع ہوئے وہ تمام تر مواد پاکستان میں نہیں پہنچ پاتا، جس کی وجہ سے تحقیق و جستجو کا حق ادا نہیں ہو سکتا، البتہ جو کسی ذریعے سے پاکستان پہنچ پایا، اس سے ضرور استفادہ کیا گیا، امید ہے اس جہت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ حقیر سی کوشش سنگ میل کا کام دے گی۔ ابتدا میں حضرت قاری صاحب کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ حیات طیب کی تقریباً پون صدی پر محیط جدوجہد کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے، اور کام کرنے والے ہر رخ، اور ہر عنوان پر مستقل کام کر سکیں، یہ پون صدی کی جدوجہد اپنے دور کی عکاس ہے اور اگر حضرت قاری صاحب کی زبان سے یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھو
ان میں اک دور کی تاریخ نظر آئے گی

حافظ بشیر حسین حامد عفی عنہ